ضیاء السنن

شرح ابن ماجہ

شارح

حضرت مولانا مفتی اسعد قاسمی صاحب مرادآبادی

دارالکتاب دیوبند

تفصیلات

نام کتاب	:	ضیاء السنن شرح ابن ماجہ
شارح	:	حضرت مولانا مفتی اسعد قاسم صاحب سنبھلی
کمپیوٹر کتابت	:	یاسر ندیم کمپیوٹر، دیوبند
تعدادِ صفحات	:	۵۹۲
طباعت	:	یاسر ندیم آفسیٹ پریس، دیوبند
سن اشاعت	:	۲۰۰۶ء
تعداد	:	۱۱۰۰
باہتمام	:	واصف حسین مالکِ دار الکتاب

ناشر

دار الکتاب دیوبند

فہرست مضامین

تمت بالخیر

عــــرض مــؤلف

سنن ابن ماجہ حدیث کی نہایت اہم اور وقیع کتاب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال، سیرت وکردار اور نبوت کے کارناموں کو مدوّن کرنے کے لئے قرونِ اولیٰ میں جو بلند مقام کتابیں لکھی گئیں، امت مسلمہ ان کے مجموعہ کو صحاحِ ستہ کے نام سے یاد کرتی ہے اور انھیں کتاب اللہ کے بعد آج بھی دین کا سب سے بڑا سرچشمہ تصور کیا جاتا ہے، ابن ماجہ اسی سنہری زنجیر کی آخری کڑی ہے جو حسین ترتیب، البیلے آغاز اور جامع مقدمہ کی بناء پر اہل علم سے ہمیشہ خراجِ تحسین وصول کرتی رہی ہے، درس وتدریس کے حلقے ہوں یا شرح وتعلیق کی بزم سجی ہو، ہر دور میں محدثین نے اسے حرزِ جاں بنا کر بحث وتحقیق کے زیور سے آراستہ کیا ہے، زمانہ کی دست برد سے گرچہ یہ تمام کاوشیں آج محفوظ نہیں ہیں لیکن ان کا جتنا حصہ بھی ہم تک پہنچا ہے وہ بھی الحمدللہ اتنی وافر مقدار میں ہے کہ حدیث وسنت کے کارواں صدیوں تک اس سے روشنی حاصل کر سکتے ہیں، کتاب کے مقدمے میں ہم نے ایسی ۲۵ شروحات کا پتہ دیا ہے کہ جن کا بہت تھوڑا حصہ اب بھی استفادے کے لئے دستیاب ہے جب کہ بڑی تعداد میوزیم اور مخطوطات میں رکھی ہماری بے اعتنائی کا شکوہ کر رہی ہے اس لئے سرِ دست ابن ماجہ پر ایسے کام کی ضرورت تھی جو شرح وتفہیم کے ساتھ ان تمام تحقیقات سے بھی آراستہ ہو جو محدثین نے بطورِ امانت ہمارے لئے ورثہ میں چھوڑی ہیں۔

اسی ضرورت کا احساس کر کے راقم نے **"مصباح الزجاجة"** کے نام سے طالب علمی کے زمانہ میں سنن ابن ماجہ کی ایک شرح لکھی تھی اس میں صرف مشکل احادیث اور اہم مقامات کو حل کیا گیا تھا، یہ گرچہ ایک ابتدائی کوشش تھی اور اس میں زیادہ پختگی بھی نہ تھی لیکن مقدمے کی مکمل شرح نہ ہونے کی بناء پر وہ بہت مقبول ہوئی اور مختصر عرصے میں اس کے کئی ایڈیشن نکل گئے، راقم کا خیال اسے شروع ہی سے دوبارہ مرتب کرنے کا تھا تا کہ وہ نصاب کے تمام ابواب واحادیث کو شامل ہو سکے؛ لیکن جب تدریس کا آغاز ہوا تو چند سال ارادہ ہی میں گذر گئے "امام مہدی۔ شخصیت وحقیقت" سے فراغت کے بعد کسی طرح ہمت کو جمع کر کے کام شروع کیا اور اللہ کے فضل سے شبانہ روز جد وجہد کی بدولت تین سال میں اس کی

تکمیل ہوگئی، ایک سال پھر طباعت کی فکر میں گذارا جب کہ دوسرے سال حاسدوں کی ریشہ دوانیوں اور بعض ناخداترس حضرات کی شرارتوں نے کچھ عرصے تک ادھر توجہ کرنے کی بھی مہلت نہیں دی، اللہ بڑا رحیم وکریم ہے، اس نے دل مضطرب کی ہمیشہ سنی ہے چنانچہ مولا نے جب دوبارہ سکونِ خاطر نصیب فرمایا تو معاً مجھے اس محبوب مشغلہ کی یاد آئی جو دل کو فرحت ونشاط عطا کرکے روح کو تازگی بخشتا تھا، شرح کی تکمیل پر دو سال گذر چکے تھے سوچا کیوں نہ ایک نظر اور ڈال لی جائے تاکہ غلطیاں کم سے کم اور افادہ زیادہ سے زیادہ ہوسکے، بس یہی فیصلہ تاخیر کا سبب بن گیا اس میں پھر خامیاں نظر آئیں، ان کا تعاقب کیا تو یہ سفر بھی ڈیڑھ سال تک جاری رہا، منزل پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ مسودے کو ۹۰ فیصد ازسرِ نو مرتب کرچکا ہوں اور کتاب اب نقش دوم سے نقش سوم میں تبدیل ہوچکی ہے۔

اس طرح یہ آٹھ سالہ کاوشوں کا ثمرہ ہے جس میں ابن ماجہ کی موجودہ تمام تخریجات وتعلیقات کے علاوہ ہم نے دوسری شروحات وحواشی سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے شرح کے دوران بنیادی کوشش اختصار، جامعیت اور تسہیل کی رہی ہے، روایت کا پس منظر، منتشر طرق کی تلاش، مشکل الفاظ کی لغوی واصطلاحی تشریح، پیچیدہ ترکیبوں کا تجزیہ، محدثین کے فرمودات کی نقل وتوجیہ، منشاء نبوت کی تفصیلی وضاحت، حدیث کی تخریج اور ہر سند کی تحقیق ہماری کتاب کے عناصر ترکیبی ہیں، حوالہ صفحات کے بجائے ہم نے کتاب اور باب کا دیا ہے جو استخراج میں بہت سہولت پیدا کردیتا ہے، مثلاً جب بخاری (ایمان ۳۶) لکھا جائے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ حدیث کتاب الایمان کے باب نمبر ۳۶ میں ملے گی، صحاحِ ستہ کے تمام حوالے اسی نوعیت کے ہیں جب کہ مرقات المفاتیح میں کتاب کے بعد فصل اور حدیث نمبر کی نشاندہی کی گئی ہے، اور تقریب التہذیب میں راقم نے رُواۃ کا نمبر شمار لکھا ہے، علامہ سندھی کی عبارتوں کا حوالہ نہیں دیا گیا کیونکہ وہ سب سنن مصطفیٰ سے ماخوذ ہیں، اس کے علاوہ دیگر حوالوں میں جلد اور صفحہ نمبر کی رعایت ہے، ضعیف روایات کے ذیل میں سند پر قدرے تفصیلی کلام ہے، اور کوئی متن روایۃً ودرایۃً موضوع قرار پاتا ہے تو اس کی شرح وتوجیہ کے گناہ سے اللہ نے ہمیں محفوظ رکھا ہے۔

فرحت وانبساط کی ان گھڑیوں میں مجھ پر صبر وشکر کی ایک والہانہ کیفیت طاری ہے کہ مولیٰ نے اس ظلوم وجہول کو خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کی شرح وتوجیہ کی توفیق نصیب فرمائی، جو تفسیر قرآن کے بعد کائنات میں یقیناً سب سے عظیم دینی خدمت ہے، مجھے

بے اختیار اس موقع پر استاذ محترم حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری دامت برکاتہم کی یاد آتی ہے جنہوں نے حدیث کے ذوق سے آشنا کرکے ہمارے دلوں میں اس کی خدمت کا ایک والہانہ جذبہ پیدا کیا میرے نزدیک یہ کاوش حضرت مولانا ہی کے درس کا فیض اور انہی کی شفقت ورہنمائی کا ثمرہ ہے اسی طرح مولانا عباد اللہ عمیس رائپوری بھی بے حد شکریہ کے مستحق ہیں انہوں نے کمپوزنگ کے تمام مراحل میں بڑی جانفشانی کا مظاہرہ کیا، مولائے کریم انہیں جزائے خیر نصیب فرمائے۔

مسودے کی تبییض میں یوں تو میرے بہت سے شاگردوں نے تعاون کیا ہے لیکن مولوی فیاض احمد حمیدی، مولوی احمد حسین بستوی، مولوی معظم علی مظفر پوری، مولوی وصی اللہ نیپالی، مولوی باب الدین باندوی، مولوی امداد الاسلام، مولوی نور الدین کبیر نگری، مولوی صنوبر سعید مظفر نگری، مولوی رئیس اعظم چمپارنی، مولوی فاروق احمد کشمیری، مولوی ظہیر احمد سمستی پوری اور مولوی ادریس احمد نیپالی وغیرہ نے تکمیلی مراحل تک پہنچانے میں قابل قدر محنت کی ہے، جب کہ تحقیق ومراجعت اور پروف ریڈنگ مولانا بلال احمد بجنوری اور مولانا مصباح الرحمٰن ڈھکوی نے کی ہے، مولائے کریم سب کو جزاء خیر عطا فرمائے۔

انسان خطاء ونسیان کا پتلا ہے جس کے باعث شرح میں یقیناً تسامحات ہوں گے اس لئے اہل علم سے درخواست ہے کہ وہ از راہِ عنایت ان کی نشاندہی فرمادیں، انشاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح کردی جائے گی، جبکہ حدیث کے طالبین سے قوی امید ہے کہ وہ اگر اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں تو مؤلف، اس کے والدین، عزیز واقارب، اور اس کے اساتذہ کے حق میں حیاً دین کی خدمت، توفیق ارزانی، حسن خاتمہ اور میتاً مغفرت ورفع درجات کی ضرور دعاء فرمائیں یہ مجھ پر ان کا ایک ذاتی احسان ہوگا۔ والسلام

اسعد قاسم سنبھلی

جامعہ شاہ ولی اللہ مرادآباد

نام ونسب

آپ کا نام محمد بن یزید بن عبداللہ، عرف ابن ماجہ اور کنیت ابوعبداللہ ہے، امام عجمی نژاد ہیں؛ لیکن قبیلہ ربیعہ سے ان کا موالات کا رشتہ تھا، اس لئے انہیں ربعی کہا جاتا ہے، جیسا کہ امام بخاری جعفی سے مشہور ہیں، ماجہ فارسی لفظ ماہ یا بچہ کا معرب ہے، محدثین سے اس کی بابت چار قول مروی ہیں:

۱۔ ماجہ امام کے دادا کا نام ہے، یہ ضعیف تر قول ہے۔

۲۔ ماجہ امام کی والدہ کا نام ہے، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے **بستان المحدثین** (۱۱۲) میں اور نواب صدیق حسن خاں بھوپالی نے **الحطة فی ذکر الصحاح الستة** (۱۱۸) میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

۳۔ ماجہ امام کے دادا کا لقب ہے۔

۴۔ ماجہ امام کے والد کا عرف ولقب ہے، امام نووی نے **تهذیب الاسماء واللغات** میں، محدث رافعی نے تاریخ قزوین (۱/۱۰۸) میں، ابن کثیر نے **البداية والنهاية** (۲/۵۲) میں، کمال الدین دمیری نے الدیباجہ فی شرح سنن ابن ماجہ (۱/۴) میں، علامہ سندھی نے **كفاية الحاجة** (۱/۱) میں، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے عجالہ نافعہ (۲۸) میں اور مجدالدین فیروز آبادی نے قاموس میں یہی صراحت کی ہے، خود قزوین کے مؤرخ ابویعلی خلیلی اور امام کے مشہور شاگرد اور ان کی سنن کے مستند راوی ابوالحسن قطان کا بھی یہی خیال ہے، اس لئے پہلے تینوں اقوال کی بنسبت یہ چوتھا قول زیادہ راجح ہے، اس لئے محمد بن یزید کے بعد ابن ماجہ الف کے ساتھ لکھنا چاہئے؛ کیونکہ وہ یزید کی نہیں محمد کی صفت ہے۔

ولادت

ابن خلکان نے **وفيات الاعيان** (۲/۲۸۴) میں، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے **بستان المحدثين** (۱۱۲) میں اور محمد بن طاہر نے **شروط الائمة الستة** (۹) میں لکھا ہے

کہ خود اپنے بیان کے مطابق ابن ماجہ کا سن ولادت ۲۰۹ھ ہے، وہ قزوین میں پیدا ہوئے جو زمانہ قدیم میں عراق کا؛ لیکن موجودہ دور میں سوویت یونین سے الگ ہونے والی ریاست آذر بائیجان کا شہر ہے جو معروف مقام رَے سے ۲۷ اور ابہر سے ۱۲ فرسخ کی دوری پر واقع ہے، ۲۴ھ میں حضرت عثمان نے جب براء بن عازبؓ کو رَے کا والی مقرر کیا تو انہوں نے پہلے ابہر پھر قزوین کو فتح کیا اور یہ مقام جلد ہی علمی دنیا کا ایسا زرخیز خطہ ثابت ہوا جس نے علی بن محمد ابوالحسن طنافسی (م۲۳۳ھ) عمرو بن رافع، ابوحجر بجلی (م۲۳۷ھ) اسمٰعیل بن ابوسہل قزوینی (م۲۴۷ھ) ہارون بن موسیٰ تمیمی (۲۴۸ھ) محمد بن ابی خالد قزوینی اور محمد بن سعید جیسے نابغۂ روزگار محدثین کو جنم دیا۔

تعلیمی اسفار

مؤرخین کی تصریح کے مطابق ۲۱/۲۲ سال تک آپ نے وطن میں رہ کر مندرجہ بالا اہل علم سے استفادہ کیا پھر دستور زمانہ کے مطابق حدیث کی تلاش میں مختلف شہروں وملکوں کا سفر کیا، مؤرخ ابن خلکان نے **وفیات الاعیان** میں اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے **تہذیب التھذیب** میں عراق، کوفہ، بصرہ، بغداد، حجاز، شام، مصر، رَے اور مکہ مکرمہ وغیرہ کے سفر کی نشاندہی کی ہے، اندازہ ہی نہیں یقین ہے کہ انہوں نے اس سے کہیں زیادہ اسفار کیے ہیں، آپ کے سلسلہ روایت کے تنوع سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے۔

اساتذہ

اساتذہ کی فہرست بہت طویل ہے جن میں ابوبکر بن ابی شیبہ (م۲۳۵ھ) ابوزرعہ رازی (م۲۶۴ھ) ابراہیم بن منذر جذامی (م۲۳۶ھ) داؤد بن رشید (م۲۳۹ھ) جبارہ بن مغلس (م۲۴۱ھ) حافظ ابوبکر بن ابی الدنیا بغدادی (م) عبداللہ بن معاویہ (م۲۴۳ھ) ہشام بن عمار (م۲۴۵ھ) محمد بن رمح (م۲۴۲ھ) محمد بن عبداللہ بن نمیر (م۲۳۴ھ) یونس بن عبدالاعلیٰ (م۲۴۳ھ) ہشام بن عبدالملک باہلی (م۲۲۷ھ) سوید بن سعید ہروی (م۲۴۰ھ) ابوطاہر بن سرح مصری (م۲۵۵ھ) اور ابوخیثمہ بغدادی (م۲۳۴ھ) خاص طور پر قابل ذکر

ہیں، شیوخ کی مکمل تفصیل کے لئے حافظ ابوالقاسم علی بن حسن (م ۵۷۱ھ) کا رسالہ ملاحظہ ہو، جس میں موصوف نے ائمہ ستہ کے اساتذہ کا بالاستیعاب تذکرہ کیا ہے۔

ثناء ومنقبت

صالح فطرت، مثالی صلاحیت، محنت ولگن، علمی اسفار اور بلند پایہ محدثین کی صحبت کی بدولت امام ابن ماجہ نے علم وفضل میں ایسا امتیاز وکمال حاصل کیا کہ ان کی علمی جلالت کا دنیا پر سکہ بیٹھ گیا اور بڑے بڑے علماء ان کی تعریف ومنقبت پر مجبور ہوئے، چنانچہ مؤرخ ابن خلکان نے ان کے بارے میں وفیات الاعیان (۳۰۸/۳) میں، کان اماماً فی الحدیث عارفاً بعلومه وجمیع ما یتعلق به ، حافظ ابن کثیر نے البدایة والنهایة (۵۲/۱۱) میں، هو صاحب کتاب السنن المشهورة وهی دالة علی عمله وعلمه وتبحّره واطلاعه واتباعه السنة فی الاصول والفروع، ابن الاثیر نے الکامل (۱۵۲/۷) میں، کان عاقلاً اماماً عالماً، رافعی نے تاریخ قزوین (۱۰۸/۱) میں، هو امام من ائمة المسلمین کبیرٌ متفق مقبول بالاتفاق حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں کان ابن ماجة حافظاً صدوقاً واسع العلم، ابویعلیٰ خلیلی نے ابن ماجة ثقة کبیر متفق علیه محتج به لهٗ معرفة وحفظ[1]۔ اور حافظ ابن حجر نے احد الائمة حافظ[2] کی تصریح کی ہے، اس کے علاوہ ابن الجوزی، جمال الدین تغری، ابن ناصر الدین اور یاقوت حموی جیسے حضرات سے بھی ان کی مدح منقول ہے۔

تلامذہ

امام کے مکمل حالات پردہ خفاء میں ہیں، اور دوسرے ائمہ کی طرح ان کی سوانح حیات کی تفصیل نہیں ملتی، محمد بن طاہر نے شروط الائمة الستة (۹) میں تجہیز وتکفین کے ضمن میں ایک صاحبزادہ عبداللہ اور دو بھائی ابوبکر وابوعبداللہ کا تذکرہ کیا ہے، جبکہ اساتذہ کی طرح ان کے شاگردوں کی فہرست بھی طویل ہے، جن میں ابوالحسن علی بن ابراہیم قطان، سلیمان بن یزید

[1] تہذیب التہذیب ج ۳، ص ۵۳۱ [2] محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے، ص ۲۴۲

قزوینی ابوجعفر محمد بن عیسیٰ مطوعی، ابوبکر حامد ابہری، احمد بن روح بغدادی شعرانی، محمد بن عیسیٰ صغار، ابراہیم بن دینار ہمدانی، جعفر بن ادریس، حسین بن علی اور قزوین کے مشہور مؤرخ ابویعلیٰ خلیلی کے دادا احمد بن ابراہیم زیادہ مشہور ہیں۔

فقہی مسلک

محدثین عموماً مجتہد منتسب ہیں یعنی اصول میں وہ ائمہ اربعہ میں سے کسی کے پابند ہیں لیکن فروع میں اجتہاد کرتے ہیں، علامہ ابن طاہر الجزائری نے توجیہ النظر (۱۸۵) میں لکھا ہے کہ ابن ماجہ اور ان کے علاوہ دوسرے محدثین ائمہ مجتہدین میں سے کسی کے بالکلیہ مقلد نہیں تھے، صرف اہل عراق کی بنسبت اہل حجاز یعنی شافعی، احمد، اسحاق اور ابوعبیدہ کی جانب زیادہ مائل تھے، اسی لئے حضرت شاہ ولی اللہ نے امام ابن ماجہ کے حنبلی ہونے کا خیال ظاہر کیا ہے۔ (الانصاف) شیخ الاسلام حضرت کشمیریؒ کا کہنا ہے **لعله شافعي** (معارف السنن:۲۲/۱) غالباً وہ شافعی ہیں۔

وفات

حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی لکھتے ہیں کہ میں نے قزوین میں امام ابن ماجہ کی تاریخ کا ایک نسخہ دیکھا جو عہد صحابہ سے لیکر ان کے زمانہ تک کے رجال امصار پر مشتمل تھا، اس کے آخر میں ابن ماجہ کے شاگرد جعفر بن ادریس کی یہ تحریر ملی کہ ابوعبداللہ محمد بن یزید نے دوشنبہ کے دن انتقال فرمایا، غسل محمد بن علی قہرمان اور ابراہیم بن دینار وڑاق نے دیا، اور سہ شنبہ ۲۲ر رمضان ۲۷۳ھ کی بھی ہے، علماء اور شعراء میں ان کے سانحۂ وفات پر دلدوز مرثیے کہے، محمد بن اسود قزوینی کے مرثیے کا پہلا شعر یہ تھا:

لقد اوهى دعائم عرش علم
وضعضع ركنه فقد ابن ماجة

یعنی ابن ماجہ کی وفات نے علم کے پایۂ تخت کے ستون اور اس کی قوت وشوکت کو ڈھا دیا، دوسرے شاعر یحییٰ بن زکریا طائفی نے کہا:

ایا قبر ابن ماجة غثت، قطرا
ملثنا بالغداة وبالعشی

یعنی اے ابن ماجہ کی قبر! تو صبح وشام بارانِ رحمت سے سیراب ہو، یا شعر کی زبان میں اس کا ترجمہ یہ ہوگا: ؎

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

یہ تمام اشعار حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب (۵۳۱/۹) میں نقل کئے ہیں۔

تصنیفات

امام ابن ماجہ مختلف صلاحیتوں کے آدمی تھے، اس لئے انہوں نے تصانیف بھی مختلف موضوعات پر کی ہیں، مؤرخین نے ان کی بہت سی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے؛ لیکن سب سے زیادہ مشہور تین تصانیف ہیں، پہلی تفسیر ہے جس کو ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ (۵۲/۱۱) میں تفسیر حافل اور سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن (۱۹۰/۲) میں اس کو ابن جریر کے طرز کی تفسیر قرار دیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک منقول وماثوری تفسیر تھی جس میں احادیث وآثار صحابہ وتابعین کو سند کے ساتھ نقل کیا گیا تھا، حافظ مزی نے تہذیب الکمال (۱۵۰/۱) میں لکھا ہے کہ مجھے ابن ماجہ کی تفسیر کے بس دو منتخب اجزاء ہی مل سکے۔

دوسری تاریخ ہے ابن خلکان نے اپنی تاریخ (۲۸۴/۲) میں اسے تاریخ ملیح اور حافظ ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ (۵۲/۱۱) میں تاریخ کامل کے نام سے یاد کیا ہے، حافظ ابوالفضل مقدسی نے بھی شروط الائمة الستة (۱۶) میں اسی طرح کا تبصرہ کیا ہے، حافظ ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ میں نے قزوین میں ابن ماجہ کی تاریخ دیکھی یہ عہد صحابہ سے لیکر مصنف کے زمانے تک تمام بلاد اسلامیہ اور راویانِ حدیث کے حالات پر مشتمل تھی، افسوس کہ آج اس کا کہیں پتہ نہیں۔

تعارف سنن ابن ماجہ

ان کی تیسری تصنیف ''سنن'' ہے، حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ ۲/۲۱۰) میں لکھا ہے کہ اس میں بتیس کتابیں، پندرہ سو (۱۵۰۰) ابواب اور چار ہزار تین سو اکتالیس (۴۳۴۱) احادیث ہیں، تین ہزار دو (۳۰۰۲) کتب خمسہ میں بھی موجود ہیں جبکہ تیرہ سو انتالیس (۱۳۳۹) احادیث میں وہ منفرد ہیں، ان میں چار سو اٹھائیس (۴۲۸) کو محمد فواد عبدالباقی نے رجالھا ثقات صحیحة الاسناد، ایک سو ننانوے (۱۹۹) کو احادیث حسنة الاسناد، چھ سو تیرہ (۶۱۳) کو احادیث ضعیفة الاسناد اور ننانوے (۹۹) کو احادیث واھیة الاسناد او منکرة او مکذوبة قرار دیا ہے، رافعی کے قول کے مطابق اس کے چار راوی زیادہ مشہور ہیں: ۱ ابوالحسن قطان ۲ سلیمان بن یزید ۳ ابوجعفر محمد بن عیسٰی ۴ ابوبکر حامد ابہری، حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب (۵۳۲/۹) میں دو ناموں کا اور اضافہ کیا ہے: ۱ سعدون ۲ ابراہیم بن دینار، ان میں سب سے زیادہ ابوالحسن قطان کی روایت کو شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، ان کے نسخے میں خود ان کی سند سے بھی بہت سی روایتیں منقول ہیں۔

خصوصیات

سنن ابن ماجہ ممتاز خصوصیات کی حامل کتاب ہے، فقہی اعتبار سے اس کی ترتیب وتبویب نہایت عمدہ ہے، عدم تکرار اور اختصار کو انہوں نے ہر قدم پر ملحوظ رکھا ہے اور اس وصف میں جامع ترمذی کی طرح یہ سنن بھی معروف ہے، اس میں ایسی نادر احادیث بھی ملتی ہیں جن سے صحاح خمسہ خالی ہیں، وہ مختصر ہونے کے ساتھ نہایت جامع بھی ہے، امام نے بعض احادیث کے متعلق مختلف وضاحتیں فرمائی ہیں، مثلاً باب کل مسکر حرام کے تحت دو روایتوں کو نقل کرنے کے بعد پہلی کے بارے میں لکھتے ہیں: ھذا حدیث المصریین اسی طرح انہوں نے دوسری کی بابت ھذا حدیث الرقیین کی وضاحت فرمائی ہے۔

ثلاثیات

سنن ابن ماجہ میں پانچ ثلاثیات بھی ہیں جو امام بخاری کو چھوڑ کر صرف انہی کا امتیاز ہے،

وہ یہ ہیں:

۱؎ حدثنا جَبارةُ بنُ المُغَلِّسِ ثنا كثيرُ بنُ سُليمٍ سمعتُ انسَ بنَ مالكٍ يَقول قال رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم مَن اَحَبَّ اَن يُكثِر اللّٰهُ خيرَ بيتِهٖ فَلْيَتَوَضَّأ اِذا حضَرَ غَدائُه وَاِذا رُفع (باب الوضو عند الطعام)

۲؎ حدثنا جبارةُ بنُ المُغَلِّسِ ثنا كثيرُ بنُ سُليمٍ عن انسِ بنِ مالكٍ قال ما رُفع مِن بينِ يديِ رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فضلُ شِواءٍ قط ولا حُملت معه طَنْفَسَةٌ (كتاب الأطعمة باب الشواء)

۳؎ حدثنا جبارةُ بنُ المُغلِّس ثنا كثيرُ بنُ سُليمٍ عن انسِ بنِ مالكٍ قال قال رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم الخير اسرع الى البيت الذى يغشى من الشفرة الى سنام البعير (كتاب الأطعمة باب الضيافة)

۴؎ حدثنا جبارةُ بنُ المُغَلِّسِ ثنا كثيرُ بنُ سُليمٍ سمعتُ انسَ بنَ مالكٍ يقول قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ما مَررتُ بليلةٍ اُسرى بِى بمَلاءٍ الا قالوا يا محمدُ مُر اُمتَكَ بالحَجَامَةِ (ابواب الطب، باب الحجامة)

۵؎ حدثنا جبارةُ بنُ المُغَلِّسِ ثنا كثيرُ بنُ سُليمٍ عن انسِ بنِ مالكٍ قال قال رسول اللّٰه ان هذه الامة مرحومة عذابها بايديها فاذا كان يوم القيامة دُفِعَ اِلى كلِ رجلٍ منَ المسلمين رجلاً مِنَ المشركين فيُقالُ هذهٖ فِدائُكَ مِنَ النَارِ (ابواب الزهد ، باب صفة امة محمد صلى اللّٰه عليه وسلم)

ثلاثیات کی تعداد صحیح بخاری میں ۲۲ اور سنن ابی داؤد و جامع ترمذی میں ایک ایک ہے، صحیح مسلم اور سنن نسائی اس صنف سے یکسر خالی ہیں، اور ان کی سب سے عالی روایتیں رباعیات ہیں، جو سنن ابن ماجہ میں بکثرت موجود ہیں، اس لئے پانچ ثلاثیات کا ہونا فخر و امتیاز تو ضرور ہے؛ لیکن محدثین کے نزدیک ابن ماجہ کے اس کارنامے کا کوئی خاص وزن نہیں ہے کیونکہ یہ سند کمزور ہے، اور ائمہ جرح و تعدیل نے کثیر بن سلیم پر سخت تنقید کی ہے۔

ضعیف روایات

صحیحین کو چھوڑ کر سنن اربعہ میں جہاں صحیح روایات بڑی تعداد میں موجود ہیں وہیں ایک معمولی تعداد کمزور احادیث کی بھی ہے، یہ سب سے کم نسائی میں اس سے زیادہ ابوداؤد میں اس سے زیادہ ترمذی میں اور سب سے زیادہ ابن ماجہ میں پائی جاتی ہیں، حافظ ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ: (۱۱/۵۵) میں لکھا ہے کلها جيادٌ سوى اليسرة یعنی چند کو چھوڑ کر سب عمدہ ہیں، علامہ ذہبی تذکرۃ الحفاظ (۲/۱۸۹) میں فرماتے ہیں کہ سنن ابن ماجہ بہت اچھی کتاب ہے، کاش اس میں چند واہی حدیثیں نہ ہوتیں، جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے سنن ابی عبداللّٰہ كتاب حسن لو لا ما كدره احاديث واهية ليست بالكثيرة حافظ ابوزرعہ سے دو قول مروی ہیں: ایک دس کا اور دوسرا تیس کا، پہلے کو حافظ ابوالفضل مقدسی نے شروط الائمۃ الستۃ (۱۶) میں، اور دوسرے کو ذہبی نے (الیانع الجنی ۵۷) میں نقل کیا ہے پھر فرماتے ہیں ۳۰ سے فراد غالبا ساقط الاعتبار روائتیں ہیں ورنہ جن حدیثوں سے حجت قائم نہیں ہوتی، ان کی تعداد تو بہت زیادہ بلکہ ایک ہزار تک ہے، سیوطی نے بھی حاشیہ نسائی میں یہی تصریح کی ہے۔

موضوعات

ضعیف کے بعد دوسری بحث موضوعات کی ہے، ان کی تعداد ابن الجوزی نے ۳۴، سیوطی نے ۲۲، اور مولانا محمد تقی عثمانی نے ۱۹ بتائی ہے، مکمل تفصیل کے لئے سیوطی کی التعقبات علی الموضوعات اور حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی مرحوم کی ما تمس اليه الحاجة لمن يطالع سنن ابن ماجة ملاحظہ ہو، دونوں نے ان روایات پر کھل کر بحث کی ہے جنہیں ابن الجوزی نے موضوع قرار دیا ہے؛ اس کے علاوہ انہوں نے سنن ابی داؤد کی ۹، اور جامع ترمذی کی ۳۰/احادیث کو وضعی کہا ہے؛ لیکن علماء نے ان دونوں کے حق میں یہ بات قبول نہیں کی، اور سیوطی نے ان کا خصوصی تعاقب کیا ہے۔

انفرادیات

اس سلسلے میں ایک بحث یہ بھی ہے کہ ابن ماجہ کی ان روایتوں کا کیا درجہ ہے، جو صحاح

خمسہ میں نہیں پائی جاتیں، حافظ مزّی (م۷۴۲) کا ایک جملہ مشہور ہے کل ما أنفرد به ابن ماجة فهو ضعيف. ظاہر ہے اس طرح تو بہت سی حدیثیں زد میں آجائیں گی، اس لئے حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب (۵۳۱/۹) میں اس کو مطلقاً تسلیم کرنے کے بجائے رجال پر محمول کیا ہے، یعنی جس راوی سے روایت کرنے میں ابن ماجہ تنہا ہیں وہ ضعیف ہے؛ کیونکہ ابن ماجہ کی انفرادیات میں صحیح اور حسن درجہ کی حدیثیں بھی موجود ہیں، جن کی تعداد فواد عبدالباقی کے نزدیک ۶۲۷ ہے، یہی رائے علامہ سندھی کی بھی ہے؛ لیکن حضرت مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی رحمہ اللہ علیہ کو یہ بھی تسلیم نہیں ان کے نزدیک مزی کے قول کو رجال پر بھی محمول نہیں کیا جاسکتا، مولانا نے اپنی کتاب ''ابن ماجہ اور علم حدیث'' میں اس کی مثالیں دی ہیں، اس لئے انفرادیات ابن ماجہ پر علی الاطلاق ضعف کا حکم لگانا صحیح نہیں۔

ابن ماجہ کی صحاح میں شمولیت

حافظ ابن السکن نے صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن نسائی اور سنن ابی داوٗد کو اسلام کی چار بنیادی کتابیں قرار دیا اور حافظ ابن مندہ نے بھی مخرجین صحاح کے ذیل میں ان ہی حضرات کے تذکرہ پر اکتفا کیا، اس کے بعد حافظ ابو طاہر سلفی نے جامع ترمذی کو بھی شامل کر کے فرمایا کہ ان پانچ کتابوں کی صحت پر مشرق ومغرب کے علماء کا اتفاق ہے، چنانچہ ابن صلاح (م۶۴۲ھ) اور امام نوویؒ (م۶۷۶ھ) نے ائمہ خمسہ کے سن وفات کو بیان کیا، اور ابن ماجہ کو یکسر نظر انداز کر دیا، سیوطی نے تدریب الراوی (۳۰) میں اس عمل پر حیرت ظاہر کی ہے، فرماتے ہیں لَمْ يُدخِلِ المُصنفُ سُنَنَ ابنِ مَاجَةَ فِي الأُصُولِ وَقَد اِشتَهَرَ فِي عَصرِ المُصنفِ وبَعدَه جُعلَ الاصولُ ستةً بِادخالِهِ فِيهَا یعنی نووی نے ابن ماجہ کو بنیادی کتابوں میں داخل نہیں کیا؛ حالانکہ خود مصنف کے عہد اور ان کے بعد اس کا شمار چھ کتابوں میں مشہور ہو چکا تھا، سب سے پہلے محمد بن طاہر مقدسی (م۵۰۷) نے ''شروط الائمة الستة'' اور ''اطراف الكتب الستة'' میں ابن ماجہ کو صحاح کے زمرے میں شامل کیا، اور ان کے بعد حافظ عبدالغنی مقدسی (م۶۰۰ھ) نے الاكمال فی اسماء الرجال میں ائمہ خمسہ کے ساتھ ابن ماجہ کے رجال کو بھی مدون کیا، ابن کثیر، ابوالقاسم، رافعی، حافظ سخاوی، عبدالقادر قرشی، ابن خلکان، علامہ

سندھی، شاہ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ عبدالعزیز دہلوی اور عام محدثین کی یہی رائے ہے، اس لئے اب رواه الجماعة کا مصداق بخاری و مسلم، نسائی، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ ہیں، جبکہ رواه الأربعة سے مراد شیخین کو چھوڑ کر بقیہ اصحاب سنن ہیں۔

اس ضمن میں دوسری رائے محدث رزین بن معاویہ عبدری (م ۵۲۵) کی ہے، یہ بھی حافظ ابوالفضل مقدسی کے معاصر ہیں، انہوں نے اپنی کتاب "كتاب التجريد للصحاح والسنن" میں ابن ماجہ کے بجائے کتب خمسہ کے ساتھ مؤطاء امام مالک کی حدیثوں کو درج کیا ہے، ان کے بعد ابن الاثیر جزری (م ۶۰۶ ھ) نے جامع الاصول میں یہی ترتیب قائم رکھی، اور ابن ماجہ کی احادیث نہیں لکھیں، حافظ ابوجعفر بن زبیر غرناطی، حضرت شاہ ولی اللہ، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی، اور بعض دوسرے مغاربہ کی بھی یہی رائے ہے، اس میں تو شک نہیں کہ قوت وصحت میں مؤطاء نہ صرف ابن ماجہ پر؛ بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک صحیحین پر بھی مقدم ہے؛ لیکن ابن ماجہ کو صحاح میں اس لئے شامل کیا جاتا ہے کہ اس میں کتب خمسہ سے الگ بھی بہت ساری روایات ہیں، جبکہ موطاء امام مالک اس صفت سے خالی ہے۔

تیسری رائے حافظ صلاح الدین خلیل علائی (م ۷۶۱ ھ) کی ہے، انہوں نے سب سے پہلے مؤطا امام مالک اور سنن ابن ماجہ کو چھوڑ کر سنن دارمی کو چھٹی کتاب قرار دیا، ان کے قول کی بنیاد علاء الدین مغلطائی کی رائے پر ہے، ابن حجر نے تنقید کر کے اسے علائی کا تفرد قرار دیا ہے، جبکہ محمد امیر یمانی کا کہنا ہے کہ انہیں مغلطائی کے قول سے دھوکہ ہوا ہے، جس میں یہ احتمال پوری طرح موجود ہے کہ انہوں نے بعض خصوصیات کی وجہ سے سنن دارمی کو ابن ماجہ سے اہم تو ضرور قرار دیا ہے؛ لیکن اس سے مراد ان کے نزدیک وہ چھٹی کتاب نہیں ہے۔

یہ اختلافات محض تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں، جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے تو آٹھویں صدی ہجری سے پندرہویں صدی تک سنن ابن ماجہ ہی صحاح کا جز ہے، اور اب اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ہاں مقام ومرتبہ میں وہ سب سے کمتر ہے، اور صحاح کی محققین کے نزدیک ترتیب اس طرح ہے: ۱۔ صحیح بخاری ۲۔ صحیح مسلم ۳۔ سنن نسائی ۴۔ سنن ابی داؤد ۵۔ جامع ترمذی ۶۔ سنن ابن ماجہ۔

شروح وحواشی

سنن ابن ماجہ محدثین کے نزدیک کافی اہمیت کی حامل رہی ہے اور انہوں نے اسے ہر دور میں مفید حواشی اور علمی تعلیقات سے سجایا ہے تاریخ اس سلسلے میں ہمیں ۲۵ شروح کا پتہ دیتی ہے، ذیل میں وہ مختصر تعارف کے ساتھ درج کی جاتی ہیں:

(۱) **الاعلام بسنته عليه السلام** یہ ابن ماجہ کی سب سے پہلی شرح ہے جسے حافظ علاؤالدین مغلطائی نے تصنیف کیا ہے، ان کا ارادہ ایک مفصل وجامع شرح لکھنے کا تھا؛ مگر اس کی تکمیل نہ ہوسکی، مولانا بدر عالم میرٹھی نے فیض الباری کے حاشیہ میں مولانا عبدالعزیز کاملپوری کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ ۲۰ جلدوں میں تھی جبکہ ملا کاتب چلپی (:۱۰۶۷ھ) نے کشف الظنون (۳۴/۲) میں اور مولانا عبدالرشید نعمانی (م۱۴۲۰) نے امام ابن ماجہ اور علم حدیث (۲۴۵) میں ۵ جلدوں کی صراحت کی ہے فی الحال اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ ٹونک میں موجود ہے، راقم نے عظیم آباد پٹنہ کی خدابخش لائبریری میں بھی اس کا مخطوطہ دیکھا ہے، شارح کا انتقال ۷۶۲ھ میں ہوا۔

(۲) **شرح ابن ماجة:** یہ محمد بن رجب زبیری شافعی کی تصنیف ہے اور وہ ابن تیمیہ کے مشہور شاگرد ومصنف سے الگ بعد کی کوئی دوسری شخصیت ہیں جن کی تاریخ ولادت سخاوی نے "الضوء اللامع لاهل القرن التاسع" میں ۸۴۶ھ لکھی ہے اور ۸۷۸ھ میں انھوں نے حج کیا ہے، ابوالحسن سندھی نے اپنے حواشی میں اور مولانا عبدالرشید نعمانی نے ابن ماجہ اور علم حدیث میں ان کی شرح کا تذکرہ کیا ہے۔

(۳) **الديباجة في شرح سنن ابن ماجة:** یہ شیخ کمال الدین محمد بن موسیٰ دمیری کی تالیف ہے، جو مشہور کتاب حیاۃ الحیوان کے بھی مصنف ہے، اس کی ۵ جلدیں ہیں؛ لیکن تبییض سے پہلے ہی مصنف کا انتقال ہوگیا، علامہ شوکانی نے "البدر الطالع" میں سن ولادت ۷۴۲ ہجری اور سن وفات ۳ رجمادی الاولیٰ ۸۰۸ ہجری لکھا ہے۔

(۴) **ما تمس إليه الحاجة على سنن ابن ماجة:** اس کے مصنف شیخ سراج الدین عمر بن علی بن الملقن ہیں علامہ شوکانی نے "البدر الطالع" میں ان کا سن ولادت ربیع

الاول ۷۲۳ھ اور سن وفات ۱۶/ ربیع الاول ۸۰۴ھ بروز جمعہ لکھا ہے، شرح ۸ جلدوں میں ہے اور صرف ان روایات کی ہے جو کتب خمسہ میں موجود نہیں ہیں، مصنف نے اپنی وفات سے ذرا پہلے یعنی ۸۰۰ ہجری میں اس کی تصنیف کی ہے۔

(۵) **مصباح الزجاجة فی زوائد ابن ماجة:** یہ شہاب الدین احمد بن ابی بکر بن اسماعیل بوصیری کی تالیف ہے، جس میں انفرادیات ابن ماجہ میں سے ہر روایت کی سند کا ضعف اور اس کی قوت کو واضح کیا گیا ہے، کتاب عرصے سے ناپید ہے؛ لیکن علامہ سندھی نے سنن مصطفیٰ میں اس کی اہم اور ضروری باتیں نقل کردی ہیں، مصنف محرم ۷۶۲ ہجری میں پیدا ہوئے اور محرم ۸۴۰ میں انہوں نے انتقال فرمایا، سخاوی نے "الضوء اللامع" میں ان کی مزید کتابوں کا پتہ دیا ہے۔

(۶) **مصباح الزجاجة علی ابن ماجة:** حافظ جلال الدین سیوطی کا مختصر اور مقبول حاشیہ ہے جو سنن کے ساتھ بھی طبع ہوا ہے۔ مصنف یکم رجب ۸۴۹ھ کو پیدا ہوئے اور ۱۹/ جمادی الاولیٰ ۹۱۱ھ کو جمعہ کے دن بوقت سحر انتقال فرمایا۔

(۷) **نور مصباح الزجاجة:** شیخ علی بن سلیمان مالکی مغربی نے علامہ جلال الدین سیوطی کے حاشیے کا اختصار کیا ہے، اور مصر سے وہ شائع بھی ہو چکا ہے۔

(۸) **سنن مصطفیٰ:** یہ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی حنفی سندھی کا حاشیہ ہے جس میں مشکل وغریب الفاظ اور اعراب کی وضاحت کا اہتمام کیا گیا ہے، مصنف کا انتقال ۱۰۳۸ھ میں مدینہ منورہ میں ہوا، مسجد نبوی میں جنازہ پڑھ کر انہیں بقیع میں دفن کیا گیا۔

(۹) **شرح سنن ابن ماجہ:** یہ ابن سبط عجمی برہان الدین ابراہیم بن محمد حلوی کی ایک لطیف تعلیق ہے، مصنف کا انتقال ۸۴۱ھ میں ہوا۔

(۱۰) **ماتدعو الیه الحاجة علی سنن ابن ماجة:** شمس الدین ابورضی محمد بن حسن زبیدی شافعی اس کے مصنف ہیں۔

(۱۱) **زوائد ابن ماجة علی الکتب الخمسة:** یہ نور الدین ابن حجر ہیثمی کی تالیف ہے، انتقال ۸۰۷ھ میں ہوا۔

(۱۲) **مفتاح الحاجة بشرح سنن ابن ماجة:** شیخ محمد علوی کا حاشیہ ہے اصح المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا۔ ۱۰ رجمادی الاولیٰ ۱۳۰۹ھ کو جمعہ بعد لکھنا شروع کیا اور جمادی الاولیٰ ۱۳۱۲ھ بعد نماز جمعہ اس کی تکمیل ہوئی، مصنف کا انتقال ۱۳۶۶ھ میں حیدر آباد میں ہوا، مذہباً یہ اہل حدیث تھے اور ان کے کچھ تفردات بھی ہیں۔

(۱۳) **شرح انجاح الحاجة:** شیخ عبدالغنی مجددی دہلوی کی محققانہ تعلیق ہے، سنن کے ساتھ دہلی سے شائع ہو چکی ہے، مصنف شعبان ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۶ رمحرم ۱۲۹۶ھ کو انتقال ہوا۔

(۱۴) **حاشیہ برسنن ابن ماجة:** یہ مولانا فخر الحسن گنگوہی کا حاشیہ ہے جس میں انہوں نے اپنے افادات اور مرقاۃ المفاتیح کے ساتھ شرح میں سیوطی اور مجددی کے حاشیے کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے، موجودہ نسخوں پر وہ چھپا ہوا ہے۔

(۱۵) **رفع العجاجة عن سنن ابن ماجة:** مشہور اہل حدیث عالم مولانا وحید الزماں وقار نواز جنگ نے احادیث کا ترجمہ اور اردو میں اس کی مختصر شرح کی ہے، جو ۳ جلدوں پر مشتمل ہے، مطبع صدیقی لاہور سے ۱۳۱۰ھ میں شائع ہوئی، مصنف کی ولادت ۱۲۵۸ھ اور انتقال ۱۳۳۸ھ میں ہوا۔

(۱۶) **المجرد فی اسماء رجال ابن ماجة:** حافظ ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے اس میں ابن ماجہ کے ان رواۃ کا تذکرہ کیا ہے، جن سے صحیحین میں کوئی روایت مروی نہیں، اس کا قلمی نسخہ ۲۰ ورق پر مشتمل دمشق کے کتب خانہ ظاہریہ میں موجود ہے۔

(۱۷) **مشکل ابن ماجة:** یہ مولانا احسن نانوتوی کی فارسی تالیف ہے جس میں انہوں نے غالباً مشکلات ابن ماجہ کی شرح کی ہے۔

(۱۸) **ما تمس الیه الحاجة لمن یطالع سنن ابن ماجة:** یہ مولانا عبدالرشید نعمانی پاکستانی کی تالیف ہے جس میں انہوں نے قرونِ اولیٰ میں تدوین حدیث، ابن ماجہ کے حالات وسوانح، ابن الجوزی کی موضوعات ابن ماجہ پر تبصرہ، سنن کے رواۃ اور اس کی شروحات پر مفصل روشنی ڈالی ہے، ان کی دوسری کتاب اردو میں امام ابن ماجہ اور علم حدیث ہے۔

(۱۹) صحیح لابن ماجه: ناصر الدین البانی (م ۱۴۲۰ھ) نے دو جلدوں میں ابن ماجہ کی تمام صحیح احادیث کو جمع کیا ہے۔

(۲۰) ضعیف لابن ماجه: البانی ہی کی تالیف ہے، ایک جلد پر مشتمل ہے اس میں اپنے نقطہ نظر سے انہوں نے ابن ماجہ کی تمام ضعیف روایات کو جمع کیا ہے، دونوں کتابیں مطبوع وعام ہیں، اوران کی تصحیح وتضعیف سے اختلاف کی گنجائش ہے۔

(۲۱) کشف الحاجة: فضائل الصحابة تک مولانا محمد ساجد صاحب بستوی کی شرح ہے جس میں انہوں نے حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیری دامت برکاتہم کے افادات کو مفید اضافوں کے ساتھ جمع کیا ہے، مطبوع وعام ہے۔

(۲۲) شرح سنن ابن ماجة: مولانا منصور احمد قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم بیدوہ ہگلی مغربی بنگال، اور مولانا ابوالبشر ناظم مدرسہ اسلامیہ شرعیہ سیانی بیناخان ۲۴ پرگنہ، مغربی بنگال کی عربی تالیف ہے، ۱۹۹۰ء میں چھپی ہے، پہلا جز باب التوقی فی الحدیث تک، ۹۸ صفحات پر مشتمل ہے، شرح کا اسلوب یہ ہے کہ پہلے حدیث ذکر کی جاتی ہے، اس کے بعد وہ حضرات محدثین کے متعلقہ افادات کو جمع کرتے ہیں اور بسا اوقات اپنے الفاظ میں خلاصہ بھی پیش کردیتے ہیں اگر یہ سلسلہ مکمل ہوجاتا تو شروحات میں شاید وہ سب سے زیادہ مفید اور جامع ہوتا؛ لیکن کوشش کے باوجود بھی ہمیں اس کے دوسرے اجزاء کی اشاعت کا علم نہ ہوسکا۔

(۲۳) مصباح الزجاجة شرح مشكلات ابن ماجة: یہ راقم السطور کی جانب منسوب ہے، جس میں اس نے امتحان کے سوالات کی روشنی میں شروع سے کتاب الطهارة تک تمام مشکل اور اہم حدیثوں کو حل کیا ہے، موجودہ شروح میں یہی سب سے زیادہ مقبول ومتداول ہے، اور زیر نظر کتاب ضیاء السنن بھی اسی کا نقش دوم ہے۔

(۲۴) الديباجة على ابن ماجة: یہ مولانا لطیف الرحمن خان قاسمی بہرائچی کی تالیف ہے، اس کی طباعت کا اہتمام مولانا ابوالکلام آزاد عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان ٹونک نے کیا ہے، مصنف نے رجال کی نقاب کشائی، حدیث کی تخریج اور اسناد کا درجہ متعین کرنے میں حد درجہ محنت کی ہے، اسی طرح شرح کے ذیل میں انہوں نے ابن حجر،

عینی اور ملاعلی قاری وغیرہ سے استفادہ کیا ہے وہ پہلے حدیث نقل کر کے اس کا اسنادی درجہ متعین کرتے ہیں پھر امہات الکتب کے حوالہ سے رواۃ کا تعارف کرایا جاتا ہے اس کے بعد بڑے مفصل طریقے پر حدیث کی تخریج کی جاتی ہے آخر میں متن کی تشریح ہوتی ہے اور سنداگر ضعیف یا موضوع ہے تو اس پر مصنف کی بحث مزید تحقیقی اور بصیرت افروز ہو جاتی ہے پہلی جلد فضائل صحابہ تک ہے، دوسری اب تک نہیں چھپی، ضیاء السنن کی تالیف میں ہمیں اس شرح سے بہت مدد ملی ہے۔

(۲۵) **تکمیل الحاجة:** مولانا غلام رسول منظور قاسمی کی تالیف ہے جسے انہوں نے محض تین مہینے میں مکمل کیا ہے، کل صفحات ۴۸۵ ہیں اور زکریا بک ڈپو کی جانب سے وہ ماہ صفر ۱۴۲۱ھ میں منظر عام پر آئی ہے یہ کل ۲۵ شروح ہیں جن میں اکثر اب ناپید ہیں اور مؤخر الذکر پانچ شروحات کے علاوہ شیخ عبدالغنی مجددی اور مولانا فخر الحسن گنگوہی کا حاشیہ ہی دستیاب ہے

افتتاح و آغاز

حضرات محدثین اپنی تصنیفات کا آغاز ان ابواب سے کرتے ہیں جو ان کے نزدیک انتہائی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، اس میں کبھی مشرب ومنبع کی جانب اشارے، کبھی ناقلین کی عظمت کا احساس دلانا اور کبھی شرط ومشروط کی تقدیم وتاخیر کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے، اس سلسلے میں کوئی ضابطہ مقرر نہیں؛ بلکہ اپنے ذوق ومزاج کے مطابق ہر مصنف اپنی کتاب کا آغاز کرتا ہے، امام بخاری نے اپنی صحیح کا آغاز باب بدء الوحی سے کر کے اس کی غیر معمولی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے؛ کیونکہ تمام نبوی علوم کا وہی مشرب ومنبع ہے امام مسلم نے **إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ** کے پیش نظر اسناد کی بحث کو مقدم کیا، تاکہ ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جو واسطے اور کڑیاں ہیں ان پر اعتماد قائم ہو جائے، جب کہ

دوسرے اصحاب سنن نے **الشرط یتقدم علی المشروط** کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی کتابوں کا آغاز **کتاب الطھارۃ** سے کیا ہے؛ کیونکہ اعمال وافعال سے ایمان وعقیدے کا پتہ چلتا ہے، ان میں سب سے مقدم نماز ہے اور اس کی ادائیگی کے لئے طہارت شرط ہے۔

امام ابن ماجہ کا افتتاحیہ ان میں سب سے انوکھا ہے، جس میں انہوں نے صراط مستقیم کو شرط اور پورے دین کو مشروط قرار دیکر ابواب واحادیث کی ایسی ترتیب قائم کی ہے جو **ما انا علیہ واصحابی** کی ترجمانی کرتی ہے، بنیادی طور پر ان کے مقدمے کے تین محور ہیں: ۱۔ سنت کی اہمیت وحقیقت۔ ۲۔ صحابہ کی عظمت وثقاہت۔ ۳۔ حاملین علوم نبوت کے ذاتی اوصاف اور ان کو نصیحت ووصیت۔

سنت کی اہمیت وحقیقت

پہلے محور میں امام نے **باب اتباع السنۃ** کو سب سے پہلے قائم کیا؛ کیونکہ وہی ایمان کی بنیاد ہے پھر اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے **باب تعظیم حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والتغلیظ علی من عارضہ** کا مضمون لائے جس سے وہ اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ سنت دین میں حجت ہے اور اس کی ظاہری مخالفت بھی حرمان وخسران کا باعث ہے، جب معاملہ اتنا اہم ہے کہ نجات کا دارومدار بھی اسی پر ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ سنت کی بابت روایت وقبول میں بے احتیاطی ہوجائے اور غیر سنت کو سنت سمجھ لیا جائے، اس لئے تحقیق ضروری ہے اسی پر تنبیہ کے لئے انہوں نے **باب التوقی فی الحدیث** قائم کیا اور ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بھی بتایا کہ احتیاط نہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں کبھی کبھی وہ حدیث گڑھنے کا سبب بن جاتا ہے جس کا نتیجہ بلاشبہ جہنم ہے **باب التغلیظ فی تعمد الکذب** میں یہی اشارہ ہے، اس مقام پر غلط فہمی ہوسکتی تھی کہ خود تو جھوٹ نہ بولے؛ لیکن دوسروں کے جھوٹ کو نقل کردے اس میں کیا جرح ہے؟ امام نے **باب من حدّث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو یری أنہ کذب** لاکر یہ بھی بتادیا کہ موضوعات کو بیان کرنا بھی روایت وضع کرنے ہی کی طرح بدترین جرم ہے، سنت کے مفہوم میں خلفاء راشدین کی سنت بھی شامل ہے، رسول اللہؐ نے اپنے ساتھ ان کی اتباع کا بھی حکم دیا ہے، اس لئے آخر میں **بَابُ اِتباعِ سُنَّۃِ**

الخُلفاءِ الرَّاشِدینَ المَھدِیِّینَ کا ذکر خصوصی ضمیمہ کے طور پر کیا گیا۔

یہاں تک سنت کی تکمیل ہوئی اب اس کے فوراً بعد بدعت وجدال کا تذکرہ چھیڑا، تعرف الاَشیاءُ بِاَضدَادِھَا ، باب اجتناب البدع و الجدل سے وہ یہ اشارہ کرنا بھی چاہتے ہیں کہ بدعت دین میں جھگڑے اور فساد کا باعث ہے اور اس کی بنیاد فاسد رائے اور جاہلانہ قیاس پر ہوتی ہے، باب اجتناب الرأی و القیاس میں یہی اصول مضمر ہے، سنت اور اتباع رسول کے بنیادی مراحل سے گذر کر ہی انسان کا عقیدہ درست اور ایمان معتبر ہوگا باب فی الإیمان اور باب فی القدر لانے کا انکا یہی مقصد ہے۔

صحابہ کی عظمت

یہاں ما أنا علیه کا پہلا محور مکمل ہوا، اب دوسرے محور کے طور پر وہ و أصحابی کا تذکرہ کررہے ہیں، اسی لئے سب سے پہلے فضائل صحابہ کا باب باندھا جس میں یہ اشارہ بھی مضمر ہے کہ رسول کے بعد دین میں دوسرا بڑا درجہ صحابہ کی جماعت کو حاصل ہے، اس لئے اتباع سنت اتباع صحابہ کو بھی لازم ہے، یہ وہ کسوٹی ہے جس سے لوگوں کے دین وایمان کو پرکھا جائے گا اگر وہ اس پر کھرے اترتے ہیں تو ما أنا علیه و اصحابی کی رو سے فرقۂ ناجیہ میں ان کا شمار ہوگا ورنہ پھر ان کا انجام بھی خوارج اور جہمیہ جیسے گمراہ فرقوں کے ساتھ ہوگا، بَابٌ فِی ذِکرِ الخَوَارِجِ اور بَابُ فِیمَا اَنکَرَتِ الجَھمِیۃُ کے ذکر کا یہی مقصد ہے پھر باب من سن سنۃً حسنۃ أو سیئۃً کے ذریعہ امام نے اہل باطل کو تنبیہ اور اہل حق کو خبر دار کیا ہے کہ جو طرح یہ فرقے ڈال رہے ہیں اس پر عمل کرنے والوں کا گناہ بھی قیامت تک انہیں کو ہوگا اور جس سنت کو انہوں نے چھوڑ رکھا ہے اس کو زندہ کرنا بھی بے حد اجر وثواب کا باعث ہے باب من أحیی سنۃ قد أمیتت کو لا کر انہوں نے دوسری شق کو موکد کیا ہے، آخر میں بَابُ فَضلِ مَن تَعلَّمَ القرآنَ و عَلَّمہٗ کا عنوان ہے جس سے وہ یہ اشارہ دینا چاہتے ہیں کہ محور اول سنت رسول قرآن کی عملی تفسیر اور محور ثانی صحابہ کی جماعت، قرآن پر عمل کا نتیجہ ہیں، اس لئے کتاب اللہ کو مضبوطی سے پکڑنا ضروری ہے، ورنہ انسان گمراہیوں کا شکار بن سکتا ہے۔

علماء کے اوصاف

تیسرے محور کو امام ابن ماجہ نے قرآنی تعلیم و تعلم کے فضائل سے شروع کیا، جس کے الفاظ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ قرآن از خود نہیں بلکہ دوسروں سے سیکھا جائے گا، یہ سکھانے والے کون لوگ ہیں؟ **باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم** قائم کر کے انہوں نے اسی سوال کا جواب دیا ہے کہ قرآن کے حامل علماء ہیں اس لئے اس کی تعلیم کا حق بھی صرف انہیں کو پہنچتا ہے، آگے دو قسم کے ابواب ہیں پہلی قسم میں علماء کے فضائل اور دعوت و تبلیغ کے بلند مقام کو انہوں نے **باب فضل العلماء** اور **باب من بلّغ علماً** کے ذریعے ثابت کیا پھر **باب من کان مفتاحاً للخیر** لائے جس سے یہی تاثر ملتا ہے کہ علماء خیر و فلاح کی کنجیاں ہیں، ان کے بغیر ان خزانوں سے اپنے دامن کو نہیں بھرا جا سکتا، اسی لئے **باب ثواب معلم الناس الخیر** میں ان کے حد درجہ ثواب اور بلند مقام کو ذکر کیا ہے، یہ چیز کہیں آزمائش کا باعث نہ بن جائے، اس لئے دوسری قسم میں علماء کو انہوں نے نصیحت کرنا ضروری سمجھا کہ وہ سب سے پہلے **کبر و تعلی سے مکمل** پرہیز کریں اور اس حد تک تواضع و مسکنت برتیں کہ مریدین و محبین کو اپنے **پیچھے نہ چلنے دیں** کیونکہ یہی چیز فخر و عجب پیدا کرتی ہے **بَابُ مَن کَرِہَ اَن یُوطَأ عَقِبَاہ** میں **یہی سبق پوشیدہ ہے**، دوسری نصیحت **بَابُ الوُصاۃِ بِطَلَبَۃِ العِلْمِ** ہے کہ جب لوگ ان کے **پاس دین سیکھنے آئیں** تو ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں، کیونکہ یہی کل کو ان کے وارث اور دین **کے حامل ہوں گے، تیسری نصیحت** انہوں نے **الاِنتِفَاعُ بِالعِلْمِ وَالعَمَلِ بِه** کے ذریعے کی **ہے کہ علم کا اصل مقصد** شریعت پر عمل کرنا ہے، اس لئے علماء کو خود اس صفت کا حامل ہو کر طلبہ اور **دوسرے مسلمانوں** میں عمل کا داعیہ پیدا کرنا ہے ورنہ خالی علم سے تو اللہ کے رسول نے پناہ مانگی **ہے باب من سئل عن علم** کے ذریعے انہوں نے چوتھی نصیحت یہ کی ہے کہ علم دین ایک **امانت ہے** اس کو بے کم و کاست دوسرے لوگوں تک وہ منتقل کر دیں ورنہ قیامت میں آگ کی **لگام پہنائی** جائے گی۔

یہ ہے مقدمہ ابن ماجہ کے ابواب کی ترتیب کا ایک اجمالی مفہوم جو بنیادی طور پر اتباع سنت، اتباع صحابہ اور اتباع علماء ربانیین میں منحصر ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

امام ابن ماجہ نے اپنی سنن کا آغاز صرف بسم اللہ سے کیا ہے اور حمد وصلوٰۃ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، امام بخاری نے اپنی صحیح میں اور امام ترمذی نے اپنی جامع میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے، ان حضرات کا مقصد کل امرٍ ذی بالٍ لم یبدأ فیه ببسم الله فهو أقطع والی حدیث پر عمل کرنا ہے، یہ سنن ابی داؤد، عمل الیوم واللیلة، صحیح ابن حبان اور صحیح ابی عوانہ میں آئی ہے، اس کے بعض طرق میں بسم اللہ، بعض میں ذکر اللہ بعض میں حمد اور بعض میں شہادت کا تذکرہ ہے، غالب گمان یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسم اللہ یا ذکر اللہ کا لفظ استعمال کیا، اور رواۃ نے اسے حمد اور شہادت سے بھی تعبیر کر دیا، اسم وذکر میں حمد وشہادت بھی شامل ہیں، اس لئے ان کو مستقلاً الگ ذکر کرنا ضروری نہیں؛ البتہ مسنون طریقہ یہ ہے کہ خطبوں کا آغاز تو حمد سے کیا جائے اور مکتوبات کی ابتداء بسم اللہ سے ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ تھا؛ چنانچہ تبلیغی دعوت کے لئے آپ نے شاہانِ عالم کو جو خطوط لکھے ہیں ان کے شروع میں بسم اللہ مکتوب ہے اور قرآنِ کریم نے حضرت سلیمانؑ کا بلقیس کے نام جو خط نقل کیا ہے وہ بھی اسی طرح کا ہے؛ لہٰذا بسملۃ کے ذریعہ آغاز کی وجہ سے امام ابن ماجہ پر کوئی اشکال واعتراض نہیں کیا جا سکتا، یہ بعینہٖ سنت کی اتباع ہے۔

باب اتباع سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم

سنت عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی بہت وسیع اور ہمہ گیر ہیں، اس میں مفہوم ومعانی کی دراصل ایک پوری دنیا آباد ہے، یہاں اس سے متعلق چار باتیں سمجھنا ضروری ہے۔ ۱۔ سنت کا لغوی مفہوم۔ ۲۔ سنت کا اصطلاحی مفہوم۔ ۳۔ سنت کی حجیت۔ ۴۔ سنت کی اقسام۔

لغوی مفہوم

سن سنًّا وسنةً نصر کے باب سے آتا ہے، اس کے لغوی معنیٰ ''کوئی نیا طریقہ جاری کرنا'' ہے جس پر بعد میں آنے والے لوگ عمل کریں، ابن دُرید (م ۳۲۱ھ) نے اس کا ترجمہ معروفةٌ [۱] سے، اسماعیل بن حماد جوہری (م ۳۹۳ھ) اور ابوالحسین احمد بن فارس بن زکریا (م ۳۹۵ھ) نے سیرةٌ [۲] سے، اور سید شریف جرجانی نے الطريقةُ مَرضيةٌ كانت أو غيرُ

مرضِیّۃ سے کیا ہے، یعنی عادت، طریقہ، راہ اور ڈگر، قرآن میں یہ لفظ ۱۶ مقام پر آیا ہے، ایک جگہ مطلق ہے جبکہ دوسری تمام جگہوں پر تین مختلف مضاف الیہ کی طرف اس کی اضافت کی گئی ہے، مطلق کی مثال قَد خَلَتْ مِن قَبْلِکُم سنَنٌ فَسِیرُوا فِی الاَرْضِ سورۂ آل عمران کی آیت ہے اور دوسری صورت میں وہ سنة اللّٰه، سنة رسل اور سنة الاولین کے الفاظ میں وارد ہوا ہے، پہلے کی مثال ولن تجد لسنة اللّٰه تبديلاً ہے، قرآن میں ایسی نو نظیریں موجود ہیں، دوسرا لفظ سنة رسل ہے جس کی ایک مثال سنة من قد ارسلنا قبلك من رسلنا سورۂ اسراء میں آئی ہے، جبکہ تیسرے لفظ سنة الاولین کی، وان يعودوا فقد مضت سنة الاولين کی صورت میں پانچ مثالیں ملتی ہیں، سنة اللّٰه کا ترجمہ دستورِ الٰہی، سنت رسل کے معنی سیرت وطریقہ اور سنة الاولین کا مفہوم کبھی تو صلحاء کی روِش، اور بسا اوقات نافرمانوں کا طریقہ ہوتا ہے۔

اصطلاحی مفہوم

یہ سنت کا لغوی مفہوم تھا، اب جہاں تک اس کے اصطلاحی مفہوم کا تعلق ہے تو حسب موضوع فقہ واجتہاد اور حدیث کے طبقوں نے تھوڑے اختلاف کے ساتھ اس کی متعدد تعریفیں کی ہیں، فقہاء کا موضوع کیوں کہ معرفة النفس ما لها وما عليها ہے یعنی فعل اور ترکِ فعل کے لحاظ سے بندے کے افعال سے بحث کرنا اس لئے کبھی تو وہ سنت کو بدعت کی نقیض کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کو سنت کہتے ہیں، جو مستحب ہو واجب یا فرض نہ ہو، جبکہ ائمہ مجتہدین کا مشغلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریعی زندگی کو مرتب کرنا اور ان سے احکام کا استنباط کرنا ہے، اس لئے وہ سنت کی تعریف یوں کرتے ہیں كُلُّ مَا صَدَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غيرَ القرآنِ الكريمِ من قَولٍ أو فِعلٍ أو تقريرٍ محدثین اور اہل سیرت کا مقصد حیات نبوی کو مکمل محفوظ کرنا اور اس کا احاطہ کرنا ہے، اس لئے ان کے نزدیک سنت کی تعریف یہ ہے كُلُّ مَا أُثِرَ عَنِ النبيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسلمَّ مِن قَولٍ أو فِعلٍ أو تَقريرٍ او صفةٍ خِلقيةٍ أو خُلقيةٍ او سيرةٍ سواءٌ كان ذلك قبلَ البِعْثَةِ كتَحَنُّثِه فِي غارِ حراءِ اَم بعدَها والسنةُ بهذا المَعنى مُرادفَة

للحدیث النبوی[۵] حدیث سنت کا مترادف لفظ ہے؛ لیکن دونوں میں ایک فرق ہے، وہ یہ کہ حدیث تو ہر اس قول وفعل اور تقریر کو کہتے ہیں جو آپ کی طرف منسوب ہو خواہ یہ نسبت ضعیف ہی کیوں نہ ہو؛ چنانچہ حدیث، صحیح، ضعیف، متصل، منقطع، مرفوع، مرسل، موقوف، مقطوع، معلل، شاذ اور منکر وموضوع بھی ہوسکتی ہے، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا تعلق صرف نبی کے ساتھ ہو اور امتی کے لئے اس پر عمل کرنا حرام ہو، جیسا کہ بیک وقت چار سے زائد بیویاں رکھنا؛ لیکن سنت صرف اسی طریقے کو کہا جاتا ہے جس کو رسول اللہؐ نے اختیار کیا اور وہ معلوم، مشہور اور معمول بہا بھی ہو؛ چنانچہ اس میں صحت اور ضعف کا کوئی مسئلہ نہیں اور نہ ہی وہ صرف نبی کے ساتھ خاص ہے۔

سنت کی حجیت

انسان اشرف المخلوقات ہے اور انبیاء انسانوں کا سب سے عظیم طبقہ ہے، ان کی ذہنی اور روحانی صلاحیتیں نہایت بلند وممتاز ہوتی ہیں، ان کی صفات عظیم تر اور شخصیات مثالی ہوتی ہیں، وہ شروع ہی سے توفیق باری کی نگرانی میں پروان چڑھتے ہیں اس لئے بعثت سے قبل بھی ان اخلاقی کمزوریوں سے محفوظ ومامون ہوتے ہیں جن میں ان کی پوری قوم کا دامن آلودہ ہوتا ہے، اخلاق وکردار کی یہ عظمت انہیں خاندان ومعاشرے میں ہردلعزیز بنادیتی ہے اور دعوت ورسالت سے پہلے ہی لوگوں کے دلوں پر ان کی صداقت ودیانت، تقدس وامانت اور مثالی سیرت کا سکہ بیٹھ جاتا ہے۔

ظاہر ہے یہ انتظامات اسی لئے کئے جاتے ہیں کہ کل کو جب وہ نبوت کا دعویٰ لیکر کھڑا ہو تو قوم کے لئے اس کی زندگی اسوہ اور نمونہ ہو اور اس کی شخصیت وکردار میں دشمنوں کے لئے حرف گیری کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے، دین میں نبی کا یہ مقام نہیں کہ وہ قوم کو بس پیغام پہنچادے اور اس کا مطاع اور مقتدیٰ نہ بنے، اسی طرح ہم اس کی ذاتی حیثیت اور نبوی زندگی میں فرق نہیں کرسکتے کہ کچھ چیزوں کو مانیں اور کچھ کو ذاتی قرار دے کر چھوڑ دیں، منصب نبوت پر فائز

۱ جمہرہ: ص ۹۵
۲ صحاح: ۵/۲۱۳۹، معجم مقائس اللغہ: ۳/۶۱
۳ کتاب التعریفات: ۱۱۸
۴ و ۵ السنۃ قبل التدوین ص: ٦

ہوتے ہی وہ ہر آن، ہر لمحہ اور ہر گھڑی اللہ کا رسول ہوتا ہے اور یہ حیثیت اس سے کسی وقت بھی جدا نہیں ہوتی، قرآنِ کریم نے اس اصول کو بڑے شرح وبسط سے بیان کیا کہ کتاب اللہ دستورِ حیات ہے جو عموماً اصول وکلیات پر گفتگو کرتا ہے، اس لئے اُن کی تشریح وتشکیل نبی کی ذمہ داری ہے وَاَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (نحل ٦) وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمْ (نحل ٦٤) ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (قیامۃ/۱۹) آیات میں تلاوت وقرأت کے بجائے بیان وتبیین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی نفس مضمون سنانا نہیں، بلکہ اس کی وضاحت وتشریح کرنا ہے جو نبی کے اقوال وافعال اور تقریرات کے ذریعے ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد کتاب کی تبلیغ اور آیات کی تلاوت کے ساتھ حکمت کی تعلیم اور امتیوں کا تزکیہ بھی ہے هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (سورہ جمعہ) امام شافعی نے الرسالہ (۴۴) میں حکمت کے معنی اہل علم سے سنت رسول نقل کیے ہیں اور تزکیہ روحانی تعلیم وتربیت کا نام ہے؛ چنانچہ عقائد وعبادات، حدود ومعاملات اور زندگی کے ہر باب میں ان کو رسول اللہؐ کے ذریعے جو روشن تفصیلات ملتی ہیں وہ اسی تعلیم کتاب اور تبیین آیات کا عملی مظہر ہیں جن سے بے نیاز ہوکر ہم قرآن کو سمجھ سکتے ہیں نہ ہی نماز کی ایک رکعت پڑھنا ممکن ہے، اسی لئے قرآن نے اطاعت باری کے ساتھ ہر جگہ اطاعت رسول کو بھی مستقلاً ذکر کیا ہے أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (سورہ نساء) کیونکہ اطاعت باری خود اطاعت رسول پر موقوف ہے، مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (سورۃ نساء) اور رسول کی نافرمانی دراصل خدا کی نافرمانی ہے، آپ کا ہر قول وفعل وحی الٰہی پر قائم ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (نجم: ۳) اس لئے آپ کی ذات مسلمانوں کے لئے بہترین اسوہ ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ان آیات واحادیث سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف نامہ بر نہیں؛ بلکہ شارح کتاب، معلم ومربی، حاکم وقاضی، اور قائد وپیشوا بھی ہیں، جن کا ہر قول وعمل اور تقریر بھی دلیل وحجت ہے اور یہ فیضان بھی براہِ راست اللہ ہی کی جانب سے ہوا ہے، جیسا کہ سنن ابی داؤد (ستۃ) میں روایت موجود ہے، أَلَا اِنِّىْ اُوْتِيْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهٗ

مَعَهٗ یہاں مثلہ معہ سے مراد علماء کے نزدیک سنت ہے اور ہمارے خیال میں یہ قرآنی حکمت کی ایک دوسری تعبیر ہے۔

حدیث وسنت کی اقسام

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے الرسالۃ (۲۸) میں احادیث وسنن کو اصولاً تین قسموں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بات کہی اور بطور استدلال اس سے متعلق قرآن کی آیت بھی پڑھی اس کی مثال کیلئے باب فی القدر کی تیسری حدیث ملاحظہ ہو۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات جو قرآن کے مجمل احکام کی تشریح ہیں ان میں آیات کا تو تذکرہ نہیں؛ لیکن قرآنی احکام سے ان کا کھلا ربط دکھائی دیتا ہے، جیسا کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کی تفصیلات۔

۳۔ یہ وہ احادیث ہیں جن میں آپ نے کوئی آیت تلاوت فرمائی، نہ ہی بظاہر قرآن سے ان کا کوئی ربط دکھائی دیتا ہے، امام شافعی نے اس قسم سے متعلق اسلاف کے چار اقوال نقل کئے ہیں:

۱۔ نبی کے ہر قول وفعل کو توفیق الٰہی شامل ہے، اس لئے اس کے قرآنی ماخذ تک نہ پہنچنے کے باوجود ہم پر اس کی کلی اطاعت فرض ہے۔

۲۔ رسول نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو گو بظاہر کم بینوں کو نظر نہ آئے، امام شاطبی (م ۷۹۰ھ) نے الموافقات میں لکھا ہے **لیس السنۃ إلا واصلہ فی القرآن** جب یہ کتاب اللہ سے ماخوذ ہے تو اس کی اطاعت وحجیت میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟

۳۔ تمام احادیث **نفث فی الروع** کا نتیجہ ومظہر ہیں، جو درحقیقت وحی الٰہی کی ایک قسم ہے، قرآن نے اسے حکمت کا نام دیا ہے۔

۴۔ ایسی تمام احادیث جن کا ماخذ قرآن میں نہیں ہے وہ کتاب سے الگ پیغام ربانی کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوئیں، امام اوزاعی نے حسان بن عتبہ سے نقل کیا

ہے كَانَ الوحيُ يَنزِلُ عَلىٰ رسولِ اللّٰهِ صلَّى اللّٰهُ عليهِ وسلَّم ويَحضُرُه جِبريلُ بالسُّنةِ الَّتي تُفَصِّلُ ذٰلِكَ.

ہمارے نزدیک پہلی تین رائیں تو ایک ہی موقف کی مختلف تعبیریں ہیں، جبکہ چوتھی رائے ان سے الگ نظر آتی ہے؛ لیکن خلاصہ بہر حال سب کا یہی نکلتا ہے کہ وہ براہِ راست وحی یا کتاب اللہ سے ماخوذ ہونے کی بنیاد پر حجت اور واجب الاتباع ہیں، اس اصولی بحث کے بعد فقہاء نے پورے ذخیرۂ حدیث کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ **سنن ھدیٰ:** یہ قرآنی احکام وفرائض کی تشکیل وتفسیر ہیں، جنہیں قبول کئے بغیر دین پر عمل ناممکن ہے، جیسا کہ طہارت واذان، صلوٰۃ وزکوٰۃ اور صیام وحج وغیرہ سے متعلق نبوی تفصیلات، ان کا منکر کافر، تارِک، فاسق اور تعزیرات کا مستحق ہے۔

۲۔ **سنن زوائد:** یہ عقائد وعبادات کی تشریح نہیں؛ بلکہ ان امور پر مشتمل ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور عادت وضرورت کیا کرتے تھے، جیسا کہ طعام وشراب اور لباس وغیرہ ان کا تارِک فاسق نہیں ہے؛ لیکن عامل ثواب کا مستحق ہے۔

علامہ سندھی نے سنن مصطفیٰ میں لکھا ہے کہ سنت سے امام ابن ماجہ کے ذہن میں یہاں دو مفہوم ہوسکتے ہیں: ایک تو ما هو أحد الأدلة الأربعة المذكورة في كتب الأصول وهي الكتاب والسنة واجماع الأمة والقياس رسول اللہؐ کے اقوال وافعال اور تقریرات اسی کے دائرے میں آتے ہیں، سندھی کے نزدیک اس کی رو سے اتباع سنت کا مفہوم ہے الأخذ بمقتضاها في تمام الأحكام الدينية من الإباحة والوجوب والندب والكراهة دوسرے مفہوم کی وضاحت انہوں نے ان الفاظ میں کی ہے، ويحتمل أَنَّهُ أراد بالسنة الطريقة المسلوكة له صلى الله عليه وسلم فيشتمل تمام الدين سواء أثبت بالكتاب أو بالسنة اس طرح اب اتباع سنت کا مطلب سندھی کے نزدیک الأخذبها ہے یعنی پوری شریعت پر عمل کرنا تو پہلے معنی کے لحاظ سے وہ دلیل کی ایک قسم ہے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے وہ مدلول ہے یعنی کتاب وسنت اسی پر دلالت کرتے ہیں، علامہ سندھی کا کہنا ہے کہ باب کے تحت آنے والی احادیث دونوں مفہوموں پر منطبق ہوتی ہیں: جبکہ آخری

حدیث سنت کے دوسرے معنی سے زیادہ قریب ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ حقیقت پوری طرح اجاگر ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ امت کو صرف قرآن پہنچانا نہیں بلکہ تعلیم وحکمت کے ذریعہ اس کی عملاً وضاحت کرنا بھی تھا، اطاعت باری کی طرح من حیث الرسول آپ کی اطاعت بھی فرض ہے، احادیث جس طرح صحابہ پر حجت تھیں، اس طرح ہمارے لئے بھی حجت ہیں؛ کیونکہ وہ نہایت مضبوط ومستند ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں، قرآن کو سمجھنے کے لئے اگر رسول کا واسطہ درمیان سے حذف کر دیا جائے، تو دین سمجھنا تو درکنار کوئی ایک رکعت نماز بھی نہیں پڑھ سکتا، امام ابن ماجہ نے اسی حقیقت کو سمجھانے کے لئے سب سے پہلے اتباع سنت کا باب قائم کیا ہے، جس سے ان کا مقصد سنت کو شرعی حجت اور عمل کا مدار قرار دیکر اصولاً منکرین حدیث پر رد کرنا ہے، باب کی تمام روایات اسی رجحان کی غمازی کرتی ہیں۔

(۱) حَدَّثَنَا أَبُوْ بَكْرِ بْنِ اَبِيْ شَيْبَةَ قَالَ ثَنَا شَرِيْكٌ عَنِ الاَعْمَشِ ، عَنْ اَبِيْ صَالِحٍ ، عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا أَمَرْتُكُمْ بِهٖ فَخُذُوْهُ ، وَمَا نَهَيْتُكُمْ عنهُ فانتَهُوا .

نحوی تحقیق

علامہ سندھی نے امام سیوطی کے حوالے سے سنن مصطفیٰ میں لکھا ہے، ما فی الموضعین شرطیة یعنی لفظ ما دونوں جگہ شرطیہ ہے، اور حدیث کا مفہوم بھی اس صورت میں زیادہ واضح ہے، جب کہ ما کو اگر موصولہ مانتے ہیں تو جملہ انشائیہ فخذوهُ اور فانتھُوا کا خبر ہونا لازم آئے گا، جو عربی قواعد کی رو سے ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے، اور اکثر نحوی اسے تاویل کے بغیر صحیح قرار نہیں دیتے، خلاصہ یہ نکلا کہ امرتُکم بہ شرط ہوا، اور فخذوہ اس کی جزاء ہے، اسی طرح نھیتکم عنه اور فانتھوا بھی شرط وجزاء ہیں۔

یہ پہلی حدیث تھی اب آئندہ آنے والی حدیث کی تحقیق بھی ملاحظہ ہو ذَرُونی یہ فتح اور سمع کے باب سے آتا ہے، پہلی صورت میں اُس کے معنی کاٹنے اور چیرنے کے ہیں، جبکہ دوسری

صورت میں اس کا مطلب چھوڑنا ہے آخری معنی میں اس کے ماضی اور مصدر کا استعمال عربوں کے نزدیک متروک ہے، اس کی جگہ ترك اور الترك لایا جائے گا، اسی طرح اسم فاعل بھی تارک ہوگا اور اس کا استعمال صرف مضارع امر اور نہی میں ہوگا، قرآن وسنت میں تینوں کی مثالیں موجود ہیں:

﴿ما ترکتکم﴾ یہاں ما مصدر ظرفیہ ہے فانما یہ کلمہ حصر ہے صدارتِ کلام کو چاہتا ہے اور کسی بھی طرح کے عمل سے خالی ہوتا ہے (اذا) دونوں جگہ ظرفیہ متضمن شرط ہے اور جملہ انشائیہ دونوں اسکی جزاء ہیں، یہ نحوی اور لغوی تحقیق تھی، مباحث آگے آئیں گے۔

(۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بنُ الصَّباحِ قَالَ اَنَا جَرِيْرٌ عَنِ الاَعْمَشِ عَنْ اَبِيْ صَالِحٍ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَرُوْنِيْ مَا تَرَكْتُكُمْ فَاِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِسُؤَالِهِمْ وَاخْتِلاَفِهِمْ عَلٰى اَنْبِيَاءِهِمْ فَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَخُذُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَانْتَهُوْا.

یہ دونوں روایتیں حجۃ الوداع میں پیش آنے والے اس واقعہ کے ٹکڑے ہیں جسے اصحاب ستہ سمیت تقریباً تمام محدثین نے نقل کیا ہے، صحیح مسلم[1] اور سنن نسائی[2] میں اس کا پس منظر بھی موجود ہے، اب مختلف طرق کے جوڑنے کے بعد واقعہ کچھ اس طرح ہے۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ اے لوگو!! تم پر حج فرض کر دیا گیا، اس لئے اب حج کیا کرو، تو ایک شخص نے کہا کیا ہر سال اے اللہ کے رسول؟ آپ خاموش رہے، یہاں تک کہ اس نے یہ سوال تین مرتبہ کیا تو آپؐ نے فرمایا اگر میں کہہ دوں جی ہاں تو یقیناً وہ فرض ہو جائے گا اور تم اسے نبھا نہ سکو گے بلکہ صرف ایک حج فرض ہے پھر آپ نے فرمایا مجھے ان چیزوں کی بابت مہلت دو جن کو میں نے تمہاری (مصلحت) کی خاطر نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ تم سے پہلے لوگ اپنے رسولوں اور انبیاء سے جھگڑنے ہی کے باعث ہلاک وبرباد ہو گئے ہیں جب کوئی حکم دوں تو اس پر عمل کرو جہاں تک

[1] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فرض الحج مرة واحدة في العمر

[2] سنن النسائي: کتاب الحج: ۱

تمہارے لئے ممکن ہو اور جب کسی چیز سے روکوں تو بس فوراً رک جاؤ۔

قرآن وسنت میں باہم ربط کی نوعیت کیا ہے؟ اتباع سنت کے باب میں اس کی بابت ہم نے امام شافعی کے حوالے سے حدیث کی اصولاً تین قسمیں نقل کی ہیں، روایت باب کا تعلق ان میں دوسری قسم سے ہے کہ جہاں آیت وروایت کے الفاظ ملتے جلتے ہوں اور دونوں کا تعلق بالکل واضح ہو؛ چنانچہ علامہ سندھی نے سنن مصطفیٰ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث سورۃ الحشر کی آیت ما آتاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا کی تفسیر ہے، امام ابوداؤد نے اسے ان پانچ حدیثوں میں شامل کیا ہے، جو پورے دین کی بنیاد ہیں اور امام نوویؒ نے ''شرح اربعین'' میں لکھا ہے هٰذَا مِن قَوَاعِدِ الاسلامِ وَمِن جَوامِعِ الكَلِمِ التى أُعْطِيَهَا النَّبِىُّ صَلَّى اللهُ عليهِ وَسَلَّمَ ويَدْخُلُ فِيْهِ مَا لَا يُحصٰى مِن الأحكامِ[1].

﴿ذرونی ما ترکتم﴾ امام بخاری نے کتاب الإعتصام بابُ اِقتِدَاءِ سُنَنِ رسولِ اللهِ ﷺ میں دعونی روایت کیا ہے، دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، امام قرطبی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ای اِحمِلُوا اللَّفظَ علی مَدلُولِہٖ الظَّاهِرِ لُغةً وان صلُح لغیرہٖ فَلَاتُكثِرُوا فی الاستقصاء خوفَ أن يكثُرَ الجوابُ كما اتفق لبنی اسرائیل فی البقرۃ[2] لغت کے اعتبار سے لفظ کو اس کے ظاہری مفہوم پر منطبق کرو، خواہ وہ دوسرے معنی کی بھی گنجائش رکھتا ہو اور تحقیق میں مبالغہ نہ کرو؛ کیونکہ جوابات کی کثرت مشقت پیدا کرتی ہے، جیسا کہ گائے کے واقعہ میں بلاضرورت تحقیق واستفسار کے باعث بنی اسرائیل کو مشقت پیش آئی، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس جملہ کی تقدیر عبارت یوں نقل کی ہے: أی مُدة تركِی إیاكم بغیر أمر شیٔ ولا نهی عَن شیٔ یعنی مجھ کو اس وقت تک مہلت دو جب تک کہ میں خود ہی تم کو کوئی حکم دوں یا کسی چیز سے منع کردوں، علامہ سندھیؒ کے الفاظ اور زیادہ جامع نظر آتے ہیں، انہوں نے لکھا ہے ای أتركونی من السوال عن القیود فی المطلقات مطلق امور میں قیود وعلت کی بابت مجھ سے سوال نہ کرو، ما ترکتکم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ای مدة ما ترکتکم عن التکلیف بالقیود فیها یعنی جب میں نے خود

---

[1] فتح الملہم [2] فتح الباری ج۲۹/۶۵۴

تمہیں قیود کا مکلف نہیں بنایا تو تم بھی اس دوران مجھ سے کچھ مت پوچھو، إلا أن أبيّن لكم بنفسي[1] یہاں تک کہ میں خود ہی وضاحت کروں، قرطبی، عسقلانیؒ اور سندھی کے اقوال کا خلاصہ یہ نکلا کہ جب نبی کوئی حکم دیں تو اولاً اس کو صحیح مفہوم پر منطبق کیا جائے پھر ہم فوراً اس پر عمل شروع کریں، فضول بحثوں میں الجھنا صحیح نہیں، اگر وہ مطلق کسی جہت سے مقید ہوگا تو نبی ازخود ہی اس کا اعلان کریں گے ہمیں تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں، صحابہ کا شعار سمعنا و أطعنا تھا اور لایعنی گفتگو سے وہ کوسوں دور بھاگتے تھے، کیونکہ یہ چیز قلبی تشویش کا باعث ہوتی ہے، پھر ذہن پراگندہ اور عملی قوتیں مضمحل ہو جاتی ہے۔

﴿فإنما هلك مَن كان قبلكم بسُؤالهم﴾ صحیح مسلم، سنن نسائی، جامع ترمذی میں بكثرة سؤالهم آیا ہے اور من كان قبلكم سے بالاتفاق محدثین یہود ونصاریٰ مراد ہیں، بنی اسرائیل اطاعت وعمل کے بجائے نصوص وشرعی احکامات پر سوالات واشکالات قائم کرتے، ہر حکم کی علت پوچھتے، اس کی مزید شرائط وصفات دریافت کرتے اور ہر بات میں ایسی بال کی کھال نکالتے کہ لایعنی فضولیات سے ان کا نبی بھی پریشان ہو اٹھتا، کبھی پوچھتے کہ اصحابِ کہف کی تعداد کتنی تھی؟ ان کے نام کیا تھے؟ ان کے کتے کا رنگ کیسا تھا؟ کبھی حضرت موسیٰؑ کے عصاء ہی پر بحث کرنے لگتے کہ اس کی لمبائی چوڑائی کیا تھی؟ اور وہ کس درخت کی لکڑی سے بنا تھا؟ اسی طرح ان چڑیوں کی نوعیت ونسل پر بھی تحقیق کرتے تھے جنہیں قرآنی تشریح کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے زندہ کیا تھا، نیز بسا اوقات ان کی گفتگو کا موضوع گائے کے جسم کا وہ حصہ ہوتا تھا جس سے بنی اسرائیل کا مردہ زندہ ہوا تھا، اسی طرح اس درخت کو بھی بحث کا موضوع بناتے تھے جس کی اوٹ سے باری تعالیٰ نے موسیٰؑ سے کلام کیا تھا۔

﴿و اختلافهم علی﴾ اختلف کے معنی جھگڑنا بار بار آکر ان سے منفی باتیں کرنا، نت نئے مطالبے کرنا، اور بات پوری ہونے سے پہلے اس میں دخل دینا ہے، ان کو آسمانی رزق ملتا تھا اس پر شکر کے بجائے ناقدری پر اترے اور موسیٰؑ سے صاف کہا لن نصبر علی طعام واحد فادع لنا ربك يخرج لنا مما تنبت الأرض الخ اسی طرح انہوں نے تسلیم اور رضا کے

[1] سنن مصطفیٰ: ص ۴۳

لئے خدا کو دیکھنے کی شرط رکھی لن نؤمن لك حتى نرى الله جهرة حضرت موسیٰ نے گائے ذبح کرنے کا آسمانی حکم سنایا تو بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑے اتتخذنا هزوًا پھر وہ بال کی کھال نکالی کہ اللہ کی پناہ! رسول اللہ ﷺ نے ان فضول بحثوں سے بچنے کو اسلام کا حسن قرار دیا من حسن اسلام المرء ترك ما لا يعنيه مغیرہ بن شعبہ نے امیر معاویہ کو خط لکھتے ہوئے آپ کے اسی مزاج کا تذکرہ فرمایا ہے، انه كَانَ يَنهى عَن قِيلَ وقَالَ و كثرة السُّوالِ[1].

اسی طرح ابوداؤد (علم/٦) کی روایت میں ہے نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الأغلوطات اغلوطہ ان مشکل مسائل کو کہا جاتا ہے، جن سے آدمی کو غلطی میں ڈالا جائے، اور یہ کثرتِ سوال سے ہوتا ہے۔

﴿فاذا امرتكم بشئ فخذو منه﴾ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس جملہ کی شرح یوں کی ہے:

فيه إشارةٌ إلى الاشتغالِ بالأهمِّ المحتاجِ إليه عَما لا يَحتاجُ اليهِ في الحالِ فكانَهُ قَالَ عَليكُم بِفعلِ الاَوَامِرِ وإجْتِنَابِ النَّواهىْ فَاجعَلُوا إشْتِغَالَكُم بِها عِوضاً عَنِ الإشتِغَالِ بالسُّؤالِ عَمَّا لَمْ يَقَعْ فَيَنْبغِي لِلمُسلمِ أن يَبحثَ عَمَّا جَاءَ عَنِ اللّٰهِ تعالى وَرَسولِهِ ثُم يَجْتَهِدُ فِي تَفَهُّم ذلك . والوُقُوفِ عَلى المُرادِ به ثم يَتَشَاغَلُ بِالعَمَلِ به فَإن كَانَ مِنَ العَمَلياتِ يَتَشَاغَلُ بالعَملِ به فَإن كَان من العِلمِياتِ يَتَشَاغلُ بتَصدِيْقِه واعِتقَادِ حقيقتِه وإن كانَ مِنَ العَمَلياتِ بَذَلَ وُسعَهُ في القيام به فعلاً وتركاً فان وَجَدَ وقتاً زائدًا على ذلك فَلاَ بأسَ بأنَ يَصرِفَهُ في الاشتغال بتَعرُّفِ حكمِ ما سَيَقعُ على قصدِ العمَل بِه إن لَو وَقَعَ فأمَا إن كَانَتْ الهِمةُ مصروفةً عند سماعِ الإمرِ والنهي إلى فرضِ أمور قد تَقَعُ وقَد لاتَقعُ مع الإعراضِ عَن القيام بمُقتَضى مَا سمِعَ فإنَّ هذا يدخل في النهيِ فاِن التَفقُّهَ في الدينِ إنمَا يُحمَدُ اِذا كان لِلعَملِ لاَ لِلمِراءِ والجِدالِ (فتح الباری)

اس جملہ میں فی الوقت غیر ضروری امور میں الجھنے کے بجائے اہم وضروری امور میں جلد

---

[1] بخاری ۱۰۸۳/۲

از جلد مصروف ہونے کی دعوت ہے گویا کہ آپ نے یوں فرمایا کہ تم ماموارت کو بجالاؤ، اور منہیات سے پرہیز کرو ماموارت ہی کو اپنا مشغلہ بنالو اور اس چیز کی بابت سوال میں مت الجھو جو ابھی واقع بھی نہیں ہوئی ہے، مسلمان کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ صرف کتاب وسنت میں غور کرکے انہیں سمجھنے کی کوشش کرے اور مفہوم سے واقفیت کے بعد اس پر فوراً عمل شروع کردے اگر وہ علمی ونظری چیزیں ہیں تو حقیقت کے اعتقاد سے ان کی تصدیق کرے اسی طرح ان کا تعلق عمل سے ہے تو مامور کو بجالانے اور منہیات کو چھوڑنے کی کوشش کرے پھر اس کے پاس اگر کچھ وقت بچتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ عمل کی نیت سے ان مسائل میں بھی وقت لگائے جو ابھی واقع بھی نہیں ہوئے کیونکہ خطاب کے وقت اگر انسانی ذہن امور واقعہ یا غیر واقعہ کو سوچنے میں لگا ہوگا تو وہ ارشادات نبوت کے تقاضوں کو بجالانے سے عاجز رہے گا اور حدیث میں اسی سے روکا گیا ہے۔

کیونکہ تفقه في الدين اسی وقت محمود ہے جبکہ اس کا مقصد عمل ہو مباحثہ اور جھگڑا نہ ہو، لفظ شيء میں عموم ہے اس لئے اس میں فرض اطاعت کے واجب مندوب اور مستحب تمام درجے داخل ہیں، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہاں ماموارت کا مصداق صرف دینی امور ہیں، دنیوی چیزیں نہیں انتم اعلم بامور دنیاکم کی رو سے وہ عقل وحالات کے تابع ہیں، یہ نظریہ بلاشبہ غلط ہے، کتاب وسنت میں رسول کو اسوہ قرار دیکر مطلق اطاعت کی تاکید کی گئی ہے اور دین ودنیا کی تفریق کا کوئی ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ہے بیع وشراء، نکاح وطلاق اور حدود ووراثت جیسی چیزیں خالص دنیوی معاملات ہیں پھر بھی ان کی بابت ہمیں نبوت کی پوری روشنی ملتی ہے اور زندگی کا کوئی گوشہ ان ہدایات سے خالی نہیں تو پھر تفریق کس بنیاد پر کی جاسکتی ہے، ہاں اگر نبی خود رخصت دیدیں تو وہ بالکل دوسری بات ہے تابیر نخل اور حضرت بریرہ کا واقعہ اسی کی مثال ہیں؛ لیکن یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں کہ ایسی استثنائی نظیریں دو تین ہی ہیں اور اس ذیل میں پیش کی جانے والی احادیث کا محمل دوسرا ہے، جن کی شرح تفصیل چاہتی ہے۔

ما استطعتم کی قید

اس جملہ سے متعلق اصولاً دو بحثیں ہیں، پہلی یہ قید فخذوا اور فانتهوا میں کس سے

متعلق ہے، دوسری اس کے کیا فوائد ہیں؟ جامع ترمذی میں سرے سے یہ قید نہیں جبکہ طبرانی میں وہ فانتھوا کے ساتھ آئی ہے؛ لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ صحیح احادیث میں وہ فخذوا ہی سے وابستہ ہے، اسی لئے شارحین حدیث طبرانی کے طریق کو مرجوح قرار دیتے ہیں، دوسری بحث یہ ہے کہ اس میں کیا کیا حکمتیں ہیں؟ تو اس سلسلے میں اصولی بات یہ ہے کہ احکام واوامر پر عمل کرنا محنت وجانفشانی کا طالب ہے جبکہ منہیات ومنکرات سے پرہیز کرنے میں نسبتاً وہ محنت شاقہ درکار نہیں، ماوردی نے کہا ہے ان الکف عن المعاصی ترک وھو سھل وعمل الطاقة فعل وھو یشق[1] اس لئے ماموارات کی انجام دہی میں طاقت واستطاعت کی شرط ہے کما قال اللّٰہ لا یکلف اللّٰہ نفساً الا وسعھا[2]، فاتقوا اللّٰہَ ما استطعتم[3] امام نوویؒ فرماتے ہیں فاذا عجز عن بعض ارکانھااو بعض شروطھا اتی بالباقی الخ[4] یعنی اگر کوئی شخص کسی حکم کو پوری طرح بجالانے پر قادر نہ ہو تو اُسے وہ حسب استطاعت انجام دے گا، مثلاً کھڑا ہو کر نماز پڑھنے سے معذور ہے، تو بیٹھ کر ادا کرے، اس پر بھی قدرت نہیں تو لیٹ کر پڑھے، وضو نہیں کر سکتا تو تیمّم کرلے، روزے رکھنے کی طاقت نہیں تو فدیہ دیدے، خود حج کو نہیں جاسکتا تو حج بدل کرادے، الغرض! جو ممکن ہو اسے بجالائے۔

﴿فاذا نھیتکم عن شئ فانتھوا﴾ جب کسی چیز سے منع کروں تو اس سے باز رہو، یہاں محدثین نے ما کو عام مانا ہے یعنی منہیات کے درجے حرام، ناجائز اور مکروہ سب اس میں شامل ہیں، پہلے جملہ کی طرح، یہاں استطعتم کی قید نہیں ہے، امام نوویؒ فرماتے ہیں: فان وجد عذر یبیحه کاکل المیتة عند الضرورة وشرب الخمر عند الاکراہ والتلفظ بکلمة الکفر اذا اکرہ او نحو ذلك فھذا لیس منھیًا فی ھذہ الحال[5] یعنی معقول عذر کی بنیاد پر شریعت رعایت ودرگذر سے کام لیتی ہے، مثلاً اضطرار کے وقت مردار کا کھانا، زبردستی شراب پلادینا، اور کلمہ کفر کی ادائیگی پر مجبور ہونا تو یہ شخص عند اللہ معذور ہے، قیامت میں اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا، اسی حکمت کے پیش نظر نہی کو استطعتم کی قید سے الگ رکھا گیا ہے۔

---

[1] شرح ابن ماجہ، مؤلفہ مولانا منصور ہنگلی [2] سورۂ بقرہ/۲۸۶
[3] تغابن/۱۶ [4] و [5] شرح مسلم/۱/۴۳۲

سوالات کی قسمیں

سوال واستفسار ایک ناگزیر چیز ہے خصوصاً فروعات اور غیر منصوص مسائل میں قدم قدم پر اس کی ضرورت پڑتی ہے، جیسا کہ خود حدیث میں ہے انما شفاء العی السوال یعنی پیاسے کی تشفی سوال سے ہوتی ہے، حدیث باب کی رو سے کیا ہر قسم کے سوال کی ممانعت کردی گئی ہے، اس کا جواب ذرا تفصیل چاہتا ہے، سوال کی دراصل پانچ قسمیں ہیں:

۱۔ طلب العلم فریضة علی کل مسلم کی رو سے کم از کم اتنا علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے جس کی روشنی میں وہ مامورات کی ادائیگی اور منہیات سے اجتناب کرسکے، یہ چیز اہل علم کی صحبت سے بھی حاصل ہوسکتی ہے فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون کا خطاب انہی لوگوں سے ہے اور قرآن کریم میں یسئلونك عن الاهلة، یسئلونك عن الشهر الحرام، یسئلونك عن المحیض وغیرہ جیسے سوالات اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں، جن پر عام آدمی کا عمل موقوف ہے ان کی بابت پوچھنا فرض وواجب ہے۔

۲۔ فَلَوْ لاَ نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ (التوبۃ/۱۲۲) کی رو سے امت میں ہر وقت اہل فقہ واجتہاد کا ایک گروہ موجود رہتا ہے جو رسوخ وتفقہ کے لئے سوالات کی کثرت ووقت کا محتاج ہے حضرت ابن عباس سے جب ان کی بلند مرتبی کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا اُعطیتُ لسانا سَئولاً وقَلبا عقولاً بحیثیت امت یہ فرض کفایہ ہے۔

۳۔ سیرتِ رسول، تاریخ اسلام اور بزرگانِ دین کے حالات سے متعلق سوالات کتاب وسنت سے قربت اور تدین میں اضافے کا سبب ہیں، جن سے نیک اعمال کی توفیق ملتی ہے، یہ چیز مستحب ہے۔

۴۔ مذکورہ تینوں قسموں سے الگ ایسے سوال کرنا جن پر کوئی عقیدہ وعمل موقوف نہ ہو اور وہ قیل وقال کا دروازہ کھولتے ہوں جیسے حلت وحرمت کی وجوہات پوچھنا، یہ چیز نبی کی ایذا کے ساتھ کبھی کسی چیز کی تحریم کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے، اس لئے وہ شریعت میں محمود نہیں، صحیح بخاری کی حدیث ہے: اِنَّ اَعْظَمَ الْمُسْلِمِيْنَ جُرمًا مَن سَالَ عَن امرٍ لم يَحرُم فحُرِّمَ مِن اَجلِ مَسئلَتِهٖ[1] وفاتِ نبوی کے بعد گو تحریم کا امکان نہ رہا؛ لیکن کراہت تو اب بھی باقی ہے؛

[1] صحیح بخاری۲، کتاب الاعتصام باب ما یکرہ من کثرۃ السوال۔

امام طیبی حدیث کی بابت لکھتے ہیں: هٰذَا فِي حَقِّ مَنْ سَئَلَ عَبَثًا وَتَكَلُّفًا فِيمَا لَا حَاجَةَ بِهٖ[1]
یہ وعید اس شخص کے حق میں ہے جو خواہ مخواہ سوال کرے اللہ کی محبت وعظمت میں کمی اس کا سبب ہوتی ہے، یہ سوالات کی نہایت ناپسند قسم ہے جس میں امم سابقہ مبتلا ہو کر برباد ہو گئیں۔

۵۔ قیامت کی تاریخ، روح کی حقیقت، متشابہات کی تحقیق اور قضاوقدر پر بحث کرنا یہ بلاشبہ حرام ہے، حدیث باب کا مصداق اگر چہ چوتھی قسم ہے؛ لیکن پانچویں اس وعید میں بدرجہ اولیٰ داخل ہے۔

حدیث بخاری مسلم (حج/۶۸) نسائی (حج/۱) ابوداؤد، ترمذی (علم/۱۷) میں بھی آئی ہے، ابن ماجہ کی سند صحیح ہے۔

(۳) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بنُ اَبِيْ شَيْبَةَ ثَنَا اَبُو مُعَاوِيَةَ وَوَكِيْعٌ عَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ اَبِي صَالِحٍ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَطَاعَنِيْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهُ، وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ.

جس نے میری اطاعت کی اس نے گویا اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے گویا اللہ کی نافرمانی کی۔

صحیح بخاری (احکام/۱) صحیح مسلم (امارۃ/۸) اور سنن نسائی (بیعۃ/۲۸) میں حدیث باب کے ساتھ وَمن اَطَاعَ اَمِيرِى فَقَد اَطَاعَنِي وَمَن عَصَا اميرى فقد عَصَانِي کا بھی اضافہ ہے، من اطاعنی شرط ہے اور فقد اطاع اللّٰه جزاء ہے، حافظ ابن حجر نے اطاعت کی تعریف فتح الباری میں یوں کی ہے اَلاتيانُ بالمامورِ به وَالانتِهاءُ عَن المَنهِيِّ عَنهُ (فتح الباری: ۱۳/۱۱۲) یہ ٹکڑا دراصل مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ سے ماخوذ ہے، سندھی کہتے ہیں: يريد انه يبلغ عن اللّٰه فمن اطاعه فيما بلغ فقد اطاع الامر الحقيقى نبی اللہ ہی کا پیغام تو پہنچانے والے ہیں تو جس نے اس پیغام میں آپ کی اطاعت کی اس نے گویا خدائی حکم کی اطاعت کی۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں: لانی احكم نيابة عنه (حاشیہ نسائی ۵، جلد ۲، ص ۱۶۵) یعنی اللہ کے نائب ہونے کی حیثیت ہی سے میں کوئی حکم دیتا ہوں، اسی کو ابن

---

[1] ترمذی ابواب العلم باب الانتهاء عما نهى عنه رسول اللّٰه۔

حجران الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں لِاَنِی لاَ امر الا بما اَمَرَ اللّٰہُ بِہ فَمَن فَعَلَ مَا امرہٗ بہ فَانمَا اَطاعَ مَن اَمرَنی (فتح الباری:۱۳/۱۱۲) میں صرف وہی حکم دیتا ہوں جس کا مجھے اللہ نے حکم دیا ہے تو جو میرے حکم کو بجالائے گا تو گویا اس نے اس ذات کی پیروی کی جس نے مجھے مامور کیا ہے، شیخ الاسلام حضرت کشمیری ان اقوال کا خلاصہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں اَرادَ بہٖ الاعلانَ بِاسْتِقلاَلِ اِطاعةِ اللّٰہِ وَاِطاعةِ رَسُوْلِہٖ (فیض الباری ۴/ ۴۹۸) یعنی نبی کا منشاء اطاعت باری کے ساتھ مستقلاً اطاعت رسول کا اعلان ہے کہ جس طرح اللہ کی اطاعت فرض ہے اسی طرح بعینہٖ رسول کی اطاعت بھی مستقلاً فرض ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

﴿ومن عصانی فقد عصی اللّٰہ﴾ یہ جملہ بھی شرط وجزاء ہے، اور مَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاِنَّ لَہٗ نَارُ جَھَنَّم سے ماخوذ ہے، ابن حجر کی تعبیر کے مطابق عصیان کی تعریف الانتھاء عن المامور بہٖ والاتیان بالمنھی عنہ ہوگی یعنی نیکیوں سے اجتناب اور برائیوں کا ارتکاب کرنا عصانی کی وضاحت صحیح بخاری (اعتصام/۳) سے بھی ہوتی ہے کلُ امتی یَدخلون الجنةَ الامن أبی قالوا ومن یابی قال من اطاعنی دخل الجنة ومن عصانی فقد ابٰی یہ عصیان اعتقادی ہے جس کو ابٰی سے تعبیر کیا گیا جبکہ عصیان عملی کا نتیجہ خلود فی النار نہیں ہے، شیخ الاسلام حضرت کشمیری کہتے ہیں کہ یہاں یہ بتلایا گیا کہ رسول کی نافرمانی بالکل خدا ہی کی نافرمانی ہے، اس لئے یہ کوئی نہ سمجھے کہ رسول کا کوئی حق نہیں پھر آپ کے اوامر اور نواہی کا مذاق اُڑانے لگے لِئَلاَّ یَظُنَّ ظَانٌّ اَن لَیسَ لِلرسولِ حقٌ فَیستَخِفُّ اَوامِرَہٗ ونَواھِیَہٗ (فیض الباری:۴/ ۴۹۸) تو گویا یہ حدیث منکرین سنت کے خلاف حجت ہے، جو رسول کے بغیر اللہ کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں، ابن ماجہ کی سند صحیح ہے، تخریج گزر چکی۔

(۴) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بنُ عَبدِاللّٰہِ بنِ نُمَیرٍ ثَنا زَکرِیَّا بْنِ عَدِیٍّ عَنِ ابنِ المُبارَکِ عَنْ مُحَمّد بنِ سُوقَةَ عَنْ اَبی جعفَرٍ قَالَ: کَانَ ابْنُ عُمَرَ اِذا سَمِعَ مِنْ رَسُولِ اللّٰہ ﷺ حَدِیْثا لَم یَعْدُہٗ، وَلَمْ یَقْصُرْ دُوْنَہٗ.

ابن عمر جب کوئی حدیث سنتے تو نہ اس سے تجاوز کرتے اور نہ اسمیں کوتاہی کرتے تھے۔

اذا سے حدیثاً تک جملہ شرط اور لم سے دونہ تک جزاء ہے، عدا عدوًا نصر کے

باب سے آتا ہے معنی دوڑنا، آگے بڑھنا، تجاوز کرنا، لم نے حرفِ علت واؤ کو ساقط کر دیا ہے، قصر قصورًا یہ بھی نصر کے باب سے آتا ہے معنی ناقص ہونا، چھوٹا پڑ جانا، دون نیچے، ورے۔

غلو فی الدین تحریف کا پہلا مرحلہ ہے، شرعی حدود کی معرفت اور سنت کی حقیقت کا ادراک ہی وہ دو چیزیں ہیں جو اہل ایمان کو اعتدال پر قائم رکھتی ہیں، اور ان کا قدم جادۂ حق سے بھٹکنے نہیں پاتا اگر دونوں میں سے کسی ایک کی بابت بھی ناواقفیت پیدا ہوتی ہے تو یہیں سے افراط وتفریط کا آغاز ہوتا ہے اور معاملہ غلو سے ہوکر تحریف دین تک جا پہنچتا ہے، امم سابقہ اور خصوصاً یہود ونصاریٰ اسی کے مرتکب ہوکر راہِ راست سے بھٹکے ہیں، ان کے برخلاف حضرات صحابہ ارشاداتِ نبوی کی بدولت اس سلسلہ میں بڑے حساس تھے اور حدود سے ادنیٰ تجاوز پر بھی ان کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔

حدیث باب ان کی اسی صفت کا بیان ہے، جس کی بابت ابن عمر کچھ زیادہ ہی خیال رکھتے تھے، اور سنت کے الفاظ تک میں کمی زیادتی نہ ہونے دیتے تھے، جیسا کہ سنن دارمی کی روایت وضاحت کرتی ہے كَانَ ابنُ عُمَرَ اِذَا سَمِعَ النبيَّ ﷺ لَم يَزِدْ فيهِ وَلَمْ يَنْقُصْ مِنْهُ (سنن دارمی: ۱/۹۳) ابن سعد نے طبقات میں عَن اَبِي نُعَيمٍ عَنْ زُهَيرِ بنِ مُعاوِيَةَ عَن مُحَمّدِ بنِ سُوقَةَ عَن اَبِي جَعْفَرٍ کے طریق سے روایت نقل کی ہے: لَم يَكُن اَحدٌ مِن اَصحابِ رَسولِ اللّٰهِ ﷺ اِذَا سمِعَ مِن رسولِ اللّٰهِ ﷺ حدِيثًا احْذَرَ اَن لا يزيد فيهِ[1] وَلَا يَنقُصَ مِنهُ مِن عبدِ اللّٰهِ بنِ عُمَرَ بنِ الخطَّابِ[2] (طبقات ابن سعد: ۲/۲۷۳) علامہ سندھی نے لکھا ہے: الحاصل اِنهُ كَانَ وَاقِفًا عِندَ الحَدِّ الوَارِدِ فِي الحديثِ وَلَم يَاتِ بِالاِفرَاطِ فِيهِ وَلا تَفرِيط یعنی وہ سنت کی حدود سے واقف تھے اس لئے اس میں افراط وتفریط نہیں کرتے تھے، سنت پر پورے عامل تھے، مگر اس کی روایت میں محتاط تھے، مسند احمد میں صحیح روایت ہے کہ وہ سفر میں ایک خاص جگہ سے دور ہوکر گزرتے تھے کیونکہ انھوں نے حضور کو ایسا کرتے دیکھا تھا اسی طرح ایک خاص درخت کے نیچے قیلولہ کرتے تھے، ابن عمر کے امتیاز

---

[1] سنن دارمی ۱/۹۳ [2] طبقات ابن سعد ۲/۲۷۳

کے ساتھ یہ صحابہ کا عمومی رنگ تھا، جیسا کہ صحیح بخاری (الزکوٰۃ:۱) میں منقول ہے کہ ایک اعرابی نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: **دُلنی علی عمل اذا عملتُہ دخلتُ الجنة،** آپؐ نے عبادت نماز روزہ اور زکوٰۃ کی تاکید کی وہ یہ سن کر کہنے لگے **والذی نفسی بیدی لاازید علی هذا** پھر جانے کے لئے مڑے تو آپ نے فرمایا: **مَن سَرَّهُ اَن يَنظُرَ اِلٰى رَجُلٍ مِن اهلِ الجَنَّةِ فَليَنظُر اِلٰى هذا**[1] اسی طرح صحیح مسلم کی روایت میں مذکور ہے کہ ایک صاحب نے آکر حضورؐ سے اسلام کے بارے میں دریافت کیا، آپ نے ان کے تمام سوالوں کا جواب دیا اور آخر میں نماز روزہ اور زکوٰۃ کی تاکید کی وہ صحابی یہ کہتے ہوئے وہاں سے اُٹھے: **لا ازید علی هذا ولا أنقص منه،** حضور نے فرمایا: **أفلح الرجل إن صدق .**

امام نے روایت **باب اتباع السنة** میں نقل کی ہے، ترجمۃ الباب بالکل عیاں ہے، کہ سنت کی مکمل اتباع کی جائے کہ لفظاً و معناً ادنیٰ کمی بیشی نہ ہو، حدیث مسند احمد ابن حنبل، سنن دارمی اور مسند حمیدی میں بھی آئی ہے، اور ابن ماجہ میں اس کی سند صحیح ہے۔

(۵) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ الدِّمَشْقِيُّ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عِيْسَى بْنِ سُمَيْعٍ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ سُلَيْمَانَ الأَفْطَسُ عَنِ الوَلِيْدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ الجُرَشِيِّ عَنْ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ عَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ: خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَذْكُرُ الفَقْرَ وَنَتَخَوَّفُهُ فَقَالَ : اَلْفَقْرَ تَخَافُوْنَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَتُصَبَّنَّ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا صَبًّا حَتّٰى لَا يُزِيغُ قَلْبَ اَحَدِكُمْ اِزَاغَةً اِلَّاهِيَهْ وَايْمُ اللّٰهِ لَقَدْ تَرَكْتُكُمْ عَلٰى مِثْلِ البَيْضَاءِ لَيْلُهَا وَنَهَارُهَا سَوَاءٌ قَالَ : اَبُوالدَّرْدَاءِ صَدَقَ وَاللّٰهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَرَكَنَا وَاللّٰهِ عَلٰى مِثْلِ البَيْضَاءِ لَيْلُهَا وَنَهَارُهَا سَوَاءٌ .

حضرت ابوالدرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس (ایسی حالت میں) تشریف لائے کہ ہم فقر و فاقہ کا تذکرہ کر رہے تھے اور فقر سے ہمارے قلوب سہم رہے تھے (ہماری حالت کو دیکھ کر) آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم فقر و فاقہ سے ڈر رہے ہو اس ذات کی قسم

[1] صحیح مسلم [2] ایمان/۲

جس کے قبضہ میں میری جان ہے (عنقریب ایک زمانہ آئے گا کہ) تم پر دنیا کی ایسی ریل پیل ہوگی کہ دنیا کے علاوہ تمہارے دل کو کوئی چیز مائل نہیں کر سکے گی، اللہ کی قسم میں نے تم کو ایک روشن (دینی واسلامی) ماحول میں چھوڑا ہے، جس کے رات اور دن بالکل برابر ہیں (جس طرح دن کے اجالے میں کوئی ظلم نہیں ہوتا اسی طرح رات کے اندھیروں میں تمام انسان مامون رہتے ہیں) حضرت ابوالدرداءؓ (اظہار تشکر کے طور پر) کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سچ کہا واقعی آپؐ نے ہمیں ایسے ماحول میں چھوڑا جس (کی برکت سے اس کے) رات اور دن یکساں ہیں۔

﴿ونحن نذكر الفقر ونتخوفه﴾ یہ جملہ معطوفہ ہوکر خرج علینا رسول اللّٰہ کا حال ہے تخوُّف میں خوف سے زیادہ گھبراہٹ کے معنی موجود ہیں؛ کیونکہ لفظ کی زیادتی معنی کی زیادتی کو مستلزم ہوتی ہے اور تفعل کا باب قبول وتأثر کا پتہ دیتا ہے، اسلام کا ابتدائی دور بڑا صبر آزما تھا جاہلی معاشرے میں جو بھی ایمان لے آتا اپنے خاندان سے کٹ کر وہ بنیادی حقوق تک سے محروم ہوجاتا تھا، بلال وعمار کا فاقہ کرنا، شعب ابی طالب میں رسول اللہ ﷺ کا سوکھے چمڑے چبانا، سابقین کا پیٹ پر پتھر باندھنا، صہیبؓ، وابوسلمہؓ کا خالی ہاتھ ہجرت کرنا، مصعب بن عمیرؓ کا ایک معمولی کمبل سے ستر ڈھانکنا، شہداء بدر واحد کو اذخر کے پتوں میں کفنانا، ابوبکرؓ وعمرؓ کا بھوک سے بے قرار ہوکر گھر سے نکلنا، خالی پیٹ میلوں لمبی خندق کھودنا اور کھجوریں چوس چوس کر روح اور بدن کا رشتہ برقرار رکھنا اسی کی مثالیں ہیں، فقر وفاقہ کی یہ شدت غزوۂ خیبر ۷ھ تک رہی، حدیث باب غزوہ بدر کے بعد کا واقعہ ہے؛ کیونکہ حضرت ابوالدرداءؓ عین بدر کے دن ایمان لائے ہیں۔

مہاجرین کے مدینہ منورہ آجانے کے بعد شروع میں وہ مکمل انصار پر منحصر تھے جس سے ان کی اقتصادیت پر بوجھ پڑ گیا تھا اس مجلس میں غالباً دونوں طرف کے صحابہ موجود تھے، جو ایک دوسرے کی معاشی پریشانیوں سے فکرمند اور فقر فاقہ کی طوالت کے اندیشے سے گھبرا رہے تھے۔

﴿الفقر تخافون﴾ ہمزۂ وصلیہ وہمزہ استفہامیہ میں ادغام کے باعث مد کی شکل پیدا ہوگئی، قرآن میں اس کی نظیریں موجود ہیں جیسا کہ سورۂ یونس میں ہے آلْئٰنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ

تَسْتَعْجِلُوْنَ﴿۵۱﴾ آلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ﴿۹۱﴾ اسی طرح سورۂ نمل میں ہے اَللّٰهُ خَيْرٌ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴿۵۹﴾ مفعول مقدم ہونے کی وجہ سے فقر منصوب ہے کقوله تعالٰی وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ اس کا فائدہ بیان کرتے ہوئے امام طیبیؒ نے فرمایا:

فائدةُ تقديمِ المفعولِ هُنا الإهتمامُ بشأن الفقر فإن الوَالدَ المُشفِقَ إذا حَضَرهُ الموتُ كان إهتمامُه بحالِ وَلدِهٖ في المالِ فأعلَمَ صلَّى الله عليه وسلم أصحابَهٗ أنهٗ وَإن كَان لهُم في الشَّفقَةِ عَليهِم كالأبِ لكن حالُه في أمرِ المالِ يُخالِفُ حالَ الوَالِدِ وأنهٗ لا يخشٰى عَليهم الفَقرَ كما يخشَاهُ الوالدُ ولكن يَخشٰى عليهم مِن الغِنٰى الذى هو مطلوبُ الوَالِدِ لِوَلدِهٖ (فتح الباری)

یہاں مفعول کو مقدم کرنے کا فائدہ فقر کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے جب کسی مشفق باپ کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو اسے اپنی اولاد کے اقتصادی حالات کی فکر ہوتی ہے، یہاں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو یہی حقیقت سمجھائی ہے کہ وہ ان کے لئے گو باپ کی مانند ہیں؛ لیکن مال ودولت کے سلسلہ میں آپؐ کی کیفیت روایتی باپ سے مختلف ہے آپ کو مسلمانوں کی بابت والد کی طرح غریبی سے کوئی اندیشہ نہیں آپ تو اس خوشحالی کو مسلمانوں کیلئے مضر جانتے ہیں جس کی ہر باپ اپنی اولاد کے لئے تمنا کرتا ہے۔ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ أشار بذلك إلٰى أن مضرة الفقر دون مضرة الغِنٰى لأن مضرة الفقر دنيوية غالبا ومضرة الغنى دينية غالبا[1]

یعنی نبی کا اشارہ یہ ہے کہ غریبی کے نقصانات مالداری کے نقصانات سے کہیں کم ہیں؛ کیونکہ فقر کی مصیبت عموماً دنیا تک محدود ہوتی ہے جبکہ دولت کی مضرت اکثر دین کو نقصان پہنچاتی ہے، كاد الفقر أن يكون كُفرًا تو شاذ ونادر ہی دیکھنے میں آتا ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے دنیا کی مختصر سی مضرت سے توجہ ہٹا کر اسے اخروی مضرت کی طرف موڑ دیا جو پہلی سے زیادہ خطرناک اور ہزاروں درجے بڑھی ہوئی ہے تو صاحب ایمان کو صرف اسی کی فکر کرنی چاہئے۔

متشابہات کی توجیہ

﴿وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ﴾ واؤ قسمیہ ہے اور نفسی بیدہ جملہ اسمیہ ہوکر الذی

---

[1] فتح الباری

موصول کا صلہ ہوا پھر دونوں مل کرقسم ہوئے یدٌ سے تشبیہ کا گمان ہوتا ہے جس سے ذاتِ باری منزہ ہے لیس کمثلہ شئ اس لئے یہ لفظ متشابہات میں سے ہے جن کی بابت شیخ الاسلام حضرت کشمیریؒ نے دوقول نقل کئے ہیں: ۱ یؤکل علمه إلیه سبحانه وتعالیٰ اس کے مفہوم کواللہ کے حوالہ کیا جائے اور وضاحت میں ایک لفظ بھی نہ کہا جائے یہ قرونِ ثلاثہ کے سلف کا مسلک ہے۔

۲ أصلُ مذهبِ أهلِ السُنةِ اَلتفویضُ وَاَما التأویلُ فَعِند الضرورةِ والمُقابلةِ مَع الغیرِ من مُخَالِفِ أهلِ السُّنَّةِ یعنی اصل موقف تو تفویض ہی کا ہے جو اوپر گذرا؛ لیکن کسی خاص ضرورت کے وقت یا فِرَقِ باطلہ سے مقابلہ کے وقت تفہیم کے لئے تاویل وتشریح کی اجازت ہے یہ اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے والمتکلمون إنما احتاجوا الی التاویلات عند المناظرة مع معاند الإسلام[۱] چنانچہ اسلام دشمنوں سے مناظرہ کے وقت متکلمین تاویل وتفہیم پر مجبور ہوئے۔

﴿لتصبَّن علیکم الدنیا صبًّا ...... الاهیه﴾ تک پورا جملہ جواب قسم ہے یہ لام تاکید نونِ ثقیلہ سے واحد مؤنث غائب فعل مجہول کا صیغہ ہے اور اس کا نائب فاعل الدنیا ہے معنی کثرت سے بہانا انڈیلنا کقولہ تعالیٰ إنا صَبَبنا الماء صبًّا مفعول مطلق نے مفہوم کے اندر اور زیادہ کثرت وتاکید پیدا کردی، وہ فقر وفاقہ سے ڈر رہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا: یہ صورت تو چند روزہ ہے اب بہت جلد تمہارے اوپر دنیا کی ریل پیل ہونے والی ہے حتی کہ روم وایران کی سلطنتیں بھی تمہارے قدموں میں ہوں گی اور سونے چاندی کا تمہارے گھروں میں ڈھیر لگ جائے گا اس لئے فقر سے ڈرنا بیکار ہے، تمہیں تو اب تنافس سے ڈرنا چاہئے جو مال ودولت کا لازمی نتیجہ ہے صحیح بخاری کی حدیث موجود ہے إنی أُعطیت مفاتیح خزائن الارض أو مفاتیح الارض وإنی والله ما اخاف علیکم ان تشرکوا بعدی ولکنی اخاف علیکم أن تنافسوا فیها[۲] فتوحات کا یہ سلسلہ عہد رسالت ہی میں شروع ہوگیا اور ایک مرتبہ جب ابوعبیدہ بحرین سے جزیہ کا مال لیکر

---

۱ عرف الشذی ص ۲۰۰ ۲ کتاب الرقاق باب ما یحذر من زهرة الدنیا والتنافس فیها

لوٹے تو مسجد نبوی میں انصار کی بھیڑ لگ گئی، آپ نے اس کی تقسیم کے وقت فرمایا: فَوَاللّٰہِ مَا الفقرَ اخشٰی علیکُم ولکنِی أخشٰی علیکم ان تُبسَطَ الدُّنیا عَلیکُم کما بُسطَت علی مَن کانَ قَبلَکُم فَتَنافَسُوھا کما تنافسُوھا وتُھلِکَکُم کَمَا أھلَکَتھم[1] قرآن میں مال واولاد کو فتنہ کہا گیا إنما اموالکم واولادکم فتنۃٌ[3] جامع ترمذی کی روایت میں تو حضورؐ نے دولت کو خصوصاً امت مسلمہ کا فتنہ قرار دیا، اِنَّ لکل امۃٍ فتنۃً وفتنۃُ اُمتی المالُ[2] وفات نبوی کے بعد جب مسلمان تمام قوموں کو زیر کر کے فاتحانہ روم وایران میں داخل ہوئے تو مال غنیمت میں اتنی دولت ہاتھ لگی کہ مسجد نبوی کا صحن زر و جواہر سے بھر گیا امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تمام نصیحتیں یاد آئیں اور آپ نے تقسیم کرنے سے پہلے روتے ہوئے مسلمانوں کو دولت کی تباہ کاریوں سے خبردار کیا؛ کیونکہ گمراہی اور بے خوفی اسی سے پھیلتی ہے۔

﴿حتی لا یزیغ قلب احدکم ازاغۃ الاھیۃ﴾ زیغ کو علامہ سندھی اور شیخ الاسلام حضرت کشمیری نے باب افعال سے مانا ہے، قلب مفعول ہے ازاغۃ مفعول مطلق اور ھیہ یزیغ کا فاعل ہے مولانا عبدالرشید نعمانی نے زیغ کے مجرد ہونے اور ھیہ کے اسم فعل ہونے کا خیال ظاہر کیا ہے، ابن حجر عسقلانی تنافس کی تعریف یوں کرتے ہیں: الرغبۃُ فی الشیٔ ومحبۃُ الانفرادِ بہٖ والمغالبۃُ علیہ یعنی کسی چیز کی محبت انسان پر ایسی چھا جائے کہ وہ بس اسی کا ہو رہے اور دوسری تمام چیزوں کو فراموش کر دے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کے اس جملہ میں تنافس کے آخری نتیجہ کو واضح کیا ہے یعنی مال ودولت کی ہوس میں مادہ پرستی اس حد تک غالب آجائے کہ پوری زندگی دنیاوی منفعت ومضرت کے گرد ہی گھومنے لگے اور لوگ دینی کام بھی دنیاوی لالچ کے بغیر نہ کریں اس صورت میں آخرت میں جواب دہی کا تصور ذہنوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور پھر زہد وتقویٰ کی باتیں بے وقت کی راگنی لگتی ہیں، آج ہر صاحب بصیرت مسلمان اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔

---

[1] کتاب الزھد فصل لا ینبغی التنافس فی الدنیا

[2] ابواب الزھد/ باب ان فتنۃ ھذہ الامۃ فی المال

[3] سورۃ الانفال / ۲۸، سورۃ تغابن / ۱۵

ھیہ کی تحقیق

﴿ھیہ﴾ امام نووی نے شرح مسلم میں آخری ہاء پر جزم اور جر کی دو لغات نقل کی ہیں، شمائل ترمذی کے محشی نے لکھا ہے: ھیه بمعنی ایه فابدل من الھمزة ھاءًا وایه سمی به الفعل معناه الاستزادة یعنی اصلاً تو ایه ہے ہمزہ کو ہاء سے بدل دیا گیا یہ دو معنی کے لئے آتا ہے: ۱ کسی چیز سے نفرت کی بناء پر اسے دور کرنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ ۲ مزید بات کی فرمائش کے لئے، پھر، ایک دفعہ اور، مزید وغیرہ۔ یہاں دوسرا مفہوم مراد ہے، شمائل میں بھی ایک روایت میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے: عن شَرِيدٍ كُنتُ رِدفَ رسولِ اللّٰهِ صلَّى اللّٰهُ علَيهِ وسلَّمَ فَانْشَدْتُهُ مأةَ قَافِيَةٍ مِن قَوْلِ اميةَ بنِ ابى الصَّلتِ كُلمَا أنشدتُه بيتًا قال لى النبيُّ صلى اللّٰه عليه وسلم ھيه حتى انشَدتُه مائةً[1] علامہ سندھی لکھتے ہیں: ھیه بسکون الیاء کلمةٌ يُستزادُ بها الشيُ والمعنى لَا يُمِيلُ قلب احدِكم امالةً إلا طلب الزيادة یعنی دولت کی حرص ہی تمہارے دِلوں کو مائل کر سکے گی۔ سندھی کے نزدیک دوسرا احتمال یہ ہے ان یکون بفتح الیاء والھاء فی اخرھا للوقف وھی ضمیر راجع إلى الدنيا اى حتى لا يميل قلب احدكم إلا الدنيا ۔ ھیه اس صورت میں ھی ضمیر ہے جو دنیا کی طرف لوٹتی ہے یعنی تمہارے دِلوں کو صرف دنیا ہی مائل کر سکے گی۔

﴿وایم اللّٰہ﴾ بخاری و مسلم میں یہ لفظ وایم الذی نفس محمد بیدہٖ کے ساتھ آیا ہے، شارح فضل اللہ تورپشتی لکھتے ہیں: الاصل فى ايم اللّٰه ايمن اللّٰه حُذف منه النونُ وهو اسم وضع للقسم ۔ حضرت مولانا عبدالحفیظ بلیاویؒ مصباح اللغات میں کہتے ہیں یہ اسم ہے جو قسم کے لئے وضع کیا گیا ہے اور اس کی تقدیر ایمنُ اللّٰه قسمی ہے، اس میں اور بھی لغات ہیں:

﴿لقد ترکتکم﴾ علامہ سندھی نے اس کی دو صورتیں لکھی ہیں: ۱ ای فارقتکم بالموت فصیغة الماضی بمعنی الاستقبال یعنی میں موت کے ذریعہ تم سے رخصت

---

[1] باب فی صفة کلام رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فی الشعر.

ہونے والا ہوں۔ ۲ اوقد اجتھدتُ فی اصلاح حالکم حتی صرتم علی ھذا الحال ترکتکم علیھا واشتغلت عنھا بامور اُخر کالعبادۃ فصیغۃ الماضی علی معناھا یعنی لفظ کو اگر ماضی کے صیغہ پر رکھیں تو یہ معنی ہوں گے کہ میں نے تمہاری اصلاح میں اتنی محنت کی جب تم اس مقام پر پہنچے تو اب میں تم سے یکسو ہو کر عبادات وغیرہ میں منہمک ہوں۔

بیضاء کے معنی

﴿مثل البیضاء﴾ علامہ سندھی نے اس کے دو معنی نقل کئے ہیں: ۱ ان ھذا بیانُ حالِ القُلوبِ لا لِحالَۃِ المِلۃِ والمعنی القلوب ھی مثل الارض البیضاء لیلاً ونھارًا یہ شریعت وملت کا نہیں بلکہ صحابہ کے دِلوں کے حال کا بیان ہے یعنی وہ اس زمین کی مانند ہیں جو دِن ورات میں یکساں چمکتی ہے، اور اسے کوئی چیز میلا نہیں کرتی۔ ۲ وَیحتملُ اَن یکونَ لفظُ المِثلِ مُقحمًا والمعنَی القلوب بیضاءُ نقیۃٌ عَن المیلِ الی الباطلِ لَا یُمیلُھا عَن الاقبالِ الی اللّٰہِ السرّاءِ والضرّاءِ اگر مثل زائد ہے تو اس کے معنی ایسے قلوب ہیں جنہیں دھو کر اس طرح صاف کر دیا گیا ہو کہ اب نرم وگرم دونوں حالات میں وہ اللہ سے نہیں پھر سکتے، سندھی کی دونوں توجیہات کا خلاصہ صحابہ کے پاک وصاف دل ہیں جبکہ شیخ الاسلام حضرت کشمیریؒ نے بیضاء کو ملت کی صفت قرار دیا ہے یعنی ملۃ ظاھرۃ صافیۃ خالصۃ عن الشرك والشبھۃ وہ شرک وشبہات سے پاک وصاف ایسی شریعت ہے جو انسان پر اس کی وسعت کے بقدر بوجھ ڈالتی ہے[۱]۔ تورپشتی کی عبارت سے بھی کشمیری ہی کی تائید ہوتی ہے، لکھتے ہیں وَصفَ المِلۃَ بالبیاضِ تَنبیھًا علی کَرمِھا وفَضلِھا لانَّ البَیاضَ لِمَا کانَ أفضلَ اللَّونِ عند العَربِ عُبِّرَ بہ عَن الکَرمِ والفضلِ حتّی قِیلَ لِمنْ لَم یَتدنَّسْ بمَعابٍ ھُو ابیضُ الوُجودِ[۲] یعنی شریعت کی فضیلت واہمیت سے آگاہ کرنے کے لئے آپ نے ملت کو سفید رنگ سے تشبیہ دی ہے کیونکہ عربوں کے نزدیک افضل رنگ ہونے کی وجہ سے بیاض کے ذریعہ فضل وکرم کو تعبیر کیا گیا جو شخص تمام عیوب سے پاک ہوتا ہے عرب اسے ابیض الوجود کہتے ہیں تو گویا پہلی توجیہ دوسری کا نتیجہ ہے اور دونوں ہی دل لگتی ہیں، البتہ ترجمۃ الباب کا ثبوت علامہ تورپشتی اور حضرت کشمیری کی توجیہ میں مضمر ہے۔

﴿لیلها فنهارها سواء﴾ دونوں میں ھاء ضمیر کا مرجع البیضاء ہے، شیخ الاسلام حضرت کشمیری نے فرمایا: المرادُ منَ اللَّيلَةِ البَيضاءِ السُّنَّةُ ومِنَ النَّهارِ القرآنُ یعنی شب روشن سے مراد سنت نبوی اور دن سے مراد قرآن ہے گویا کتاب اللہ سورج کی طرح روشن اور سنت آفتاب کی طرح تاباں ہے، اور شریعت کی یہ دونوں بنیادیں محفوظ اور منور ہیں، یہاں تک وایم الله سے شروع ہونے والا جملہ پورا ہوگیا، جس کا ماقبل سے ربط یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ایسی واضح اور روشن شریعت دی ہے جس میں فقر و دولت دونوں حالتوں میں مکمل رہنمائی موجود ہے، فقر عزیمت ہے اور دولت رخصت، صحابہ نے صرف ایک پہلو کو دیکھ کر اندیشے ظاہر کئے، رسول نے دوسرا پہلو دکھا کر انہیں مستقبل کی آزمائش سمجھادی اور اشارۃً یہ بتلادیا کہ نبوت فقر و مسکنت سے قریب ہے مال و دولت سے نہیں۔

امام نے باب اتباع السنة کے تحت یہ روایت نقل کی ہے مفہوم ظاہر ہے کہ نبی کی سنت امیری نہیں فقیری ہے، اس لئے سنت کا اتباع زہد کی عظمت میں مضمر ہے اور مال و دولت کی کثرت اکثر و بیشتر زہر ہلاہل ثابت ہوتی ہے، جو صراط مستقیم سے انسان کو ہٹادیتی ہے تو حدیث میں دو جگہ تو اشارۃ النص سے اور تیسری جگہ دلالۃ النص یعنی البیضاء سے ترجمۃ الباب ثابت ہوتا ہے جس کا راجح مفہوم سنت ہی ہے۔

حدیث باب ابن ماجہ کی انفرادیات میں سے ہے جس کے ایک راوی محمد بن عیسٰی بن قاسم بن سمیع امیر معاویہؓ کے مولی ہیں، حافظ ابن حجر نے تقریب (۶۲۰۹) میں ان کے بارے میں لکھا ہے "صَدوقٌ يُخطِئ ويُدلِّس ورُمي بِالقَدر" اس لئے روایت ضعف کی وجہ سے حسن کے درجہ میں آجاتی ہے۔

(۶/۶) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بنُ بَشَّارٍ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بنُ جَعفَرٍ حَدَّثَنا شُعبَةُ عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ قُرَّةَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِيْ مَنْصُوْرِيْنَ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ.

طائفة طواف سے اسم فاعل کا مؤنث ہے اور من امتی اسم ہی سے متعلق ہے جبکہ منصورین اس کی خبر ہے، اشکال ہوتا ہے کہ طائفة واحد مؤنث کی خبر جمع مذکر کی صورت میں

کیونکر آئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ طائفة محض لفظاً واحد مؤنث ہے معنیً وہ جمع مذکر ہی ہے جیسے کہ جماعة پھر خبر کو مذکر لانے میں طائفة کی طاقت و دبدبہ کا اظہار ہے، جبکہ طائفة کے نکرہ لانے میں تین حکمتیں ہوسکتی ہیں: ۱؎ تقلیل یعنی یہ لوگ شرذمة قلیلة بس معدود چند ہوں گے۔ ۲؎ تکثیر یعنی ان کی تعداد اچھی خاصی ہوگی اور وہ دشمنوں پر ہر دور میں بھاری پڑیں گے۔ ۳؎ تعظیم یہ جماعت روئے زمین پر موجود تمام مسلمانوں سے افضل ہوگی علامہ سندھی نے طائفة کی تعداد مجاہد کے حوالہ سے الواحد إلى الف، ابن عباس سے النفر اور الواحد فما فوقه نقل کی ہے، جب کہ قرطبی سے الطائفة الجماعة اور ابن راہویہ سے الطائفة دون الالف مروی ہے، جس کی رو سے صرف تقلیل کے معنی راجح ہیں اور دوسرے قرائن کی بناء پر اس میں تعظیم کی صورت بھی شامل ہوجائے گی، جبکہ تکثیر کا احتمال بھی اس معنی کر صحیح ہوسکتا ہے کہ طائفة کا تناسب امت کی مجموعی تعداد کے حساب سے ہوگا اگر کسی زمانہ میں ہماری تعداد محض ایک لاکھ ہے تو طائفة کے افراد ایک ہزار تک ہوسکتے ہیں اور آج کی طرح اگر مسلمان ایک اُرب سے زائد ہوں تو طائفة بھی لاکھوں میں ہوگا، یہ لغوی تحقیق تھی علمی بحث ہم آگے کریں گے، روایت بخاری (اعتصام/۱۱) مسلم (ایمان/ ٦٧، امارة/۵۲) وغیرہ میں بھی آئی ہے، حدیث کی سند صحیح ہے اور دِمیری کی صراحت کے مطابق تمام رُواۃ بصری ہیں۔

(۷/۷) حَدَّثَنَا اَبُو عَبْدُ اللّٰهِ قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ حَمْزَةَ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو عَلْقَمَةَ نَصْرُ بْنُ عَلْقَمَةَ عَنْ عُمَيْرِ بْنِ الْأَسْوَدِ وَكَثِيْرِ بْنِ مُرَّةَ الْحَضْرَمِيْ . عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِيْ قَوَّامَةً عَلَى اَمْرِ اللّٰهِ لَا يَضُرُّهَا مَنْ خَالَفَهَا .

میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ دین کی نگراں رہے گی اور مخالفت کرنے والے اس کا بال بیکا نہ کرسکیں گے۔

قوّام کے معنی منتظم ونگراں کے ہیں، سورۂ نساء کی آیت الرجال قوّامون على النساءِ اسی کی شہادت دیتی ہے، اب حدیث کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک جماعت ہمیشہ ایسی موجود رہے گی جو امت کے انتظام کو درست کر کے اس کی تمام منصبی ضروریات کو پورا کرے گی اور دینی

سرمایہ کی حفاظت میں اپنا لہو بہاتی رہے گی، صحیح مسلم کے طریق میں یہ لفظ قائمة بأمر اللّٰه کی صورت میں آیا ہے جبکہ وہاں دوسرے طرق میں یُقاتِلُ علیه عِصابةٌ من المُسلِمِینَ اور یُقاتلُون عَلی الحقِ کا بھی اضافہ ہے، قوامة سے متعلق شارحین کے اقوال کا خلاصہ سندھی کے الفاظ میں یہ ہیں: ”أی بشَریعتِه وَدینِه وتَروِیجِ سُنةِ نَبِیّه أو الجِهادِ مع الکُفارِ، حدیث کے ذیل میں اصولاً دو بحثیں ہیں: ۱ طائفہ کا مصداق امت کا کونسا طبقہ ہے۔ ۲ یہ لوگ کب تک رہیں گے اور حتّٰی تقوم الساعة سے کیا مراد ہے؟

طائفۂ منصورہ

پہلے سوال کا جواب امام بخاریؒ نے هم أهلُ العلمِ[1] عبداللہ بن مبارک نے هم عندی أصحابُ الحدیثِ[2] اور امام احمد ابن حنبل نے إن لم یکونوا أهلَ الحدیثِ فلا أدری من هم[3] کے ذریعہ دیا ہے، قاضی عیاضؒ نے امام احمد کے بارے میں لکھا ہے إنّما أرادَ أحمدُ أهلَ السنةِ والجماعَةِ ومَنْ یَعْتَقِدُ مَذهبَ أهلِ الحَدیثِ[4] امام نوویؒ نے اس میں توسع اختیار کیا ہے، فرماتے ہیں: قُلْتُ وَیحْتَمِلُ اِنَّ هٰذِهِ الطائفةَ مُفرَّقَةٌ بینَ انواعِ المؤمنینَ مِنهم شُجعانٌ مُقاتِلونَ ومِنْهُم فُقهاءُ ومنهم مُحَدِّثُونَ ومِنْهُم زُهَّادٌ وامِرُون بالمعرُوفِ والنَّاهُون عَن المُنْکَرِ ومنْهُم اهلُ أنواعٍ أُخری من الخیرِ[5] ملا علی قاریؒ نے بھی کچھ اسی طرح کی توجیہ کی ہے، لکھتے ہیں: فی الحدیث إشارة إلی انَّ وجه الأرض لا یخلوا من الصلحاء الثابتین علٰی اوامر اللّٰه المتباعدین عن نواهیه الحافظین لأمور الشریعة یستوی عندهم[6] .

ان تمام اقوال کا خلاصہ علماء، محدثین، فقہاء، اہل صلاح وتقویٰ، صوفیاء، مبلغین اور مجاہدین کی صورت میں نکلتا ہے، گویا کسی بھی حیثیت سے دین کی خدمت کرنے والا اس جماعت میں داخل ہے، شیخ الاسلام حضرت کشمیریؒ کا رجحان صرف مجاہدین کی طرف ہے اور وہ

---

۱ صحیح بخاری کتاب الاعتصام، باب لا تزال طائفة من أمتی

۲، ۳، ۴، ۵ شرح صحیح مسلم کتاب الامارة باب لا تزال طائفة من امتی

۶ مرقاة المفاتیح

اس حدیث کو سنن ابی داوٗد کی روایت الجهادُ مَاضٍ مُنذُ أن بَعَثَنِيَ اللّٰهُ إلٰى أن يُقَاتِلَ اٰخِرُ أُمتي الدَّجَّالَ کی عملی تفسیر سمجھتے ہیں؛ کیونکہ صحیح مسلم کے طرق میں یقاتلون علی الحق کی صراحت موجود ہے اور کتاب الایمان میں امام مسلمؒ نے باب نزول عیسٰی بن مریم کے تحت اس کی جو مفصل روایت کی ہے اس سے بھی حضرت کشمیریؒ کے موقف کی تائید ہوتی ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں: لا تزال طائفة من أمتي يقاتلون على الحق ظاهرين إلى يوم القيٰمة قال فينزل عيسى بن مريم[۴] اس قول کی روشنی میں مذکورہ اقوال کی تاویل کی جائے گی کہ مجاہدین کا اہل سنت والجماعت کے ان تمام طبقوں سے تعلق ہوگا جن کی نشاندہی امام احمد بن حنبل، امام بخاری، عبداللہ ابن مبارک، امام نووی، اور ملاعلی قاریؒ نے کی ہے، حدیث کے دوسرے طرق میں ظاهرون على الناس اور على الأرض کی بھی تصریح ہے یعنی یہ لوگ دشمنوں پر بھاری پڑیں گے اور مسلمانوں کے دِلوں میں ان کی بڑی عظمت اور وقعت ہوگی لا يضرهم من خذلهم، من ناواهم اور من خالفهم کے الفاظ آج حقیقت بن چکے ہیں، یہود ونصاریٰ انتہاء پسند، بنیاد پرست، اور دہشت گرد کی گالیاں دے کر مجاہدین کو دبانا چاہتے ہیں؛ لیکن طائفہ منصورہ ہے کہ قابو ہی نہیں دیتا اور اس کے آخری دستے امام مہدی اور مسیح کی قیادت میں یہود ودجال سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے بے تاب ہیں یہ طائفہ کے مصداق سے متعلق بحث تھی، اب دوسری بحث باب کی دسویں حدیث کے تحت ہوگی، تخریج گزر چکی، حدیث کی سند درست ہے محدثین کو مراد لینے کی صورت میں تو ترجمۃ الباب ظاہر ہے، وہ اتباع سنت کے سب سے بڑے علم بردار ہیں جبکہ مجاہدین یا دوسرے طبقوں کو اگر ترجیح دی جائے تو ترجمہ کے ثبوت کے لئے ہم کہیں گے کہ یہ تمام خصوصیات سنت پر عمل کرنے کا نتیجہ ہیں۔

(۸/۸) حَدَّثَنَا اَبُوعَبْدُ اللّٰهِ قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ حَدَّثَنَا الجَرَّاحُ بْنُ مَلِيحٍ حَدَّثَنَا بَكْرُ بْنُ زُرْعَةَ قَالَ: سَمِعْتُ اَبَا عِنَبَةَ الخَوْلَانِي وَكَانَ قَدْ صَلَّى القِبْلَتَيْنِ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: لَا يَزَالُ اللّٰهُ يَغْرِسُ فِي هٰذَا الدِّيْنِ غَرْسًا يَسْتَعْمِلُهُمْ فِي طَاعَته .

اللہ تعالیٰ اس دین کے اندر مسلسل ایسے لوگوں کو پیدا کرتا رہے گا جن کو وہ اپنی اطاعت

میں استعمال کرے گا۔

رسول اللہ ﷺ سے قبل دنیا میں مبعوث ہونے والے انبیاء ورسل کی نبوت ایک مخصوص قوم اور متعین زمانے تک محدود تھی آئندہ نسلیں ان کا مخاطب نہ تھیں اس لئے ان کی شریعت وتعلیمات کو دوسروں کے لئے محفوظ نہیں کیا گیا اور وہ سب اپنے دور کے ساتھ ہی نظروں سے اوجھل ہوگئی لیکن سید الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تھے اور ایک دائمی شریعت دیکر آپ کو حال ومستقبل کے تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا، اب حکمت الٰہی کا تقاضہ ہوا کہ دین محمدی کو اس کی حقیقی شکل میں محفوظ کردیا جائے، اور لوگ قیامت تک اس امانت سے بے کم وکاست فائدہ اٹھاسکیں اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ اسی کا اعلان تھا اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حفاظت قرآن وسنت تک محدود رہے گی؛ بلکہ آیت کا مفہوم عملاً ایسے گروہ پر دلالت کرتا ہے جو گردش زمانہ کی چیرہ دستیوں کے باوجود دین کے صحیح تصور کا حامل اور اس کے تقاضوں پر عمل کرتا رہے گا، وہ درحقیقت ہر دور کے مسلمانوں کے لئے صحابہ وتابعین کی زندہ تصویر ہوگا، اور پوری امت میں اسی کے دم سے دینی اسپرٹ باقی رہے گی، علامہ سندھی نے حدیث کے مفہوم میں دو احتمال ظاہر کئے ہیں: انه اَعمٌّ فیشمُلُ کُلَّ مَن یَدعُو الناسَ إلی اِقامةِ دینِ اللّٰه وطاعتِهِ وسُنة نبیهِ گویا یہ وَلْتکن مِنکُم أمَةٌ یَدعُونَ إلَی الخَیرِ ویأمُرُونَ بالمَعرُوفِ وَیَنهَوْنَ عَنِ المُنکَرِ کا عملی مظہر ہے، جس کا نتیجہ اقامت دین ہے، حدیث میں غرس کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنی کھیتی کے ہیں جس طرح ایک کسان اپنی کھیتی کی دل وجان سے حفاظت کرتا ہے اور مہلک جراثیم کو اس کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتا اسی طرح باری تعالیٰ خصوصی طور پر امت میں ایسے افراد پیدا کرتا ہے جن کی سرشت میں صلاح وتقویٰ ہوتا ہے وہ توفیق الٰہی کے سایہ میں پروان چڑھتے ہیں اور سعادت کو مجروح کرنے والی تمام چیزوں سے ان کی حفاظت کی جاتی ہے، تب جاکر دنیا یَحمِلُ هٰذَا الدِّیْنَ مِنْ کُلِّ خَلَفٍ عُدولُه ینفُون عَنه تحریفَ الغَالینَ وانتحالَ المُبطِلینَ وتَاویلَ الجَاهِلِینَ سے آشنا ہوتی ہے، اس طرح علم وعمل، دعوت وتبلیغ اور جہاد وشہادت وغیرہ جیسے کسی بھی میدان میں مخلصانہ طور پر کام کرنے والے اس حدیث کے زمرہ میں آتے ہیں۔

تجدید دین

دوسرا احتمال علامہ سندھی نے یہ ظاہر کیا لعل هذا هو المجدد للدين على رأس كل مائة سنة شیخ محمد علوی نے بھی مفتاح الحاجہ میں اسی معنی کا تذکرہ کیا ہے، تجدید کی تعریف إحياء ما اندرس من العمل بالكتاب والسنة والأمر بمقتضاهما یعنی دین پر جمی گرد وغبار کو جھاڑ کر دلوں میں اس کی عظمت کو اتار دینا، اور معاشرے کو حرکت دیکر اس کا رخ خیر القرون کی طرف پھیر دینا، تجدید کی اصل سنن ابی داؤد کی روایت ان الله يبعث لهذه الأمة على رأس كل مائة سنة من يجدّد لها أمر دينها ہے، اس میں دو باتیں غور طلب ہیں:

(۱) مجدد کوئی جماعت ہوتی ہے یا تنہا ایک فرد، اہل علم کی ایک تعداد فرد کو اس کا مصداق قرار دیتی ہے گویا پوری صدی میں کوئی ایک شخص ہی مجدد ہوگا جبکہ محدثین کی اکثریت جماعت پر اس کا اطلاق کرتی ہے یعنی ایک زمانے میں کئی کئی مجدد ہو سکتے ہیں، ابن حجر، ملا علی قاری، مولانا گنگوہی، نواب صدیق حسن خان بھوپالی، مولانا یحییٰ کاندھلوی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی علیہم الرحمۃ کی یہی رائے ہے جبکہ نواب قطب الدین دہلوی اور حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے نزدیک دونوں صورتیں ممکن ہیں۔

دوسری غور طلب چیز على رأس كل مائة سنة ہے، یہ قید احترازی ہے یا اتفاقی؟ بعض احترازی کہتے ہیں جس کی رو سے مجدد کا زمانہ صدی کا آخر یا شروع ہی ہوسکتا ہے، دوسرے طبقہ کے نزدیک وہ اتفاقی ہے، مولانا نعمانی نے تذکرہ مجدد الف ثانی میں اسی کی وکالت کر کے احترازی کی مکمل تردید کی ہے، پوری بحث کے لئے ملاحظہ ہماری کتاب امام مہدی شخصیت وحقیقت باب سوم فصل دوم۔

ابن ماجہ یہ حدیث باب اتباع السنة میں لائے ہیں جو بظاہر بے جوڑ ہے کیونکہ حدیث میں اطاعت باری کا تذکرہ ہے اتباع سنت کا نہیں؛ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو روایت کا ترجمۃ الباب سے بڑا گہرا تعلق ہے اس لئے کہ اطاعت باری کی پہلی سیڑھی اتباع سنت ہی ہے اور رسول کی پیروی کے بغیر کوئی بھی اللہ کی اطاعت نہیں کر سکتا، قرآن وحدیث میں اس کی بے شمار شہادتیں موجود ہیں من يطع الرسول فقد اطاع الله، من اطاعني فقد

اطاع اللّٰہ ومن عصانی فقد عصا اللّٰہ وغیرہ تو یستعملھم فی طاعتہ ترجمۃ الباب ہے، یعنی اللہ کی اطاعت کے لئے یہ لوگ رسول کی سنت کو مضبوطی سے پکڑیں گے، حدیث کی سند درست ہے بوصیری نے زوائد ابن ماجہ (۴۴/۱) میں لکھا اسنادہ صحیح رجالہ کلھم ثقات.

(۹/۹) حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ حُمَيْدِ بْنِ كَاسِبٍ حَدَّثَنَا الْقَاسِمُ بْنُ نَافِعٍ حَدَّثَنَا الْحَجَّاجُ بْنُ اَرْطَاةَ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيهِ قَالَ : قَامَ مُعَاوِيَةُ خَطِيبًا فَقَالَ اينَ عُلَمَاؤُكُمْ اينَ عُلَمَاؤُكُمْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ لَا تَقُومُ السَّاعَةُ اِلَّا وَطَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِي ظَاهِرُونَ عَلَى النَّاسِ لَا يُبَالُونَ مَنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ نَصَرَهُمْ .

سیدنا امیر معاویہ تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے اور فرمایا تمہارے علماء کہاں ہیں؟ تمہارے علماء کہاں ہیں؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت نہیں آئے گی مگر میری امت کی ایک جماعت اس وقت بھی لوگوں پر غالب رہے گی وہ نہ اس کی پرواہ کریں گے جو ان سے علیحدہ رہے گا اور نہ اس کی جو ان کی مدد کرے گا۔

اس روایت کی تفصیل صحیح بخاری (مناقب/۲۷) میں آئی ہے کہ جب امیر معاویہ نے لوگوں کو یہ روایت سنائی تو ان کے ایک مصاحب عمیر بن ہانی نے کہا کہ مالک بن یخامر نے حضرت معاذ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ یہ لوگ شام میں ہوں گے، امیر معاویہ بولے: ھٰذا مَالكٌ يَزْعَمُ انه سَمِعَ معاذًا يقول وهُم بالشام کہ دیکھو مالک کا گمان ہے کہ انہوں نے حضرت معاذ کو یہ فرماتے سنا تھا کہ وہ طائفہ منصورہ شام میں ہوگا، روایت سنانے کا حضرت معاویہ کا یہی مقصد تھا کہ وہ حضرت علی کے خلاف اس سے اپنی حقانیت پر استدلال کرنا چاہتے تھے، حالانکہ احادیث کی روشنی میں اہل سنت والجماعت کے نزدیک حق حضرت علی کے ساتھ تھا اور امیر معاویہ اجتہادی غلطی پر تھے، اس لئے وہ اس جماعت کا مصداق نہیں، شیخ الاسلام حضرت کشمیری لکھتے ہیں اِنَّ الحدیث ورد نظرًا الی زمنِ عیسی علیه السلام فان الخیرَ لا یکونُ فی زمانه الا بالشام او هو بناءً علی الحدیثِ الذی اِختَلَفَ فیه المُحدِّثُونَ اَن الابدالَ اکثرُهم بالشام ولا تعلُّقَ له بما یُشیرُ الیه معاویةُ یعنی

حدیث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے پس منظر کی ہے کیوں کہ ان کے زمانے میں ہی شام خیر کا مرکز ہوگا یا اس کی بنیاد وہ مختلف فیہ حدیث بھی ہوسکتی ہے کہ ابدال کی اکثریت ملک شام میں ہوگی، امیر معاویہ کے استدلال سے اس کا کوئی تعلق نہیں، سند کے پہلے راوی یعقوب بن حمید بن کاسب مدنی زیادہ مضبوط نہیں ابن حجر نے تقریب (۷۸۱۵) میں انہیں صدوق ربما وھم قرار دیا ہے: دوسرے راوی قاسم بن نافع کو ذہبی نے میزان الاعتدال (۳۸۱/۲) میں مجھول اور ابن حجر نے تقریب (۵۵۰۲) میں مستور قرار دیا ہے، تیسرے راوی حجاج بن ارطاۃ، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، امام نسائی، دارقطنی، ابن عدی، قطان اور ابن مہدی کے نزدیک مضبوط نہیں، ابن حجر نے ان کے بارے میں تقریب (۱۱۱۹) میں لکھا ہے صدوق کثیر الخطاء والتدلیس اس لئے روایت درجہ صحت تک نہیں پہنچتی۔

(۱۰/۱۰) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّار حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بنُ شُعَيْبٍ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بنُ بَشِيْرٍ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَبِي قِلَابَةَ عَنْ أَبِي اَسْمَاءَ الرَّحَبِيْ عَنْ ثَوْبَانَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِن اُمَّتِي عَلَى الحَقِ مَنْصُورِينَ لَا يَضُرُّهُم مَنْ خَالَفَهُم حَتّٰى يَأْتِيَ اَمْرُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ.

شرح وترجمہ گذر چکا ہے یہاں ہم صرف حتی یاتی امر اللہ پر بحث کریں گے، جس کا باب کی ساتویں حدیث کے تحت ہم نے تذکرہ کیا ہے، صحیح مسلم کی حدیث ہے لا تقوم الساعة حتی یقال اللّٰہ اللّٰہ فی الارض اسی ضمن کی دوسری حدیث لا تقوم الساعة الا علی شرار الخلق دونوں سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ قیامت کے قریب دنیا مسلمانوں سے خالی ہوجائے گی اور اس وقت صرف کفار اور مشرکین ہی بچیں گے پھر یہ طائفہ قیامت تک کیسے رہے گا؟ امام نووی لکھتے ہیں لاَ مخالفةَ بينَ الاحاديثِ لانَّ المُرادَ مِن امرِ اللّٰهِ الريحُ اللينةُ التي تَاتي قريب الساعة فتاخذ روحَ كلِ مؤمنٍ ومؤمنةٍ ابن حجر نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے لکھتے ہیں ان المراد بأمر اللّٰه هبوب تلك الريح مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ نے اپنے حاشیہ میں ان اقوال کو اس طرح جمع کیا ہے ان هذهِ الطائفة تبقى الى عين مجيئ الريح التى تقبض روح كل مؤمن ثم يبقى شِرار الخلق عليهم

تقوم الساعة اقامت ساعت کی تعبیر گویا ان حضرات کے نزدیک محض قربِ قیامت کی طرف اشارہ ہے، ورنہ درحقیقت اس سے وہ ہوا مراد ہے جو قیامت سے پہلے چل کر اہل ایمان کی روحیں قبض کرلے گی اور دنیا میں ایک بھی مسلمان باقی نہ رہے گا۔

ریح کی تاویل اسی وقت ہوگی جب ہم طائفہ کو عام مانیں؛ لیکن شیخ الاسلام حضرت کشمیری کے مطابق اگر اس کا مصداق صرف مجاہدین کو قرار دیا جائے تو اس طائفہ کی عمر ریح کے بجائے خروج دجال اور وفاتِ عیسیٰ تک ہوگی، کیونکہ جہاد کے معرکے گذشتہ حدیث کے مطابق مہدی اور مسیح کے دور پر جاکر ختم ہوجائیں گے، ان دونوں کی وفات کے بعد پھر دین کے بالکلیہ مٹ جانے کا دور ہے اور اس میں قتال کی ضرورت نہیں، إلى ان يقاتل اخر امتي الدجال اور يضع الجهاد کا یہی مطلب ہے، حدیث کے ایک راوی سعید بن بشیر ازدی کو یحییٰ بن معین، ابن حبان، حاکم، امام بخاری، امام نسائی، اور ابن حجر نے ضعیف قرار دیا ہے اس لئے سند مضبوط نہیں؛ لیکن اس سے متن حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑتا؛ کیونکہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اقتضاء الصراط المستقیم میں اور امام جعفر کتانی نے نظم المتناثر فی الحدیث المتواتر میں اس کو متواتر قرار دیا ہے۔

(۱۱/۱۱) حَدَّثَنَا اَبُو سَعِيد عَبْدُ اللّٰهِ قَالَ كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ فَخَطَّ خَطًّا وخَطَّ خَطَّيْنِ عَنْ يَمِينِهٖ وخَطَّ خَطَّيْنِ عَنْ يَسَارِهٖ ثُمَّ وَضَعَ يَدَهُ فِي الخَطِّ الاَوْسَطِ فَقَالَ هٰذَا سَبِيلُ اللّٰهِ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الآية ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ

حضرت جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ کے پاس تھے، آپ نے ایک لکیر کھینچی پھر دو لکیریں اس کے دائیں جانب، اور دو ہی لکیریں بائیں جانب کھینچیں، اور پہلی والی درمیانی لکیر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے اس کے بعد یہ آیت پڑھی: ''بیشک یہ میرا راستہ ہے، سو اسی کی اتباع کرو اور دیگر راستوں پر نہ چلو وہ تمہیں راہِ راست سے بھٹکا دیں گے''

خط خطاً نصر کے باب سے آتا ہے معنی لکیر کھینچنا، ملا علی قاری لکھتے ہیں: ''اى لأجلنا تعليمًا وتفهيمًا وتقريبًا لأنَّ التمثيل يجعل المقصود من المعنى كالمحسوس

من المشاهد فی المبنیٰ" یعنی تعلیم وتفہیم اور حقیقت کو ہمارے ذہنوں سے قریب کرنے کے لئے آپ نے لکیر کھینچی کیونکہ مثال محسوسات کے معنی مرادی کو مجسمات کی طرح واضح کردیتی ہے خطاً ملاعلی قاری لکھتے ہیں ای خطاً مستقیمًا۔

﴿وخط خطین عن یمینہ وخط خطین عن یسارہ﴾ یہاں صرف دو لکیروں کا تذکرہ ہے جبکہ مسند احمد اور سنن دارمی کی روایت میں ثم خط خطوطًا عن یمینہ وعن شمالہ منقول ہے جس کی وضاحت ملاعلی قاری نے سبعةً صغارًا منحرفةً سے کی ہے نیز دونوں کی روایت میں ھذہ سُبل علی کل سبیل منھا شیطان یدعو الیہ کا بھی اضافہ ہے۔

ھذا سبیلُ اللّٰہِ سندھی نے لکھا ہے المرادُ بھَا الدینُ القویمُ والصراطُ المستقیمُ دین قیم اور صراط مستقیم کی وضاحت ملاعلی قاری یوں کرتے ہیں: وھُمَا الإعتقادُ الحقُ والعملُ الصالحُ وھذا الخطُ لما کان مثالا یُسماہ سبیلَ اللّٰہ یعنی دین حق صحیح عقائد اور اعمالِ صالحہ سے عبارت ہے اور اس لکیر کو آپ نے بطور مثال سبیل اللّٰہ قرار دیا۔

﴿وإنّ ھذا صِراطِی مُستقیمًا فاتبعوہ﴾ حالیت کی بناء پر مستقیم منصوب ہے، یعنی صرف سیدھے راستہ کی پیروی کرو، ملاعلی قاری لکھتے ہیں: إن سبیلَ اللّٰہِ وَسَطٌ لیسَ فیہِ تفریطٌ ولا إفراطٌ بل فیہ التوحیدُ والإستقامةُ ومراعاة الجانبین فی الجادَة اللہ کا راستہ درمیانی ہے جس میں افراط وتفریط نہیں ہے بلکہ یکسوئی، استحکام اور وسط شاہراہ پر چلتے ہوئے دونوں سمتوں کی رعایت ہے۔

﴿ولا تتبعوا السُّبل﴾ ملاعلی قاری کہتے ہیں ای سبلُ الشیاطینِ المنحرفةُ الزائغة المتشعبةُ من طرقِ الشرکِ والبدعةِ التی اشارَ إلیھا صلی اللّٰہ علیہ وسلم بقولہٖ سَتفْتَرِقُ امتی علی ثلاثٍ وسبعین فِرقةً کُلُّھا فی النارِ إلا التی علی ما کنتُ علیہ انا واصحابی یہ شرک وبدعت کے راستوں سے پھٹ کر نکلنے والی وہ منحرف اور ٹیڑھی پگڈنڈیاں ہیں جن کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۷۳ فرقے والی حدیث میں اشارہ کیا ہے کہ راہِ حق پر گامزن صرف وہی طبقہ ہے جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقہ پر ہو، ملاعلی قاری مزید لکھتے ہیں کہ سبل اھل البدع ما ئلة إلی الجوانب وفیھا تقصیر وغلو

ومیل وانحراف وتعدد واختلاف اہل بدعت کے راستے کسی ایک جانب مائل ہوتے ہیں، ان میں نقص، غلو، انحراف، تضاد اور بڑی شقیں ہوتی ہیں، اس کی مثال میں انہوں نے خوارج، روافض وغیرہ کو پیش کیا ہے، علامہ آلوسی نے سبل کا ترجمہ ابن جریر کے حوالے سے الضلالات مجاہد کے حوالے سے البدع والشبهات اور ابن عباس سے الادیان المختلفة . کالیهودیه والنصرانیة نقل کیا۔

﴿فتفرق بکم عن سبیله﴾ ثقل سے بچنے کے لئے یہاں پہلی تا کو حذف کر دیا گیا، ملا علی قاری نے لکھا ہے إشارة إلٰی أنه لا یمکن اجتماع سبیل الحق مع السبل الباطلة یعنی عن سبیله میں اس طرف اشارہ ہے کہ باطل راستوں کے ساتھ صراط مستقیم کا اجتماع ممکن نہیں ہے، انسان دونوں میں سے کسی ایک ہی پر قائم رہ سکتا ہے، تو یہ ذاتی مفادات کی خاطر دین کے عقائد واصول میں اختلاف ہوا جو ممنوع ہے لیکن اگر فروعی مسائل کے حل کی تلاش میں اجتہاد کے صحیح اصولوں کے ذریعہ مسائل کا استنباط کیا جائے اور فقہاء کی رائیں باہم مختلف بھی ہو جائیں تو وہ اس وعید سے خارج بلکہ امت کے لئے رحمت ہیں، إختلاف أمتی رحمةٌ .

ملا علی قاری کی یہ تمام تشریحات مرقات المفاتیح "کتاب الإعتصام بالکتاب والسنة" فصل دوم کی حدیث نمبر ۶ سے ماخوذ ہیں۔

غلو فی الدین

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتدال پر قائم رہنے اور افراط وتفریط سے بچنے کی تاکید کی ہے دینی حدود کی عدم معرفت غلو کو جنم دیتی ہے اور یہی وہ بیماری ہے جس نے قوموں اور فرقوں کو راہِ راست سے ہٹا کر گمراہی کے گڑھوں میں لا مارا، یہود نے انبیاء کی محبت میں غلو کیا تو انہیں اللہ کا بیٹا کہا، وقالت الیهود عزیرن ابن اللّٰه اور ان کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا ڈالا؛ لیکن یہی جب تفریط پر اترے تو رسولوں پر الزامات لگائے، کردار کشی کی اور ان کی جانوں ہی کے درپے ہو گئے، اسی طرح نصاریٰ بھی اعتدال پر قائم نہ رہے اور عقیدت میں غلو کر کے انہوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہہ ڈالا، وقالت النصاریٰ المسیح بنُ اللّٰه مسلمانوں میں بھی جو گمراہ فرقے پیدا ہوئے وہ بھی سب اسی افراط وتفریط کا نتیجہ ہیں، چنانچہ شیعوں کے پورے

مذہب کی بنیاد اہل بیت سے بیجا محبت ہے، انہوں نے عقیدت کے غلو میں حضرت علیؓ کو رسول کا وصی اور سب سے افضل قرار دیا تو بزعم خود یہ لازم آیا کہ نبی کے بعد وہی خلافت کے منصب پر فائز ہوں؛ لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو خلفاء ثلاثہ انہیں غاصب نظر آئے، تمام صحابہؓ دشمن اور کافر ٹھہرے، ائمہ کا تذکرہ نہ ہونے کی وجہ سے قرآن محرف ہوگیا، اور جب خود حضرت علی خلفاء کی بیعت میں اطاعت کرتے دکھائی دیئے تو ان کی طرف تقیہ منسوب کردیا۔ الغرض! اپنی رائے کو مضبوط کرنے کے لئے انہوں نے ہر روز نیا عقیدہ گڑھا، اگر یہ حب علیؓ میں اتنے آگے نہ گئے ہوتے تو انہیں یہ سب کام کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

اس کے برخلاف خوارج نے حضرت علیؓ کے بغض میں غلو کیا تو ان کو اور ان کے تمام حامی صحابہ تک کو کافر کہا، مخالفوں کا خون حلال ہوگیا، اور ان کے علاقے دار الحرب قرار پائے، معتزلہ نے عقل کی پرستش میں حدود سے تجاوز کیا تو صفات باری، رویت الٰہی، عذابِ قبر، پل صراط، میزان، شفاعت، اور حوضِ کوثر وغیرہ جیسی ان منصوص چیزوں کو جھٹلایا جنہیں ان کی عقلیں تسلیم نہ کرتی تھیں، جبریہ قضاء وقدر کے باب میں غلو کا شکار ہوکر انسان کو جمادات ونباتات کی طرح مجبور محض سمجھنے لگے، مجسمہ تشبیہ میں افراط پر اتر آئے اور باری تعالیٰ کے لئے جسم ثابت کیا، جبکہ عقیدہ ہی کو سب کچھ سمجھ کر مرجیہ نے اعمالِ صالحہ کی افادیت اور اعمال سیئہ کی مضرت کا انکار کردیا، آج بھی مسلمانوں میں جو گمراہ طبقے اٹھتے ہیں ماضی کی طرح ان کا ضمیر بھی اسی غلو سے تیار ہوا ہے جس کی قرآن کریم میں ممانعت کی گئی ہے "یا أهل الكتاب لا تغلوا في دينكم" اور یہ امت جعلناکم أمة وسطًا ہے۔

صراطِ مستقیم

صراط مستقیم کا معیار وہ روایت ہے جو امام ترمذی نے أبواب الایمان باب افتراق هذه الأمة میں نقل کی ہے، یعنی وَإن بَني إسرائيلَ تفرقَتْ على ثِنتينِ وسَبعين مِلةً وتَفتَرِقُ أمتي علىٰ ثَلاثٍ وسَبعينَ ملةً كُلُهم في النار إلا ملةً واحدةً قالوا من هي يا رسولَ اللّٰه! قال مَا أنا عليه وأصحابي ملا علی قاری اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں مَن كانَ علىٰ مَا أنا عليهِ وأصحابي من الإعتقادِ والقَولِ والفِعلِ فإن ذٰلك

يُعرفُ بالإجماع فمَا أجمَعَ عليه علماءُ الإسلام فَهُوَ حقٌ وما عداه باطل یعنی ناجی فرقہ عقیدہ وعمل میں بعینہٖ رسول وصحابہ کے نقش قدم پر ہوگا اوراس کی معرفت اجماع امت کے ذریعہ ہی ممکن ہے تو جس مسئلہ پر علماء اسلام کا اتفاق ہو وہ تو حق ہے اس کے علاوہ ساری چیزیں باطل ہیں، خلاصہ یہ نکلا کہ عہد رسالت اور عہد صحابہ میں جو عقائد واعمال قرآنی کہلاتے تھے ان کو بعینہٖ دانتوں سے پکڑنے والا ہی صراطِ مستقیم پر گامزن ہے اب دیگر فرقے یا تو سنت رسول کے منکر ہیں یا انہیں طریقہ صحابہ سے اختلاف ہے، اوران کا تصور ومزاج بھی قرآن سے یکسر مختلف ہے اس لئے ان کا دعویٰ صحیح نہیں ہے پھر اس معیار پر کون پورا اترتا ہے، ملا علی قاری تاکید کے ساتھ جواب دیتے ہیں **المراد هم المهتدون المتمسكون بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين من بعدى فلا شك ولا ريب أنهم هم أهل السنة والجماعة** کہ یہاں بلاشبہ اہل سنت والجماعت مراد ہیں کیونکہ رسول اور خلفاء راشدین کی سنت کو انھوں نے ہی مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔ (مرقات المفاتیح: **كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة** فصل۲/۱۰)

امام ابن ماجہ نے یہ حدیث اتباع سنت کے تحت ذکر کی ہے جس سے ان کا مقصد یہ بتانا ہے کہ سنت رسول ہی صراطِ مستقیم ہے اوراس سے ادنیٰ انحراف انسان کو راہِ راست سے بھٹکا دیتا ہے، حدیث باب مسند احمد اور مستدرک حاکم میں بھی آئی ہے حاکم اور ذہبی نے اسے **صحيح** کہا ہے: ابن ماجہ کے رواۃ کو علامہ دمیری نے رجالهٗ ثقاة کہا ہے جبکہ بوصیری، زوائد ابن ماجہ (۴۴/۱) میں لکھتے ہیں **هذا إسناد فيه مقال من أجل مجالد بن سعيد** ان کو ابن سعد اور ابن حبان نے ضعیف قرار دیا ہے اور ابن حجر نے تقریب (۲۴۰) میں **ليس بالقوى وقد تغير فى آخر عمره** کا تبصرہ کیا ہے، اس لئے **الديباجة على ابن ماجة** میں روایت کو حسن لغیرہٖ کہا گیا ہے۔

باب تعظیم حدیث رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم والتغلیظ علی من عارضہ

اس باب کا مقصد حدیث کی عظمت کو اجاگر کرنا اور اس کی مخالفت کی قباحت وشناعت کو بیان کرنا ہے، رسول اللہ ﷺ سب سے افضل ومحترم ہیں، اس لئے قرآنِ کریم نے صحابہ کو بارگاہِ رسالت میں آواز پست کرنے کا حکم دیا یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (الحجرات/۲) یعنی جس طرح بے تکلف ہوکر آپس میں زور زور سے گفتگو کرتے ہو، نبی کی مجلس میں یہ مناسب نہیں جب وہ ارشاد فرمائیں تو تمہاری آواز پست ودبی ہوئی ہو؛ کیونکہ ان کا مرتبہ بہت بلند ہے اس لئے ان کی گفتگو کو اپنی طرح نہ سمجھو لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَاءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا آپ کی زبان سے نکلنے والا ہر ہر لفظ الہام ووحی اور انسانی خیر وفلاح کا ضامن ہے اس لئے اس کو سننے سے پہلے دل میں عقیدت وعظمت کا چراغ جلانا ہوگا لَا یؤمنُ احدُکُم حتی اَکونَ اَحبَّ الیهِ مِن وَالده وَوَلَدِهٖ والناسِ اجمعین کے جو حقوق وتقاضے ہیں تقریباً وہی حدیث رسول کے بھی ہیں، تعظیم کے مفہوم میں یہ بات داخل ہے کہ بندہ مومن رسول کے ہر قول وفعل کو ذاتِ نبوی کی طرح سب سے زیادہ محبوب رکھے، اس کے حصول ومعرفت کی طلب ہو، اسے حجت وبرہان سمجھے، قرآن کے بعد اسی کو قانون کا سرچشمہ جانے اور اس کی اشاعت وحفاظت اہل ایمان کا نصب العین ہو۔

اس کے برخلاف مخالفت کے معنی یہ ہیں کہ دل ودماغ کا حب رسول سے خالی ہونا، منصب نبوت سے ناآشنا ہونا، صرف قرآن ہی کو ماننا، حدیث کو حجت نہ سمجھنا، اور اپنے علم وفہم کی بابت خوش فہمی کا شکار ہوکر ایسے فکر وخیال کا اظہار کرنا جن کا قرآن وسنت میں کہیں پتہ نہ ہو، اسی طرح حدیث رسول کی بظاہر وبلا قصد مخالفت بھی مذموم ہے اور عتاب وغضب کا باعث ہے، چاہے دل میں نبی کی عقیدت ومحبت کا سمندر ٹھاٹھے مار رہا ہو، عبادة بن صامتؓ نے امیر معاویہؓ کو، ابن عمرؓ نے اپنے لخت جگر کو، عبداللہ بن مغفل نے اپنے بھتیجے کو اور حضرت ابو ہریرہ نے ابن

عباس کو، یہی حقیقت سمجھائی ہے، اب جو شخص بھی حدیث کا دلدادہ اور اس کے پڑھنے پڑھانے کا شغل رکھتا ہے، اس کا فرض ہے کہ تمام آداب واحترام بجالا کر تعظیم کے پانچ تقاضے پورے کرے، جو حضرت سفیان ثوری کے الفاظ میں، انصات، استماع، حفظ وضبط، عمل اور نشرواشاعت ہیں، اور حدیث کا وہی مطلب سمجھے جو کتاب وسنت اور صحابہ کی حیات وافکار پر منطبق ہوتا ہو، اس سے الگ نیا مفہوم تراشنا بھی تعظیم کے منافی اور تغلیظ ومخالفت کے زمرے میں آتا ہے۔

(۱۲/۱) حَدَّثَنَا اَبُوبَکرِ بْنِ اَبِیْ شَیْبَۃَ قَالَ حَدَّثَنَا زَیْدُ بْنُ الحبابِ عَنْ مُعَاوِیَۃَ بْنِ صَالِحِ حَدَّثَنِیْ الحَسَنُ بْنُ جَابِرٍ عَنِ المِقْدَامِ بْنِ مَعْدِیْکَرِب الکِنْدِي اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ یُوشِكُ الرَّجُلُ مُتَّکِئًا عَلٰی أَرِیْکَتِہٖ یُحَدَّثُ بِحَدِیْثٍ مِنْ حَدِیْثِیْ فَیَقُوْلُ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ کِتَابُ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ مَا وَجَدْنَا فِیْہِ مِنْ حَلَالٍ اسْتَحْلَلْنَاہُ وَمَا وَجَدْنَا فِیْہِ مِنْ حَرَامٍ حَرَّمْنَاہُ أَلَا وَاِنَّ مَا حَرَّمَ ﷺ مِثْلُ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ .

فرمایا وہ وقت بہت قریب ہے، جب ایک شخص اپنے تخت پر ٹیک لگائے بیٹھا ہوگا، اسے میری حدیث سنائی جائے گی تو وہ کہے گا ہمارے اور تمہارے درمیان صرف کتاب اللہ ہی (حجت ومعیار) ہے، اس میں جو چیز ہم حلال پائیں گے، اسی کو حلال سمجھیں گے، اور جو اس میں حرام دیکھیں گے اسی کو حرام قرار دیں گے (آپ نے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا) سنو! اللہ کے رسول نے جو چیزیں حرام کردیں وہ بلاشبہ ایسی ہی ناجائز اور حرام ہیں جن کو اللہ نے حرام کردیا ہو۔

أوشك افعال مقاربہ میں سے ہے، اس کا اسم مرفوع، اور خبر فعل مضارع کی صورت میں ان کے بعد آتی ہے، علامہ سندھی نے ابن مالک کے حوالہ سے لکھا ہے "ولا اعلم تجردہ من أن الا فی ھذا الحدیث وفی بعض الاشعار" حدیث باب، اور چند اشعار کو چھوڑ کر مجھے علم نہیں کہ "أوشك" کبھی اَن کے بغیر استعمال ہوا ہو، امام سیوطیؒ کا کہنا ہے کہ مستدرک میں یہ روایت حاکم نے قاعدہ کے مطابق "یوشك أن یقعد الرجل" ہی نقل کی ہے، سندھی کہتے ہیں: "اراد السیوطی ان لفظ الحدیث قد غیرہ الرواۃ ، والا فأن موجودۃ فیہ فی

الاصل کما فی روایۃ الحاکم" یعنی سیوطی کے نزدیک حاکم کی روایت کے مطابق یہاں بھی "أن" موجود تھا؛ لیکن راویوں سے سہو ہو گیا۔

﴿متکئًا علی أریکته﴾ یہ "الرجل" کا حال ہو سکتا ہے؛ لیکن علامہ سندھی نے اسے بعید قرار دیکر "الرجل" کی طرف لوٹنے والی "یُحدث" کی ضمیر کا حال مانا ہے، وہ اَن کی تقدیر کے ساتھ یوشک کی خبر ہے۔اور أریکة سے مراد ان کے نزدیک "السریر المزیّن" ہے، جس پر قیمتی کپڑوں کا گنبد بنایا جاتا ہے، اور نئی نویلی دلہن کے لئے وہ حلّوں سے آراستہ ہوتا ہے، علامہ سندھی فرماتے ہیں: هٰذا بیان لبلادتِهِ وسوء فهمه ای حماقته وسوء اد به کما هُو دأب المُتَنَعِّمِینَ المَغرُورِینَ بِالمَالِ وَالجَاهِ یہ کند ذہنی، کوتاہ فہمی اور اس کی حماقت اور بے ادبی کا بیان ہے جو ان تمام عیش پسندوں کی عادت ہوتی ہے جو اپنی دولت وعزت پر نازاں ہوں، امام خطابی نے لکھا ہے: اراد به اصحاب الترفة والدعة الذین لَزِمُوا البیوتُ ولم یطلبوا بالاسفار من اهلهٖ اس تعبیر کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ نے ان آسائش وراحت پسندوں کو مراد لیا ہے، جو اپنے عشرت کدوں ہی میں رہے اور انہوں نے اپنے اعزاء واقرباء کو چھوڑ کر طلب علم کے لئے کوئی سفر نہیں کیا، ایسے لوگ عموماً نفس پرست ہوتے ہیں، اس لئے شرعی حدود وقیود سے بچنے کے لئے وہ کٹ حجتی کیا کرتے ہیں؛ تاکہ ان کی بے دینی کو جواز کی سند مل جائے اور اہل تقویٰ کو وہ مرعوب کر سکیں۔

﴿یَحدَّث﴾ فعل مجہول ہے اور ضمیر الرجل سے متعلق ہے۔

﴿بیننا وبینکم کتاب اللّٰه﴾ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے، اور اس کی موجودگی میں کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں، یہ دراصل کلمة حق اُرید بها الباطل کا ایک نمونہ ہے جس کے ذریعہ یہ گمراہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو حجت اور قرآن کی تفسیر ماننے سے انکار کر رہا ہے اور قرآن کی ایسی من چاہی تاویل کرنا چاہتا ہے جو اس کی پُرتعیش زندگی اور نفسانی خواہشات پر ذرا بھی قدغن نہ لگاتی ہو۔

﴿فما وجدنا فیه الخ﴾ ما موصولہ مبتدا ہے اور اس کی خبر بالترتیب استحللناه وحرمناه ہے یعنی ہم حلال وحرام کی بابت صرف قرآن کو ماخذ مانتے ہیں اس کے علاوہ کسی کو

خواہ رسول ہی کیوں نہ ہو تحلیل وتحریم کا حق حاصل نہیں۔

﴿الا وانّ ما حرّم رسول اللّٰہ مثل ما حرّم اللّٰہ﴾ یہ اس باطل نظریہ کی تردید ہے، علامہ سندھی نے تقدیر عبارت یوں نقل کی ہے:

الا ان ما فی القرآن حق وان ما حرم رسول اللّٰہ الخ یعنی قرآن سراسر حق ہے اور رسول کا یہ منصب ہے کہ وہ جس چیز کو حرام قرار دیدیں وہ بھی بعینہ قرآنی محرمات کی طرح حرام ہو جاتی ہے، کیونکہ اللہ کے حکم ہی سے رسول تحریم کا اعلان کرتے ہیں، اپنے جانب سے نہیں، علامہ سندھی فرماتے ہیں فان التحریم یُضَافُ اِلَی الرَّسُوْلِ بِاِعتِبَارِ التبلیغ واِلّاَ هُوَ فِی الحَقِیقَةِ لِلّٰہِ تحریم تبلیغی حیثیت ہی سے تو رسول کی طرف منسوب ہے ورنہ وہ حقیقت میں تو اللہ ہی کی طرف سے ہے اور رسول نے تو صرف اسے ہم تک پہنچایا ہے، اب جو قرآنی ونبوی تحریم کو نہ مانیں، باری تعالیٰ نے ان سے مسلمانوں کو قتال کرنے کا حکم دیا ہے، ﴿قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالیَوْمِ الاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہ﴾ (توبہ/۲۹)

حدیث دراصل غزوہ خیبر کی تقریر ہے جس کا اگلا حصہ امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں یوں نقل کیا ہے "أَلَا لَا یَحِلُّ لَکُمُ الحِمارُ الأهلیُّ، وَلا کلُّ ذِی نابٍ مِن السبعِ، ولَا لقطةُ مُعاهدٍ الا أن یَستغنیَ عَنها صاحبُها، ومَن نَزَل بقَومٍ فعلیهِم أن یقروه فان لم یقرُوه فله أن یُعقِبَهم بمثل قِراه"[1] یہاں رسول اللہ ﷺ نے ان محرمات کا تذکرہ کیا ہے جو قرآن میں موجود نہیں، اور ان کا ثبوت ہمیں صرف سنت سے ملتا ہے، یعنی پالتو گدھا، کچلی والا جانور، اور اس معاہد کا گرا پڑا سامان جو اس سے بے نیاز نہ ہو، تو یہ چیزیں بعینہ تحریم الٰہی کی طرح ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ حدیث زائد علی کتاب اللہ ہو تو وہ تحلیل وتحریم کے باب میں قبول کی جائے گی، نیز یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ تحریم قرآنی قطعی، اور تحریم نبوی خبر واحد کی صورت میں ظنی ہے، اس لئے پہلی کا منکر تو بہر صورت کافر ہے جب کہ دوسری کا انکار کرنے والا اس صورت میں کافر ہوگا جب کہ اس کا ثبوت حدیث متواتر سے ہو، بصورت دیگر اسے فاسق اور بدعتی قرار دیا جائے گا۔

---

[1] کتاب السنۃ باب لزوم السنۃ

حدیث باب ایک پیشین گوئی ہے جس میں منکرین حدیث کے ظہور کی خبر دی گئی ہے، ان کی چار علامتیں بیان ہوئیں۔

۱۔ وہ اہل ثروت وعشرت ہوں گے۔

۲۔ اپنی حیثیت عرفی پر انہیں بڑا گھمنڈ ہوگا۔

۳۔ وہ غبی ہوں گے، شریعت ان کے فہم سے بالاتر ہوگی۔

۴۔ بے ادب وگستاخ ہوں گے۔

یہ تمام تر علامتیں منکرین حدیث میں بدرجہ اتم موجود ہیں، اور ان کے لٹریچر سے ایک ایک چیز کی تصدیق ہوسکتی ہے، انکار حدیث کی مفصل تاریخ تو ہم اگلی حدیث میں بیان کریں گے، یہاں امام کا مقصد امت کو تعظیم حدیث کا درس دینا، اور تکبر، بے ادبی، اور کٹ حجتی سے ڈرانا ہے تا کہ امت کا کوئی فرد حدیث کی ادنیٰ مخالفت نہ کر سکے، اور انہیں بھی قرآن کی طرح واجب العمل مانے۔

حدیث باب کے ایک راوی زید بن الحباب کی بابت ابن حجرؒ نے اہل جرح وتعدیل کے اقوال کی روشنی میں صَدوقٌ یُخطِئ فی حدیثِ الثوری[1] کا فیصلہ کیا ہے، جبکہ دوسرے راوی معاویہ بن صالح کو وہ صدوق له اوهام[2] کہتے ہیں، اس لئے ابن ماجہ کی سند قدرے ضعیف ہے، سنن ابی داؤد کی سند بالکل مختلف ہے جبکہ ترمذی کے سلسلے میں زید بن الحباب موجود نہیں ہیں، اور مصنف نے اسے حسن غریب کہا ہے۔

(۱۳/۲) حَدَّثَنَا نَصرُ بْنُ عَلِيّ الجَهْضَمِيُّ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ فِي بَيته اَنَا سَأَلتُهُ عَنْ سَالِمٍ أَبِي النَّضْرِ ثُمَّ مَرَّ فِي الحَدِيْثِ قَالَ اَوْ زَيْدِ بْنِ اَسلَمَ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِيْ رَافِعٍ ، عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا اُلفِيَنَّ اَحَدَكُمْ مُتَّكِئًا عَلٰى اَرِيكَتِهٖ يَاْتِيْهِ الاَمْرُ مِمَّا اَمَرْتُ بِهِ اَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ فَيَقُولُ لَا أَدْرِي مَا وَجَدْنَا فِي كِتَابِ اللّٰهِ اتَّبَعْنَاهُ .

فرمایا میں ہرگز تم میں سے کسی کو اس طرح نہ پاؤں کہ وہ اپنی مسہری پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو،

۱۔ تقریب نمبر ۲۱۲۴ ۲۔ تقریب التهذیب نمبر ۶۷۶۲

پھر اس کے پاس وہ بات پہنچے جس کا میں نے حکم دیا ہو یا اس سے میں نے روکا ہو، تو وہ کہے میں نہیں جانتا، ہم جو کتاب اللہ میں پائیں گے بس اسی کی اتباع کریں گے۔

﴿ثم مر فی الحدیث﴾ مولانا عبدالغنی مجددی دہلوی نے اس کا مفہوم یہ لکھا ہے أی ذکر الحدیث الذی یاتی من بعد یعنی سفیان بن عیینہ نے اس کے بعد حدیث باب بیان کی

﴿او زید بن اسلم﴾ مجددی نے انجاح الحاجہ میں لکھا ہے شك سفیان فی الحدیث اھو عن سالم او عن زید یعنی سفیان بن عیینہ کو شک ہوا کہ یہ روایت سالم سے مروی ہے یا زید بن اسلم سے، سلسلہ اسناد میں ایسا عام طور پر ہوتا ہے کہ محدث اپنے شک کو ظاہر کر دیتا ہے، اور سند میں کوئی چیز چھپی نہیں رہتی، یہ ان حضرات کی احتیاط اور تقویٰ کی دلیل ہے۔

﴿لا الفینّ احدکم متکئًا علی أریکته﴾ الفی یلفی إلفاءً پانا، باقی رکھنا، یہ نون تاکید کے ساتھ فعل نہی کا واحد متکلم کا صیغہ ہے "متکئًا" احدکم کا حال یا لا الفین کا مفعول ثانی ہے أریکة کی شرح گذر چکی ہے، علامہ سندھیؒ اس جملہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں "والمرادُ نَهیُهُم عن أن یکونُوا علی هذه الحالة فانهم اذا کانوا علیها یجدهم صلوات اللّٰه وسلامه علیه" یعنی آپ کا مقصد مسلمانوں کو اس طرزِ عمل سے روکنا ہے، اب انہوں نے اگر اس گناہ کا ارتکاب کرلیا تو آپ کے حکم کی صریح خلاف ورزی ہوگی جس کے باعث امت صراطِ مستقیم سے منحرف ہوسکتی ہے۔

﴿یاتیه الأمر مما أمرت به او نهیت عنه﴾ علامہ سندھی نے اس جملہ کو "احدکم" کا حال قرار دیا ہے اور "امر" سے مراد ان کے نزدیک کوئی بھی دینی حکم ہے جس میں مامورات ومنہیات کی تمام اقسام داخل ہیں والامرُ بمعنی الشأن فَیَعُمُّ الامر والنهی یعنی وہ تمام احکامات جو صراحۃً قرآن میں مذکور نہ ہوں ان کا حکم بعینہٖ قرآنی حکم کی طرح ہے، انوار المحمود شرح أبی داؤد میں لکھا ہے لأن الحدیث اذا سُمِعَ من فَمِ النَّبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم فَهو مِثلُ القرآن قطعیٌ[1] تو اعتقاد وعمل کے لحاظ سے دونوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں رہا، قرآن کی روشنی میں حدیث کا جائزہ لینا اور اسے پرکھنے کے لئے

---

[1] انوار المحمود ۳/۵۳۴

قرآن پر پیش کرنا حدیث کے حجت ہونے کی شرط نہیں، اس سلسلہ میں اذا جَاء کُم حدیثٌ فَاعرِضُوه علی کتاب اللہ فإن وَافقه فخذوه الخ جو روایت پیش کی جاتی ہے، یحیٰ بن معین نے اس کو هذا حدیث وضعه الزنادقة اور خطابی نے حدیث باطل لا اصل له قرار دیا ہے، حدیث باب سے استدلال کرتے ہوئے خطابی لکھتے ہیں وفی الحدیث دلیلٌ علی أنه لا حاجةَ بالحدیثِ أن یُعرَضَ علی الکِتَابِ وأنه مهمَا ثبتَ عن رسولِ اللہ صلی اللہ علیه وسلم کانَ حجةً بنفسه یعنی کسی چیز کا نبی سے ثبوت ہی اس کے بذاتِ خود حجت ہونے کے لئے کافی ہے، قرآن پر پیش کرنے کی ضرورت نہیں؛ کیونکہ نبی وحی الٰہی کی روشنی میں کوئی حکم دیتے ہیں، جس کا کتاب اللہ سے اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ترجمۃ الباب ظاہر ہے، حدیث سنن اُبی داوٗد (السنۃ ٦) جامع ترمذی (العلم ١٠) اور دیگر کتب حدیث میں بھی آئی ہے، ابن ماجہ میں اس کی سند بالکل صحیح ہے۔

فتنہ انکارِ حدیث

اسلامی تاریخ میں حدیث کا انکار سب سے پہلے خوارج نے کیا وہ اسلام کے منقول ومتواتر تصور کو درہم برہم کرکے جو انتہاء پسند نظریات پھیلانا چاہتے تھے ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ رسول کی سنت تھی جو نصوص کی عملی تطبیق کرکے تحریف دین کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتی، اس لئے انہوں نے حدیث کی حجیت کا مسئلہ مسلمانوں میں پوری قوت سے اٹھایا پھر دوسری صدی ہجری کے اواخر سے جب عالم اسلام پر عجمی اور یونانی فلسفوں کا حملہ ہوا تو امت کا ایک طبقہ ان کا شکار ہوکر پھر اسلام کی مرمت کے لئے اٹھا، ہم انہیں معتزلہ کے نام سے جانتے ہیں، خوارج کی طرح ان لوگوں کا مقصد بھی مکمل طور پر اسلام سے سبکدوشی حاصل کرنا نہ تھا تاہم ان کے ذہنوں پر عقلی بھوت پوری طرح سوار تھا، وہ اتنی جرأت تو نہ کرسکے کہ یونانی افکار ہی کا پوسٹ مارٹم کرڈالتے، الٹا ان خرافات کو معیار بنا کر اسلامی عقائد وعبادات کی ایسی تشریح کرنے لگے جو اس تصور دین سے بالکل مختلف تھی جو عہد رسالت وخلافت راشدہ میں پایا جاتا تھا، معتزلہ بالکلیہ حدیث کے منکر نہ تھے؛ بلکہ سنت متواتر اور مشہورہ کو وہ بھی تسلیم کرتے تھے؛ لیکن خبر آحاد کا انہوں نے صراحۃً انکار کیا اور متواترات کی بھی ایسی دور از کار تاویلیں کیں جن کے نتائج

انکارہی پر جا کر منتج ہوئے، اس وقت ان ملحدوں اور رافضیوں کی تعداد بہت کم تھی جنہوں نے بعد میں غلو اختیار کر کے سنت ہی کو سرے سے حجت ماننے سے انکار کر دیا۔

یہ صورتِ حال امت کے لئے بہت بڑا چیلنج تھی، باری تعالیٰ محدثین کی قبروں کو نور سے بھر دے، جنہوں نے نہ صرف اس کو قبول کیا بلکہ اس انحراف کے تدارک کے لئے بیک وقت دو محاذوں پر کام کیا، ایک طرف روایت ودرایت کی کسوٹی پر پرکھ کر حدیث کی تدوین کا عظیم کارنامہ انجام دیا، جو آج مسانید، صحاح، جوامع، سنن، معاجم اور مستدرکات جیسی مختلف شکلوں میں موجود ہے، دوسری جانب انکارِ حدیث کے ضمن میں حدیث پر ہونے والے شبہات واعتراضات کو دفع کرنے کے لئے "مختلف الحدیث" کے فن کو وجود بخشا، امام شافعیؒ (م۲۰۴ھ) کی اختلاف الحدیث، ابن قتیبہ (م۲۷۶ھ) کی تاویل مختلف الحدیث، اور امام طحاوی (م۳۲۱ھ) کی شرح معانی الآثار اسی باب کی وہ قیمتی کتابیں ہیں جنہوں نے صدیوں تک منکرین حدیث کے منہ کو بند کر دیا، چنانچہ تیسری صدی ہجری کے بعد سے تیرہویں صدی کے اختتام تک تاریخ میں وہ پھر کہیں زور باندھتے نظر نہیں آتے تا آنکہ انیسویں صدی کے اواخر میں جب عالم اسلام پر دوبارہ یورپی فلسفوں نے یلغار کی تب پھر ایک ناخداترس گروہ نے ان کی آواز میں لَے ملائی، اس کی راہ میں بھی پھر وہی سنت مزاحم ہوئی جو پہلے خوارج، معتزلہ اور ملحدوں کی راہ مار چکی تھی، انہوں نے محسوس کیا کہ حدیث وسنت کی موجودگی میں ہم اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے، کیوں نہ پہلے اسی سے پیچھا چھڑایا جائے، پھر قرآن کے صرف الفاظ رہ جائیں گے جن کے پیچھے کوئی عملی نمونہ نہ ہوگا، نہ کوئی مستند تشریح اور نہ رسالت واجماعِ امت کا کوئی واضح تصور، پھر آسانی سے اسلام کو تختۂ مشق بنایا جاسکے گا۔

اس ناپاک مقصد کے لئے سب سے پہلے انکارِ سنت کا فتنہ عراق میں اٹھایا گیا، پھر ہندوستان میں، سرسید احمد خاں، اور مولوی چراغ علی نے محتاط انداز میں اسے ہوا دی، مصر کے طٰہٰ حسین اور ترکی کے ضیاء گوک الپ نے اس کی اشاعت میں اپنی تمام تر صلاحیتیں جھونک دیں، برصغیر میں پنجاب کی زمین اسے خاص طور پر راس آئی، جہاں عبداللہ چکڑالوی، احمد الدین امرتسری، اسلم جیراجپوری، اور چودھری غلام پرویز نے اس گمراہی کو تحریر وتقریر کے ذریعہ

ایک مکتبۂ فکر کی شکل دی، انہوں نے امت کو سنت سے برگشتہ کرنے کے لئے پوری قوت سے یہ سوال اٹھایا کہ حدیث کا ذخیرہ کس حد تک مستند ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ لوگوں نے جھوٹ گڑھ کر رسول کی طرف ناحق منسوب کر دیا ہو، بالفرض یہ احایث اگر صحیح ہیں تو بھی ہم ان کی اطاعت کے مکلف نہیں، ہم صرف قرآن کے پابند ہیں، اور قرآن ہی کو پہنچانے کے لئے خدا نے رسول کو ہماری طرف بھیجا، اس کے بعد محمد بن عبداللہ ہماری طرح ایک عام انسان ہیں، ان کی باتیں نہ پہلے واجب العمل تھیں اور نہ آج ہمارے لئے حجت ہیں۔

قرونِ اولیٰ میں جب یہ فتنہ اٹھا تھا تو مسلمان حاکم وفاتح اور دوسری قومیں محکوم وغلام تھیں اس لئے یہ حملہ نقصان دہ تو ضرور رہا تھا لیکن اتنا کارگر نہ ہوسکا کہ امت کے دینی مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا ہو؛ بلکہ مسلمانوں کے ہر طبقہ نے اس بدعت کو پوری طرح ٹھکرا دیا، اور فتنہ جلد ہی دب گیا؛ لیکن ایک صدی قبل انکارِ حدیث کا جب دوسرا جنم ہوا تو خیر القرون کی بنسبت حالات میں بہت فرق آچکا تھا، مسلمان فوجی اور معاشی تمام میدانوں میں پٹ چکے تھے، اب دوسری قومیں فاتح وحاکم تھیں، اس لئے وار بڑا کاری ثابت ہوا، پہلے سنت کا مطلق انکار نہ تھا؛ بلکہ وہ بھی متواتر اور خبر واحد میں تفریق کرتے تھے؛ لیکن یہود ونصاریٰ کی تحریک پر اس مرتبہ ایک نوخیز ومرعوب طبقہ امت میں پیدا ہوا، اور اس نے علی الاطلاق حدیث کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا، ان کے نزدیک وحی صرف متلو ہے، غیر متلو کوئی چیز نہیں، حضور کا فریضہ صرف قرآن پہنچانا تھا اور سنت کے نام پر جو آج ذخیرہ ملتا ہے اسے یہ ناخدا ترس لوگ جھوٹ کا پلندہ اور عجمی سازش قرار دیتے ہیں، **نعوذ باللّٰہ الف الف مرۃ من ھذہ الھفوات.**

اہل علم وفضل نے اس چیلنج کو قبول کیا اور حجیت حدیث کے موضوع پر قرآن وسیرت، منصب رسالت اور تاریخ امت کی روشنی میں ایسا زبردست تحقیقی کام کیا کہ بفضل خداوندی تمام بہی خواہانِ ملت عش عش کر اٹھے، اور عام مسلمانوں کے ذہن میں یہ آوازہ پوری قوت سے گونجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ صرف قرآن پہنچانے کے لئے نامہ بر مقرر نہیں ہوئے؛ بلکہ آپ کتاب اللہ کے شارح وترجمان، امت کے معلم ومربی اور قیامت تک تمام انسانوں کے لئے پیشوا اور نمونہ ہیں، آپ کا قول پہلے بھی حجت تھا، اور آج بھی اس پر عمل کرنا فرض ہے،

ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کی "السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي" عجاج الخطیب کی "السنة قبل التدوين" عبدالرحمٰن بن یحییٰ یمانی کی "الأنوار الكاشفة" ڈاکٹر محمد ابوزہو کی "الحديث والمحدثون" شیخ مصطفیٰ اعظمی کی "دراسات في الحديث النبوي" ڈاکٹر محمد ابوشہبہ کی "دفاع عن السنة" مولانا مناظر احسن گیلانی کی "تدوین حدیث" مولانا محمد تقی عثمانی کی "حجیت حدیث" مولانا حبیب اللہ مختار کی "سنت نبویہ اور قرآن کریم" اور شروح حدیث کے مقدمات کے علاوہ دوسری بے شمار تصنیفات انہیں محنتوں کا ثمرہ ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب وسنت دین کی دو مستقل بنیادیں ہیں، اور قرنِ اول سے آج تک امت قرآن کے بعد حدیث ہی کو دوسرا بڑا ماخذ سمجھتی رہی ہے۔

(۱۴/۳) حَدَّثَنَا اَبُو مَرْوَانَ مُحَمَّدُ بْنُ عُثْمَانَ الْعُثْمَانِيُّ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدِ بْنِ اِبْرَاهِيمَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ عَنْ اَبِيهِ عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ .

فرمایا جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز پیدا کی جو اس میں نہیں تھی تو وہ مردود ہے۔

اسلام مکمل اور آخری دین ہے اشاعت کے ساتھ شروع ہی سے اس نے شریعت کی حفاظت کا پورا خیال رکھا ہے، اس لئے ان تمام راہوں کو پہلے ہی مسدود کر دیا جو کسی وقت بھی دراندازی کا سبب بن سکتی تھیں، ختم نبوت کے بعد بدعت کی روک تھام اسی سلسلہ کا دوسرا بڑا انتظام ہے، جس کی رو سے قرآن وسنت، اجماع امت اور خیر القرون کے نظام حیات سے الگ ہر نظریہ وعمل بدعت ہے جس سے پوری امت کو بچانا ہر مسلمان کا فرض ہے، مثلاً جمہوریت، سیکولرزم اور قبر پرستی وغیرہ "اى كلُ عملٍ لم يَثبُتُ بالكتابِ والسُّنَّةِ ولم يَكن نَظيرُهُ في القُرونِ المشهودِ لها بالخَيرِ"

﴿من احدث في أمرنا هذا ما ليس منه﴾ "ما ليس منه" جملہ ہوکر "احدث" کا مفعول ہے اور پورا جملہ مل کر شرط واقع ہے، "امر" اگر "امور" کا واحد ہے تو اس کے معنی معاملہ، حالت جبکہ "اوامر" کا واحد ہونے کی صورت میں اس سے مراد حکم ہوگا، سندھی فرماتے

ہیں کہ دونوں صورتوں میں اس کا مفہوم دین لیا جائے گا "والمراد علی الوجھین الدین القیم" ابن رجب حنبلی نے "جامع العلوم والحکم" میں "دیننا وشرعنا الذی ارتضاہ اللّٰہ لھا[1]" سے امر کی شرح کی ہے، دونوں کا خلاصہ دین وشریعت کے الفاظ میں نکلتا ہے، حدیث باب کے دوسرے طرق میں بھی "امرنا" کے بجائے "دیننا" کی تعبیر منقول ہے اس لئے قاضی عیاض، ابن حجر، ملا علی قاری، مولانا عبدالغنی مجددی، علامہ عثمانی اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، "احداث" کے لغوی معنی اس چیز کو ایجاد کرنا ہے جو پہلے سے موجود نہ ہو اور "ما لیس منہ" کا جملہ یہ بتلاتا ہے کہ دین سے اس کا ضابطہ کا کوئی تعلق نہ ہو دین کی تعریف محشی ابوداؤد نے یوں کی ہے "وھُوَ عِبارۃٌ عن اِتباعِ اٰثارِ الآیاتِ والأخبارِ واستنباطِ الأحکامِ منھا فیَنْدَرِجُ فی الامرِ المسائلُ الفِقھیۃُ الاجتھادیۃ[2]" یعنی کتاب وسنت اور ان سے مستنبط احکامات اس لئے فقہی واجتہادی مسائل کا شمار بھی امر میں ہوگا تو "احداث" کا مصداق وہ چیزیں ہوں گی جن کی کوئی بنیاد نصوص، خلفاء راشدین کی سنت، تعامل صحابہ وتابعین، خیر القرون اور صحیح ومستند اجتہاد میں موجود نہ ہو اسی کو قاضی عیاض نے من احدث فی الإسلام رأیًا لم یکن لہ من الکتاب والسنۃ سند ظاھر او خفی ملفوظ او مستنبط فھو رد علیہ حافظ ابن حجر نے من اخترع فی الدین مالا یشھد لہ اصلٌ من اصولہ فلا یلتفت الیہ[3] سے تعبیر کیا ہے یعنی احداث فی نفسہ دین میں ہو اس کا تعلق وسائل سے نہ ہو جیسا کہ صرف ونحو وغیرہ تو وہ بدعت ہیں۔ (انجاح)

﴿فھو رد﴾ امام نوویؒ فرماتے ہیں قال اھل العربیۃ الرد ھنا بمعنی المردود ومعناہ فھُوَ باطلٌ غیرُ مَعتدٍّ بہ یعنی وہ باطل ہے، اور اس کو کوئی حیثیت نہیں دی جائے گی، علامہ سندھی نے لکھا ہے والمرادُ أن ذٰلك الامر واجبُ الرَّدِ یجبُ علی الناسِ رَدُّہ ولا یجوزُ لأحَدٍ اِتباعُہ والتقلید فیہ کہ یہ چیز قابل رد ہے، لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ اسے ٹھکرادیں؛ کیونکہ کسی مسلمان کے لئے اس کا اتباع یا تقلید جائز نہیں ہے، سندھی نے ایک

---

[1] جامع العلوم والحکم: ص۷۲

[2] ابوداؤد، کتاب السنۃ، باب فی لزوم السنۃ: ص۶۳۵، حاشیہ نمبر۵۔

[3] فتح الباری

احتمال یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ "ھو" کی ضمیر "امر" کے بجائے "من" کی طرف لوٹے تو اس صورت میں مطلب ہوگا فذاك الشخص مردود مطرود ہمارے نزدیک یہ احتمال بعید ہے، اور راجح معنی یہی ہیں کہ ہر وہ چیز جس کی شریعت کے ماخذ میں کوئی بنیاد نہ ہو بدعت ہے، اسے دیوار پر مار دیا جائے گا، اور یہ حدیث ردِ بدعت کی بہت واضح اور مضبوط دلیل ہے، امام نووی نے لکھا ہے هذا الحديث قاعدة عظيمة من قواعد الإسلام وهو من جوامع كلمه صلى الله عليه وسلم فانه صريح فى رد كل البدع والمخترعات، وهذا الحديث مما ينبغي أن يعتني بحفظه واستعماله فى ابطال المنكرات واشاعة الاستدلال به[1] اسی طرح کا تاثر فتح الباری میں ابن حجر سے بھی منقول ہے۔

بظاہر عنوان باب اور روایت میں کوئی جوڑ نظر نہیں آتا اور اس کا تعلق "باب اجتناب البدع" سے زیادہ نظر آتا ہے؛ لیکن ذرا غور کیا جائے تو حدیث و باب کے درمیان بہت گہرا ربط موجود ہے، عظمت حدیث کا تقاضہ تو یہ تھا کہ بعینہٖ اس پر عمل کیا جاتا؛ لیکن اسے پس پشت ڈال کر ترمیم کرنا یا کوئی اور چیز گڑھ لینا عظمت کے منافی ہی نہیں؛ بلکہ حدیث سے اس درجہ کا معارضہ ہے کہ اس سے زیادہ کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا، حدیث باب صحیح بخاری (الصلح: ۵) صحیح مسلم (الاقضیۃ: ۸) سنن ابی داؤد (السنۃ/ ۶) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ میں بھی اس کی سند صحیح ہے، چاروں حضرات کا صرف پہلا راوی الگ ہے ورنہ اگلا سلسلہ تو سب ہی کا ایک ہے۔

(۱۵/۴) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ رُمْحِ بْنِ الْمُهَاجِرِ الْمِصْرِيُّ أَنْبَأَنَا اللَّيْثُ بْنُ سَعْدٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ اَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ حَدَّثَهُ اَنَّ رَجُلًا مِنَ الْاَنْصَارِ خَاصَمَ الزُّبَيْرَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ شِرَاجِ الْحَرَّةِ الَّتِيْ يَسْقُوْنَ بِهَا النَّخْلَ فَقَالَ الْاَنْصَارِيُّ سَرِّحِ الْمَاءَ يَمُرُّ فَاَبٰى عَلَيْهِ فَاخْتَصَمَا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْقِ يَا زُبَيْرُ ثُمَّ اَرْسِلِ الْمَاءَ إِلٰى جَارِكَ فَغَضِبَ الْاَنْصَارِيُّ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ كَانَ ابْنَ عَمَّتِكَ

---

[1] شرح مسلم کتاب الاقضیۃ باب نقض الاحکام الباطلۃ الخ

فَتَلَوَّنَ وَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ يَا زُبَيْرُ اسْقِ ثُمَّ اِحْبِسِ الْمَاءَ حَتّٰى يَرْجِعَ إِلَى الْجَدْرِ قَالَ فَقَالَ الزُّبَيْرُ وَاللّٰهِ اِنِّى لَاَحْسِبُ هٰذِهِ الآيَةَ نَزَلَتْ فِي ذٰلِكَ (فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيْمًا)

عبداللہ بن زبیر بیان کرتے ہیں کہ ایک انصاری نے سیاہ پتھریلے علاقہ کی ان نالیوں کی بابت حضرت زبیر سے نزاع کیا، جن سے کھجور کے باغات سیراب کئے جاتے ہیں، اس نے زبیر سے کہا پانی چھوڑ دو، انہوں نے انکار کیا، معاملہ حضور کے پاس پہنچا تو آپ ﷺ نے فرمایا زبیر تم سینچ کر پانی پڑوسی کے لئے چھوڑ دو، انصاری کو یہ چیز پسند نہ آئی وہ بولا اے اللہ کے رسول زبیر آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں (اسی لیے فیصلہ انہی کے حق میں ہوا) آپ ﷺ کا چہرہ انور یہ سن کر متغیر ہو گیا، پھر آپ ﷺ نے زبیر کو حکم دیا کہ تم سیراب کر کے پانی کو روک لو، یہاں تک کہ کھیت کی مینڈوں تک پہنچ جائے، راوی کہتے ہیں کہ حضرت زبیر نے فرمایا خدا کی قسم میرے نزدیک یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی ہے، تمہارے پروردگار کی قسم وہ مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے اختلافات ونزاعات میں آپ ﷺ کو حکم نہ مان لے، پھر آپ جو کچھ فیصلہ فرمائیں اسے بسر وچشم قبول کر لے، اور اس کی بابت اپنے دلوں میں کوئی بوجھ محسوس نہ کرے۔

زبیر وانصاری کی مخاصمت

شراج امام نوویؒ نے شرح مسلم (۲/۲۶۱) میں لکھا ہے کہ شرجة کی جمع ہے اور اس کے معنی مسائل الماء کے ہیں، یہ خصوصاً ایسی نالی کو کہتے ہیں جو سنگستان سے نرم زمین کی طرف بہتی ہو، نیز ایسے گڑھے کو بھی شرجة کہا جاتا ہے، جس میں کھال بچھا کر پانی ڈالا جائے، الحرّة امام نووی کا کہنا ہے: هی الارض الملبسة حجارة سوداء یعنی وہ زمین جہاں کے پتھر سیاہ ہو سَرَحَ ثلاثی اور مزید فیہ دونوں میں اس کے معنی چھوڑنا ہے، اس لئے نوویؒ اور سندھی نے اس کو اَرْسَلَ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، یہ الماء کا حال ہے، أبی (ض) اباءً انکار کرنا، ناپسند کرنا۔ إسْقِ یہ سِقَايَةٌ سے فعل امر ہے، جَدْرٌ معنی دیوار، جمع جُدْرَان

آتی ہے، أن کان إبن عمتك تقدیر عبارت علامہ سندھی نے سنن مصطفیٰ میں یہ لکھی ہے حکمت بذٰلك لکونه ابن عمتك.

حدیث میں تین چیزیں غور طلب ہیں: ۱۔ پہلی یہ کہ حضرت زبیر کے مدمقابل انصاری مسلمان تھے یا منافق؟ داؤدی اور قرطبی نے انہیں منافق قرار دیا ہے، کیونکہ شانِ رسالت میں ایسی گستاخی مسلمان نہیں کرسکتا، لیکن یہ قول درست نہیں؛ کیونکہ صحیح بخاری کتاب الصلح باب اذا اشار الامام بالصلح الخ کے تحت امام بخاری نے روایت نقل کی اور اس میں رجل من الانصار کے بعد قد شهد بدرًا کی بھی تصریح ہے، حافظ فضل اللہ تورپشتی (عمدۃ القاری: ۱۵/۶) نے وهو باطل اذ کونه انصاریًا وصف مدح حضرت شاہ صاحب نے فیض الباری (۳۰۴/۳) میں فَلَا یُحْکَمْ عَلَیْهِ بِالنِّفَاقِ نیز ان هذا الانصاری کان بدریًا فکیف یظن به النفاق (۳۰۸/۳) اور حضرت گنگوہی نے الکوکب الدری میں وهذا سوء ادب نسبةً إلی الصحابة الکرام کے ذریعہ نفاق کے قول کو باطل قرار دیا ہے، علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں لکھا ہے کہ تمام طرق میں ان کا نام چھپایا گیا ہے، اور یہ ان کے مسلمان ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ رواۃ کا مقصد مومن کی پردہ دری سے بچنا ہے، پھر بھی اس سلسلے میں ثابت بن قیس بن شماس، ثعلبہ بن حاطب اور حاطب بن ابی بلتعہ کے نام لئے گئے ہیں۔

دوسری بحث انصاری کا یہ جملہ ہے، حضرت کشمیریؒ کے الفاظ میں وہ توجب نسبة الجور الی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم وهو کفر بواحٌ او نفاق صراح (فیض: ۳۰۴/۳) ہے اس کی دو تاویلیں کی گئی ہیں، پہلی یہ کہ انصاری نے آپ کی طرف ظلم نہیں؛ بلکہ ترجیح کو منسوب کیا ہے، یعنی آب پاشی دونوں کے لئے جائز تھی؛ لیکن آپ نے زبیر کو ابن العمة ہونے کی وجہ سے ترجیح دیدی، شیخ الاسلام حضرت کشمیریؒ فرماتے ہیں: والجواب عندی انه اراد من قوله ان کان ابن عمتك ترجیح احد الجائزات بهذه الرعایة دون الترجیح جانب الحرام والمعنی ان استقاء الزبیر واستقائی کانا جائزین ولکنك راعیت ابن الزبیر فحکمت لهٗ لکونه ابن عمتك (فیض: ۳۰۴/۳) قرابت کی بنیاد پر اسی کو ترجیح دی جائے، یہ دوسروں کے لئے تو اتنا اہم مسئلہ نہیں ہے لیکن رسول

کی طرف اس کا انتساب نہایت خطرناک چیز ہے، اس لئے آپ کو انصاری پر غصہ آیا۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ انصاری بہرحال انسان تھے، اس لئے بشری تقاضے کے تحت ان سے یہ لغزش ہوئی اور انہوں نے اس طرح کے نازیبا الفاظ کہہ دیئے، الکوکب الدری (۲/ ۲۰۸) اور بذل المجهود (۴/۳۲۲) میں تصریح ہے کہ انصاری کا باغ حضرت زبیر کے نشیب میں واقع تھا، اور وہ اپنی دانست میں یہ سمجھتے تھے، کہ سینچائی کا حق پہلے نیچے والے کو ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری (۵/ ۲۵) میں لکھا ہے، قال العلماء الشرب من نهرٍ او مسيلٍ غير مملوك يقدم الاعلٰى فالاعلٰى ولا حق للاسفل حتى يستغني الاعلٰى اس لئے حق تو زبیر ہی کا تھا، لیکن حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے الفاظ میں امرهٗ صلى الله عليه وسلم اولاً بالمسامحة والايثار بان يبقى شيئًا يسيرًا ثم يرسله الى جاره (بذل:۴/۳۲۲) رسول اللہ نے پہلے از راہِ محبت واخلاق پانی سے تھوڑا سا مستفید ہونے کے بعد فوراً اسے انصاری کے لئے چھوڑنے کا حکم دیا؛ لیکن انصاری کا جب یہ رویّہ دیکھا تو مولانا سہارنپوری ہی کے الفاظ میں امرهٗ بان يأخذ تمام حقه ويستوفيه فانه اصلح له وبالزجر ابلغ تو پھر انصاری کی تادیب کے لئے حضرت زبیر کو پورا حق وصول کرنے کا حکم دیا؛ کیونکہ اس وقت یہی مناسب تھا، حضرت کشمیری دونوں حکموں کی بابت فیض الباری (۳/ ۳۹۸) میں لکھتے ہیں: وفيه دليلٌ على ان حكمهٗ اولاً كان مروئةً وسماحةً فاذا راهٗ مغضبًا حكم عليه بالقضاء یعنی پہلے تو آپ نے ایثار و ہمدردی کا فیصلہ کیا تھا لیکن جب ان کا یہ رویہ دیکھا تو آپ نے قانونی حکم سنایا۔

شاتم رسول کا حکم

یہ جملہ بلاشبہ سنگین وخطرناک ہے، تو پھر اس انصاری کو قتل کیوں نہیں کیا گیا، امام نووی کے قول کا مستفاد یہ ہے کہ آپ نے انہیں معاف کردیا، جیسا کہ اوائل اسلام میں آپ کی عادت تھی، اس سلسلے میں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے الصارم المسلول میں بڑی گہری بات کہی ہے، فرماتے ہیں، شاتم رسول کو معاف کرنا نبی کا حق تھا، آپ کی وفات کے بعد یہ صورت ختم ہوگئی اور اب امت پر اس کو قتل کرنا واجب ہے، معاف کرنے کا کسی کو حق نہیں، اسی لئے امام

نووی شرح مسلم (۲۶۲/۲) میں لکھتے ہیں قال العلماءُ ولو صَدرَ مثلُ هٰذا الكلام الذی تَكلم به الانصاریُّ اليوم من اِنسانٍ من نسبته صلی الله عليه وسلم إلی هوی کان کفرًا وجرت علی قائلهٖ احکام المرتدین فیجب قتلهٗ اس لئے آج جو لوگ سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسے بدقماش لوگوں کی ہرزہ سرائی پر خاموشی اور درگذر کا مشورہ دیتے ہیں وہ شرعی قوانین سے ناواقف ہیں، اور اللہ معاف فرمائے ان کے سینوں میں حب رسول کا نام ونشان تک موجود نہیں ہے۔

تیسری بحث یہاں آیت کی شان نزول کی ہے، حضرت زبیر کی طرح مفسرین کی ایک جماعت کا بھی یہی خیال ہے، امام نووی نے شرح مسلم (۲۶۲/۲) میں لکھا ہے کہ دوسرا قول یہ بھی ہے کہ یہ آیت ان دو شخصوں کے بارے میں نازل ہوئی، جنہوں نے اپنا مقدمہ آپ کی عدالت میں پیش کیا؛ لیکن فیصلہ اس کے خلاف ہوا، وہ حضرت عمر کی طرف چلا، تیسرا قول ایک یہودی منافق کے بارے میں ہے ان کے جھگڑے کی بابت جب رسول اللہؐ نے فیصلہ فرمایا، تو منافق نے اسے تسلیم نہیں کیا اور مقدمہ ایک کاہن کے پاس لے گیا، ابن جریر کا کہنا ہے یہ بات ممکن ہے کہ تینوں واقعات اس کے نزول کا باعث بنے ہوں۔ حدیث صحیح بخاری (مساقات، صلح) صحیح مسلم (فضائل/ ۲۹) سنن نسائی، ابوداؤد، ترمذی (تفسیر/ نساء) میں بھی آئی ہے، اور ابن ماجہ کی سند بعینہٖ مسلم کی ہے۔

(۱۶/۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيٰى النَّيْسَابُورِيُّ حَدَّثَنا عَبْدُ الرَّزَّاقِ اَنْبَانَا مَعْمَرٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ سَالِمٍ ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا تَمْنَعُوا إِمَاءَ اللّٰهِ اَنْ يُصَلِّيْنَ فِي الْمَسْجِدِ فَقَالَ ابْنٌ لَهُ اِنَّا لَنَمْنَعُهُنَّ فَغَضِبَ غَضَبًا شَدِيْدًا وَقَالَ اُحَدِّثُكَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ تَقُولُ اِنَّا لَنَمْنَعُهُنَّ .

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم اللہ کی بندیوں کو اس بات سے مت روکو کہ وہ مسجدوں میں نماز پڑھیں، ابن عمرؓ کے بیٹے نے عرض کیا: ہم ان کو ضرور روکیں گے، راوی کا کہنا ہے کہ اس پر حضرت ابن عمر کو بہت غصہ آیا اور کہا کہ میں تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

حدیث بیان کر رہا ہوں اور تم کہتے ہو کہ ہم انہیں ضرور روکیں گے۔

(لا تمنعوا اماء الله أن يصلين في المسجد) صحیح مسلم کی روایت میں اذا استأذنكم کا اضافہ ہے۔

جماعت میں خواتین کی شرکت

جماعت میں خواتین کی شرکت، عورتوں کی مسجد میں نماز با جماعت سے متعلق حدیث کے ذخیرہ میں ہمیں پانچ قسم کی روایات ملتی ہیں جن کو سامنے رکھ کر ہی حدیث باب کی صحیح و مستند توجیہ کی جاسکتی ہے، احادیث کی پہلی قسم تو وہ ہے جن میں خروج النساء الى المساجد کی مطلق اجازت دی گئی ہے اور ان کے اولیاء کو اس بات سے روکا گیا ہے کہ وہ ان کی راہ میں حائل ہوں صحیحین میں اس کی روایات موجود ہیں، مثلاً: اذا استأذنَتْ إمرأةُ أحدِكم فلا يَمْنَعْهَا لیکن امام نوویؒ، حافظ ابن حجر، علامہ دقیق العید اور خود اہل حدیث عالم مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نے دوسری احادیث کی روشنی میں اس اجازت کو دیگر شرائط کے ساتھ مقید کیا ہے اور اسے بالکلیہ مطلق نہیں چھوڑا ہے۔

بخاری و مسلم ہی میں احادیث کی دوسری قسم وہ ہے جو خروج النساء کے لئے رات کی قید لگاتی ہے اور وہاں دن میں مسجد جانے کا کوئی تذکرہ نہیں، صحیح بخاری میں کتاب الاذان، باب خروج النساء الى المساجد بالليل والغلس کے تحت روایت ملتی ہے اذا استأذنكم نسائكم بالليل الى المساجد فأذنوا لهن.

تیسری قسم بھی صحیحین کے ساتھ سنن نسائی، سنن ابی داؤد، ابن ماجہ، طبرانی اور مسند احمد و بزار میں منقول ہے جس کی رو سے خواتین کو اسی وقت مسجد جانے کی اجازت ہے جبکہ وہ زیب و زینت اور خوشبو استعمال نہ کریں، جس سے بے پردگی اور فتنہ کا خطرہ ہو مثلاً: اذا شهدت إحداكن العشاء فلا تطيب تلك الليلة مسلم ہی کی دوسری روایت اس طرح ہے أيما امرأة أصابت بخورًا فلا تشهد معنا العشاء الآخرةَ.

چوتھی قسم سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ خواتین کی نماز مسجد سے زیادہ گھروں میں افضل ہے، سنن ابی داؤد کی روایت ہے صلوة المرأة في بيتها أفضل من صلوتها في

حجرتها وصلوٰتها في مخدعها أفضل من صلوٰتها في بيتها[۲] مسند احمد کی حدیث خيرُ مساجدِ النساء قَعرُ بُيُوتِهن اور زیادہ واضح ہے اور طبرانی میں ایک روایت یہ بھی ملتی ہے صلوٰة المرأة في بيتها خير من صلوٰتها في حجرتها ، وصلوٰتها في دارها خير من صلوٰتها في مسجد قومها اس کی سند عمدہ ہے اور حاکم نے مستدرک میں، منذری نے الترغيب والترهيب میں، ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں، ابن ابی شیبہ نے مُصنَّف میں ایسی مزید روایتیں صحیح سندوں کے ساتھ نقل کی ہیں۔

احادیث کی پانچویں قسم وہ ہے جن سے خروج النساء الى المساجد کی ممانعت ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ کی روایت لو أدرك رسول الله صلى الله عليه وسلم ما أحدث النساء لمنعهن المسجد كما منعت نساء بني إسرائيل حضرت عمر، زبیر بن عوام، عبداللہ بن مسعود، ابن عمر، ابن عباس، عروہ بن زبیر کے آثار بھی اسی قسم سے متعلق ہیں، نیز قاسم بن محمد، اسود علقمہ، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری، عبداللہ ابن مبارک اور جمہور فقہاء و محدثین کا رجحان بھی خروج کے خلاف رہا اور بعد کی صدیوں میں خواتین کا مسجدوں کے بجائے گھروں ہی میں نماز پڑھنے کا معمول رہا، خلافت عثمانیہ کے زوال یعنی ۱۹۲۳ء تک تو پھر بھی شرعی نظامِ حیات کے موجود ہونے کی بناء پر معاشرہ اپنے اندر بڑی خیر و برکت رکھتا تھا اور اس میں عمومی بگاڑ کی گنجائش نہیں تھی لیکن آج اسلامی نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد معاشرہ میں شرور و فتن کا ایک سیلاب سا آ گیا ہے، اور دجالی طاقتوں کے غلبہ کی بدولت عریانیت اب ایک تہذیب بن گئی ہے، اب ٹھنڈے دل سے سوچنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے اسلاف نے جب خیر القرون میں ان کے خروج کو پسند نہیں کیا تو آج کے شر القرن میں اس کی اجازت کی بابت کیونکر سوچا جا سکتا ہے، ہمارے نزدیک یہ کوئی علمی بحث نہیں ہے جس پر محاذ آرائی کی جائے، دوسرے مذاہب کے عبادت خانے کیوں کہ بے حیائی کا اڈہ بن چکے ہیں اور ہم لٹ پٹنے کے باوجود آج بھی اپنی مسجدوں میں اس روحانی ماحول کے امین ہیں جو عہد صحابہ سے ہم کو ورثہ میں ملا ہے، یہودی اسی ماحول کے دشمن ہیں اور دوسری عبادت گاہوں کی طرح ہماری مسجدوں کو آلودہ کرنے کے لئے انہوں نے یہ بحث چھیڑی ہے، باری تعالیٰ ان کے

شر سے پوری امت کو بچائے۔

﴿فقال ابن له﴾ صحیح مسلم کے ایک طریق میں فقال بلال بن عبداللہ اور دوسرے میں یقال له واقد منقول ہے، حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اول کو ترجیح دی ہے اور قرائن کے پیش نظر یہی بات دل کو لگتی ہے، سندھی کی بھی یہی رائے ہے۔

﴿لنمنعهن﴾ صحیح مسلم میں لَانَدَعهُن یخرُجنَ فَیَتخِذنَه دَغلاً کی تفصیل ہے یعنی ہم ان کو اس طرح نہیں چھوڑیں گے کہ وہ باہر نکل کر اس اجازت کو فساد اور دھوکے کا بہانہ بنالیں "دغل" کے معنی امام نووی نے الفساد والخداع والرِّیبَة بتلائے ہیں۔

﴿فغضب غضبًا شدیدًا﴾ صحیح مسلم کے ایک طریق میں فزَبرہ آیا ہے، جس کے معنی امام نوویؒ نے ای نهره لکھے ہیں، یعنی جھڑکنا، ڈانٹنا دوسرے طریق میں فضرب فی صدرہ اور تیسرے میں فأقبل علیه عبد اللّٰه فسبّه سبًا سیئًا ما سمعته سبّه مثله قط خلاصہ یہ ہوا کہ انہوں نے پہلے بیٹے کو جھڑک کر اس کے سینے پر ہاتھ مارا اور پھر اس کو اتنا سخت سست کہا کہ ان کے دوسرے بیٹے سالم کا کہنا ہے کہ میں نے ان کو ایسا جھڑکتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا، امام نوویؒ فرماتے ہیں فیه تعزیر المعترض علی السنة والمعارض لها برأیه یہ ہر اس شخص کی سزا ہے جو سنت پر اعتراض کر کے اپنی رائے سے اس کا معارضہ کرے شیخ الاسلام حضرت کشمیری نے لکھا ہے کہ ما أراد ان یقابل الحدیث برأیه وإنما کان غرضه صحیحًا غیر أن تعبیره لم یکن مناسبًا یوهم المعارضة والمخالفة لذا غضب به عبد اللّٰه بن عمر ان کا ارادہ حدیث سے مقابلہ کا نہ تھا؛ بلکہ صحیح مقصد سے انہوں نے یہ بات کہی تھی؛ لیکن تعبیر چونکہ غیر مناسب تھی جس سے مخالفت کا شبہ ہوتا تھا اس لئے حضرت کو اس پر غصہ آیا مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے بذل المجهود میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے فتح الملهم میں اور حضرت گنگوہی نے الکوکب الدری میں انہی خیالات کا اظہار کیا ہے کیونکہ بلال ممتاز تابعین میں سے ہیں اور ان سے بڑی بڑی شخصیات نے حدیث کی روایت کی ہے اس لئے حدیث کی مخالفت کا تو ان کی بابت تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ترجمة الباب أُحدِثُكَ عن رسولِ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وتقول انا لَنَمنَعُهُنَّ میں مضمر

ہے گو دل میں خیال نہ ہو؛ لیکن حدیث کی ظاہری مخالفت سے بھی تعظیم پر فرق آتا ہے اس لئے اس سے بھی بچنا چاہیے، ابن ماجہ کی سند بالکل صحیح ہے اور حدیث بخاری (الاذان/۱۶۵) مسلم (الصلوٰۃ/۳۰) سنن ابی داؤد (صلوٰۃ/۵۵) کے علاوہ بیشتر کتب حدیث میں موجود ہے۔

(۶/۱۷) حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ ثَابِتِ الْجَحْدَرِيُّ وَاَبُوْ عَمْرٍو وَحَفْصُ بْنُ عَمْرٍو قَالاَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الوَهَّابِ الثَّقَفِيُّ ثَنا اَيُّوْبُ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ اَنَّـهُ كَانَ جَالِسًا اِلٰى جَنْبِهِ ابْنُ اَخٍ لَهُ فَخَذَفَ فَنَهَاهُ وَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْهَا فَقَالَ اِنَّهَا لاَ تَصِيدُ صَيْدًا وَلاَ تَنْكِي عَدُوًّا وَاِنَّهَا تَكْسِرُ السِّنَّ وَتَفْقَأُ الْعَيْنَ قَالَ : فَعَادَ ابْنُ اَخِيْهِ فَخَذَفَ فَقَالَ اُحَدِّثُكَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْهَا ، ثُمَّ عُدْتَ تَخْذِفُ لاَ اُكَلِّمُكَ اَبَدًا.

سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ عبداللہ بن مغفل کا بھتیجا ان کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک اس نے کنکر اٹھا کر پھینکا، انہوں نے اسے تنبیہ کی (ناصحانہ انداز میں) سمجھایا کہ رسول اللہؐ نے اس سے روکا ہے، اور اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ یہ (معمولی کنکر) نہ تو شکار مار سکتا ہے اور نہ ہی دشمن کو کوئی گزند پہنچا سکتا ہے، (ہاں) اس سے یہ (نقصان) تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی (آنے جانے والے) کا دانت توڑ دے اور کسی کی آنکھ پھوڑ ڈالے، سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ اس (تنبیہ) کے باوجود ان کے (کمسن) بھتیجے نے پھر وہی حرکت کی کہ اور وہ (دوبارہ) کنکر پھینکنے لگا (یہ دیکھ کر عبداللہ بن مغفل کو بہت غصہ آیا اور) انہوں نے کہا میں تجھ سے رسول اللہ کی حدیث بیان کر رہا ہوں کہ آپ نے اس (طرح کی لغویات) سے منع فرمایا ہے اور (تو ہے کہ) دوبارہ کنکر پھینکنے لگا (خدا کی قسم) میں تجھ سے کبھی نہیں بولوں گا

خَذَفَ (ض) خَذْفًا خَذْفًا بالحصاة ونحوها، انگلیوں سے کنکری یا پتھر پھینکنا، نَكٰى (ض) نِكَايَةُ العدوّ فی العدوِ، قتل یا زخم لگا کر غالب آنا، فقأ (ف) فقأً وفقًّأ لفقيئةُ الدمل پھوڑے کو چیر نا شگاف لگانا، العین آنکھ پھوڑنا، عاد فعل شروع ہے، اور یخذف اس کی خبر واقع ہے۔

قطع تعلق کی نوعیت

لا اکلمك ابدًا یہ جملہ صحیح بخاری (ادب/ الہجرۃ) کی روایت **لا یحل لمسلم ان یھجر اخاہٗ فوق ثلث لیالٍ** کے خلاف ہے؛ کیونکہ حدیث کی رو سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق کی اجازت نہیں جبکہ صحابی یہاں ہمیشہ نہ بولنے کا عہد کرر ہے ہیں، حضرات محدثین کا کہنا ہے کہ حدیث کا محمل الگ ہے، اور یہ حکم اس وقت ہے جبکہ قطع تعلق کی بنیاد دنیوی ہو، شرعی نہ ہو، امام نووی نے صحیح مسلم (البر والصلۃ/ ۷) میں اس حدیث پر **باب تحریم الھجر فوق ثلثۃ ایام بلا عذر شرعی** کا ترجمۃ الباب قائم کرکے اسی طرف اشارہ کیا ہے؛ چنانچہ خود عہد رسالت میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ قطع تعلق تین دن نہیں؛ بلکہ ڈھائی مہینہ تک چلا ہے جیسا کہ صحیح بخاری (ادب/ ٦٢) میں غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین صحابہ، کعب بن مالک، مرارۃ بن الربیع، اور ہلال بن امیہ کی بابت جہاد میں شرکت نہ کرنے کی وجہ سے یہ حکم صادر فرمایا کہ تمام مسلمان ان سے قطع تعلق کرلیں اور بات بھی نہ کریں، چنانچہ یہ بائیکاٹ چالیس دن تک جاری رہا امام بخاری نے اس پر **باب ما یجوز من الھجران لمن عصٰی** کا عنوان قائم کیا ہے، دوسری دلیل امام ابوداوٗد نے (سنۃ/ ۴) میں نقل کی ہے، کہ ایک مرتبہ سفر میں ام المومنین صفیہ بنت حی کا اونٹ بیمار پڑ گیا، حضرت زینب بنت جحش کے پاس ایک فاضل اونٹ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب کو حکم دیا کہ وہ اونٹ صفیہ کو دیدو، تو اچانک ان کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا **انا اعطی تلك الیھودیۃ** رسول اللہ کو اس پر اتنا غصہ آیا کہ آپ نے ان سے ذی الحجہ، محرم اور صفر کے کچھ دن یعنی تقریباً ڈھائی مہینے تک کوئی تعلق نہیں رکھا۔

تیسری دلیل، صحیح بخاری **کتاب الادب باب الھجرۃ** میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ نے اپنے بھانجے عبداللہ بن زبیر سے خفا ہوکر یہ نذر مانی **لا اکلم ابن الزبیر ابدا** روایت میں تصریح ہے کہ **طالت الھجرۃ** کہ یہ قطع تعلق بہت لمبا چلا، تب کہیں جاکر ان کے تعلقات استوار ہوئے، صاف ظاہر ہے کہ یہ مدت تین دن سے کہیں زائد تھی، اس لئے محدثین کی رائے ہے کہ شرعی عذر کی بناء پر مزید قطع تعلق کی اجازت ہے، ملا علی قاری نے

مرقات المفاتیح (۲۱۶/۴) میں لکھا ہے فان هجرة اهل الاهواء واهل البدع واجبة ع‍ٰ‌ی مر الاوقات مالم يظهر منه التوبة والرجوع الى الحق، اسی طرح امام خطابی حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں رُخِصَ لِلمسلمِ اَن يَغضِبَ علىٰ اَخِيهِ ثَلٰثَ لَيالى لِقِلَّتِهٖ ولا يجوزُ فَوقَهَا الا إذا كانَ هجرانٌ فى حق من حُقوقِ اللّٰهِ تعالىٰ فيجوزُ فوقَ ذٰلك، حافظ سیوطی نے مسئلے کو مزید منقح کرتے ہوئے لکھا ہے واما ما كان من جهة الدين والمَذهبِ فهجرانُ اهل البِدَعِ والاهواءِ واجبٌ إلى وقت ظُهورِ التوبةِ ومَن خافَ مِن مُكَالَمَةِ احدٍ وصلتِهٖ ما يُفسِدُ عليه الدين او يَدخُل مضَرَّتَه فى دنياه يجوزُ له مجانبَتُهٗ والبعدُ عنه .

علامہ شامی اور ابن عبدالبر نے بھی صراحت کی ہے کہ تحفظ دین اور منکر پر نکیر کے لئے تین دن سے زیادہ قطع تعلق کیا جا سکتا ہے، شیخ عبدالغنی مجددی حدیث باب ہی سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں، وفيه جَوازُ الهجرانِ من اهلِ المَعاصى ان اصروا عليها اسی طرح دعاء قنوت میں ونترك من يفجرك کا ہم عہد کرتے ہیں۔

امام نے یہ روایت تعظیم حدیث کے تحت ذکر کی ہے مطلب واضح ہے کہ سماعت حدیث کے وقت یکسوئی اور دلجمعی ہونی چاہئے، تمام لغو اور فضول کام اس کی عظمت کے منافی ہیں، حدیث صحیح بخاری، صحیح مسلم (صید/ ۹) اور سنن ابی داؤد کے علاوہ مسند احمد اور مستدرک حاکم میں آئی ہے، ابن ماجہ کی بھی سند صحیح ہے۔

(۱۸/۷) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ حَدَّثَنَا يَحْيٰى بْنُ حَمْزَةَ حَدَّثَنِى بُرْدُ بْنُ سِنَانٍ عَنْ إِسْحَاقَ بنِ قبيصة عَنْ أَبِيهِ أَنَّ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ الْأَنْصَارِىَّ النَّقِيْبَ صَاحِبَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَزَا مَعَ مُعَاوِيَةَ أَرْضَ الرُّوْمِ فَنَظَرَ إِلَى النَّاسِ وَهُمْ يَتَبَايَعُوْنَ كِسَرَ الذَّهَبِ بِالدَّنَانِيْرِ وَكِسَرَ الفِضَّةِ بِالدَّرَاهِمِ فَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اِنَكُمْ تَاكُلُوْنَ الرِّبٰوا ، سمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ لاَ تَبْتَاعُوْا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ اِلاَّ مِثْلاً بِمِثْلٍ لاَ زِيَادَةَ بَيْنَهُمَا وَلاَ نَظِرَةً فَقَالَ لَهُ مُعَاوِيَةُ : يَا أَبَا

الْوَلِيْدِ ! لَا أَرىٰ الرِّبٰوا فِي هٰذَا إِلَّا مَاكَانَ مِنْ نَظِرَةٍ ، فَقَالَ عبَادَة أُحَدِّثُكَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتُحَدِّثُنِي عَنْ رَأيِكَ لَئِنْ أَخْرَجَنِيَ اللّٰهُ لا أُسَاكِنُكَ بِأَرْضٍ لَكَ عَلَيَّ فِيهَا إِمْرَةٌ ، فَلَمَّا قَفَلَ لَحِقَ بِالْمَدِيْنَةِ ، فَقَالَ لَهُ عُمَرُ بنُ الخَطَّابِ مَا أَقْدَمَكَ يَا أَبَا الوَلِيْدِ! فَقَصَّ عَلَيْهِ الْقِصَّةَ وَمَا قَالَ مِنْ مُسَاكَنَتِهِ ، فَقَالَ إِرْجِعْ يَا أَبَا الْوَلِيْدِ إِلٰى أَرْضِكَ فَقَبَحَ اللّٰهُ أَرْضًا لَسْتَ فِيهَا وَأَمْثَالُكَ وَكَتَبَ إِلٰى مُعَاوِيَةَ لَا إِمْرَةَ لَكَ عَلَيْهِ واحْمِلِ النَاسَ عَلَى مَا قَالَ فَإِنَّهُ هُوَ الْأَمْرُ .

قبیصہ روایت کرتے ہیں کہ عبادہ بن صامت انصاری نے جو قوم کے سربراہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے امیر معاویہ کے ساتھ روم میں جہاد کیا، وہاں انہوں نے دیکھا کہ لوگ دینار سے سونے کے ٹکڑوں کو اور درہم سے چاندی کے ٹکڑے خرید رہے ہیں، انہوں نے کہا: لوگو!! تم سود کھا رہے ہو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ سونے کو سونے کے عوض مت بیچو، جب تک کہ دونوں برابر اور نقد نہ ہوں، امیر معاویہ نے ان سے کہا کہ ابوالولید میں تو اس کو سود نہیں سمجھتا، جب تک سودا ادھار نہ ہو، عبادہ نے جواب دیا کہ میں تمہیں حدیث رسول سنا رہا ہوں اور تم مجھ سے اپنی رائے کی بات کر رہے ہو، اگر اللہ نے مجھ کو یہاں سے واپس کر دیا تو میں اس سرزمین پر نہیں رہوں گا، جہاں مجھ پر تمہاری حکومت ہوگی؛ چنانچہ واپسی پر وہ مدینہ لوٹ آئے، عمر ابن خطاب نے ان سے فرمایا: اے ابوالولید کیا چیز تمہیں یہاں لے آئی؟ اس پر انہوں نے حضرت کو پورا واقعہ سنایا؛ لیکن اپنے قیام سے متعلق کچھ نہیں کہا حضرت عمر نے فرمایا ابوالولید اپنی جگہ لوٹ جاؤ، باری تعالیٰ اس جگہ کو خیر سے محروم کر دے گا، جہاں تم جیسے لوگ موجود نہ ہوں، انہوں نے امیر معاویہ کو لکھ دیا کہ تمہاری امارت عبادہ پر نہیں ہے، انہیں کی رائے پر لوگوں سے عمل کراؤ؛ کیونکہ مسئلہ وہی ہے۔

عبادہ بن صامت کا واقعہ

﴿عبادة بن الصامت الأنصاري النقيب﴾ مشہور انصاری صحابی ہیں ان کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا، ۱۳ نبوی موسم حج میں مدینہ منورہ سے جو ۷۳ مرد اور دو عورتیں مکہ مکرمہ آ کر

بیت عقبہ ثانیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان لائے تھے ان میں بارہ سربراہ منتخب کئے گئے تھے، ۹ خزرج کے اور ۳، اوس کے، خزرجی نقباء میں حضرت عبادہ بن صامت بھی شامل تھے، حدیث باب میں نقیب سے اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے؛ چنانچہ تمام غزوات میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے پھر دور فاروقی میں حضرت عمر نے ان کو قاضی ومعلم بنا کر شام بھیج دیا، یہ واقعہ اسی زمانے کا ہے پھر وہ فلسطین منتقل ہوگئے، اور ۷۲ رسال کی عمر میں ۳۴ رہجری میں رملہ یا بیت المقدس میں ان کی وفات ہوگئی۔

﴿غزا مع معاوية ارض الروم﴾ ابن ماجہ میں اختصار ہے جبکہ صحیح مسلم اور سنن نسائی کی روایت میں یہاں کچھ اور تفصیلات بھی ملتی ہیں جن میں زیادہ واضح مسلم کا طریق ہے؛ چنانچہ واقعہ کے ایک اور شریک ابوالاشعث بیان کرتے ہیں **غَزَونَا غزوةً وعلى الناسِ مُعاويةُ فَغنمنَا غنائمَ كثيرَةً فكان فيما غَنمنَا انيةٌ مِن فِضَّةٍ فأمر مُعاوية رجلاً أن يبيعها فِي اَعطِيَاتِ الناسِ فتسارَعَ الناسُ فى ذلك فَبَلَغَ عُبادةَ بنِ الصامت فَقَامَ فقال انى سَمِعتُ رسولَ اللّٰه ﷺ يَنهٰى عَن بَيعِ الذَّهب بالذَّهبِ والفِضَّةِ بالفِضَّةِ والبُرِّ بالبُرِّ والشعيرِ بالشَّعيرِ والتَّمرِ بالتَّمرِ والمِلحِ بِالمِلحِ الاَّ سواءً بسواءٍ عَينًا بِعَينٍ فمَنْ زَادَ اَوِ ازدَادَ فَقَد اَربى فَرَدَّ الناسُ ما أخَذُوا .**

﴿وهم يتبايعون كِسرَ الذهب بالدنانير وكِسرَ الفضة بالدراهم﴾ **كِسَر** **كِسْرة** کی جمع ہے معنی ٹکڑا، اکسار و کسور بھی اس کی جمع آتی ہے، درہم چاندی کے اور دینار سونے کے سکے کو کہتے ہیں، یہی چیز حضرت عبادہ کے نزدیک سود تھی اور اسی سے بچانے کے لئے انہوں نے کھڑے ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنائی جس کی تعبیر ابن ماجہ میں صحیح مسلم سے مختلف ہے، وہاں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ دیا جبکہ یہاں آپ کا قول نقل کررہے ہیں یعنی **لا تبتاعوا الذهب بالذهب إلا مثلاً بمثل لا زيادة بينهما ولا نظرة** ، **نظرة** کے معنی مہلت، تاخیر، یہاں ادھار مراد ہے، لوگوں نے یہ سن کر خریدی ہوئی چیزیں واپس کردیں۔

﴿فقال له معاوية يا ابا الوليد! لا ارى الربو فى هٰذا إلا ما كانت من

نظرۃ﴾ ایسا لگتا ہے کہ امیر معاویہ نے حضرت عبادہ سے یہ براہِ راست گفتگو بعد میں کی، پہلے مجمع عام میں ان کی تردید فرمائی، صحیح مسلم میں منقول ہے: **فبلغ ذٰلك معاويةَ فقام خطيبًا فقالُ ألا ما بال رجالٍ يتحدثون عن رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم أحاديثَ قد كنا نشهدُه ونصحبُه فلم نسمعَها منه** یعنی حضرت عبادہ کی تنبیہ پر جب لوگوں نے خریدی ہوئی چیزیں واپس کر دیں تو یہ اطلاع ملتے ہی امیر معاویہ نے کھڑے ہو کر تقریر کی کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی احادیث بیان کرتے ہیں جن کو آپ سے ہم نے نہیں سنا، حالانکہ ہم بھی نبی کے ساتھ رہے ہیں، ہم نے بھی صحبت اٹھائی ہے۔

﴿**احدثك عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وتحدثني عن رأيك**﴾ اس پر حضرت عبادہؓ نے امیر معاویہؓ کی سخت گرفت کی کہ تم محض اپنی رائے پیش کر رہے ہو، جبکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے حوالہ سے مسئلہ بتایا تھا کیا قول نبوی کا مقابلہ آپ کی رائے کر سکتی ہے؟ یہی ترجمۃ الباب ہے کہ حدیث کی ادنیٰ اور ظاہری مخالفت بھی تعظیم حدیث کے منافی ہے، صحیح مسلم میں مزید وضاحت ہے کہ حضرت عبادہ نے اسی مجمع میں کھڑے ہو کر پہلے مسئلہ کو دوبارہ بیان کیا اور پھر اعلان کیا: **لنحدثنّ بما سمعنا من رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وإن كره معاوية او قال وإن رغم ما أبالى أن لا أصحبه فى جنده ليلة سوداء .**

پھر غالباً مندرجہ ذیل جملہ کہا ہوگا!!

﴿**لئن أخرجنى اللّٰه لاأساكنك بأرضٍ لك علىّ فيها إمرة**﴾ امیر معاویہ نے جب ان کی بات کو تسلیم نہیں کیا غالباً انہوں نے اس وقت یہ فیصلہ کیا، ایک مسلمان کو اس کا حق ہے کہ تنبیہ کے باوجود اگر دوسرے لوگ اطاعت نہ کریں اور ان سے غیر شرعی فعل کا صدور ہو تو ان سے علیحدگی کر لے، اشکال پیدا ہوتا ہے کہ امیر معاویہ کی طرف نتیجہ کے طور پر اکل ربوا کا انتساب ہوا، حالانکہ وہ بھی فقہاء صحابہ میں سے ہیں، حضرت مولانا محمد حسن سنبھلی نے طحاوی کے حاشیہ پر اس کا تفصیلی جواب دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی چیز کے سود ہونے پر یقین کے بعد تمام وعیدیں جاری ہوں گی اور فسق وعصیان کا فیصلہ کیا جائے گا؛ لیکن یہ عمل اگر اجتہادی طور

پر صادر ہو، نافرمانی کے طور پر نہیں تو اس صورت میں مجتہد وعید کا مصداق نہیں؛ بلکہ خطا ہونے کے باوجود اسے ایک اجر سے پھر بھی نوازا جائے گا، امیر معاویہ مجتہد عادل تھے ان سے اس مقام پر ایسی ہی خطا ہوئی ہے جیسا کہ حضرت علی کے خلاف صف آرائی میں ہوئی، اس لئے کوئی اعتراض نہیں، صحابہ میں پہلے ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ کا بھی یہی مسلک تھا کہ ڈھلائی کی قیمت کو ذہن میں رکھ کر سکوں کے عوض خالی سونا نقد کچھ زائد لیا جا سکتا ہے، بعد میں حضرت ابو سعید خدری کی روایت کی بنیاد پر انہوں نے رجوع کر لیا۔

علامہ باجی نے معاویہ کے سلسلہ میں اسی مسلک کا احتمال ظاہر کیا ہے۔

ربا کی تحدید

بعض اہل ظاہر ربا کو انہیں چھ چیزوں میں محدود مانتے ہیں؛ لیکن یہ صحیح نہیں، ائمہ اربعہ اور جمہور امت کے نزدیک یہ حکم کسی علت کا معلول ہے، اس لئے جو چیزیں بھی ان کے مماثل ومشابہ ہوں گی وہ اسی کے ذیل میں آئیں گی؛ لیکن یہ علت کیا ہے؟ اس سلسلے میں ائمہ مجتہدین کی رائے مختلف ہے، سونے اور چاندی میں علت تو امام مالک وشافعی کے نزدیک ثمنیت ہے جبکہ باقی اشیاء میں وہ اول الذکر کے نزدیک اقتیات وادخار ہے، وثانی الذکر اسے مطعومیت قرار دیتے ہیں یعنی ان کے نزدیک اتحاد جنس علت نہیں شرط ہے، امام ابوحنیفہ اور احمد بن حنبل کا کہنا ہے یہاں دو علتیں ہیں: ایک اتحاد جنس کی اور دوسری اتحاد قدر کی، سونے اور چاندی میں وزن مع الجنس ہے اور دوسری اشیاء میں کیل مع الجنس، کیونکہ حدیث میں مماثلت کو ضروری قرار دیا گیا ہے، اب مالکیہ اور شوافع کے درمیان فرق اس صورت میں ظاہر ہوگا کہ دواؤں کے تبادلے میں کمی بیشی پہلے طبقے کے نزدیک جائز ہے؛ کیونکہ وہ غذا کے طور پر استعمال نہیں کی جاتیں، جبکہ دوسرا طبقہ اسے ناجائز کہتا ہے؛ کیونکہ اس میں مطعومیت پائی جاتی ہے، یہی حال پھلوں کا ہے، ذخیرہ اندوزی نہ ہونے کی وجہ سے مالکیہ ان میں باہمی کمی بیشی کو جائز کہیں گے، اور مطعومیت کی وجہ سے وہ شوافع کے نزدیک ناجائز ہے، اس طرح شوافع اور حنفیہ کے درمیان فرق یہ ہوگا کہ لوہے اور تانبے وغیرہ میں ہمارے یہاں کمی بیشی جائز نہیں؛ کیونکہ جنس اور وزن کی علت پائی جا رہی ہے، اور ان کے یہاں وہ جائز ہے؛ کیونکہ دونوں میں ثمنیت اور مطعومیت

نہیں ہے، الغرض! ان چھ چیزوں کو ذکر کر کے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بیع وشراء کے سلسلے میں اصولی ہدایات دیدی ہیں، جن کی روشنی میں ہم خرید وفروخت کا پورا نظام وضع کر سکتے ہیں۔

﴿فلما قفل لحق بالمدينة﴾ قفل قَفلاً وقفولاً باب نصر وضرب سے آتا ہے، معنی سفر سے لوٹنا، مسافرین کی جماعت کو بطور دعا قافلہ کہا جاتا ہے اور اس کی کلام عرب میں بہت مثالیں موجود ہیں، حضرت عبادہ اپنے عہد کے مطابق مدینہ منورہ چلے آئے اور حضرت عمر کے استفسار پر ان کو پورا واقعہ سنایا اوجز المسالك میں اسے فقہاء کی اصطلاح کے مطابق "رفع المنكر الى الامام إذا لم يستطع تغييرهٗ بنفسه" کا نام دیا گیا ہے۔

﴿قبح الله أرضًا﴾ قاموس کے حوالہ سے علامہ سندھی نے فعل کو تخفیف کے ساتھ لکھا ہے اور ان کے نزدیک معنی ہیں "نحّاه الله من الخير" یعنی اللہ اس علاقہ کو خیر سے محروم کردیگا، کسی بزرگ شخصیت کے باعث خیر وبرکت کے نزول اور آفت وبلاؤں سے حفاظت کی قرآن وسنت میں اور بھی دلیلیں موجود ہیں۔

﴿لست فيها وأمثالك﴾ علامہ سندھی نے سنن مصطفیٰ میں لکھا ہے "بالرفع عطف على إسم ليس أمثالك" لیس کے اسم پر عطف ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، مولانا عبدالغنی مجددی فرماتے ہیں کہ امثالك کا عطف ضمیر مرفوع متصل پر کیا گیا، اور معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان فصل واقع ہونے کی بناء پر لستَ کی تاکید ضمیر منفصل سے نہیں کی گئی ہے۔

﴿واحمل الناس على ما قال﴾ یعنی لوگوں کو عبادہ ہی کی رائے کے مطابق عمل کی دعوت دو، علامہ باجی نے لکھا ہے "كتب عمر على حسب ما يجب على الإمام من احكامه بالحق والتوصية لهم بصواب الأحكام" لوگوں کو حق پر جمانا اور انہیں صحیح حکم سے آگاہ کرنا، امام المسلمین کا فریضہ ہے، اسی لئے حضرت عمر نے امیر معاویہ کو یہ خط لکھا، اس سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ خلیفہ کے فرمان کے مطابق انہوں نے بھی اپنے موقف سے رجوع کرلیا ہوگا۔

﴿فانه هو الأمر﴾ سندھی نے اس کی وضاحت "اعتقدوا فيه" سے کی ہے یعنی اسی کو عقیدہ بنالو، مولانا لطیف خاں بہرائچی نے الديباجه على سنن ابن ماجه میں حدیث کی سند کو حسن لغیرہ قرار دیا ہے جبکہ مختصر طور پر وہ صحیح مسلم (مساقاۃ/۱۳) سنن نسائی (بیوع/

۴۱)وغیرہ میں بھی آئی ہے۔

(۱۹/۸) حَدَّثَنَا اَبُوبَکْرِ بْنُ الخَلَّادِ البَاهِلِیُّ حَدَّثَنَا یَحْیٰی بْنُ سَعِیْدٍ عَنِ ابْنِ عَجْلَانَ اَنْبَانَا عَوْنُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اِذَا حَدَّثْتُکُمْ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَظُنُّوْا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الَّذِیْ هُوَ اَهْنَاهُ وَاَهْدَاهُ وَاَتْقَاهُ .

عبداللہ ابن مسعود نے فرمایا کہ جب تم سے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کروں تو اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کی بناء پر سب سے مناسب، سب سے زیادہ ہدایت والی اور سب سے زیادہ تقویٰ کا ضامن سمجھو۔

﴿أهنأ﴾ یہ هنأ (ف) یهنأ هناءً ا سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے معنی خوش گوار ہونا، آسان ہونا، علامہ سندھی نے اس کی تشریح "الذی هو أوفقُ به من غیره" سے کی ہے یعنی وہ مفہوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج نبوت سے سب سے زیادہ مطابقت رکھتا ہو اور اس میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جو آپ کی تعلیمات کے منافی ہو۔

﴿أهداه﴾ یہ بھی ہدایت سے اسم تفضیل ہے علامہ سندھی اس کے معنی لکھتے ہیں "و ألیق بکمال هُداه" یعنی حدیث کے الفاظ سے نکالا گیا تمہارا وہ مفہوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کے شایانِ شان ہو جس کے آپ سب سے اونچے منصب پر فائز ہیں اور اس میں کوئی سطحی بات نہ ہو۔

﴿أتقاه﴾ یہ خلافِ قاعدہ إتقاء سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے، سندھی لکھتے ہیں: ای وأنسب بکمال تقواه وہ معنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ درجہ کے تقویٰ کے مناسب ہو، مولانا عبدالغنی مجددی نے لکھا ہے: "فاقبلوه واعزموا علیه فإن الوجوه الممکنة فی فعل من افعاله او قول من اقواله متعددة وأحسنها ماثبت عنه صلی اللّٰه علیه وسلم واستقر امر الصحابة علیه" یعنی حدیث رسول کو فوراً قبول کر کے اس کو مضبوطی سے پکڑلو آپ کے کسی بھی قول وفعل کی توجیہیں مختلف ہوسکتی ہیں؛ لیکن ان میں سب سے بہتر مفہوم وہ ہوگا جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو اور اس پر صحابہ کا عمل ہوگیا ہو، اس کی

وجہ سندھی لکھتے ہیں: إن قوله صواب ونصح واجب العمل به لكونه جاء به من عند الله تعالىٰ وبلّغه الناس بلا زيادة ونقصان رسول کی شان، مجددی کے الفاظ میں یہ ہے: فانه لا يامرنا الا بالخير وإن كان بعض الامور مخالفا للطبع والعادة اُن کے ہر حکم میں خیر ہوتی ہے خواہ بعض چیزیں عادت ومزاج کے خلاف ہوں، اگر نبی کے قول وفعل کی متعدد توجیہات ہوں تو اس وقت ہم ایسی توجیہ کی تعیین کے مکلّف ہیں جو شرعی حدود کے زیادہ مطابق نبوی مزاج سے قریب تر اور آپ کے تقویٰ کے شایانِ شان ہو، نیز صحابہ کرام کا عمل بھی اُسی کو راجح قرار دیتا ہو، حدیث باب کا یہی تقاضہ ہے۔

نبی کے اسوے کے خلاف روایات سے مفہوم تراشنا تعظیم حدیث کے منافی بلکہ شدید ترین معارضہ ہے، اس لئے امام نے حدیث کو اس باب کے تحت ذکر کیا، بوصیری نے ''زوائد'' (۴۵/۱) میں لکھا ہے هذا إسناد فيه إنقطاع، عون بن عبدالله لم يسمع عن عبد الله بن مسعود اس لئے مولانا لطیف الرحمٰن خان بہرائچی نے حدیث کی بابت اسنادهٗ ضعیف کا فیصلہ کیا ہے، مسند احمد بن حنبل میں یہ روایت تقریباً آٹھ سندوں سے مروی ہے۔

(۲۰/۹) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ حَدَّثَنَا يَحْيىٰ بْنُ سَعِيْدٍ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ عَمْرِو بْنِ مُرَّةَ عَنْ أَبِي الْبَخْتَرِيْ عَنْ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمٰنِ السُّلَمِيِّ عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ قَالَ اِذَا حَدَّثْتُكُمْ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيْثًا فَظُنُّوْا بِهِ الَّذِيْ هُوَ اَهْنَاهُ وَاَهْدَاهُ وَاَتْقَاهُ.

عہد رسالت کے بعد جب وضع حدیث کا فتنہ اُٹھا تو اس کے ردِ عمل کے طور پر امت میں ایسا طبقہ وجود میں آیا جو قرآن کو کافی سمجھ کر حدیث نبوی سے یک گونہ استغنا برتنے لگا، حضراتِ صحابہ نے حکمت وتدبر کے ساتھ مضبوط دلائل کے ذریعہ اس مرض کا علاج کیا، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے تدوین حدیث میں لکھا ہے کہ حضرت علی کا مخاطب یہاں وہی طبقہ ہے جو موضوعات سے بیزار ہو کر احادیث سے دور ہونے لگا تھا، اُنہوں نے سمجھایا کہ فرمانِ نبوت میں ہی ہدایت وتقویٰ کی سب سے زیادہ ضمانت ہے اور قرآنِ کریم سیرت کی روشنی میں ہی سمجھا جا سکتا ہے، اس لئے خزف ریزوں سے جھلا کر اشرفیوں سے محروم مت ہو جاؤ۔

بعض لوگ یہاں ایک اور مطلب بھی بتلاتے ہیں وہ یہ کہ حدیث نبوی کے عموم، اشتراک اور اجمال سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھایا جائے، اُس صورت میں دوسری نصوص کے ذریعہ عام کو خاص، مطلق کو مقید اور مجمل کو مفسر کیا جائے گا، اپنے جی سے کچھ کا کچھ گھڑنا مناسب نہیں، جیسا کہ مرجئہ نے "من قال لا الٰه الا اللّٰه دخل الجنة" کے عموم سے عمل کی منفعت ومضرت کا انکار کیا اور اہل ظاہر نے لیس منا، لا إیمان لمن اور لا سهم في الإسلام جیسی احادیث کے عموم سے کبائر کے مرتکب کو کافر و مرتد قرار دیا، جبکہ شیعوں نے من كنت مولاه فعلي مولاه کے اشتراک سے فائدہ اٹھا کر "مولیٰ" سے جانشین مراد لیکر علی کے خلیفہ بلا فصل ہونے کا عقیدہ قائم کیا اور "أنت مني بمنزلة هارون من موسیٰ کے اجمال سے بھی حضرت علی کی جانشینی پر استدلال کیا، حدیث کے الفاظ پر غور کرنے کے بعد ہمارے نزدیک یہاں مولانا گیلانی کی توجیہ زیادہ دل لگتی ہے، ترجمۃ الباب گزشتہ حدیث میں ذکر کیا جاچکا، سند کی بابت بوصیری نے "زوائد" (۱/ ۴۵) میں لکھا ہے: "اسنادُہ صحیحٌ رجالُهُ محتجٌ بهِم في الصحيحين"

(۱۰/۲۱) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الْمُنْذِرِ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْفُضَيْلِ ثَنَا الْمَقْبُرِيُّ عَنْ جَدِّهِ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ لَا أَعْرِفَنَّ مَا يُحَدَّثُ أَحَدُكُمْ عَنِّيْ الْحَدِيْثَ وَهُوَ مُتَّكِئٌ عَلٰى أَرِيْكَتِهِ فَيَقُوْلُ اقرأ قُرْآنًا مَا قِيْلَ مِنْ قَوْلٍ حَسَنٍ فَأَنَا قُلْتُهُ.

حدیث باب کا ایک راوی عبداللہ بن سعید بن ابی سعید مقبری حد درجہ ضعیف ہے، اور اس پر امام احمد، ابن معین، ابوزرعہ، ابوحاتم، نسائی، دارقطنی، ابن حبان، امام بخاری، اور حافظ ابن حجر نے سخت تنقید کی ہے پھر درایتی نقطہ نظر سے بھی یہ روایت غلط ہے؛ کیونکہ اس کی رو سے ہر اچھے مقولے کو بآسانی حدیث قرار دیا جاسکتا ہے اور یہ بھی موضوع روایات ہی کی ایک قسم ہے؛ چنانچہ صحیح مسلم باب الاسناد من الدين میں ابوجعفر ہاشمی کے بارے میں امام رقبہ سے مروی ہے كان يضع احاديث كلام حق وليست من احاديث النبي صلى الله عليه وسلم وكان يرويها عن النبي صلى الله عليه وسلم یعنی وہ ہر اچھے مقولے اور حکمت

کی باتوں کو حدیث بنا کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرتا تھا، ابن ابی سعید مقبری اسی کا سرپرست معلوم ہوتا ہے جو ظاہرا ہر اچھی بات کو حدیث بنانے کے لئے خود رسول اللہ ﷺ سے سند حاصل کرنا چاہتا ہے، محدثین نے اس کو متروک قرار دیا ہے، اس لئے روایت و درایت دونوں لحاظ سے یہ روایت باطل ہے اور اسے مان کر ائمہ جرح وتعدیل کی ساری کوششیں لغو قرار پاتی ہیں، مولانا لطیف الرحمٰن خاں بہرائچی نے الدیباچہ (۱/۱۴۴) میں اس کی بابت اسنادہ منکر کا فیصلہ کیا ہے۔

(۲۲/۱۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عُبَادِ بْنِ اٰدَمَ ثَنَا أَبِی عَنْ شُعْبَةَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَمرٍو عَنْ أَبِی سَلَمَةَ عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ ح وَحَدَّثَنَا هَنَّادُ بْنُ السَّرِیُّ ثَنَا عَبْدَةُ بْنُ سُلَیْمَانَ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَمرٍو عَنْ أَبِی سَلَمَةَ أَنَّ أَبَا هُرَیْرَةَ قَالَ لِرَجُلٍ یَا ابْنَ أَخِی اِذَا حَدَّثْتُكَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَدِیْثًا فَلَا تَضْرِبْ لَهُ الْاَمْثَالَ قَالَ أَبُو الْحَسَنِ ثَنَا یَحْیٰی بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ الْکَرَابِسِیُّ ثَنَا عَلِیُّ بْنُ الْجَعْدِ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ عَمرِو بْنِ مُرَّةَ مِثْلَ حَدِیْثِ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ.

ابوسلمہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے ایک شخص سے کہا بھتیجے! جب میں تم سے رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث بیان کروں تو اس کی بابت مثالیں نہ دیا کرو۔

جامع ترمذی میں منقول ہے: ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الوضوءُ مِما مَسَّتِ النارُ ولو مِن ثَورِ أقطٍ ابن عباس نے اعتراض کرتے ہوئے کہا أنتوَضأُ مِنَ الدُّهنِ؟ أنتوَضأُ مِنَ الحَمِيمِ؟ اس پر ابوہریرہؓ نے انہیں جو تنبیہ کی حدیث باب اسی پر مشتمل ہے، وضوء مما مست النار کے بارے میں صحابہ کے ابتدائی دور میں اختلاف تھا؛ لیکن امام نوویؒ کی تصریح کے مطابق اب عدم وجوب پر اتفاق واجماع ہو گیا ہے، جیسا کہ سنن ابوداؤد باب فی ترك الوضوء مما مست النار میں حضرت جابر کی روایت منقول ہے، كان آخر الامرين من رسول الله صلى الله عليه وسلم ترك الوضوء مما غيرت النار یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ابن عباس نے حدیث

رسول کی اتنی صریح مخالفت کی حالانکہ یہ وہ چیز ہے جس کی وجہ سے ابن مغفل نے اپنے بھتیجے اور ابن عمر نے اپنے بیٹے سے قطع تعلق کرلیا تھا، اور عبادہ بن صامت نے امیر معاویہ کے ساتھ نہ رہنے کی قسم کھائی تھی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور علامہ ابراہیمؒ بلیاوی جواب دیتے ہیں کہ ابن عباس کا اعتراض حدیث پر نہیں؛ بلکہ حضرت ابو ہریرہؓ کے فہم پر تھا؛ کیونکہ انہوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کا عمل اس کے خلاف دیکھا تھا، اس لئے ان کو خیال ہوا کہ حضرت ابو ہریرہ حدیث سے دوسرا مفہوم سمجھ رہے ہیں؛ چنانچہ انہوں نے یہ اشکال کردیا امام ابن ماجہ نے اس حدیث کو تعظیم حدیث کے تحت ذکر کیا ہے، مقصد واضح ہے کہ حدیث کے ظاہری معارضہ سے بھی اجتناب ضروری ہے، خواہ نیت میں کتنا ہی اخلاص ہو، بعض حضرات نے اسی حدیث کے ذیل میں حضرت ابو ہریرہؓ کی فقاہت کا انکار کیا ہے، جو صریح غلطی ہے، ان کا شمار اہل علم کے نزدیک فقہاء صحابہ میں ہوتا ہے، روایت جامع ترمذی (طہارۃ / ۵۷) میں بھی آئی ہے، ابن ماجہ کی سند میں عباد ابن آدم کو ابن حجر نے تقریب (۳۱۲۱) میں مجھول اور محمد بن عمرو کو (۶۱۸۸) صدوق له اوهام قرار دیا ہے، اس لئے سند ضعیف ہے۔

باب التوقی فی الحدیث عن رسول اللہ ﷺ

یہ وقایہ سے تفعل کا مصدر ہے جس کے معنی احتیاط کرنا اور خوف کھانا ہے، حدیث میں احتیاط کے تین مطلب ہوسکتے ہیں، ۱ احتیاط فی روایت الحدیث ۲ احتیاط فی قبول الحدیث ۳ احتیاط فی فہم الحدیث، امام ابن ماجہ نے باب میں تینوں کو ملحوظ رکھا ہے اور ہر ایک سے متعلق انہوں نے یہاں روایات درج کی ہیں۔

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ کی وعید کے پیش نظر روایت کے باب میں صحابہ پر پوری زندگی ایک ہیبت طاری رہی اور انہوں نے صرف انہیں احادیث کو بیان کیا جو حافظے میں صد فیصد صحیح اور درست تھیں، ایک شک کی بنیاد پر صدیق اکبرؓ کا اپنا صحیفہ جلادینا، حضرت عمرؓ کا صحابہ کو اقلوا الروایة کا مشورہ دینا، حضرت عثمانؓ کا مَا يَمْنَعُنِي ان أُحدِثَ عن رسولِ الله صلى الله عليه وسلم ان لا اكونَ اَوعى أصحابِه عنه

ولکنی أشهدُ لَسَمِعتُه يَقولُ مَن قال عليَّ مَا لم اَقُلْ فلْيَتَبوأ مقعَدَه مِنَ النارِ.
(مسند احمد) کا اعلان کرنا حضرت علیؓ کا لان اخر من السماء احب اِلی من ان اکذب علی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلمؐ کا اظہار کرنا، روایت حدیث کے موقعہ پر ابن مسعود کی حالت غیر ہو جانا، ہر حدیث کے بعد حضرت انس بن مالک کا او کما قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کا اضافہ کرنا، زید بن ارقم کا کبرنا ونسینا والحدیث عن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم شدید کے ذریعے روایت سے بچنا، ابن عمر اور سعد بن مالک کا کوئی حدیث بیان نہ کرنا اسی احتیاط و خوف کی دلیل ہیں حتی کہ معروف راوی عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے تو سنن دارمی میں یہاں تک منقول ہے ادرکت فی هٰذا المسجد عشرین ومائة من الأنصار وما منهم من یحدث بحدیث إلا وان اخاه کفاه یعنی کوفے کی مسجد میں ایک سوبیس انصاری صحابہ کو دیکھا جن میں کوئی بھی حدیث بیان نہیں کرتا تھا؛ بلکہ ہر ایک اپنے دوسرے بھائی ہی کی روایت پر اکتفا کرتا تھا۔

احتیاط فی القبول

روایت کے ساتھ قبول حدیث میں بھی صحابہ کا معیار بہت سخت رہا، حضرت مغیرہ بن شعبہ نے عہد صدیقی میں جب روایت بیان کی، حضرت ابوبکرؓ نے هل معك غيرك کہہ کر دلیل طلب کی جو محمد بن مسلمہ کی صورت میں ملی، یہیں سے اصولِ شہادت کی بنیاد پڑی، حضرت عمرؓ راوی سے شہادت یا قسم لیتے تھے، صحیح بخاری کتاب الإستیذان باب التسلیم والاستیذان ثلثا میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا واقعہ موجود ہے، جب انہوں نے اذا سلم احد کم ثلثا فلم یجب فلیرجع والی حدیث سنائی، تو حضرت عمر نے سخت لہجے میں کہا: لتأتینی علی ذٰلك بینةً أو لافعلن بك فوراً دلیل پیش کرو ورنہ میں تمہیں سخت سزا دوں گا پھر حضرت ابوسعید خدری نے جا کر جب شہادت دی تو حضرت عمر مطمئن ہوئے، یہی حال حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے دور میں رہا پھر جب فتنوں کا آغاز ہوا اور ہر طبقے نے اپنے موقف کی تائید میں احادیث گڑھنی شروع کر دیں تو صحابہ وتابعین کا معیار سخت وبلند ہوتا گیا،

---

[1] مسند احمد ۱/۱۸

باب کے تحت آنے والی ابن عباس کی روایت اسی کی نظیر ہے بعد کے زمانوں میں قبول و روایت کی احتیاط و سختی مستقل ایک فن بن گئی ہے، اور علماء نے جرح و تعدیل کے فطری اور الہامی اصول وضع کر کے آمیزش اور ملاوٹ کی تمام راہیں مسدود کر دیں۔

احتیاط فی الفہم

تیسری چیز احتیاط فی فہم الحدیث ہے، مسند احمد اور ابن ماجہ میں اس کی بابت حضرت علی کے یہ الفاظ ملتے ہیں إذا حدثتكم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فظنوا برسول الله صلى الله عليه وسلم الذى هو أهناه و أهداه و اتقاه یعنی حدیث کا وہی مفہوم مراد لو جو صحیح و عمدہ، اور نبی کی شایانِ شان ہو، اسلاف نے اسی مفہوم کو نسلاً بعد نسل منتقل کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور حدیث کی تمام شروحات و تعلیقات اسی احتیاط فی الفہم کا نتیجہ ہیں جس کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر حدیث کا ہمارے پاس بعینہٖ وہی مفہوم و تصور موجود ہے جو صحابہ و تابعین کے ذہنوں میں تھا۔

(۲۳/۱) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ اَبِىْ شَيْبَةَ حَدَّثَنَا مُعَاذُ بْنُ مُعَاذٍ عَنِ ابْنِ عَوْنٍ حَدَّثَنَا مُسْلِمٌ الْبَطِينُ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ التَّيمِى عَنْ اَبِيه عَنْ عَمْرِو بْنِ مَيْمُوْنٍ قَالَ مَا أخْطَأنِى ابْنُ مَسْعُودٍ عَشِيَّةَ خميس إلاَّ آتيتُهُ فيهِ قَالَ فَمَا سمِعْتُه يَقُولُ (لشيء) قطُّ قَالَ رَسُولُ اللّٰه ﷺ فَلَمَّا كَانَ ذَاتَ عشِيَّةٍ قَالَ قَالَ رسُولُ اللّٰهِ ﷺ قَال فنكَس قالَ فنظرتُ إلَيهِ فَهُوَ قَائِمٌ مُحَلَّلَةً ازرارُ قَميصِهِ قد اغْرَوْرَقَتْ عَيْنَاهُ وانتَفَخَتْ اَوداجُهُ قَالَ أو دُونَ ذٰلِكَ أو فَوْقَ ذٰلك أو قرِيبًا مِنْ ذٰلكَ أَوْ شَبيهًا بِذٰلكَ .

عمرو بن میمون فرماتے ہیں کہ عبداللہ ابن مسعود نے مجھے کسی بھی جمعرات کی شام کو غائب نہیں پایا؛ مگر میں ان کے پاس پہنچ گیا، کہتے ہیں میں نے کسی بات کے ضمن میں انھیں قال رسول اللہ ﷺ کہتے ہوئے کبھی نہیں سنا، ایک شام انہوں نے کہا: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں پھر سر جھکا لیا میں نے دیکھا کہ وہ کھڑے ہیں ان کے کرتے کے بٹن کھلے ہوئے ہیں، آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں، گردن کی رگیں پھول گئی ہیں، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے اس سے کم یا کچھ زائد اس کے قریب یا اس سے ملتی جلتی کوئی بات فرمائی۔

﴿ما أخطأني ابن مسعود عشية خميس﴾ أخطأ افعال کا باب ہے معنی خطا کرنا، اصل مقصد کو چھوڑنا، یعنی ابن مسعود نے مجھ کو جمعرات کی شام کبھی غائب نہیں پایا، علامہ سندھی فرماتے ہیں اى ما فَاتَني لِقاءُهٗ یعنی مجھ سے ان کی ملاقات فوت نہیں ہوئی، حضرت ابن مسعود ہر جمعرات کی شام کو وعظ وتذکیر، وفقہی مسائل بتانے کے لئے مجلس منعقد کرتے تھے جس میں لوگ دیوانہ وار شریک ہوتے تھے، حدیث میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

﴿الاّ أتيته فيه﴾ سندھی کے فرمان کے مطابق "قد" کی تقدیر کے ساتھ یہ عام حالات سے استثناء ہے جیسا کہ سورۂ دخان میں ہے لا يذوقون فيها الموت الا الموتة الأولىٰ "فيه" کی ضمیر وقت کی تاویل کے ساتھ عشية کی طرف راجع ہے، علامہ سندھی نے لکھا ہے ومعلومٌ أنه لا يفوتُه الملاقاةُ حالَ إتيانِهٖ إياهُ فهٰذا تاكيدٌ للُزُومِ الملاقاةِ في عَشيَةِ كل خَميسٍ یعنی پہلے جملہ ہی سے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ ابن مسعود کی خدمت میں حاضری کے باعث ابن میمون کی ملاقات ان سے فوت نہیں ہوتی تھی، اب ان الفاظ کے ذریعہ ہر جمعرات کی رات کو ملاقات کے وقوع کی تاکید کی گئی ہے۔

﴿فما سمعتهٗ يقول بشئ قط الخ﴾ علامہ سندھی اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں اى في شئ او يخاطب أحدًا او يقول له میں نے کسی بھی چیز میں خواہ وہ کسی کو مخاطب کررہے ہوں یا اس سے گفتگو کررہے ہوں قال رسول اللهﷺ کے الفاظ نہیں سنے۔

﴿فلما كان ذات عشية﴾ ذات کلام کے حسن کو بڑھانے کے لئے مقحم یعنی زائد ہے، کلام عرب میں اس کی مثالیں موجود ہیں، عشية رات کے ابتدائی حصہ کو کہتے ہیں، نكس نصر کے باب سے آتا ہے، الرأس معنی سر جھکا دینا۔

﴿محللة ازرار قميصه﴾ حلل تحليل سے اسم مفعول ہوکر حال واقع ہے معنی کھولنا، ازرار، زر کی جمع ہے گھنڈی، بٹن، ازرار قميصه کو علامہ سندھی نے محللة کا نائب فاعل قرار دیا ہے۔

﴿إغر ورقت عيناه﴾ غرق سے افعيلال کا باب ہے، علامہ سندھی قاموس کے

حوالے سے لکھتے ہیں کانهما غرقتا فی دمعها یعنی آنکھوں کا آنسوں میں ڈوب جانا۔

﴿انتفخت اوداجه﴾ اوداج، وداج کی جمع ہے، اور یہ وہ رگ ہے جس پر زندگی کا مدار ہے یعنی گلے کی رگیں خوف وگریہ سے پھول گئیں، آنکھوں سے آنسو اُمڈ پڑے اور تحدیث کے خوف سے اُن کی گھگی بندھ گئی، باب کے شروع میں ہم نے جو صحابہ کے حالات لکھے ہیں ابن مسعود کے لاشعور میں بھی یہی خوف ہے جو اُن کو روایت حدیث سے روکتا ہے، ترجمۃ الباب ظاہر ہے، بوصیری نے ''زوائد'' (۱/۴۶) میں لکھا ہے، اسنادهٗ صحيح إحتج الشيخان بجميع رُوَاتِهِ .

(۲۴/۲) حَدَّثَنَا اَبُوبَكرِ بْنُ اَبِي شَيْبَةَ حَدَّثَنَا مُعَاذُ بْنُ مُعَاذٍ عَنِ ابْنِ عَوْنٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيرِينَ قَالَ كَانَ انسُ بنُ مالِكٍ اِذَا حَدَّثَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ حَدِيثًا فَفَرَغَ مِنْهُ قَالَ اَوْ كَمَا قَالَ رَسُولُ اللّٰه ﷺ .

جب انس بن مالک رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے کوئی حدیث بیان کرتے تو آخر میں ''اوکما قال رسول اللہ'' بھی کہتے تھے۔

حضرت انس ایک معمر صحابی ہیں، جنہوں نے اپنی عمر کے سو سال دنیا میں گذارے ہیں، ۹۰ یا ۹۳ھ میں ان کا بصرے میں انتقال ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص تھے، اس لئے بہت طویل صحبت ملی، کذب علی النبی کی وعید کے پیش نظر ان کا حال بھی خوف واحتیاط میں دیگر صحابہ سے مختلف نہ تھا، لیکن دوسری طرف کتمانِ علم سے بچنا بھی ضروری تھا، اس لئے انہوں نے احادیث تو بیان کیں، لیکن احتیاطاً أو کما قال الرسول کہہ دیا کرتے تھے، علامہ سندھی کے نزدیک یہ روایت بالمعنی کا اشارہ ہے، تنبیهاً علٰی ان مَاذَكَرَهٗ نَقلٌ با لمَعنى اس لئے وہ بعینہٖ الفاظِ نبوت بھی ہو سکتے ہیں، اور دوسرے الفاظ بھی۔

یہاں شارحین حدیث نے روایت بالالفاظ اور روایت بالمعنی پر بحث کی ہے، پہلی تو بالاتفاق جائز ہے، کلام دوسری میں ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء ومحدثین اسے چند شرطوں کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں، پہلی یہ کہ الفاظ منشاء نبوت کی صحیح ترجمانی کریں دوسری اس میں کچھ کمی بیشی نہ ہو، تیسری ظاہر وباطن کے لحاظ سے ترجمانی ٹھیک ہو، تفصیلی بحث اور دلائل کے

لئے شیخ عجاج الخطیب کی السنة قبل التدوین سیوطی کی تدریب الراوی اورعلامہ عثمانی کی فتح الملہم (۸۰/۱) ملاحظہ ہو۔

امام نووی نے لکھا ہے، ینبغی للراوی اذا رویٰ با لمعنی اَن یقُولَ عَقِیبَ رِوَایتِه او کما قال اِحتیاطاً وخَوفًا من تغَیُّرِ حَصَلَ[1] یعنی الفاظ وحروف کی تبدیلی کے خوف سے روایت بالمعنی میں راوی کے لئے احتیاطًا او کما قال کہنا مناسب ہے، ترجمة الباب ظاہر ہے بوصیری نے ''زوائد'' میں لکھا ہے، اسناده صحیح علی شرطِ الشیخَینِ فقَد احتجا بجَمِیع رُوَاته[2]''

(۲۵/۳) حَدَّثَنَا اَبُوبَکْر بن اَبِی شَیْبَةَ حَدَّثَنَا غُنْدَرٌ عَنْ شُعْبَةَ ح وَحَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بنُ مَهْدِیٍّ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَمْرِو بْنِ مُرَّةَ عَنْ عَبدِ الرحمٰنِ بنِ أبِی لَیلی قَالَ قُلنَا لِزَیدِ بنِ اَرْقَمَ حَدثَنَا عَن رسُولِ اللّٰه ﷺ قَالَ کَبِرنا ونَسِینَا والحَدِیثُ عَن رسُولِ اللّٰهِ ﷺ شَدِیدٌ .

ہم نے زید بن ارقم سے کہا کہ آپ ہمیں حضور ﷺ کی حدیث سنایئے، انہوں نے فرمایا: ہم بوڑھے ہوگئے اور بھول گئے اور رسول کی حدیث بیان کرنا بڑا سخت معاملہ ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ ایک معروف شخصیت ہیں، ان کے قول: قلنا لزید بن ارقم حدثنا عن رسول اللّٰه'' سے پتہ چلتا ہے کہ: یہ درخواست صحابی رسولؐ سے غالبًا انہوں نے چند دوستوں کے ساتھ کی تھی، اس زمانہ میں تابعین اور تبع تابعین کا یہی ایک مشغلہ تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ایک ایک صحابی کی تلاش میں سرگرداں رہتے اوران سے ملاقات پر فوراً حدیث سنانے کی درخواست کرتے۔

﴿کبرنا ونَسِینا﴾ علامہ سندھی نے با کو مکسور پڑھا ہے: ''ای بلغنا حد الشیخوخة'' قرآن کی زبان میں ارذل العمر کا فطری نتیجہ ''لکیلا یعلم بعد علم شیئًا'' کی صورت میں نکلتا ہے، زید ابن ارقم نے نسیان سے اسی کو مرادلیا ہے، جو ہمارے

---

[1] شرح مسلم، ۱۰۷/۱ [2] مصبا الزجاجة فی زوائد ابن ماجہ، ۱۳۶/۱

نزدیک واقعہ نہیں بلکہ حضرت کی تواضع اور احتیاط ہے ورنہ صحابہ سے اچھے حافظہ رکھنے والی قوم دنیا میں کبھی پیدا نہیں ہوئی پھر رسول ان کے محبوب تھے جن کے دین کی اشاعت کے لئے انہوں نے تمام قربانیاں دیں پھر وہ اسے کیوں بھولنے لگے۔

﴿والحدیث عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم شدید﴾ اس سے احتیاط وخوف کا مضمون مزید اجاگر ہوتا ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث روایت کرنا دنیا کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے، جس کی ادائیگی اسی وقت مناسب ہے، جب تک قویٰ میں اضمحلال نہ آئے ترجمہ الباب ظاہر ہے، اور سند کی بابت بوصیری نے ''زوائد ابن ماجہ'' (۱/ ۴۷) میں لکھا، ''اسنادہ صحیح رجالہ کلھم ثقات محتج بھم فی الکتب الستة''

(۲۶/۴) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ نُمَيْرٍ حَدَّثَنَا اَبُو النَّضْرِ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِي السَّفَرِ قَالَ سَمِعْتُ الشَّعْبِيَّ يَقُوْلُ جَالَسْتُ ابْنَ عُمَرَ سَنَةً فَمَا سَمِعْتُهُ يُحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ شَيْئًا .

میں ایک سال تک ابن عمر کے پاس بیٹھا لیکن میں نے ان سے حضور ﷺ کی حدیث نہیں سنی۔

عبداللہ بن مسعود، انس ابن مالک اور زید بن ارقم کے بعد احتیاط وتقلیل روایت کی چوتھی نظیر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ہے، جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ: علم نبوت کیا سب کا سب ان کے سینوں میں چھپا رہ گیا؟ حالانکہ انہیں تو ''بلغوا عنی ولو بآیة'' اور ''الا فلیبلغ الشاھد الغائب'' کا حکم تھا، جواب یہ ہے کہ: صحابہ کرامؓ کا محبوب مشغلہ دن رات نبوی علوم کی اشاعت تھا، جس میں انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی، لیکن احتیاط کے پیش نظر وہ ان چیزوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کرتے تھے، مبادا بھول چوک میں کذب سرزد ہوجائے، اسی لئے حضرات محدثین نے ان کی غیر مدرک بالقیاس چیزوں کو حدیث مرفوع کا درجہ دیا ہے۔

﴿جالست ابن عمر سنة﴾ صحیح بخاری کتاب اخبار الآحاد باب خبر المرأة الواحدة'' میں اور صحیح مسلم ''کتاب الصید باب اباحة الضب ''میں یہ الفاظ: ''قاعدتُ عُمرَ قریبًا من سَنتَینِ اوسَنةٍ ونصفٍ'' منقول ہیں، جس سے مدت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

ﷺ "فما سمعته يحدث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم شيئاً" ﷺ ابن ماجہ میں روایت مختصر ہے، جب کہ صحیحین میں شعبی کے الفاظ یہ ہیں: "فلم اسمعه روى عن النبي صلى الله عليه وسلم غير هذا" یعنی اس مدت میں انہوں نے صرف ایک حدیث سنی اور وہ یہ تھی: "قال كان ناس من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم فيهم سعد فذهبوا يا كلون من لحم فنادتهم امرأة من بعض ازواج النبي صلى الله عليه وسلم انه لحم ضب فامسكوا فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم كلوا واطعموا فانه حلال اوقال لاباس به. شك فيه. ولكنه ليس من طعامي" مولانا لطیف الرحمٰن خاں بہرائچی نے الدیباجہ علی ابن ماجہ (۱/۱۶۷) میں حدیث کی بابت اسنادہ صحیح کا فیصلہ کیا ہے۔

(۵/۲۷) حَدَّثَنَا الْعَبَّاسُ بْنُ عَبْدِ الْعَظِيمِ الْعَنْبَرِيُّ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ اَنبَانَا مَعْمَرٌ عَنِ ابْنِ طَاوُسٍ عَنْ اَبِيهِ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ يَقُولُ اِنَّمَا كُنَّا نَحْفَظُ الْحَدِيثَ وَالْحَدِيثُ يُحْفَظُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَاَمَّا اِذَا رَكِبْتُمُ الصَّعْبَ وَالذَّلُولَ فَهَيْهَاتَ .

ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ہم حدیث یاد کرتے تھے، اور وہ حدیث رسول اللہ ﷺ کی یاد کی جاتی تھیں اب جب تم سرکش اور سدھائی ہوئی سواری پر سوار ہونے لگے تو دوری مناسب ہے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت تک احادیث کا ذخیرہ بالکل صاف اور محفوظ تھا اور جھوٹ کی اس میں ادنی آمیزش نہ تھی لیکن جب روافض، نواصب اور کرامیہ وغیرہ نے اپنی اپنی تائید میں حدیثیں وضع کیں تو کچھ قصہ گو صوفی بھی ترغیب وترہیب کے باب میں اسی سے کام چلانے لگے، یہ خیر امت ہے، اور اس دین کی حفاظت کا وعدہ خود رب العالمین نے کیا ہے، اس لئے صحابہ نے عارضی طور پر عمومی روایت حدیث کو موقوف کر کے ایک طرف معروف ومستند احادیث کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور دوسری سمت اہل علم وفضل نے منکرات وموضوعات کی پکڑ دھکڑ شروع کی، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے تدوین حدیث میں لکھا ہے کہ: روایت باب اس زمانہ کی ہے، جب کہ ابن عباس حضرت علی کی طرف سے بصرہ کے حاکم ووالی تھے،

اور تحدیث کی بابت اس وقت صحابہ کی یہی حکمت عملی تھی۔

﴿انا کنّا نحفظ الحدیث﴾ ابن عباس نے یہاں جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے، جس کا اطلاق ان کی ذات کے ساتھ دیگر صحابہ پر بھی ہوتا ہے نتیجہ یہ نکلا کہ احادیث کو یاد کرنا عہد رسالت ہی سے صحابہؓ کا معمول تھا اور آپ کی ہر گفتگو کو وہ بہت توجہ اور سنجیدگی سے لیتے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ حضرت انسؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ کی احادیث اس کا ثبوت ہیں، حفظ حدیث کا یہ جذبہ ہی انہیں لکھنے پر آمادہ کرتا تھا، تاکہ علم نبوی زیادہ سے زیادہ محفوظ ہو جائے، حضرت ابوبکر، حضرت علی، عبداللہ بن مسعود، سعد بن عبادہ، ابو رافع، محمد بن مسلمہ، سمرہ بن جندب، عبد اللہ بن عمرو اور حضرت جابر بن عبداللہ کے صحیفے اس کا نتیجہ ہیں، ابن عباس کا مقصد سندھی نے "ای ناخذہ عن الناس ونحفظ اعتمادًا علی صدقھم" بتلایا ہے[۱]۔ یعنی ہم لوگوں سے حدیث لیتے تھے اور ان پر اعتماد کر کے یاد کرتے تھے۔

﴿والحدیث یحفظ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم﴾ سندھی نے اس کے معنی ای ھو حقیق بان یعتنیٰ بہ لکھے ہیں، یعنی حدیث رسول واقعۃً یاد کرنے ہی کے قابل ہیں، اس لئے قرآن کے بعد امت میں جس چیز کو سب سے زیادہ حفظ کرنے کا اہتمام رہا وہ حدیثِ رسول ہے، محدثین نے قریہ قریہ چھان کر جو صحاح، جوامع، سنن، مسانید، معاجم اور مستدرکات کے امت کو مجموعے دیئے ہیں، ان کا مقصد بھی یہی تھا، اسی غرض کے لئے اسماء رجال کا فن وجود میں آیا اور قرن اول سے آج تک ان کے درس وتدریس کے معمول میں بھی یہی آرزو کار فرما ہے، کہ امت حفظ حدیث کا آخر آخر تک اہتمام رکھے اور یہ دولت کسی لمحہ ان سے ضائع نہ ہو، ابن عباس نے اسی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے یہ الفاظ کہے ہیں۔

﴿"فاما اذا رکبتم الصعب والذلول"﴾ اما حرف تفسیر شرطیہ اور جملہ فعلیہ مل کر شرط ہوا، امام نوی نے لکھا ہے: "اصلُ الصَّعبِ والذلولِ فی الابل یعنی اصالۃ تو صعب" اور ذلول اونٹ کو کہتے ہیں: "فالصعب العُسر المرغوبُ عنہ والذَلولُ السھلُ الطَیبُ المحبوبُ المرغوبُ فیہ[۲]"

یعنی پہلے کا مطلب ایسی سرکش اونٹنی ہے جسے سوار پسند نہ کرتا ہو اور دوسرے کے معنی عمدہ

سدھی ہوئی سواری ہے جسے ہر کوئی پسند کرتا ہے، آگے نوی نے لکھا ہے: "**فالمعنیٰ سلك الناس كل مسلك من مايُحمد ويُذم**" اب مطلب یہ ہوا کہ: لوگ اچھے برے ہر راستہ پر چل پڑے اور ان میں احتیاط بالکل نہ رہی علامہ سندھی نے اس مفہوم کو مزید واضح کیا ہے فرماتے ہیں: "**كنايةٌ عن الإفراطِ والتفريطِ في النقلِ بحيثُ مَابقي الاعتمادُ على نَقلِهم**" یعنی ان الفاظ کے ذریعہ ابن عباس نے تحدیث میں افراط وتفریط کی طرف اشارہ کیا ہے کہ: لوگ غلط سلط ہر روایت کو بیان کرنے لگے، منکر وموضوع سے اجتناب نہ رہا تو صحیح ومستند کے التباس کے باعث ان کی روایت سے ہمارا اعتماد اٹھ گیا، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے بھی فتح الملہم (۱/ ۱۲۸) میں سندھی کے الفاظ کو تفصیل سے بیان کیا ہے، صحابی رسول کے عمل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ: عمومی روایت حدیث درست نہیں محدثین کا صرف اہل لوگوں کو ہی اس کی اجازت دینا بھی یہی بتلاتا ہے ورنہ صحیح احادیث کی اسناد ومتون میں الٹ پھیر کے ساتھ منکرات وموضوعات کے بھی انتشار کا شدید خطرہ ہے اور آج کے دور میں تو مزید سختی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

هيهات کی تحقیق

﴿**فهيهات**﴾ ہیہات کی تحقیق مذکورہ جملہ کی جزاء ہے ابوالحسن واحدی سے منقول ہے:

"**اسمٌ سُمِّيَ به الفعلُ وهو بُعدٌ في الخبرِ لا في الأمر**"

ابوعلی فارسی کے نزدیک یہ فعل کے قائم مقام ہوکر "**بَعُدَ**" کے معنی میں ہے، فراء صفت مان کر اسے "**بعد**" کا مترادف قرار دیتے ہیں اور "**زجاج وابن الآنباری**" نے مصدر قرار دے کر اسے **بُعْد** کے معنی میں لیا ہے، واحدی نے اس میں تیرہ لغتیں لکھیں ہیں، امام نوی نے لکھا ہے: "**موضوعةٌ لا ستبعاد الشيء واليأس منه**" یعنی کسی سے مایوس ہوکر اس سے بچنے کے لئے وضع کیا گیا ہے، ان کے الفاظ میں معنی یہ ہوئے "**بَعُدت استقامتُكم اوبَعُدَ اَن نَثِقَ بِحَدِيْثِكُم**" تمہاری راست بازی ختم ہوگئی، یا تمہاری حدیث پر اعتماد کرنا ہمارے لئے بعید بات ہے، علامہ سندھی فرماتے ہیں: "**فبعيد أن نروي لهم**" ان سے حدیث رسول بیان کرنا ہمارے لئے بعید ہے، کیونکہ نقل میں بے احتیاطی کی وجہ سے وہ وضع حدیث کی

راہ ہموار کریں گے۔

ان الفاظ سے ایسا لگتا ہے جیسے: انہوں نے اخذِ روایت کو بالکل موقوف کر دیا ہو، لیکن صحیح مسلم کی حدیث میں "لم ناخذ من الناس الا مَانَعرِفُ " کا بھی اضافہ ہے، جس سے مستند روایات کو قبول کرنے کا استثناء سمجھ میں آتا ہے، لیکن وہ بھی ہر ایک کی نہیں چنانچہ مسلم میں بشیر بن کعب عدوی کا واقعہ موجود ہے کہ: انہوں نے آکر جب ابن عباس کو حدیث سنائی تو حضرت ان کی طرف متوجہ ہوئے نہ نظر اٹھا کر دیکھا وہ بولے: "یا ابن عباس مالی لأراك تسمع لحدیثی احدثك عن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ولا تسمع تو آپ نے انہیں یہ جواب دیا انا کنا مرة اذا سمعنا رجلا یقول قال رسول اللّٰه صل اللّٰه علیه وسلم ابتدرته أبصارنا وأصغینا الیه باذاننا فلما رکب الناس الصَّعْبَ والذلول لم ناخذ من الناس الا ما نعرف" یعنی ہم تو ہمہ تن گوش ہو کر ہی سنتے تھے لیکن جب تم الٹی سیدھی باتیں بیان کرنے لگے تو اب ہم صرف معروف و مستند شخص ہی کی روایت لیتے ہیں۔

ترجمہ الباب کے مطابق ابن عباس کے عمل سے توقی فی نقل الحدیث واخذہ کا ثبوت ملتا ہے، حدیث کی سند صحیح ہے، اور پہلے راوی کو چھوڑ کر وہ بعینہٖ مسلم کی ہے۔

(۲۸/۶) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عَبْدَةَ حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ مُجَالِدٍ عَنِ الشَّعْبِي عَنْ قَرَظَةَ بْنِ كَعْبٍ قَالَ بَعَثَنَا عُمَرُ بْنُ الخَطَّابِ اِلَى الْكُوْفَةِ وَشَيَّعَنَا فَمَشَى مَعَنَا اِلَى مَوْضِعٍ يُقَالُ لَهُ صِرَارٌ فَقَالَ اَتَدْرُوْنَ لِمَ مَشَيْتُ مَعَكُمْ قَالَ قُلْنَا لِحَقِّ صُحبَةِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَلِحَقِّ الاَنْصَارِ قَالَ لٰكِنِّي مَشَيْتُ مَعَكُمْ لِحَدِيْثٍ أَرَدْتُ اَنْ اُحَدِّثَكُمْ بِهِ وَاَرَدْتُ اَنْ تَحْفَظُوهُ لِمَمْشَايَ مَعَكُمْ اِنَّكُمْ تَقْدَمُوْنَ عَلٰى قَوْمٍ لِلقُرآنِ فِي صُدُوْرِهِمْ هَزِيْزٌ كَهَزِيْزِ الْمِرْجَلِ فَاِذَا رَأَوْكُم مَدُّوْا اِلَيْكُم اَعْنَاقَهُمْ وَقَالُوْا اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ فَاَقِلُّوا الرِّوَايَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَاَنَا شَرِيْكُكُمْ.

قرظہ بن کعب نے بیان کیا کہ: ہم کو عمر بن خطاب نے کوفہ بھیجا اور ہماری مشایعت کرتے ہوئے اس جگہ تک ہمارے ساتھ چلے جس کو صرار کہا جاتا ہے، پھر فرمایا جانتے ہو میں کیوں

تمہارے ساتھ آیا ہوں؟ ہم نے عرض کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور انصار کے حق کی وجہ سے؟ انہوں نے کہا (ہاں) لیکن میں تمہارے ساتھ ایک اہم بات کی وجہ سے آیا ہوں، جس کو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں، میری خواہش ہے کہ: تم اپنے ساتھ میرے (یہاں تک) آنے کیوجہ سے اس کو یاد رکھو گے، (تو سنو) تم ایسے لوگوں کے پاس پہنچو گے، جن کے دلوں میں قرآن کے تئیں کھولتی، ہانڈی کا ساجوش ہے، جب وہ تمہیں دیکھیں گے، تمہاری طرف اپنی گردنیں بڑھائیں گے اور کہیں گے محمد کے صحابہؓ!! تو (اس وقت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کم بیان کرنا، پھر میں تمہارا شریک ہوں گا۔

عہد فاروقی میں جب فتوحات کی کثرت ہوئی اور دیگر قومیں ایک سیلاب کی طرح اسلام میں داخل ہوئیں، تو ان کی تعلیم و تربیت کے لئے ہر جگہ اہل علم وفضل کی ضرورت پڑی، حضرت عمر نے اسی مقصد کے لئے صحابہ کو مختلف شہروں میں بسایا ''قرظہ بن کعب'' اور دوسرے انصاری صحابہؓ کا کوفہ کا سفر اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

﴿شیعنا﴾ باب تفعیل سے ہے، رخصت کرنے کے لئے کچھ دور ساتھ چلنا، نبی کی سنت کے مطابق مقام ''صرار'' تک ان لوگوں کی مشایعت کی، علامہ سندھی نے قاموس کے حوالے سے لکھا ہے، کہ یہ مدینہ کے قریب ایک جگہ ہے، ابن عبد البر قرطبی نے ''جامع بیان العلم وفضله'' میں اپنی سند سے یہی روایت نقل کی ہے، اس میں حضرت عمرؓ کی بابت ''صرار'' پہنچ کر ''فَتَوَضَأَ فَصَلّٰی اِثْنَتَیْنِ'' بھی منقول ہے۔

﴿لحق صحبة رسول الله ﷺ ولحق الانصار﴾ قرطبی کی بیان العلم میں ''نحن اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم مشيت معنا'' کے الفاظ ہیں۔

﴿لكنى مشيت معكم لحديث﴾ شہر کی پرہجوم زندگی میں یکسوئی مشکل ہوتی ہے، پھر الوداعی لمحات میں اصل مقصد کو یاد دلا کر ضروری ہدایات بھی لازمی ہیں، حضرت عمر اسی کے پیش نظر انہیں کچھ دور تک چھوڑنے آئے ظاہر ہے اب مخاطب کی توجہ بھی زیادہ ہوگی اور نصیحت کو اہمیت کے ساتھ وہ یاد بھی رکھے گا:

﴿أن تحفظوه لممشاى معكم﴾ میں انہیں چیزوں کی طرف اشارہ ہے: (''انکم

تقدمون علی قوم“) قرطبی نے ”انکم تأتون أهل قرية“ کا جملہ نقل کیا ہے جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ آئندہ آنے والی نصیحت قوم کے مخصوص حالات کے پیش نظر ایک استثنائی حکم ہے، عمومی دعوت نہیں۔

﴿للقرآن فی صدورهم هزيز كهزيز المرجل﴾ قرطبی نے ”لهم دوی بالقرآن کدوی النحل“ کی عبارت نقل کی ہے جو مترادف تعبیر ہے، مرجل ہانڈی کو کہتے ہیں، علامہ سندھی نے لکھا ہے: ”وله صوت عند غليان الماء فيه.......... والمراد لهم الاقبال علی قرأة القرآن“ یعنی هزيز کے معنی ہانڈی میں کھولنے کی آواز کے ہیں اور اس سے مراد قرآن کے تئیں ان لوگوں کا شوق وولولہ ہے، شیخ محمد علوی مفتاح الحاجہ میں لکھتے ہیں: ”ای فی صدورهم من الخشوع والخضوع والحرص والاشتياق“ ان کے سینہ میں کتاب اللہ سے تعلق کے باعث خشوع وخضوع اور طلب واشتیاق پیدا ہو گیا ہے، جو بذات خود مقصود ہے۔

﴿مدّو اليكم أعناقهم﴾ علامہ سندھی لکھتے ہیں ”ای للأخذِ عَنكُم وتَسلِيمًا للأمرِ اِلَيكُم وتَحكِيمًا لكُم“ یعنی حدیث سننے کے لئے وہ تمہارے سامنے بالکل خود سپردگی کا مظاہرہ کریں گے، کیونکہ وہ نو مسلم ہیں، انہوں نے نبی کی زیارت نہیں کی ہے اس لئے صحابیت کی نسبت کو سنتے ہی وہ تمہاری طرف لپک پڑیں گے اور تم سے نبوی اقوال وافعال کی بابت پوچھیں گے، ابھی ان کا قرآنی شعور پختہ نہیں، اس لئے کوئی اور بات کرنا ان سے مناسب نہیں تا آنکہ انہیں کتاب اللہ سے مناسبت اور مکمل واقفیت ہو جائے:

﴿فاقلوا الرّواية﴾ قرطبی نے اس سے پہلے ”فَلَا تَصُدوهُم بالأحَاديثِ فَتَشغَلُوهُم، جَوّدُوا القُرآنَ“ بھی نقل کیا ہے، جب کہ بیہقی میں اقلوا کے بجائے: ”صححو الرواية“ کے الفاظ موجود ہیں، ابن ماجہ میں روایت یہیں ختم ہو جاتی ہے، لیکن قرطبی کی ”بیان العلم“ میں صراحت ہے کہ: حضرت قرظہ کے عراق پہنچنے کے بعد حسب توقع لوگوں نے ”حدثنا“ کہہ کر جب ان سے حدیث کی فرمائش کی تو انہوں نے جواب دیا ”نهانا عمر بن الخطاب“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد

شارحین حدیث کے نزدیک حضرت عمر کا موقف یہاں تفصیل طلب ہے، منکرین حدیث نے اس کی بنیاد پر انہیں اپنا ہمنوا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جو بداہتہً غلط ہے، کیونکہ اس صورت میں روایت پر پابندی لگانی ضروری تھی، تقلیل تو بہرحال انکار حدیث کے خلاف جاتی ہے اور اس سے حجیت حدیث ہی کا ثبوت نکلتا ہے، ہمارے نزدیک حضرت عمر کے پیش نظر یہاں تین مقصد ہیں پہلا یہ کہ وہ لوگ نومسلم ہیں اور اس وقت ان کی بھرپور توجہ قرآن کریم کی طرف ہے جو بیحد خوش آئند بات ہے، ایسی صورت میں بوقت ضرورت کچھ احادیث ضمناً تو ذکر کی جاسکتی ہیں، لیکن وہ اتنی زیادہ نہ ہوں کہ کتاب اللہ سے ان کی توجہ ہٹ جائے، عہد رسالت میں بھی ابتداء اسی لئے احادیث کو لکھنے کی ممانعت تھی، تا آنکہ انہیں ایک حد تک کتاب اللہ کی معرفت حاصل ہوجائے: "جو دوا القرآن" کا یہی مطلب ہے، دوسرا یہ کہ اس قوم کو عہد رسالت کا زمانہ نہیں ملا ہے، اسلامی نظام حیات کو وہ پوری طرح نہیں سمجھتی عقائد وعبادت سے کما حقہ آشنا نہیں اور شرعی اصول ومبادی سیکھنے کے لئے بھی ابھی کچھ وقت درکار ہے، اس صورت میں احادیث کی کثرت اسے ہضم نہ ہوگی اور مفہوم کو غلط سمجھ کر اس کے فتنہ میں بھی مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، اس لئے فی الحال قرآن کے ساتھ انہیں روایت کی بہت تھوڑی غذا دینا سندھی کے الفاظ میں: "لئلا یشتغلوا بذلك عن العظة"[1] تاکہ ان کی وجہ سے وہ نصیحت سے غافل نہ ہوں پھر "صَحِّحُوا الروایةَ" سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہ محکم اور واضح ہوں۔

تیسرا مقصد یہ ہے کہ تکثیر روایت اکثر وبیشتر لغزش کا سبب بنتی ہے اور پھر احتیاط کا دامن ہاتھ سے جاتا رہتا ہے، علامہ سندھی لکھتے ہیں: "ای لاتکثِرُوا فی الروایة نظرًا الی کثرةِ طَلبِهِم وَتشوقهم فی الاخذ عنکم تعظیمًا لأمرا لروایة عنه صلی الله علیه وسلم" تم روایت میں ان کے اشتیاق اور کثرتِ طلب کو دیکھ کر احادیث زیادہ بیان کرنے مت لگنا، کیونکہ حدیث رسول کا معاملہ بڑا نازک ہے، امام ابن ماجہ بھی ترجمۃ الباب کے تحت یہی تأثر دینا چاہتے ہیں۔

---

[1] مسند احمد ۱/۱۸

﴿ثم أنا شریککم﴾ علامہ سندھی نے کہا ہے: "أی فی الاجر بسبب أنه الدالُّ الباعثُ لهم الخیرَ" یہاں اجر وثواب میں شرکت مراد ہے، کیونکہ ان کو خیر کی ترغیب دینے کا سبب تو حضرت عمرؓ ہی بنے ہیں، دکتور محمد عجاج الخطیب نے اپنی معروف کتاب "السنة قبل التدوین" (۹۷) میں سندھی کے قول کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے: "ذٰلك لأن المقام لایحتمله" یہ موقعہ ایسے معنی کا احتمال نہیں رکھتا، ان کے نزدیک صحیح مفہوم یہ ہے: "انا شریککم فی الاقلال ای انصحکم فی ذٰلك واعمل بنصیحتی" احتیاط کے ساتھ کم روایات بیان کرنے میں میں بھی تمہارا شریک ہوں، اسی کی تمہیں تاکید کرتا ہوں، اور اپنی نصیحت پر خود بھی عمل کرتا ہوں ہمارے نزدیک بھی یہی قول راجح ہے..... حدیث سنن دارمی (۱/۸۵) سنن بیہقی (۱/۱۲) اور مستدرک حاکم وغیرہ میں بھی آئی ہے، بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے: " هٰذا اسناد فیه مقال من اجل مجالد" حافظ نے تقریب میں (۶۴۷۸) مجالد کو لیس بالقوی وقد تغیر فی اخر عمره قرار دیا ہے، اس لئے الدیباچہ میں: "اسنادهٔ حسن لغیره" کا فیصلہ کیا ہے۔

(۲۹/۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَیْدٍ عَنْ یَحْیَی بْنِ سَعِیدٍ عَنِ السَّائِبِ بْنِ یَزِیْدَ قَالَ صَحِبْتُ سَعْدَ بْنَ مَالِكٍ مِنَ الْمَدِیْنَةِ اِلٰی مَکَّةَ فَمَا سَمِعْتُهُ یُحَدِّثُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ بِحَدِیْثٍ وَاحِدٍ.

سائب بن یزید کہتے ہیں میں نے مدینہ سے مکہ تک سفر میں سعید کی رفاقت کی لیکن ان کو حضور کی ایک حدیث بیان کرتے ہوئے بھی نہیں سنا۔

علامہ سندھی نے سنن مصطفیٰ میں لکھا ہے۔

"ولعلهم کانوا یُحدثون عند شدة الحاجةِ، ورغبةِ الطالِب والأحادیثُ المشهورةُ عنهم رَووها علی هذا الوجهِ والا کیف اشهر هؤلاء هذه الاحادیث ولعلهم حملوا حدیث لِیبلِّغ الشاهدُ الغائبَ التبلیغَ عِندَ الحاجةِ اوأنهم تَرکُوا الروایةَ بَعد ان بَلَّغوا ای بعضَ الغَائِبینَ ما کان عندهم من الحدیث ورأوا اَن هٰذا کافٍ فی اِمتثالِ الأمرِ وَحَمَلُوا ذلك علی الوُجوبِ علی الکِفایةِ فإذَا قام به

البعضُ کأبی ھُرَیْرَۃَ سَقَطَ الطلبُ عن الباقین و اللّٰہ اعلمُ بالصواب"

سعد بن ابی وقاص کا موقف

غالبًا حضرات صحابہ ﷺ اسی وقت حدیث بیان کرتے تھے، جب طالبین کے اندر سچی طلب ہوتی اور ضرورت بھی اس کا تقاضا کرتی، ان سے مروی معروف احادیث کی یہی توجیہ ہے، ورنہ ان احادیث کی انہوں نے کیسے اشاعت کردی ایسا لگتا ہے کہ: لیبلغ الشاھد الغائب کی حدیث کو ضرورت کے وقت تبلیغ پر محمول کیا ہے، یا دوسری تاویل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اپنی تمام تر حدیث کی تبلیغ کے بعد انہوں نے روایت کرنا چھوڑ دیا، اور مذکورہ حکم کی اطاعت کے لئے اسی کو کافی سمجھا، تو ان کے نزدیک یہ چیز فرض کفایہ ہوئی کہ: جب حضرت ابو ہریرہؓ جیسے کچھ حضرات اس فریضہ کو انجام دیں تو دوسروں سے روایت کا مطالبہ ساقط ہو جائے گا۔ واللہ اعلم

حدیث کی روایت میں احتیاط کے یہ اس شخص کے حالات ہیں، جس کو حضرت عمر جیسے تقلیل وتثبت کے داعی نے یہ کہہ کر اعتماد کی سند عطا کی ہے کہ: جب سعدؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کریں تو پھر تحقیق کی ضروت نہیں تفصیلی حالات فضائل صحابہ کے باب میں درج ہیں، علامہ دمیری نے لکھا ہے: "انفرد بہ المصنف" حدیث صرف ابن ماجہ میں آئی ہے، سند کی بابت بوصیری نے زوائد (۱/ ۴۷) میں "ھذا اسنادٌ صحیح موقوف" کا فیصلہ کیا ہے، ترجمۃ الباب ظاہر ہے۔

باب التغلیظ فی تعمد الکذب علی رسول اللّٰہ ﷺ

"باب التوقی فی الحدیث" کے بعد امام نے: "باب التغلیظ فی تعمد الکذب علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم" قائم کر کے روایت میں حزم واحتیاط کو مؤکد کیا ہے، گذشتہ باب میں ہر قدم پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ: برسہا برس کی معیت کے باوجود صحابہ تقلیل واحتیاط کے خوگر کیوں ہیں؟ اس میں اسی کا جواب دیا گیا ہے، تو گویا وہ مقدمہ تھا، یہ باب تفصیل ہے، جس کی تمام تر احادیث میں ایک ہی جرم کو مختلف حوالوں سے اتنی بار مذموم قرار دیا گیا کہ: رسول اللہ ﷺ کی طرف جانتے بوجھتے جھوٹ منسوب کرنے کی قباحت

ونفرت شدید طور پر سامنے آئی اور کذابین کی بابت حکم سخت سے سخت تر ہوتا گیا، یہاں محدثین نے بڑی قیمتی بحثیں کی ہیں، ہم اختصار کے ساتھ ذیل میں چند اہم مباحث کو پیش کریں گے۔

کذب کی تعریف

پہلی کذب کی تعریف سے متعلق ہے، امام نووی نے اہل سنت والجماعت کے حوالے سے اس کی تعریف ''الإخبارُ عنِ الشيءِ علی خِلافِ مَا هُو عَمَدًا کانَ اَو سَهوًا''نقل کی ہے، یعنی کسی چیز کے بارے میں واقعے کے خلاف خبر دینا خواہ جان کر ہو یا بھول کر جب کہ معتزلہ کا مذہب ''شرطه الحمدية'' منقول ہے، گویا خلاف واقعہ ہونے کی صورت میں بھی اسی وقت کذب کا اطلاق ہوگا، جب کہ مخبر نے عمداً ایسا کیا ہو سہو کی صورت میں وہ جھوٹ نہیں ہے، علم وعقل کی روشنی میں اس رائے کو تسلیم کرنا ممکن نہیں، خود باب کی احادیث میں تعمد کی شرط بھی یہ بتلاتی ہے کہ: سہواً بھی جھوٹ کا صدور ہوتا ہے، گرچہ گناہ نہ ہو۔

کذب کی حرمت

دوسری کا موضوع کذب کی حرمت ہے، جس کے ثبوت میں بے شمار آیات واحادیث پیش کی جاسکتی ہیں، جب عمومی حالات میں حکم اتنا سخت ہے، تو یہ چیز نبی کے سلسلہ میں کتنی شدید تر ہوجائے گی، امام نووی نے لکھا ہے: ''انه فاحشة عظيمة وموبقة كبيرة[1]'' یہ ایسا بدترین گناہ ہے، جو تمام نیکیوں کو ضائع کر دیتا ہے، حتی کہ شیخ محمد جوینی، ناصر الدین، ابن المنیر، زین الدین ابن المنیر، ابن معین اور ابن عتیبہ جیسے بلند مقام علماء نے ''كاذب على النبى'' کو کافر اور مباح الدم تک قرار دیا ہے، لیکن امام نووی نے جمہور کے حوالے سے اس حکم کے لئے یہ شرط لگائی کہ: وہ حلال سمجھ کر حدیث وضع کرے: ''ولكن لا يُكفَّرُ بهذا الكِذبِ الا ان يستَحِلَّه[2]'' چنانچہ وضع کو اکبر الکبائر قرار دے کر عبد الکریم بن ابی العوجاء اور محمد بن مصلوب جیسے: ''کذابون'' کو امت نے سولی تک دی ہے، بہر حال یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ: اگر کسی نے ایک حدیث میں بھی جان بوجھ کر جھوٹ کا ارتکاب کیا تو اسے فاسق قرار دے کر تمام

[1-2] مسلم ۱/۸

روایات ٹھکرا دی جائیں گی اور ان میں کسی سے بھی استدلال جائز نہ ہوگا، امام نووی لکھتے ہیں:
"مَنْ كَذَبَ عليه صلى الله عليه وسلم عمدًا فی حدیثٍ واحدٍ فُسِّقَ ورُدَّتْ رِوَايَاتُه كُلُّها وبَطَلَ الاحتجاجُ بجَمِيعِها[1]"

واضع حدیث کی توبہ

یہاں تیسرا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ: "متعمد واضع حدیث" اگر سچی پکی توبہ کرے، تو کیا اس کی روایت کو دوبارہ قبول کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا اس کی نقل پر پھر اعتماد کرنا درست ہوگا؟ امام احمد بن حنبل، ابوبکر حمیدی، اور ابوبکر صیرفی جیسے بلند پایہ علماء کی ایک جماعت نفی میں جواب دے کر اسے دائمی متروک قرار دیتی ہے اور متقدمین کا یہی مسلک ہے: "لاتوثر توبته فی ذلك ولاتقبل روايتهٔ ابدًا بل يحتم جرحه دائمًا[2]" لیکن امام نووی نے اس رائے کو شرعی اصولوں کے خلاف بتلاتے ہوئے لکھا ہے، کہ: ایمان لانے کے بعد کافر کی روایت وشہادت سب کے نزدیک معتبر ہے، تو پھر ایک مسلمان کے تائب ہونے کے بعد اس کی روایت کیونکر مقبول نہ ہوگی، جب کہ شہادت اور روایت میں کوئی فرق نہیں ہے اور تائب مسلمان اعتبار وقبول کا زیادہ نہیں تو برابر کا مستحق ضرور ہے، پھر نووی نے فیصلہ کیا: "والمختار القطع بصحة توبته فی هذا وقبول رواياته بعدها اذا صحت توبته بشروطها المعروفة وهی الاقلاع عن المعصية والندم علی فعلها والعزم علی ان لا يعود اليها فهذا هو الجاری علی القواعد الشرعية[3]" نووی کی یہ رائے ذہن کو اپیل کرتی ہے، اس لئے بعد میں وہ علمی حلقوں کی عام رائے بن گئی اور علماء نے اسے کافی اہمیت دی، لیکن محدثین کی ایک جماعت اسے مرجوح جان کر اب بھی متقدمین اسلاف ہی کے موقف کو راجح قرار دیتی ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ مقدمۂ مشکوٰۃ المصابیح میں لکھتے ہیں: "ومن ثبت عنه تعمد الكذب فی الحديث وان كان فی العمر مرة وان تاب من ذلك لم يقبل حديثه أبدًا بخلاف شاهد الزور اذا تاب" کذب علی النبی اور کذب علی غیرہ کا عظیم فرق' سب کو تسلیم ہے، شہادت کا تعلق حقوق سے ہے اور اس پر حاکم کا فیصلہ بھی موقوف ہے، اس لئے توبہ کے بعد

---

[1] مسلم ۸/۱ [2] ایضاً [3] ایضاً

قائم بالزور کی گواہی کو قبول کرنا سمجھ میں آتا ہے، لیکن جس شخص نے اتنی بڑی جرأت کر ڈالی ہو، جس کی سزا مسند احمد بن حنبل کی روایت میں خود رسول ﷺ نے قتل تجویز کی ہو اور شاہد زور سے کہیں زیادہ سخت الفاظ میں اس کو اخروی عذاب سے ڈرایا گیا ہو، اس کی روایت کو دوبارہ قبول کرنے کا مطلب کذب علی النبی اور کذب علی غیرہ میں کوئی فرق نہ کرنا ہے، حالانکہ نصوص اور قواعد شرعیہ شہادت سے زیادہ روایت میں سختی کا مطالبہ کرتے ہیں اسی لئے اسماء رجال کے فن کی تدوین ہوئی ہے اس لئے دل لگتی بات متقدمین ہی کی محسوس ہوتی ہے۔

وضع فی الترغیب

چوتھی بحث یہاں وضع فی الترغیب والترھیب سے متعلق ہے، امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ شریعت کے کسی بھی باب میں خواہ وہ احکامی ہو یا ترغیب وترہیب اور وعظ وارشاد سے تعلق رکھتا ہو: "کذب علی النبی" حرام، اکبر الکبائر اور بدترین جرم ہے، جس کی کسی صورت میں اجازت نہیں امام نووی نے لکھا ہے: "لافرق فی تحریم الکذب علیه صلی الله علیه وسلم بین ماکان فی الاحکام وما لاحکم فیه کالترغیب والترهیب والمواعظ وغیرذلك فکله حرام من اکبر الکبائر واقبح القبائح باجماع المسلمین الذین یعتدبهم فی الاجماع[1]" لیکن مسلمانوں کا ایک گمراہ فرقہ کرامیہ ترغیب وترہیب کے باب میں وضع حدیث کو جائز قرار دیتا ہے، اس کا استدلال حدیث باب کے اس طریق سے ہے، جو مسند بزار میں "من کذب علیّ لیضل به الناس" کی زیادتی کے ساتھ منقول ہے، ان کا کہنا ہے کہ: "کذب" وہی حرام ہے، جو شریعت کے خلاف ہو اگر کذب کے ذریعہ لوگوں میں آخرت کا خوف اور جنت کا شوق پیدا کیا جائے، تو اس کی اجازت ہوگی؛ امام نووی نے ان کے استدلال کو سطحیت اور فساد ذہن کا نتیجہ قرار دیا ہے اور اس زیادتی کے انہوں نے تین جواب دیئے ہیں، ۱" لیضل الناس زیادة باطلة اتفق الحفاظ علی ابطالها وانها لا تعرف صحیحة بحال[2]" لیضل به الناس کی زیادتی باطل ہے، حفاظ حدیث کا اس کے باطل ہونے اور کسی صورت صحیح نہ ہونے پر اتفاق ہے،

[1، 2] مسلم ۸/۱

(۲) دوسرا جواب انہوں نے امام طحاوی کا نقل کیا ہے: "انها لو صحت لكانت للتاكيد" اگر بالفرض وہ درست ثابت ہو جائے، تو یہ زیادتی علت نہیں تاکید ہے، اور اس کی مثال خود قرآن کریم میں موجود ہے: "فمن اظلم ممن افترى على الله كذبا ليضل الناس"

۳ تیسرا جواب امام نووی نے یہ دیا ہے کہ: "ليضل" کا لام "ليست لام التعليل بل هي لام الصيرورة والعاقبة" کہ یہ علت کے لئے نہیں، بلکہ صیرورت اور عاقبت کے لئے ہے: "ومعناه أن عاقبة كذبه ومصيره الى الا ضلال به"[1] یعنی کذب کا نتیجہ گمراہی ہے، قرآن کریم اور کلام عرب میں اس کی بے شمار نظریں موجود ہیں، مثال کے لئے امام نووی نے: "فالتقطه آل فرعون ليكون لهم عدو اوحزنا" والی آیت پیش کی ہے..... جب اس زیادتی کے باطل ہونے پر محدثین کا اتفاق ہو گیا، تو اب ان دو جوابوں کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہتی اور وہ محض فرض محال کے طور پر دیئے گئے ہیں، ورنہ اصل جواب تو پہلا ہی ہے اور ان کی تردید کے لئے قرآن وسنت کے بے شمار دلائل موجود ہیں، لیکن افسوس کہ کرامیہ کی طرح یہ گمراہی روافض اور بعض صوفیوں کے یہاں بھی علمی رائے بن گئی اور اس کے اثرات آج بڑے بھیانک طور پر سامنے آرہے ہیں۔

۱/۳۰ حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنِ اَبِيْ شَيْبَةَ وَسُوَيدُ بْنُ سَعِيْدٍ وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَامِرِ بْنِ زُرَارَةَ وَاِسْمَاعِيْلُ بْنُ مُوْسٰى قَالُوا: ثَنَا شَرِيْكٌ عَنْ سِمَاكٍ ، عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَذِبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ.

جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

مسند احمد میں اس روایت کا پس منظر یہ نقل کیا گیا ہے کہ: عبداللہ بن ابی جذعہ نامی ایک شخص قبیلہ ثقیف کے پاس طائف میں پہنچا اور ایک حلہ دکھا کر کہا یہ رسول اللہ ﷺ کا حلہ ہے، آپ ﷺ نے مجھے حکم دیا ہے، میں تمہارے جس گھر میں چاہوں، قیام کرلوں، انہوں نے کہا کہ: یہ ہمارے گھر ہیں، جہاں چاہو ٹھہر جاؤ، جب رات ہوئی وہ شخص بولا رسول اللہ ﷺ نے

[1] مسلم ۱/۸

مجھے یہ بھی اختیار دیا ہے کہ: میں تمہاری جس عورت کے ساتھ چاہوں، شب باشی کروں، انہوں نے کہا ہمارا تو رسول اللہ ﷺ سے زنا کی حرمت پر عہد ہے، ہم آپ ﷺ کی طرف قاصد بھیج کر معلوم کرتے ہیں، چنانچہ انہوں نے ایک شخص کو آپ کے پاس بھیجا، وہ دوپہر کے وقت خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور پورا واقعہ سنایا عبداللہ بن الحارث صحابی کہتے ہیں کہ یہ سن کر حضور ﷺ کو اتنا شدید غصہ آیا کہ: میں نے اتنا غصہ ہوتے آپ ﷺ کو کبھی نہیں دیکھا، پھر آپؐ نے فرمایا اے فلاں! اے فلاں! تم دونوں وہاں جاؤ اگر وہ تم کو مل جائے، تو قتل کر کے جلا دینا، پھر مزید فرمایا جب تم اس کے پاس پہنچو گے تو شاید اس کا کام تمام ہو چکا ہوگا راوی کہتے ہیں، طائف کے قیام کے دوران ہی ایک رات وہ بارش میں قضائے حاجت کو نکلا یہیں پر سانپ نے اسے ڈس کر قتل کر ڈالا، ان دونوں حضرات نے پھر اس کی لاش کو جلا دیا، جب کہ: دوسرے طرق میں جلانے سے منع کیا ہے کیونکہ آگ کا عذاب رب العالمین ہی کے لئے زیبا ہے، اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کی زبان پر یہ حدیث جاری ہوئی کہ: جو مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

﴿**من كذب على متعمدًا**﴾ جملہ فعلیہ ہو کر شرط ہے، **كذب على** کے معنی "**المعجم الوسيط**" میں "**اَخبر عنه بمالم يكن فيه**" لکھے ہیں، یعنی کسی کے بارے میں ایسی خبر دینا جو اس کی بابت ثابت نہ ہو، **متعمداً** کی وضاحت علامہ سندھی نے "**قاصدًا الكذب علىّ لغرض من الأغراض لا انه وقع فيه خطاءً اوسهوًا فان ذلك مكفر عن هذه الامة** سے کی ہے کہ کسی مقصد کے لئے میرے سلسلہ میں ارادتاً جھوٹ بولے سہو اور خطا کے طور پر نہیں کیونکہ اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

﴿**فليتبوأ مقعده من النار**﴾ جملہ انشائیہ ہو کر شرط کی جزاء ہے خطابی نے لکھا ہے: "**واصله مباءاة الابل وهى اعطافها**" تبوء، دراصل **مباءاة الابل** سے ماخوذ ہے، جس کے معنی اونٹ کا سیراب ہو کر اپنے ٹھکانے پر مستقل طور پر بیٹھ جانا" **فليتبوّء**" میں ایک احتمال دعاء کا ہے، جس کا مطلب امام نووی نے "**بوّاه الله ذلك**" لکھا ہے، لیکن یہ مرجوح ہے راجح معنی خبر کے ہیں، جس کی نووی نے دو صورتیں لکھیں ہیں، ۱ "**معناه فلينزل، وقيل:**

فلیتخذ منزلةً من النار" یعنی جہنم میں قیام کرے اور وہیں ٹھکانہ بنالے۔ ۲ معناہ فقد استوجب ذلك فلیؤطن نفسه علیه یعنی جہنم واجب ہوچکی، اس لئے اپنے آپ کو سزا بھگتنے کے لئے تیار کرلے، امام نووی لکھتے ہیں: "یلج النار" اور "بنی له بیت فی النار" بعض روایت کے الفاظ اسی مفہوم پر دلالت کرتے ہیں، سندھی نے بھی یہی لکھا ہے: "وفی التعبیر بلفظ الأمر الواجب اشارة فی تحقیق الوقوع" امر واجب کی تعبیر جہنم میں اس کی منزل کے مقرر ہونے کا اشارہ کرتی ہے، اب حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ: اس جرم کے ارتکاب کے بعد باری تعالیٰ سے عنایت وکرم کی توقع فضول ہے، اس کا ٹھکانا تو جہنم میں بن چکا، جہاں اسے بالآخر پہنچنا ہے، یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ: کیا یہ دخول دائمی ہوگا؟ امام نووی جواب دیتے ہیں: "وقد یجاز به وقد یعفو اللّٰه الکریم عنه ولا یقطع علیه بدخول النار وهكذا سبیل کل ماجاء من الوعید بالنار بأصحاب الکبائر" سزا بھی دی جاسکتی ہے، اور باری تعالیٰ اسے معاف بھی کرسکتے ہیں، کیونکہ دخول نار دائمی نہیں ہوگا، یہی حکم ان تمام وعیدوں کا ہے، جو کفر کو چھوڑ کر کبائر کا ارتکاب کرنے والوں کے سلسلہ میں آگ کے تذکرہ کے ساتھ وارد ہوئی ہیں، کیونکہ اہل سنت والجماعت کا متفقہ موقف ہے: "وَلا یُخلَدُ فی النارِ احدٌ ماتَ علی التَّوحیدِ"

سند کی تحقیق

حدیث باب کے ایک راوی سوید بن سعید کے بارے میں ابن حجر نے لکھا ہے: "صدوق بنفسه الا انه عمی فصار یتلقن مالیس من حدیثه افحش فیه ابن معین القول" بذات خود تو سچے ہیں، لیکن نابینا ہونے کے بعد وہ حدیث میں کچھ بھی تلقین قبول کرلیتے تھے، اسی لئے ابن معین کی رائے ان کی بابت بہت سخت ہے، دوسرے راوی اسماعیل بن موسیٰ کو حافظ نے: "صدوق یُخطیٔ ورُمِیَ بالرفض" لکھا ہے، لیکن سند پر کوئی آنچ نہیں آتی، کیونکہ ابن ماجہ نے یہ روایت ابوبکر بن ابی شیبہ سے بھی لی ہے، جو سب کے امام ہیں اور ان کے دوسرے شیخ عبداللہ بن عامر بن زرارہ بھی صدوق ہیں آگے شریک سے ابن مسعود

تک سلسلہ بھی درست ہے، اس لئے الدیباجہ علی ابن ماجہ میں اسے حسن لغیرہ کہنا تسامح ہے، یہ بات اس وقت صحیح ہوتی جب روایت کا انحصار سوید اور اسماعیل پر ہوتا اور امام اسے ابوبکر اور ابن عامر سے روایت نہ کرتے، یہ سند صحیح تر ہے۔

(۳۱/۲) حَدَّثَنَا عَبدُ اللّٰهِ بْنِ عَامِرِ بنِ زُرَارَةَ، وَاِسْمٰعِيْلُ بْنُ مُوْسٰى، قَالاَ ثَنَا شَرِيْكٌ عَنْ مَنْصُوْرٍ، عَنْ رِبْعِيِّ بْنِ حِرَاشٍ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِى طَالِبٍ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لاَتَكْذِبُوْا عَلَىَّ، فَاِنَّ الْكِذْبَ عَلَىَّ يُوْلِجُ النَّارَ"

"لاتكذبوا على" علامہ قسطلانی نے لکھا ہے: " بِصِيْغَةِ الجَمْعِ وَهُوَ عَامٌّ فِى كُلِّ كِذْبٍ مُطْلَقٍ فِى كُلِ نَوعٍ مِنْهُ فِى الاَحْكَامِ وَغَيرِهَا كَالتَّرغِيْبِ وَالتَّرهِيْبِ"

یہ صیغہ دین کی جملہ اقسام خواہ احکام ہوں یا ترغیب وترہیب کا موضوع ہو ہر طرح کے کذب کو شامل ہے اور اب کسی شعبے میں وضع حدیث کی گنجائش نہیں رہتی، حضرت کا استدلال کرامیہ کے پس منظر میں ہے، تفصیلی بحث باب کے ضمن میں گذر چکی ہے۔

﴿فان الكذب على يولج النار﴾ صحیح بخاری کتاب العلم باب اثم من كذب على النبى صلى الله عليه وسلم ، صحیح مسلم مقدمہ اور جامع ترمذی کتاب العلم باب تعظيم الكذب على رسول الله صلى الله عليه وسلم میں یہ الفاظ فانه من كذب على فليلج النار منقول ہیں، اولج افعال سے آتا ہے، معنی داخل کرنا، یہاں متعمداً کی قید نہیں ہے، اس لئے مطلق جھوٹ کی بنا پر وعید اور زیادہ سخت ہوگئی، علامہ سندھی فرماتے ہیں: " يدخل كل من له تلبيس به ولو بالدلالة عليه والرضابه والرواية له" یعنی یہ جرم ہر اس شخص کو جہنم میں داخل کردے گا، جس کا کذب سے کوئی بھی تعلق ہو، خواہ یہ تعلق دلالۃً رضاءً اور روایتاً ہی کیوں نہ ہو، بہر صورت وہ جہنم کا مستحق ہے، ابن ماجہ کا سلسلہ رواۃ بعینہ ترمذی کا سلسلہ ہے اور امام ترمذی نے اس سند کو حسنٌ صحيحٌ قرار دیا ہے۔

(۳۲/۳) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ رُمْحٍ المِصْرِىُّ، ثَنَا اللَّيْثُ بْنُ سَعْدٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ "مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ حسبتهُ قال: مُتعَمِّدًا فَلْيَتبوأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"

﴿حسبتهُ﴾ یہ حضرت انسؓ کا قول ہے، جوانھوں نے متعمدًا کی شرط کے بارے میں ظاہر کیا ہے، علامہ سندھی نے لکھا ہے، والجملة معترضةٌ بينَ الشرطِ وَالجزاءِ للِافادة في التقييْدِ بالمُتعَمّدِ في هٰذه الرواية یعنی حسبتهٗ قال متعمدًا شرط اور جزاء کے درمیان جملہ معترضہ ہے، جس سے روایت میں تعمد کی قید کا پتہ چلتا ہے، مولانا لطیف الرحمٰن بہرائچی نے سند کی بابت اسنادهٗ صحيح کا فیصلہ کیا ہے، روایت جامع ترمذی کتاب العلم باب تعظيم الكذب على النبي صلى الله عليه وسلم میں بھی موجود ہے۔

(۳۳/۴) حَدَّثَنَا اَبُوْخَيْثَمَةَ زُهَيْرُ بْنُ حَرْبٍ، حَدَّثَنَا هُشَيْمٌ عَنْ اَبِي الزُّبَيْرِ، عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"

ھشیم بن بشیر کے بارے میں ابن حجر نے: تقریب (۷۳۱۲) میں "ثقة ثبت كثير التدليس والارسال الخفي" کا اور ابوزبیر کی بابت صدوق الا أنه يدلس (۶۲۹۱) کا تبصرہ کیا ہے، جس کے باعث سند میں کچھ ضعف آجاتا ہے، اور مولانا لطیف الرحمٰن بہرائچی اس کو صحیح لغیرہ قرار دیتے ہیں۔

(۳۴/۵) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنِ اَبِيْ شَيْبَةَ، حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بِشْرٍ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرٍو، عَنْ اَبِيْ سَلْمَةَ، عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "مَنْ تَقَوَّلَ عَلَيَّ مَالَمْ اَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"

﴿تقول علىّٰ﴾ کے معنیٰ المعجم الوسيط میں اختلقهٗ كذبًا لکھے ہیں، معنیٰ جھوٹ گھڑنا قرآن کریم میں یہ لفظ اسی معنیٰ میں موجود ہے: "ولو تقول علينا بعض الا قاويل لأخذنا منهُ باليمين" علامہ سندھی نے لکھا ہے: "يَدُلُّ علىٰ اَن التَكلُّفَ يُغني عَن قَيدِ التَّعَمُّدِ باب تفعل تکلف پر دلالت کرتا ہے، جس میں عزم اور کوشش کے معنیٰ پیدا ہوتے ہیں، اس لئے تعمد کی قید کی ضرورت نہ رہی، کیونکہ تقول میں تعمد بھی موجود ہے۔ محمد بن عمرو کی صدوق ہونے کے باوجود ابن معین، جوزجانی ابن سعد اور ابن حجر نے بعض وجوہ سے

تضعیف کی ہے، اس لئے مولانا لطیف الرحمٰن خان بہرائچی نے اس کی بابت **اسنادہٗ حسن لغیرہٖ** کا فیصلہ کیا ہے۔

(۳۵/۶) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنِ اَبِیْ شَیْبَةَ، ثَنَا یَحْیٰی ابْنُ یَعْلٰی التَّیْمِیُّ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِسْحَاقَ عَنْ مَعْبَدِ بْنِ كَعْبٍ عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ ، عَلٰی هٰذَا الْمِنْبَرِ "اِیَّاكُمْ وَكَثْرَةَ الْحَدِیْثِ عَنِّیْ فَمَنْ قَالَ عَلَیَّ فَلْیَقُلْ حَقًّا اَوْصِدْقًا وَمَنْ تَقَوَّلَ عَلَیَّ مَالَمْ اَقُلْ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ"

قتادہ کہتے ہیں کہ: میں نے اس منبر پر رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا کہ خبردار حدیث کی کثرت سے پرہیز رکھنا اور جو بھی میرے بارے میں کہے تو وہ حق کہے یا سچ کہے اور جس نے میری بابت آگے بڑھ کروہ بات کہی جو میں نے نہیں کہی، تو اپنا ٹھکانا وہ جہنم میں بنالے۔

﴿ایا﴾ حرف تنبیہ ہے، ضمیر منفصل منصوب کے شروع میں لگایا جاتا ہے، مقصد تنبیہ وتخصیص ہوتا ہے، تقدیر عبارت یوں ہوگی: "**قوا انفسكم واحذروا كثرة الحديث**" اپنے کو بچاؤ اور کثرت روایت سے اجتناب کرو۔

﴿**حقا وصدقا**﴾ علامہ سندھی لکھتے ہیں: "**كلمة او للشك**" یعنی حضرت ابوقتادہ کو شک ہوگیا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "**حقا**" فرمایا یا: "**صدقا**" جس کو انہوں نے ظاہر کردیا صحابہ، تابعین اور رواۃ حدیث میں ایسی احتیاط کی مثالیں عام طور پر ملتی ہیں،..... محمد بن اسحاق حدیث کے ایک راوی پر ابن حجر نے **صدوق يدلس ورمي بالقدر والتشيع** کا تبصرہ کیا ہے، حافظ بوصیری نے بھی زوائد (۱/ ۴۸) میں **اسنادهٗ ضعیف لتدلیس ابن اسحاق** تحریر فرمایا ہے۔

(۳۶/۷) حَدَّثنا اَبُوْبَكْر بْنِ اَبِیْ شَیْبَةَ مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَا: ثَنا غُنْدَرٌ مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ ثَنا شُعْبَةُ، عَنْ جامعِ بْنِ شَدَّادٍ اَبِیْ صَخْرَةَ عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الزُّبَیْرِ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ: قُلْتُ لِلزُّبَیْرِ بْنِ الْعَوَّامِ: مَالِیْ لَا اَسْمَعُكَ تُحَدِّثُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلّی اللّٰهُ عَلَیْه وسلّم كَمَا اَسْمَعُ ابْنَ مَسْعُوْدٍ

وَفُلاَنًا وَفُلاَنًا قَالَ اَمَا اِنِّی لَمْ اُفَارِقْهُ مُنْذُ اَسْلَمْتُ وَلٰكِنِّی سَمِعْتُ مِنْهُ كَلِمَةً يَقُوْلُ: "مَنْ كَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ"

عبداللہ سے روایت ہے کہ: میں نے زبیرابن العوام سے عرض کیا کیا وجہ ہے، میں آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بیان کرتے نہیں سنتا جس طرح ابن مسعوداور فلاں فلاں حضرات سے سنتا ہوں، انہوں نے فرمایا سنو میں نے جب سے اسلام قبول کیا: رسول اللہ ﷺ سے جدا نہیں ہوا، لیکن میں نے آپ سے ایک جملہ سنا ہے، فرماتے تھے کہ: جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

حضرت عبداللہ بن مسعوداور دوسرے صحابہؓ کو جب ابن زبیر نے کثرت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث روایت کرتے سنا تو ان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میرے والد تو اور بھی زیادہ قدیم الاسلام ہیں اوران کا شمار عشرۂ مبشرہ میں بھی ہوتا ہے، پھر وہ احادیث بیان کیوں نہیں کرتے! حضرت زبیرؓ سے جب انہوں نے سوالیہ انداز میں اس کا شکوہ کیا، تو انھوں نے مندرجہ ذیل جملہ کہا:

﴿لم افارقه منذ اسلمت﴾ وہ ان چند مخصوص وقدیم لوگوں میں تھے جن کو سب سے پہلے ایمان لانے کی توفیق ملی اور آخر تک نبی کی صحبت سے سرفراز رہے اس لئے پورا دورِ نبوت ان کی آنکھوں کے سامنے تھا اور تمام نبوی ارشادات بھی مستحضر تھے، لیکن غایت احتیاط اور خوف کی بناء پر انھوں نے براہِ راست تحدیث کو مشغلہ نہیں بنایا، اوراس کی وجہ قلت صحبت نہیں تھی بلکہ کذب علی النبی کا خوف تھا، یہی حقیقت انھوں نے اپنے بیٹے کو سمجھائی، حدیث بخاری (علم/۳۴) میں بھی موجود ہے اور ابن ماجہ کی سند کو الدیباجہ (۱/۱۹۴) میں اسنادہ صحیح قرار دیا گیا ہے۔

(۳۷/۸) حَدَّثَنَا سُوَيْدُ بْنُ سَعِيْدٍ حَدَّثَنَا عَلِیُّ بْنُ مُسْهِرٍ عَنْ مُطَرِّفٍ عَنْ عَطِيَّةَ عَنْ اَبِی سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ كَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ.

حافظ نے عطیہ بن سعد کو تقریب (۴۶۱۶) میں صدوق یخطئ کثیرا کان شیعیا

مدلسا کہا ہے، اس لیے بوصیری فرماتے ہیں هذا اسناد ضعيف لضعف عطية الديباجه (۱/۱۹٦) میں بھی سند کو حسن لغیرہ قرار دیا ہے۔

بَابُ مَنْ حَدَّثَ وَهُوَ يُرى انَهُ كَذِبٌ

وضع حدیث کا مذموم عمل اسلامی تاریخ میں حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد شروع ہوا وہ طبقے جو محض سیاسی تھے، مذہبی لبادہ اوڑھ کر مکتب فکر کی حیثیت اختیار کر گئے، ان میں سرفہرست شیعہ وخوارج ہیں، جنہوں نے اپنے موقف کی تائید کے لئے خصوصاً حدیثیں گھڑیں، جھوٹ کا آغاز تو انہی گمراہ لوگوں سے ہوا، لیکن اہل سنت والجماعت میں بھی کچھ سطحی اور جاہل ان سے متاثر ہوئے اور انہوں نے شان نبوت میں غلو، فقہی ذوق کی تائید، ترغیب وترہیب، تفسیر وطب، زہد وتصوف، امراء کی خوشنودی اور فضائل ومناقب کے باب میں حدیثیں گڑھ دیں۔

موضوعات کی بابت محدثین کا موقف بہت حساس اور سخت تھا، انہوں نے ایک طرف تو واضعین حدیث کے لئے سخت سے سخت سزا یعنی قتل تک مقرر کی، تو دوسری جانب موضوع روایت کے بیان کرنے پر بھی پابندی لگادی اور اس کی اجازت صرف اسی شخص کو دی جو کسی خاص ضرورت کے پیش نظر اس کے وضع کی صراحت کرے، ورنہ عام آدمی کے لئے یہ حرام اور اشد الکبائر ہے، ابن صلاح نے مقدمہ (۲۱۲) میں: "ولا تَحِلُّ رواياته لأحدٍ عَلِمَ حالَهُ في أيِّ معنى كان الا مقرونا ببيان وضعه" امام نووی نے تقریب (تدریب الراوی ۱/۲۷۴) میں: "تحرم روايته مع العلم به في أى معنى كان الا مبيّنا" اور علامہ شریف جرجانی نے: "مختصر من خلاصة للطيبى فى فن اصول الحديث" (۱۱) میں: "لا يحل رواية الموضوع للعالم بحاله في اى معنى كان الا مقرونا ببيان الوضع" کے الفاظ میں اسلام کے اسی موقف کی ترجمانی کی ہے اور یہ بعینہ باب کے تحت آنے والی احادیث سے ماخوذ ہے۔

﴿باب التغليظ في تعمد الكذب﴾ الخ کے بعد امام ابن ماجہ نے یہ باب قائم کیا ہے، پچھلے باب میں احادیث خود وضع کرنے کا گناہ تھا اور اس باب میں موضوع کو بیان کرنے

کے گناہ کا تذکرہ ہے، شریعت جہاں وضع سے روکتی ہے، وہیں اس کا منشاء یہ بھی ہے کہ: موضوعات کے غلط اثرات سے امت کو محفوظ رکھنے کے لئے انہیں بالکل شہرت نہ دی جائے اور کسی صورت میں وہ معاشرہ میں رائج نہ ہوسکیں اس عنوان کے تحت آنے والی ہر حدیث ان لوگوں کو بھی جھوٹا قرار دے کر وضاعین میں شمار کرتی ہے، جو خود تو کچھ نہیں گڑھتے، لیکن کاذبوں کی موضوع روایات کو جانتے بوجھتے دوسروں سے نقل کرتے ہیں، ایک نے جھوٹ گڑھا دوسرے نے اس کی اشاعت کی دونوں ہی برابر کے مجرم ہیں، یہ معاملہ تو بہت سخت ہے، حدیث میں تو اس شخص کو بھی جھوٹا قرار دیا گیا ہے، جو سنی سنائی باتوں کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کے بجائے، دوسروں سے نقل کرتا پھرے، پھر جانتے بوجھتے نبی کی طرف منسوب ایک غلط بات کو پھیلانے کا گناہ کتنا سخت ہوگا، اس لئے حضرات محدثین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ: موضوع روایتوں کو بیان کرنا حرام ہے الا یہ کہ موضوع ہونے کی وضاحت کردی جائے، خداوند قدوس ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔

(۱/۳۸) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنِ اَبِيْ شَيْبَةَ ثَنَا عَلِيُّ بْنُ هَاشِمٍ عَنِ ابْنِ اَبِيْ لَيْلٰى عَنِ الْحَكَمِ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِيْ لَيْلٰى عَنْ عَلِيٍّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ حَدَّثَ عَنِّيْ حَدِيْثًا وَهُوَ يَرٰى اَنَّهٗ كَذِبٌ فَهُوَ اَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ.

حدیث باب کے ایک راوی علی بن ہاشم ہیں، جن کی بابت ابن حجر نے (۴۸۱۰) "صدوق يتشيع" جب کہ ابن ابی لیلیٰ کو علی ابن مدینی نے: "كان سئ الحفظ واهي الحديث" ساجی نے:" كان سيئ الحفظ لا يتعمد الكذب" ابن حبان نے:"كان فاحشَ الخطاِ رَدِئَ الحفظِ" اور ابن جریر طبری نے :"لايحتج به" اور ابن حجر نے صدوق سيئ الحفظ جدا (تقریب ۶۰۸۱) کہا ہے، اس لئے مولانا لطیف الرحمٰن خان بہرائچی نے سند کی بابت اسناده حسن لغيره کا فیصلہ کیا ہے، یاد رہے کہ: یہ ابی الیلیٰ کوئی نہیں، اسی نام کے دوسرے راوی عبد الرحمٰن ابن ابی لیلیٰ ہیں، جن کو امام نووی نے: "من اجل التابعين" (مسلم ۱/۶) لکھا ہے، اور ان کے بارے میں عبد اللہ ابن الحارث کا یہ مقولہ نقل کیا: "ماشعرت أن النساء ولدت مثله" یہ مسلم اور متفق علیہ شخصیت ہیں۔

(۳۹/۲) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنِ اَبِیْ شَيْبَةَ قَالَ: ثَنَا وَكِيْعٌ ح وَثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ قَالَا: ثَنَا شُعْبَةَ عَنِ الْحَكَمِ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ لَيْلٰی عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ حَدَّثَ عَنِّیْ حَدِيْثًا وَهُوَ يَرٰی اَنَّهٗ كَذِبٌ فَهُوَ اَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ

صحیح مسلم کی سند: "حدثنا ابوبکر بن ابی شیبة قال: نا وکیع عن شعبة عن الحکم عن عبد الرحمن بن أبی لیلٰی عن سمرة بن جندب" منقول ہے، اور یہی سلسلہ ابن ماجہ کا بھی ہے، بس فرق یہ ہے کہ امام مسلم نے اسے صرف ابوبکر بن ابی شیبہ سے روایت کیا ہے، جب کہ ابن ماجہ تحویل سند کے ساتھ اسے محمد بن بشار اور محمد بن جعفر سے بھی لیتے ہیں، جس سے ان کی سند میں مزید قوت آجاتی ہے۔

(۴۰/۳) حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ أَبِیْ شَيْبَةَ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُضَيْلٍ عَنِ الْأَعْمَشِ عَنِ الْحَكَمِ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِیْ لَيْلٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ حَدَّثَ عَنِّیْ حَدِيْثًا وَهُوَ يَرٰی أَنَّهٗ كَذِبٌ فَهُوَ اَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ.

محمد بن فضیل کو چھوڑ کر سب صحیح مسلم کے رواۃ ہیں، ابن حجر نے محمد ابن فضیل بن غزوان کے بارے میں تقریب (۶۲۲۷) میں لکھا ہے، صدوق عارف رُمیَ بالتشیُّع.

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ أَنْبَأَنَا الْحَسَنُ بْنُ مُوْسٰی الاَشْيَبُ عَنْ شُعْبَةَ مِثْلَ حَدِيْثِ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ.

یہاں ہم امام ترمذی کے وہ الفاظ بھی نقل کرتے چلیں، جو حدیث کی شرح کے باب میں اہم لفظوں کی طرف راہنمائی کرتے ہیں فرمایا:

سَأَلْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَبَا مُحَمَّدٍ عَنْ حَدِيْثِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَدَّثَ عَنِّیْ حَدِيْثًا وَهُوَ يَرٰی اَنَّهٗ كَذِبٌ فَهُوَ اَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ قُلْتُ لَهٗ مَنْ رَوٰی حَدِيْثًا وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّ اِسْنَادَهٗ خَطأٌ أَتَخَافُ أَنْ يَّكُوْنَ قَدْ دَخَلَ فِی حَدِيْثِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْ اِذَا رَوَی النَّاسُ حَدِيْثًا مُرْسَلًا فَأَسْنَدَهٗ بَعْضُهُمْ اَوْ قَلَبَ اِسْنَادَهٗ يَكُوْنُ قَدْ دَخَلَ فِی هٰذَا الْحَدِيْثِ فَقَالَ لَا اِنَّمَا مَعْنٰی هٰذَا

اَلْحَدِیْثِ اِذَا رَوَی الرَّجُلُ حَدِیْثاً وَلاَ یُعْرَفُ لِذٰلِکَ الْحَدِیْثِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَصْلٌ فَحَدَّثَ بِهٖ فَاَخَاف أَنْ یَّکُوْنَ قَدْ دَخَلَ فِی هٰذَا الْحَدِیْثِ (جامع ترمذی، کتاب العلم باب فیمن روی حدیثا وهو یری انه کذب)

میں نے عبداللہ بن عبدالرحمٰن ابومحمد سے حدیث نبوی: "من حدث عنی حدیثا وھو یری انه کذب فھو احد الکاذبین" کی بابت استفسار کرتے ہوئے کہا کہ: جوشخص ایسی حدیث بیان کرے جس کی سند کو وہ غلط سمجھتا ہے، تو کیا آپ کو اندیشہ ہے کہ: وہ بھی اس وعید میں داخل ہے، اسی طرح اگر لوگ کسی مرسل حدیث کو بیان کریں اور کوئی اس کو مرفوع بنادے، یا اس کی سند میں الٹ پھیر کردے، تو کیا وہ بھی اس حدیث کا مصداق ہوگا تو انہوں نے فرمایا کہ: نہیں حدیث کا مفہوم بس یہ ہے کہ آدمی ایسی حدیث بیان کرے جس کی کوئی بنیاد نہ ہو، تو مجھے اندیشہ ہے کہ: وہ بھی اس حدیث کا مصداق بن جائے گا، پہلے راوی کو چھوڑ کر الدیباجہ (۲۰۴/۱) میں اسنادہ صحیح کہا ہے، عبدك تمام ہندوستانی نسخوں میں ایسا ہی ہے لیکن فواد عبدالباقی نے اسے تصحیف قرار دیا ہے، ان کے نزدیک صحیح محمد بن عبداللہ ہے، جبکہ مکتبہ آصفیہ حیدرآباد کے نسخہ میں محمد بن غندر ہے، جو یقیناً غلط ہے، ملاحظہ ہو الدیباجہ ۲۰۴/۱۔

(۴۱/۴) حَدَّثَنَا اَبُوْبَکْرِ بْنِ اَبِیْ شَیْبَةَ ثَنَا وَکِیْعٌ عَنْ سُفْیَانَ عَنْ حَبِیْبِ بْنِ اَبِیْ ثَابِتٍ عَنْ مَیْمُوْنِ بْنِ اَبِیْ شَبِیْبٍ عَنِ الْمُغِیْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ! قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَدَّثَ عَنِّیْ بِحَدِیْثٍ وَهُوَ یَرٰی اَنَّهٗ کَذِبَ فَهُوَ اَحَدُ الْکَاذِبِیْنَ.

﴿من حدث عنی.......... الکاذبین﴾ پوری عبارت شرط ہے، وھویری انه کذب جملہ حدث کی فاعلی ضمیر کا حال واقع ہے، یری میں دو قراءتیں ہیں معروف اور مجہول پہلی صورت میں یعلم کے ہوں گے یعنی یقین کے ساتھ روایت کا جھوٹ ہونا اس پر عیاں ہے دوسری صورت میں وہ یظن کے معنی میں ہوگا یعنی ظن غالب کے طور پر وہ روایت کو جھوٹ سمجھتا ہے امام نوویؒ نے اسی کو مشہور قراءت قرار دیا ہے۔

﴿فھو احد الکاذبین﴾ جملہ اسمیہ بن کر شرط کی جزاء ہے، کاذبین کو طیبیؒ تثنیہ کہتے

ہیں اوران کی دلیل القلم احد اللسانین، الجد احد الابوین ہے مجددی نے بھی اسی کو مشہور قول قرار دیا ہے، لیکن ان کے برخلاف قاضی عیاضؒ نے جمع کو ترجیح دی ہے اور امام نووی کے نزدیک یہی مشہور قراءت ہے الجمع وهذا هو المشهور سندھیؒ کی بھی یہی رائے ہے، لکھتے ہیں: "اى فَهُو واحدٌ مِن جملةِ الوَاضِعِينَ الحديثَ والمقصودُ أن الرواية مَع العلم بوضع الحديث كوضعه قالوا: هذا اذا لم يبين وضعه" یعنی وہ بھی وضاعین حدیث میں ہی کا ایک فرد ہے، کیونکہ وضع کا علم ہونے کے ساتھ روایت کرنا وضع ہی کی طرح ہے، محدثین نے شرط لگائی ہے کہ: یہ حکم اس وقت ہوگا، جب کہ روایت کے ساتھ وہ وضع کی تصریح نہ کرے، حدیث کے ذیل میں یہ جملہ محدثین کی تحقیقات کا خلاصہ ہے اور یہی حدیث کا صحیح مفہوم بھی ہے، لیکن حضرت مولانا عبدالغنی مجددی نے "انجاح الحاجه" میں جوتثنیہ کی بناء پر مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی کو مراد لیا ہے، اسے ایک بہترین نکتہ قرار دیئے بغیر چارہ نہیں امام نووی نے فقہ الحدیث ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

فَفِيهِ تَغْلِيظُ الْكِذْبِ وَالتَّعَرُّضِ لَهُ وَاَنَّ مَنْ غَلَبَ عَلٰى ظَنِّهٖ مَا يَرْوِيهِ فَرَوَاهُ كَانَ كَاذِبًا وَكَيْفَ لَا يَكُوْنُ كَاذِبًا وَهُوَ مُخْبِرٌ بِمَالَمْ يَكُنْ۔

فرمان رسالت میں کذب اور اس سے تعلق کی قباحت وشدت بیان کی گئی ہے، کہ جو شخص بھی ظن غالب کے طور پر اس کو جھوٹ سمجھتا ہو، پھر بھی روایت کرے تو وہ جھوٹا ہے، اور اس کو جھوٹا کیوں نہ کہا جائے، جب کہ وہ ایسی خبر دے رہا ہے، جو واقعہ میں موجود نہیں ہے ترجمۃ الباب ظاہر ہے، حدیث کی سند بعینہٖ صحیح مسلم کی ہے۔

بَابُ اِتِّبَاعِ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ

گذشتہ تمام ابواب سنت رسول سے متعلق تھے، اور ان کا مقصد نبوت ورسالت کی اہمیت وعظمت کو اجاگر کر کے اتباع رسول کی ترغیب دینا تھا، قرآن وسنت کے بعد دین میں تیسرا اہم مقام صحابہ کرام کو حاصل ہے، جو اسلام کا جیتا جاگتا نمونہ اور شریعت کی زندہ تصویر تھے، ان میں خلفاء راشدین کو خصوصی مرتبہ حاصل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انفرادی واجتماعی

دونوں طریقے پر امت کو ان کی اطاعت کی تاکید کی ہے، یہ چاروں حضرات جماعت صحابہؓ کے ترجمان وشارح ہیں، اور ان کے بیشتر فیصلوں پر خود تمام صحابہؓ کا اجماع ہے، اس لئے ان کی اطاعت دراصل تمام صحابہؓ کی اطاعت ہے، یہی عقیدہ آگے چل کر اہل سنت والجماعت کا قالب اختیار کر لیتا ہے، امام ابن ماجہ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے یہ باب قائم کیا ہے کہ: اتباع نبوت، خلفاء راشدین اور صحابہ کی اتباع کے بغیر ممکن نہیں۔

خلیفہ کے معنی

خلافت راشدہ اور خلیفہ راشد کی تعریف کیا ہے؟ اس مقام پر یہی دراصل غور وفکر کا موضوع ہے، خلافت کے لغوی معنی جانشینی اور کسی کی جگہ پر اس کے بعد بیٹھنے کے ہیں، اسی سے خلیفہ کا مفہوم متعین ہو جاتا ہے کہ: وہ ایک اصل کا سایہ، ایک آئینے کا عکس اور ایک عظیم منصب کی قائم مقامی ہے، اسی کی دوسری تعبیر امام ہے، یہ دونوں مترادف لفظ ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ: اپنے پیش رو کے لحاظ سے تو وہ خلیفہ اور اپنے معاصرین کے لحاظ سے امام اور پیشوا ہوتا ہے، یعنی خلافت وامامت نبی کی قائم مقامی اور اس کی وفات کے بعد امت کی پیشوائی ہے، نبی کی بعثت کا کیا مقصد اور دنیا میں اس کا کیا نصب العین ہے، حضرت شاہ ولی اللہ نے اس کے جواب میں اقامت دین کا لفظ استعمال کیا ہے، جس میں صلاۃ وصیام، حج وزکوٰۃ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر تعلیم وتزکیہ، شرعی حدود، نصب اور دین کی سربلندی کے لئے جہاد کا قیام شامل ہے، عہد خلافت میں گرچہ یہ ذمہ داریاں مختلف لوگوں سے متعلق تھیں، لیکن خلیفہ کو ان سب کا جامع ہونا ضروری ہے، اسی طرح: "الخلافة بعدی ثلثون" کا مصداق ہونے کے لئے علماء نے قرآن وحدیث کے اشارات وتلویحات کی روشنی میں چھ شرطیں مقرر کی ہیں۔

۱۔ خلیفہ مہاجرین اولین میں سے ہو، بدر واُحد، صلح حدیبیہ، خندق وتبوک میں شامل ہونے کے ساتھ سورہ نور کے نزول کے وقت موجود ہو جس میں خداوند قدوس نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے خلافت عطاء کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

۲۔ وہ مبشر بالجنہ ہو۔

۳۔ امت محمدیہ کے سب سے بلند طبقے یعنی صدیقین، شہداء، صالحین اور محدثین میں

شامل ہو، نیز جنت میں بھی اس کا مقام بلند ہو۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں اس سے نبوت کا کام لیا ہو، اس کے ساتھ آپ کا معاملہ مستحق خلافت جیسا ہو یعنی یا تو صراحتًا خلافت کی بابت اس کے استحقاق کا تذکرہ کیا یا آپ نے ایسے اشارے دیئے ہوں جن سے فقہاء صحابہؓ نے یہ سمجھا کہ: اگر آپ خلیفہ بناتے تو اسی شخص کو بناتے۔

۵۔ باری تعالیٰ نے نبی سے جو وعدے کئے وہ اس کی ذات سے پورے ہوں۔

۶۔ اس کا قول حجت ہو۔

یہ اوصاف گرچہ متفرق و اجتماعی طور پر اور بہت سے صحابہ میں بھی پائے جاتے ہیں، لیکن ان کا کامل ترین مظہر خلفاء اربعہ کا مجموعہ تھا، وہ مہاجرین اولین میں سے تھے، تمام غزوات میں شریک رہے اور سورہ نور کے نزول کے موقعہ پر بھی موجود تھے، انہیں دنیا میں جنت کی بشارت دی گئی، اور عشرہ مبشرہ میں ان کا نمبر سب سے اوپر ہے، صحیح احادیث کی رو سے وہ صدیق، شہید اور محدث و صالح ہر طبقے یا اکثر سے تعلق رکھتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرداً فرداً ان کے فضائل بیان کئے اور ان کے ساتھ بالکل مستحقین خلافت جیسا معاملہ فرمایا، قرآن میں اظہار دین اور یہودیت، ونصرانیت اور مجوسیت وغیرہ کے مغلوب ہو جانے کا وعدہ انہیں کے دور میں پورا ہوا، اسی طرح: "انّ علینا جمعه وقرآنه" کا وعدہ بھی تدوین قرآن کی صورت میں انہی حضرات کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا، صحیح بخاری میں خوارج کی بابت حضورؐ نے ارشاد فرمایا: "لئن أجدَهم لَاَقْتُلَنَّهُمْ قَتْلَ عَادٍ" یہ جنگ آپ کی جانب سے خلیفہ رابع نے لڑی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةُ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ اَو اقتدَوا مَن بَعدِى اَبَا بَكر وَعُمَرَ کے ذریعہ ان کے قول کو حجت قرار دیا کیونکہ نبوت کے بعد خلافت اسلام میں سب سے اونچا درجہ ہے۔

خلفاء کی تعیین

یہاں خلفاء سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس سلسلے میں شارحین حدیث کے دو قول ہیں۔

۱۔ عام اور لغوی مفہوم کے رو سے خلفاء اربعہ کے نقش قدم پر چلنے والے فقہاء و مجتہدین

اور مجاہدین ومجددین تمام ہی حضرات اس کا مصداق ہیں۔

۲۔ جمہور محدثین کا خیال ہے کہ: لغوی مفہوم کے بجائے، یہاں اصطلاحی مفہوم راجح ہے اور اس سے صرف ابوبکر وعمر اور عثمان وعلی ہی مراد لئے جاسکتے ہیں، ملاعلی قاری، فضل اللہ تورپشتی اور شیخ محمد علوی چار ہی پر اکتفا کرتے ہیں، جب کہ شاہ عبدالغنی مجددیؒ وغیرہ نے پانچواں نام حضرت حسن کا لیا ہے، کیونکہ انہی کو ملا کر ۳۰ سال پورے ہوتے ہیں۔

۳۔ خلافت کی احادیث کے پیش نظر تیسرا قول یہ ہونا چاہئے کہ: عمر بن عبدالعزیز کی طرح یہاں قیامت تک آنے والے بارہ عادل خلفاء مراد ہیں، ان میں سیوطی، سفارینی، مولانا ادریس کاندھلوی اور دوسرے محدثین کے نزدیک آخری خلیفہ امام مہدی ہیں۔

جمہور کے نزدیک پہلا قول مرجوح اور دوسرا راجح ہے، جب کہ: تیسرے کا غالباً کسی نے تذکرہ نہیں کیا وفات نبوی کے بعد قائم ہونے والی خلافت راشدہ اسلامی قانون کا ایک مستقل ماخذ ہے ملاعلی قاری اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "فَانَّهُم لم يَعمَلوا الا بِسُنَّتِهِ فالاضافَة اليهم اِمّا لِعلمِهِم بها اَو لِاستنباطِهِم واختيارِهم ايّاها"[۱] کیونکہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ آپ ہی کی سنت ہے، اب اسے خلفاء کی سنت کہنا یا تو اس وجہ سے کہ وہ سنت سے اچھی طرح واقف ہیں۔

۱۔ مرقاۃ المفاتیح باب الاعتصام بالكتاب والسنة فصل ثانی حدیث ۵

یا اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے، (کہ: اللہ کی خصوصی توفیق کے ذریعہ) سنت ہی کو معیار بنائیں گے، اور ہر مسئلہ اسی سے مستنبط کریں گے، اسی لئے اہل سنت والجماعت کے نزدیک ان کے تمام اوامر وفتاوی اور مجتہدات بذات خود دین میں شامل ہیں، کیونکہ اکثریت ان فیصلوں کی ہے، جو شریعت میں منصوص ومشروع تو تھے، لیکن حکمت ومصالح کے پیش نظر وہ عہد رسالت میں رائج ومشہور نہ ہوسکے، خلفاء اربعہ نے اپنے الہامی فہم وبصیرت کی بدولت انہیں نافذ کیا اور غیر منصوص مسائل میں امت کو نبوی اجتہاد واستنباط سے آشنا فرمایا، تو دراصل ان کا ہر قدم حضور ہی کا مقصد منشاء تھا، یہ حضرات محض نفاذ وتطبیق کا مظہر ہیں، اس لحاظ سے ان کی خلافت نبوت کا ضمیمہ تھی، اور نصوص کی تشریح یا قیاسی مسائل میں ان کے اجماعی فیصلے حدیث مرفوع کے حکم میں ہیں جن سے

خروج بہرصورت جائز نہیں۔

سنت خلفاء کی حیثیت

اگر پہلے اور تیسرے طبقے کو بھی خلفاء راشدین کا مصداق قرار دیا جائے، تو ان کی سنت کا درجہ بھی وہی ہوگا، جو خلفاء اربعہ کا ہے، یا باہم فرق مراتب ہوگا؟ محققین فرماتے ہیں، دونوں کی سنت میں فرق ہوگا، خلفائے اربعہ کا طریقہ تو معیار و حجت ہوگا، جب کہ دوسرے حضرات شرعی مسائل میں کسی ایک پہلو کو راجح اور دوسرے کو مرجوح قرار دینے میں محض دلیل اور شہادت بن سکتے ہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توثیق کر کے خلفاء اربعہ کے فضائل بیان کئے اور امت کو ان کی اقتداء پر ابھارا، پھر ان کے فیصلوں پر اجماع صحابہ کی مہر بھی ثبت ہے، جو خود ایک مضبوط دلیل اور اعتماد کی ضمانت ہے، ظاہر ہے دوسرے حضرات کو یہ ضمانت و امتیاز حاصل نہیں، اس لئے نصوص کی تصریح اور اجتہاد و استنباط میں ان کی سنت دلیل تو بن سکتی ہے، معیار و حجت نہیں ہمارا خیال ہے کہ: "یکون فی امتی اثنا عشر خلیفۃ" میں جن بارہ حضرات کا تذکرہ ہے، وہ بھی صحیح قول کے مطابق خلفاء راشدین ہیں، جن میں سب سے پہلے عمر بن عبدالعزیز اور سب سے آخری امام مہدی ہیں، ہمارے نزدیک بقیہ آٹھ حضرات: "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الأَمْرِ مِنْكُمْ" کے اولین مصداق میں دوسرے درجے پر فائز ہیں، اس لئے ان کی سنت کو دلیل شہادت سے اوپر اور خلافت راشدہ سے بس تھوڑا سا نیچا ہونا چاہئے کیونکہ وہ بھی ہو بہو انہیں کے نقش قدم پر تھے، جب کہ امام مہدی کا معاملہ تو اس سے بڑھ کر نظر آتا ہے، اور بعض علماء نے انہیں خلفاء اربعہ تک سے افضل قرار دیا ہے، لیکن وہ ان سے افضل تو نہیں، لیکن انہی کے زمرے میں رکھے جانے کے لائق ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فضائل و مناقب بیان کر کے ان کی بھی تصویب فرمائی ہے، اس لئے ان کی سنت کا بھی وہی درجہ ہوگا، جو امت کے نزدیک ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ کی سنت کا ہے۔

(۴۲/۱) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ اَحْمَدَ بْنِ بَشِیْرِ بْنِ ذَكْوَانَ الدِّمَشْقِیُّ ثَنَا الْوَلِیْدُ بْنُ مُسْلِمٍ ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ الْعَلَاءِ یَعْنِی ابْنِ زَبْرٍ حَدَّثَنِیْ یَحْیٰی بْنُ اَبِی الْمَطَاعِ قَالَ سَمِعْتُ الْعِرْبَاضَ بْنَ سَارِیَةَ یَقُوْلُ قَامَ فِیْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ فَوَعَظْنَا مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ فَقِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَعَظْتَنَا مَوْعِظَةَ مَوَدِّعٍ فَاعْهَدْ اِلَيْنَا بِعَهْدٍ فَقَالَ عَلَيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَاِنْ عَبْدًا حَبَشِيًّا وَسَتَرَوْنَ مِنْ بَعْدِيْ اخْتِلَافًا شَدِيْدًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَاِيَّاكُمْ وَالْاُمُوْرَ الْمُحْدَثَاتِ فَاِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ"

ترجمہ اگلی حدیث کے تحت آرہا ہے۔

ذرف، (ض) بہنا، وَجِل، (س) وجلاً، موجلاً ڈرنا گھبرانا: کقوله تعالٰی "لا توجل انا نبشرك بغلام عليم عَضَّ" (س) عضًا وعضيضًا، دانت سے پکڑنا: "کقوله تعالٰی یوم یعض الظالم علی یدیه، ودَّع یودع تودیع" رخصت کرنا مُودِع ملاعلی قاری علامہ سندھی اور مولانا خلیل احمد سہارن پوری نے اسے دال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے: علامہ سندھی نے اس کے معنی یہ لکھے ہیں: "اسم فاعل من اَودَعَ ای المبالغة تدل علٰی انك تودعنا فان المودع عند الوداع لایترك شیئًا مما یهتم به یعنی ایداع سے صیغہ مبالغہ کے لئے لایا گیا، معنی یہ ہوئے کہ: آپ ہم کو چھوڑ کر جارہے ہیں، تو چھوڑ کر جانے والا رخصتی کے وقت کسی بھی ایسی چیز کو نظر انداز نہیں کرتا، جو اہمیت کی حامل ہو، اس لئے فاعهد الینا ہمیں نصیحت کردیجئے: عَهِدَ، (س) عَهْدًا کا صلہ جب الٰی آئے گا، تو اس کے معنی نصیحت کرنا اور ذمہ داری سونپنے کے ہوں گے، حضرت گنگوہی کا کہنا ہے کہ: صحابہؓ نے رخصتی کا خیال اس لئے کیا کہ: "اذا جاء نصر اللّٰه" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حانت ساعة الفراق کے معنی کی تصریحات سامنے آئیں، جب کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ فرماتے ہیں، کہ اس خطبے کی عجیب وغریب تاثیر کو دیکھ کر صحابہؓ کو یہ خیال آیا اور انہوں نے نصیحت کی درخواست کی۔

علیکم یہ اسم فعل ہے، معنی ہیں الزموا بتقوی اللّٰه سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی میں اُوصیکم بتقوی اللّٰه ہے، یعنی مامورات پر عمل اور منہیات سے بچنا ہی تقوی کی اصل ہے:

"والسمع والطاعة" یہ حکم خلفاء اور امراء سے متعلق ہے: مالم یأمر بالمعصیة فلا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق وان عبدًا حبشیًا" ابوداؤد وترمذی میں: "وان کان عبدا حبشیًا" مروی ہے، بذل المجہود (۵/۱۹۰) میں خطابی کا قول منقول ہے کہ: اس کا یہ مطلب نہیں کہ: امام کو حبشی غلام ہونا چاہئے، بلکہ یہ والی وامیر کی اطاعت کی تاکید ہے، خواہ وہ کیسا ہی ہو، جیسا کہ: "من بنی للّٰہ مسجدًا کمفحص قطاةٍ" میں حقیقتاً وہ گڑھا مراد نہیں جو سنگ خوار نے انڈے دینے کے لئے بنایا ہو، بلکہ یہ تعمیر مسجد کی ترغیب ہے، خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی ہو۔

﴿وسترون من بعدی اختلافًا شدیدًا﴾ ابوداؤد اور ترمذی میں شدیداً کے بجائے، کثیراً ہے، مجددی انجاح الحاجہ میں لکھتے ہیں قد وقع کما قال علیه السلام اِختلافٌ کثیرٌ بینَ الصَّحابَةِ وَکذٰلكَ الحُروبُ الواقعةُ بَینَهُم بِسبَبِ اِختلافِهِم کحربِ الجَمَلِ والصِفّین وغَیرِهمَا وکذٰلك حروبُ الخَوارِجِ والروافِضِ فی زَمنِهم ملاعلی قاری نے مرقات المفاتیح (کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة) فصل دوم میں اس جملہ پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: اس میں بدعت وھوی، بادشاہت کی خواہش وغیرہ کے ظہور کی طرف اشارہ ہے، جو فتنہ اور معاصی کا سبب بنتے ہیں۔

﴿فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین﴾ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شفقت وترحم کے طور پر اپنی امت کو آگاہ کیا اور نجات کا طریقہ بتلاتے ہوئے فرمایا کہ: تم میری اور خلفاء راشدین کی سنت کی پیروی کرنا، اس سے کون لوگ مراد ہیں، باب کے تحت اس پر روشنی ڈالی جاچکی ہے۔

اطاعت امیر

امیر کی اطاعت واجب ہے، اور مخصوص حالات کو چھوڑ کر اس سے خروج کسی صورت جائز نہیں اس سلسلے میں جو روایات آئی ہیں، ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تک امام وقت نماز وغیرہ کا پابند ہو اس کا نظام کفر کے لئے خطرہ اور مسلمانوں کے لئے سائبان کی حیثیت رکھتا ہو، اس وقت تک بغاوت جائز نہیں چاہے وہ فاسق وفاجر ہی کیوں نہ ہو، ہاں وہ علانیہ اگر اسلام دشمنی پر اتر آئے اور یہود ونصاریٰ کے مفادات کا تحفظ کرنے لگے، تو اس صورت میں اسے

معزول کرنا ضروری ہوگا، عبد حبشی یقیناً اطاعت کی تاکید ہے، لیکن تاریخ میں وہ امر واقعہ بھی ہے، چنانچہ حضرت ابوذر غفاری جب خلیفہ ثالث کے حکم پر ربذہ پہنچے تو وہاں کا امیر ایک حبشی ہی تھا، جب نماز کا وقت آیا، تو اس نے امامت کے لئے، حضرت ہی کو بڑھانا چاہا، لیکن آپ نے اسی قسم کی روایات پر عمل کرتے ہوئے باصرار اس کے پیچھے نماز پڑھی:

﴿عضوا عليها بالنواجذ﴾ یہ ناجذ کی جمع ہے، معنی ڈاڑھ، ابوداؤد میں اس سے پہلے: "تمسکو ا بها" کا بھی جملہ ہے، ملا علی قاری نے اس کے معنی یہ لکھے ہیں: "والعض كناية عن شدة ملازمة السنة والتمسك بها" علامہ سندھی کہتے ہیں: "اراد به الجدّ في لزوم السنة" دونوں کے اقوال کا خلاصہ یہ نکلا کہ یہ جملہ سنت کو مضبوطی سے پکڑنے کی تعبیر ہے۔

﴿وایاکم والا مور المحدثات﴾ ملا علی قاری فرماتے ہیں: "ای احذروا عن الامور التی احدثت علٰی خلاف اصلٍ من اصول الدین واتقوا احداثها" اس کی مزید تفصیل کیلئے باب اجتناب البدع والجدل ملاحظہ ہو، حدیث سنن ابی داؤد (سنۃ/٦) جامع ترمذی (علم/١٦) مستدرك حاكم (١/٩٧) اور دارمی میں بھی آئی ہے، نیز ابن ماجہ میں بھی اس کی سند صحیح ہے، بس ولید بن مسلم ایک راوی مدلس ہیں، ان کے بارے میں محدثین کے قول کا خلاصہ یہ ہے کہ: اگر وہ ابن جریج اور اوزاعی سے روایت کریں تو اعتماد نہ کیا جائے گا۔

(۲/۴۳) حَدَّثَنَا اِسْمَاعِيْلُ بْنُ بِشْرِ بْنِ مَنْصُوْرٍ وَاِسْحَاقُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ السَّوَّاقُ قَالاَ ثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنِ مَهْدِيِّ عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ صَالِحٍ عَنْ ضَمْرَةَ بْنِ حَبِيْبٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَمْرٍو السُّلَمِيِّ اَنَّهُ سَمِعَ العِرْبَاضَ بْنَ سَارِيَةَ يَقُوْلُ وَعَظَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَوْعِظَةً ذَرَفَتْ مِنْهَا العُيُوْنُ وَوَجِلَتْ مِنْهَا القُلُوْبُ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ هٰذِهِ لَمَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَمَاذَا تَعْهَدُ اِلَيْنَا قَالَ قَدْ تَرَكْتُكُمْ عَلَى الْبَيْضَاءِ لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا لاَيَزِيْغُ عَنْهَا بَعْدِىْ اِلاَّ هَالِكٌ مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ فَسَيَرٰى اخْتِلاَفًا كَثِيْرًا فَعَلَيْكُمْ بِمَا عَرَفْتُمْ مِنْ سُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَعَلَيْكُمْ بِالطَّاعَةِ وَاِنْ عَبْدًا حَبَشِيًّا

فَإِنَّمَا الْمُؤْمِنُ كَالْجَمَلِ الْأَنِفِ حَيْثُمَا قِيدَ انْقَادَ.

عرباض ابن ساریہ فرماتے ہیں کہ: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ایسا پر اثر وعظ فرمایا کہ آنکھیں بہنے لگیں اور دل دہل گیا، ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ وعظ تو الوداع کہنے والے کی نصیحت سا ہے، تو آپ ﷺ (جدائیگی کے وقت) ہم سے کیا عہد لیتے ہیں، آپؐ نے فرمایا میں نے تم کو ایک روشن ماحول میں چھوڑا جس کی رات بھی اس کے دن کی طرح روشن ہے، (اس روشن شاہراہ) سے اب صرف ہلاک ہونے والا ہی بھٹکے گا، نیز میرے بعد تم میں جو بھی زندہ رہے گا، وہ عنقریب بہت اختلافات دیکھے گا، تو (انتشار اور فتنے کے وقت) تم پر لازم ہے کہ: تم میرے خلفاء راشدین کے معروف طریقے کو دانتوں سے پکڑ لینا نیز (امیر کی) اطاعت کرنا چاہئے، وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ مومن نکیل والے اونٹ کی طرح ہے، اس کو جدھر ہانک دیا جائے، (اونٹ کی طرح) چل پڑتا ہے۔

﴿قد تركتكم على مثل البيضاء﴾ علامہ سندھیؒ نے سنن مصطفیٰ میں اس کی شرح ان الفاظ سے کی ہے: "اى: الملةُ والحجةُ الواضحةُ التى لا تَقبَلُ الشُبهَ أصلاً فصار حالُ ايرادِ الشُبَهِ عليها كحَالِ الشُّبَهِ عنها ودَفعَها اليه الاشارةُ بقوله ليلها كنهارها" یعنی اسلام ایسا دین اور واضح حجت ہے، جس میں بنیادی طور پر ٹیڑھ اور شبہ کی گنجائش نہیں اور "ليلها كنهارها" کی مزید تشریح کے لئے حدیث نمبر (۵) کا مطالعہ کیجئے، وہاں اس پر ہم نے مفصل بحث کی ہے:

﴿من يعش﴾ من شرطیہ ہونے کی وجہ سے يعيش حالت جزم میں ہے، اور اجتماع ساکنین کے باعث یاء ساقط ہوگئی: "فسيرى اختلافًا كثيرًا" فاء جزاء کے طور پر ہے، شرح گزر چکی ہے۔

﴿كالجمل الأنف﴾ یہاں دو لغتیں ہیں: "أنِفٌ اور انِفُ" یعنی وہ اونٹ جس کے لگام ڈال دی گئی ہو، علامہ سندھیؒ نے پہلی لغت کو فصیح اور اصح قرار دیا ہے، تو انہی کے الفاظ میں شان المومن ترك التكبر والتزام التواضع " یعنی تواضع اور کبر سے دوری مومن کی شان ہے، اور وہ بالکل مطیع اونٹ کی طرح ہے: "الذى جعل الزمام فى انفه فيجره من يشاء

من صغیر او کبیر الی حیث یشاء" یعنی لگام ڈالنے والا خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اسے کسی بھی سمت میں ہانک دیتا ہے۔

﴿حیثما قید﴾ حیثما ظرفیہ متضمن شرط ہے، قِیْدَ قَادَ سے فعل مجہول کا صیغہ اور پھر جملہ بن کر شرط ہے، اِنقاد بمعنی چل پڑنا، ترکیب میں جزاء واقع ہے، حدیث کی سند کو الدیباجہ (۱/۲۱۸) میں صحیح لغیرہ قرار دیا گیا ہے، لیکن ایک راوی اسماعیل بن بشر پر قدری ہونے کا الزام ہے۔

(۴۴/۳) حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ حَكِيْمٍ ثَنَا عَبْدُ الْمَلِكِ بْنُ الصَّبَاحِ الْمِسْمَعِيُّ ثَنَا ثَوْرُ بْنُ يَزِيْدَ عَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ الصُّبْحِ ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَوَعَظَنَا مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً فَذَكَرَ نَحْوَهُ.

سند کو الدیباجہ (۱/۲۲۱) میں صحیح لغیرہ کہا گیا ہے، دوسری حدیث کی طرح اس کا بھی ایک راوی ثور بن یزید صدوق، وثقہ ہونے کے باوجود قدر کا عقیدہ رکھتا ہے۔

بَابُ اِجْتِنَابِ الْبِدَعِ وَالْجَدَلِ

بدعت کا لغوی مفہوم

بدعت کے لغوی معنی انوکھی چیز کے ہیں، جس کی تعریف علامہ مجدالدین فیروز آبادی (م ۸۱۶) نے قاموس (۴/۲) میں الحدث فی الدین بعد الاکمال سے کی ہے، عبدالقادر رازی نے بھی مختار الصحاح (۲۰۰) میں یہی الفاظ لکھے ہیں، جب کہ ابن منظور افریقی نے لسان العرب (۶/۸) میں اس کو البدعة الحدث وما ابتدع من الدین بعد الاکمال سے تعبیر سے کیا ہے اس کے علاوہ امام راغب اصفہانی (م ۵۰۳) امام لغت ناصر بن عبد السید (م ۶۱۶) اور زبیدی سے (م ۱۲۰۵) بھی بدعت کی تعریف میں کم وبیش یہی الفاظ منقول ہیں۔

اصطلاحی مفہوم

یہ بدعت کا لغوی مفہوم تھا، اب رہا اس کا شرعی مطلب تو اس کی اصل صحیح بخاری

(۳۷۱/۱) صحیح مسلم (۷۷/۲) میں منقول حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے: "من احدث فی امرنا هذا مالیس منه فهو ردّ" محدثین کی تعریفات اسی سے ماخوذ ہیں، چنانچہ اس کی بابت ابن رجب حنبلی نے جامع العلوم والحکم (۱۹۳) میں: "المراد بالبدعة ما أحدث مما لا اصل له فی الشریعة یدل علیه علامہ عینی نے عمدۃ القاری (۳۵۶/۵) میں البدعة فی الاصل احداث امرلم یکن فی زمن رسول الله صلی الله علیه وسلم" اورحافظ ابن حجر نے فتح الباری (۲۱۹/۴) میں: "البدعة اصلها ماأحدث علی غیر مثال سابق وتطلق فی الشرع فی مقابل السنة فتکون مذمومةً" کے الفاظ نقل کئے ہیں، حضرت کشمیریؒ نے فیض الباری (۲۲۷/۳) میں اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے: "البدعة عندی کل شئ حدث بعد القرون الثلثة المشهود لها بالخیر لشبهة لا لعنادٍ وکانت متلبسة بالشریعة" شیخ الاسلام علامہ عثمانی نے فتح الملہم میں اسے اور پھیلایا ہے، لکھتے ہیں: "ان البدعة الشرعیة هو احداث امر لیس له ثبوت بواحدٍ من الاصول الاربعة الدینیة زاعمًا انه من الدین ومظنة للاثابة من الله والتحسین" ان تمام تعریفات کا خلاصہ یہ ہوگا، کہ ہر وہ طریقہ بدعت ہے۔

۱ جو رسول اللہ ﷺ سے قولاً، فعلاً، دلالۃً اور اشارۃً ثابت نہ ہو۔ ۲ عہد صحابہ اور خیرالقرون میں اس کا پتہ نہ ہو۔ ۳ اس کو دینی امر اور کارثواب سمجھ کر اختیار کیا جائے۔ ۴ یہ کمی اور زیادتی اصل دین میں ہو اور اس کا تعلق ذرائع ووسائل سے نہ ہو۔

بدعت کی حقیقت

قرآن وحدیث سے پتہ چلتا ہے کہ: گزشتہ ادیان صرف دو وجہ سے مٹے ہیں، ۱ کتمان حق، ۲ تلبیس وتحریف یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، کتمان کا مقصد تحریف اور تحریف کی بنیاد کتمان ہوتا ہے، شریعت محمدیؐ دنیا کی آخری شریعت ہے، اس لئے اس کی حفاظت کی باری تعالیٰ نے خود ذمہ داری لی اور ان تمام چور راستوں کو بند کردیا جو کتمان وتحریف کی طرف مڑتے ہیں، پہلی چیز کو روکنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علوم ونبوت کی نشرواشاعت، دعوت وتبلیغ کی ترغیب دی اور کتمان حق کی بابت شدید

وعید سنائی جب کہ: دوسرے کے سلسلے میں افتراء علی اللہ اور افتراء علی الرسول کو سب سے بڑا جرم اور دوزخ کا یقینی سبب بتایا بدعت بھی اسی دوسری شق کی ایک قسم ہے، جس کی بابت شریعت نے سخت احکام دیئے ہیں، صحیح مسلم (۲۸۵/۱) کی روایت ہے: "شرا لامور محدثاتها و كل بدعة ضلالة" سنن نسائی (۱۷/۱) میں مزید اضافہ ہے: "و كل ضلالة فی النار" اس طرح رسول اللہ نے اصولی ہدایت دیتے ہوئے فرمایا: "من احدث فی أمرنا هذا مالیس منه فهورد"، بعض روایت میں فی أمرنا کی جگہ فی دیننا کا لفظ ہے، جو اس کی صحیح تفسیر ہے اور علماء اعلام نے بھی اس کے یہی معنی بیان کئے ہیں چنانچہ حافظ بن حجر نے فتح الباری، (۳۲۱/۵) میں: "والمراد امر الدین" علامہ عزیزی نے السراج المنیر (۳۲۰/۳) میں فی أمرنا هذا أی فی دین الاسلام مولانا خلیل احمد سہارن پوری نے بذل المجہود (۱۹۵/۵) میں والمراد به الدین اور شیخ الاسلام علامہ عثمانی نے فتح الملہم (۴۰۷/۲) میں: "والمراد بالامر، الدین" کے الفاظ لکھے ہیں، اس لئے اہل بدعت کا دنیاوی امور کی بدعات کو پیش کر کے دینی بدعات کو جائز قرار دینا سراسر غلط ہے، یہ روک ٹوک دین میں ہے، دنیا کے معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اسی طرح ما لیس منه سے ان کا وہ عقائد واعمال مراد لینا جو دین کے خلاف ہوں اور ان نئی چیزوں کو جائز کہنا جو دین کے حق میں ہوں، محض ایک مغالطہ ہے، رسول اللہؐ نے مخالف وموافق علی الاطلاق دین میں اضافے کو مردود قرار دیا ہے، بدعت کی حرمت وقباحت کا اندازہ صحیح بخاری (۱۰۸۴/۲) اور صحیح مسلم (۴۴۲/۱) کی اس حدیث سے بھی ہوتا ہے فرمایا: "المدینة حرام ما بین عیر الی ثور فمن أحدث فیها حدثا اواوی محدثا فعلیه لعنة الله والملائكة والناس اجمعین لا یقبل فیه صرف ولا عدل" نیز مجمع الزوائد (۱۸۹/۱۰) میں حضرت انس کی یہ روایت بھی ملتی ہے کہ: رسول اللہ نے فرمایا: "ان الله حجب التوبة عن كل صاحب بدعة" اسی لئے ہم صحابہؓ کو دیکھتے ہیں، تو بدعت کے سلسلے میں بڑے حساس اور غیور واقع ہوئے تھے، سنن ابی داؤد (۲۷۸/۲) میں منقول ہے کہ: ایک شخص نے آکر ابن عمر کو کسی کا سلام پہنچایا تو انہوں نے جواباً ارشاد فرمایا: "بلغنی أنه قد احدث فان كان قد احدث فلا تقرءه منی السلام"، مجھے معلوم ہوا

ہے کہ اس نے بدعت کا ارتکاب کیا ہے تو اگر یہ صحیح ہے تو تم اس سے میرا اسلام مت کہنا۔

بدعت سنت کی ضد ہے، اس لئے اس کا ایک نقصان تو یہ ہے کہ: سنت کمزور پڑ جاتی ہے، جیسا کہ مسند احمد (۴/۱۰۵) کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**ما احدث قوم بدعۃً الا رفع مثلها من السنة**" دوسرا نقصان یہ ہے کہ: اس سے جھگڑے فساد بلکہ جنگ وجدال کا بازار گرم ہو جاتا ہے، جیسے کہ: جامع ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت ہے: "**ماضل قوم بعد هدى كانوا عليه الا وأوتو الجدل**" اسی طرح بدعت کے باعث نور و برکت سلب ہو جاتی ہے، اور تحریف و تلبیس کا مزاج بننے لگتا ہے۔

بدعت کی تقسیم

بعض حضرات نے اعراب القرآن، دینی کتب کی تالیف وطباعت، اقامت مدارس، تدوین فنون، ماکولات ومشروبات کا تنوع اور زندگی کے جدید وسائل وسہولتوں کی بنا پر بدعت کو حسنہ اور سیئہ میں تقسیم کیا ہے، کیونکہ یہ چیزیں عہد رسالت میں موجود نہیں تھیں، لیکن کسی کے نزدیک بھی وہ ممنوع نہیں، اس لئے یہ بدعت حسنہ ہیں، جس پر "**كل بدعة ضلالة**" کا اطلاق نہیں ہوتا، ساتویں صدی ہجری کے شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلامؒ سے غالباً یہ توجیہ شروع ہوئی اور بعد کی صدیوں میں پھر اچھی خاصی تعداد ان کی ہمنوا رہی، لیکن علماء محققین نے اس کو کبھی تسلیم نہیں کیا، کیونکہ اعراب القرآن، تالیف کتب، اقامت مدارس اور تدوین فنون تو بایں معنی بدعت نہیں کہ: اب تلاوت اور دین کا فہم وعمل انہیں پر موقوف ہے، اس لئے وہ شرعاً اس طرح مطلوب ومحمود ہو گئیں، جس طرح کہ وضو کے لئے پانی کی تلاش پھر یہ کہ ان کے ذریعہ فی نفسہٖ دین کے اندر کوئی اضافہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ متن کی الگ سے شرح معلوم ہوتی ہیں، اب رہیں زندگی کی دوسری راحتیں اور وسائل تو وہ بدعت کے دائرے ہی میں نہیں آتے کیونکہ وہ خالص دنیوی چیزیں ہیں، جب کہ بدعت سے مراد ہر نئی چیز نہیں، بلکہ صرف وہ عقیدہ اور عمل ہے، جس کو نفس دین میں شامل کیا جائے اور اسے عبادت قرار دے کر اجر وثواب اور رضائے الٰہی کا ذریعہ سمجھا جائے، حالانکہ قرآن وحدیث، عمل صحابہؓ، اجماع امت اور مستند ومعتبر اجتہاد میں اس کی کوئی بنیاد نہ ہو۔

ایمان وکفر، صلوٰۃ زکوٰۃ، حج وصیام اور جہاد کی طرح بدعت بھی ایک خالص دینی اصطلاح ہے، جو سنت کی ضد ہونے کی بنا پر مطلقاً گمراہی ہے، جس طرح کفر کی کوئی تقسیم نہیں، اسی طرح بدعت کو حسنہ نہیں کہا جا سکتا، بعض حضرات نے صحیح مسلم کی روایت: "من سن سنة حسنة فله اجرها و اجر من عمل بها" الخ سے استدلال کیا ہے، جو بالکل غلط ہے، کیونکہ یہاں کسی نئے طریقے کا اختراع نہیں، بلکہ مشروع ومسنون طریقے کو رواج وفروغ دینا ہے، اس لئے تقسیم کی بابت اسے دلیل بنانا درست نہیں، ہمیں دین کی حفاظت کے لئے بدعت حسنہ کا سد باب کرنا ہی ہوگا ورنہ اہل باطل اس کا نعمت غیر مترقبہ کی طرح استعمال کرتے ہی رہیں گے، علامہ شاطبی نے اپنی کتاب الاعتصام میں اور علامہ شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم میں انہیں خیالات کا اظہار کر کے تقسیم کی پرزور تردید کی ہے مجدد الف ثانی نے اپنے مکتوبات تجلیات ربانی میں بھی تقسیم کو مسترد کر کے بدعت حسنہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

﴿جدل﴾ کے لغوی معنی سخت جھگڑا کرنے کے ہیں، اگر یہ حق کے لئے ہو، تو مطلوب ومحمود اور باطل کے لئے ہو تو مردود ومذموم ہے، قرآن میں دونوں کی مثالیں موجود ہیں: "ولاتجادلوا اهل الكتاب الا بالتی هی احسن" وجادلهم بالتی هی احسن، ما يجادل فی آيات الله الا الذين كفروا" لیکن امام ابن ماجہ کی مراد جدل کا منفی پہلو ہے، جو بدعت کا طبعی نتیجہ ہے۔

(۱/۴۵) حَدَّثَنَا سُوَيْدُ بْنُ سَعِيْدٍ، وَاَحْمَدُ بْنُ ثَابِتٍ الْجَحْدَرِيُّ، قَالاَ: ثَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ الثَّقَفِيُّ، عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ، قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا خَطَبَ اِحْمَرَّتْ عَيْنَاهُ، وَعَلاَ صَوْتُهُ وَاشْتَدَّ غَضَبُهُ كَأَنَّهُ مُنْذِرُ جَيْشٍ يَقُوْلُ صَبَّحَكُمْ مَسَّاكُمْ وَيَقُوْلُ: بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ" وَيَقْرِنُ بَيْنَ اِصْبَعَيْهِ السَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰى، ثُمَّ يَقُوْلُ: "أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّ خَيْرَ الْأُمُوْرِ كِتَابُ اللّٰهِ، وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ، وَشَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا، وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ" وَكَانَ يَقُوْلُ: "مَنْ تَرَكَ مَالاً فَلِأَهْلِهِ، وَمَنْ تَرَكَ دِيْنًا اَوْضَيَاعًا

فَعَلَیَّ وَاِلَیَّ"

حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تقریر فرماتے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں، آواز بلند ہو جاتی اور جوش اتنا بڑھ جاتا گویا کہ: آپ لشکر کو ڈرانے والے ہوں کہ دشمن صبح یا شام دھمکنے والا ہے پھر فرماتے کہ: مجھے اور قیامت کو اس طرح ساتھ ساتھ مبعوث کیا گیا ہے، پھر اپنی سبابہ اور وسطی کو ملا دیتے پھر اما بعد کہنے کے بعد ارشاد فرماتے کہ: بہترین کلام کلام اللہ اور سب سے عمدہ عملی نمونہ محمد کی سیرت ہے، اور بدترین چیز دین میں، نئی بات پیدا کرنا ہے، ہر بدعت گمراہی ہے اور فرماتے کہ: جس نے مال چھوڑا تو وارث اس کے اہل وعیال ہوں گے اور جس نے قرض یا لاوارث بچے چھوڑے اس کی ادائیگی اور بچوں کی نگہداشت میرے ذمہ ہے۔

﴿اذا خطب احمرت عيناه﴾ نسائی میں وجنتاه منقول ہے، جس کے معنی عالی الخد رخسار کے اوپری حصہ کے ہیں، اِحمرار افعلال سے آتا ہے، معنی سرخ ہونا، گویا خطبہ کے وقت آپ کی آنکھیں اور رخسار دونوں سرخ ہو جاتے تھے۔

﴿وعلا صوته واشتد غضبه﴾ علا علوًا نصر سے آتا ہے، معنی بلند ہونا، اشتد افتعال کا وزن ہے، تیز ہونا، سخت ہونا، بڑھ جانا، دوران تقریر جوش کا بڑھ کر آواز کا بلند ہو جانا اور آنکھوں کے ساتھ چہرے کا سرخ ہو جانا دراصل ایسی کیفیت تھی جس کے تین محرک تھے، ایک طرف قیامت کے ہولناک مناظر، محشر کا پگھلا دینے والا دن اور جہنم کا کلیجہ پھاڑ دینے والا عذاب تو دوسری جانب لوگوں کی نہ ٹوٹنے والی نیند، نجات وآخرت کی بابت سوز وکرب کی کمی اور حد درجہ غفلت وتساہل کا مظاہرہ، تیسری سمت: "لعلك باخع نفسك ان لا يكونوا مؤمنين" کا عمومی اور "وبالمؤمنين رؤف رحيم" کا خصوصی نبوی مزاج، انہیں کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت ہوتی تھی، اپنے نونہالوں کو ہلاکت سے بچانے کے لئے کوئی ماں جس طرح کرب واضطراب سے تڑپ اٹھتی ہے، نبیؐ اپنی امت کو اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ تباہی سے بچانا چاہتا ہے، اس لئے آپ کے اسلوب، کیفیت اور آواز ہر چیز سے اسی درد دل کا ظہور ہوتا تھا، پھر یہ انداز خاص خاص موقع ہی پر ہوتا تھا، ہمیشہ نہیں امام نووی

نے لکھا ہے: ”ولعل اشتد ادغضبه كان عند انذاره امرًا عظيما وتحذيره خطبًا جسيمًا[1]“ کہ: آپ کے جوش کی یہ شدت اسی وقت ہوتی تھی، جب آپ کسی امر عظیم سے ڈراتے یا بڑے خطرے سے آگاہ کرتے نووی مزید فرماتے ہیں کہ اسی حدیث کی بنیاد پر مقرر کے لئے یہ مستحب سمجھا گیا کہ وہ ترغیب وترہیب کے جس ماحول میں گفتگو کررہا ہو، اسی کے مطابق اس کا اسلوب فصیح، آواز بلند اور تقریر میں عظمت ہو: ”يستدل به على انه يستحب للخطيب ان يفخم امر الخطبة ويرفع صوته ويجزل كلامه ويكون مطابقًا للفصل الذى يتكلم فيه من ترغيب او ترهيب[2]“

﴿كأنه منذر جيش﴾ علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے: ”هو الذى يجئ مخبرًا للقوم بما قددهمهم من عدو اوغيره“ یہ اس شخص کو کہتے ہیں، جو قوم کے پاس اس دشمن یا مصیبت کی خبر لاتا ہے، جو ان پر اچانک آدھمکی ہو، تو گویا جس سرعت واضطراب کے ساتھ یہ شخص قوم کو جگاتا ہے، مبادا بے خبری میں وہ دشمن کا لقمہ نہ بن جائے، اس طرح رسول بھی انسانوں کو اس شدت سے جھنجھوڑتا ہے، تاکہ عذاب وقیامت سے پہلے ہی وہ سنبھل جائیں اور ان کا کم سے کم نقصان ہو۔

﴿يقول صبّحكم مسّاكم﴾ یہ پورا جملہ منذر کی صفت واقع ہے، اور یقول کی ضمیر بھی منذر ہی کی طرف لوٹتی ہے صبّح کے معنی تخفیف کے ساتھ بھی صبح کو آنا ہے لیکن تفعیل کے باب میں پہنچ کر زیادتی لفظ زیادتی معنی کو مستلزم ہوگی، اب مطلب ہوگا، صبح کو اچانک دشمن تم پر یلغار کردے گا، یہی حال ”مساكم“ کا بھی ہے اور ماضی کا صیغہ علامہ سندھی کے بقول ثبوت ویقین کے لئے ہے: ”صيغة الماضى للتحقق“ تصبيح اور تمسيئ کی ضمیر فاعلی ”هو“ کا مرجع خود نبی بھی ہو سکتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک سندھیؒ کا یہ احتمال مرجوح ہے، راجح دشمن ہی ہے، جو عبارت میں ملحوظ ہے۔

﴿بعثت أنا والساعةَ كهاتين﴾ یہاں راجح قول کے مطابق واوٴ عاطفہ نہیں، بلکہ معیّہ ہے اور الساعة مفعول معہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، علامہ سندھیؒ نے ابوالبقاء کے

---

[1] [2] شرح مسلم كتاب الجمعه فصل فى الخطبة والصلوة قصدا (ج ۱، ص: ۲۸۵)

حوالہ سے لکھا ہے: ”لایجوز فیه الا النصب“ امام نووی کا بھی یہی رجحان ہے، فرماتے ہیں: ”المشهور نصبها علی المفعول معهٗ[1]“

﴿کهاتین﴾ علامہ سندھیؒ نے: ”مقترنین“ کی تاویل میں اس کو حال قرار دیا ہے، یہاں تشبیہ کی دو بنیادیں ہیں، مقارنت اور مقاربت پہلی کی تعریف قاضی عیاض نے: ”وانه لیس بینهما اصبع اخری کما أنه لا نبی بینه وبین الساعة“ اور علامہ سندھیؒ نے: ”لا واسطه بیننا من نبی“ سے کی ہے مولانا عبدالغنی مجددیؒ نے اس کی انجاح الحاجہ میں یوں وضاحت کی ہے۔ لان وجوده الشریف العلامةُ الاولٰی للسَّاعَةِ فبَعدَها علاماتٌ اُخَر ولیسَ بینَه وبینَ الساعَةِ اُمةٌ سوی اُمته فاذا هَلَكَ اُمتُه قَامت القِیامةُ .

رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس خود قیامت کی پہلی علامت ہے اس کے بعد دوسری نشانیاں ظہور پذیر ہوں گی، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ: رسول اللہ ﷺ سے قیامت تک نہ کوئی نبی ہوگا، اور نہ کوئی امت پیدا ہوگی اور جب امت محمدیہ اپنا وقت پورا کر چکے گی، تو اسی دن قیامت آجائے گی۔

دوسری کے معنی قاضی عیاض نے: ”انه للتقریب مابینهما من المدة وان التفاوت بینهما کنسبة التفاوت بین الاصبعین تقریبا لا تحدیدًا “بیان کئے ہیں، یعنی حدیث میں نبی آخر الزماں اور قیامت کے قرب کو سمجھایا ہے کہ: ان دونوں انگلیوں کے درمیان جس قدر کم فاصلہ ہے، تقریباً اتنا ہی بعثت محمدیؐ اور قیامت کے درمیان ہے، علامہ سندھیؒ نے اس مفہوم کو: ”المدة التی هی بینناقلیلة فوجه الشبه قلة ما بین راسی السبابة والوسطی من التفاوت“ سے تعبیر کیا ہے، مقارنت میں تو کوئی شبہ نہیں، جب کہ مقاربت بایں معنی صحیح ہے کہ کائنات کی پیدائش کو جدید تحقیق کے مطابق پانچ ارب سال ہو چکے ہیں، جن کے مقابلہ میں پندرہ صدیوں کی یہ مدت اتنی ہی کم ہے، جتنا کہ سبابہ اور وسطی کا فاصلہ، اس لئے یہاں بیک وقت دونوں معنی مراد ہیں۔

﴿ثم یقول﴾ اس کے بعد صحیح مسلم اور سنن نسائی میں: ”من یهده الله فلا مضل له

---

[1] مسلم (ج ۱ص ۲۸۴)

ومن يضلله فلا هادي له" بھی منقول ہے۔

﴿أما بعد﴾ اما حرف شرط اور بعد فعل محذوف کا ظرف ہونے کے بعد جملہ فعلیہ ہو کر شرط ہوا حمد وثنا کے بعد وہ اگلی عبارت میں فصل قائم کرتا ہے، اس کا استعمال کب سے شروع ہوا امام نووی نے اس کے جواب میں تین حضرات کی نشاندہی کی ہے، حضرت داؤد علیہ السلام، ابو العرب يعرب بن قحطان اور جاہلی خطیب وشاعر قس بن ساعدہ اب سنت محمدیہ ہونے کی وجہ سے تقریروں میں اس کا استعمال مستحب ہے، امام بخاری نے اپنی صحیح میں: "كتاب الجمعة باب من قال في الخطبه بعد الثناء اما بعد" کے تحت احادیث سے أما بعد کی چھ مثالیں پیش کی ہیں، اسی طرح امام ابوداؤد نے بھی كتاب الأدب میں: "الرجل يقول في خطبة أما بعد" کا باب قائم کیا ہے، دونوں کا مقصد استحباب کو ثابت کرتا ہے۔

﴿فان خير الامور كتاب الله﴾ صحیح مسلم میں: "فان خير الحديث كتاب الله" اور سنن نسائی میں: "إن أصدق الحديث كتاب الله" منقول ہے، جس کے معنی علامہ سندھیؒ نے: "اي خير مايتعلق به المتكلم او خير الأمور الموجودة بينكم" لکھے ہیں، یعنی رسول کی ذات سے متعلق سب سے بہتر چیز یا صحابہؓ اور امت کے درمیان موجود چیزوں میں سب سے عمدہ کتاب اللہ ہے، دونوں ہی معنی درست ہیں، رسول پر آسماں سے جو ہدایات نازل ہوئیں ان میں سب سے افضل قرآن ہے اور امت کو جو آپ کے علوم ملے ان میں بھی سب سے بالا اللہ کی کتاب ہے جس کو پکڑ کر ہم کبھی گمراہ نہیں ہو سکتے: "تركت فيكم أمرين لن تضلوا بعدي أبدا ما ان تمسكتم بهما كتاب الله وسنة رسوله"

﴿وخير الهدى هدى محمد﴾ مسلم کے بھی یہی الفاظ ہیں، جب کہ نسائی میں "وأحسن الهدى" مروی ہے: "هدًى" میں امام نوویؒ نے دو قرأتیں نقل کی ہیں، ۱۔ فتح الهاء واسكان الدال جس کے معنی امام ہروی نے طریق ومسلک کے لکھتے ہیں، ۲۔ ضم الهاء وفتح الدال حافظ نے فتح الباری میں اسی کو ترجیح دی ہے، امام نوویؒ نے علماء کے حوالہ سے اس کے دو معنی بتلائے ہیں، ایک تو الدلالة والارشاد یعنی کسی چیز کی نشاندہی ورہنمائی کرنا عموماً اس کی نسبت قرآن، انبیاء اور عباد اللہ کی طرف کی جاتی ہے: "ان هذا القرآن

يهدى للتى هى أقوم، وانك لتهدى الى صراط مستقيم" اور "هدىً للمتقين"
اسی کی مثال ہیں، نیز باری تعالیٰ کی طرف اس کی اضافت تو عام بات ہے دوسرا مفہوم امام نووی
نے: "اللطف، والتوفيق والعصمة، والتائيد" بتایا ہے اور یہ صرف باری تعالیٰ کے لئے
خاص ہے: "انك لا تهدى من أحببت ولكن الله يهدى من يشاء" اس کی مثال ہے،
اس قرأت کی بنیاد پر مطلب یہ ہوا کہ: آپ کی تعلیمات صراط مستقیم کو واضح کر کے اس کی جانب
سب سے اچھی رہنمائی کرتی ہیں، جب کہ پہلی قرأت کے مطابق معنی یہ ہوں گے کہ: سب سے
عمدہ سیرت اور جامع شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، جس میں ہر طبقہ اور انسان کی ہر کیفیت
کا مکمل حل موجود ہے، الغرض مال کے اعتبار سے نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے، اور دونوں قرأتوں میں
کوئی بہت زیادہ فرق نہیں علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں: "والمقصودُ أنَّ خيرَ الاديانِ دِينُهٗ"

﴿وشر الأمور محدثاتها﴾..... محدثہ کی جمع ہے، جس کے معنی وہ نو ایجاد چیز ہے، جو
کتاب وسنت اور اجماع امت میں اپنی کوئی بنیاد نہ رکھتی ہو، مشہور حدیث: "من احدث فی
أمرنا هذا ماليس منه" کا مصداق یہی ہے، جیسا کہ سندھیؒ لکھتے ہیں: "والمراد بها مالا
اصل له فى الدين مما احدث بعده صلى الله عليه وسلم" اس کے شر ہونے ہی کی
وجہ سے "فهو رد" کا حکم لگایا گیا۔

﴿وكل بدعة ضلالة﴾ سنن نسائی میں بالترتیب كل محدثة بدعة و كل بدعة
ضلالة و كل ضلالة فى النار مروی ہے، بدعت کی تعریف اور اس پر مفصل گفتگو باب کے
تحت گزر چکی ہے۔

﴿وكان يقول﴾ یہ آپ کا آخری عمل ہے، جب کہ پہلے طریقہ مختلف تھا، سنن نسائی
"كتاب الجنائز باب الصلوٰة على من عليه دين" میں حضرت ابو ہریرہؓ اور خود حضرت
جابر کی روایت موجود ہے کہ: قرض کی شدت کے پیش نظر آپ مدیون کی نماز جنازہ نہیں پڑھتے
تھے: "كان اذا توفى المؤمن وعليه دين فيسأل هل ترك لدينه من قضاء فان
قالوا نعم صلى عليه وان قالوا: لا قال صلوا على صاحبكم" لیکن جب اللہ نے
فتوحات کا دروازہ کھولا، تو آپ نے ایسے موقعوں پر مندرجہ ذیل اعلان فرمایا: "فلما فتح الله

علی رسوله صلی الله علیه وسلم قال الخ"

﴿من ترك مالاً فلأهله﴾ صحیح مسلم، سنن نسائی اور سنن ابی داؤد میں اس سے پہلے: "أنا اولی لكل مؤمن من نفسه" کا جملہ بھی منقول ہے، اور فلأهله میں اصحاب الفروض، عصبہ اور ذوی الأرحام وغیرہ تمام مستحقین آ جاتے ہیں۔

﴿ومن ترك دينًا او ضياعًا﴾ اس میں دو احتمال ہیں، ضاد کے کسرہ کے ساتھ ضائع کی جمع ہے، علامہ سندھیؒ نے اس کی دلیل میں جائع جمع جیاع کو پیش کیا ہے، دوسرا ضاد کے فتحہ کے ساتھ جو ضاعَ کا مصدر ہے، سندھیؒ اسی طرف مائل ہیں اور امام نوویؒ نے لکھا ہے: "من ترك أطفالاً وعيالاً ذوی ضياع فاوقع المصدر موضع الاسم" یعنی مصدر کو اسم کی جگہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ: وہ بچے اتنے چھوٹے ہیں، جو کفالت نہ ہونے کی وجہ سے عموماً ضائع ہو جاتے ہیں، امام ترمذی فرماتے ہیں: "ومعنى قوله من ترك ضياعا يعنى ضائعا ليس له شئ فالیّ يقول انا اعوله وانفق عليه[1]"

﴿فعلیّ والیّ﴾ علامہ سندھیؒ نے امام سیوطی کے حوالے سے لکھا ہے: "فيه لف ونشر مرتب" اس میں لف ونشر مرتب ہے: "فعلی راجع الی الدين" پہلے کا تعلق تو قرض سے ہے، کہ: اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہے: "والیّ راجع الی الضياع" اور دوسرے کا تعلق ضیاع سے ہے کہ: چھوٹے بچوں کی پرورش اور نگہداشت میری ہی ذمہ داری ہے۔

ترجمة الباب کل بدعة ضلاله ہے، کیونکہ بدعت سے بچنا عنوان کا تقاضہ ہے..... حدیث مسلم (جمعہ/۱۱) نسائی (عیدین/۲۳) ترمذی (فرائض/۱) ابوداؤد (خراج/۱۵) میں آئی ہے، امام کی سند صحیح ہے، ابن ماجہ نے اسے سوید بن سعید اور احمد بن ثابت جحدری سے لیا ہے، جب کہ امام مسلم محمد بن مثنی سے روایت کرتے ہیں آگے عبدالوہاب سے جابر بن عبداللہ تک دونوں کا سلسلہ یکساں ہیں۔

[1] جامع ترمذی ابواب الفرائض باب ما جاء فی من ترك مالا فلورثته

(۴۶/۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ مَيْمُوْنِ الْمَدَنِيُّ، اَبُوْ عُبَيْدٍ، ثَنَا أَبِيْ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جَعْفَرِ بْنِ أَبِيْ كَثِيْرٍ، عَنْ مُوسٰى بْنِ عُقْبَةَ، عَنْ أَبِيْ

اِسْحَاقَ عَنْ أَبِي الْأَحْوَصِ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "اِنَّمَا هُمَا اثْنَتَانِ: اَلْكَلَامُ وَالْهَدْيُ، فَاَحْسَنُ الْكَلَامِ كَلَامُ اللّٰهِ، وَاَحْسَنُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ، اَلَا وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ، فَاِنَّ شَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا، وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ، اَلَا لَا يَطُوْلَنَّ عَلَيْكُمُ الْاَمَدُ فَتَقْسُوَ قُلُوْبُكُمْ، اَلَا اِنَّ مَا هُوَ آتٍ قَرِيْبٌ، وَاِنَّمَا الْبَعِيْدُ مَالَيْسَ بِآتٍ، اَلَا اِنَّمَا الشَّقِيُّ مَنْ شَقِيَ فِيْ بَطْنِ أُمِّهٖ، وَالسَّعِيْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَيْرِهٖ: أَلَا اِنَّ قِتَالَ الْمُؤْمِنِ كُفْرٌ وَسِبَابُهٗ فُسُوْقٌ، وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَّهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ، أَلَا وَاِيَّاكُمْ وَالْكِذْبَ، فَاِنَّ الْكِذْبَ لَا يَصْلُحُ بِالْجِدِّ وَلَا بِالْهَزْلِ، وَلَا يَعِدُ الرَّجُلُ صَبِيَّهٗ ثُمَّ لَايَفِي لَهٗ، فَاِنَّ الْكِذْبَ يَهْدِيْ اِلَى الْفُجُوْرِ، وَاِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِيْ اِلَى النَّارِ، وَاِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ اِلَى الْبِرِّ، وَاِنَّ الْبِرَّ يَهْدِيْ اِلَى الْجَنَّةِ، وَاِنَّهٗ يُقَالُ لِلصَّادِقِ: صَدَقَ وَبَرَّ وَيُقَالُ لِلْكَاذِبِ: كَذَبَ وَفَجَرَ، أَلَا وَاِنَّ الْعَبْدَ يَكْذِبُ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا"

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "رشد وہدایت" بس دو ہیں، کلام پاک اور سیرت نبویؐ، سب سے بہتر کلام اللہ کا کلام ہے اور سب سے عمدہ سیرت محمدؐ کی سیرت ہے، خبردار محدثات سے پرہیز کرلو، کیوں کہ سب سے بدتر چیز محدثات ہیں، ہر محدث بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور سنو! دنیا کی آرزو دراز نہ ہوجائے، پھر تمہارے دل سخت ہوجائیں گے، یادرکھو! جس چیز کو آنا ہے، وہ قریب ہے، اور نہ آنے والی چیزیں ہی دور ہے، خبردار بدنصیب وہ ہے، جو ماں کے پیٹ ہی سے بدنصیب ہو اورخوش قسمت وہ ہے، جو دوسروں سے عبرت حاصل کرے، یادرکھو کہ: مومن سے لڑائی کفراور اس کو گالی دینا فسق ہے، کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ: وہ اپنے دوسرے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے رکھے، دیکھو! جھوٹ سے بچنا وہ سنجیدگی میں صحیح ہے نہ مذاق میں، اس لئے کوئی شخص اپنے بچہ سے بھی ایسا وعدہ نہ کرے جسے وہ پورا نہ کرتا ہو، جھوٹ فسق وفجور کی راہ پر

ڈالتا ہے اور فسق وفجور جہنم میں پہنچا دیتے ہیں اور صدق نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور نیکی انسان کو جنت تک پہنچا دیتی ہے، سچے کو سچا اور نیک کہا جاتا ہے اور جھوٹے کو کذاب وفاجر، یاد رکھو! (جب مسلسل) بندہ جھوٹ بولتا ہے، تو اسے اللہ کے یہاں بھی جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔

﴿انما هما اثنتان﴾ علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے کہ: هما ضمیر کلام اور ہدی کی تفسیر کرتی ہے، مطلب یہ ہوا کہ: کتاب وسنت ہی وہ دو بنیادیں ہیں، جن پر عمل کا انسان مکلّف ہے، تیسری کوئی چیز نہیں، ضمیر" (هما) مفسر بالكلام والهدى اى: انما الكتاب والسنة اللذان وقع التكليف بهما اثنتان لاثالث معهما" یہ نفی کی صورت تھی جب کہ دوسرا احتمال سندھی کے نزدیک نہی کا بھی ہے: "ويحتمل أن يكون المقصود النهى عن ضم المحدثات اليهما" جس کا مقصد قرآن وحدیث میں دوسری نئی چیزوں کولاحق کرنے سے روکنا ہے، اور اصولاً بس یہی دو چیزیں دین میں حجت ہیں، سندھیؒ کے نزدیک اثنتان کو مؤنث لانے کی وجہ بھی یہی ہے، لکھتے ہیں: "تانيث (اثنتان) نظرا الى انهما حجتان" فقہاء نے اجماع امت اور قیاس کو بھی حجت قرار دیا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ: وہ دونوں بھی قرآن وحدیث کی طرح کوئی مستقل بنیادیں ہیں، بلکہ پہلا تو دراصل نصوص کے مستند مفہوم کا عملی مظہر ہے جب کہ دوسرا منصوصات کی علت کو تلاش کر کے غیر منصوص امور پر نافذ کرنے کا نام ہے، تا کہ جواز وعدم جواز کا فیصلہ کیا جا سکے، تو گویا وہ دونوں بھی کتاب وسنت ہی کی ذیلی شاخیں ہیں الگ سے کوئی سانچہ نہیں۔

﴿الكلام الهدى فاحسن الكلام كلام الله و كل بدعة ضلالة﴾

اس حصے کی وضاحت باب کی پہلی حدیث کے تحت گذر چکی ہے۔

﴿الا لا يطولن عليكم الأمد فتقسو قلوبكم﴾ ألا حرف تنبیہ اور "لايطولن" نون تاکید سے فعل نہی غائب کا صیغہ ہے اور اس کے معنی غایت، انتہا، اور خواہش کے ہیں اور یہ ٹکڑا دراصل "ولا يكونوا كالذين اوتوا الكتاب من قبل فطال عليهم الأمد فقست قلوبهم" (حدید/۱۶) آیت کی تفسیر ہے، مجددی انجاح میں لکھتے ہیں اى لا يلقين الشيطان فى قلوبكم طول البقاء فتقسو قلوبكم اى تغلظ قلوبكم.

دنیا کی تحقیر کی وضاحت کر کے آخرت کی اہمیت وعظمت کو دلوں میں بٹھانا شریعت کا بنیادی مقصد ہے، قرآن وحدیث میں اسی لئے حرص کی بار بار مذمت کی گئی انبیا کرام اور خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نکتے کو مفصل اور موثر پیرائے میں بیان فرمایا ہے کہ: زندگی تو آخرت ہی کی ہے، دنیا محض دھوکہ کا سامان اور عارضی مسافر خانہ ہے، اس عقیدے میں ذرا سی غفلت سے خواہشات اور آرزوئیں سر اٹھانے لگتی ہیں اور انسان کی توجہات کو وہ آخرت سے موڑ کر دنیا پر مرکوز کر دیتی ہیں، نتیجہ دل کی سختی کی صورت میں نکلتا ہے، جس سے بخل، تکبر، حسد اور حب دنیا کی بیماریاں جنم لیتی ہیں، جو بسا اوقات: "کلا بل ران علیٰ قلوبهم" اور "ختم اللّٰہ علیٰ قلوبهم" کا سبب بن جاتی ہیں، زہد اور یقین وتوکل کی تعلیمات اسی کا تریاق ہے جیسا کہ: روایت ہے: "صلاح هٰذه الامة اليقين والزهد واول فسادها البخل والأمل"

﴿فتقسوا قلوبكم﴾ علامہ سندھی نے لکھا ہے کہ تقسوا جوابِ نہی ہونے کی بنا پر منصوب ہے، بالنصب علیٰ انه جواب النهى.

﴿الا إن ما هو ات قريب ، وانما البعيد ماليس بات﴾ یہ جملہ قربِ قیامت کی ایک موثر تعبیر ہے، آثار قیامت کا ظہور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہوتا ہے: "اقتربت الساعة وانشق القمر" اور نبوی تصریح: "بعثت انا والساعة کهاتين" کے بعد تو وہ گویا سر پر کھڑی معلوم ہوتی ہے، اس لئے اسے دور سمجھ کر حساب وکتاب سے بے پرواہ ہو جانا دانشمندی نہیں، جس کا آنا یقینی ہے، اس کو دور سمجھنا حد درجہ غفلت ہے، وہ قریب ہے گرچہ کچھ مہلت مل جائے، علامہ سندھی نے لکھا ہے: "تعليم وارشاد لما ينتفع بنهى طول الأمد" یہ امیدوں کی درازی سے بچنے کی ہدایت وتعلیم ہے۔

﴿الآ انما الشقى من شقى فى بطن امه﴾ یہاں دراصل دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے، سنن ابی داؤد وجامع ترمذی کی روایت ان میں ایک حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے: "قال عمر سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يسأل عنها فقال ان اللّٰه خلق آدم ثم مسح ظهره بيمينه فاستخرج منه ذرية فقال خلقت هولاء للجنة

وبعمل اهل الجنة يعملون ثم مسح ظهره فاستخرج منه ذرية فقال خلقت هؤلاء للنار وبعمل أهل النار يعملون[1]" یہ شقاوت کا پہلا نقش ہے جو صرف روح تک محدود تھا لیکن ہر انسان کی پیدائش تک وہ کس طرح جسم میں منتقل ہوتا ہے، بخاری و مسلم کی روایت اسی کا جواب ہے۔ کہ حمل کے چار مہینے کے بعد فرشتہ آتا ہے۔

ثُمَّ يَبْعَثُ اللّٰهُ اِلَيْهِ مَلَكاً بِاَرْبَعِ كَلِمَاتٍ فَيَكْتُبُ عَمَلَهٗ وَاَجَلَهٗ وَرِزْقَهٗ وَشَقِيٌّ اَوْسَعِيْدٌ ثُمَّ يَنْفخُ فِيْهِ الرُّوْحَ فَوَالَّذِيْ لَا اِلٰهَ غَيْرُهٗ اِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى مَايَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّاذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا جو اس کے عمل، عمر، رزق اور شقی یا سعید ہونے کو لکھتا ہے، پھر اس میں روح پھونک دیتا ہے، اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی خدا نہیں کہ: تم میں سے کوئی جنت کے عمل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس سے جنت کا فاصلہ صرف ایک قدم رہ جاتا ہے کہ: تقدیر غالب آتی ہے اور وہ دوزخیوں کے عمل کر کے جہنم میں جا گرتا ہے، عالم ازل میں جو شقاوت روحانی تھی وہ ماں کے پیٹ میں پہنچ کر جسمانی بن گئی حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے۔

﴿والسعيد من وعظ بغيره﴾ پہلے جملہ میں اخروی شقاوت کا تذکرہ تھا جب کہ یہاں ازلی سعادت کے دنیوی اثرات مراد ہیں کہ ماں کے پیٹ کا سعید دوسروں سے کس طرح عبرت و نصیحت حاصل کرتا ہے، "وُعِظَ" مجہول سے اللہ کی توفیق کی طرف اشارہ ہے کہ گناہوں کی بناء پر جب وہ دوسروں کو عذاب میں دیکھتا ہے تو سیئات کو اس خوف سے چھوڑ دیتا ہے، مبادا وہ بھی اس سزا کا شکار ہو جائے، سندھی کے یہی الفاظ ہیں: "من وفقه الله تعالٰى للاتعاظ فرأى ماجرى على غيره بالمعاصي من العقوبة فتركها خوفاً من ان يناله مثل مانال غيره" اسی نصیحت کیلئے قرآن میں گمراہوں کی تباہی کے واقعات مفصل بیان کئے گئے ہیں، انسانوں کی یہ قسم حدیث کے مطابق حضرت آدم کی داہنی پشت سے نکلی ہے۔

﴿الا ان قتال المؤمن كفر وسبابه فسق﴾ اس کی تفصیل کتاب الایمان کی چودہویں حدیث کے تحت آئے گی۔

﴿ولا يحل لمسلم أن يهجر اخاه فوق ثلاث﴾ یہ بحث باب تعظیم

الحدیث کی چھٹی روایت میں گذر چکی ہے۔

﴿الا وایاکم والکذب﴾ تقدیر عبارت: "احذرو وقوا انفسکم الکذب" ہے، یعنی محتاط ہو جاؤ اور اپنے آپ کو جھوٹ سے بچاؤ......... کذب، کفر ونفاق کا اثر، اور صدق ایمان وفطرت کا نتیجہ ہے، اس لئے پہلے کا قلع قمع کر کے انبیاء کرامؑ نے دوسرے کو فروغ دیا ہے، قرآن میں ہے: "واجتنبوا قول الزور" مسند احمد کی ایک روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چھ چیزوں پر جنت کی ضمانت لی ہے، ان میں ایک: "اصدقوا اذا حدثتم" ہے، ترمذی کی روایت میں تو یہاں تک منقول ہے کہ: "اذا کذب العبد تباعد عنه الملك میلا من نتن ماجاء به" یعنی جب بندہ جھوٹ بولتا ہے، تو فرشتہ اس کی بدبو سے ایک میل دور چلا جاتا ہے، ابوداؤد کی روایت میں اسی لئے جھوٹی گواہی کو شرک تک کہا گیا ہے: "عدلت شهادة الزور بالاشراك بالله" اس میں اتنی احتیاط کی گئی کہ: سنی سنائی باتوں کو بھی بلا تحقیق نقل کرنے والا شریعت کے نزدیک جھوٹا قرار دیا: "کفٰی بالمرأ کذبًا ان یحدث بکل ماسمع"

﴿فان الکذب لا یصلح بالجد﴾ اس قباحت کی بنا پر جھوٹ علی الاطلاق حرام ہے، جد کے معنی سنجیدگی کے ہے، یعنی سنجیدگی میں جھوٹ بولنا مسلمان کی شان نہیں، علامہ سندھیؒ لکھتے ہیں: "لایحل اولا یوافق شان المومن بالجدأی: بطریق الجد"

﴿ولا بالهزل﴾ ضرب سے آتا ہے، معنی ٹھٹھا کرنا، مذاق وبیہودگی کرنا جس طرح جھوٹ سنجیدگی میں حرام ہے، اسی طرح دل لگی میں بھی حرام ہے، ابوداؤد اور ترمذی کی روایت میں ایسے شخص کے لئے بھی وعید موجود ہے، جو محض ہنسانے کے لئے جھوٹ بولے: "ویل لمن یتحدث فیکذب لیضحك به القوم ویل له ویل له".

﴿ولا یعد الرجل صبیهٗ ثم لایفی له﴾ ولایعد فعل امر غائب ہے، اجتماع ساکنین کی وجہ سے یاء ساقط ہوگئی ہے، یفیٔ وفاءاً سے ہے، معنی عطا کرنا، پورا کرنا، کذب جلی کی وضاحت کے بعد یہ کذب خفی کی نشاندہی ہے، کہ بچے سے بھی ایسا وعدہ نہ کرو، جو پورا نہ کر سکو، عموماً اسے جھوٹ نہیں سمجھا جاتا، لیکن شریعت ہمیں اس سے بھی روکتی ہے، چنانچہ

ابواؤد میں (ادب/۸۲) ایک روایت اسی قبیل کی موجود ہے، فرماتے ہیں۔

قَالَ دَعَتْنِي أُمِّيْ يَوْمًا وَرسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم قَاعِدٌ فِي بَيْتِنَا فَقَالَتْ تعَالَ أُعْطِيْكَ فَقَالَ لَهَا رَسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلمَ مَا اَرَدْتِ أن تُعْطِيَهُ؟ قالت اَرَدْتُ اَنْ أُعْطِيَهُ تَمرًا فقال لها رسول الله صلى الله عليه وسلم اَمَا اَنْتِ لَوْلَمْ تُعْطِيْهِ شَيْئًا كُتِبَتْ عَلَيْكِ كِذْبَةٌ"

ایک دن جب کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے، میری والدہ نے مجھے پکارا اور کہا ادھر آ میں تجھے کچھ دونگی، رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا تم اس بچے کو کیا چیز دینا چاہتی ہو، انہوں نے عرض کیا میں اس کو ایک کھجور دینا چاہتی ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یادرکھو! اگر تم اس بچے کو کوئی چیز نہیں دیتیں تو تمہارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا۔

﴿وان الكذب يهدى الى الفجور﴾ فجور کے معنی امام نووی نے: "الميل عن الاستقامة وقيل الانبعاث في المعاصي" لکھے ہیں، یعنی راہ راست سے بھٹک کر معصیت پر ٹوٹ پڑنا سندھیؒ کا کہنا ہے: "لعل الكذب بخاصيته يفضي بالانسان الى القبائح" دونوں اقوال کا مشترک مفہوم یہ ہوا کہ: "کذب" فی نفسہ ایک خبیث خصلت ہے، جوانسان کے اندر فسق وفجور کا میلان پیدا کر کے اس کی پوری زندگی کو بدکاری کی زندگی بنادیتی ہے، اور وہ بالآخر جہنم تک پہنچ جاتا ہے۔

﴿وان الصدق يهدى الى البر﴾ امام نوویؒ نے بر کی تعریف. "البر اسم جامع للخير كله وقيل البر الجنة ويجوز ان يتناول العمل الصالح والجنة" کی ہے، سندھیؒ سے بھی تقریباً یہی منقول ہے، یعنی بر ایسا لفظ ہے، جو تمام نیک اعمال کا جامع ہے، اس کے بارے میں ایک قول جنت کا بھی ہے پھر اپنی جامعیت کی بنا پر وہ عمل صالح اور جنت کو بھی مشتمل ہوسکتا ہے، امام نوویؒ مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "قال العلماء معناه ان الصدق يهدى الى العمل الصالح الخالص من كل مذموم" مطلب یہ ہوا کہ صدق بذات خود بھی ایک عمدہ خصلت ہے اور اس کی خاصیت یہ بھی ہے، کہ وہ بے غبار اور خالص نیک عمل کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

﴿حتی یکتب عند اللہ کذابا﴾ امام نوویؒ نے لکھا ہے: ”ومعنی یکتب ھنا یحکم لہ بذلک ویستحق الوصف بمنزلۃ الصدیقین وثوابھم اوصفۃ الکذابین وعقابھم“ کتابت یہاں حکم کے معنی میں ہے، یعنی اس وصف کی بدولت وہ صدیقین کے مقام واجر تک کا مستحق ہوجاتا ہے: ”یا کذابین“ کی صفت اوران کی سزا کا، نوویؒ آگے لکھتے ہیں۔

”المراد اظھار ذالک للمخلوقین اما بان یکتبہ فی ذٰلک یشتھر بحظہ من الصفتین فی الملأ الاعلی واما بان یلقی ذلک فی قلوب الناس والسنتھم کما یوضع لہ القبول والبغضاء والافقدر اللّٰہ تعالیٰ وکتابہ السابق قد سبق بکل ذلک“

(مسلم، ج:۲، ص:۳۲۶، باب قبیح الکذب وحسن الصدق)

﴿یکتب﴾ سے مراد مخلوق کے سامنے اس کا اظہار ہے، یا تو اس طرح کہ باری تعالیٰ اس کو اس زمرے میں لکھ دے پھر وہ ملاء اعلیٰ میں صدق وکذب کی صفت کے ساتھ مشہور ہوجائے یا لوگوں کے دلوں اور زبانوں پر اس کی نامقبولیت کا القاء کردے محبوبیت اور عتاب کو اسی طرح دنیا میں اتارا جاتا ہے، کتابت کے یہی معنی ہیں، ورنہ کتابت تقدیر تو بہت پہلے واقع ہوچکی ہے۔

علامہ سندھیؒ نے فرمایا: ”الظاھر ان المراد کتابتہ فی دیوان الاعمال ویحتمل ان المراد اظھارہ بین الناس بوصف الکذب“ مطلب یہ ہوا کہ: جھوٹ کی عادت وتسلسل کذابیت کے درجے تک پہنچا کر انسان کو اتنا لعنتی بنادیتے ہیں کہ: اس کی نحوست دنیا والے بھی محسوس کرتے ہیں اور معاشرے میں اس کا مقام گرجاتا ہے، ترجمۃ الباب کل بدعۃ ضلالۃ ہے، کیونکہ اصل اجتناب تو بدعت ہی سے ہے، جدال تو اس میں تبعاً داخل ہے، اس لئے اس کا مذکور نہ ہونا مضر نہیں۔

حدیث باب دراصل وہ خطبہ ہے، جو آپ نے غزوہ تبوک میں دیا تھا، حدیث کی کتابوں میں اس کے مختلف ٹکڑے منقول ہیں، روایت باب کا آخری حصہ صحیح بخاری (الادب/۶۹) صحیح مسلم (البر/۲۸) ابوداؤد (ادب/۸۲) میں بھی مروی ہے، لیکن ابن ماجہ کی سند کمزور ہے، کیونکہ پہلے راوی محمد بن عبید کو ابن حجر نے تقریب (۶۱۲۱) میں صدوق یخطئی قرار دیا ہے،

جب کہ دوسرے راوی عبید بن میمون کی بابت تہذیب التہذیب (۶۹/۷) اور تہذیب الکمال (۸۹۶/۲) میں ابوحاتم سے مجھول ابن حبان سے "یروی المقاطیع" اور ابن حجر سے مستور کا تبصرہ منقول ہے، اس لئے بوصیری نے زوائد ابن ماجہ (۴۸/۱) میں بھی اسنادہ ضعیف لعبید بن میمون کا فیصلہ کیا ہے۔

(۴۷/۳) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ خَالِدِ بْنِ خِدَاشٍ ثَنَا اِسْمٰعِیْلُ بْنُ عُلَیَّةَ ثَنَا أَیُّوْبُ ح وَحَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ ثَابِتٍ الْجَحْدَرِیُّ وَیَحْیٰ بْنُ حَکِیْمٍ قَالاَ: ثَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ ثَنَا أَیُّوْبُ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِی مُلَیْکَةَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: تَلاَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هٰذِهِ الْاٰیَةَ هُوَ الَّذِیْ أَنْزَلَ عَلَیْكَ الْکِتَابَ مِنْهُ آیَاتٌ مُحْکَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْکِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ اِلٰی قَوْلِهٖ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّا اُوْلُوْ الْاَلْبَابِ فَقَالَ یَا عَائِشَةُ! اِذَا رَأَیْتُمُ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْهِ فَهُمُ الَّذِیْنَ عَنَاهُمُ اللّٰهُ فَاحْذَرُوْهُمْ.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی "وہی تو ہے جس نے آپ پر ایسی کتاب اتاری جس میں محکم آیات ہیں وہ کتاب کی بنیاد ہیں اور کچھ متشابہات ہیں، اور نصیحت تو عقلمند ہی حاصل کرتے ہیں" پھر فرمایا: عائشہ! جب تم ان لوگوں کو پاؤ جو قرآن میں جھگڑیں تو ان سے اجتناب کرنا، کیونکہ آیت میں یہی اللہ کی مراد ہیں۔

محکم کی تعریف:

علوم القرآن کے بلند پایہ عالم بدرالدین زرکشی (م،۷۹۴ھ) نے اس کی تعریف: " لا توقف معرفته علی البیان[1]" ملاعلی قاری نے: "ما امن من احتمال التاویل[2]" شیخ الاسلام حضرت کشمیری نے: "ما احکم مراده[3]" اورعلامہ آلوسی نے: "واضحة المعنی ظاهرة الدلالة محکمة العبارة محفوظة من الاحتمال والاشتباه[4]" کے الفاظ میں کی ہے، جن کا خلاصہ یہ نکلتا ہے، کہ: ایسی آیات جن کی مراد متعین اور واضح ہو، ان کی لغت وترکیب میں کوئی ابہام نہ ہو اوران میں متعدد معانی کا بھی احتمال نہ ہو، اگر بالفرض مختلف معانی

[1] البرہان فی علوم القرآن۔ (ج:۲،ص:۷۹) [2] مرقاۃ المفاتیح۔ (ج:۱باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ فصل اول)
[3] فیض الباری۔ (ج:۴،ص:۱۶۶) [4] روح المعانی۔ (جز۳،ص۸۰)

کا احتمال ہو، تو دوسری نصوص اور اجماعِ امت کے ذریعہ ان کی مراد متعین ہو جاتی ہو، علم تفسیر میں انہیں محکمات کہا جاتا ہے۔

متشابہ کی تعریف

علامہ زرکشی نے: "لا یرجیٰ بیانه" ملا علی قاری نے: "مابلغ فی الخفاء غایته ولایرجیٰ معرفته" شیخ الاسلام حضرت کشمیری نے ما ابهم مرادهٗ کے الفاظ میں متشابہ کی تعریف کی ہے، مجموعی مفہوم یہ ہوا کہ: جس آیت کی مراد حتمی طور پر معلوم کرنے میں اشتباہ والتباس ہو، علم تفسیر میں اسی کو متشابہ کہتے ہیں، یہ محکمات کے تابع ہوتی ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اس مسئلے پر بیان القرآن میں: "التوجه لما یتعلق بالمتشابه" کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، جس کی ہم تلخیص پیش کرتے ہیں۔

"متشابہ وہ آیت ہے، جس کی مراد خداوند قدوس اور بقول بعض باری تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کو یقینی طور پر معلوم نہ ہو اور جس کی مراد مجاز یا کنایہ کے طور پر واضح ہو جائے، وہ متشابہ نہیں ہے، اگرچہ اس کے حقیقی معنی میں کوئی استحالہ لازم آتا ہو، متشابہ کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ جس کا لغوی مفہوم بھی کسی کو معلوم نہ ہو، جیسے حروف مقطعات دوسرا وہ جس کا لغوی مفہوم تو معلوم ہو لیکن عقل اور نقل کے پیش نظر اسے مراد لینا مشکل ہو، جیسا کہ باری تعالیٰ کی طرف انسانی اعضاء کا انتساب کرنا، اس آخری صنف کی بھی دو قسمیں ہیں، پہلی یہ کہ: اس کا لغوی مفہوم و مدلول کسی ایک ہی چیز پر دلالت کرتا ہو، اور اس میں متعدد احتمالات نہ ہوں جیسے کلام اور سمع و بصر اور دوسری یہ کہ: اس کا لغوی مدلول کسی ایک معنی کے بجائے متعدد معانی و مطالب کا احتمال رکھتا ہو، اس مشترک المعانی کی بھی دو قسمیں ہیں، ۱۔ ان مشترک معانی میں دلیل قطعی یا ظنی سے کسی ایک معنی کو ترجیح دے دی جائے...... ۲۔ دلیل کی بنیاد پر ان وجوہ و معانی میں کسی کو ترجیح نہ دی جائے۔

حروف مقطعات میں سب کے نزدیک تفویض واجب ہے، اور سمع و بصر و کلام میں کما یلیق شانہٗ سب کے نزدیک تفسیر جائز ہے، اسی طرح مشترک معانی میں اگر کسی کو ترجیح نہ دی جائے، تو اس میں سکوت ضروری ہے، اور ترجیح کی صورت میں یا تو اسے منصوص لفظ ہی سے تعبیر کیا جائے جیسے: "استویٰ کما یلیق به شانه" اور اگر اس کا ترجمہ کیا جائے، تو اس سلسلے

میں دو رائیں ہیں، پہلی رائے سلف کی ہے، وہ اسے حقیقی معنی پر ہی محمول کرتے ہیں، چاہے اس کے معنی کی تعیین دلیل قطعی سے ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ استویٰ کی تفسیر کسی نے استقراء سے کی نے بلندی سے، بعض نے استیلاء سے اور کچھ لوگوں نے اقبال سے کی ہے، یہ لغت کی بنیاد پر کیونکہ ظنی تعیین ہے، اس لئے محمول حقیقی معنیٰ ہیں، یعنی ذہن میں یہ قید موجود رہے گی: "لا استقرارنا المستلزم للحاوية ولاكعلونا المقتضى للجهة ولا كاستيلائنا المسبوق ولا كاقبالنا المسبوق بالادبار"

علامہ زرکشی نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب البرھان فی علوم القرآن میں محکم ومتشابہ کی بابت حسین بن محمد بن حبیب نیشاپوری کے حوالے سے تین اقوال نقل کئے ہیں۔

بعض لوگ پورے قرآن کو متشابہ مانتے ہیں، ان کے نزدیک اس میں کوئی مفہوم ومدلول ایسا نہیں جس کا عقل انسانی پورے طور سے ادراک کر لیتی ہو، ان کی دلیل کتاباً متشابهًا مثاني ہے، یہاں قرآن کی صفت متشابہ لائی گئی ہے، جس سے پورے قرآن کا متشابہ ہونا لازم آتا ہے، نیز خداوند قدوس کی ذات وصفات بھی اس کی متقاضی ہیں کہ: اس کا کلام ظلوم وجہول بندوں کی دسترس سے دور ہو، اس سے قرآن کی معجزانہ حیثیت اور زیادہ واضح ہوگئی، لیکن یہ رائے درست نہیں اور آیت میں متشابہ کا مطلب اصطلاحی نہیں، بلکہ لغوی ہے، یعنی ایسی کتاب جس کے مضامین باہم متشابہ ہیں اور ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر ہے اس رائے کو مان کر قرآن کے نزول کا مقصد فوت ہوجاتا ہے۔

جب کہ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ پورا قرآن محکم ہے، اور اس میں کوئی آیت بھی ایسی نہیں جو فہم وادراک کی گرفت میں نہ آتی ہو، ان کی دلیل كتاب احكمت اياته ثم فصلت ہے۔ جس میں علی الاطلاق آیات کو محکم اور مفصل قرار دیا گیا ہے پھر عقل وحکمت کا بھی تقاضہ ہے کہ: خدا کا پیغام محکم وواضح ہونا چاہئے تاکہ: ہر سطح کا آدمی اس کی مراد کو سمجھ سکے، بصورت دیگر تكليف ما لايطاق لازم آئے گی، اور نزول کا مقصد بھی فوت ہوجائے گا، لیکن یہ رائے بھی حقیقت پر مبنی نہیں مطلق آیات کو دوسری آیات سے مقید کرنا علم تفسیر میں مسلم ہے، اس لئے محکمات کا دائرہ اتنا ہی رہے گا اور قرآن نے جن پر ابہام واجمال کے پردے ڈالے ہیں، وہ

متشابہات ہی قرار دی جائیں گی، نیز اس دوسری رائے کو مان لینے کی صورت میں قرآن کا اعجازی پہلو مجروح ہوتا ہے۔

اہل سنت کا موقف

اہل سنت والجماعت مذکورہ بالا دونوں مذہبوں میں سے کسی کے قائل نہیں اور وہ حدیث باب میں مذکور آیت کی بنا پر محکمات کے ساتھ قرآن کی کچھ آیتوں کو متشابہات بھی مانتے ہیں، اسلامی احکام وتعلیمات کا مدار اگرچہ پہلی قسم پر ہے، لیکن دوسری قسم اعجاز وامتیاز ظاہر کرنے کے لئے ہے اور اس کی تعداد زیادہ نہیں، علامہ زرکشی نے البرھان میں[1] اور امام سیوطی نے الاتقان[2] میں اسی کو صحیح موقف قرار دیا۔

یہاں ایک مسئلہ یہ بھی غور طلب ہے کہ: حدیث باب کی آیت میں لفظ اللّٰہ پر وقف ہے: "یا والراسخون فی العلم" پر؟ جمہور امت، اللّٰہ ہی پر وقف مانتے ہیں، کیوں کہ مراد کسی کو معلوم نہیں، آیت کا سیاق وسباق بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے اور ابن عباس وغیرہ سے جو منقول ہے کہ: وقف علم پر ہے اور راسخین بھی اس کے معنی جانتے ہیں، تو اس قول کی یہ تاویل کی گئی ہے کہ: راسخین ان کے معنی اپنی فہم کی حد تک جان سکتے ہیں حقیقی مراد کا علم اللہ ہی کو ہے۔

﴿فاما الذین فی قلوبھم زیغ﴾ اس کی وضاحت اسلاف نے یہود وخوارج اور کفار سے کی ہے بدعملی کی بدولت جب انسان کا دل تاریک وزنگ آلود ہو جاتا ہے، تو توفیق الٰہی کے دروازے اس پر بند ہو جاتے ہیں نتیجتاً وسط واعتدال سے تجاوز کر کے وہ متشابہات کے پیچھے پڑ جاتا ہے، دوسری قوموں میں تو یہودی علماء جب کہ مسلم فرقوں میں خوارج اس کا سب سے زیادہ شکار رہے ہیں، پھر یہ مرض عوام کو نہیں بدعمل خواص کو ہوتا ہے۔

﴿اذا رأیتم﴾ مسلم، ابوداؤد وترمذی میں بھی جمع ہی کا صیغہ ہے، لیکن امام بخاری نے کتاب التفسیر سورۂ آل عمران کے پہلے باب میں: "فاذا رأیت" واحد مؤنث کا صیغہ نقل کیا ہے، ملا علی قاری نے اس کو حضرت عائشہؓ کی عظمت اور کثرت علم کی دلیل قرار دیا ہے۔

﴿بکسر التاء علی خطاب ام المؤمنین عائشة بیانا لشرفھا وغزارة

---

[1] البرھان فی علوم القرآن۔ (ج ۲، ص: ۷۹) [2] الاتقان فی علوم القرآن۔ (ج ۲، ص: ۳)

علمها[1] یہاں حضرت عائشہؓ کو خطاب کر کے پھر جمع کی ضمیر لانے کی وجہ علامہ سندھیؒ کے نزدیک یہ تنبیہ ہے کہ: ایسے گمراہوں کی معرفت صرف حضرت عائشہ کے لئے ضروری نہیں، بلکہ وہ دوسروں پر بھی واجب ہے، للتنبيه على ان معرفة هٰذا لايختص بعائشة بل يعمها وغيرها"

﴿الذين يجادلون فيه﴾ صحیح بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی میں الذین "يتبعون ماتشابه منه" کے الفاظ آئے ہیں، جن کی تشریح ملا علی قاری نے: "الذين يقتصرون على تتبع المتشابه" سے کی ہے، امام ابن جریر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

فَمَعْنَى الْكَلَامِ. فاما الذين فى قلوبِهِم مَيْلٌ عَنِ الحقِ وحَيْفٌ عنه فَيَتَّبِعُوْنَ من اى الكتاب مَاتَشَابَهتْ الفاظُ واحتَمَلَ صرفُهٗ فى وجوهِ التاويلاتِ بِاحْتِمَالِه المَعَانِىْ المختلفةِ ارادةَ اللُّبْسِ علٰى نفسهٖ وعلٰى غيرهٖ احتجاجًابهٖ علٰى باطلهٖ الذى مَالَ اِلَيهِ قَلْبُهٗ دون الحقِّ الذى اتاه اللّٰه تعالٰى فاوضَحَهٗ بِالْمُحْكَمَاتِ من اياتِ كتابهٖ وهٰذهٖ الاية وانكانت نزلت فيمن ذكرنا انها نزلت فيهم من اهل الشركِ فانه معنىً بها كلُّ مُبْتَدِعٍ فى دِيْنِ اللّٰهِ بدعةً مَالَ قَلْبُه اليها تاويلاً منه لبعض متشابه اى القرآنِ ثم حَاجَّ به وجَادَلَ بِهِ اهلَ الحق وعدل عن الواضح من ادلة اية المحكمات ارادةً منه بِذَلِكَ اللُّبْسِ علٰى اهلِ الْحَقِّ مِنَ المومنين وطلبا لعلم تاويل مَاتَشَابَهَ عَلَيْهِ مِنْ ذَالِكَ كَائِنًا من كان واى اصاف البدعة كان من اهل النصرانية كان او اليهودية اوالمجوسية او كان سبائيًا اوحروريًا اوقدريًا اوجهميًا. (حاشيه ابى داؤد ج: ٢، ص: ٦٣٢)

اب آیت کے معنی یہ ہوئے کہ: جن لوگوں کے دلوں میں حق سے انحراف واجتناب موجود ہے، وہ انہی آیتوں کے پیچھے پڑتے ہیں، جن کے الفاظ متشابہ کی قبیل سے ہوں اور مختلف معانی کے احتمال کی وجہ سے ان کی کوئی ایک توجیہ مشکل ہو، ان لوگوں کا مقصد اپنے ساتھ دوسروں کو دھوکا دے کر اپنے اس باطل موقف پر استدلال کرنا ہے، جس پر ان کا دل رنجھ گیا ہے، اس کا حق

[1] مرقاۃ المفاتیح۔ (ج:١، باب الاعتصام بالكتاب والسنۃ فصل اول)

سے کوئی تعلق نہیں، جو اللہ نے اتارا اور محکم آیتوں سے اس کی وضاحت فرمائی۔

یہ آیت گرچہ مشرکین کی بابت نازل ہوئی، لیکن اس سے مراد ہر وہ شخص ہے، جو قلبی کجی کے باعث اللہ کے دین میں کوئی بدعت گڑھے اور متشابہات کی تاویل کر کے اس کو دلیل بنائے اس کی بنیاد پر اہل حق سے بحث کرے اور محکم آیتوں کے تقاضے کو نظر انداز کر جائے، اس کا مقصد بھی اہل حق کو تشویش میں مبتلا کرنا اور متشابہات کی تاویل کے درپہ ہونا ہے، اس لئے وہ بھی اس وعید کا مصداق ہے خواہ وہ نصرانی، یہودی اور مجوسی جیسا کھلا مشرک ہو یا رافضی، خارجی، قدری، جہمی اور اہل بدعت کے کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔

﴿فهم الذين عناهم الله﴾ بخاری، مسلم اور ابواؤد میں: "فأولئك الذين سمى الله" کے الفاظ ہیں، علامہ سندھی فرماتے ہیں: "ای: ارادهم بقوله" (فاما الذين فى قلوبهم زيغ) الخ یعنی آیت مذکورہ میں باری تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کو مراد لیا ہے۔

﴿فاحذروهم﴾ جامع ترمذی میں حضرت عائشہؓ کی مناسبت سے "فاذا أيتهم" "فاعرفيهم" منقول ہے اور امام ترمذی نے یزید بن ابراہیم راوی سے: "فاذا رأيتموهم فاعرفوهم قالها مرتين" او ثلاثا بھی نقل کیا ہے۔

حذر کے معنی بہت چوکنا ہو کر اجتناب کرنے کے ہیں، امام نوویؒ نے اسی مفہوم کی ادائیگی کیلئے اس حدیث پر صحیح مسلم[1] میں: "باب النهى عن اتباع متشابه القرآن والتحذير من متبعيه والنهى عن الاختلاف فى القرآن" کا ترجمۃ الباب قائم کیا ہے، جب کہ اس پر ابوداؤد میں: "باب النهى عن الجدال واتباع المتشابه من القرآن" کا عنوان ہے، جن کا مشترکہ مفہوم مذہبی جدال اور متشابہات سے بالکلیہ اجتناب ہے، امام طیبی نے لکھا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے یہاں جس چیز سے ڈرایا ہے، وہ متشابہات کی مخصوص قسم اللہ کی صفات اور احوالِ قیامت ہیں، جن کی کیفیت کو محسوس کرنا مشکل ہے اور ان کا استحضار کیا ہی نہیں جا سکتا، "المتشابه الذى يحذر منه وهو صفات الله تعالىٰ التى لا كيفية لها واوصاف القيامة التى لا سبيل الى ادراكها بالقياس والاستنباط ولاسبيل الى استحضارها فى النفوس[2]" ایسی

---

[1] کتاب العلم (ج:۲،ص:۳۳۹) [2] حاشیہ ترمذی ابواب التفسیر/آل عمران۔

ہی لوگوں کی بابت امام نووی نے استدلال کیا ہے: "وفی هٰذا الحدیث التحذیر من مخالطة اهل الزیغ واهل البدع ومن یتبع المشکلات للفتنة[۱]" حدیث باب میں گمراہ، بدعتی اور مشکلات ومتشابہات کے درپے ہونے والوں کی صحبت سے خبردار کیا گیا ہے، سندھیؒ نے اس مفہوم کو اور زیادہ کھولا ہے، فرماتے ہیں: "ایها المسلمون لا تجالسوهم ولا تکالموهم، فانهم اهل البدعة فیحق لهم الاهانه احترازًا عن الوقوع فی عقیدتهم[۲]" یعنی فسادِ عقائد کے اندیشہ کی بنیاد پر مسلمانوں کو ان سے سلام وکلام اور نشست وبرخاست سے بھی پرہیز رکھنا چاہئے، کیونکہ وہ بدعتی ہیں اور تحقیر کے مستحق ہیں، بلکہ امام نوویؒ نے تو ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ ان کے لئے کوڑوں کی سزا تجویز کی ہے، فرماتے ہیں: "یزجر ویعزر کما عزر عمر بن الخطاب رضی اللّٰه عنه صبیغ بن عسل حین کان یتبع المتشابه[۳]" اجتناب وتعزیر کا یہ حکم اس پر موقوف ہے، کہ سائل کا انداز محض فساد وجدال کا ہو حق سے اس کو کوئی سروکار نہ ہو، لیکن اگر کسی کا منشاء پیش آنے والے اشکالات کو رفع کرنا اور صحیح موقف کی تلاش ہو، تو وہ اس وعید کا مصداق نہیں اور اس کو جواب دینا ضروری ہے امام نووی لکھتے ہیں: "فاما من سأل عما اشکل علیه منها للاسترشاد والتلطف فی ذٰلك فلا بأس علیه وجوابه واجب[۴]"

سند کی تحقیق

بخاری (تفسیر/آل عمران) مسلم (علم/۱)، ابوداؤد (سنۃ/۲) اور ترمذی (تفسیر/آل عمران) میں اس روایت کو عبداللہ بن ابی ملیکہ، قاسم بن محمد کے حوالے سے حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں، جب کہ ابن ماجہ کی سند میں ابن ابی ملیکہ نے یہ حدیث براہِ راست حضرت عائشہ سے لی ہے، جس سے انقطاع کا شبہ ہوتا ہے، لیکن امام ترمذی نے وضاحت کی ہے کہ: ایسا دیگر محدثین کے اسناد میں بھی ہے اور ابن ابی ملیکہ کا حضرت عائشہؓ سے بھی سماع ثابت ہے فرماتے ہیں۔

---

۱ مسلم ۲/۳۳۹ ۲ ۳ مسلم ج:۲ کتاب العلم، باب اول۔
۴ مسلم ۲/۳۳۹

هكذا رَوٰى غيرُ وَاحدٍ هذا الحديثَ عَن ابنِ ابى مُلَيكةَ عَن عائشةَ ولم يَذكُروا فِيه عن القاسم بن محمد وانما ذَكرَه يزيدُ بنُ ابراهيمَ عن القاسم بن محمد فى هذ الحديث وابنُ ابى مُلَيكةَ هو عبدُ الله بن عُبيدِ الله بن أبى مُلَيكَة وقد سمع من عائشة أيضاً"[1] اس لئے مولانا لطیف الرحمٰن خان نے الدیباجہ (۲۴۶/۱) میں اسناده صحیح لغيره کا فیصلہ کیا ہے۔

(۴۸/۴) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الْمُنْذِرِ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُضَيْلٍ ح وَحَدَّثَنَا حَوْثَرَةُ بْنُ مُحَمَّدٍ، ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بِشْرٍ قَالَا: ثَنَا حَجَّاجُ بْنُ دِيْنَارٍ، عَنْ أَبِيْ غَالِبٍ عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى كَانُوْا عَلَيْهِ اِلَّا اُوْتُوْا الْجَدَلَ ثُمَّ تَلَاهٰذِهِ الآيَةِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ

فرمایا ہدایت کے بعد کوئی قوم گمراہ نہیں ہوئی، مگر اس طرح کہ: اس کے مزاج میں جھگڑا پیدا کردیا گیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: "بل هم قوم خصمون"

کٹ حجتی کی مذمت

ہدایت طبیعت کی سلامتی اور قلب کی سعادت کی بنیاد پر نصیب ہوتی ہے، جس کا نتیجہ باہمی امن واخوت کے قیام کی صورت میں نکلتا ہے، جدال انسان کی اسی سعادت کو مجروح کر کے معاشرہ کو بھی قلق وانتشار میں مبتلا کردیتا ہے، اسی لئے شریعت نے اسے ان سات چیزوں میں شمار کیا ہے، جو بالآخر انسان کو ایمان تک سے محروم کردیتی ہیں: نهى عن السبع الموبقات سوء ظن، تجسس، اغتیاب، تنافس، بغض، حسد، انتقام، غضب، تمسخر اور شماتت کا اسی لئے قلع قمع کیا گیا ہے، کیونکہ اختلاف وجدال کا یہی چیزیں سبب بنتی ہیں، امام زہری کا قول ہے: " المراء يَذهَبُ بِنُورِ العِلمِ" شب قدر کی تعیین بھی جھگڑے ہی کی نحوست کی بنا پر اٹھائی گئی، اسلئے ہر قیمت پر اس سے بچنا چاہئے چاہے اپنا حق ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے، اسلامی تعلیمات کا یہی تقاضا ہے اور باب کی آخری حدیث تو اس سلسلہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

﴿الا اوتو الجدل﴾ قد کی تقدیر کے ساتھ یہ جملہ حالیہ ہے، امام طیبی نے کان کی خبر

---

[1] ابواب التفسیر سورۃ آل عمران۔

کی پوشیدہ ضمیر کو اس کا ذوالحال قرار دیا ہے، ملا علی قاری کی بھی یہی رائے ہے، لیکن علامہ سندھیؒ نے اس کی تردید کی ہے، ان کے نزدیک ذوالحال ماضل کا فاعل "قوم" ہے، فرماتے ہیں: "وذوالحال فاعلُ ماضلَّ لا الضميرُ المستَتِرُ الذی فی خبَرِ کانَ کمَا توَهَّمَهُ الطِّیبِی فانهُ فَاسدٌ معنی اور یہی صحیح ہے" یہاں جدل سے مراد عام لڑائی جھگڑا نہیں، بلکہ دین میں وہ نفسانی اختلاف ہے، جس کا مقصد عمل سے فرار یا اپنی بات کی پچ ہو، اگر حدیث کے مفہوم کو ہم صرف امم سابقہ تک محدود رکھیں، تو ملا علی قاری کے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوگا: "والمعنٰی ما کان ضلالُهم ووقوعُهم فی الکفرِ الا بسببِ الجدالِ وهو الخُصُومَةُ بالباطلِ مع نبیّهِم وطلبُ المُعجزةِ منه عِنادًا او جُحُودًا"[1]، یعنی ان کے کفر وضلال کا سبب صرف جدال تھا امتِ مسلمہ کا بگاڑ بھی کیونکہ انہی کے طرز پر ہوگا، اس لئے ماضی وحال کے تمام فرق ضالہ میں یہ عنصر پورے طور پر موجود ہے، یعنی کٹھ حجتی، عناد، قرآن کے معنی مرادی میں ہٹ دھرمی کا مظاہرہ اور اپنے مسلک اور اپنے بڑوں کی رائے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے آیتوں سے غلط استدلال: قاری لکھتے ہیں "والمرادُ فی القرآنِ ضَرْبُ بعضِهِ بِبَعضٍ لترویجِ مذاهبِهِم وآراءِ مشائِخِهِم" اللہ معاف فرمائے اب تو ہر طبقہ ہی ان کا شکار ہوتا جا رہا ہے: "کلُّ حِزبٍ بمَا لدَیهِم فرِحُونَ" اس مزاج وفکر کی آخری منزل ہے، جہاں پہنچ کر قرآن کی تلاوت بھی حق کی تلاش کے لئے نہیں بلکہ اپنے مطلب کی باتیں ڈھونڈنے کے لئے کی جاتی ہے۔

﴿ثم تلا هذ الآیة بل هم قوم خصمون﴾ (زخرف/ ۵۸) امام ترمذی نے آیت کا پہلا ٹکڑا "ماضربوه لك الا جدلا" بھی نقل کیا ہے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے آیت کے تین شان نزول ذکر فرمائے ہیں، پہلا قرطبی کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ: ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "یا معشر قریش لا خیر فی عبد یعبد من دون الله" اس پر مشرکین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال پیش کی کہ: اس طرح تو ان کے اندر بھی خیر نہیں رہی، کیونکہ نصاری ان کی پوجا کرتے ہیں، پھر

---

[1] مرقاۃ المفاتیح۔ (ج:۱ص:۲۵۲ باب الاعتصام بالسنۃ فصل ثانی)

جواباً یہ آیت نازل ہوئی۔

دوسرا ابن کثیر وغیرہ کے حوالے سے منقول ہے کہ: جب آپ نے: "اِنَّکُم وَمَاتَعبُدُونَ من دون اللّٰه حَصَبُ جَهَنَمَ" والی آیت پڑھی تو عبداللہ بن الزبعری جو اس وقت کافر تھے، نے کہا عیسائی حضرت عیسیٰ کی اور یہود حضرت عزیرؑ کی پوجا کرتے ہیں، تو کیا وہ دونوں بھی جہنم کا ایندھن بنیں گے، مشرکین کو یہ جواب بہت پسند آیا، وہ خوشی سے چیخنے چلانے لگے تو باری تعالیٰ نے جواباً: "اِنَّ الَّذِینَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الحُسنٰى اُولٰئكَ عنها مُبْعدُونَ" والی سورہ انبیاء کی آیت کے ساتھ مذکورہ آیت بھی نازل فرمائی۔

تیسرا شان نزول یہ ہے کہ: ایک مرتبہ مشرکین نے یہ جھوٹ بولا کہ محمد ہم سے اپنی عبادت کرانا چاہتے ہیں، جس طرح نصاری عیسیٰ کی عبادت کرتے ہیں، تو گویا ان کا ارادہ بھی خدائی کا دعویٰ کرنے کا ہے، اس کی تردید میں یہ آیتیں نازل ہوئی، حضرت مفتی صاحب کا رجحان یہ ہے کہ: بیک وقت تینوں ہی صورتیں پیش آئیں، جن کے تفصیلی جواب کے ساتھ اجمالاً یہ بھی بتلایا گیا کہ: مشرکین کی یہ ساری لن ترانیاں کٹ حجتی کے لئے ہیں، جن کا مقصد غور وفکر نہیں، بلکہ آپ کو زچ کرنا ہے، کیونکہ مزاجاً یہ لوگ جھگڑالوں ہیں۔

اشکال

یہاں اشکال ہوتا ہے کہ: تذکرہ تو ہدایت کے بعد گمراہی کا تھا، قریش تو ہدایت ہی پر نہ تھے، پھر حدیث باب کے ضمن میں ان کی مثال کیونکر درست ہے، علامہ سندھیؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے، کہ روشن دلائل کی بناء پر ان کا ہدایت کی قبولیت پر قادر ہونا گویا ذہناً ہدایت پر ہونے کے قائم مقام تھا، لیکن جھگڑالوطبیعت کی بدولت انہوں نے ہدایت کو ٹھکرا دیا، اس صورت میں مثال درست ہے: "نزل تمكنهم منه بواسطة البراهين الساطعة منزلة كونهم عليه فحيث دفعوا بعد ذلك الحق بالباطل" جامع ترمذی کتاب التفسیر سورہ زخرف میں بھی یہ روایت موجود ہے، اور امام نے اس کو "حسن صحيح" قرار دیا ہے، حجاج بن دینار سے رسول اللہ علیہ صلی اللہ علیہ وسلم تک دونوں کا سلسلہ ایک ہے اور ترمذی سے الگ امام ابن ماجہ کے دوسرے رواۃ بھی ثقہ ہیں، اس لئے مولانا لطیف الرحمٰن بہرائچی نے الدیباجہ

(۲۵۳/۱) میں اسے: "اسناده صحيح" کہا ہے۔

(۴۹/۵) حَدَّثَنَا دَاوُدُ بْنُ سُلَيْمَانَ الْعَسْكَرِيُّ، ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيٍّ اَبُوْهَاشِمِ بْنِ اَبِيْ خِدَاشٍ الْمَوْصِلِيُّ قَالَ : حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مِحْصَنٍ، عَنْ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ اَبِيْ عَبْلَةَ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الدَّيْلَمِيِّ، عَنْ حُذَيْفَةَ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَقْبَلُ اللّٰهُ لِصَاحِبِ بِدْعَةٍ صَوْمًا، وَلَا صَلٰوةً وَلَا صَدَقَةً وَلَاحَجًّا وَلَا عُمْرَةً، وَلَاجِهَاداً، وَلَاصَرْفاً، وَلَا عَدْلًا، يَخْرُجُ، مِنَ الْاِسْلَامِ كَمَا تَخْرُجُ الشَّعْرَةُ مِنَ الْعِجِيْنِ"

﴿لا يقبل اللّٰه﴾ قبولیت کی دو قسمیں ہیں، ۱ قبول اصابت، حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانیؒ نے اس کی تعریف درس ترمذی، ۱/۱۵۴ میں : "كَوْنُ الشَّىِ مُسْتَجمِعًا لِجَمِيْعِ الشَّرائِطِ وَالاركَانِ" سے کی ہے، یعنی تمام ارکان وشرائط کے ساتھ کسی عمل کا ظاہر ہونا، اس کا نتیجہ دنیاوی اعتبار سے فراغ الذمۃ ہے، خواہ آخرت میں ثواب نہ ملے: "لايقبل اللّٰه صلٰوة حائض الابخمار" (ابوداؤد ۱/۴۵) اسی کی مثال ہے، ۲ قبولِ اجابت، اس کی تعریف مولانا عثمانیؒ کے نزدیک: "وقوعُ الشئ فى حيّزِ مَرضَاةِ الربِّ سُبحانه وتعالٰى" یعنی اللہ اس عمل سے راضی ہو اور اس پر آخرت میں ثواب عنایت فرمائے، من شرِبَ الخمرَ لَم تُقبَل لهٗ صلٰوةٌ اَربعين صبَاحًا (ترمذی، اشربہ) اسی کی مثال ہے، حدیث باب میں قبول اجابت ہی مراد ہے، کیونکہ بدعت کی وجہ سے آخرت میں اس کو ثواب سے محروم کر دیا جائے گا، علامہ سندھی نے لکھا ہے "لعلّ المراد بالبدعة الاعتقاد الفاسد دون العمل الفاسد" یہاں عملی بدعت کے بجائے، شاید اعتقادی بدعت مراد ہے، اور ایسے ہی شخص کو بدعتی کہا جاتا ہے۔

امام نووی نے شرح مسلم (۴۴۱/۱) میں صرفا ولا عدلا کی بابت حسن بصری، اصمعی، یونس اور ابوعبیدہ کے مختلف قول نقل کئے جن میں جمہور الصرف الفريضة والعدل النافلة کو ترجیح دیتے ہیں اب قاضی عیاض کی زبان میں حدیث کا مطلب ۔ ۱۴۱ لاتقا فریضة ، لا[illegible]

قبول رضیٰ وان قبلت قبول جزاء یعنی اللہ کی رضا حاصل نہیں ہوگی خواہ بدلہ مل جائے۔

﴿یخرج من الاسلام﴾ علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے: "ای من کماله" یعنی وہ کمال اسلام سے نکل جاتا ہے، نفس اسلام سے نہیں کہ: اس پر کفر کا فتویٰ دیا جائے، تو گویا یہ الفاظ شدت وغلظت پر محمول ہونگے۔

﴿کما تخرج الشعرة من العجین﴾ شعرة کی تاء وحدت کی ہے، معنی بال اور عجین گوندھے ہوئے آٹے کو کہتے ہیں، یہ مکمل علیحدگی کی ایک بلیغ مثال ہے۔

سند

حدیث باب کی سند کے تمام رواۃ صحیح ہیں، صرف محمد بن محصن العکاشی کمزور ہے، ابن معین اور ابو حاتم نے کذاب، ازدی اور امام بخاری نے منکر الحدیث قرار دیا ہے، دارقطنی کہتے ہیں: "متروكٌ یضعُ" ابن حبان نے لکھا ہے: "شیخٌ یضعُ الحدیثَ عنِ الثِّقاتِ لا یحِلُّ ذِکرُہٗ اِلَّا عَلٰی سبیلِ القَدحِ فِیهِ" نیز دوسری جگہ انہوں نے: "یَروِی المَقلوباتِ عنِ الثِقاتِ لا یُکتَبُ حدیثُهٗ اِلَّا لِلاعتبَارِ" کا تبصرہ کیا ہے، جب کہ عقیلی نے: "الغالبُ علٰی حدیثِهٖ الوهْمُ والنَّکارَةُ" اور ابن حجر نے "کذَّبُوہ" لکھا ہے[1]، اس لئے بوصیری نے زوائد[2] میں هذا اِسنادٌ ضعیفٌ کا فیصلہ کیا ہے۔

(۶/۵۰) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ سَعِیْدٍ، ثَنَا بِشْرُبْنُ مَنْصُوْرٍ الخنَّاطُ عَنْ أَبِیْ زَیْدٍ، عَنْ أَبِیْ الْمُغِیْرَۃَ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بن عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَبیَ اللّٰهُ اَنْ یَقْبَلَ عَمَلَ صَاحِبِ بِدْعَةٍ حَتّٰی یَدَعَ بِدْعَتَهٗ.

حافظ ذہبی نے الکاشف میں اور بوصیری نے "زوائد ابن ماجہ" (۴۹/۱) میں سند کی بابت ارشاد فرمایا: "هذا اسنادٌ رِجالُهٗ کلُّهم مجهُولُون" جب کہ الجرح والتعدیل میں نقل کیا گیا ہے: "لا أعرف أبازید ولا أبا المغیرة" اور حافظ ابن حجر نے بھی ان دونوں کو اپنی کتاب "تقریب" (۴۲۵/۲، ۴۷۶) میں مجهول قرار دیا ہے، چنانچہ امام ابن الجوزی

---

[1] ملاحظہ ہو التقریب جلد: ۲، ص: ۲۰۵ اور تہذیب التہذیب ج: ۹، ص: ۳۸۱۔

[2] زوائد ابن ماجہ، ج: ۱، ص: ۴۸۔

"العلل المتناهية" (۱/ ۱۳۷، ۱۳۸) میں لکھا ہے: "هذا حديث لا يَصِحُ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وفيه مَجَاهِيلُ" علامہ کمال الدین دمیری کہتے ہیں: "هذا حديث موضوع" مولانا لطیف الرحمٰن خاں بہرائچی نے بھی اسے اسناده موضوع قرار دیا ہے، اس لئے روایت کی شرح کا ہمارے نزدیک کوئی جواز نہیں۔

(۵۱/۷) حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ الدِّمَشْقِيُّ، وَهَارُوْنُ بْنُ اِسْحَاقَ قَالَا: ثَنَا اِبْنُ اَبِيْ فُدَيْكٍ، عَنْ سَلْمَةَ بْنِ وَرْدَانَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "مَنْ تَرَكَ الْكَذِبَ وَهُوَ بَاطِلٌ بُنِيَ لَهُ قَصْرٌ فِيْ رَبَضِ الْجَنَّةِ، وَمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَهُوَ مُحِقٌّ بُنِيَ لَهُ فِيْ وَسْطِهَا، وَمَنْ حَسَّنَ خُلُقَهُ بُنِيَ لَهُ فِيْ اَعْلَاهَا.

فرمایا جس نے جھوٹ کو باطل ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا، اس کا جنت کے نواحی علاقہ میں ایک محل بنایا جائے گا، جس نے حق پر ہونے کے باوجود جھگڑے کو چھوڑ دیا، اس کا بیچ جنت میں محل بنایا جائے گا اور جو اپنے اخلاق کو درست کرے گا، اس کا محل جنت میں سب سے اونچی جگہ پر بنے گا۔

﴿من ترك الكذب وهو باطل﴾ "وهو باطل" کو ابن رجب زبیری نے اپنی شرح ابن ماجہ میں کذب کا حال قرار دیا ہے، معنی ہوئے: "اى حال كونه باطلاً" یعنی وہ جھوٹ بھی باطل تھا اور اس میں رخصت کی کوئی گنجائش نہ تھی، جھوٹ علی الاطلاق حرام ہے، لیکن بطور توریہ شریعت نے اس کی اجازت دی ہے، جیسا کہ صحیحین میں روایت موجود ہے: "ليس بكذاب من يصلح بين الناس فيقول خيرًا وينمي خيرًا ورخص في الكذب في ثلاث في الحرب، واصلاح ذات البين وكذب الرجل على امرأته" وہ شخص جھوٹا نہیں ہے، جو باہمی صلح کے لئے اچھی بات کہے اور اسی کو دوسرے تک پہنچائے تین موقعوں پر کذب میں رخصت دی گئی ہے۔

۱ جنگ میں، امام نوویؒ نے اس کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے: "بان يقول مات امامكم الأعظم وينوى امامهم في الأزمنة الماضية او غدا ياتينا مدد اى طعام"

ان کے سپہ سالار کی موت کا اعلان کرنا اور نیت گذشتہ زمانوں میں مرنے والے ان کے کسی قائد کی جائے، اسی طرح اپنی کمک آنے کی خبر دینا اور اس سے کھانے پینے کی چیزیں مراد لینا۔

۲ لوگوں کے درمیان صلح وتصفیہ کے لئے گفتگو کو اس طرح نقل کرنا کہ دونوں فریقوں کا دل صاف ہو جائے، اور ایک دوسرے کی بابت وہ اچھی رائیں قائم کرلیں، امام نوویؒ نے اسی مفہوم کو "نقل عن هؤلاء الی هؤلاء كلامًا جميلاً ومن هؤلاء الی هؤلاء" سے تعبیر کیا ہے۔

۳ میاں بیوی ایک دوسرے کی دلجوئی کے لئے ازراہ توریہ کچھ کہدیں جس کا مطلب امام نووی کے الفاظ میں: "المراد به فی اظهار الود والوعد بما لا يلزم ونحو ذلك" ہے یعنی تعلق ومحبت کے اظہار میں اگر کچھ مبالغہ بھی ہو جائے، تو کوئی حرج نہیں، اسی طرح دونوں کا آپس میں ان چیزوں کا وعدہ کرنا جو شرعاً وقانوناً ان پر واجب نہیں، تو یہ بھی تحریم کے دائرے میں نہیں آتا، حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے متعلق صحیحین میں جو روایت ملتی ہے کہ: انہوں نے تین خلاف واقعہ باتیں کہیں تو وہ بھی اسی قبیل کی چیز ہے اور یہاں کذب سے صراحۃً جھوٹ نہیں بلکہ کنایۃً ایسی بات کہنا مراد ہے، جو ایک جہت سے صحیح ہو لیکن مخاطب اسے دوسری جہت پر محمول کر کے قائل کی منشا تک نہ پہنچ سکے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حدیث باب میں "وهو باطل" کی قید سے اسی طرح کے توریات وکذبات کو مستثنیٰ کیا گیا ہے یعنی جو ایسے جھوٹ کو چھوڑ دے جو مطلقاً حرام تھا اور مذکورہ استثناءات سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، تو اس کو بھی جنت کے اطراف میں محل ملے گا۔

یہ مفہوم "وهو باطل" کو جملہ حالیہ ماننے کی بنا پر ہے، لیکن ہم اگر ابن العربی کی توجیہ کو مانیں، تو مطلب دوسرا ہوگا، انہوں نے اپنی شرح ترمذی میں "ذو" کی تقدیر کے ساتھ "وهو ذو باطل" جملہ کو كذب کے بجائے "ترك" کی ضمیر فاعلی کا حال بنایا ہے، اور كذب سے مراد سنن ابی داؤد کی روایت کی بنیاد پر "المراء بالباطل" لیا ہے، اب معنی یہ ہوئے کہ وہ باطل پر ہونے کی وجہ سے جھگڑے کو چھوڑ دے، علامہ سندھیؒ بھی اسی توجیہ کے حق میں ہیں اور حدیث کے دوسرے جز "وهو محق" کو انہوں نے دلیل میں پیش کیا ہے کہ: جس طرح یہ

فاعل کا حال ہے اسی طرح "وھو ذو باطل" کو بھی فاعل ہی کا حال مانا جائے، امام ابوداؤد نے وہ روایت: "کتاب الأدب باب فی حسن الخلق" میں یوں کی ہے: "قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم أنا زعیم ببیت فی ربض الجنة لمن ترك المراء وان کان محقًا وببیت فی وسط الجنة لمن ترك الكذب وان کان مازحًا وببیت فی أعلی الجنة لمن حسن خلقه" علامہ سندھیؒ اسی حدیث کی بنیاد پر لکھتے ہیں "وھذا یقتضی أن یراد بباطل مازح " یعنی یہاں باطل سے عدم حقیقت مراد لینا اس حدیث کا تقاضا ہے، ابن العربی کی یہ توجیہ ابن رجب کے مقابلہ میں زیادہ باوزن نظر آتی ہے۔

یہاں ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ باطل جھگڑے کو چھوڑنے پر ابن ماجہ کی حدیث کے مطابق تو محل جنت کے اطراف میں ملے گا، جب کہ ابوداؤد کی مذکورہ روایت میں اس عمل پر وسط جنت میں محل کا وعدہ ہے، جو کھلا تعارض ہے علامہ سندھیؒ نے جواب دیا: "والظاھر أنه وقع من تغییر بعض الرواة" بظاہر یہی سمجھ میں آتا کہ بعض راویوں کے سہو کی وجہ سے یہ تضاد ہوا ہمارے نزدیک سنن أبی داؤد کی بنسبت جامع ترمذی اور ابن ماجہ کی ترتیب زیادہ قرین قیاس ہے۔

﴿ربض الجنة﴾ پہلے دونوں حرفوں پر فتحہ ہے، جمع أرباض یہ شہر کی فصیل کے باہر گردونواح کی بستیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، دنیا میں تو یہ شہر سے باہر ہی ہوتی ہے، لیکن آخرت میں وہ جنت سے باہر نہیں بلکہ اس کے اطراف اور کناروں میں ہوں گی، علامہ سندھیؒ لکھتے ہیں: "بفتحتین ای حوالی الجنة واطرافھا لا فی وسطھا ولیس المراد خارجًا عن الجنة کما قیل".

﴿ومن ترك المراء﴾ علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے: "ای الجدال خوفًا أن یقع صاحبه فی اللجاج المُوقِع فی الباطل" یعنی اس خوف سے جھگڑا چھوڑ دینا کہ کہیں وہ ایسی دشمنی میں تبدیل نہ ہوجائے، جو باطل کے گڑھوں، میں لا مارتی ہے، اس لئے پہلے کی بنسبت اس کا اعزاز زیادہ ہوگا، کیونکہ نفس کو دبانے کے ساتھ اس نے اپنا حق بھی چھوڑا ہے۔

﴿وحسن خلقه﴾ یہ باب تفعیل سے ہے، یعنی جس نے اپنے عادات واطوار کو درست اور شریعت کے مطابق کرلیا، تو اس کا محل جنت کے سب سے اونچے حصہ میں ہوگا، مذکورہ

دونوں حضرات کے مقابلہ میں یہ اعزاز زیادہ بڑا ہے کیونکہ انہوں نے صرف ایک موقع پر نفس کشی کی ہے، جب کہ اس نے اخلاق کے معنی وہ نہیں جو عرف عام میں سمجھے جاتے ہیں، بلکہ یہ تمام عادات واطوار کو درست کر لینے کا نام ہے یعنی ماموارت پر عمل اور منہیات سے اجتناب۔
امام ابن ماجہؒ نے یہ روایت عبدالرحمٰن بن ابراہیم اور ہارون بن اسحاق سے لی ہے، جب کہ امام ترمذیؒ نے اسے عقبہ بن مکرم العمی البصری سے روایت کیا ہے، آگے ابن ابی فدیک سے رسول اللہ تک دونوں کا سلسلہ ایک ہے جس پر امام ترمذی: "**ھٰذا حدیث حسن لانعرفهٗ الا من حدیث سلمة بن وردان عن انس**"[1] کا تبصرہ فرماتے ہیں، ابن وردان ایک کمزور راوی ہیں، جن کو امام ابوداوٗدؒ امام نسائیؒ عجلیؒ دارقطنی اور ابن حجرؒ نے ضعیف قرار دیا ہے[2]، اس لئے سند کا درجہ حسن سے آگے نہیں بڑھتا۔

باب اجتناب الرائ و القیاس

بدعت وجدال کے بعد رائے اور قیاس سے بچنے کی تلقین کرنا، دراصل یہ بتانا ہے کہ: تمام بدعات وخرافات کا محرک اور بنیادی سبب فاسد رائے اور باطل قیاس ہے رائے کے معنی عربی میں دیکھنا، نظریہ قائم کرنا اور تدبیر کرنا ہے: "**النظرُ بِحاسَةِ البَصَرِ واعتَقَدَهٗ و دَبَّرَهٗ**" جب کہ قیاس ایک چیز کو دوسری نظیر کی روشنی میں اندازہ لگانے کو کہتے ہیں، کہا جاتا ہے: "**قِسِ النَّعْلَ بِالنَّعْلِ**" ایک جوتے کو دوسرے کی طرح بنادو، امام نے یہاں رائے کو مقدم کر کے اس پر قیاس کا عطف کیا ہے، جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ: ان کے نزدیک وہ قیاس مردود ہے، جس کی بنیاد محض رائے اور ظن پر قائم ہو اور آگے پیچھے کوئی شرعی دلیل نہ ہو، اتباع نفس اس کا خصوصی محرک ہوتا ہے جامع ترمذی، اور سنن ابی داوٗد کی روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**من قال فی القرآن برأیه فلیتبوأ مقعده من النار**" گویا کہ: قرآن میں عقل ورائے کا دخول بھی انہیں کبائر میں سے ہے جن پر جہنم کی وعید وارد ہوئی ہے، چنانچہ یہ اصول

---

[1] جامع ترمذی ابواب البر والصلہ باب فی المراء
[2] ما جاء ... و تقریب، (۳۱۹/۱) تہذیب التہذیب (۱۴۰/۴)

ٹھہرا کہ: اس میں سرے سے رائے دینا ہی غلط ہے چاہے وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو، سنن ابی داؤد (علم/۴) میں روایت ہے: "من قال في كتاب الله فاصاب فقد أخطأ" صحیح مسلم کی روایت سے بھی رائے کے اس معنی کا پتہ چلتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازراہ تواضع فرمایا: "اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ اَمْرِ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهٖ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَائِي فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ" باب میں اسی رائے اور قیاس کا رد ہے ذیل میں آنے والی تمام احادیث یہی بتاتی ہیں، چنانچہ پہلی روایت میں حاملین علوم نبوت کے اٹھ جانے کے بعد ان جاہل پیشواؤں کے ظہور کی خبر ہے جو بغیر علم کے فتوے دے کر امت کے لئے ضال اور مضل ثابت ہوں گے، دوسری حدیث بھی اسی مفہوم پر مشتمل ہے، جب کہ تیسری حدیث علم کے تین ماخذ کی نشاندہی کرتی ہے، اور فریضہ عادلہ سے اجماع امت اور قیاس صحیح کی طرف اشارہ ہے، اس کے علاوہ دوسری فاسد رایوں کا کوئی اعتبار نہیں، چوتھی حدیث سے یہ سبق ملتا ہے کہ: قضاء وافتاء صرف علماء کا کام ہے اور انہیں بھی اگر اشکال پیش آجائے، تو تحقیق اور رُجوع الی النصوص ضروری ہے، پانچویں حدیث میں بنی اسرائیل کے حالات کی روشنی میں یہ بتایا گیا کہ: کسی بھی امت کا معاملہ اسی وقت تک درست رہتا ہے، جب کہ اس کی دینی قیادت صحیح النسب اور شریف النفس لوگوں کے ہاتھ میں ہو، اس منصب پر اگر گرے پڑے اور پست ذہن لوگ آبیٹھیں، تو قیادت کے نشے میں وہ دین میں رائے زنی شروع کر دیتے ہیں، نتیجۃً خود گمراہ ہو کر دوسروں کی گمراہی کا بھی باعث بنتے ہیں۔

ان احادیث میں غور کرنے کے بعد ہر شخص یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہے کہ: امام ابن ماجہ کا مقصد یہاں اس فاسد رائے اور باطل قیاس کا رد کرنا ہے، جو شریعت سے انحراف کا باعث بنتا ہے رہا وہ قیاس جس کے ذریعہ نصوص کی روشنی میں استخراج واستنباط کیا جاتا ہے، وہ امر لابُدّ کی ہے کوئی معمولی علم وعقل رکھنے والا شخص بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

قیاس کی حقیقت

انسانی ضروریات، تہذیب وتمدن اور معاشرتی تقاضوں کے باعث ہر دور میں ایسے سینکڑوں اور ہزاروں مسائل رونما ہوتے ہیں، جن کا حل براہ راست قرآن وسنت میں نہیں ملتا

اور یہی فطری تقاضہ بھی ہے، کیونکہ کتاب وسنت اصول وکلیات بیان کرتے ہیں اور تفہیم وتشریح کے لئے کچھ مثالیں بھی دیدی جاتی ہیں، اب غیر منصوص مسائل کو اصول کے دائرے میں لا کر ان پر شرعی حکم لگانا علماء کی ذمہ داری ہے، اس سلسلے میں اصل بنیاد علت کا اشتراک ہوتا ہے، شریعت کی اصطلاح میں اسی کو قیاس کہتے ہیں علامہ ابن رشد (م: ۵۹۵ھ) نے بدایۃ المجتھد (۳/۱) میں قیاس شرعی کی تعریف یہ کی ہے: "فھو الحاق الحکم الواجب لشئ ما بالشئ الذی اوجب الشرع لہ ذلک الحکم اولعلۃ جامعۃ بینھما" یعنی قیاس کے شرعی معنی ہیں منصوص چیزوں کے حکم کو ان احکام پر چسپاں کیا جائے، جن کے بارے میں نص خاموش ہے، یہ تطبیق دونوں کی مشابہت اور ان کی مشترک علت کی بنیاد پر ہوتی ہے، اس کے بغیر چارہ نہیں، اس لئے قیاس کو کتاب وسنت اور اجماع امت کے بعد فقہ میں مستقل چوتھا ماخذ تسلیم کیا گیا ہے، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد (القضاء/۱۱) اور مسند دارمی میں حضرت معاذ بن جبل کی روایت موجود ہے، جس کی سند کو حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (۳/۱) میں اسناد جید قرار دیا ہے کہ: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن کا عامل وقاضی بنا کر بھیجا تو آپ نے ان سے دریافت فرمایا: "کیف تقضی" انہوں نے ترتیباً بکتاب اللہ اور بسنۃ رسول اللہ کا جواب دیا اور جب ان دونوں میں صریح حکم نہ ملنے کی بات آئی تو حضرت معاذ نے: "اجتھد برائی ولا الو" کا ضابطہ پیش کیا، رسول اللہؐ نے بہت فرحت ومسرت کا اظہار کر کے ان کی تصویب فرمائی، چنانچہ وفات نبویؐ کے بعد صحابہ کا بھی یہی طریقہ رہا، جب بھی کوئی مقدمہ پیش ہوتا، وہ پہلے قرآن میں، پھر حدیث میں اس کا جواب تلاش فرماتے، بصورت دیگر ان دونوں کی روشنی میں اجتہاد وقیاس فرماتے، حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں طبقات ابن سعد (۱۳۶/۳) میں، حضرت عمرؓ کے سلسلے میں مسند دارمی (۳۴) میں اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کی بابت مستدرک حاکم (۱۳۰/۱) میں یہی تصریح منقول ہے، خلافت راشدہ کے بعد گذشتہ صدیوں میں تمام اہل علم نے یہی طریقہ اختیار کیا اور ہمارا فقہی ذخیرہ بھی اس کی شہادت دیتا ہے، جس میں منصوص مسائل سے کہیں زیادہ مجتہد فیہ مسائل ملتے ہیں، علماء نے: "فاعتبروا یا اولی الابصار" کو قیاس کی دلیل قرار دیا ہے، اسی طرح سنن

نسائی کتاب الحج، باب تشبه قضاء الحج بقضاء الدين کے تحت آنے والی حدیث کو بھی اجتہاد وقیاس کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، جس میں مذکور ہے کہ: قبیلہ خثعم کے ایک شخص نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ: میرے باپ پر حج فرض ہے، لیکن وہ بڑھاپے کے باعث سفر پر قادر نہیں ہیں، تو کیا میں ان کی جانب سے حج کر سکتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ: تم ان کی سب سے بڑی اولاد ہو، اس نے کہا جی! فرمایا: "أريت لو كان عليه دين اكنت تقضيه قال نعم قال فحج عنه" یعنی اگر تمہارے والد پر قرض ہوتا، تو اس کو اداء کرتے؟ اس نے کہا ضرور، فرمایا: تب تو ان کی جانب سے حج کر آؤ، یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق اللہ یعنی حج کو حق عباد یعنی قرض کے ساتھ لاحق کیا دونوں میں علت مشترکہ اداءِ واجب ہے، یہ قیاس کی صریح دلیل ہے۔

صحت کے شرائط

اصول الشاشی (۸۵) میں اس کے صحیح ہونے کی پانچ شرطیں مذکور ہیں

۱۔ لایکون فی مقابلة النص

یعنی قیاس نص شرعی کے مقابل نہ ہو مثلاً ایک دیہاتی نے حضرت حسن بن زیاد سے نماز میں قہقہہ لگانے کے متعلق دریافت کیا، حضرت حسن نے برملا جواب دیا کہ: "قهقهة فی الصلوٰة" ناقض وضوء ہے، دیہاتی نے حضرت کے جواب پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ: اگر کوئی شخص بحالت نماز کسی پاکدامن عفیفہ عورت پر تہمت لگادے تو یہ اعظم ترین گناہ ہونے کے باوجود ناقص وضو نہیں ہے، تو قہقہہ سے وضو کیوں ٹوٹے گا، دیہاتی کا یہ قیاس مردود ہے، کیونکہ قہقہہ کے متعلق نص شرعی یعنی صدیق اکبرؓ کی روایت موجود ہے، جس میں صراحتاً نقض وضوء کا تذکرہ ہے۔

۲۔ لا يتضمن تغير حكم من احكام النص

احکام نص میں سے کسی حکم کی وہ تبدیلی کا سبب نہ بنے جیسا کہ تیمّم پر قیاس کر کے وضوء میں بھی نیت کو شرط قرار دیا جائے، کیوں کہ اس طرح وضوء کی آیت میں مطلق سے مقید ہو کر تبدیلی

لازم آتی ہے لہذا یہ بھی مردود ہے۔

۳۔ لایکون المعدّی حکما لا یعقل

بین المسئلتین کی علت غیر مدرک بالعقل نہ ہو جیسے: یہ کہنا کہ: جس طرح اخراج ریح سبب حدث ہے اور اس پر نماز کی بناء کرنا درست ہے، اسی طرح احتلام بھی حدث ہے، اسلئے اس پر بھی بناء جائز ہونی چاہئے یہاں حکم اصلی کی علت کا ادراک نہ ہونے پر یہ قیاس بھی مردود ہے۔

۴۔ لا یقع التعلیل لحکم شرعی لا لامر لغوی.

حکم شرعی کے اثبات کے لئے علت دریافت کی جائے، لغوی امر کے لئے نہیں مثلاً کوئی یوں کہے چور کو سارق اس لئے کہا جاتا ہے، کہ وہ خفیہ طریقے سے دوسروں کا مال حاصل کرتا ہے، تو اسی وصف کی بنا پر نباش کفن چور کو بھی سارق قرار دیا جائے، اور اس پر قطع ید کی حد جاری ہو، یہ قیاس کیونکہ لغت سے متعلق ہے، اس لئے امر شرعی میں اس کا اعتبار نہیں۔

۵۔ لا یکون الفرع منصوصًا علیه

فرع منصوص علیہ نہ ہو، کیونکہ جب نص موجود ہے، تو قیاس کی کوئی ضرورت نہیں مثلاً کفارۂ قتل پر قیاس کرتے ہوئے غلام کے ساتھ کفارہ ظہار اور کفارۂ قسم میں بھی مؤمن کی قید لگادی جائے، تو یہ قیاس مردود ہوگا، کیونکہ کلام اللہ میں ان کفاروں کو مطلق ذکر کیا گیا ہے، تو وہ مقید نہیں ہونگے۔

ایسے ہی قیاس کی بابت جو اصول شریعت سے ہم آہنگ ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجر وثواب کی بشارت دی ہے، صحیح بخاری (۱۰۹۲/۲) اور صحیح مسلم (۷۶/۲) کی روایت ہے: "اذا حکم الحاکم فاجتهد واصاب فلهٗ اجر ان واذا حکم فاجتهد واخطأ فله اجر واحد" اس لئے اہل سنت والجماعت قیاس واجتہاد کے جواز پر متفق ہیں، اور اس کا انکار روافض، خوارج اور معتزلہ نے ہی کیا ہے۔

(۵۲/۱) حَدَّثَنَا اَبُوْ كُرَيْبٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُاللّٰهِ ابْنُ اِدْرِيْسَ وَعَبْدَةُ وَاَبُوْ مُعَاوِيَةَ وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ نُمَيْرٍ وَمُحَمَّدُ بْنُ بِشْرٍ ح وَحَدَّثَنَا سُوَيْدُ بْنُ سَعِيْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُسْهِرٍ وَمَالِكُ بْنُ اَنَسٍ وَحَفْصُ بْنُ مَيْسَرَةَ وَشُعَيْبُ

بْنُ اِسْحَاقَ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ اِنْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ النَّاسِ وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ فَاِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اِتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُسًا جُهَّالًا فَسُئِلُوْا فَاَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ (اس طرح) علم کو نہیں اٹھائیں گے کہ: دفعۃً انسانوں سے اسے سلب کرلیں بلکہ (رفع علم کا اندازہ یہ ہوگا کہ) علماء کو (رفتہ رفتہ) وفات دے کر علم کو سلب کرلیں گے، تو جب خداوند قدوس کسی عالم کو (بھی دنیا میں) نہیں چھوڑیں گے، تو لوگ جاہلوں کو (اپنا پیشوا) وسردار بنالیں گے، پھر (عالم سمجھ کر) ان سے (مسائل شرعیہ) پوچھے جائیں گے، تو وہ جہلاء بغیر علم کے فتوے دیں گے، اور خود بھی گمراہ ہوں گے، اور (اپنے ساتھ ساتھ) دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

﴿لایقبض العلم﴾ ملا علی قاری کہتے ہیں: المراد به علم الکتاب والسنة ومایتعلق بهما[1] "انتزاعا" اس میں دو احتمال ہیں، (۱) دوسرے مادے سے مفعول مطلق ہے جیسے: قعد جلوسا" ملا علی قاری اور علامہ سندھی نے رجع القهقری کی مثال پیش کی ہے، سندھیؒ کے الفاظ میں معنی ہوں گے: "محوًا من الصدور" یعنی باری تعالیٰ علم کو یک لخت سینوں سے مٹا نہیں دیں گے، اس صورت میں "ینتزعه" جملہ مستانفہ ہوگا اور اس کی ضمیر سندھی کے بقول علم کی طرف لوٹتی ہے: "انتزاع" کی طرف نہیں: "ان ضمیرہ للعلم لا للانتزاع"

۲۔ دوسرا احتمال "ینتزعه" کا مفعول مطلق مقدم ہونے کا ہے اور جملہ علامہ سندھیؒ کے نزدیک یقبض کے فاعل یا مفعول کا حال ہے، قاری کے الفاظ میں اب معنی یہ ہوئے: "لا یقبض العلم من العباد بان یرفعه من بینهم الی السماء[2]"

﴿بقبض العلما﴾ نوویؒ نے: معناه انه یموت حَمَلَتُهٗ[3] اور ملا علی قاریؒ نے: ای بموتهم ورفع ارواحهم کی تشریح کی ہے[4]، یعنی قبض سے علماء کی رحلت ووفات مراد ہے۔

---

[1] [2] [4] کتاب العلم فصل اول حدیث، ۹
[3] صحیح مسلم: ۲، کتاب العلم باب رفع العلم وقبضه

﴿اذا لم يبق﴾ مسلم وترمذی میں: "لم يترك" کے الفاظ ہیں بخاری کے طریق میں: "لم يَبْقَ عالمٌ" بھی آیا ہے

﴿اتخذ الناس رؤسا﴾ یہ: بضم الهمزة والتنوين رأس کی جمع ہے اور بفتح الهمزه والمد رئیس کی جمع ہے، دونوں ہی صحیح ہیں، لیکن نوویؒ اور مجددی نے پہلی کو اور ابن حجر نے دوسری کو ترجیح دی ہے، قاری کے الفاظ اس کا مطلب یہ ہوا: ای خليفة وقاضيًا ومفتيا واماما وشيخا[1].

﴿فسئلوا﴾ یہ مجہول سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے، جس کے معنی ہیں کہ: پھر ان سے مسائل پوچھے جائیں گے بخاری میں "یستفتون" کا لفظ ہے۔

﴿فافتوا بغير علم﴾ نووی فرماتے ہیں: "يحكمون بجها لاتهم[2]" بخاری میں: "فيفتون برايهم" منقول ہے۔

﴿فضلوا﴾ سندھیؒ نے لکھا ہے: "ای بالفتوی بلا علم"

﴿واضلو﴾ علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں: "اتباعهم الاخذين بفتواهم" یعنی فتوی لینے والے اپنے متبعین کو وہ گمراہ کردیں گے، اسی کو قاری نے: "ای مضلين لغيرهم فيعم الجهل العالم[3]" سے تعبیر کیا، امام نووی فقہ الحدیث یہ بتاتے ہیں: "وفيه التحذير من اتخاذ الجهال رؤسا[4]" یعنی حدیث میں جاہلوں کو پیشوا بنانے پر تنبیہ ہے، آج کا دور اسی حدیث کا مصداق ہے کہ: اب جو عالم بھی دنیا سے اٹھتا ہے، اس کا صحیح بدل نہیں لایا جاتا اور یہ مسند نالائق صاحبزادوں کے قبضے میں چلی جاتی ہے، قاضی ابوبکر ابن العربی لکھا ہے، کہ یہ امت کا امتیاز ہے کہ: علم رفتہ رفتہ اٹھایا جائے گا، ورنہ دوسری قوموں سے وہ دفعۃً سلب کیا گیا۔

ترجمۃ الباب بغیر علم ہے، اسی صورت میں رائے اور قیاس کو اختیار کیا جاتا ہے، جس سے اجتناب باب کا تقاضا ہے۔

حدیث صحیح بخاری (العلم/ ۳۵، الاعتصام/ ۸) صحیح مسلم (العلم/۲) جامع ترمذی (العلم

---

[1] [3] کتاب العلم فصل اول حدیث ۹،
[2] [4] صحیح مسلم: ۲، کتاب العلم باب رفع العلم وقبضہ

/۵) میں آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی صحیح ہے، اس کے اتنے طرق ہیں کہ: ابوبکر خطیب نے انہیں ایک ضخیم کتاب میں جمع کیا ہے ابن حجر نے ان کی تعداد ستر سے زائد بتلائی ہے۔

(۵۳/۳) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ، ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ أَبِيْ أَيُّوْب حَدَّثَنِيْ اَبُوْهَانِيْ حَمِيْدُ بْنِ هَانِي الْخَوْلَانِي، عَنْ أَبِيْ عُثْمَانَ مُسْلِمِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اُفْتِيَ بِفُتْيَا غَيْرَ ثَبْتٍ فَاِنَّمَا اِثْمُهُ عَلٰى مَنْ أَفْتَاهُ.

فرمایا جس کو بغیر دلیل وعلم کے فتویٰ دیا گیا، اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا۔

﴿من افتى بفتيا﴾ فتیا فتویٰ کی دوسری لغت ہے، جمع فتاوِی وفتاویٰ آتی ہے، اس میں دو قول ہیں، پہلا یہ کہ: وہ مجہول کا صیغہ ہے، جس سے مراد مستفتی ہے، علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے: ”ای من وقع فی خطأ بفتویٰ عالم فلا اثم علی متبع ذلك العالم“ یعنی اگر کوئی مسلمان کسی کے فتوی کی بنیاد پر غلطی کر بیٹھے تو اس کا گناہ اسے نہیں بلکہ فتوی دینے والے عالم کو ہوگا، ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: الاثم علی المفتی دون المستفتی[۱] علامہ سندھیؒ اور ملا علی قاریؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے، دوسرا قول معروف کا ہے جس کی مراد مفتی ہے، اس صورت میں دوسرے افتاہ کا مطلب استفتاہ ہوگا، ملا علا قاریؒ لکھتے ہیں: ”ای کان اثمهٗ علی من استفتاہ فانهٗ جعله فی معرض الافتاء بغیر علم[۲]“ اس صورت میں غلطی کا گناہ فتویٰ لینے والے کو ہوگا، کیونکہ اس نے بلا علم اس شخص کو افتاء کا منصب عطا کیا، علامہ سندھیؒ نے گناہ کیلئے یہ شرط بھی لگائی کہ مفتی جہالت کے ساتھ فتویٰ دینے میں مشہور ہو، پھر اس وقت اس سے مسئلہ پوچھنا ہی جائز نہیں: ”اذا کان هذا المفتی معلومًا بالجهل وبالفتویٰ به لم یجز ن یسأله ہمارے نزدیک یہ قول مرجوح بلکہ متروک ہے، کیونکہ افتاء کے معنیٰ استفتاء بتلانا ہی تسلیم نہیں، اس صورت میں تو ہر لفظ کے الٹے معنی کی گنجائش نکلتی ہے، پھر یہاں تمام تر گناہ مستفتی کو ہو رہا ہے اور مفتی بے گناہ لگتا ہے، حالانکہ قواعدِ شرعیہ مستفتی کے ساتھ مفتی کے گناہ کا بھی تقاضہ کرتے ہیں، کیونکہ اس نے نا اہل ہونے کے باوجود وہ کام کیا جو اس کا منصب نہیں تھا۔

[۱، ۲] مرقاۃ المفاتیح کتاب العلم فصل دوم

﴿غیر ثبت﴾ معنیٰ حجت، دلیل۔ کہا جاتا ہے: "لا احکم الابثبت" علامہ سندھی نے: "العدل الصواب" کے معنی لکھے ہیں، جو دلیل وحجت کا نتیجہ ہیں، یہ جملہ افتی کی ضمیر کا حال واقع ہوگا، سنن ابی داؤد میں بغیر علم کے الفاظ منقول ہیں...... افتاء نہایت اہم منصب ہے اور اس کا اہل صرف وہی شخص ہوسکتا ہے، جو نصوص شرعیہ، فقہی اصول ومبادی، متون وشروح اور فتاویٰ کی کتابوں سے واقفیت کے ساتھ زمانوں کے فرق کو بھی سمجھتا ہو، متقدمین نے مفتی کے لئے جن صلاحیتوں کی شرط لگائی ہے وہ اب عنقا ہیں، اس لئے احتیاط اب متاخرین کی تحریروں ہی میں جواب دینے میں ہے نوازل مستثنیٰ ہیں حدیث ابوداؤد (العلم/۷) میں آئی ہے علامہ دمیریؒ نے ابن ماجہؒ کی سندکو وهو حديث صحيح قرار دیا ہے۔ (الدیباجہ ۱/۲۸۳)

(۵۴/۳) حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ الْهَمْدَانِيُّ حَدَّثَنِي رِشْدِيْنُ بْنُ سَعْدٍ وَجَعْفَرُ بْنُ عَوْنٍ عَنْ ابْنِ اَنْعُمٍ هُوَ الْاِ فْرِيْقِيُّ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ رَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ "اَلْعِلْمُ ثَلَاثَةٌ فَمَا وَرَاءَ ذٰلِكَ فَهُوَ فَضْلٌ: آيَةٌ مُحْكَمَةٌ، اَوْسُنَّةٌ قَائِمَةٌ اَوْفَرِيْضَةٌ عَادِلَةٌ

﴿العلم ثلاثة﴾ علم تو تین ہیں اس کے علاوہ سب زوائد ہیں، آیت محکمہ یا سنت قائمہ، یا فریضہ عادلہ۔

ملاعلی قاریؒ نے اس کے معنی: "ای معرفة ثلاثة اشياء" لکھے ہیں، یعنی تین چیزوں کی معرفت علم ہے، جب کہ علامہ سندھی فرماتے ہیں: "ای علوم الدين ثلاثة" دینی علوم کی بنیادیں تین ہیں، گویا باقی سب فروع ہیں، جن کی حیثیت ذرائع کی ہے، مقصود کی نہیں یہی تعبیر زیادہ جامع ہے کیونکہ گفتگو یہاں معرفت کی نہیں ماخذ ومراجع کی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں هذا ضبط وتحديد لما يجب عليهم بالكفاية [1] یعنی فرض واجب کفائی کی تحدید مراد ہے۔

﴿فما وراء ذلك فهو فضل﴾ علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے: زائد يعنى كل علم سوى هذه العلوم الثلاثة وما يتعلق بها ممايتوقف هذه الثلاثة عليه ويستخرج

[1] مرقاۃ کتاب العلم فصل ثانی

منها فهو زائد لا ضرورة في معرفته" یعنی ہر وہ علم جو ان تینوں کے علاوہ ہو۔ خواہ ان کے قواعد ہوں یا فروع وہ سب زائد ہیں جن کی معرفت کی خاص ضرورت نہیں ہے۔

ملاعلی قاریؒ نے اس وضاحت کے بعد: "کالنحو والتصریف والعروض والطب وغیر ذلك[1]" کی مثال بھی پیش کی ہے، تو اب علم وہ ہوا جو دنیا کو وحی کے ذریعہ ملے اور یہ صرف کتاب وسنت اور ان سے ماخوذ ومستنبط احکامات ہیں رہی مذکورہ دوسری چیزیں تو وہ صنعت وحرفت ہیں علم نہیں، ان سے استفادہ علوم کی تحصیل میں ذرائع اور وسیلے کے طور پر ہوتا ہے۔

﴿آية محكمة﴾ اس کی شرح میں علامہ سندھیؒ نے أي غير منسوخة ملاعلی قاری نے غیر منسوخة او مالا يحتمل إلا تاويلا واحدا[2] اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے المراد به كتاب الله تعالى واحكام ثبوتها[3] سے کی ہے، مطلب یہ ہوا کہ اس سے کتاب اللہ کی وہ تمام آیات مراد ہیں جو منسوخ نہ ہوں اور ان کی مراد بھی واضح ہو۔

﴿او سنة قائمة﴾ علامہ سندھی نے لکھا ہے: اى ثابتة اسنادا بان تكون صحيحة اوحكما بان لاتكون منسوخة یعنی ثابت شدہ سنت جو سنداً صحیح ہو اور حکماً منسوخ نہ ہو، ملاعلی قاری نے: اى ثابتة صحيحة منقولة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم معمول بها کے الفاظ تحریر فرمائے ہیں اور حضرت مولانا ادریس کاندھلوی: التعليق الصبيح میں: فهي ثابتة المعمول بها[4] پر اکتفاء کرتے ہیں، لب لباب سب کا ایک ہی ہے، سندھیؒ کے الفاظ میں جو منسوخ نہ ہوگی، قاری اور کاندھلوی کے یہاں وہیں تو معمول بہا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ نے جامع تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: والقائمة مالم ينسخ ولم يهجر ولم يشذ راويه وجرى عليه جمهور الصحابة والتابعين[5].

﴿فريضة عادلة﴾ ملاعلی قاری نے اس کے ذیل میں چند اقوال نقل کئے ہیں۔

۱۔ علم الفرائض حضرت شاہ ولی اللہؒ کی بھی یہی رائے ہے سندھیؒ بھی شاید اسی طرف مائل ہیں۔

۱، ۲ مرقاۃ کتاب العلم فصل ثانی
۳ بذل المجہود ۴/۱۰۲
۴ مرقاۃ کتاب العلم فصل ثانی
۵ حجۃ اللہ البالغہ ۱/۱۷۱

۲؎ ”الفریضة العادلة ما اتفق علیه المسلمون وهو اشارة الی الحکم الثابت بالاجماع“ وہ امور واحکامات جن پر امت متفق ہو یہ اجماع کے ذریعہ ثابت شدہ چیزوں کی طرف اشارہ ہے، عبداللہ بن عروہ سے بھی یہی منقول ہے۔

۴؎ ”المراد بها الحکم المستنبط من الکتاب والسنة بالقیاس لمعادلته الحکم المنصوص فیهما ومساواته لهما فی وجوب العمل“ یعنی قیاس کے ذریعہ کتاب وسنت کے وہ مستنبط مسائل جو علت کے اشتراک کی بنا پر منصوص ہی کا درجہ رکھتے ہیں اور وجوب عمل میں بھی اسی کے مساوی ہیں مولانا ادریس کاندھلویؒ کا بھی یہی موقف ہے اور ملا علی قاری نے بھی: والحاصل ان ادلة الشرع اربعة الکتاب والسنة والاجماع والقیاس ویسمی الاجماع والقیاس فریضة عادلة تحریر فرما کر آخر کے دوقولوں کو ترجیح دی ہے ذوق بھی یہی کہتا ہے کہ: پہلے دو کی بنسبت آخر کے دوقول ہی نبوت کا منشا معلوم ہوتے ہیں......امام نے اس باب کے تحت حدیث کو درج کر کے یہ بتلایا ہے کہ: ان کے نزدیک شریعت کے مآخذ کتاب وسنت اجماع امت اور قیاس صحیح ہیں، ان کے علاوہ اب ہر چیز رائے زنی اور باطل قیاس شمار ہوگی، جس سے اجتناب ضروری ہے۔

رشدین بن سعد، ابن انعم افریقی اور عبدالرحمن بن رافع محدثین کے نزدیک بالاتفاق ضعیف ہیں اس لئے: ”الدیباجة علی ابن ماجه“ (۲۸۵/۱) میں مولانا لطیف الرحمن نے اسناده ضعیف کا فیصلہ کیا ہے ابوداؤد (فرائض/۱) کی سند میں صرف ابن رافع ہیں، اس لئے وہ ضعف ابن ماجہ سے کم ہے۔

(۵۵/۴) حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ حَمَّادٍ سَجَّادَةُ، ثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيْدٍ الْاُمَوِيُّ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سَعِيْدِ بْنِ حَسَّانَ ، عَنْ عُبَادَةَ بْنِ نُسَيٍّ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ غَنْمٍ، ثَنَا مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ قَالَ لَمَّا بَعَثَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الْيَمَنِ قَالَ: لَا تَقْضِيَنَّ اَوْلَا تَفْصِلَنَّ اِلَّا بِمَا تَعْلَمُ وَاِنْ اَشْكَلَ عَلَيْكَ اَمْرٌ فَقِفْ حَتّٰى تُبَيِّنَهُ اَوْتَكْتُبَ اِلَيَّ فِيْهِ.

فرمایا تم ہرگز قاضی نہ بننا نہ کوئی فیصلہ کرنا، مگر صرف ان مسائل کے بارے میں جن کا تمہیں علم ہو،

اگر تمہیں کوئی اشکال پیش آئے تو رک جانا تا کہ اسے منقح کر سکو، یا پھر اس کی بابت مجھے لکھو۔

علامہ کمال الدین دمیریؒ کا کہنا ہے: انفرد به المصنف وهو ضعيف فان فيه محمد بن سعيد وهو متروك الحديث محمد بن سعید کی بابت محدثین کا موقف بڑا سخت ہے، اس پر ابومسہر نے: هو من كذا بى الاردن عمرو بن علی نے: حدث بأحاديث موضوعة جو زجانی نے: هو مكشوف الامر هالك احمد بن صالح نے: وضع أربعة الاف حديث نسائی اور دار قطنی نے متروك الحديث حاکم نے: هو ساقط لاخلاف بين اهل النقل فيه احمد ابن حنبل نے: قتله المنصور على الزندقة وصَلَّبَهٗ احمد بن صالح مصری نے زندیق ضربت عنقه، ابن حبان نے: كان يضع الحديث لا يحل ذكره الا على وجه القدح ابواحمد حاکم نے: كان يضع الحديث صلب على الزندقة نسائی نے: الكذابون المعروفون بوضع الحديث اربعة ابراهيم بن ابى يحيى بالمدينة والواقدى ببغداد، ومقاتل بخراسان، ومحمد بن سعيد بالشام اور ابن حجر نے كذبوه کا تبصرہ کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تقریب ۲/۱۶۴، تہذیب ۹/۱۶۳)

جس روای کو محدثین نے زندیق کہا ہو اور وضع حدیث کے جرم میں اسے پھانسی تک ہوئی ہو، اس کی روایت کا درجہ تو بالکل ہی گر جاتا ہے، بوصیری کو زوائد ابن ماجہ (۱/۵۰) میں یہاں: هذا اسناد ضعيف سے کہیں زیادہ سخت فیصلہ کرنا چاہئے تھا، علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے کہ: اس کی دوسری سندوں میں بھی رواۃ مجہول ہیں، اسی لئے ابن الجوزی نے اسے موضوع قرار دیا ہے، علامہ سندھیؒ نے درایتی اعتبار سے بھی سے یمن جاتے وقت اسے حضرت معاذ اور حضور کی گفتگو[1] کے خلاف بتلایا ہے۔

(۵/۵۶) حَدَّثَنَا سُوَيْدُ بْنُ سَعِيْدٍ، ثَنَا ابْنُ أَبِيْ الرِّجَالِ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَمْرِو الْأَوْزَاعِيِّ، عَنْ عَبْدَةَ بْنِ أَبِيْ لُبَابَةَ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: "لَمْ يَزَلْ اَمْرُ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ مُعْتَدِلًا حَتّٰى نَشَأَ فِيْهِم الْمُوَلَّدُوْنَ، اَبْنَاءُ سَبَايَا

[1] ملاحظہ ہو، سنن ابی داؤد کتاب القضاء، باب اجتہاد الرای فی القضاء

الأُمَمِ،فَقَالُوْا بِالرَّايِ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوْا"
فرمایا بنی اسرائیل کے حالات بالکل درست رہے، یہاں تک کہ نئی مخلوط نسل اور دوسری قوموں کی باندیوں کی اولاد کا دور آیا، انہوں نے رائے اور خیال پر انحصار کیا، نتیجتاً خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

﴿حتّٰی نَشَأَ فِیْهِمُ الْمُوَلَّدُوْنَ﴾ نشأ الطفل، جوان ہونا، یہاں معاشرہ پر چھا جانا مراد ہے، ترجمے میں اس کی رعایت ہے، المولد تولید سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، بعض حضرات نے اسے فاعل قرار دیا جو درست نہیں، معنی ہوئے عجمی باندیوں سے پیدا ہونے والی عربوں کی نئی مخلوط نسل۔

﴿ابناء سبایا الأمم﴾ علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں: جمع سبیة وهی المرأة المنهوبة فعیلة بمعنی مفعولة سبیہ فعیلہ کے وزن پر مفعول کا صیغہ ہے اور یہ اس عورت کو کہتے ہیں، جو لوٹ کر لائی گئی ہو، یہاں باندی مراد ہے، وہ عموماً دوسری قوموں سے تعلق رکھتی ہے، کردار کی پستی کا بھی شکار ہوتی ہے، دل ودماغ گھٹیا خیالات اور غلط جذبات کی آماجگاہ ہوتے ہیں ظاہر ہے اب ان کی کوکھ سے جو نسل جنم لے گی، وہ اپنے موروثی اثرات سے کیونکر خالی ہوسکتی ہے اس کے اندر کمتری کا احساس، جاہ ومنزلت کی طلب اور انتقامی جذبہ بھی کچھ نہ کچھ پایا جاتا ہے، عموماً یہ نسل حکمراں طبقے کی غلط کاریوں کا ثمرہ ہوتی ہے، اس لئے پہلے تو سیاسی سطح پر قومی امور میں اس کا دخل شروع ہوتا ہے، پھر یہ منہ چڑھے لوگ مذہبی مناصب پر بھی آبیٹھتے ہیں۔

﴿فقالوا بالرأی﴾ جامع بیان: ابن عبدالبر نے فاحدثوا فیهم القول بالرای اور مسندِ بزار میں: فافتوا بالرأی نقل کیا ہے، نسبی دنائت، مزاج کی پستی، اور صحیح تعلیم وتربیت سے محرومی کے باعث وہ ان بلند مناصب کے قطعاً اہل نہ تھے، اس لئے کتاب وسنت کی بنیاد پر جواب دینے کے بجائے انہوں نے ہر مسئلہ میں رائے زنی شروع کی اور یہیں سے تحریف کا آغاز ہوا ہے، اور پھر رفتہ رفتہ بنی اسرائیل کی پوری شریعت ہی بدل گئی، نبوی تصریح کے مطابق مسلمانوں کا زوال بھی ان ہی کے طرز پر ہوگا، دشمنوں نے دوسرے محاذوں پر ناکامی کے بعد

ہمارے اندر ایسی ہی عورتیں داخل کر دیں، جنہوں نے سازشیں رچنے کے ساتھ ہمارے خون کو ہمارے ہی خلاف استعمال کیا، خلافت اموی، عباسی اور ترکی، تینوں کے سقوط میں یہ عنصر بھی کارفرما ہے کہ: بسا اوقات حکومت ان کے حرم سے ہوتی تھی، اور آج بھی مسلم حکمرانوں کے حرم میں بے شمار یہودی وصلیبی لڑکیاں موجود ہیں، جنہوں نے اپنے حسن ورعنائی سے عالم اسلام کو کافروں کا اڈہ بنا دیا۔ واا سفاہ

علامہ کمال الدین دمیریؒ کی تصریح کے مطابق صحاح میں یہ روایت صرف ابن ماجہ نے نقل کی ہے، دیگر رواۃ تو ثقہ ہیں، لیکن ایک راوی ابن ابی الرجال مضبوط نہیں، امام احمد، ابن معین، دارقطنی اور ابن حبان نے ان کی توثیق کی ہے، ابن حجر لکھتے ہیں: "صدوق ربما أخطأ" ملاحظہ ہو، تقریب (۳۸۵۸) اور تہذیب التہذیب (۱۵۴/۶) اس لئے بوصیری نے زوائد ابن ماجہ (۵۰/۱) میں: هذا اسناد ضعيف لضعف ابن ابی الرجال واسمه حارثة بن محمد بن عبد الرحمن کا فیصلہ کیا ہے، لیکن یہ جرح ضبط سے متعلق ہے راوی کی عدالت سے نہیں اسلئے تعدد طرق سے اس ضعف کا ازالہ ہو جائے گا اور روایت حسن لغیرہ کے درجہ میں آجائے گی، یہ طرق مسند دارمی، مسند بزار اور جامع ابن وہب میں موجود ہیں۔

کتاب الایمان

ایمان کا لفظ أمَن سے مشتق ہے، جس کے معنی مطمئن ومحفوظ ہونا ہے، باب افعال بیشتر موقعوں پر تعدی کے لئے ہی آتا ہے، اس لئے اب مطلب یہ ہوا کہ: دوسرے کو اپنے شک وتکذیب سے محفوظ کر کے اس کی بالکلیہ تصدیق کردی، اسی لئے علماء نے ایمان کا ترجمہ عموماً تصدیق سے کیا ہے، اور اہل علم دونوں کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھتے ہیں، حالانکہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ: ایمان کے مادہ میں ہمیشہ امانت واعتماد کا مفہوم ملحوظ رہتا ہے، جب کہ تصدیق میں یہ خصوصیت نہیں ہے، اس لئے ہر اس خبر میں تصدیق کا لفظ استعمال ہوسکتا ہے، جہاں مخبر کی امانت داری ملحوظ ہو یا نہ ہو، تو نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا تعلق زیادہ مشاہدات وتجربات سے ہے، جب کہ ایمان بنیادی طور پر مغیبات سے وابستہ ہے، یعنی پیغمبر کے اعتماد پر ایسی چیزوں کا تسلیم کرنا، جن تک حواس وادراک تو کیا تصورات تک کی رسائی نہیں ہوتی، جیسا کہ ذات وصفات، قضاء وقدر، جنت ودوزخ اور برزخ سے لے کر قیامت تک پیش آنے والے واقعات تو اس طرح کل ماجاء به الرسول من عند الله کی تصدیق ایمان کہلاتی ہے۔

ایمان کی حقیقت

یہ دراصل وہ نور ہے، جو بندے کے دل ودماغ میں گھر کر کے اس کے پورے وجود کو اعتماد وتسلیم کی کیفیت سے سرشار کردیتا ہے، امام بیہقی اور ابن ابی شیبہ نے حضرت علی کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے، کہ: ایمان سب سے پہلے ایک سفید نقطہ کی شکل میں قلب پر نمودار ہوتا ہے، پھر جتنا ایمان بڑھتا ہے، اتنا ہی یہ نقطہ پھیلتا ہے، تا آنکہ ایمان کی تکمیل پر پورا دل سفید ہوجاتا ہے، یہی حال نفاق کا ہے، وہ سیاہ نقطہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، اور بالآخر پورے قلب کو سیاہ کردیتا ہے، ایمان وکفر کے اثرات براہ راست دل پر پڑتے ہیں اور وہی پورے انسانی وجود پر حکومت کرتا ہے، اس لئے صحیح بخاری (کتاب الایمان) میں روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا: ألا و ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا
فسدت فسد الجسد کله ألا و هی القلب قرآنی تعبیرات کے مطابق کفار کے قلوب:
اثم قلبه عام مسلمانوں کے قلب منیب اور ایمان وتقوی کے بلند مقام پر فائز لوگوں کے دل
قلب سلیم کہلاتے ہیں، قلب اثیم شیطانی الہامات سے فیضیاب ہوکر کفر وجاہلیت کے
معائب کو انسان کی نظر میں عمدہ بنا دیتا ہے: زُيِّن للناس حب الشهوات کا یہی مطلب ہے،
جب کہ: ''قلب منیب'' اور قلب سلیم تجلیات الٰہی سے روشن ہوکر دنیا سے متنفر ہوتے ہیں
اور آخرت ہی ان کی منزل مقصود بن جاتی ہے، نتیجتاً اخلاق رذیلہ سے کوئی تعلق نہیں رہتا اور
اخلاق فاضلہ ہمہ دم قلب کو گرماتے ہیں: أفمن شرح الله صدره للاسلام فهو علی نور
من ربّه میں اسی طرف اشارہ ہے، ایمان کی بنیادیں ذات صفات ملائکہ ورسل تقدیر وآخرت
اور آسمانی کتابیں ہیں، دل ودماغ کو روشن ومنور کر کے وہ انسان کی تمام کی تمام صفات وحالات
کو یکسر بدل ڈالتا ہے اور زندگی کے تمام شعبے اس کی گرفت میں آجاتے ہیں: الایمان بضع
وسبعون شعبة اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے، جس کا آغاز: لا اله الا الله سے ہوتا ہے
اور عبادات ومعاملات کے مراحل طے کر کے انسان اخلاق کی اس بلندی پر پہنچ جاتا ہے، جہاں:
اماطة الاذی عن الطریق جیسی معمولی چیز کے ثواب سے بھی وہ محروم نہیں ہونا چاہتا۔

﴿لا یؤمن احدکم﴾ اور لا ایمان لمن لا أمانة له جیسی احادیث ایمان کے
انہیں شعبوں کی وضاحت ونشاندھی کرتی ہے، جن کو حدیث میں: بضع وسبعون کے مختصر اور
مجمل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور قرآن میں ایمان کے نتیجے کے طور پر ہر جگہ: وعملوا
الصالحات کا تذکرہ ہے، مختصراً یہ کہ وہ انسانی رگ ریشے میں سرایت کر کے اس کے ہر پہلو
سے پھوٹتا اور ہر اداء سے چمکتا ہے، ایمانی رسوخ کی تین بنیادیں ہیں، ۱۔ آخرت کی طرف
میلان ۲۔ دنیا سے یکسوئی وبے رغبتی، ۳۔ موت سے پیشتر آخرت کی تیاری یہ امور اس کے
استحکام ورسوخ پر دلالت کرتے ہیں اور پھر آندھی اور طوفان بھی اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے،
بلال، وعمار، خبیب ومقداد، سمیہ وزنیرہ اور قرن اول سے آج تک امت کی قربانی کے تمام
واقعات اسی کی دلیل ہیں۔

اس تمہیدی گفتگو کے بعد ضروری ہے کہ: ایمان وعقیدے کی بابت وہ مباحث بھی درج کئے جائیں جو محدثین اور متکلمین کی سالہا سال کی عرق ریزی کا نتیجہ ہیں، اس ضمن میں تصدیق قلب، اقرار لسان، اعمال جوارح، ایمان واسلام کے فرق، ایمان کی کمی وزیادتی اور اس کے مرکب وبسیط ہونے پر بحث کی جاتی ہے۔

ایمان واسلام کا فرق

واضح رہے کہ عقیدہ ایک تخم اور اعمال اس کی شاخیں اور پھول ہیں، اسی لئے علماء نے ایمان واسلام کے درمیان فرق قائم کیا ہے، خود قرآنی آیات واحادیث میں اس کی رعایت کی گئی اور ایمان کا تعلق باطنی کیفیات اور اسلام کا تعلق ظاہری احوال سے دکھائی پڑتا ہے، چنانچہ محی الدین ابن العربی نے دونوں کی وضاحت: **الاسلام عمل والایمان تصدیق**[1] سے شیخ الاسلام حضرت کشمیریؒ نے: **فالاسلام علی جوارحه لم یسر ذلك الی باطنه والایمان فی قلبه ولم یرق هذا الی ظاهره**[2] سے اور خطابی نے: **واصل الایمان التصدیق واصل الاسلام الاستلام والانقیاد**[3] سے کی ہے۔

سب کا خلاصہ یہی ہے کہ: ایمان عقیدے کا نور ہے، جو دل میں جلوہ گر ہوکر خارجی مظاہر پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، جب کہ اسلام ان ظاہری اعمال وصفات کا نام ہے، جن کی باطنی کیفیت دل میں ہوتی ہے، اور وہ ایمان ہے، امام غزالی فرماتے ہیں کہ ایمان اور اسلام کے درمیان خصوص وعموم کی نسبت ہے، یعنی اسلام کا جوہر ایمان ہے، اور ایمان کا مظہر اسلام ہے،[4] امام خطابی اور بدر الدین عینی نے بھی الفاظ وتعبیرات کے فرق کے ساتھ یہی لکھا ہے جب کہ کچھ حضرات نے عموم وخصوص کی تردید کی ہے۔

محل ایمان

پھر یہاں یہ مسئلہ بھی زیر غور ہے کہ محل ایمان کیا ہے: **اولئك کتب فی قلوبهم الایمان، وقلبهٗ مطمئن بالایمان، یخرج من النار من کان فی قلبه مثقال ذرة من**

---

۱ التعلیق الصبیح (ج:۱/۱۳)
۲ فیض الباری (ج:۱/۳۵)
۳ صحیح مسلم (ج:۱/۲۵)

الایمان اور هل لاشققت قلبه کی بنیاد پر علماء کا فیصلہ ہے کہ: ایمان کا مورد ومحل قلب ہے گرچہ مجمع البحار میں امام اعظم کی جانب دماغ کا قول منسوب ہے، حضرت کشمیریؒ نے ان دلائل کی بنیاد پر اس کی تردید کی ہے اور محل ایمان قلب ہی کو قرار دیا ہے، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دونوں کے فرق اور محل ایمان کی بابت فیصلہ کن انداز میں لکھتے ہیں۔

والحق ان الایمان عبارة عن التصدیق کقوله تعالیٰ وما انت بمؤمن لنا ای بمصدق والاسلام عبارة عن التسلیم وللتصدیق محل خاص وهو القلب واما التسلیم فانه عام فی القلب واللسان والجوارح فکل تصدیق تسلیم ولیس کل تسلیم تصدیقا فموجب اللغة ان الاسلام اعم والایمان اخص.

جب کہ بعض حضرات دونوں کو مترادف سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک ہر ایک کا استعمال دوسرے پر جائز ہے، ایمان کا پہلا درجہ معرفت ہے، یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ کو پہنچان لینا یہ بلاشبہ ایمان کی سمت پہلا قدم ہے، لیکن اس کے بعد تصدیق قلب، اقرار لسان اور اعمال جوارح کی ضرورت ہوتی ہے، جب ہی ایمان معتبر اور کامل ہوگا۔

جہمیہ کا موقف

جہم ابن صفوان جو امام اعظمؒ کا معاصر تھا، صرف معرفت کو ایمان قرار دیتا ہے، اور اس کے نزدیک نہ صرف اقرار ضروری نہیں، بلکہ کوئی شخص اگر زبان سے انکار بھی کر گذرے تو بھی معرفت قلبی کی بنیاد پر وہ مؤمن کامل ہوگا: **من مات وهو یعلم انه لا اله الا الله دخل الجنة** جیسی احادیث جہمیہ بطور استدلال پیش کرتے ہیں، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ نے کتاب الایمان (۱۳۷، ۱۳۸) میں لکھا ہے کہ: اس مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ نے اس کی تردید فرمائی ہے، اور اہل نظر کے نزدیک یہ قول پرکاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتا، کیونکہ اس صورت میں تو ابلیس، ہرقل اور ابوطالب بھی مومن ٹھہریں گے، کیونکہ وہ تصدیق ہی سے تو محروم رہے، معرفت بہرحال انہیں حاصل تھی، اس لئے حضرت کشمیریؒ نے خوب فرمایا ہے کہ: ایمان جان لینے کا نہیں مان لینے کا نام ہے۔

کرامیہ کا موقف

جہمیہ کے برخلاف دوسرا طبقہ کرامیہ کا ہے، جہمیہ نے محض علم ومعرفت کو ایمان قرار دیا چاہے کوئی شخص زبان سے انکار کرے، کرامیہ نے صرف اقرار باللسان کو ایمان کہا چاہے معرفت وتصدیق موجود نہ ہو، حضرت کشمیریؒ ان لوگوں کی بابت تحریر فرماتے ہیں: فانهم زعموا ان الاقرار باللسان يكفي للنجاة[1].

یعنی اخروی نجات کے لئے صرف اقرار کافی ہے، اور تصدیق نہ ہونے کے باوجود وہ کامل الایمان ہے، ان حضرات نے: من قال لا اله الا الله دخل الجنة جیسی روایات سے استدلال کیا ہے، جن میں صرف اقرار کی تصریح ہے، معرفت وتصدیق کا کوئی تذکرہ نہیں جہمیہ کی طرح ان لوگوں کا قول بھی بداہۃً غلط ہے، کیونکہ علم ومعرفت اور تصدیق قلبی نصوص کی روشنی میں ایمان کی اولین بنیادیں ہیں، اس کے بغیر کسی کو مسلمان کہنا ان تمام منافقین کو ایمان ومعرفت کا پروانہ دینا ہے، جو روزانہ عہد رسالت میں ایمانی اقرار کیا کرتے تھے، حالانکہ ان کے دل عناد وتکذیب سے بھرے تھے، اور ہمہ دم وہ اسلام کو نقصان پہنچانے کے درپہ تھے، قرآن نے انہیں پرلے درجے کا جہنمی قرار دیا۔

مرجیہ کا مذہب

جہمیہ اور کرامیہ کے بعد تیسرا طبقہ مرجیہ کا ہے ان کا کہنا ہے کہ: معرفت وتصدیق کے بعد صرف زبانی اقرار کافی ہے، اعمال صالحہ کی کوئی ضرورت نہیں، چنانچہ کوئی شخص اگر ایمان لانے کے بعد پوری زندگی دینی فرائض وواجبات سے دور لہو ولعب میں مست رہا، تو بھی وہ ان وعدوں اور بشارتوں کا مستحق ہے، جو قرآن وحدیث میں مومنوں کے حق میں وارد ہوئی ہیں: وان زنى وان سرق جیسی احادیث ان کی دلیل ہیں ان لوگوں کے نزدیک ایمان بسیط ہے، مرکب نہیں امام اعظم ابوحنیفہؒ کی طرف بھی یہ قول منسوب کیا گیا ہے، لیکن اہل نظر کے نزدیک اس کا بعینہٖ انتساب درست نہیں تفصیل آگے آرہی ہے۔

---

[1] فیض الباری (۴۹/۱)

معرفت وتصدیق کا فرق

یہیں پر مناسب ہے کہ: معرفت اور تصدیق کا فرق بھی بیان کر دیا جائے، علامہ آلوسی نے روح المعانی (۱/۹۵) میں لکھا ہے۔

فان كان حاصلا بالقصد والاختيار بحيث يستلزم الاذعان والقبول فهو تصديق لغوى، وإن لم يكن كذلك لمن وقع بصره على شئ فعلم انه جسد مثلا فهو معرفة يقينية وليس بتصديق لغوى.

اگر علم ومعرفت قصد واختیار کے ذریعے حاصل ہو اور اس میں قبول واطاعت بھی شامل ہو، تو وہ تصدیق لغوی ہے اور اگر ایسا نہیں، تو یقینی معرفت ہے تصدیق نہیں، مثلاً کسی چیز پر نظر پڑ جائے اور وہ یہ جان لے کہ یہ جسم ہے، یعنی معرفت صرف پہنچاننے کا نام ہے، اس کیلئے اظہار ضروری نہیں یہ درجہ بسا اوقات حالت کفر میں بھی حاصل ہوتا ہے قرآن کی آیت: **وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم ظلما وعلوا، يعرفونه كما يعرفون ابنائهم** اور **فلما جاء هم ما عرفوا كفروا به** میں اسی کی طرف اشارہ ہے، جب کہ تصدیق کے مفہوم میں یہ بات شامل ہے کہ: بالقصد معرفت حاصل کرے اور اسے قبول کر کے اطاعت میں لگ جائے۔

معتزلہ وخوارج کا مذہب

چوتھا مذہب خوارج ومعتزلہ کا ہے، ان کے نزدیک ایمان بسیط نہیں، بلکہ قلبی تصدیق، زبانی اقرار اور جسمانی اعمال سے مرکب ہے، ان تین امور میں کسی ایک کا بھی تارک ان کے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہے، معتزلہ کی اکثریت اسے اسلام وکفر کے درمیان ایک تیسرے درجہ میں رکھتی ہے، جب کہ خوارج تارکین عمل اور مرتکب کبائر کو کافر ومرتد قرار دیتے ہیں: **لا يزنى الزانى حين يزنى وهو مؤمن** الخ وغیرہ ان کی مستدل ہیں۔

مندرجہ بالا چاروں مذہب افراط وتفریط کا شکار ہیں اور ہر ایک نے نصوص کے ایک پہلو کو پکڑ کر دوسرے زاویوں سے صرف نظر کر لیا ہے۔

مرکب وبسیط کی بحث

اسلئے صحیح موقف اہل سنت والجماعت ہی کا ہے ان میں دو فریق ہیں، پہلے فریق کا عقیدہ

ہے کہ: ایمان مرکب نہیں بسیط ہے اور وہ صرف تصدیق قلبی کا نام ہے رہا اقرار باللسان تو یہ ایمان کی صحت کی نہیں، بلکہ اسلامی احکام کے اجراء کی شرط ہے، اسی طرح اعمال جوارح اس کے اجزاء نہیں تکمیل کا ساماں ہیں، امام ابوحنیفہؒ، ابوالحسن اشعریؒ، ابومنصور ماتریدیؒ اور جمہور متکلمین وفقہاء کا یہی مذہب ہے، ان کے نزدیک تارکِ عمل اور مرتکب کبیرہ فاسق ہے، کافر نہیں۔

جب کہ اہل سنت کے دوسرے فریق کا کہنا ہے کہ ایمان بسیط نہیں بلکہ قلبی تصدیق، زبانی اقرار اور جسمانی اعمال سے مرکب ہے امام شافعی اور جمہور محدثین اسی طرف گئے ہیں، ان کے نزدیک بھی عمل کا تارک فاسق ہے کافر نہیں: بنی الاسلام علی خمسٍ اور الایمان: بضع وسبعون شعبۃ جیسی احادیث ان حضرات کا مستدل ہیں، بظاہر دونوں فریقوں میں تضاد ہے، لیکن حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنیؒ نے تقریر بخاری (۱/۱۰۰، ۱۰۱) میں لکھا ہے کہ: محدثین وفقہاء کے درمیان ایمان کے مرکب وبسیط ہونے میں جو اختلاف ہے، وہ صرف الفاظ وتعبیرات کا فرق ہے، بات دونوں کی ایک ہے، فریق اول ایمان کو بسیط کہہ کر بنی الاسلام علی خمسٍ اور: الایمان بضع وسبعون شعبۃ کو ایمان کے مکملات قرار دیتا ہے، جب کہ دوسرا فریق انہیں اجزاء ترکیبی کہتا ہے، نہ فقہاء کے نزدیک تارک اعمال سیدھا جنت میں جائے گا۔

جیسا کہ مرجیہ کا عقیدہ ہے، نہ محدثین کے نزدیک وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا، نتیجہ ایک ہی نکلا کہ: وہ گناہوں کی سزا بھگت کر جنت میں داخل ہوگا، جب دونوں فریقوں کا مقصود ایک ہے اور ان کے درمیان صرف الفاظ وتعبیر کا فرق ہے، تو پھر دونوں نے ایمان کی ایک ہی تعریف وتعبیر کیوں نہ اختیار کی تاکہ محدثین پر اعتزال اور فقہاء پر ارجاء کا الزام عائد نہ ہوتا؟ ایضاح البخاری (۲/۱۴۴) میں اس کی وجہ حضرت شیخ الہندؒ سے یہ بیان کی گئی ہے کہ: اہل سنت والجماعت کا مقابلہ ہر دور میں باطل فرقوں سے رہا ہے اور انہوں نے رد وقدح میں ہمیشہ اپنے زمانے کے مزاج وفکر کو ملحوظ رکھا ہے، امام اعظم کے دور میں اعتزال کا اثر تھا اور حکومت تک اس کے دام فریب میں آگئی تھی، تو امام نے ان کی پوری مخالفت کی اور ایمان کو بسیط قرار دے کر عمل کو اس کے دائرے سے نکال دیا، جب امام شافعی کا دور آیا تو مقابلہ کرامیہ سے تھا، جو صرف

اقرار کو ایمان قرار دیتے تھے، اور تصدیق وعمل سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا، امام شافعی نے ان کا رد کرنے کے لئے تصدیق قلبی، اقرار باللسان اور عمل بالابدان سے مرکب مجموعہ کو ایمان قرار دیا نتیجہ یہ نکلا کہ ایمان کی حقیقت تو دونوں کے نزدیک ایک ہے بس اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے پیش نظر الفاظ واسلوب بدل گئے ہیں۔

الایمان یزید وینقص

اسی ضمن کی ایک معرکۃ الآراء بحث یہاں ایمان میں کمی وزیادتی کی ہے، قرآنی آیات ۱ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا، ۲ فَزَادَهُمْ اِيْمَاناً، ۳ فَمِنْهُمْ مَنْ يَّقُوْلُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖ اِيْمَانًا، ۴ فَاَمَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا، ۵ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِيْمَانًا ۶ وَلِيَزْدَادُوْا اِيْمَانًا مَعَ اِيْمَانِهِمْ، ۷ وَمَازَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا، اس سلسلے میں برھان قاطع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور امام بخاری نے نقص وزیادتی پر انہیں سے استدلال کیا ہے، عبد اللہ بن مسعود حذیفہ بن الیمان، ابراہیم نخعی، حسن بصری، عطاء، طاؤس، مجاہد، عبد اللہ بن مبارک، سفیان ثوری، عبد اللہ بن عمر، معمر بن راشد، ابن جریج، سفیان بن عیینہ، امام اوزاعی، امام مالک وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے، بلکہ امام ابوالحسن علی بن خلف بن بطال مالکی مغربی نے تو یہاں تک لکھ دیا: "مذھب جماعة اهل السنة من سلف الامّة، وخلفها ان الایمان قول وعمل یزید وینقص" (مسلم ۲/۲۵) جب کہ امام ابوحنیفہؒ ایمان کے بسیط ہونے کی بناء پر اس کی کمی وزیادتی کو تسلیم نہیں کرتے کیونکہ وہ تو اللہ کے ساتھ ایک عہد ہے جو کمی زیادتی کو متحمل نہیں ہوتا حضرت مولانا فخر الدین صاحب علیہ الرحمۃ شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند فرماتے ہیں کہ: الایمان لا یزید ولا ینقص کا انتساب امام اعظم کی جانب درست نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ وہ ان کتابوں کی بنیاد پر کیا گیا ہے، جو گرچہ امام کی طرف منسوب ہیں، لیکن واقعتاً وہ دوسروں کی تالیف ہیں، جیسا کہ فقہ اکبر کو ابوحنیفہؒ کی تصنیف کہا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ ان کے شاگرد ابومطیع بلخی کی لکھی ہوئی ہے جو فقہاء کی نظر میں بلند مرتبہ سہی لیکن[1] محدثین کے نزدیک کمزور ہے، اس لئے امام تک اس قول کی نسبت کی صحت میں کلام ہے'

---

۱ ایضاح البخاری جز ثانی (۱۴۷،۱۴۸)

حضرت کشمیریؒ کو بھی ایک عرصہ تک اس قول کے انتساب میں شک تھا اور وہ اس کی تردید کرنا چاہتے تھے، لیکن بروقت ابوعمر مالکی کی شرح موطا میں انہیں یہ تصریح ملی کہ: یہ قول امام کے استاذ حماد کا ہے اور حنفیہ کا ثابت شدہ مذہب ہے، تو اب مندرجہ بالا آیات کی کیا تاویل وتشریح ہوگی؟ علماء نے اس ضمن میں تین توجیہات پیش کی ہیں۔

۱۔ آیات واحادیث میں اصالۃً ایمان کی کمی بیشی مرادنہیں، بلکہ کمال ایمان کی رو سے نقص وزیادتی مراد ہے، حضرت کشمیریؒ اور شیخ الاسلام علامہ عثمانی فرماتے ہیں کہ: نقص وزیادتی کے قائل خود بھی۔ اس موقع پر یہی تاویل کرتے ہیں۔

۲۔ دوسری توجیہ فتح الملہم میں یہ کی گئی ہے کہ: نصوص اصل ایمان کی نہیں، بلکہ اس کے نور کی کمی زیادتی کو بتاتی ہیں، اور اس نور کی شریعت میں بہت سی نظیریں موجود ہیں مثلاً: أفمن شرح اللّٰہ صدرہٗ للاسلام فھو علی نور من ربّہ میں شرح صدر سے اعمال صالحہ کی توفیق مراد ہے، جن سے نور ایمان کی کرنیں پھوٹتی ہیں اور وہ بندوں کی ایمانی کیفیات اور حالات وتغیرات کی بنا پر مدہم اور تیز ہوتی رہتی ہیں۔

۳۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حوالے سے مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے التعلیق الصبیح میں تیسری توجیہ یہ پیش کی ہے کہ: ایمان کے دو معنی ہیں، ایک تو تصدیق الجنان بما لا بُدّ من تصدیقه یعنی ضروریات دین کی معرفت وقلبی تصدیق جو صرف ایک عقیدہ ہے اور حدیث جبرئیل میں: أن تو من باللّٰه الخ میں یہی مراد ہے، ایمان کے دوسرے معنی سکینت، بشاشت، حلاوت اور طمانینت کے ہیں، جو مقربین کو حاصل ہوتی ہیں: انزل السكنية فی قلوب المومنين ليزدادوا ايمانًا مع ايمانهم، اولم تؤمن قال بلی ولكن ليطمئن قلبی جیسی آیات اسی معنی کا پتہ دیتی ہیں، حضرت مولانا کاندھلویؒ تطبیق دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: جو لوگ ایمان میں کمی زیادتی کے قائل ہیں، ان کے پیش نظر شاید یہ دوسرے معنی ہیں: فمن قال بزيادة ايمان ونقصان فلعلهٗ اراد الايمان بمعنی السكينة والطمانينة (التعلیق ۱/۱۳) اور جو حضرات کمی زیادتی کا انکار کرتے ہیں، ان کے سامنے اس کا پہلا مفہوم ہے، یعنی وہ تصدیق جس کے باعث انسان کفر ونفاق سے نکل کر ایمانی کیفیت سے سرشار ہوتا

ہے اور وہ اول آخر تمام مسلمانوں میں مشترک ہے: ومن قال ان الایمان لا یزید ولا ینقص فقد اراد الایمان بمعنی التصدیق الذی یخرج به المرأ عن الکفر والنفاق ویشترك فیه جمیع المؤمنین اولهم وآخرهم (التعلیق ۱/۱۳) پہلی دونوں توجیہات کی بنسبت یہ تاویل وتطبیق زیادہ باوزن اور دل لگتی ہے اور اس کو اختیار کرنے کے بعد نزاع لفظی کی دیوار بھی منہدم ہوکر اہل سنت کے دونوں فریق باہم گلے آملتے ہیں۔

(۱/۵۷) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ الطَّنَافِسِيُّ، ثَنَا وَكِيعٌ ، ثَنَا سُفْيَانُ عَنْ سُهَيْلِ بْنِ اَبِي صَالِحٍ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "اَلْإِيْمَانُ بِضْعٌ وَّسِتُّوْنَ أَوْسَبْعُوْنَ بَابًا أَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ وَأَرْفَعُهَا قَوْلُ: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيْمَانِ

فرمایا ایمان ساٹھ یا ستر سے کچھ زیادہ باب کا نام ہے، جن میں سب سے کم درجہ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے اور ان کا سب سے اونچا درجہ لا الٰہ الا اللّٰہ کی گواہی ہے اور حیا بھی ایمان ہی کا شعبہ ہے۔

﴿بضع﴾ بضعة دونوں بکسر الباء وفتحها منقول ہیں، ملا علی قاریؒ نے اس کی بابت قاموس کے حوالے سے پانچ قول نقل کئے ہیں، ۱ ما بین الثلث الی التسع علامہ سندھیؒ نے فرمایا: وهو الصحیح ۲ مابین الثلث إلی الخمس ۳ مابین الواحد الی الأربع ۴ من اربع إلی تسع ۵ هو سبع آگے لکھتے ہیں: یؤیدهٗ انه جاء فی بعض الروایات سبع وسبعون [۱] جب کہ امام نوویؒ نے: ما بین اثنی عشر الی العشرین کو هذا القول هو الأشهر الأزهر بتلایا ہے۔

﴿ستون، وسبعون﴾ صحیح بخاری میں ستون منقول ہے، جب کہ مسلم، نسائی، ابوداؤد اور ترمذی میں سبعون آیا ہے، امام نوویؒ نے: فان الحکم لمن حفظ الزیادة جازماً بها کہہ کر اسی کو ترجیح دی ہے، ملا علی قاریؒ کا بھی یہی موقف ہے۔

یہاں واقعۃً ایمانیات کی تحدید کی گئی ہے، یا مقصد صرف تکثیر ہے، حافظ ابن حبان اور

ابوحاتم نے پہلے کو ترجیح دی ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ۷۷ شعبوں کو درج بھی کر دیا ہے، جب کہ ملا علی قاریؒ اس کی تردید کر کے تکثیر کو راجح قرار دیتے ہیں: المراد به التكثير لا التحديد علامہ سندھیؒ نے بھی: وهذا كناية عن الكثرة کہہ کر اسی کی تائید کی ہے، شیخ الاسلام حضرت کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا محمد منظور نعمانی رحمہم اللہ کی بھی یہی رائے ہے کہ عربی محاورے کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے ایمان کے شعبوں کی کثرت و بہتات کی طرف اشارہ فرمایا ہے، جس طرح پانی کو چوس کر درخت برگ و بار لاتا ہے، اسی طرح دل و دماغ میں ایمان پیدا ہونے کے بعد جن اخلاق حسنہ، اعمال صالحہ اور ظاہری و باطنی بلند احوال کا ظہور ہوتا ہے، وہ سب یہی شعبے ہیں، جن کی طرف اشارہ کیا گیا ظاہر ہے کہ وہ ستر نہیں بے شمار ہیں۔

﴿ادناها اما طة الاذىٰ عن الطريق﴾ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں: "اى اقلها فائدة لأنها دفع ادنى ضرر" یعنی یہ سب سے کم ثواب کی چیز ہے، کیونکہ وہ بہت معمولی ضرر کو دفع کرنا ہے، امام نوویؒ نے فرمایا: "اى تنحيته و ابعاده والمراد بالأذىٰ كل مايوذى من حجر او مدر او شوك اوغيره" یعنی اماطة کے معنی کنارہ کرنا اور دور کرنا ہے، اور اذیٰ سے مراد پتھر، ٹھیکری اور کانٹا وغیرہ جیسی ہر وہ چیز ہے، جو ایذاء کا باعث ہو، یہ پہلا درجہ ہے۔

﴿وارفعها قول لا اله الا الله﴾ دوسری روایات میں: افضلها منقول ہے اور شہادت یہاں توحید کے ساتھ رسالت کو بھی شامل ہے یہ ایمان کی بنیاد ہے اس لئے وہ سب سے بلند و بالا ہے ان دونوں کے درمیان بقیہ ایمان کے شعبے ہیں، حیاء پر بحث باب کی تیسری حدیث میں آئے گی...... حدیث بخاری (ایمان/۲) مسلم (ایمان/۱۰) نسائی (ایمان/۱۶) ابوداؤد (السنۃ/۱۵) اور ترمذی (ایمان/۶) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی صحیح ہے، پہلے راوی کو چھوڑ کر یہ بعینہ ترمذی کا طریق ہے۔

(۲/۵۸) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ اَبِىْ شَيْبَةَ، ثَنَا، اَبُوْخَالِدٍ الْأَحْمَرُ عَنِ ابْنِ عَجْلَانَ ح وَحَدَّثَنَا عَمْرُوبْنُ رَافِعٍ ثَنَا جَرِيْرٌ عَنْ سُهَيْلٍ جَمِيْعاً عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ اَبِىْ صَالِحٍ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَحْوَهٗ.

الدیباجۃ علٰی ابن ماجۃ (۳۱۴/۱) میں اسے اسنادہ صحیح قرار دیا گیا ہے۔

(۳/۵۹) حَدَّثَنَا سَهْلُ بْنُ اَبِی سَهْلٍ وَمُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ يَزِيْدَ قَالَا حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ سَالِمٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ سَمِعَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا يَعِظُ اَخَاهُ فِی الْحَيَاءِ فَقَالَ: اِنَّ الْحَيَاءَ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ

﴿یعظ أخاہ فی الحیاء﴾ جملہ کی صورت میں یہ رجلاً کی صفت ہے یعنی وہ شخص اپنے بھائی کو حیا کرنے اور بے شرمی سے بچنے کی نصیحت کر رہا تھا۔

نفسانی حیاء

ملا علی قاریؒ نے حیاء کی لغوی تعریف: وھو تغیر وانکسار یعتری المرأ من خوف ما یلام ویعاب علیہ[1] کی ہے، یعنی ملامت اور عیب جوئی کے خوف سے انسان پر جو غیرت و پراگندگی کی کیفیت طاری ہوتی ہے، وہی حیاء ہے۔

دوسری جامع وضاحت علامہ سندھیؒ نے فرمائی ہے، لکھتے ہیں: فالنفسانی الجبلی الذی خلقہ اللّٰہ فی النفوس کالحیاء من کشف العورۃ ومباشرۃ المرأۃ بین الناس حتی نفوس الکفرۃ فطری حیا وہ ہے جو ستر کو کھولنے اور سب کے سامنے جماع کرنے سے مانع ہے یہ کافروں تک میں ہوتی ہے۔

ایمانی حیاء

اسکی تعریف امام نوویؒ نے: انما حقیقۃ الحیاء خلق یبعث علی ترك القبیح ویمنع من التقصیر فی حق ذی الحق[2] ملا علی قاریؒ نے: وھو خلق یمنع الشخص من الفعل القبیح بسبب الایمان کالزنا وشرب الخمر وغیرذلك من القبائح کے الفاظ سے کی ہے، تو یہ وہ جذبہ ہے، جو ایمان کی بناء پر مسلمان کو منہیات کے ترک اور حق تلفی سے روکتا ہے جیسا کہ زنا شراب وغیرہ، جامع ترمذی کی روایت میں اسی کی رسول اللہ ﷺ نے وضاحت فرمائی ہے۔[3]

۱،۳ مرقاۃ المفاتیح کتاب الایمان فصل اول حدیث ۳

۲ شرح نوویؒ مسلم ۴۷/۱

استحيوا من الله حق الحياء قالوا انا نستحيي والحمد لله فقال ليس ذلك ولكن الاستحياء من الله حق الحياء ان تحفظ الرأس وما حوى والبطن وما وعى وتذكر الموت والبلى فمن فعل ذلك فقد استحيا الله حق الحياء.

اللہ سے ایسی حیاء کرو جیسی اس سے کرنی چاہئے مخاطبین نے عرض کیا الحمد للہ ہم خدا سے حیا کرتے ہیں آپ نے فرمایا یہ نہیں! بلکہ اللہ سے حیاء کرنے کا حق یہ ہے کہ: سر اور سر میں جو افکار وخیالات ہیں، ان سب کی نگہداشت کرو اور پیٹ کی اور جو کچھ اس میں بھرا ہوا ہے ان سب کی نگرانی کرو، (یعنی برے خیالات سے دماغ کی اور حرام و ناجائز غذا سے پیٹ کی حفاظت کرو) اور موت اور اس کے بعد قبر میں تمہاری جو حالت ہونی ہے، اس کو یاد کرو جس نے یہ کرلیا بس سمجھ لو کہ اس نے اللہ سے حیاء کرنے کا حق ادا کر دیا۔

﴿شعبة﴾ ملا علی قاریؒ نے اس کی وضاحت عظیمة سے کی ہے، علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں: والتنكير فيها للتعظيم ابن ماجہ کی سند صحیح ہے اور حدیث صحیح بخاری (ایمان/ ۱۵، ادب/ حیاء) صحیح مسلم (ایمان/ ۱۰) نسائی (ایمان/ حیاء) ابوداؤد (ادب/ ۷) اور ترمذی (ایمان/ ۷) میں بھی آئی ہے، اور ابن ماجہ کی سند بھی صحیح ہے۔

(۶۰/۴) حَدَّثَنَا سُوَيْدُ بْنُ سَعِيْدٍ ثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُسْهِرٍ عَنِ الْأَعْمَشِ ح وَحَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مَيْمُوْنِ الرَّقِّيُّ، ثَنَا سَعِيْدُ بْنُ سَلْمَةَ عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ إِبْرَاهِيْمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ، وَلَا يَدْخُلُ النَّارَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِنْ إِيْمَانٍ

فرمایا وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا، جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی کبر ہو اور وہ شخص دوزخ میں نہیں جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو۔

کبر کی مذمت

﴿من كان فى قلبه مثقال ذرة من خردل من كبر﴾ ثقل مصدر سے مثقال کے معنی وزن کے ہیں ذرةٌ، ذر کا واحد ہے، جس کے معنی علامہ سندھیؒ نے: وهو النمل

الاحمر الصغیر لکھے ہیں اور امام سیوطیؒ کا قول یہ نقل کیا ہے: الذرة لا وزن لها ویرادبها ما یریٰ فی شعاع الشمس الداخل فی الکوة النافذة یعنی وہ چھوٹے چھوٹے ذرّات مراد ہیں جن کا بذاتِ خود کوئی وزن نہیں ہوتا اور وہ روشن دان سے چھن کر اندر جانے والی دھوپ ہی میں دکھائی پڑتے ہیں، الغرض یہ قلت کی آخری تعبیر ہے، اس سے نیچے پھر کوئی درجہ نہیں رہتا، خردل رائی کو کہتے ہیں، یہاں کبر سے کیا مراد ہے، اس میں دو قول ہیں۔

۱۔ خطابی فرماتے ہیں ان المراد التکبر عن الایمان فصاحبهُ لا یدخل الجنة اصلاً اذا مات علیه طیبی کے الفاظ یہ ہیں: ان یراد بالکبر الکفر والشرك کبر سے کفر وشرک مراد لیا جائے یعنی تکبر کے باعث وہ ایمان ہی قبول نہ کرے اور کفر وشرک پر اڑا رہے، آذر، نمرود، فرعون وقارون، ہامان وشداد ابوجہل وابولہب اور دیگر قوموں کے چودھری اسی کی مثال ہیں، طیبی اس توجیہ کی وجہ ترجیح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: الا تریٰ انه قد قابله فی نقیضه بالایمان[1] یہ بات قابل غور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کے دوسرے جز میں نقیض کی حیثیت سے ایمان کا تذکرہ کیا ہے۔

۲۔ انه لا یکون فی قلبه کبر حال دخول الجنة[2] یہ خطابی کے الفاظ تھے، جب کہ طیبی کی عبارت یہ ہے: ان اللّٰه اذا اراد ان یدخله الجنة نزع ما کان فی قلبه من کبر[3] یعنی جنت میں داخلے کے وقت اس کے دل میں کبر نہیں ہوگا، باری تعالیٰ دخول کے فیصلے کے ساتھ کبر سے بھی اس کے دل کو دھودیں گے، پھر وہ جنت میں داخل ہو جائے گا: ونزعنا ما فی صدورهم من غل[4] اسی کی دلیل ہے۔

امام نوویؒ نے: وهذان التاویلان فیهما بعد کہہ کر دونوں تاویلوں کی تردید کی ہے، فرماتے ہیں: فان هذاالحدیث ورد فی سیاق النهی عن الکبر المعروف وهو الارتفاع علی الناس واحتقارهم ودفع الحق[5] یہ حدیث اس کبر کی ممانعت کے پس منظر میں وارد ہوئی ہے، جو معروف ہے، یعنی اپنے کو دوسروں سے بلند جان کر انہیں حقیر سمجھنا اور حق تلفی کرنا ترمذی میں حدیث باب میں اتنا اضافہ اور منقول ہے کہ: ایک صحابی نے دریافت کیا

۱۔ ۲۔ ۳۔ ترمذی ۲/ ابواب البر باب ما جاء فی الکبر حاشیہ ۵

۴۔ سورۃ اعراف/۴۳ ۵۔ شرح نووی مسلم ۱/ کتاب الایمان باب تحریم الکذب۔

کہ: مجھے عمدہ کپڑا اور عمدہ جوتا پسند ہے، کیا یہ بھی کبر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ان اللّٰہ یحب الجمال یہ تو منشاء الٰہی ہے: ولکن الکبر من بطر الحق وغمص الناس کبر تو دراصل تکبر کے باعث حق کو قبول نہ کرنا اور لوگوں کو ذلیل سمجھنا ہے، امام نوویؒ کے الفاظ میں: واما بطر الحق فھو دفعه وانکاره ترفعًا وتجبرا اور غمص کے معنی احتقارھم ہیں[1]۔

کبر دراصل کفر ونفاق کی ایک شاخ ہے، جس کا قلع قمع کر کے ایمان عبدیت کا شعور پیدا کرتا ہے، اب جو بندہ اللہ کے جتنا قریب ہوگا، کبر سے اتنا ہی دور ہوگا، اور جو جتنا عبدیت سے دور ہوگا، وہ کبر کے اتنا ہی قریب ہوگا، اسی لئے بخاری ومسلم کی روایت میں دوزخیوں کی بابت فرمایا گیا: "کل عتل جواظ مستکبر" انبیاء کی دعوت تواضع کی دعوت ہے اور اہل اللہ اسی کی بدولت عبدیت کے بلند مقام تک پہنچے ہیں، قاضی عیاض اس کی تاثیر کی بابت فرماتے ہیں: ھٰذا جزاءه لو جازاه[2] یعنی اگر کبر کی سزا دی جائے، تو حدیث باب کے مطابق اس کی سزا جہنم ہی ہے: وقد یتکرم علیه لأنه لا یجازیه[3] لیکن باری تعالیٰ کبھی بندے پر کرم فرما کر سزا نہیں دیتے اور شروع ہی میں دخول کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

﴿ولا یدخل النار من کان مثقال حبة من خردل من ایمان﴾ امام نوویؒ فرماتے ہیں: فالمراد به دخول الکفار وھو دخول الخلود[4] یہاں دخول خلود مراد ہے جو صرف کفار کے لئے ثابت ہے، کیونکہ کبائر کی سزا تو مسلمان کو بھی بھگتنی ہوگی، اس کے بعد ہی وہ جنت میں جا سکے گا، علامہ طیبیؒ سندھیؒ اور جمہور محدثین کی یہی رائے ہے۔

حدیث مسلم (ایمان/۳۷) ابوداؤد (لباس/۲۶) اور ترمذی (بر/۵۹) میں بھی آئی ہے ابن ماجہ کے اعمش تک دو طریق ہیں، جن میں پہلا مسلم کا طریق ہے اس لئے حدیث صحیح ہے اور اس کے دوسرے طریق ہی کو مدار بنا کر الدیباجه علی ابن ماجة (۱/۳۱۷) میں سند کی بابت جو اسناده حسن لغیره کا فیصلہ کیا گیا وہ درست نہیں معلوم ہوتا۔

(۶۱/۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيىٰ، ثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ اَنْبَأَنَا مَعْمَرٌ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ اَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

---

[1] [2] [3] [4] شرح نووی مسلم ۱/ کتاب الایمان باب تحریم الکذب۔

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "اِذَا خَلَّصَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنَ النَّارِ وَاٰمِنُوْا، فَمَا مُجَادَلَةُ اَحَدِكُمْ لِصَاحِبِهٖ فِي الْحَقِّ يَكُوْنُ لَهٗ فِي الدُّنْيَا، اَشَدَّ مُجَادَلَةً مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لِرَبِّهِمْ فِيْ اِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ اُدْخِلُوا النَّارَ، قَالَ: يَقُوْلُوْنَ: رَبَّنَا اِخْوَانُنَا كَانُوْا يُصَلُّوْنَ مَعَنَا وَيَصُوْمُوْنَ مَعَنَا وَيَحُجُّوْنَ مَعَنَا فَاَدْخَلْتَهُمُ النَّارَ، فَيَقُوْلُ: اِذْهَبُوْا فَاَخْرِجُوْا مَنْ عَرَفْتُمْ مِنْهُمْ، فَيَاْتُوْنَهُمْ فَيَعْرِفُوْنَهُمْ بِصُوَرِهِمْ، لَاتَاْكُلُ النَّارُ صُوَرَهُمْ، فَمِنْهُمْ مَنْ اَخَذَتْهُ النَّارُ اِلٰى اَنْصَافِ سَاقَيْهِ وَمِنْهُمْ مِنْ اَخَذَتْهُ اِلٰى كَعْبَيْهِ، فَيُخْرِجُوْنَهُمْ، فَيَقُوْلُوْنَ: رَبَّنَا اَخْرَجْنَا مَنْ قَدْ اَمَرْتَنَا ثُمَّ يَقُوْلُ: اَخْرِجُوْا مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ وَزْنُ دِيْنَارٍ مِنَ الْاِيْمَانِ، ثُمَّ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ وَزْنُ نِصْفِ دِيْنَارٍ ثُمَّ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ" قَالَ اَبُوْسَعِيْدٍ: فَمَنْ لَمْ يُصَدِّقْ هٰذَا فَلْيَقْرَأْ: (اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ مومنین کو حساب وکتاب کے بعد نجات دیں گے اور وہ تمام شدتوں اور سختیوں سے مامون ہو جائیں گے، تو ان کا اللہ تعالیٰ سے اتنا سخت مجادلہ اور منازعہ ہوگا کہ: دنیا میں تم آپس میں بھی کسی حق پر اتنا نہ جھگڑے ہوؤ گے، جتنا کہ اس روز مومنین اپنے دوزخی بھائیوں کے بارے میں اللہ سے جھگڑیں گے، مومنین حجت پیش کرتے ہوئے کہیں گے کہ: اے خداوند قدوس تو نے ہمارے ان بھائیوں کو دوزخ میں ڈال دیا، جو ہمارے ساتھ نماز پڑھتے، روزہ رکھتے اور حج کرتے تھے، (ان اعمال صالحہ کی بنا پر ہم تو تیرے فضل سے جنتی بن گئے، لیکن یہ کیوں دوزخ میں ڈال دے گئے، جب کہ اعمال میں ہم دونوں مساوی ہیں،) تو اللہ تعالیٰ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے فرمائیں گے، اچھا جاؤ اپنے تمام بھائیوں کو بھی دوزخ سے نکال لو، جن کو تم مومن سمجھتے اور پہچانتے ہو، پس وہ آئیں گے اور صورتوں سے انہیں پہچان لیں گے، کیونکہ ان کے ایمان کی وجہ سے آگ نے ان کی صورتوں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا ہوگا، تو ان میں کچھ تو ایسے ہوں گے، جن کی صرف آدھی پنڈلیوں تک ہی آگ اثر انداز ہوگی اور کچھ کو ٹخنوں تک جلا چکی ہوگی، مومنین

انہیں نکال کر کہیں گے، اے خداوند قدوس جن کے بارے میں آپ نے ہمیں حکم دیا ہم نے ان کو نکال لیا پھر باری تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس کو بھی نکال لو، جس کے دل میں صرف ایک دینار کے برابر ایمان ہے، یا آدھا دینار کے برابر اسی طرح اس شخص کو بھی جس کے دل میں رائی کے دانے کے بقدر ایمان ہے، حضرت ابوسعید کہتے ہیں کہ جسے اس بات کا یقین نہ ہو، وہ قرآن کی یہ آیت پڑھے: "**ان اللّٰه لا يظلم مثقال ذرة وان تلك حسنة يضاعفها ويؤت من لدنه اجرًا، عظيما**"

﴿**خلص**﴾ تفعیل سے آتا ہے، معنی نجات دینا، یہاں بغیر کسی سزا کے جنت میں داخلہ مراد ہے۔

﴿**وامن**﴾ **امنًا** سمع کے باب سے آتا ہے، معنی محفوظ و مطمئن ہونا، یہاں مغفرت کے بعد کا اطمینان مراد ہے۔

﴿**فما مجادلة احدكم لصاحبه في الحق يكون له في الدنيا**﴾ روایت کے دوسرے طرق میں **مناشدة** کا لفظ آیا ہے، جس کی رو سے یہاں لغوی مفہوم مراد نہیں بلکہ معنی التجاء، الحاح اور پیہم اصرار کے ہوں گے، مجددی لکھتے ہیں **اى ليس مجادلة احدكم فى الدنيا لخصمه فى الامر الحق الذى ثبت وتبين عنده ازيد واغلب واشد من مجادلتهم لربهم فى حق اخوانهم** یعنی دنیا میں حق کے لئے تم میں سے کسی کا اپنے فریق سے اتنا سخت اور زوردار مباحثہ نہ ہوا ہوگا جتنا کہ قیامت میں اپنے دوزخی بھائیوں کے لئے ہوگا، جس طرح بچہ اپنے والدین سے شفقت و محبت کی بنا پر ضد کرتا ہے، اور وہ برا ماننے کے بجائے، ان بچکانہ اداؤں سے محظوظ ہو کر اس کا مطالبہ پورا کرتے ہیں، اسی طرح باری تعالیٰ بھی اپنی بے پایاں رحمت و شفقت کی وجہ سے جنتیوں کے اصرار اور اخوت و محبت کے مظاہرے پر خوش ہوں گے، اور اس درخواست کو قبول فرما کر ان کے گناہگار متعلقین کو دوزخ سے آزاد فرمائیں گے، تو چھوٹوں کا بڑوں سے ضد کرنا جرأت کی نہیں بلکہ محبوبیت کی دلیل ہے۔

﴿**ربنا**﴾ حرف نداء مقدر ہے **اخواننا هم** مبتدا محذوف ہے اور یہ پورا جملہ خبر ہے۔

﴿**لا تاكل النار صورهم**﴾ بعض روایات میں: **فتحرم صورهم على النار** آیا

ہے، جس کی علت علامہ سندھیؒ نے یہ لکھی ہے: لأن النار لا تاکل اعضاء السجود الغرض ایسے تمام لوگوں کو جہنم سے نکال لیا جائے گا، جن کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوں گا، پھر باری تعالیٰ مزید ایسے لوگوں کو نکالیں گے، جن کے پاس عمل کی روشنی نہ ہونے کے باعث ایمان کا اتنا دھندلا نقش ہوگا کہ: پیغمبر تک اس کو نہ دیکھ سکیں گے...... حدیث سے شفاعت کا مضمون ثابت ہوتا ہے، قرآن وسنت میں اس کے دلائل موجود ہیں، اس لئے خوارج ومعتزلہ کے برخلاف اہل سنت والجماعت نے اسے عقلاً ونقلاً درست تسلیم کر کے نبوت محمدیؐ کا امتیاز قرار دیا ہے اور حدیث باب کی رو سے تبعًا یہ فضیلت امت کے بلند مقام لوگوں کو بھی حاصل ہوگی۔

حدیث باب ہی کے مضمون پر دلالت کرنے والی روایت بخاری (ایمان/۳۳) توحید/ ۳۶ رقاق/ ۵۱) مسلم (ایمان/ ۷۳) میں موجود ہے اور بعینہٖ یہ روایت امام نسائی نے کتاب الایمان باب زیادۃ الایمان میں نقل کی ہے، پہلے روای کو چھوڑ کر نسائی اور ابن ماجہ دونوں کی سند ایک ہے، مولانا لطیف الرحمٰن بہرائچی نے الدیباجہ علی ابن ماجہ (۱/۳۲۳) میں اسے اسنادہ صحیح قرار دیا ہے۔

(۶۲/۶) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا وَكِيعٌ ثَنَا حَمَّادُ بْنُ نَجِيحٍ وَكَانَ ثِقَةً عن ابي عمران الجونيّ عن جُندبِ بنِ عبدِ اللّٰهِ، قَالَ: كنا مَعَ النبيِّ صلى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَنَحْنُ فِتْيَانٌ حَزَاوِرَةٌ فَتَعَلَّمْنَا الْإِيْمَانَ قَبْلَ اَنْ نَتَعَلَّمَ الْقُرْآنَ ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرآنَ فَازْدَدْنَا بِهٖ اِيْمَانًا

فرمایا ہم نوعمری کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، تو ہم نے قرآن سیکھنے سے پہلے ایمان سیکھا پھر جب قرآن پڑھا تو ہمارے ایمان میں اضافہ ہوا۔

﴿ونحن فتیان حزاورۃ﴾ یہ فتی کی جمع ہے، معنی نوعمر لڑکا جب کہ حزاورۃ کا واحد حزور ہے، ایک لغت واؤ مشدد کی بھی ہے، علامہ سندھی نے نہایہ کے حوالے سے اس کے معنی: "ھو الذی قارب البلوغ" اور صحاح جوہری کے حوالے سے: "ھو الغلام اذا اشتدو قوی وحزم" لکھے ہیں، یعنی وہ قریب البلوغ لڑکا جو مضبوط طاقت ور اور ہوشیار ہو، یہ پورا جملہ کنا کی اسمیہ ضمیر کا حال ہے۔

﴿فتعلمنا الایمان قبل ان نعلم القرآن﴾ مجددی لکھتے ہیں استفید منه ان تعلم علم العقائد قبل تعلم الفقه و القرآن اس جملہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عقائد کا علم فقہ وقرآن پر مقدم ہے یعنی ہم نے تمام شعبوں کے ساتھ پہلے ایمان کو سمجھا پھر قرآن کے اسرار ورموز، قصص واشارات، احکامات وتعلیمات اور منہیات وماموارت کی معرفت حاصل کی، تو گویا قرآن سے استفادے کی شرط ایمان ہوئی، ایمان میں کمی بیشی کی بحث گذر چکی ہے، حدیث کی بابت بوصیری نے زوائد میں: هٰذا اسناد صحیح، رجاله ثقات کا فیصلہ کیا ہے۔

(۷/۶۳) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُضَيْلٍ ثَنَا عَلِيُّ بْنُ نَزَّارٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عِكْرَمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى للّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: صِنْفَانِ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ لَيْسَ لَهُمَا فِي الْاَسْلَامِ نَصِيْبٌ الْمُرْجِئَةُ وَالْقَدْرِيَّةُ

اس امت میں دو طبقوں کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں مرجیہ اور قدریہ۔

﴿المرجئة﴾ علامہ طیبی لکھتے ہیں: هم الذین یقولون الا یمان قول بلاعمل فیؤخرون العمل عن القول[1] وہ لوگ جو ایمان بلا عمل کے قائل ہوں اور اقرار کو عمل سے الگ رکھتے ہوں، ملا علی قاریؒ اس کی تردید کر کے لکھتے ہیں: بل الحق أن المرجئية هم الجبرية القائلون بان اضافةالفعل الی العبد کا ضافته الی الجمادات[2] یہ بندہ کو مجبور محض مانتے ہیں، ان کے نزدیک انسان کی طرف کسی فعل کو منسوب کرنا جمادات کی طرف منسوب کرنے کی طرح ہے، اور بندہ کو کوئی اختیار نہیں علامہ سندھی اور وضاحت کرتے ہیں: وهم فرقة من فرق الاسلام يعتقدون أنه لا يضر مع الاسلام معصية كما انه لا ينفع مع الكفر طاعة، سموا بذلك لا عتقادهم ان اللّٰه تعالٰی ارجا تعذیبهم علی المعاصی أی: أخره عنهم وبعّده ایسا فرقہ ہے جو اسلام کے ساتھ کسی معصیت اور کفر کے ساتھ کسی طاعت کے اثر کا قائل نہیں، اللہ نے گناہوں کے باوجود بندوں کی سزا کو ان کے نزدیک مؤخر کر دیا ہے، اسی لئے انہیں مرجیہ کہا جاتا ہے۔

﴿القدریه﴾ اس کی تعریف ملا علی قاریؒ نے ان الفاظ میں کی ہے: وهم المنكرون

[1-2] مرقاۃ المفاتیح کتاب القدر فصل دوم حدیث ۱۱

للقدر القائلون بأن أفعال العباد مخلوقة بقدرتهم ودواعيهم لا بقدرة الله وارادته[1] تقدیر کے منکر ہیں، انسانوں کے افعال کو قدرت الٰہی اور مشیت ایزدی کے بجائے خود انہیں کی صلاحیت وقدرت کا نتیجہ مانتے ہیں، یہ دونوں ترکیب میں یا تو صنفان کا بدل ہیں، یا هما مبتداء محذوف کی خبر ہیں ترمذی میں: "من أمتي" کا جملہ ہے، جس کے معنی ملا علی قاری: ای امة الاجابة[2] لکھتے ہیں۔ یعنی ان کا شمار مسلمانوں میں ہے۔

﴿ليس لهما نصيب في الاسلام﴾ ظاہر کی بنیاد پر اس سے ان کے کفر پر استدلال کیا گیا ہے، لیکن تورپشتی نے اس کی نفی کر کے محققین کا موقف: فهم اذن بمنزلة الجاهل المجتهد المخطي[3] نقل کیا ہے، قاری نے لکھا ہے: فيحمل قوله ليس لهما نصيب على سوء الحظ وقلة النصيب[4] ان الفاظ کو ان کی بدقسمتی اور کم نصیبی پر محمول کیا جائے گا اور اس کے معنی ای حظ کامل ہوں گے، یعنی اسلام میں ان کا پورا حصہ نہیں ہے۔

حدیث ترمذی (قدر/۱۳) میں آئی ہے مصنف نے اسے حسن غریب کہا ہے ابن ماجہ اور ترمذی دونوں کی سند میں علی بن نزار اور نزار بن حیان دو راوی ضعیف ہیں، ابن عدی، ذہبی اور ابن حجر نے ان کی تضعیف کی ہے ملاحظہ ہو، تقریب (۴۸۰۶، ۷۱۰۴۔) بوصیری نے زوائد (۱/۵۷) میں اسناده ضعیف کا فیصلہ کیا ہے، سراج الدین قزوینی موضوع کہتے ہیں، ابن حجر اسے بعید قرار دے کر تحسین کی طرف مائل ہیں[5]۔

حدیث جبریل

(۸/۶۴) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا وَكِيعٌ عَنْ كَهْمَسِ بْنِ الْحَسَنِ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ يَحْيَى بْنِ يَعْمَرَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنْ عُمَرَ قَالَ كُنَّا جُلُوساً عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَاءَ رَجُلٌ شَدِيْدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ شَدِيْدٌ سَوَادِ شَعْرِ الرَّأْسِ لَا يَرَى عَلَيْهِ أَثَرُ سَفَرٍ وَلَا يَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ قَالَ فَجَلَسَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَسْنَدَ رُكْبَتَهُ إِلَى

۱، ۲، ۳، ۴ مرقاة المفاتیح کتاب القدر فصل دوم حدیث ۱۱

۵ الدیباجہ علی ابن ماجہ/۳۳۱

رُكْبَتَيْهِ وَوَضَعَ يَدَيْهِ عَلَى فَخِذَيْهِ ثُمَّ قَالَ يَا مُحَمَّدُ مَا الْإِسْلَامُ، قَالَ شَهَادَةُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَانِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ وَإِقَامُ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ وَصَوْمُ رَمَضَانَ وَحَجُّ الْبَيْتِ فَقَالَ صَدَقْتَ فَعَجِبْنَا مِنْهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ ثُمَّ قَالَ يَا مُحَمَّدُ مَا الْاِيْمَانُ؟ قَالَ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَكُتُبِهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ قَالَ صَدَقْتَ فَعَجِبْنَا مِنْهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ ثُمَّ قَالَ يَا مُحَمَّدُ مَاالْإِحْسَانُ؟ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنَّكَ اِنْ لَا تَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ قَالَ فَمَتَى السَّاعَةُ؟ قَالَ مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بَاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ قَالَ فَمَا أَمَارَتُهَا؟ قَالَ اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا قَالَ وَكِيْعٌ يَعْنِيْ تَلِدَ الْعَجَمُ الْعَرَبَ وَأَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبِنَاءِ قَالَ ثُمَّ قَالَ فَلَقِيَنِيْ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ ثَلَاثٍ فَقَالَ أَتَدْرِيْ مَنِ الرَّجُلُ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ قَالَ ذَاكَ جِبْرَئِيْلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ مَعَالِمَ دِيْنِكُمْ.

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ: ہم نبی ﷺ کے پاس بیٹھے تھے، کہ ایک شخص آیا کپڑے نہایت سفید اور سر کے بال بیحد کالے تھے، اس پر سفر کا کوئی اثر نظر آتا تھا، نہ ہی ہم میں سے کوئی اسے جانتا تھا..... حضرت عمرؓ نے بیان کیا، پھر وہ شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوکر بیٹھ گیا اور اپنے گھٹنے کو آپ کے گھٹنوں سے ملا کر دونوں ہاتھ آپ کی رانوں پر رکھ دیئے، پھر کہا اے محمد ﷺ! اسلام کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ کی گواہی، نماز کو قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا (ہی اسلام ہے) اس نے کہا آپ سچ کہتے ہیں، ہمیں تعجب ہوا کہ: وہ سوال بھی کرتا ہے اور تصدیق بھی (دونوں متضاد باتیں ہیں پہلی جہل کی اور دوسری علم کی علامت ہے) پھر وہ بولا محمد ﷺ ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں، اس کی کتابوں، روز آخرت اور اس کی تقدیر کے خیر و شر پر ایمان لاؤ، اس نے کہا آپ نے بجا فرمایا ہمیں (پھر) تعجب ہوا سوال بھی کرتا ہے اور تصدیق بھی! اس نے پھر کہا محمد ﷺ احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا تم اس طرح اللہ کی عبادت

واطاعت کرو، گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ سکتے، تو وہ تو تم کو دیکھ ہی رہا ہے، اس نے پوچھا قیامت کب آئے گی، آپ نے فرمایا مسئول اس کے بارے میں سائل سے زیادہ کچھ نہیں جانتا، اس نے پوچھا اس کی نشانیاں کیا ہیں، ارشاد ہوا کہ باندی اپنے آقا کو جنے...... حضرت وکیعؒ نے فرمایا کہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ عجمیہ عرب کو جنے گی اور تم ننگے پاؤں، ننگے بدن، قلاش بکریاں چرانے والوں کو بلند سے بلند مکانات بناتے دیکھو گے، ابن عمرؓ نے کہا اسکے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تین دن بعد ملے آپ نے پوچھا تم جانتے ہو کہ: وہ شخص کون تھا؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں، آپ نے فرمایا وہ جبریل تھے، تم لوگوں کو تمہارے دین کے عنوانات بتانے آئے تھے۔

حافظ فضل اللہ توربشتی کی تصریح کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریل امین کے مابین یہ مکالمہ ''حجۃ الوداع'' سے کچھ دن پہلے ہوا، جب کہ انقطاع وحی اور تکمیل دین کا وقت قریب آچکا تھا، حافظ ابن حجر عسقلانی نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ: وہ ''حجۃ الوداع'' کے بعد واقع ہوا ہو راجح بات پہلی لگتی ہے، امام طیبی، ملا علی قاری، قاضی عیاض، مولانا عبدالحق دہلوی اور دیگر محدثین نے کہا ہے کہ: جس طرح سورۂ فاتحہ کو **ام الکتاب** کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اجمالاً قرآن کے تمام مضامین پر حاوی ہے، اسی طرح حدیث جبریل کو **ام السنۃ** کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ پورے دین کی جامع ہے اور ۲۳ سال میں جو عقائد وعبادات وغیرہ تدریجاً نازل ہوئے یہ ان کی مختصر فہرست ہے اصولاً اس کے پانچ محور ہیں، ۱ اسلام، ۲ ایمان، ۳ احسان، ۴ آثار قیامت، ۵ اس کی حتمی تاریخ کے متعلق تصریح کہ اسے اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے اور وہ مجلس ہی کا دن تھا: **فجاء رجل** ترمذی کی سند میں بھی یہی الفاظ ہے، جب کہ بخاری ومسلم کے ایک طریق میں: **''اتاہ''** اور سنن نسائی میں **اذا قبل** کا لفظ ہے، سنن ابی داؤد اور صحیحین کے دوسرے طرق میں: **اذ طلع علینا رجل** کے الفاظ آئے ہیں، حضرت مولانا محمد ادریسؒ کاندھلوی نے: **التعلیق الصبیح** میں لکھا ہے، کہ: طلوع کی تعبیر زیادہ فصیح وبلیغ ہے، کیونکہ جبریل خالص نور سے پیدا ہوئے ہیں، اس لئے انسانی شکل اختیار کرنے کے بعد بھی اس کے اثرات نمایاں ہوں گے۔

﴿شديد بياض: الثياب شديد سواد شعر الرأس﴾ دوسری کتب میں بھی اسی طرح منقول ہے، جب کہ نسائی میں: رجل احسن الناس وجهًا واطيب الناس ريحًا كان ثيابه لم يمسها دنس کے الفاظ آئے ہیں اور ابن حبان میں شعر کے بجائے لحية کا تذکرہ ہے، ملا علی قاریؒ نے مرقاۃ المفاتیح میں لکھا ہے کہ: اس ہیئت وکیفیت سے جہاں نظافت اور سفید لباس کا استحباب معلوم ہوتا ہے وہیں یہ اشارہ بھی ہے کہ: طالب علمی کا زمانہ بلوغ وشباب کا ہے، تاکہ قوی علم کا تحمل کرسکیں۔

﴿لا يرى عليه اثر السفر ولا يعرفه منا احد﴾ دوسری کتب میں بھی یہی ہے، جب کہ اور ابوداؤد میں: لا نعرفه کے الفاظ ہیں، ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ: یہ جملہ رجل کا حال یا اس کی صفت ہے اور اس سے مراد: ظهور التعب والتغير والغبار ہے، اسی طرح: لايعرفه منا احدٌ سے متعلق علی بن عبداللہ بن احمد مصری عرف زین العرب نے مصابیح کی شرح میں لکھا ہے کہ: منا سے صرف صحابہؓ مراد ہیں، کیونکہ رسول اللہؐ تو انہیں شروع ہی میں پہچان گئے تھے، جب کہ ابن حجر نے فتح الباری میں اور بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری میں لکھا ہے کہ بعض روایات صراحت کرتی ہیں کہ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی ان کو نہیں پہچانا اور رخصت کے وقت معلوم ہوا کہ: وہ جبریل تھے، صحابہؓ کو حیرت اس وجہ سے تھی کہ: وہ جن ہے یا فرشتہ کیونکہ مدینہ کا کوئی شخص ہوتا تو لازماً وہ اس کو جانتے جب کہ پردیسی پر سفر کے آثار ضروری ہیں۔

آداب ملاقات

ملاقات کا پہلا ادب یہ ہے کہ صاف وشفاف لباس زیب تن کر کے باوقار ہیئت اختیار کی جائے، دوسرا ادب حاضری کے وقت سلام ہے، چنانچہ نسائی کے طریق میں منقول ہے: حتى سلم في طرف البساط فقال السلام عليك يامحمد فرد عليه السلام تیسرا ادب قریب آ کر بیٹھنے کی اجازت طلب کرنا ہے، نسائی ہی کے طریق میں مروی ہے: قال ادنو يا محمد قال ادن فمازال يقول ادْنو مرارًا ويقول لهُ اُدن یعنی انہوں نے اجازت بھی کئی مرتبہ طلب کی: فجلس الى النبي صلى الله عليه وسلم اور اتنے قریب بیٹھے کہ: فاسند ركبتهٗ الى ركبته، ركبة جامع ترمذی میں بھی واحد آیا ہے، جب کہ صحیح مسلم اور سنن ابوداؤد

میں تثنیہ کے ساتھ منقول ہے: وضع یدیه علیٰ فخذیه امام نوویؒ اور تورپشتی نے اس کے یہ معنی بیان کیے کہ: اس شخص نے اپنے ہاتھوں کو خود اپنی دونوں رانوں پر رکھ لیا، لیکن یہ تسامح ہے، سنن نسائی کی روایات میں صاف مذکور ہے وضع یدهٔ علی رکبتی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ابن حجر نے بھی فتح الباری میں یہی وضاحت کی ہے، کہ یہ کیفیت حد درجہ تقرب وتوجہ مرکوز کرنے کے لئے تھی شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم میں لکھا ہے۔

اس انداز جلوس سے صحابہ کو یکدم اپنی طرف متوجہ کرنا تھا دوسرے پر تو کوئی اشکال نہیں، لیکن یا محمدؐ کہنے کی صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ: لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضاً کی رو سے حضورؐ کا نام لینا صحیح نہیں تھا جیسا کہ اس آیت کے بعد صحابہ کا طرز عمل رہا، تو پھر جبریل نے نام کیوں لیا؟ محدثین نے اس کے دو جواب دیئے ہیں، ۱ یہاں لفظ محمد سے اصل نام نہیں، بلکہ صفت مراد ہے، جو بلا شبہ تعریف ہے، ۲ مذکورہ آیت کے مخاطب ومکلّف انسان ہیں فرشتے نہیں، ہمارے نزدیک دونوں جواب محل نظر ہیں، پہلا تو تکلف پر مبنی ہے، جب کہ دوسرے کی بابت اشکال کیا جا سکتا ہے کہ جب خود حدیث کی تصریح کے مطابق جبریل اس وقت صحابہ کی تعلیم کے لئے آئے تھے، تو اس موقعہ پر آیت کی رعایت کرنا ضروری تھا، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی نے ترجمان السنہ (۱/۶۵) میں یہ جواب دیا ہے کہ: یا محمد! اگر انہوں نے کہا تو اس وقت ان کے مناسب حال یہی تھا، کہ اپنے کو متردد حالات کے تحت رہنے دیں تاکہ مخاطب ان کے متعلق کوئی رائے قائم ہی نہ کر سکے، یا رسول اللّٰہ سے ملاقات کا چوتھا ادب یہ ثابت ہوا کہ تخاطب میں منصب کا تذکرہ مناسب ہے۔

اسلام

﴿ما الاسلام﴾ بخاری اور ترمذی میں بھی یہی الفاظ ہیں، جبکہ دیگر کتب میں: أخبرنی عن الاسلام مروی ہے، اسی طرح بخاری کی روایت میں پہلا سوال اسلام کے بجائے ایمان سے متعلق ہے اسلام کے لغوی معنی اطاعت واتباع کے ہیں، اللہ کے آخری دین کا نام اسلام اس لئے رکھا گیا ہے کہ: اس میں بندہ اپنی ذات کو بالکل خدا کے سپرد کر دیتا ہے، قرآن وحدیث میں بھی یہ لفظ بکثرت اس معنی میں استعمال ہوا ہے، رسول اللہ ﷺ نے جواباً پانچ چیزوں کا

تذکرہ فرمایا، ۱۔ شہادت، ۲۔ اقامت صلوٰۃ، ۳۔ ایتاء زکوٰۃ، ۴۔ صیام رمضان، ۵۔ حج بیت اللہ،
یہی اسلام کی بنیادیں ہیں، جیسا کہ: **بنی الاسلام علی خمس** والی حدیث میں مذکور ہے،
اس کے بعد جبریل نے کہا **صدقت** صحابہ ﷺ کو تعجب ہوا: **یساله ویصدقهٗ** امام نوویؒ نے
شرح مسلم، (۱/ ۲۸) میں تعجب کا یہ سبب بتایا: **هذا خلاف عادة السائل الجاهل انما
هذا كلام خبير بالمسؤل عنه ولم يكن في ذلك الوقت من يعلم هذا غير النبی**
ﷺ یعنی تصدیق وتصویب کرنا ناواقف سائل کا کام نہیں یہ تو باخبر شخص کی گفتگو ہے، حالانکہ اس
وقت رسول اللہ ﷺ کے علاوہ یہ باتیں کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا، امام قرطبی سے بھی یہی جواب
منقول ہے، نوویؒ کے اس قول کا خلاصہ یہ ہے کہ: سوال سائل کی جہالت کا متقاضی ہے جب
کہ تصدیق اس کی معرفت کو مستلزم ہے، صحابہ کو ان دونوں چیزوں کے اجتماع سے تعجب ہوا کہ
جب یہ شخص آپ سے کبھی ملا نہ دربار نبوت میں بیٹھا، پھر تصدیق کیونکر کرتا ہے، یہ تو نبی کی صحبت
کے بعد سمجھ میں آتی ہے۔

ایمان

﴿**ما الایمان**﴾ ایمان کی حقیقت اور اس سے متعلق تمام بحثیں باب کے شروع میں
گذر چکی ہیں: **قال ان تؤمن بالله** ملا علی قاریؒ نے مرقاۃ المفاتیح (۱/ ۵۵) میں لکھا ہے کہ
یہاں ایمان تصدیق کے معنی میں وارد ہوا ہے یعنی اللہ کی ذات وصفات کی مکمل تصدیق واعتراف،
توحید کا عقیدہ تمام آسمانی مذاہب کی بنیاد رہا ہے اور مشرکین مکہ کی طرح ہندوستان کے بت
پرست بھی اس کے دعوے دار ہیں، لیکن یہی وہ نازک مقام ہے، جہاں قوموں نے غلطی کی اور
توحید کے دعوے کے باوجود اللہ کے اعتقاداً وعملاً ہزاروں شریک ٹھہرا لیے، رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کا یہ عظیم کارنامہ ہے، جو اسلام کو دوسرے ادیان سے ممتاز کرتا ہے کہ: آپ نے توحید
کے تصور کو اس طرح نکھار کر پیش کیا کہ: شرک اور درمیانی واسطوں کا بالکلیہ استیصال ہو گیا اور
بندے اپنے معبود حقیقی سے جڑ گئے۔

وملئکته

یہ **ملك** کی جمع ہے جو اصلا: "**مَلْاَك**" تھا، فرشتے اللہ کی ایک مستقل مخلوق ہیں جن کو

نور سے پیدا کیا گیا ہے: بَلْ عباد مکرمون ان میں شر کا عنصر ہی نہیں ہے، اس لئے دن رات عبادات اور حکم بجالانے میں مصروف ہیں: لایعصون اللّٰہ ماامرھم ویفعلون مایؤمرون قرآن میں متعدد جگہ فرشتوں کا تذکرہ آیا ہے، ساری آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ: وہ اللہ اور انبیاء کے درمیان سفارت اور پیام رسانی کا ذریعہ رہے، انہیں کے ہاتھوں دنیا میں خدا کے احکام جاری ہوتے ہیں، موت کے وقت روحوں کا قبض کرنا، انہیں کی ذمہ داری ہے، اعمال کے مطابق بندگان خدا پر رحمت یا لعنت نازل کرتے ہیں، اللہ کی بارگاہ کے حاضر باش ہیں، آخرت میں جنت ودوزخ کا انتظام بھی انہیں کے ہاتھوں میں ہوگا، توحید کی طرح فرشتوں کے باب میں بھی امم سابقہ افراط وتفریط کا شکار رہی ہیں، یہود ونصاریٰ نے ان میں بعض کو خدا کا درجہ دیا۔ ہندوؤں نے انہیں دیوی بنایا، مشرکین عرب فرشتوں کو دختران خدا کہتے تھے، اسلام نے ان خیالات کو باطل قرار دے کر فرشتوں کی حقیقت کو اجاگر کیا۔

ورسلہ

یعنی باری تعالیٰ نے رشد وہدایت کے چراغ جلانے کے لئے دنیا کے ہر خطے اور ہر قوم میں انبیاء کو مبعوث فرمایا، وہ سب راست باز اور نہایت امین وصالح تھے، اس لئے پوری ذمہ داری کے ساتھ انہوں نے لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچایا، طبرانی کی ایک ضعیف روایت کے مطابق ان کی تعداد ۱۲۴۰۰۰ ہے قرآن کریم نے صرف ان حضرات کا تذکرہ کیا ہے، جو عربوں یا یہود ونصاریٰ میں معروف تھے جب کہ بیشتر کے حالات وواقعات ہم سے مخفی رکھے گئے ہیں، ان میں سب سے آخری پیغمبر محمد ﷺ ہیں، مسلمان ہونے کے لئے بلاتفریق سب پر ایمان لانا ضروری ہے اور ان میں سے کسی ایک نبی کے انکار سے بھی انسان فوراً کافر ہو جائے گا۔

وکتبہ

باری تعالیٰ نے مختلف زمانوں میں انبیاء کرام پر جو کتابیں نازل کی ہیں، ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے، قرآن کریم نے اس شق کو بار بار دہرایا ہے: وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ان میں سب سے آخری کتاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل

ہوئی وہ پچھلے تمام صحائف اور کتابوں کی تعلیمات کو پوری طرح حاوی ہے اور دنیا میں اب صرف یہی محفوظ وموجود ہے، باقی تو زمانے کی نذر ہو گئیں۔

والیوم الآخر

جس طرح ہر چیز کی آخری منزل فنا، اور زوال ہے اسی طرح ایک مقررہ دن دنیا کا یہ پورا نظام تہہ وبالا کر دیا جائے گا اور ہر چیز کو موت آجائے گی، پھر باری تعالیٰ سارے انسانوں کو از سر نو زندہ کر کے ان کی زندگی کے ہر لمحے کا حساب لیں گے، اور ہر خیر وشر کا بدلہ دیا جائے گا، خواہ وہ رائی کے دانے کے برابر ہی کیوں نہ ہو، آخرت کا عقیدہ تمام مذاہب کی بنیاد ہے اور اسلام نے بھی ایمان باللہ کے بعد سب سے زیادہ زور ایمان بالآخرت پر ہی دیا ہے۔

وبالقدر خیرہ وشرہ

اس عقیدے کا خلاصہ یہ ہے کہ: دنیا میں اب تک جو کچھ ہوا، جو اس وقت ہو رہا ہے اور جو آئندہ ہوگا، خواہ وہ خیر ہو یا شر سب اللہ کے حکم اور اسی کے علم کے مطابق ہوا ہے، جس کو اس نے ازل میں طے کر دیا تھا، مسئلہ قدر پر مفصل کلام ہم باب القدر میں کریں گے۔

احسان

﴿ماالاحسان﴾ یہ قرآن وسنت کی ایک مخصوص اصطلاح ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ: عقائد واعمال کو اس طرح ادا کیا جائے، جیسا کہ ان کا حق ہے، حدیث میں اس کی صورت یہ بتائی گئی ہے کہ: **ان تعبد اللّٰہ کانك تراہُ فان لم تکن تراہُ فانہ یراك** محدثین کے نزدیک اس سے عبادت کے دو درجوں کی طرف اشارہ ہے، پہلا یہ کہ عبادت مشاہدہ کے ساتھ کی جائے، یہ عارفین کا مقام ہے، دوسرا یہ کہ مشاہدہ تو حاصل نہ ہو، لیکن تصور یہ کیا جائے، کہ: اللہ مجھ کو دیکھ رہا ہے، یہ دوسرے درجے کے عابدوں کا مقام ہے امام نووی نے شرح مسلم اور علامہ سندھی نے حواشی صحیح بخاری میں اس کا دوسرا مطلب بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ: تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے، تو وہ تو تم کو دیکھ ہی رہا ہے، تو اس طرح یہ درجہ بندی نہیں، بلکہ خدا کے وجود کا کامل استحضار ہے، حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

نے معارف الحدیث (۱/ ۲۸) میں اسی مفہوم کو حدیث کے الفاظ سے قریب تر قرار دیا ہے۔

متی الساعة

دوسرے طرق میں: فاخبرنی عن الساعة کے الفاظ منقول ہیں، امام قرطبی کا کہنا ہے کہ: سوال کا مقصد سامعین کو قیامت کی بابت استفسار سے روکنا ہے، جیسا کہ قرآن وحدیث کی تعلیم ہے، رسول اللہؐ نے ہر سوال کا جواب دیا، لیکن قیامت کے بارے میں آپ نے: ما المسؤل عنها باعلم من السائل ہی کا جملہ کہا حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں اور مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے: التعلیق الصبیح میں لکھا ہے کہ: یہاں اصل جواب: لست اعلم بها تھا لیکن اسے چھوڑ کر یہاں ایک عمومی اور اصولی جواب دیا گیا، تاکہ سامعین یہ سمجھ لیں کہ قیامت کی تاریخ سے متعلق جو بھی سائل ومسئول ہوگا، اسکی یہی کیفیت ہوگی کہ: کوئی حتمی جواب نہیں دے سکتا، حضرت کشمیریؒ کا کہنا ہے کہ: یہاں کنایۃً جواب دیدیا گیا اور یہی فصیح ہے۔

آثار قیامت

﴿فما اماراتها﴾ اس کی علامتیں کیا ہیں، فرمایا: ﴿ان تلد الامة ربتها﴾ اس جملے کی تشریح میں محدثین سے کئی اقوال مروی ہیں، ۱۔ اصول فروع اور فروع اصول بن جائیں، یعنی ہر معاملے میں اہل علم وفضل اور خاندانی لوگوں کو نظر انداز کر کے امور ومعاملات نااہلوں کے ہاتھ میں دیدیئے جائیں، ۲۔ نااہل لوگ قائد بن جائیں، جیسا کہ حدیث کے دوسرے طریق میں مروی ہے: اذا وُسد الامر الی غیر اهله فانتظر الساعة حضرت کشمیریؒ نے ''فیض الباری'' میں اسی کو ترجیح دی ہے، ۳۔ کنایۃً یہاں باندیوں کی اولاد کی کثرت کی خبر دی گئی ہے کہ: ماں اپنے بیٹے کے لئے بھی باندی کی طرح ہوگی، کیونکہ وہ اس کے باپ کی مملوکہ ہوگی، ۴۔ فتوحات کے بعد حاصل ہونے والی باندیوں کی کوکھ سے حکمراں جنم لیں گے اور ماؤں کی حیثیت رعایا کی سی ہوگی، ۵۔ یہ شر وفساد کی خبر ہے کہ: قرب قیامت میں امہات الاولاد کی کثرت سے خرید وفروخت ہوگی، یہاں تک کہ ایک شخص اپنی ماں کو خریدے گا، لیکن اسے کچھ خبر نہ ہوگی، ۶۔ والدین کی نافرمانی کی خبر ہے کہ: اولاد ان کے ساتھ ایسا توہین آمیز سلوک کرے

گی، جیسا آقا باندیوں سے کرتے ہیں، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے "فتح الملہم" میں اسی توجیہ کو خصوصاً ذکر کیا ہے اور حضرت مولانا نعمانی نے معارف الحدیث (۱/۷۱) میں بھی اسی کو ترجیح دی ہے کہ: لڑکیاں جن کی سرشت میں ماؤں کی اطاعت وعظمت حد درجہ ہوتی ہے، اور نافرمانی مشکل وبعید ہوتی ہے وہ بھی نافرمان ہو جائیں گی، اور ماؤں پر اس طرح حکم چلائیں گی گویا وہ ان کی زرخرید غلام ہیں۔

دوسری نشانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلائی کہ: **ان ترى الحفاة العراة الخ** چرواہے، عربوں میں اونٹ والوں کی بہ نسبت کمتر سمجھے جاتے تھے، ان کا قیامت کے قریب خصوصی عروج ہوگا، اور گرے پڑے لوگ نہ صرف اونچی اونچی عمارتیں بنائیں گے، بلکہ وہی اس وقت بادشاہ بھی ہوں گے، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ: چرواہوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو بالکل قلاش ہوتے ہیں۔

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے: **أشعة اللمعات** میں اور مولانا عثمانیؒ نے فتح الملہم میں یہی توجیہ نقل کی ہے............حضرت عمرؓ کہتے ہیں: **فلقيني النبي صلى الله عليه وسلم بعد ثلث** دوسرے طرق میں: **فلبثتُ مليًا** کا لفظ ہے، جس سے تین دن ہی مراد لئے جائیں گے، شارحین کی یہی رائے ہے۔

حدیث صحیح بخاری (ایمان/۳۶ تفسیر/لقمان) صحیح مسلم، (ایمان/۱) سنن نسائی (ایمان/۶) سنن ابی داؤد (السنۃ/ القدر) اور جامع ترمذی (ایمان/۴) وغیرہ میں بھی منقول ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی صحیح ہے۔

(۶۵/۹) حَدَّثَنَا أَبُوْ بَكْرِبْن أَبِيْ شَيْبَةَ ثَنَا إِسْمٰعِيْلُ بْنُ عُلَيَّةَ عَنْ أَبِيْ حَيَّانَ عَنْ أَبِيْ زُرْعَةَ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا بَارِزًا لِلنَّاسِ فَأَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْإِيْمَانُ؟ قَالَ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَلِقَائِهِ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ الْاٰخِرِ قَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْإِسْلَامُ؟ قَالَ أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ الْمَكْتُوْبَةَ وَتُؤَدِّيَ الزَّكَاةَ الْمَفْرُوْضَةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ قَالَ

يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْاِحْسَانُ؟ قَالَ! أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنَّكَ اِنْ لَاتَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ قَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَتَى السَّاعَةُ؟ قَالَ مَا الْمَسْؤُلُ عنها بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ وَلٰكِنْ سَاُحَدِّثُكَ عَنْ اَشْرَاطِهَا اِذَا وَلَدَتْ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا، فَذَالِكَ مِنْ اَشْرَاطِهَا وَاِذَا تَطَاوَلَ رِعَاءُ الْغَنَمِ فِي الْبُنْيَانِ فَذٰلِكَ مِنْ أَشْرَاطِهَا فِيْ خَمْسٍ لَايَعْلَمُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ فتلَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰه عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَاذَا تَكْسبُ غَدًا وَمَا تَدْرِيْ نفسٌ بِاَىِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ.

ایک دن رسول اللہ ﷺ لوگوں کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: تم اللہ، فرشتوں، اس کی کتابوں، رسولوں اور اس کی ملاقات پر ایمان لاؤ، اور آخری زندگی پر ایمان لاؤ۔ اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! اسلام کیا ہے؟ فرمایا کہ تم اللہ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، فرض نماز قائم کرو، فرض زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو۔ اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! احسان کیا ہے؟ فرمایا تم اس طرح اللہ کی عبادت کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو، کیونکہ تم اگر اسے نہیں دیکھتے تو وہ تم کو دیکھ ہی رہا ہے۔ اس نے کہا: قیامت کب آئے گی؟ فرمایا: اس کی بابت مسئول کو سائل سے زیادہ علم نہیں؛ لیکن میں تم کو اس کی علامات بتاتا ہوں کہ جب باندی اپنی آقا جنے تو وہ اس کی علامت ہے، جب بکریاں چرانے والے تعمیر میں مفاخرہ کریں تو وہ اس کی علامت ہے، قیامت ان پانچ چیزوں میں ہے جن کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، پھر آپ نے تلاوت فرمائی، بے شک اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے وہی بارش برساتا ہے وہ رحموں کی حالت جانتا ہے، اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا، اور کوئی نہیں جانتا کہ کس زمین میں مرے گا، بے شک اللہ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

پہلی روایت کے برخلاف اس روایت میں حج البیت کا تذکرہ نہیں ہے، اسی طرح صحیح بخاری کتاب الایمان میں بھی حج کا ذکر نہیں کیا گیا، جب کہ سنن نسائی میں تحج البیت

اور صحیح مسلم میں: تحج البیت ان استطعت الیه سبیلا کی صراحت ہے:

﴿ورسله﴾ بخاری مسلم میں اس سے پہلے: لقائه کا اور اضافہ ہے، بیشتر روایات میں رسل کے الفاظ آئے ہیں، لیکن سنن نسائی کے ایک طریق میں: والنبیین منقول ہے۔

﴿متی الساعة﴾ اس کے بعد بخاری مسلم نسائی ابن ماجہ میں فوراً: ما المسؤل منها باعلم من السائل والا جواب نقل کیا گیا ہے، لیکن نسائی کی روایت میں متی الساعة کے بعد: فنکس فلم یجبه شیئاثم اعادفلم یجبه شیئا ثم اعاد فلم یجبه شیئا ورفع راسه فقال مالمسئول الخ ولکن لها علامات تعرف بها" کا بھی اضافہ ہے۔

﴿ولکن سأحدثك عن اشراطها﴾ بخاری و مسلم میں بھی یہی الفاظ ہیں جب کہ دوسری روایات میں یہاں اس جملے کے بجائے جبریل امین کا سوال: فاخبرنی عن اماراتها منقول ہے۔

﴿واذا تطاول رعاء الغنم فی البنیان﴾ مسلم کے دوسرے طریق میں: اذا رأیت الحفاة العراة الصم البکم ملوك الارض کے الفاظ آئے ہیں۔

﴿فی خمس لا یعلمهن الا الله﴾ بخاری و مسلم میں صراحت ہے کہ: جب سائل رخصت ہوگیا، تو آپ ﷺ نے صحابہؓ کو حکم دیا: ردوهُ علی الرجل فاخذوا لیردوه فلم یروا شیئا اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: هذا جبریل جاء لیعلم الناس دینهم.

دنس، گندگی، نکس (ن) نکسا راسه، سر جھکانا۔ دنا، یدنوا، دنوا قریب ہونا، بهم ابهم کی جمع ہے، گونگا یہاں گفتگو کے آداب سے ناآشنا ہونا مراد ہے، مسلم میں یہی الفاظ "نووی" کی تصریح کے مطابق "بُهْمٌ" ہے جس کے معنی گائے اور بکری کے چھوٹے بچے ہیں، ایسے لوگوں کو عربوں میں کم درجے کا سمجھا جاتا تھا: "صُمٌّ، اصم" کی جمع ہے، بہرا۔ بکم ابکم کی جمع ہے، گونگا، امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ: ان الفاظ سے جاہل اور پست درجے کے چرواہے مراد ہیں وہ اپنی سماعت وقوت گویائی وغیرہ سے صحیح کام نہیں لیتے اس لئے ان پر الصم البکم کا اطلاق کیا گیا، تخریج ومباحث گزر چکے، سند صحیح ہے۔

(۶۶/۱۰) حَدَّثَنَا سَهْلُ بْنُ اَبِیْ سَهْلٍ وَمُحَمَّدُ بْنُ اِسْمَاعِیْلَ قَالَا: ثَنَا عَبْدُ

السَّلَامِ بْنُ صَالِحٍ اَبُوالصَّلْتِ الْهَرَوِيُّ ثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُوْسَى الرِّضَا عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاِيْمَانُ مَعْرِفَةٌ بِالْقَلْبِ وَقَوْلٌ بِاللِّسَانِ وَعَمَلٌ بِالْاَرْكَانِ، قَالَ اَبُوالصَّلْتِ لَوْقُرِئَ هٰذَا الْاِسْنَادِ عَلٰى مَجْنُوْنٍ لَبَرَأَ"

حدیث کے ایک راوی عبد السلام بن صالح سلیمان قدرے تعارف کے محتاج ہیں، اگر چہ کچھ حضرات نے ان کی صفائی پیش کی ہے، لیکن بیشتر محدثین انہیں قابل اعتماد نہیں سمجھتے چنانچہ ان کے بارے میں امام نسائی نے: لیس بثقة ابوزرعہ نے لا احدث عنه ولا ارضاه جوزقانی نے کان مائلا عن الحق ابن عدی نے: له احادیث مناکیر فی فضل اهل البیت وهو متهم فیها ابن حجر نے: صدوق له مناکیر و کان یتشیع دارقطنی نے رافضی خبیث متهم بوضع حدیث الایمان اقرار بالقول اور احمد بن عبد اللہ بن صالح ابوالحسن عجلی نے کذاب ہونے کی صراحت کی ہے ملاحظہ ہو (تقریب ۱/۱۲۸،) (تہذیب ۶/۳۲۲) (میزان ۲/ ۱۲۸) (ماتمس الیه الحاجة)

حضرت مولانا عبدالرشید صاحب نعمانیؒ نے بھی ان اقوال کونقل کرنے کے بعد دارقطنی کی رائے کو ترجیح دی ہے، جس کی دلیل ان کے نزدیک ذھبی اور ابن حجرؒ کا اس رائے کونقل کر کے اس کی تردید نہ کرنا ہے، کیونکہ دونوں اپنے اعتدال کی بنا پر اتنی سخت جرح کو برداشت نہیں کرتے اسی بنا پر ابن الجوزی نے اسے: "موضوعات" (۱/ ۱۲۸) میں: هذا حدیث موضوع لم یقله رسول الله صلی الله علیه وسلم، علامہ ابن قیم نے تہذیب السنن (۸/ ۵۹) میں هذا حدیث موضوع لیس من کلام رسول الله صلی الله علیه وسلم" علامہ کمال الدین دمیری نے انفرد به المصنف وهو حدیث موضوع قرار دیا ہے، بوصیری زوائد ابن ماجہ (۱۲/۱) میں لکھتے ہیں ابو الصلت هذا متفق علی ضعفه واتهمه بعضهم امام سیوطی کو اس رائے سے اتفاق نہیں اور بعض محدثین نے اسے قابل استدلال بنانے کے لئے متعدد طرق کو بھی جمع کیا ہے، لیکن وہ سب کے سب ضعیف ہیں، روایت کے رد ہونے کے بعد

اب علماء فیصلہ کریں کہ: "لوقرئ هذا الاسناد علی مجنون لبرأ " کا انکشاف کیونکر درست ہوسکتا ہے، اور علامہ سندھیؒ کے یہ الفاظ محل نظر ہیں لما فی الاسناد من خیار العباد وهم خلاصة اهل بیت النبوة رضی الله عنهم.

(۶۷/۱۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ وَمُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى قَالَا ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ سَمِعْتُ قَتَادَةَ يُحَدِّثُ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا يُوْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ اَوْقَالَ لِجَارِهِ، مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ

تم میں کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی یا پڑوسی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

﴿لا یومن احدکم﴾ مسلم میں: والذی نفسی بیده اور نسائی میں: والذی نفس محمد بیده اس جملے سے پہلے منقول ہے۔

﴿لأخیه اوقال لجاره﴾ صحیح مسلم میں بھی اسی طرح منقول ہے، جب کہ: بخاری ونسائی میں بلاشک صرف لأخیه آیا ہے۔

﴿ما یحب لنفسه﴾ سنن نسائی کے ایک طریق میں یہاں: "من الخیر" کا اضافہ بھی ملتا ہے، جب کہ مسند احمد ابن حنبلؒ میں اس کے بعد وتکره "ماتکره لنفسك" بھی آیا ہے، نسائی کی زیادتی کی بنیاد پر اس کی وضاحت علامہ سندھیؒ نے "ای من خیری الدنیا والاخرة" سے کی ہے، امام نوویؒ اس کی نشاندہی کر کے لکھتے ہیں: "المراد یحب لاخیه من الطاعات والاشیاء المباحات"[1] حافظ ابن حجر نے اس کو اور پھیلایا ہے: "والخیر کلمة" جامعة تعم الطاعات والمباحات الدنیویة والاخرویة وتخرج المنهیات لان اسم الخیر لا یتناولها[2] خیر طاعت وعبادات اور دنیا وآخرت کے تمام مستحب امور کو شامل ہے، منہیات اس میں داخل نہیں، کیونکہ خیر کا لفظ ان کا متحمل نہیں ہے،

---

[1] صحیح مسلم ۱/۵۰

[2] فتح الباری کتاب الایمان باب من الایمان ان یحب لاخیه ما یحب لنفسه۔

خلاصہ یہ نکلا کہ دینی اور دنیوی تمام فائدے جو اپنے لئے چاہے، اسی کی خواہش دوسرے مسلمان بھائی کے لئے بھی کرے، ایمان سے یہاں مطلق نہیں، بلکہ کمال وتمام کی نفی مقصود ہے، جیسا کہ امام نوویؒ نے لکھا ہے: قال العلماء معناه لايومن الايمان التام والا، فاصل الايمان يحصل لمن لم يكن بهذه الصفة[1] علماء کے نزدیک یہاں کمال ایمان کی نفی ہے ورنہ نفس ایمان تو اس شخص کو بھی حاصل ہے جس میں یہ صفت نہیں ہے، حدیث صحیح بخاری (ایمان/۶) صحیح مسلم (ایمان/۱۵) سنن نسائی (ایمان/ ۱۹،۳۳) اور دوسری کتابوں میں بھی آئی ہے، ابن ماجہ کی سند بعینہٖ مسلم کی ہے۔

(۶۸/۱۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ وَمُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنّٰى قَالَا ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ سَمِعْتُ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ.

تم میں کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

﴿لايومن﴾ اس کی تشریح امام نوویؒ نے: ان حقيقة الايمان لاتتم الا بذلك علامہ سندھیؒ نے: لا يكمل ايمانه اور ملا علی قاریؒ نے: اى ايمانًا كاملًا سے کی ہے، یعنی یہاں مطلق ایمان کی نہیں کمالِ ایمان کی نفی ہے۔

﴿من ولده﴾ صحیح مسلم اور سنن نسائی میں بھی ولد ہی مقدم ہے، بخاری کی روایت میں پہلے والد آیا ہے، جس کی وجہ ابن حجر نے یہ بتائی کہ: ہر انسان کے لئے باپ کا وجود تو لازم ہے، لیکن اس کے کوئی اولاد بھی ہو، یہ ضروری نہیں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے نزدیک وجہ تقدم في الزمان والاجلال ہے، جب کہ: "ولد" کو مقدم کرنے کی حکمت ملا علی قاری کے نزدیک لان محبته اكثر[2].

﴿ووالده﴾ ملا علی قاریؒ علامہ عثمانی اور دیگر محدثین کے نزدیک یہاں دونوں والدین

[1] شرح مسلم: ۴۹/۱ [2] مرقاۃ المفاتیح کتاب الایمان فصل اول حدیث ۵

مراد ہیں۔

محبت کی تقسیم

محدثین نے محبت کی اصالۃً دو قسمیں کی ہیں۔ ۱ طبعی محبت یہ خونی رشتوں کا نتیجہ ہے، ۲ اختیاری محبت یہ عظمت اور احسان کی بنا پر پیدا ہوتی ہے، یہاں کون سی مراد ہے بحث کا اصل نقطہ یہی ہے۔

ابو سلیمان خطابی، قاضی بیضاوی علامہ سندھیؒ اور علامہ قسطلانی کے نزدیک یہاں حب عقلی اور اختیاری مراد ہے، کیونکہ حب طبعی صرف خونی رشتوں کا نتیجہ ہے، اور غیر اقارب کے سلسلے میں کسی شخص کو حب طبعی کا: مکلف بنانا: لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے منافی ہے، لیکن یہ رائے صحیح نہیں ہے، بدرالدین عینی علامہ طیبی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کہتے ہیں کہ: یہاں حب عقلی نہیں حب طبعی مراد ہے، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: "**قل ان کان اباؤکم وابناؤکم وازواجکم وعشیرتکم واموال إقترفتموها وتجارة تخشون كسادها ومساكن ترضونها احب اليكم من الله ورسوله وجهاد في سبيله فتربصوا حتى ياتي الله بأمره**" آیت مذکورہ چیزوں کی محبت طبعی ہے، اور اللہ اور اس کے رسول کے حق میں اس سے کہیں زیادہ محبت مطلوب ہے، اسی طرح امام بخاری نے کتاب الایمان والقدر میں حدیث نقل کی ہے: **عن عمر بن الخطاب قال للنبي صلى الله عليه وسلم لأنت يا رسول الله احب الي من كل شئ من نفسي فقال لا والذي نفسي بيده حتى اكون اليك من نفسك فقال له عمر فانك الان والله احب الي من نفسي قال الان ياعمر** یہ حدیث بھی حب رسول کا طبعی ہونے کا فیصلہ کرتی ہے، نیز صحابہ کرامؓ کی جانثاری کو دیکھ کر بھی یہی فیصلہ کرنا پڑتا ہے، چنانچہ حضرت طلحہؓ اور ابودجانہ کا احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے خود کو ڈھال بنا دینا، عبداللہ بن زید بن عبدربہ کا وفات نبوی کے بعد: **اذهب بصري حتى لا أرى بعد حبيبي احدا** کی دعاء کرنا اور پھر کف بصر پر خوش ہونا، اسی طرح شوہر، بھائی اور والد کی شہادت کے باوجود ایک انصاریہ کا رسول اللہ کو دیکھ کر: **كل مصيبة بعدك جلل** کہنا اور ابوسفیان کے جواب میں زید بن دخنہ کا قول **والله ما**

احب ان محمدا الان فی مکانه الذی هو فیه تصیبه شوکة وانی جالس فی اهلی وغیرہ، جیسے واقعات صرف اورصرف محبت طبعی کی مثالیں ہیں، اس لئے پہلے کی نسبت یہ رائے زیادہ قوی ہے اور مولانا ادریس کاندھلویؒ کا رجحان بھی یہی ہے، جب کہ حضرت کشمیریؒ محبت کی تقسیم ہی کے خلاف ہیں، وہ کہتے ہیں، محبت ایک ہی ہے: ان صرفتها الی الاباء والابناءِ سمیت طبیعیة وان صرفتها الی الشرع سمیت شرعیة واضح رہے کہ:اس محبت کے نتائج قاضی عیاضؒ کے الفاظ میں اب سنت کی نصرت، شریعت کی حفاظت کرنا، اطاعت رسول میں اپنے کو فنا کرنا اور خواہشات پر مرضیات نبوی کو مقدم رکھنا ہے: نصرة سنتهٖ والذب عن شریعتهٖ والتمنی حضور حیاتهٖ فیبذل ماله ونفسهٗ ...... حدیث صحیح بخاری (ایمان/ ۷) صحیح مسلم (ایمان/۱۴) سنن نسائی (ایمان/ ۱۹) میں آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بعینہٖ مسلم کی ہے۔

(۶۹/۱۳) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ اَبِیْ شَیْبَةَ ثَنَا وَكِیْعٌ وَاَبُوْ مُعَاوِیَةَ عَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ اَبِیْ صَالِحٍ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ "وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَا تَدْخُلُوْا الْجَنَّةَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا اَوَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰی شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ اَفْشُوْا السَّلَامَ بَیْنَكُمْ"

سلام کی ترغیب

﴿والذی نفسی بیده﴾ ...... یہاں واؤ قسمیہ ہے: "الّذی" اسم موصول اور اگلا پورا جملہ اس کا صلہ ہے، اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر قسم اور: لاتدخلوا الجنة الخ جواب قسم ہے، جامع ترمذی کی روایت میں بھی: لاتدخلوا ہی ہے، جب کہ صحیح مسلم میں: لاتدخلون آیا ہے اور ولا تومنوا نفی کا صیغہ ہے، یا نہی کا: حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں: لعلّه نفیٌ بصیغة النهی علامہ سندھی کا فیصلہ ہے: لا یخفی انه نفی ولا نهیٌ یہی رائے ملا علی قاریؒ کی بھی ہے، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ نہی نہیں، بلکہ نفی ہے، تو دونوں کا نون کیوں حذف کیا گیا، ملاعلی قاریؒ، علامہ سندھیؒ اور حضرت شیخ الحدیث سہارنپوری کا جواب یہ ہے کہ: نون مجانست اور ازدواج کے باعث حذف ہوا، حضرت گنگوہیؒ نے الکوکب الدری (۲/۱۳۴)

میں اس کا ذرا مفصل جواب دیا ہے، فرماتے ہیں: ان العرب تعامل بالنون معاملة حرف العلة فتحذفها تحقيقًا كما فی قوله تعالىٰ أولم تك تاتيكم رسلكم بالبينات وقول الشاعر ألم يك بيننا بلدٌ بعيدٌ مجانست وازدواج اور حرف علت کا سا معاملہ کرنے ہی کو غالبًا امام نووی نے: وهی لغة معروفة صحيحة قرار دیا ہے، علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں: وقد جاء حذفها للتخفيف كثيرًا .

ابن الصلاح، نووی اور علامہ سندھیؒ نے دونوں جگہ کمال ایمان مراد لیا ہے، سندھی کے الفاظ میں مفہوم یہ ہوگا: والمراد لاتستحقون دخول الجنة اولاً حتى تومنوا ايمانًا كاملاً ولا تومنوا ذلك الايمان الكامل حتى تحابوا یہی بات مجددی نے لکھی ہے والمراد بالدخول الدخول الاول والا فمن امن بالله ورسوله وان لم يعمل بعمل قط يدخل الجنة کہ یہاں اوائل وہلہ کا داخلہ مراد ہے، ورنہ سزا بھگت کر تو وہ مسلمان بھی جنت میں جائے گا جس نے کبھی کوئی عمل نہیں کیا۔

﴿تحابوا﴾ علامہ سندھی کے بقول یہ "تتحابون" تھا، نون اعرابی ساقط ہوا اور تاء تخفیفاً حذف کردی گئی، مولانا نعمانیؒ کے بقول معلوم یہ ہوا کہ ایمان محض عقیدہ اور کلمہ نہیں بلکہ وہ اتنی وسیع حقیقت ہے کہ: باہمی تعلق ومحبت بھی اسکا لازمی جز ہے۔

﴿أفشو السلام﴾ یہ باب افعال سے امر کا صیغہ ہے، امام نوویؒ لکھتے ہیں: وفيه الحث العظيم على افشاء السلام وبذله للمسلمين كلهم من عرفت ومن لم تعرف علامہ سندھیؒ نے اس کی یہ حکمت بیان کی ہے: والمراد نشر السلام بين الناس لِيُحيُوا سنتهٗ آگے فرماتے ہیں، کہ سیوطیؒ نے ابوداؤد کے حاشیئے میں نوویؒ کے حوالے سے لکھا ہے: أقله ان يُرفع صوته بحيث يسمع المسلم عليه فان لم يسمعه لم يكن آتيا بالسنة اس کی ادنیٰ حد یہ ہے کہ سلام اتنی آواز سے کیا جائے جس کو مخاطب سن لے ورنہ سنت کی ادائیگی نہیں ہوگی، اپنی رائے دیتے ہوئے سندھیؒ لکھتے ہیں: قلت وظاهره انه حمل الافشاء على رفع الصوت به والاقرب حمله على الاكثار یعنی نوویؒ نے افشاء کو رفع صوت پر محمول کیا ہے، لیکن اسے کثرتِ سلام پر محمول کرنا لفظ سے زیادہ قریب ہے۔

سلام تمام قوموں میں رائج رہا ہے: اہل جاہلیت انعم اللہ بك یا انعم صباحًا کہا کرتے تھے اور ہر قوم کے اس سلسلے میں مخصوص الفاظ ہیں، لیکن ان میں کوئی بھی اپنے اندر بیک وقت محبت و تعظیم اور دعاء کے معنی نہیں رکھتا: ''السلام علیکم'' ایسا جامع کلمہ ہے، جو دعاء ہونے کے ساتھ عبدیت کا احساس بھی دلاتا ہے، اس میں چھوٹوں کے لئے پیار و محبت اور بڑوں کے لئے اکرام و عظمت کی ایک دنیا موجود ہے، وہ اجنبیت کے پردے ہٹاتا ہے، پرانے تعارف کو جلاء بخشتا ہے، شرعی آداب کی رو سے چھوٹا بڑے کو، سوار پیدل کو، کھڑا بیٹھے کو اور فرد جماعت کو سلام کرے گا جب کہ قضاء حاجت، کھانا کھاتے وقت اسی طرح شہوت کی موجودگی میں عورتوں کو سلام کرنا منع ہے، اس کے لئے تعارف ضروری نہیں، یہ ہر مسلمان کا حق ہے، اسی لئے کفار کو سلام کرنے کی اجازت نہیں، ان کے حق میں انبیاء سے صرف دو ہی دعاء منقول ہیں، شروع میں ہدایت کی اور آخر میں ہلاکت کی، سلام تو مستحب ہے، لیکن اس کا جواب دینا واجب ہو جاتا ہے...... حدیث باب صحیح مسلم، (ایمان......۲۰) اور جامع ترمذی (استیذان/۱) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بعینہٖ مسلم کی سند ہے۔

(۷۰/۴) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ نُمَيْرٍ ثَنَا عَفَّانُ ثَنَا شُعْبَةُ عَنِ الْاَعْمَشِ ح وَحَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ ثَنَا عِيْسَى بْنُ يُوْنُسَ ثَنَا الْاَعْمَشُ عَنْ اَبِيْ وَائِلٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ.

مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے قتال کرنا کفر ہے۔

﴿سباب المسلم فسوق﴾ سب سے مفاعلۃ کا مصدر ہے، امام نوویؒ کے الفاظ میں معنی: الشتم والتكلم فی عرض الانسان بما يعيبه یعنی گالی دینا اور کیچڑ اچھالنا، فسوق، نصر کے باب سے آتا ہے معنی: عصى وجاوز حدود الشرع وخرج من طاعته ہیں، امام نوویؒ نے لکھا ہے: واما معنى الحديث فسب المسلم بغير حق حرام باجماع الامة وفاعله فاسق كما اخبر به النبی صلی اللہ علیہ وسلم[1].

---

[1] صحیح مسلم بشرح نووی ۵۸/۱۔

﴿وقتاله كفر﴾ مومن سے قتال کبائر میں سے ہے، جس کے ارتکاب سے بندہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک فاسق ہو جاتا ہے، بظاہر حدیث سے خوارج کی تائید ہوتی ہے، جو مرتکب کبیرہ کو کافر کہتے ہیں، اس لئے محدثین نے یہاں متعدد توجیہات کی ہیں، امام نووی لکھتے ہیں: ۱ احدها أنه في المستحل اگر جائز سمجھ کر قتال کرنے تو یہ حکم ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اس پر بڑا وزنی اشکال کیا ہے، کہ حلال سمجھ کر تو سباب بھی کفر ہے پھر دونوں میں فرق کیا جائے گا۔

۲ والثاني ان المراد كفر الاحسان والنعمة واخوة الاسلام لاكفر الجحود کفر سے مراد یہاں ایمان کی ضد انکار نہیں بلکہ نعمت الٰہی، احسان خداوندی اور اسلامی اخوت کی ناشکری ہے۔

۳ والثالث انه يؤل الى الكفر بشومه یہ فعل حرمت ونحوست کی بنا پر کفر تک پہنچ جاتا ہے، حضرت گنگوہیؒ نے: "الكوكب الدرى" میں: والجواب عن القتال بالكفر لكونه اعظم الكبائر فكانه اذا قتل المسلم فقد كفر لکھ کر اسی کی تائید کی ہے، شیخ الاسلام حضرت کشمیریؒ کی بھی یہی رائے ہے۔

۴ انه كفعل الكفار[۱] یہ گویا کافروں کا فعل ہے، یعنی اسے تغلیظا وتشبیہا کفر کہا گیا، علامہ سندھیؒ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور دیگر محدثین کا یہی رجحان ہے، صحیح بخاری (فتن/ ۸) کی حدیث: لاترجعوا بعدى كفارا يضرب بعضكم رقاب بعض سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

حدیث بخاری (ایمان/ ۳۵، ادب/ ۴۴، فتن/ ۸) مسلم (ایمان/ ۲۶) نسائی (محاربۃ/ ۲۳) اور ترمذی (البر/ ۵۰، ایمان/ ۱۴) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند کو مولانا لطیف الرحمٰن نے الدیباجہ (۱/ ۳۵۹) میں اسناده صحيح قرار دیا ہے۔

(۷۱/۱۵) حَدَّثَنَا نَصْرُ بْنُ عَلِيِّ الْجَهْضَمِيُّ، ثَنَا أَبُوْ أَحْمَدَ، ثَنَا أَبُوْجَعْفَرِ الرَّازِيُّ، عَنِ الرَّبِيْعِ بْنِ أَنَسٍ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

---

۱ شرح مسلم نووی (۱/ ۵۸)

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ فَارَقَ الدُّنْيَا عَلَى الِاخْلَاصِ لِلّٰهِ وَحْدَهُ، وَعِبَادَتِهِ لَاشَرِيكَ لَهُ، وَاِقَامِ الصَّلَاةِ، وَاِيتَاءِ الزَّكَاةِ، مَاتَ وَاللّٰهُ عَنْهُ رَاضٍ" قَالَ اَنَسٌ: وَهُوَ دِيْنُ اللّٰهِ الَّذِيْ جَائَتْ بِهِ الرُّسُلُ وَبَلَّغُوْهُ عَنْ رَّبِّهِمْ قَبْلَ هَرْجِ الاَحَادِيْثِ، وَاخْتِلَافِ الْأَهْوَاءِ ...... وَتَصْدِيْقُ ذٰلِكَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ فِيْ آخِرِ مَا نَزَلَ يَقُوْلُ اللّٰهُ: فَاِنْ تَابُوْا قَالَ: خَلْعُ الْاَوْثَانِ وَعِبَادَتِهَا وَاَقَامُوْا الصَّلَاةَ وَاٰتُوْا الزَّكَاةَ وَقَالَ فِيْ اٰيَةٍ اُخْرٰى فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوْا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوْا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ.

حضرت انس سے روایت ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص دنیا سے اس حال میں رخصت ہوا کہ وہ دلجمعی کے ساتھ توحید کا قائل تھا صرف اسی کی عبادت کرتا تھا، نماز قائم کرتا تھا، زکوٰۃ ادا کرتا تھا، پھر وہ مرگیا، تو اللہ اس سے راضی ہوگا۔

حضرت انسؓ کا کہنا ہے کہ اللہ کا دین وہ ہے جس کو پیغمبر لے کر آئے اور اپنے رب کے حوالے سے اسے دوسروں تک خواہشات کے تنوع اور فتنوں کے ظہور سے پہلے پہنچا دیا۔

اسکی تصدیق قرآن کریم کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت سے بھی ہوتی ہے، یعنی اگر وہ توبہ کرلیں، حضرت انسؓ کے بقول بتوں کی عظمت اور عبادت کو چھوڑ دیں باطل مذہب وعقیدے سے اجتناب کریں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں باری تعالیٰ نے ایک دوسری آیت میں فرمایا اگر وہ توبہ کرلیں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، تو اب وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

﴿علی الاخلاص للّٰه وحده، وعبادته لا شريك له﴾ یہاں واؤ کو عطف تفسیری مان کر اخلاص کا مطلب: "وحده لا شريك" کی عبادت اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ ہوگا، علامہ سندھیؒ نے عبادت کے معنی: "ای توحیده" لکھے ہیں، جب کہ دوسری صورت میں اصالۃً تو یہاں اطاعت مراد ہے اور نماز وزکوٰۃ کا ذکر عظیم عبادت ہونے کی بنا پر نمونے کے طور پر کیا گیا ہے، سندھیؒ نے لکھا: "فذكر اقام الصلوٰة وايتاء الزكوٰة بعدها تخصيص لأعظم العبادات" چونکہ پہلی بدنی کا اور دوسری مالی عبادت کا گویا عنوان ہے، جس کے تحت تمام اقسام آجاتی ہیں، اخلاص کے معنی اللہ کی ذات وصفات میں صحیح موقف اختیار

کرنا اور شرک کے شائبے تک سے بچنا ہے، یہ لفظ دراصل توحید کے اس جامع تصور کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو سورہ اخلاص میں پیش کیا گیا ہے۔

﴿مات واللّٰه عنه راض﴾ علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے: "یوفق لفعل الخیرات وترك المنكرات والتوبة عند الموت" یعنی راضی ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ: زندگی میں تو اسے نیکیاں کرنے اور برائیوں سے بچنے کی توفیق ملے گی اور موت کے وقت توبہ نصیب ہوگی۔

﴿قبل هرج الأحاديث﴾ ھرج، کے معنی فتنہ وفساد کے ہیں، علامہ سندھیؒ لکھتے ہیں: كثرتها واختلاطها شیخ مجددی نے فرمایا یعنی قبل اختلاط الاحاديث من قبل انفسهم في الدين المنزل یعنی آسمانی دین میں نفسانیت کی بناء پر غلط باتوں کو شامل کر دینا، حضرت انسؓ اب اس مستند دین کی طرف مجموعی طور پر اشارہ فرما رہے ہیں، جس کی چند چیزیں حدیث میں نقل ہوئیں کہ: یہ رسولوں کا لایا ہوا دین ہے اور اس کا صرف وہی تصور قابلِ اعتبار ہے، جو فتنہ وفساد سے محفوظ خیر القرون میں موجود تھا۔

فرماتے ہیں کہ: اس حدیث کی تصدیق قرآن کریم کی آخر میں نازل ہونے والی اس آیت سے بھی ہوتی ہے، جس میں باری تعالیٰ نے فرمایا کہ: اگر وہ توبہ کر لیں، یعنی بتوں کی عقیدت وعبادت چھوڑ کر توحید کا اقرار کریں، نماز کو قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، تو ان کے ساتھ بھی رضائے الٰہی کا یہی معاملہ ہوگا، امام سیوطیؒ نے: "اخر ما نزل" کی تاویل سورہ براۃ سے کی ہے: لأنها اخر سورة جبکہ مجددیؒ نے بغوی کے حوالے سے آخر کو اضافی قرار دیا ہے تحقیقی نہیں یعنی یہ آیت بھی من جملہ دوسری آیتوں کے نبی کے آخری دور میں نازل ہوئی، دوسری آیت بھی اسی مضمون پر دلالت کرتی ہے کہ: ان چیزوں کی ادئیگی کے بعد یہ لوگ تمہارے دینی بھائی بن جائیں گے، یہاں حج کا کوئی تذکرہ نہیں حالانکہ وہ بھی فرض ہے؟ مجددیؒ نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے ان المشركين كانوا مقرين للحج ولم يكونوا مقرين للصلوٰة والزكوة فلذا اهتم اللّٰه تعالىٰ بشانهما وايضا الصلوٰة والزكوٰة تتكرران ولا يتكرر الحج مشرکین حج کے تو قائل تھے ہی اس لئے نماز وزکوٰۃ کا اہتمام کے ساتھ ذکر ہوا یا پھر اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں عبادتیں بار بار ادا کی جاتی ہیں جبکہ حج سال میں ایک بار ہی ہوتا ہے۔

سند کی تحقیق

صحاح میں یہ حدیث صرف ابن ماجہ میں آئی ہے حاکم نے گرچہ اس طریق کو صحیح الاسناد قرار دیا ہے، لیکن علامہ سندھی نے ابن حبان کے حوالہ سے لکھا ہے: "الناس يتقون حديثهٗ ما كان من رواية ابي جعفر عنه لأن في احاديثه اضطرابًا كثيرًا" یعنی ربیع سے جب ابوجعفر روایت کرتے ہیں، تو اہل علم ان کی حدیث سے پرہیز کرتے ہیں کیونکہ اس میں بہت اضطراب ہے، علامہ سندھی فرماتے ہیں کہ اس بات کو یوں کہنا چاہئے کہ: ابو جعفر ضعيف في الربيع لا الربيع ضعيف اذا روىٰ عنه ابو جعفر فليتامل" بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے: هذا اسناد ضعيف، الربيع بن انس ضعيف هنا (ملاحظہ ہو، سنن مصطفیٰ باب الایمان حدیث:۱۵) سندھی کا یہ قول درست ہے، لیکن ربیع بن انس بذاتِ خود بھی کوئی زیادہ مضبوط راوی نہیں ہیں، ابن حجر نے تقریب التہذیب (۲۰۵) میں ان پر: صدوق له اوهام ورمى بالتشيع کا تبصرہ کیا ہے۔

(۷۳/۱۶) حَدَّثَنَا اَبُوْحَاتِمٍ ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُوْسَى الْعَبْسِيُّ ثَنَا اَبُوْجَعْفَرٍ الرَّازِيُّ عَنِ الرَّبِيْعِ بْنِ اَنَسٍ مِثْلَهٗ

یہ سند ابن ماجہ کے راوی ابوالحسن قطان کا اضافہ ہے۔ مولانا لطیف الرحمٰن خان بہرائچی نے: "الديباجة علىٰ ابن ماجه" (۳۶۴/۱) میں اسے اسنادهٗ ضعيف قرار دیا ہے۔

(۷۴/۱۶) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ الْاَزْهَرِ، ثَنَا اَبُوالنَّضْرِ، ثَنَا اَبُوْجَعْفَرٍ، عَنْ يُوْنُسَ، عَنِ الْحَسَنِ، عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : "أُمِرْتُ اَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَيُقِيْمُوْا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوْا الزَّكَاةَ"

فرمایا مجھے اس وقت تک لوگوں سے معرکہ آرائی کا حکم دیا گیا جب تک کہ وہ "لا اله الا الله وانى رسول الله" کا اقرار نہ کرلیں، نیز نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔

ابن ماجہ میں حدیث مختصر ہے جبکہ دوسری کتب میں جا بجا مفصل وارد ہوئی ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں: لا اله الا الله کے بعد حضرت ابو ہریرہؓ کے طریق میں: ويومن بى وبما جئت

به فاذا فعلوا ذلك عصموا منی دمائهم واموالهم الابحقها وحسابهم علی اللّٰه منقول ہے، جب کہ حضرت جابر کی سند کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے: انما انت مذکر لست علیهم بمسیطر کی آیت بھی تلاوت فرمائی۔

سنن ابوداؤد اور ترمذی میں شہادتین کے بعد: وان یستقبلوا قبلتنا ویاکلوا ذبیحتنا وان یصلوا صلاتنا فاذا فعلوا ذلك حرمت علینا دمائهم واموالهم الا بحقها، لهم ما للمسلمین وعلیهم ما علی المسلمین . بھی منقول ہے

﴿الا بحقها﴾ کے بعد اوسط طبرانی میں: "قیل وما حقها قال زنا بعد احصان او کفر بعد اسلام اوقتل نفس فیقتل بها" کا اضافہ منقول ہے......وفات نبوی کے بعد ارتداد کے جلو میں جو مانعین زکاۃ کا فتنہ اٹھا ان سے جہاد صدیق اکبر نے اسی حدیث کی بنیاد پر کیا، چنانچہ صحیح بخاری سنن نسائی اور جامع ترمذی میں روایت باب کے ضمن میں ان کا یہ بیان بھی موجود ہے: لاقاتلن من فرق بین الصلاة والزکاة واللّٰه لو منعونی عناقا کانوا یودونها الی رسول اللّٰه ﷺ لقاتلتهم علی منعها قال عمر فواللّٰه ما هو الا انی رأیت اللّٰه قد شرح صدر ابی بکر لقتالهم فعرفت انه الحق .

یہ طرق تھے، مباحث اگلی حدیث کے ذیل میں آئیں گے......روایت بخاری (زکوٰۃ/۱، جہاد/۱۰۲، استتابۃ/۲، اعتصام/۳) مسلم (ایمان/۶) نسائی (زکوٰۃ/۳، جہاد، المحاربۃ/۱) ابوداؤد (جہاد/۴۶) اور ترمذی (ایمان/۱) میں بھی آئی ہے، ابن ماجہ کی سند کو مولانا لطیف الرحمٰن بہرائچی نے: "الدیباجه علی ابن ماجه" (۱/۳۶۵) میں اسناده صحیح لغیره قرار دیا ہے۔

(۱۷/۷۳) حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ الْاَزْهَرِ، ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوْسُفَ، ثَنَا عَبْدُ الْحَمِيْدِ بْنُ بَهْرَامَ، عَنْ شَهْرِ بْنِ حَوْشَبٍ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ غَنْمٍ، عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ"

﴿امرت﴾ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ای امرنی ربی بالوحی الجلی او الخفی[1] یعنی مولیٰ نے وحی جلی یا خفی کے ذریعہ مجھے یہ حکم دیا ہے۔

﴿ان اقاتل الناس﴾ سنن نسائی کتاب المحاربۃ باب تحریم الدم میں ان اقاتل المشرکین منقول ہے، جس کی بنیاد پر خطابی نے یہاں: "المراد بھذا اھل الاوثان دون اھل الکتاب[2]" قاضی عیاضؒ نے: المراد بھذا مشرکو العرب واھل الاوثان ومن لا یوحدوھم[3] کی رائے قائم کی ہے اور ملا علی قاریؒ نے اسے اکثر شارحین کا مذہب بتلایا ہے، کیونکہ ایمان کا مطالبہ صرف مشرکین سے ہی کیا جاتا ہے، جب کہ اہل کتاب سے جزیہ بھی قبول کرلیا جاتا ہے، حدیث میں دعوت وجہاد کی غایت پر روشنی ڈالی گئی ہے، تاکہ کفر کے اڈوں کو توڑ کر سادہ لوح عوام کے لئے ابدی نجات کی راہ ہموار کی جاسکے، جزیہ کیونکہ ایک عارضی شکل ہے اور دین میں وہ مقصود بالذات بھی نہیں ہے، اس لئے مستقلاً اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا، محدثین کے بقول یہ بھی ممکن ہے کہ: اس وقت تک جزیہ مشروع نہ ہو کیونکہ اس کے احکامات غزوۂ تبوک میں آئے ہیں۔

﴿حتی یشھدوا﴾ ابن ماجہ میں شہادتین پر اکتفاء کیا گیا ہے، لیکن دوسری کتابوں میں اس کے اور بھی طرق آئے ہیں، جن کو گذشتہ حدیث میں ہم نے جمع کردیا ہے، امام نوویؒ نے خصوصاً: "ویومنوا بی وبما جئت بہ" کو گویا تمام طرق پر حاوی اس کی شرح قرار دیا ہے، اب دیگر اسلامی احکامات کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، علامہ سندھیؒ بھی: "فینبغی أن یحمل علیٰ اظھار شعائر الاسلام" کے ذریعہ یہی کہنا چاہتے ہیں۔

﴿ویقیموا الصلوٰۃ﴾ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے: أی المفروضۃ بأن یاتوا بشرائطھا وارکانھا المجمع علیھا[4] فرض نماز مراد ہے یعنی متفق علیہ شرائط وارکان کے ساتھ ان کی ادائیگی کریں۔

﴿ویوتوا الزکوۃ﴾ قاریؒ فرماتے ہیں: "وھی لا تکون الا مفروضۃ[5]" بنی الاسلام علی خمس کی رو سے یہاں حج وصیام کا تذکرہ بھی ضروری تھا، کیونکہ

---

[1] مرقاۃ کتاب الایمان فصل اول حدیث ۱۰ [2] [3] صحیح مسلم ۱، ص: ۳۹
[4] [5] مرقاۃ کتاب الایمان فصل اول حدیث ۱۰

ان دونوں میں سے کسی کے انکار پر بھی امت کے نزدیک بالاتفاق وہی سزا ہے، جو صدیق اکبرؓ نے مانعین زکوٰۃ کو دی تھی، پھر وہ کیوں مذکور نہیں؟ اس کا سب سے بہترین جواب ملا علی قاریؒ نے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: انما خصتا بالذکر لأنهما أم العبادات البدنية والمالية واساسهما والعنوان علی غیرهما[1] یعنی نماز بدنی عبادت کا عنوان ہے، جس کے تحت تمام بدنی عبادات داخل ہوں گی اور مالی عبادات زکوٰۃ کے زمرے میں داخل ہوں گی، حافظ ابن حجرؒ کی بھی یہی رائے ہے، اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ اس وقت حج وصوم فرض نہ ہوئے تھے۔

امام نوویؒ نے اس حدیث سے پندرہ چیزوں پر استدلال کیا ہے اور زندیق کی توبہ کی بحث بھی اٹھائی ہے اس کے ضمن میں انہوں نے پانچ اقوال نقل کئے ہیں[2]۔

۱۔ اصحها والأصوب منها قبولها مطلقًا للاحاديث الصحيحة المطلقة.

۲۔ والثانی لا تقبل ويتحتم قتله لكنهٗ ان صدق فی توبته نفعه ذٰلك فی الدار الاخرة وكان من اهل الجنة.

۳۔ والثالث ان تاب مرة واحدة قبلت توبتهٗ فان تكرر ذالك منه لم تقبل.

۴۔ والرابع ان اسلم ابتدٰاء من غير طلب قبل منه وان كان تحت السيف فلا.

۵۔ والخامس ان كان داعيا الٰی الضلال لم يقبل منه والا قبل منه .

حدیث کی تخریج گذر چکی ہے، امام بوصیری نے زوائد (۱/۱۳) میں اسے هٰذا اسناد حسن لکھا ہے، یہ ضعف ابن حوشب کی وجہ سے ہے، وہ قدرے کمزور راوی ہیں۔ حافظ تقریب (۲۸۳۰) میں انھیں صدوق کثیر الارسال والاوهام قرار دیا ہے۔

(۱۸/۷۴) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ اِسْمَاعِيْلَ الرَّازِيُّ، اَنْبَأَنَا يُوْنُسُ بْنُ مُحَمَّدٍ، ثَنَا عَبْدُاللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ اللَّيْثِيُّ ، ثَنَا نَزَّارُ بْنُ حَيَّانَ، عَنْ عِكْرِمَةَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللهِ ، قَالَا: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: "صِنْفَانِ مِنْ اُمَّتِيْ لَيْسَ لَهُمَا فِيْ الْاِسْلَامِ نَصِيْبٌ: اَهْلُ الْاِرْجَاءِ، وَاَهْلُ الْقَدْرِ"

۱۔ مرقاۃ کتاب الایمان فصل اول حدیث ۱۰

۲۔ صحیح مسلم ۱/۳۹

حدیث کے ایک راوی محمد بن عبداللہ کو حافظ ذہبی اور ابن حجر نے مجہول قرار دیا ہے جبکہ نزار بن حیان کی بابت ابن حجر سے تقریب (۷۱۰۴) میں ضعیف من السادسة کا تبصرہ منقول ہے، ابن حبان نے کتاب الضعفاء میں لکھا ہے یاتی عن عکرمة بما لیس من حدیثہ حتی یسبق إلی القلب انه المعتمد لذلك لا یجوز الاحتجاج بہ یعنی عکرمہ کے حوالے سے اس چیز کو بیان کرتا ہے جو بطور حدیث ان سے ثابت نہیں اور اپنے اعتماد کو بڑھانے کے لئے الٹ پھیر تک کر لیتا ہے اس لئے اس کی باتوں سے استدلال درست نہیں، بوصیری نے اسے هذا اسناد ضعیف قرار دیا ہے۔

(۱۹/۷۵) حَدَّثَنَا اَبُوْ عُثْمَانَ الْبُخَارِیُّ سَعِیْدُ بْنُ سَعْدٍ ثَنَا الْهَیْثَمُ بْنُ خَارِجَةَ ثَنَا اَسْمٰعِیْلُ یَعْنِیْ ابْنُ عَیَّاشٍ عَنْ عَبْدِالْوَهَّابِ بْنِ مُجَاهِدٍ عَنْ مُجَاهِدٍ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ وَابْنِ عَبَّاسٍ قَالَا: اَلْاِیْمَانُ یَزِیْدُ وَیَنْقُصُ.

اسمٰعیل بن عیاش، ایک مختلف فیہ راوی ہیں حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب (۱۰۹) میں ان کی بابت یہ فیصلہ کیا ہے، صدوق فی روایتہ عن اهل بلدہ مخلط فی غیرهم کہ اگر وہ اہل وطن سے روایت کریں، تو درست ہے، ورنہ دوسروں کے حوالے سے ان کو مخلط مانا گیا ہے، جس کی تعریف شیخ عبدالحق محدث الدہلوی نے یہ کی ہے، وإن طرأ سوء الحفظ لعارض مثل اختلاط فی الخافظة بسبب کبر سنہ او ذهاب بصرہ او فوات کتبہ دوسرے راوی عبدالوہاب بن مجاہد کو امام احمد، ابن معین، ابو حاتم، دارقطنی، ابن سعد نے ضعیف قرار دیا ہے جبکہ حاکم کا تبصرہ روی احادیث موضوعة ہے، حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب (۴۲۶۳) میں لکھا ہے متروك وقد کذبه الثوری من السابعة حافظ ذہبی نے اُسے تلخیص الاباطیل (۲۱) میں کذب، شوقانی نے الفوائد السجموعة فی الاحادیث الموضوعة (۴۵۲) میں له طرق عند الحاکم والجوزقانی وغیرهما لا یصح منها شيء اور ابن عدی نے وهو حدیث باطل قرار دیا ہے، اس لئے روایت درست نہیں۔

حَدَّثَنَا اَبُوْعُثْمَانَ الْبُخَارِیُّ ثَنَا الْهَیْثَمُ ثَنَا اَسْمٰعِیْلُ عَنْ جَرِیْرِ بْنِ عُثْمَانَ عَنِ

الْحَارِثِ اَظُنُّهُ عَنْ مُجَاهِدٍ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ الْاِیْمَانُ یَزْدَادُ وَیَنْقُصُ

مولانا لطیف الرحمٰن خان بہرائچی نے اس روایت کو الدیباجه علی ابن ماجة (۳۷۸/۱) میں اسناده حسن لغیره قرار دیا ہے۔

باب فی القدر

مسئلہ تقدیر کائنات کی ایک بنیادی حقیقت ہے اور کوئی بھی آسمانی دین اس عقیدے سے بے بہرہ نہیں ہے، چنانچہ آج بھی توریت وانجیل میں اشارتاً اور زبور میں صراحتاً ہمیں اس کی تعلیم ملتی ہے، اسلام ایک جامع اور مکمل دین ہے، اس لئے عقائد وعبادات اور معاملات وغیرہ کی طرح اس مسئلے کو بھی اس نے تشنہ لب اور گنجلک نہیں چھوڑا بلکہ از اول تا آخر وہ تمام واضح ہدایات ومعلومات فراہم کردیں، جن کا انسانی عقل تحمل کرسکتی تھی، جامع ترمذی میں عبادہ بن صامت سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ان اول ما خلق الله القلم فقال له اكتب قال ما اكتب قال القدر فكتب ما كان وما هو كائن الى الابد" قلم کی تخلیق اور تقدیر کی کتابت زمین وآسمان سے کتنی پہلے ہوئی؟ صحیح مسلم کی حدیث اس سے بھی پردہ اٹھاتی ہے، فرمایا: كتب الله مقادير الخلائق قبل ان يخلق السموٰات والارض بخمسين الف سنة قال وكان عرشه على الماء شریعت میں ایمان باللہ اور ایمان بالرسول وغیرہ کی طرح ایمان بالتقدیر کو بھی لازمی قرار دیا گیا ہے، اس کے بغیر یہاں نجات ومغفرت کا تصور نہیں کیا جاسکتا، نصوص پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے، کہ صرف جن انس نہیں، بلکہ کائنات کی تمام مخلوقات ومصنوعات تقدیر الٰہی کے شکنجے میں کسی ہیں اور ہر چیز کی بابت تمام احوال ونتائج لوح محفوظ میں درج ہیں: انا كل شیء خلقناه بقدر اور قد جعل الله لكل شيء قدرا کا یہی مطلب ہے، قرآن کریم نے مجمل اور اصولی تقدیر پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ ہر ہر چیز میں قضاء وقدر کی تصریح کی ہے، چنانچہ آسمان وزمین کے بارے میں: السماء منفطر به كان وعده مفعولا، الم تعلم ان الله يعلم ما في السماء والارض ان ذلك في كتاب، وقدر فيها اقواتها کی وضاحت چاند وسورج کے سلسلے

میں: والشمس تجری لمستقر لها ذلك تقدير العزيز العليم، والقمر قدرناه منازل حتى عاد كالعرجون القديم کی صراحت اور موت کی بابت: نحن قدرنا بينكم الموت، ان اجل الله اذا جاء لا يؤخر کی خبر دی گئی ہے۔

کائنات کی تخلیق کا اصل مقصد انسان کی تکلیف وخلافت ہے، اس لئے قضاء وقدر میں سب سے زیادہ واضح اسی کے احوال ہیں، ان کی تفصیل سے پہلے ضروری ہے کہ: ہم قضاء وقدر کی بابت کچھ لغوی گفتگو بھی کرتے چلیں، یہ دونوں مترادف ہیں، لیکن ان کے درمیان ایک باریک فرق یہ ہے کہ: قدر ازلی فیصلے کو کہتے ہیں اور اس کے مطابق کسی بھی چیز کے اظہار وتخلیق کو قضاء کہا جاتا ہے۔

تقدیر کی حقیقت

سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی کی روایت ہے، حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے: "واذا خذ ربك من بنی ادم من ظهورهم وذريتهم" کی بابت استفسار کیا گیا آپ نے فرمایا:

انَّ اللّٰهَ خَلَقَ ادَمَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ بِيَمِيْنِهِ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وبعمل أَهْلِ الجَنَّةِ يَعْمَلُوْنَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ للنَارِ بِعَمَلِ اهلِ النَّارِ يَعْمَلُوْنَ فَقَالَ رَجُلٍ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَفِيْمَ العملُ؟ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ اِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلْجَنَّةِ اِسْتَعمَلَهُ بِعَمَلِ اَهْلِ الجَنَّةِ حَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى عَمَلٍ مِن اعمالِ اهلِ الجنةِ فيُدْخِلُهُ بِهِ الجنة واذا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلنَّارِ اِسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ حَتّٰى يَمُوْتَ بِعَمَلٍ مِنْ اعمالِ اَهْلِ النَّارِ فَيُدْخِلُهُ النَّارَ.

خداوند قدوس نے آدم کو پیدا کر کے ان کی پشت پر اپنا دایاں ہاتھ پھیرا اور کچھ اولاد نکالی پھر فرمایا ان لوگوں کو میں نے جنت کے لئے پیدا کیا ہے، یہ جنتیوں کے ہی عمل کریں گے، پھر ان کی پشت پر ہاتھ پھیر کر کچھ دوسری اولاد نکالی اور فرمایا کہ: انہیں میں نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے، یہ دوزخیوں کے ہی عمل کریں گے، ایک شخص نے پوچھا اے اللہ کے رسول تو پھر اب عمل کس لئے کرے؟ ارشاد فرمایا باری تعالیٰ جب اپنے کسی بندے کو جنت کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس

سے اہل جنت کے عمل بھی کرالیتا ہے، یہاں تک کہ ان کا خاتمہ بھی ان ہی اعمال پر ہوتا ہے اور اس کو جنت میں داخل کردیتا ہے، اسی طرح جب کسی بندے کو جہنم کے لئے پیدا کرتا ہے، تو اس سے عمل بھی دوزخیوں ہی کے کراتا ہے، تا آں کہ ان ہی پر اس کی موت ہوتی ہے اور اس کو جہنم میں داخل کردیتا ہے۔

مختلف الفاظ وتعبیرات کے ساتھ یہی مضمون دوسری احادیث میں بھی منقول ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ کی حدیث: **ان اللہ خلق للجنة اهلاً خلقهم لها وهم فی اصلاب ابائهم وخلق للنار اهلا، خلقهم لها ، وهم فی اصلاب ابائهم** اسی طرح صحیحین میں حضرت علیؓ کی روایت: **مامنکم من أحد الا وقد کتب مقعده من النار اومقعده من الجنة** ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ: انسان کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی جنت یا جہنم میں اس کا ٹھکانا مقرر ہو چکا، اب پیدائش کے وقت باری تعالیٰ ایک فرشتے کو حکم دیتے ہیں: **فیکتب عمله واجله ورزقهٗ وشقی ام سعید** وہ تمام چیزیں لکھ دیتا ہیں، پتہ چلا رزق، عمل، موت، شقاوت اور سعادت بھی ازل میں پہلے ہی سے مقرر ہے، اس لئے جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے، باری تعالیٰ کو پہلے ہی سے اس کا علم ہے، لوح محفوظ میں اس کی عمر لکھی ہے، اب وہ نہ کم ہوسکتی ہے، نہ زیادہ: **وماتحمل من انثی ولا تضع الا بعلمه وما یعمر من معمر ولا ینقص من عمره الا فی کتاب** (فاطر/۲) اس لئے کسی کے بس میں نہیں کہ اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے مرجائے: **وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا مؤجلا** (آل عمران) اسی طرح انسان کو دنیا میں جو بھی، صحت وبیماری، زوال وترقی، دولت وافلاس راحت، وتکلیف، فرحت ومسرت سے سابقہ پڑتا ہے، وہ بھی پہلے لوح محفوظ میں درج ہے: **ما أصاب من مصیبة فی الارض ولا فی أنفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأها** (حدید/۳) معلوم ہوا دنیا کے تمام حادثے بھی تقدیر الٰہی کے تحت رونما ہوتے ہیں اور کوئی چیز بھی اس کی گرفت سے باہر نہیں، حتی کہ مسلم کی ایک روایت کے مطابق انسانی نشاط وستی بھی لوح محفوظ میں لکھی ہے: **کل شیء بقدر حتی العجز والکیس** (مسلم/قدر)

ان آیات واحادیث کا خلاصہ یہ نکلا کہ دنیا میں جو کچھ ہوا جو ہورہا ہے، اور جو آئندہ ہوگا، وہ سب

ازلی فیصلے کے مطابق ہے، یعنی بحر و بر کی تمام مخلوقات کے احوال، انسانوں کی سعادت وشقاوت، رزق وعمل، موت واجل، صحت وبیماری، فرحت وغم، اور نشاط وچستی سب کچھ پہلے ہی سے مقرر و طے شدہ ہے۔

جبر واختیار

اس مقام پر آ کر بندے کے جبر واختیار کا سوال کھڑا ہوتا ہے، جب تمام امور مقرر اور طے شدہ ہیں، کہ ذرا بھی ان میں تخلف وانحراف نہیں ہوسکتا، تو بندے میں کسب واختیار کہاں رہا، وہ تو مجبور محض قرار پایا، پھر اسے مکلّف بنانا کہاں تک درست ہے، اب وہ مجبور ہے، یا مختار؟ نیز افعال عباد کی کیا حیثیت ہے؟ یہ وہ عقدہ ہے، جس سے قدیم مذاہب میں ہمیشہ اغماض برتا گیا، یا انہوں نے اسے کھولنے کی اگر کبھی کوشش بھی کی تو وہ اختیار چھوڑ کر جبر ہی کے جادے پر گامزن ہوئے، چنانچہ ہندوؤں میں تناسخ، آواگون، اور کرم، عیسائیوں میں گناہ آدم، اور خدا کی مرضی، جیسے عقائد جبری فکر ہی کا نتیجہ ہیں۔

معتزلہ کا موقف

اس موڑ پر امت میں بھی تین گروہ پیدا ہوئے معتزلہ نے سرے سے تقدیر ہی کا انکار کیا: **لاقدر وان الامر انف** ان کا مسلک ہے، یعنی افعال عباد کا اللہ کو پہلے کوئی علم نہیں تھا، ان کے صادر ہونے کے بعد اس کو علم ہوا، اس طرح یہ باری تعالیٰ کے علم قدیم کی نفی ہے، حافظ ابن حجر اور قرطبی نے لکھا ہے کہ یہ عقیدہ قدیم معتزلہ کا تھا، اس میں باری تعالیٰ کی جانب جہل کو منسوب کیا جاتا ہے، جو یقیناً بدترین گستاخی ہے، اسی لئے متاخرین معتزلہ نے اس موقف کو ترک کردیا اور قدرے اصلاح وترمیم کے بعد کہا کہ افعال عباد کا علم اللہ کو پہلے ہی سے ہے لیکن بندوں کی طرح وہ ان کے افعال کا خالق نہیں ہے، بلکہ بندے خود اپنے افعال کے خالق ہیں، معتزلہ نے یہ موقف اس لئے اختیار کیا کہ بندوں سے اطاعت ومعاصی دونوں کا صدور ہوتا ہے، اگر باری تعالیٰ کو خالق قرار دیا جائے، تو خیر کے ساتھ اس کو شر کا خالق کہنا پڑے گا، جو انکے نزدیک بھاری غلطی ہے، اس لئے بندے کی طاعت وصلاحیت کی مثال بس ایک تلوار کی سی ہے، اس سے کوئی

جہاد کرے، یا معصوم اور بے گناہ کو قتل کرے، تلوار دینے والے کا کوئی قصور نہیں، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ: بندے کی صلاحیت وطاقت کو تلوار دینے کے مترادف سمجھنا اس وقت تو صحیح ہے، جب کہ تلوار دینے والے کو آئندہ اس کے افعال کی خبر نہ ہو، لیکن تم نے جب باری تعالیٰ کے علم قدیم کو تسلیم کر کے یہ مان لیا کہ اسے بندوں کے تمام آئندہ افعال کی خبر ہے تو اب فرعون وقارون جیسے ظالموں کو صحت وطاقت وعزت واقتدار اور حکومت وسلطنت عطا کرنے کا کیا مطلب؟ جب کہ ان کی سرکشی کی پہلے ہی سے خبر تھی، اس صورت میں نہ صرف ان کو طاقت نہ دی جاتی، بلکہ ان کے جسم پر فالج گرا دیا جاتا تا کہ وہ ایسی حرکتیں نہ کرتے، لیکن روکنے کے بجائے ان کو تمام اسباب فراہم کرنا اعانت جرم ہے، جو خود جرم سمجھا جاتا ہے، اس صورت میں جناب باری کی تقدیس کو کس طرح بچاؤ گے، معتزلہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ان لوگوں کو قدریہ بھی کہا جاتا ہے، یہ صحابہ کے آخری دور میں پیدا ہوئے اور ان کے موجد یہودی تھے، ابن عباس، ابن عمر اور حضرت واثلہ بن اسقع نے اس عقیدے کو مٹانے کی بھرپور کوششیں کیں۔

جبریہ کا موقف

معتزلہ کے برخلاف دوسرا طبقہ جبریہ کا ہے، وہ کہتے ہیں، بندہ اپنے افعال کا خالق تو کیا ہوتا وہ تو نظام کائنات کی طرح مجبور محض ہے اور اس کے کاموں میں اختیار وارادے کا کوئی دخل نہیں، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں، کہ: اگر تم افعال میں بندے کو اینٹ اور پتھر کی طرح مجبور محض مانتے ہو، تو کاتب کے ہاتھ کی حرکت اور مرتعش کے ہاتھ کی حرکت میں بداہۃً فرق ہے، اس کی کیا وجہ ہے، جبریہ اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے، کیونکہ اضطراری اور ارادی حرکت میں جانور بھی فرق کرتے ہیں، مثلاً آپ نے کتے کو پتھر مارا تو وہ پتھر پر نہیں بلکہ آپ پر بھونکے گا، حالانکہ اس کے چوٹ پتھر ہی سے پڑی ہے، لیکن اتنی بات وہ بھی سمجھتا ہے، کہ پتھر کی حرکت اضطراری اور آپ کی اختیاری ہے، اور مواخذہ اختیاری ہی پر ہوتا ہے، تو خلاصہ یہ نکلا کہ اصل موثر اور محرک تو اللہ ہی ہے، لیکن اپنے افعال میں انسان کو بھی یک گونہ کسب اختیاری حاصل ہے، اور یہی اس کو مکلف بنانے کی وجہ ہے۔

اہل سنت کا موقف

تیسرا موقف اہل سنت والجماعت کا ہے وہ کہتے ہیں کہ: بندہ جمادات کی طرح مجبور محض ہے اور نہ ہی اس کو مطلق اختیار ہے، بلکہ جبر واختیار کے درمیان ایک منزل کسب کی ہے، جس میں بندے کے ارادے کو دخل ہوتا ہے گرچہ یہ ارادہ کمزور سہی لیکن بہر حال وہ جزاء وسزا کے ترتب کی صلاحیت رکھتا ہے، تو نتیجہ یہ نکلا کہ قدرت تامہ کی وجہ سے افعال عباد باری تعالیٰ کی تخلیق پر کسب کے باعث بندے کے مکسوب ہیں، کیونکہ علم قدیم اور قدرت الٰہی اختیار وارادے کو سلب نہیں کرتی، بلکہ اور زیادہ استوار اور مستحکم کرتی ہے، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے افعال عباد کی تخلیق کے بارے میں بڑی دلچسپ مثال دی ہے، فرماتے ہیں ایک کھیت کی پیداوار پر جھگڑتے ہوئے دو آدمی حاکم کے پاس پہنچے، دونوں کو پیداوار پر اپنی ملکیت کا دعوی تھا، حاکم نے پوچھا زمین تم میں سے کس کی ہے، ایک فریق نے جواب دیا کہ: زمین میرے مخالف کی ہے، بیج بھی اسی نے ڈالا تھا، آب پاشی بھی اسی نے کی تھی، ہل بھی اسی نے چلایا، پلیوا بھی اسی نے کیا غرض کھیتی پکنے تک جتنی ضرورتیں آئیں وہ سب اسی نے پوری کیں، لیکن جو پیداوار ہوئی وہ میری ہے اور اس کی بابت میں ملکیت کا دعویدار ہوں، ظاہر ہے دنیا کی ہر عدالت کا فیصلہ اس شخص کے خلاف اور دوسرے کے حق میں ہوگا، بالکل بعینہ یہی معاملہ افعال عباد کا ہے، کہ جن اجسام، جن قوتوں اور جن اسباب والآت وغیرہ سے وہ صادر ہوئے، وہ سب از اول تا آخر خدا کی مخلوق ہیں، افعال عباد جو ان تمام کا حاصل اور نتیجہ ہیں، خدا سے ہٹ کر بندوں کی مخلوق کیسے ہو سکتے ہیں؟

اشعری اور ماتریدی موقف کا فرق

اہل سنت والجماعت کے دو طبقے ہیں، اشاعرہ اور ماترید یہ افعال عباد کے مخلوق باری ہونے اور بندے کے کاسب ہونے پر تو دونوں کا اتفاق ہے، لیکن کسب کی تفسیر دونوں نے الگ الگ پیرائے میں کی ہے اشعری ان افعال کے انسان کے ساتھ صرف قائم ہونے کو کسب کہتے ہیں، جب کہ ماتریدی حاصل بالمصدر یعنی فعل کی نظر آنے والی شکل کو کسب قرار دیتے ہیں، اس

کے علاوہ ماتریدیہ کے نزدیک کسب کے اور بہت سے معانی ہیں، جن کی تفصیلات علم کلام کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

یہ ہے، قرآنی آیات، احادیث رسول اور تشریحات سلف کی روشنی میں قضاوقدر کی بحثوں کا خلاصہ! شبہات واشکالات گرچہ اب بھی پیچھا نہیں چھوڑتے، لیکن تفہیم وتشریح میں کسی کے لئے ان حدود سے آگے بڑھنا ممکن نہیں، محدثین نے قضاوقدر کو "سرٌ من اسرار الله" قرار دیا ہے، جب ہر وقت نظروں کے سامنے رہنے والی دنیا کی اکثر چیزیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، تو عالم غیب کا راز اور وہ بھی صفات باری سے متعلق، ایک ظلوم وجہول انسان کس طرح اس کا ادراک کرسکتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لئے مسئلے کی بابت ادنی گفتگو تک سے منع فرمایا ہے۔

(۷۷/ا) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا وَكِيعٌ وَمُحَمَّدُ بْنُ فُضَيْلٍ وَاَبُوْ مُعَاوِيَةَ وَحَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مَيْمُوْنٍ الرَّقِّيُّ ثَنَا اَبُوْمُعَاوِيَةَ وَمُحَمَّدُ بْنُ عُبَيْدٍ عَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ زَيْدِ بْنِ وَهْبٍ قَالَ: قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ اَنَّهُ يُجْمَعُ خَلْقُ اَحَدِكُمْ فِيْ بَطْنِ أُمِّهِ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَبْعَثُ اللّٰهُ اِلَيْهِ الْمَلَكَ فَيُؤْمَرُ بِاَرْبَعِ كَلِمَاتٍ، فَيَقُوْلُ اُكْتُبْ عَمَلَهُ وَاَجَلَهُ وَرِزْقَهُ وَشَقِيٌّ اَمْ سَعِيْدٌ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ اِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى مَا يَكُوْنَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا وَاِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا.

ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ: ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا اور بے شک آپ صادق ومصدوق تھے کہ: تم میں سے ہر شخص نطفہ کی شکل میں چالیس دن تک اپنے شکم مادر میں پڑا رہتا ہے، پھر چالیس ہی دن میں وہ دم بستہ کی شکل اختیار کرتا ہے، پھر اتنی ہی مدت

میں وہ گوشت کا لوتھڑا بنتا ہے، اس کے بعد خداوند قدوس اس کے پاس فرشتے کو چار باتیں بتا کر بھیجتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ: عمل، عمر اور اس کے رزق کو نیز نیک بخت ہوگا یا بد بخت، سب کو لکھ ڈالو، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ: تم میں کا ایک شخص (ساری عمر) جنت والوں کے سے عمل کرتا ہے یہاں تک اس میں اور جنت میں صرف ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے، لیکن آخیر میں نوشتہ تقدیر غالب آتا ہے اور وہ جہنمیوں کے عمل کر کے دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے، اسی طرح تم میں ایک شخص ساری عمر دوزخیوں کے عمل کرتا ہے، لیکن جب اس کے اور جہنم کے مابین صرف ایک گز کا فاصلہ ہوتا ہے، تو تقدیر غالب آتی ہے اور اچانک وہ جنتیوں کے عمل کر کے بہشت میں پہنچ جاتا ہے۔

﴿**وهو الصادق والمصدوق**﴾ ترکیب میں یہ جملہ کیا واقع ہے؟ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: **يحتمل الجملة حالية ويحتمل ان تكون اعتراضية وهو اولىٰ لتعم الاحوال كلها** حالیہ اور معترضہ دونوں کا احتمال ہے، لیکن دوسری صورت راجح ہے، کیونکہ اس صورت میں صدق کی صفت ہر حال میں باقی رہتی ہے، ملا علی قاریؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ امام نوویؒ نے اس کے معنی یہ لکھے ہیں: **الصادق في قوله المصدوق فيما ياتيه من الوحي الكريم** یعنی اپنے قول میں سچے ہیں اور وحی الٰہی میں بھی آپ امین و دیانتدار ہیں، بعض حضرات نے اس کا ترجمہ مصدَّق سے کیا ہے، یعنی اہل ایمان نے آپ کی تصدیق کی ہے، لیکن علامہ سندھیؒ نے سنن مصطفیٰ میں اس کی تردید کی ہے اور صحیح ترجمہ: **جاء بالصدق من ربه** قرار دیا ہے:

تخلیق انسانی کے مراحل

﴿**انه يجمع خلق احد كم في بطن امه اربعين يومًا**﴾

تخلیق انسانی خدا کی قدرت کا حسین مظہر ہے، اسی لئے باری تعالیٰ نے تراب ماء معین، نطفہ، علقہ، مضغہ، اقرار فی الرحم، ہڈیوں پر گوشت چڑھا دینا پھر پیدائش کے بعد رضاعت وطفولیت و شباب اور کہولت کے تمام مراحل کو آیت ونشانی کے طور پر پیش کیا ہے، حدیث باب بھی اسی ضمن کی چیز ہے، جس میں تخلیقی اطوار کی مزید تفصیل وتوضیح کی گئی ہے بطن

مادر میں جمع خلقت کا کیا مطلب ہے؟ تفسیر ابن ابی حاتم میں حضرت ابن مسعودؓ سے یہ جواب مروی ہے: ان النطفة اذا وقعت فی الرحم فاراد اللّٰہ ان یخلق منها بشرا طارت فی جسد المرأة تحت کل ظفر وشعر ثم تمکث اربعین یومًا ثم تنزل دمًا فی الرحم فذٰلك جمعها[1] یعنی نطفہ عورت کے رگ وریشہ میں پھیلنے کے چالیس دن بعد خون بن کر رحم میں اترتا ہے، اسی کو حدیث میں جمع خلقت سے تعبیر کیا گیا ہے، ابن الأثیر فرماتے ہیں: تمکث النطفة اربعین یوما تخمر فیه حتی تتهیأ للتصویرثم تخلق بعد ذالك[2] نطفہ کا چالیس دن تک ٹھہراؤ خمیر اٹھنے کے لئے ہوتا ہے، پھر وہ صورت وخلقت کے قابل ہوجاتا ہے امام قرطبی نے لکھا ہے: ان المنی یقع فی الرحم حین انزعاجه بالقوة الشهوانية الدافعة مبثوثا متفرقًا فیجمعه اللّٰہ فی محل الولادة من الرحم[3] جمع سے مراد منی کے وہ قطرے ہیں، جو انزال کے وقت شہوت کی وجہ سے بکھر جاتے ہیں، توجیہات تو یہ تینوں ہی دل لگتی ہیں، لیکن ابن مسعود کی بات زیادہ گہرائی اور بلاغت رکھتی ہے، پھر مسئلہ غیر مدرک بالقیاس بھی ہے، اس لئے امام خطابی اور طیبی نے اس کو راجح قرار دیا ہے۔

﴿ثم یکون علقةً مثل ذلك﴾ علقہ کی تشریح ابن حجر نے: قطعة دم جامد[4] ملا علی قاریؒ نے: دما غلیظًا جامدًا[5] اور علامہ سندھی نے: دما جامدًا یخلط تربة قبر المولود سے کی ہے، یعنی جما ہوا خون جس میں سندھی کے مطابق انسان کی قبر کی مٹی کی بھی آمیزش ہوتی ہے اور "مثل ذٰلك" کی وضاحت ملا علی قاریؒ نے ای مثل ذلك الزمان یعنی أربعین یومًا سے کی ہے[6]۔

﴿ثم یکون مضغة مثل ذٰلك﴾ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: قطعة لحم قدر ما یمضغ[7] یعنی ایسا گوشت جس کو چبایا جاسکے، دیگر شراح نے بھی یہی جملہ لکھا ہے، صحیح مسلم کی روایت میں تصریح ہے: ان اللّٰہ قدو کل بالرحم ملکا فیقول ای رب نطفة ای رب علقة ای مضغة[8] یعنی ہر مرحلہ پر فرشتہ اجازت طلب کرتا ہے، تب اگلی منزل آتی ہے، مسلم ہی

۱، ۲، ۳، ۴ فتح الباری کتاب القدر حدیث ۱
۵، ۶، ۷ مرقاة المفاتیح باب الایمان بالقدر فصل اول حدیث ۴ — ۸ مسلم ۲/۳۳۲

کی دوسری روایت یہ بتاتی ہے: **اذا مر بالنطفة اثنتان واربعون ليلة بعث الله اليها ملكًافصورها وخلق سمعها وبصرها وجلدها ولحمها وعظامها**[1] یعنی دوسری اَربعین سے غالبًا تیسری اربعین تک یہ کام پورے ہوجاتے ہیں۔

﴿**ثم يبعث الله اليه الملك**﴾ جوفرشتہ تصویر کرتا ہے، اسی کواب دوسرا حکم ہوتا ہے تو گویا بعث یہاں حکم کے معنی میں ہے، ملاعلی قاریؒ لکھتے ہیں: **والمراد بالارسال امره بها والتصرف فيها**[2] قاضی عیاض اور ابن حجر کی بھی یہی رائے ہے، تدریج کی حکمت قاری نے: **لوخلقه دفعة لشق على الام**[3] بیان کی ہے، یعنی دفعۃً تخلیق، ماں کی مشقت کا باعث ہوتی۔

﴿**فيومر باربع كلمات**﴾ ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: **كل قضية تسمى كلمة قولاً كان اوفعلاً** یعنی قول وفعل کے ہر واقعے کو یہاں کلمہ کا نام دیا گیا ہے۔

﴿**فيقول اكتب**﴾ اصل تقدیر تو لوحِ محفوظ میں لکھی ہے، ازل سے ابد تک کائنات کے ہر ذرے کا وہاں ریکاڈ موجود ہے جب کہ یہاں صرف وہ امور لکھے جاتے ہیں، جو اس بندے سے متعلق ہیں، یہ چیزیں کہاں لکھی جاتی ہیں، اس سلسلے میں تین رائیں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ **كل انسان الزمناه طائره فی عنقه** آیت کی بنیاد پر مجاہد اور دوسرے مفسرین نے یہ فیصلہ کیا کہ ان امور کا مجموعہ لکھ کر اس کے گلے میں لٹکا دیا جاتا ہے[4]۔

۲۔ حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی نے لکھا ہے کہ یہ امور پیشانی یا پیٹ پر لکھے جاتے ہیں، پہلے قول کی تائید میں انہوں نے مسند بزار کی مرفوع روایت پیش کی ہے: "**ثم يكتب بين عينيه ما هو لاق حتى نكبة ينكبها**[5]"

۳۔ ملاعلی قاری کا کہنا ہے: **قلت وهو كناية عن الذمة فكان هذه الاشياء فی ذمته ان يفعلها ولا يقدر ان ينفلك عنها**[6] یہ لزوم کا اشارہ ہے، تو یہ چیزیں انجام دینا اس کے لئے مقدر ہوگیا، جن سے بچنا اس کے لئے ممکن نہیں .... قلبی اطمینان دوسری توجیہ پر ہوتا ہے۔

۱۔ مسلم ۲/۳۳۳
۲، ۳، ۴۔ مرقاۃ المفاتیح باب الایمان بالقدر فصل اول حدیث ۴
۵۔ ترجمان السنۃ ۳۰/۷۹
۶۔ مرقاۃ المصابیح ایمان/ اول/۴

﴿عمله﴾ ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: "من الخیر والشر"

﴿واجله﴾ قاری لکھتے ہیں: "مدة حیاته او انتهاء عمره"

﴿ورزقه﴾ ملاعلی قاریؒ نے فرمایا: "یعنی انه قلیل او کثیر وغیرهما ممایتنفع به حلالًا کان اوحرامًا ما کولًا وغیره" یعنی رزق کی کمی بیشی، اس کا حلال یا حرام ہونا، ماکول یا غیر ماکول ہونا اور وہ تمام چیزیں اس کے ضمن میں لکھی جاتی ہیں، جن سے وہ اپنی زندگی میں استفادہ کرے گا۔

﴿وشقي ام سعید﴾ ملاعلی قاری کے نزدیک یہاں هو مبتداء محذوف ہے، صحیح مسلم کی دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اعملوا فکل میسر اما اهل السعادة فیسرون لعمل اهل السعادة واما اهل الشقاوة، فیسرون لعمل اهل الشقاوة عمل کرو، ہر ایک کو اسباب مہیا ہیں یا تو وہ اہل سعادت میں ہے تو اسے اہل سعادت کا عمل آسان کردیا جائے گا، یا وہ اہل شقاوت میں ہے تو بدبختی کی راہ آسان کردی جائے گی، حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے: وهو شقي باعتبار ما یختم له وسعید باعتبار ما یختم له یعنی شقی وسعید خاتمہ کے اعتبار سے ہے۔

﴿فوالذی نفسی بیده............بعمل اهل الجنة فیدخلها﴾ یہاں انسانوں کی دو قسمیں بیان کی گئیں، پہلی تو یہ کہ پوری زندگی دین پر قائم رہے، لیکن موت کفر پر ہوگئی: اعاذنا الله منها دوسری یہ کہ زندگی تو پوری کفر پر گزری لیکن موت کے وقت ایمان نصیب ہوگیا اللّٰهم ارزق کل من لا یومن بالله الیوم تقدیر کا ظہور کیونکہ ان ہی دو قسموں میں ہوتا ہے، اس لئے ان ہی پر اکتفاء کیا گیا ورنہ انسانوں کی دو قسمیں اس کے علاوہ اور بھی ہیں، پہلی یہ کہ پوری زندگی دین پر گذرے اور موت بھی ایمان پر نصیب ہو، دوسری یہ کہ عمر بھر کفر پر رہے اور خاتمہ بھی اسی پر ہوا، دنیا میں عموماً یہی دو قسمیں پائی جاتی ہیں، مسلمان صدفی صد ایمان پر مرتے ہیں، لیکن قدرت کے اظہار کے لئے کبھی کبھی ایمان سلب بھی ہوجاتا ہے، مگر ایسا لاکھوں میں کوئی ایک واقعہ ہوتا ہے: اللّٰهم احفظنا منه جب کہ کفر کے بعد ایمان پر خاتمہ اللہ کے فضل وکرم کا نمونہ ہے اور ایسا خوب ہوتا ہے ذراع کو یہاں ملاعلی قاری نے تمثیل لغاية

قوبھا قرار دیا ہے، یعنی یہ جنت یا جہنم کی حد درجہ قربت کی مثال ہے علامہ سندھیؒ اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی بھی یہی رائے ہے۔

حدیث صحیح بخاری (قدر/۱، توحید/ ۲۸، بدء الخلق / ۶، انبیاء/۱) صحیح مسلم (قدر/۱) سنن ابی داوٗد (سنۃ/قدر) جامع ترمذی (قدر/۴) میں بھی آئی ہے، اور ابن ماجہ کی سند بھی صحیح ہے۔

(۲/۷۸) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا إِسْحٰقُ بْنُ سُلَيْمَانَ قَالَ: سَمِعْتُ اَبَا سِنَانٍ عَنْ وَهْبِ بْنِ خَالِدِ الحمْصِيّ عَنْ ابنِ الدَّيْلَمِيِّ قَالَ: وَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ شَيْئٌ مِنْ هٰذَا الْقَدْرِ خَشِيْتُ اَنْ يُفْسِدَعَلَيَّ دِيْنِيْ وَأَمْرِيْ فَأَتَيْتُ أُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ فَقُلْتُ: أَبَا الْمُنْذِرْ إِنَّهُ قَدْ وَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ شَيْئٌ مِنْ هَذَا الْقَدْرِ فَخَشِيْتُ عَلَيَّ دِيْنِيْ وَأَمْرِيْ فَحدّثْنِيْ مِنْ ذٰلِكَ بِشَيْئٍ لَعَلَّ اللّٰهَ أَنْ يَنفَعَنِيْ بِهِ فَقَالَ: لَوْ أَنَّ اللّٰهَ عَذَّبَ اَهلَ سَمَا وَاتِهِ وَأَهْلَ أَرْضِهِ لَعَذَّبهُم وَهُوَ غَيْر ظَالِمٍ لَهم وَلَوْرَحِمَهُمْ لَكَانَتْ رَحْمَتُهُ خَيْرًا لَهُمْ مِنْ اَعْمَالِهِمْ وَلَوْ كَانَ لَكَ مِثْلَ جَبَلِ أُحُدٍ ذَهَبًا اَوْمِثْلُ جَبلِ أُحُدٍ تُنفِقُهُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا قُبِلَ مِنْكَ حَتّٰى تُؤْمِنَ بِالقَدْرِ فَتعْلَمَ أَن مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخطِئَكَ وَأَنْ مَا أَخْطَاكَ لَمْ يكن لِيُصِيبَكَ وَإِنَّكَ إِنْ مُتَّ عَلٰى غَيْرِ هَذا دَخَلْتَ النَّارَ وَلاَ عَلَيْكَ أَنْ تَأتِيَ أَخِيْ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مسعودٍ فتَسَالَهُ، فَأَتَيتُ عَبْدَ اللّٰهِ فَسَأَلتُهُ، فَذَكَرَ مِثْلَ مَا قَالَ أُبَيٌّ وَقَالَ لِيْ وَلاَ عَلَيْكَ اَنْ تَأتِيَ حُذَيْفَةَ فَأَتَيْتُ حُذيْفَةَ فَسَأَلْتُهُ فَقَالَ مِثْل مَا قَالاَ وَقَالَ اِئْتِ زَيْدَ بْنَ ثَابتٍ فَاسْأَلْهُ فَأَتَيْتُ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ فَسَأَلْتُهُ فَقَال: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: لَوْ أَنْ اللّٰهَ عَذَّبَ أَهلَ سَمَا وَاتِهِ وَأَهْلَ اَرضِهِ لَعَذَّبَهُمْ وَهُوغَيْرُ ظَالِمٍ لَهُمْ وَلَوْرَحِمَهُمْ لَكَانَتْ رَحْمَتُهُ خَيْرًا لَهُمْ مِنْ أَعْمَالِهِمْ وَلَوْ كَانَ لَكَ مِثْلُ أُحُدٍ ذَهَبًا اَوْمِثْلَ جَبَلِ أُحُدٍ ذَهَبًا تُنْفِقُهُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا قَبِلَهُ مِنْكَ حَتّٰى تُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ كُلِّهِ، فَتَعْلَمَ أَنْ مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ وَمَا أَخْطَاكَ لَمْ يكن لِيُصِيبَكَ وَأَنَّكَ إِنْ مُتَّ عَلٰى غَيْرِ هَذَا دَخَلْتَ النَّارَ.

ابن دیلمی سے روایت ہے کہ: مسئلہ قدر کی بابت میرے دل میں کچھ کھٹک ہوئی مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ چیز تو میرے دین کو بگاڑ کر میری آخرت برباد کردے گی، چنانچہ میں فوراً ہی حضرت ابی بن کعبؓ کے پاس حاضر ہوا اور کہا کہ اے ابوالمنذر میرے دل میں تقدیر کا مسئلہ کھٹک رہا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا دین و آخرت برباد ہو جائے، (از راہ کرم) آپ اس سلسلے میں مجھے کچھ نصیحت فرمادیں شاید باری تعالیٰ اسی کو میرے لئے نافع بنادے انہوں نے فرمایا کہ: خداوند قدوس اگر آسمانوں اور زمین کے تمام رہنے والے کو جہنم میں بھیج دیں تو یہ کر سکتے ہیں اور پھر بھی انہیں ظالم نہیں کہا جا سکتا، اسی طرح اگر وہ ان سب کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ فرمائیں، تو ان کی یہ رحمت وعنایت ان لوگوں کے عمل سے بہتر ہوگی، (سنو) اگر تمہارے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور تم اسے اللہ کے راستے میں خرچ کردو، تو بھی باری تعالیٰ تمہارے اس عمل کو اس وقت تک قبول نہیں کریں گے، جب تک تم تقدیر پر ایمان نہیں لاتے (یاد رکھو) کہ جو چیز تم کو پہنچنا مقدر ہے، وہ تم سے گریز نہیں کرسکتی اور جو تمہاری قسمت میں نہیں، وہ تمہیں کبھی نہیں مل سکتی، (اچھی طرح سمجھ لو) اگر تقدیر پر ایمان لائے بغیر مر گئے، تو سیدھے جہنم میں جاؤ گے، تم اس سلسلے میں میرے بھائی عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس جا کر بھی تقدیر کی بابت سوال کر سکتے ہو (دیلمی کہتے ہیں) میں عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس آیا اور میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے بھی بالکل وہی بات کہی جو حضرت ابی بن کعب نے کہی تھی اور مجھ سے فرمایا تم حذیفہ کے پاس بھی جا سکتے ہو، میں حضرت حذیفہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے اپنی دل کی کیفیت بیان کی، حضرت حذیفہؓ نے بھی وہی بات دہرائی جو ابن کعب اور ابن مسعودؓ کہہ چکے تھے، پھر کہا جاؤ زید بن ثابت سے جا کر پوچھو میں زید بن ثابت کے پاس آیا اور ان کے سامنے اشکال و اندیشہ بیان کیا انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے "کہ خداوند قدوس اگر آسمانوں اور زمین کے تمام رہنے والوں کو جہنم میں بھیج دیں تو یہ کر سکتے ہیں اور پھر بھی انہیں ظالم نہیں کہا جا سکتا، اسی طرح اگر وہ ان کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ فرمائیں، تو ان لوگوں کی یہ رحمت وعنایت ان کے عمل سے بہتر ہوگی (سنو) اگر تمہارے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور تم اسے اللہ کے راستے میں خرچ کردو تو بھی باری تعالیٰ تمہارے اس عمل کو اس وقت تک قبول نہیں کریں

گے، جب تک تم تقدیر پر مکمل ایمان نہیں لاتے اور جان رکھو جو کچھ تمہیں ملنا ہے، وہ تم سے بچ کر نہیں جاسکتا اور جو قسمت میں نہیں وہ تمہیں کبھی نہیں مل سکتا، اگر اس عقیدے پر ایمان لائے بغیر مرجاتے ہو تو یقیناً جہنم میں جاؤ گے۔

﴿ابن الدیلمی﴾ اس نام سے کئی حضرات جانے جاتے ہیں، محدث جمال الدین میرک شاہ نے فرمایا: "بل المراد ابن الضحاك بن فیروز وھو تابعی مقبول من اوسط التابعین[۱]" یہاں ضحاک بن فیروز دیلمی مراد ہیں، جو تابعین کے درمیانی طبقے کے مقبول راوی ہیں اور ان کے والد صحابی ہیں، انہی کے ایک بھائی عبداللہ بن فیروز ہیں، ملا علی قاریؒ نے یہاں انہیں کو مراد لیا ہے: "وھو ثقة من كبار التابعين[۲]" مولانا خلیل احمد سہارن پوری کی بھی یہی رائے ہے۔

﴿وقع فی نفسی شیء من ھذا القدر﴾ یہ کھٹک کس نوعیت کی تھی؟ ابن حجر مکی فرماتے ہیں بعض شبه القدر التی ربما تؤدی الی الشك فیه[۳]" تقدیر کی بابت بعض ایسے شبہات پیش آئے جو عموماً اس عقیدے میں شک پیدا کردیتے ہیں جیسا کہ معتزلہ کا بندے کو اعمال کا خالق کہنا اور جبریہ کا اسے مجبور محض بنانا ملا علی قاریؒ نے لکھا: "حزازة واضطراب عظیم من جھة امر القضاء والقدر باعتبار العقل لا بموجب النقل[۴]" یعنی قضاوقدر کی بابت ان کی تشویش و بے چینی از روئے عقل تھی نقلا انہیں کوئی اشکال نہ تھا، مولانا خلیل احمد سہارن پوری نے بھی اس کی تشریح میں: "الشبھة والانکاربه[۵]" کی تعبیر استعمال کی ہے، جو دونوں کی جامع ہے، وہ فوراً ابی بن کعب کے پاس آئے شکوک وشبہات کے سلسلے میں خصوصاً جب کہ وہ عقائد کے باب میں ہوں ایک مسلمان کو اتنا ہی سنجیدہ ہونا چاہئے تا کہ اس وسوسہ کا فوری ازالہ ہو سکے۔

﴿لعل اللہ ان ینفعنی به﴾ علامہ سندھیؒ نے لکھا: "دخول أن فی خبر لعل للتشبیه عسی" یعنی عسی کی مشابہت کی وجہ سے یہاں لعل کی خبر پر أن داخل ہوا ہے۔

﴿لو ان اللہ عذب .... وھو غیر ظالم لھم﴾ علامہ طیبی نے فرمایا: "ارشاد عظیم وبیان شاف لازالة ما طلب منه، لانه ھدم به قاعدة القول بالحسن

والقبح عقلا وبين انه مالك الملك فله ان يتصرف في ملكه كيف يشاء ولا يتصور في تصرفه ظلم ، لانه تصرف في ملك الغير[6]" یہ بلند توجیہ اور ایسا تشفی بخش جواب ہے، جو شک وشبہے کو بالکل زائل کر دیتا ہے، کیونکہ صحابی نے یہاں حسن وقبح کے اس عقلی اصول ہی کو توڑ دیا جس کے سبب اشکال پیدا ہوا تھا، باری تعالیٰ جب تمام کائنات کا مالک ہے، تو اپنی ملکیت میں وہ جس طرح چاہے، تصرف کرے، جب کہ ظلم وزیادتی کا اطلاق اسی وقت صحیح ہوگا، جب کہ یہ تصرف دوسرے کی ملکیت میں ہو امام سیوطی ملا علی قاری علامہ سندھیؒ مجددیؒ اور حضرت مولانا ادریس کاندھلوی رحمہم اللہ نے بھی اسی قول کو نقل کیا ہے۔

[1] [2] [3] [4] [6] مرقاۃ المفاتیح باب الایمان بالقدر فصل ثالث حدیث ۳
[5] بذل المجهود کتاب السنة باب القدر۔

﴿**ولو رحمهم لكانت رحمته خيرًا لهم من أعمالهم**﴾ علامہ سندھیؒ لکھتے ہیں: **ان النجاة من العذاب انما هي برحمته لا بالأعمال فالرحمة خير منها** یعنی جہنم سے نجات محض اس کی رحمت سے ملے گی، اعمال سے نہیں اس لئے رحمت خداوندی بندوں کے اعمال صالحہ سے افضل ہے، ملا علی قاری اور مولانا کاندھلویؒ کی بھی یہی رائے ہے، تعذیب ورحمت کی یہ ایک مثال ہے، جس کا مقصد باری تعالیٰ کی ملکیت وقدرت کو بتلانا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ لازماً ایسا ہی ہوگا، قرآن وسنت میں صراحت ہے کہ نیکو کاروں کو اجر وثواب اور گنہگاروں کو غضب وعذاب ہوگا یہ اللہ کا وعدہ ہے، جس میں کوئی تبدیلی نہیں ملا علی قاریؒ نے فرمایا: **انه اخبر أن المطيعين لهم الثواب وأن العاصين لهم العقاب كما هو مثبت في أم الكتاب**[1] یعنی نیکو کاروں کو ثواب اور گناہ گاروں کو عذاب تو قرآن سے ثابت ہے۔

﴿**ولو كان لك مثل جبل أحد ذهبا.......... حتى تؤمن بالقدر**﴾ ذهبا تمیز واقع ہے اور جبل احد سے صدقے کی تحدید نہیں تکثیر مراد ہے، اگر کوئی زمین وآسمان بھر کر بھی سونا خیرات کر دے تو اس کا بھی یہی حکم ہے، ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے: "**وهو تمثيل على سبيل فرد لاتحديد اذلوفرض انفاق ملأ السموات والارض كان كذلك**[2]"

[1] [2] کتاب الایمان بالقدر فصل سوم حدیث ۳ مرقاۃ المفاتیح

﴿ما قبل منك﴾ بدعتی ہونے کی بنا پر یا منکر تقدیر کے کافر ہونے کی وجہ سے اللہ کے یہاں کوئی عمل مقبول نہیں، سندھی نے لکھا ہے لا قبول لعمل المبتدع عند اللّٰه تعالیٰ وهو مبنی علی القول بكفر منكر القدر .

﴿فتعلم أن ما اصابك لم يكن ليخطئك﴾ علم وحسب کے بعد ان مثقلہ مخففہ ہوجاتا ہے یہ جملہ: " لن يصيبنا الاّ ما كتب اللّٰه لنا" آیت کی تفسیر ہے کہ: نعمت مصیبت اطاعت اور معصیت جو کچھ تمہاری قسمت میں لکھ دی گئی ہے، وہ تمہارے پاس پہنچ کر رہے گی۔

﴿وان ما أخطأك لم يكن ليصيبك﴾ جو خیر وشر تمہاری قسمت میں نہیں ہے وہ تم کو کبھی نہیں پہنچ سکتا، ملا علی قاریؒ نے فرمایا: وفيه حث على التوكل والرضا ونفي الحول والقوة وملازمة القناعة والصبر على المصائب[1] یعنی یہاں توکل ورضا کی ترغیب، زور وطاقت یعنی مصیبتوں پر صبر اور قناعت پسندی کی تعلیم ہے۔

ابن مسعودؓ اور حذیفہؓ ابن الیمان تک حدیث موقوف تھی، لیکن زید بن ثابت کے پاس آکر وہ مرفوع ہوگئی، اس سے ہمیں ان دونوں حضرات کی غایت احتیاط کا پتہ چلا جو صحابہ کا عمومی حال تھا، پھر ہر ایک نے سائل کی نظر میں دوسرے کی اہمیت وعظمت کو نمایاں کر کے یہ بتلایا کہ: تقدیر کا مسئلہ انسان کی محدود عقل میں نہیں آسکتا۔

﴿ان مت ...... النار﴾ مجددی نے لکھا ہے: دخول غير الخلود لان اهل القبلة يعذبون في النار ثم يخرجون عارضی دخول مراد ہے کیونکہ اہل قبلہ کو سزا کے بعد دوزخ سے نکال لیا جائے گا۔

حدیث سنن ابی داوٗد كتاب السنه باب في القدر میں بھی آئی ہے، ابن ماجہ کی سند میں ابوسنان منذر بن سنان ایک راوی ہیں، جن کو ابن حجر نے تقريب التهذيب (۲۳۳۲) میں: صدوق له اوهام قرار دیا ہے، اس لئے الدیباجہ علی ماجہ (۲۹۲/۱) میں سند کو اسناده حسن لغيره کہا گیا ہے۔

(۷۹/۳) حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ ثَنَا وَكِيعٌ ح وَحَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ

---

[1] کتاب الایمان بالقدر فصل سوم حدیث۳ مرقاۃ المفاتیح

ثنا أبو معاوية ووكيع عن الأعمش عن سعد بن عبيدة عن أبي عبد الرحمن السلمي عن علي قال كنا جلوسا عند النبي صلى الله عليه وسلم وبيده عود فنكت في الأرض ثم رفع رأسه فقال ما منكم من أحد إلا وقد كتب مقعده من الجنة ومقعده من النار قيل يا رسول الله أفلا نتكل؟ قال لا اعملوا ولا تتكلوا وكل ميسر لما خلق له ثم قرأ (فأما من أعطى واتقى وصدق بالحسنى فسنيسره لليسرى وأما من بخل واستغنى وكذب بالحسنى فسنيسره للعسرى)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ: ہم (ایک مرتبہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے، آپؐ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی، جس سے آپ زمین کرید رہے تھے، پھر سر اٹھا کر آپؐ نے فرمایا تم میں کوئی ایسا نہیں جس کا ٹھکانہ جنت اور جہنم میں لکھ نہ دیا گیا ہو عرض کیا گیا، اے اللہ کے رسولؐ پھر ہم اسی پر بھروسہ نہ کرلیں (عمل کی کیا ضرورت ہے) فرمایا نہیں عمل کرتے رہو، اور بھروسہ بالکل نہ کرو، کیونکہ ہر شخص کے لئے وہ ہی آسان وفراہم کی گئی ہے، جس منزل کے لئے وہ پیدا ہوا ہے، پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ: جس نے (اللہ کے لئے) دیا اور تقویٰ اختیار کیا نیز اچھی بات کی تصدیق کی تو ہم اس کو راحت وسکون کے مقام پر آسانی سے پہنچادیں گے اور جس نے بخل وبے پرواہی کا مظاہرہ کیا او حسنیٰ کی تکذیب کی تو ہم اس کو آہستہ آہستہ عذاب وسختی تک پہنچادیں گے۔

ابن ماجہ میں صحابہ کا صرف حضورؐ کے پاس بیٹھنا مذکور ہے، جب کہ صحیحین کی روایت میں: **كنا في جنازة في بقيع الغرقد فاتانا رسول الله صلى الله عليه وسلم فقعدو قعدنا حوله ومعه مخصرة فنكس** کی بھی تصریح ہے، عود کٹی ہوئی شاخ کو کہتے ہیں، جب کہ مخصرہ کا اطلاق لاٹھی یا چھڑی پر بھی ہوتا ہے، دونوں کے معنی ایک ہیں، یعنی ایک چھوٹا سا ڈنڈا، آپ ﷺ تشریف فرما ہوکر اپنے اسی عصا سے زمین کرید رہے تھے: نکت (ن) نکتا الارض سوچ وفکر کی حالت میں چھڑی یا انگلی سے زمین کو کریدنا، امام نوویؒ فرماتے ہیں:

هذافعل المفكر المهموم[1] ایسا غمزدہ ومتفکر انسان کرتا ہے، جب کہ حضرت گنگوہی کا کہنا ہے: فيها فوائد لم نعرفها[2] نبی کی ان کیفیت واداؤں میں اتنے اسرار ورموز ہیں، جن کو ہم سمجھ ہی نہیں سکتے زمین کو کریدنا عموماً لغو خیال کیا جاتا ہے، لیکن حضرت کشمیریؒ فرماتے ہیں: ولما ثبت عن النبی صلی اللہ علہ وسلم لا یکون مخالفًا للوقار والمتانة[3] رسول اللہ ﷺ کی اس کی کیفیت سے صحابہؓ کے دلوں میں بھی رغبت وفکر پیدا ہوئی آپ ﷺ نے روئے مبارک اٹھا کر فرمایا، تم میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جس کا ٹھکانہ جنت یا جہنم میں پہلے ہی نہ لکھ دیا گیا ہو بخاری ومسلم میں: الا وقد كتبت شقية اوسعيدةً کا بھی اضافہ ہے، یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے کہ: انسان کی منزل ایک ہی ہوسکتی ہے جنت یا جہنم! دونوں میں ٹھکانہ مقرر ہونے کا کیا مطلب ہے، بعض حضرات اس طرف گئے ہیں کہ اصولاً انسان کا مقام دونوں جگہ مقرر ہے اب وہ جیسا عمل کرے گا آخیر میں اس کا ٹھکانہ کسی ایک میں کر دیا جائے گا، دوسرا قول یہ ہے کہ انسان کا اخروی ٹھکانہ جنت یا جہنم کسی ایک ہی جگہ ہوگا، اور یہاں واوَ او کے معنی میں ہے، ملا علی قاریؒ نے مرقاۃ المفاتیح (قدر حدیث ۷) میں علامہ سندھی نے سنن مصطفیٰ (قدر حدیث ۳) میں اور مولانا ادریس کاندھلویؒ نے التعلیق الصبیح (قدر حدیث ۷) میں یہی تصریح کی ہے اور صحیح بخاری باب: وكان امر الله قدرا مقدورًا میں بھی یہ حدیث او ہی کے ساتھ منقول ہے اور افلا نتكل خود اسی کی دلیل ہے، جب سب کچھ مقرر ہے تو پھر عمل سے کیا فائدہ؟ صحابہؓ کے ذہن میں اشکال پیدا ہوا صحیح مسلم کی روایت کے مطابق سراقہ بن جعشم نے مجمع کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا: افلا نتكل؟ صحیح مسلم کی حدیث میں: افلا نمكث على كتابنا وندع العمل وقال من كان من اهل السعادة فيصير إلى عمل أهل السعادة ومن كان من اهل الشقاوة فيصير الى عمل اهل الشقاوة تو کیا ہم اسی پر تکیہ کرلیں؟ اس سوال کی تشریح حافظ ابن حجر نے: ألانترك مشقة العمل فانا سنصير الى ماقدر علينا ملا علی قاریؒ نے: اذا كا ن الأمر كما ذكرت يا رسول الله افلا

---

[1] مسلم کتاب القدر ۲/۳۳۴
[2] الکوکب الدری ۳/۴۴
[3] فیض الباری ۴/۴۰۳

نعتمد علی ماکتب لنا فی الأزل سے علامہ سندھیؒ نے: **أی العمل لا یرد القضاء والقدر السابق فلا فائدۃ فیہ** سے اور حضرت گنگوہیؒ نے: **حاصل السوال ان المقدر یجعلنا مضطرًا الی ما ھو مقدرٌ فنؤول الیہ بالاخرۃ فلا فائدۃ فیہ اذا** کے الفاظ سے کی ہے یعنی جب سب کچھ طے شدہ ہے اور اب کسی تبدیلی کا امکان نہیں تو پھر عمل سے کیا فائدہ جو مقدر میں ہوگا، وہ خود بخود مل جائے گا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا کہ: نہیں عمل کرو اور تقدیر پر تکیہ نہ کرو، کیونکہ ہر شخص کو وہی اسباب وحالات مہیا کئے گئے ہیں، جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

﴿**کل میسرٌ**﴾ کے متعلق ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے کہ: یہاں مضاف الیہ کے محذوف کرنے کی وجہ سے کل پر تنوین آئی ہے، صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں: **اعملوا فکل میسرٌ أما اھل السعادۃ فیسیرون لعمل اھل السعادۃ وأما اھل الشقاوۃ فَيُيَسَّرُون لعمل اھل الشقاوۃ** ہرایک کو وہی میسر ہے، جس کے لئے پیدا کیا گیا، اس جملے کی وضاحت ملاعلی قاریؒ نے: **ان القدر فی حق العباد واقع علی تدبیر الربوبیۃ وذلك لا یبطل تکلیفھم العمل بحق العبودیۃ فکل من الخلق میسرٌ لمادبر لہ فی الغیب فیُسَّرُ لہ العمل الی ما کتب لہ فی الازل من سعادۃ اوشقاوۃ** اور مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ نے: **جوابہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انھم لیسوابمختارین فی اتیان العمل ولا یمکنھم ترکہ لأن المقدور یجبرھم علیہ فیأتون لا محالۃ** کے الفاظ سے کی ہے، جواب نبوی کا خلاصہ یہ ہے کہ تقدیر الٰہی کی بدولت بندوں کی تکلیف باطل نہیں ہوتی وہ اب بھی محنت وعمل کے مکلّف ہیں، کیونکہ ایک انسان جنت یا جہنم جس کے لئے پیدا کیا گیا ہے، عمل کی راہیں خود بخود اسی سمت ہموار ہوتی جائیں گی اور وہ ان پر گامزن ہوکر اپنی منزل پر پہنچے گا، تو اس طرح عمل سعادت وشقاوت کی علامت ہوا، ان کا سبب نہیں ہے، بس ہر شخص اطاعتِ الٰہی کی دھن میں عمل کرتا رہے اور اس طرح کے وسوسوں کو قریب نہ آنے دے، علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ: یہ جواب علی اسلوب الحکیم ہے۔

منعھم عن ترك العمل وامرھم بالالتزام مما یجب علی العبد من العبودیۃ

وزجرهم عن التصرف في الأمور المغيبة فلا يجعلوا العبادة وتركها سببًا مستقلًا لدخول الجنة والنار بل هي علامات فقط (فتح الباری/ القدر باب ۳)

آپ نے ترک عمل سے روک کر انہیں اس عبودیت کی ادائیگی کا حکم دیا جو بندے پر واجب ہے اور غیبی امور میں تصرف اور دخل دینے پر تنبیہ فرمائی کہ وہ جنت وجہنم کے دخول میں عمل کرنے نہ کرنے کو سبب نہ بنائیں وہ صرف علامت ہے۔

حضرت کشمیریؒ نے حضورؐ کے اس جوابی ارشاد پر بہت محققانہ گفتگو کی ہے فرماتے ہیں۔

هذهِ الجملةُ جزيلةُ المعنى فليُمعِنِ النظرَ فيها وحاصلُ الجواب ان الانسان مختار في عالم الشهادة ومجبورٌ بالنظر الى عالم الغيب الذى تحقق بالأدلة السَمْعِيِّةِ والا فَنَحْنُ مُخْتَارُوْنَ في العالمِ المشهودِ قطعًا وَلاَ خُبْرَةَ لنا بعالم غيره فَافْعَلُوْا الخيرَ وَامتنعوا عن الشَرِّ فِيْ مَوطِنِ الاختيارفان المسبوقَ بالخيرِ لاياتى منه الشَّرو المسبوق بالِشر لا ياتى منه الخير اصلاً ولا يُيَسَّرُ للسعيدِ الا الاعمال الصالحةِ وللشقى اِلَّا الاعمالُ الطالحةُ فقولكم: أفلا نَدعُ العملَ في غير محلهِ فَاِنَّكُمْ ان سبقَ لكم الخيرُ لا يُيَسَّرلكُمُ اِلَّا هُوَ فَاياه تعملون وكذا ان قدر لكم الشرلا يُيَسَّرُ لكُمْ الا هُوَ فَفِيْهِ تقتحمون فَلَيْسَ الخيرُ والشرُّ مِنْ عندِ انفسِكُمْ وانَّمَا استَعْمَلْتُمْ بِهِ فعملتُمْ وهٰذه الجملُ بهذِهِ السذاجة لَا يُمْكِنُ ان تخرجَ اِلَّا من صاحب النبوةِ (فيض البارى۲ / الجنائزُ بابُ موعظةِ المحدثِ /۴۹۰)

رسول اللہ ﷺ کا یہ جملہ (كل مسير) معانی سے بھرا ہے، اس لئے اس میں غور وفکر ضروری ہے، آپ کے اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں تو صاحب اختیار ہے جب کہ عالم غیب میں مجبور ہے، جیسا کہ منقول دلائل سے پتہ چلتا ہے، تو ہم کیونکہ یقینی طور پر دنیا میں مختار ہیں اور عالم غیب کا ہمیں کوئی علم نہیں اس لئے اختیار وکسب کی دنیا میں تم لوگ شر سے بچ کر خیر کو اختیار کرو کیونکہ خیر میں سبقت کرنے والے سے شر کا صدور نہیں ہوتا اور شر میں سبقت کرنے والے سے پھر خیر کا ظہور مشکل ہے، فطرتاً سعید شخص کے لئے اعمال صالحہ کو آسان

مرغوب کردیا جاتا ہے اور شقی خود بخود بری باتوں میں الجھ جاتا ہے، تو تمہارا **افلا ندع العمل** کہنا بے محل ہے، کیونکہ تمہارے لئے اگر خیر مقدر ہے تو تمہیں اسی کے وسائل واسباب فراہم کئے جائیں گے، پھر تم اس پر عمل کرو گے اور اگر شر مقدر ہے، تو اسی کے اسباب فراہم ہوں گے اور تم اس میں مبتلا ہو جاؤ گے لیکن یاد رکھو یہ خیر وشر خود تمہاری جانب سے نہیں ہے، بلکہ تم تو محض استعمال ہوئے ہو اور تم نے اس پر عمل کیا ہے، اس سادگی کے ساتھ ایسا جملہ صرف نبی ہی بول سکتا ہے۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی آیت سے اس کی شہادت ودلیل دی کہ: جس نے فرمان الٰہی کے مطابق زکوٰۃ وصدقات اور دوسرے مالی حقوق ادا کر کے تقوے کی راہ لی اور اچھی بات کی تصدیق کی یعنی قرآن وسنت پر ایمان لایا تو ہم اس کو سہولت کے ساتھ جنت کے راحت وآرام میں پہنچا دیں گے اور جس نے بخل کے باعث زکوٰۃ وصدقات اور مالی حقوق کی ادائیگی نہ کر کے استغناء اور لاپرواہی برتی علوم نبوت کو جھٹلایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ مصائب وآلام کی جگہ جہنم میں پہنچا دیں گے...... حدیث باب صحیح بخاری (جنائز/۸۲، الادب/الرجل ینکث الشيء، قدر/۳) صحیح مسلم، (قدر/۱) جامع ترمذی (قدر/۳، تفسیر، واللیل اذا یغشی) وغیرہ میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی صحیح ہے۔

(۴/۸۰) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ ابى شَيْبَةَ وَعَلِى بْنُ محمدِ الطَنافِسِىُّ قَالَا: حَدَّثَنَا عبدُاللّٰهِ بْنُ ادريسَ عَنْ بيعةَ بن عثمانَ عَنْ مُحمدِ بن يحيىَ بنِ حَبَّانَ عَنِ الأعرَجِ عَنْ أبى هُرَيْرَةَ قَالَ: قال رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسَلَّمَ اَلْمُؤْمِنُ القوِىُّ خيرٌ، وَأَحَبُّ الى اللّٰهِ مِنَ المؤْمِن الضَّعِيفِ وَفِىْ كُلٍّ خَيْرٌ احرِصْ عَلَى ما يَنفعُكَ واستَعِنْ باللّٰهِ وَلَا تَعْجَزْ فاِنْ اَصَابَكَ شىٌ فَلَا تقُلْ لَوْاَنِّى فَعَلْتُ كذا وكذا ولكِن قُلْ قَدَّرَ اللّٰهُ وما شَاءَ فَعَلَ فَاِنَّ "لو" تَفْتَحُ عَمَلَ الشَيْطَانِ.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مضبوط وتوانا مومن کمزور مومن کی نسبت اللہ کو زیادہ محبوب وپسند ہے، لیکن بھلائی دونوں میں ہے ان چیزوں کے خواہاں رہو جو تمہارے لئے مفید ہوں، مدد اللہ سے طلب کرو، اور کبھی نکمے مت بنو اگر تم کو کوئی نقصان پہنچ جائے، تو یہ مت کہو کہ کاش میں

ایسا کرتا ویسا کرتا، بلکہ یہ کہو کہ اللہ نے مقدر فرمادیا اور اس نے جو چاہا کیا کیوں کہ "لو" کا لفظ شیطانی عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

حدیث بظاہر مختلف احوال ونصائح پر مشتمل ہے، لیکن گہری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ: وہ ایک دوسرے سے باہم مربوط ومتحد ہیں، یعنی مومن کو طاقتور ہونا چاہئے، لیکن جو کمزور ہے، اللہ کے نزدیک وہ بھی خیر وفلاح کا حامل ہے، نیک اعمال کو انجام دینے کی خواہش دونوں کو ہونی چاہئے، یہ اللہ کی توفیق ہی سے ممکن ہے اس لئے قوی زیادہ اپنی طاقت پر بھروسہ نہ کرے، اور کمزور احساس کمتری کا شکار نہ ہو اور دونوں یہ جان لیں کہ ہوگا وہی جو تقدیر میں لکھا جاچکا ہے، قضائے الٰہی پر قوت وزور اثر انداز نہیں ہوتے اس لئے یہ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ اگر میں نے یہ کیا ہوتا تو نتیجہ برعکس ہوتا۔

﴿المومن القوی خیرٌ واحب الی اللہ من المومن الضعیف﴾ امام نوویؒ نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔

المراد بالقوۃ عزیمۃ النفس والقریحۃ فی امور الآخرۃ فیکون صاحب ھذ الوصف اکثرا قدامًا علی العد وفی الجھاد واسرع خروجًا الیہ وذھابا فی طلبہ واشد عزیمۃ فی الامر بالمعروف والنھی عن المنکر والصبر علی الاذی فی کل ذلك واحتمال المشاق فی ذات اللہ تعالیٰ وارغب فی الصلوٰۃ والصوم والأذکار وسائر العبادات وانشط طلبًا لھا ومحافظۃ علیھا ونحو ذلك" (صحیح مسلم، ج:۲، ص:۳۳۸)

علامہ سندھیؒ کے الفاظ یہ ہیں:

ای: علی أعمال البر ومشاق الطاعۃ، والصبور علی تحمل مایصیب من البلاء والمتیقظ فی الامور المھتدی الی التدبیر والمصلحۃ بالنظر الی الاسباب، واستعمال الفکر فی العاقبۃ. (قدر، حدیث، ۷۹)

امام نوویؒ کی عبارت تو آسان اور واضح ہے، اس لئے ترجمے کی ضرورت نہیں، جب کہ سندھی کے قول کا مطلب یہ ہے کہ طاقت ور مومن نیک اعمال کرنے اور طاقت کی مشقت کو

جھیلنے پر قادر ہوتا ہے، وہ دین کی راہ میں آنے والے مصائب کو برداشت کرنے پر حد درجہ صبر کرتا ہے، اسی طرح اسباب میں غور وخوض اور عقل وفکر کو اخروی امور میں استعمال کر کے وہ ان چیزوں کی بابت بہت چوکسی کا ثبوت دیتا ہے، جو مصلحت اور انجام کی طرف رہنمائی کرتی ہوں۔

﴿وفی کل خیر﴾ مضاف الیہ کے محذوف ہونے کی بناء پر کل پر تنوین ہے، اس کی تشریح کرتے ہوئے امام نوویؒ تحریر فرماتے ہیں: "فمعناه فی کل من القوی والضعیف خیر لاشتراکھا فی الایمان، مع ما یأتی به الضعیف من العبادات[1]" یعنی قوی بہتر تو ہے، لیکن ایمان میں برابری کی وجہ سے ضعیف وقوی دونوں میں خیر ہے، مضبوط وتوانا کی طرح کمزور، مردمیدان تو نہیں ہوتا، لیکن عبادت اطاعت وہ بھی کر لیتا ہے۔

﴿احرص علی ما ینفعك واستعن باللّٰه ولا تعجز﴾ حرص، ضَرَبَ وسمع کے باب سے آتا ہے، معنی خواہش کرنا، لالچ کرنا، اسی طرح عجز بھی ان ہی دونوں ابواب سے منقول ہیں، طاقت نہ رکھنا، عاجز ہو جانا، امام نوویؒ فرماتے ہیں: "ومعناه: احرص علی طاعة اللّٰه تعالٰی والرغبة فیما عنده واطلب الاعانة من اللّٰه علٰی ذلك ولاتعجز ولاتکسل عن طلب الطاعة ولا عن طلب الاعانة[2]" اللہ کی اطاعت اور اس کی نعمتوں کے خواہاں رہو، اس سلسلے میں اسی سے مدد طلب کرو اور طاعت اعانت کو طلب کرنے میں کسی طرح کی عاجزی وسستی نہ دکھاؤ: "واستعن باللّٰه" کی بابت حضرت مولانا عبدالغنی مجددیؒ دہلوی ایک عارفانہ نکتہ بیان کرتے ہو لکھتے ہیں: "ای لا تعتمد فی حرصك علٰی نفسك فعسٰی ان تحبوا شیئا وھو شرلکم فاذا استعنت باللّٰه عزوجل فانه تعالٰی لا یعینك الا بما ھو خیر لك[3]" یعنی خواہشات میں نفس پر اعتماد نہ کرو، ممکن ہے کوئی چیز پسند ہو اور وہ درحقیقت شر ہو تو جب اللہ سے مدد لو گے تو وہ تمہاری صرف خیر ہی پر مدد کرے گا۔

﴿فان اصابك شیٔ﴾ الخ انسان یقینی طور پر یہ اعتقاد رکھے کہ اگر میں ایسا کرتا، تو نتیجہ کچھ اور ہوتا، حدیث میں اسی کی ممانعت ہے، کیونکہ علامہ سندھیؒ کے الفاظ میں: ان الامر منوط بتدبیر العبد وان تدبیره ھو المؤثر قبل[4] اس سے یہ عقیدہ پیدا ہوتا ہے کہ:

---

[1][2] صحیح مسلم، ج:۲، ص:۳۳۸ [3] حاشیہ ابن ماجہ، ص:۹
[4] سنن مصطفیٰ قدر حدیث ۷۹

معاملہ بندے کی تدبیر سے وابستہ ہے اور اس کی تدبیر ہی اصل مؤثر ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ: تمام امور و معاملات تدبیر سے نہیں، تقدیر سے وابستہ ہیں، اس لئے یہ لفظ ''کاش'' نہایت خطرناک ہے، شیطان اسی کے ذریعے دلوں میں نقب لگا کر انسان کو غیر شعوری طور پر تقدیر کا منکر بنا دیتا ہے اس مفہوم میں ایک اور پہلو سے پردہ اٹھاتے ہوئے، مولانا عبدالغنی مجددی لکھتے ہیں: **ای ولا تعتذر عن ترك اعمال البر، قائلا بانه لو كانت مقدرة لی لفعلت تلك فان هذا من الشيطان**[1] یعنی نیک اعمال کو چھوڑ کر یہ عذر نہ کرو، کہ اگر وہ میری تقدیر میں ہوتے تو میں ان کو یقیناً کرتا، کیونکہ یہ تاویل و توجیہ شیطانی ہے، جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ: ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو تہجد کے لئے جگایا، تو انہوں نے یہ عذر کیا: **انفسنا بيد الله لوشاء لبعثنا** ہماری جانیں تو اللہ کے قبضے میں ہیں، وہ اگر چاہتا تو ہمیں ضرور بیدار کر دیتا، آپ نے فرمایا: **كان الانسان اكثر شيء جدلا** اس لئے اسی طرح کہنے کی ممانعت ہے اور یہ نہی تحریمی نہیں، قاضی عیاضؒ امام نوویؒ اور علامہ سندھی کی تصریح کے مطابق تنزیہی ہے.......... یہ لفظ خود حضور ﷺ نے استعمال کیا ہے، اس کا کیا جواب ہے، کیونکہ نبی نہی تنزیہی کا بھی ارتکاب نہیں کرتے امام نوویؒ جواب دیتے ہیں: **فاما من قاله تأسفا علىٰ ما فات من طاعة الله تعالىٰ او ما هو متعذر عليه من ذٰلك ونحوهٰذا فلابأس به وعليه يحمل اكثر استعمال الموجود فی الاحاديث**[2] یعنی جس نے اطاعت، عبادت کے فوت ہونے پر لفظ ''کاش'' کا استعمال کیا، یا اسے ایسی چیز کے بارے میں بولا، جو اس کے لئے ممکن نہیں ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں اور احادیث میں اکثر وہ اسی معنی پر محمول ہیں، جیسا کہ **لولا ان اشق علىٰ امتی لأمرتهم بالسواك، يا لو كنت راجما بغير بينة لرجمت هٰذه** اسی طرح: **لولا حدثان عهد قومك بالكفر لاتممت البيت علىٰ قواعد ابراهيم** وغیرہ۔

ترجمۃ الباب ظاہر ہے کہ انسان کو تقدیر پر مکمل یقین رکھنا چاہئے کیونکہ کوئی تدبیر قضائے الٰہی کو نہیں ٹال سکتی حدیث باب صحیح مسلم، (قدر/۸) میں آئی ہے اور دونوں کی سند بھی ایک ہے۔

---

[1] سنن مصطفیٰ قدر حدیث ۴ [2] صحیح مسلم، ج:۲ ص:۳۳۸

(۸۱/۵) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ وَيَعْقُوبُ بْنُ حَمِيْدِ بْنِ كَاسِبٍ قَالَا: ثنا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ عَنْ عَمْرِو بْنِ دِيْنَارٍ سَمِعَ طَاوُسًا يَقُوْلُ سَمِعْتُ أَبَاهُرَيْرَةَ يُخْبِرُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِحْتَجَّ آدَمُ وَمُوْسٰى فَقَالَ لَهُ مُوْسٰى يَا آدَمُ: أَنْتَ اَبُوْنَا خَيَّبْتَنَا وَاَخْرَجْتَنَا مِنَ الْجَنَّةِ بِذَنْبِكَ فَقَالَ لَهُ آدَمُ يَا مُوْسٰى! اِصْطَفَاكَ اللّٰهُ بِكَلَامِهِ وَخَطَّ لَكَ التَّوْرَاةَ بِيَدِهِ أَتَلُوْمُنِيْ عَلٰى أَمْرٍ قَدَّرَهُ اللّٰهُ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَنِيْ بِاَرْبَعِيْنَ سَنَةً؟ فَحَجَّ آدَمُ مُوْسٰى، فَحَجَّ آدَمُ مُوْسٰى فَحَجَّ اٰدَمُ مُوْسٰى ثَلَاثًا.

حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے بتاتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا آدمؑ وموسیٰؑ نے مناظرہ کیا تو ان سے موسیٰؑ نے کہا کہ اے آدمؑ آپ ہمارے باپ ہیں، آپ نے ہمیں محروم کرکے اپنے گناہ کی پاداش میں ہمیں جنت سے نکلوایا، تو آدمؑ نے ان سے فرمایا اے موسیٰؑ! اللہ نے تم کو اپنی ہمکلامی کے لئے منتخب فرمایا اور اپنے ہاتھ سے تمہیں توریت لکھ کر دی تو کیا تم مجھے اس بات پر ملامت کرتے ہو، جس کو اللہ نے میری پیدائش سے چالیس سال پہلے ہی میرے لئے مقدر فرمادیا تھا، تو آدمؑ موسیٰؑ پر غالب آگئے، تو آدم موسیٰؑ پر غالب آگئے ایسا تین مرتبہ فرمایا۔

﴿احتج آدم وموسیٰ﴾ ابوداؤد میں ان الفاظ سے پہلے: ان موسیٰ قال یا رب ارنا آدم الذی أخرجنا ونفسه من الجنة فأراه الله آدم کی بھی تصریح ہے، جب کہ: صحیح مسلم کی روایت میں عند ربهما کے الفاظ ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے، دونوں میں گفتگو کہاں ہوئی؟ محدثین نے اس کے متعدد جواب دیے ہیں۔

۱۔ قاضی عیاض نے فرمایا: ويحتمل أنه على ظاهره وأنهما اجتمعا باشخاصهما[۱] ممکن ہے، یہ ظاہر پر محمول ہو اور دونوں نے زندہ ہو کر ملاقات کی ہو، جیسا کہ: معراج کی رات تمام انبیاء زندہ ہو کر مسجد اقصیٰ تشریف لائے اور خاتم الرسل کی امامت میں انہوں نے نماز ادا کی۔

۲۔ دوسرا احتمال قاضی عیاض نے یہ ظاہر کیا ہے کہ: ان ذلك جرى في حياة موسٰى سأل الله تعالٰى أن يريه آدم فحاجه[۲] کہ حضرت موسیٰؑ نے جب آدمؑ کو دیکھنے کی درخواست

۱۔۲۔ صحیح مسلم ۲/۳۳۵

کی تو اللہ نے برزخی حجابات اٹھا دیئے اور دونوں کا یہ مناظرہ ہوا۔

۳ ابوالحسن قابسی نے یہ توجیہ کی ہے: التقت أرواحهما في السماء فوقع الحجاج بينهما[۱] دونوں کی روحوں نے آسمان میں پہنچ کر یہ مناظرہ کیا ابن عبدالبر کی بھی یہی رائے ہے۔

۴ یہ مکالمہ شب معراج میں ہو۔

۵ علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں لکھا ہے، کہ یہ مکالمہ عالم آخرت میں ہوگا۔

اور یقینی ہونے کی بنا پر اسے ماضی کے صیغہ سے تعبیر کر دیا گیا، ہمارے نزدیک پہلے دو قول مرجوح تیسرا راجح اور آخری دو کا وقوع ممکن ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے مناظرہ کے لئے انبیاء میں حضرت موسیٰؑ کو کیوں منتخب کیا گیا؟ شیخ الاسلام حضرت کشمیری نے عرف الشذی میں لکھا ہے: وكان موسى حديد الطبع اور "فیض الباری" میں فرمایا: انه لم يكن من أبنائه من يجترأ أن يسأل أباه عن اكل الشجرة غير موسى عليه السلام فانه كان في طبعه شدة فنصب للمناظرة بذلك وهذ اليس اسائة للأدب ولكنه من اختلاف الطبائع[۳] حضرت موسیٰ کے مزاج میں تیزی تھی اس لئے انہی کو اس مکالمے کے لئے منتخب کیا گیا کوئی دوسرا اس کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، پھر یہ مزاجوں کا اختلاف ہے، کوئی گستاخی نہیں:

﴿يا آدم! آنت ابونا خيبتنا وأخرجتنا من الجنة بذنبك﴾ بخاری و سنن ابی داؤد میں بھی یہی منقول ہے، جب کہ مسلم میں: انت آدم الذي خلقك الله بيده ونفخ فيك من روحه واسجد لك ملائكته وأسكنك في جنته آیا ہے، دوسرے طرق میں بھی اسی سے ملتے جلتے الفاظ ہیں۔

﴿إصطفاك الله بكلامه وخطّ لك التوراة بيده﴾ یعنی تمہیں اللہ نے اپنی ہم کلامی کے لئے منتخب فرمایا اور اپنے ہاتھ سے لکھ کر توریت دی ابوداؤد کے طریق میں ہے آدم نے پوچھا: ومن أنت قال أنا موسى قال أنت نبيُّ بني اسرائيل الذي كلمك الله من

---

۱ صحیح مسلم ۲/۳۳۵ ۲ ترمذی باب القدر ۲/۳۷
۳ فیض الباری ۴/۲۰۶

وراء الحجاب لم یجعل بینك وبینه رسولا من خلقه اسی طرح مسلم کے طریق میں: وأعطاك الالواح فیها تبیان کل شئ وقربك نجیًا وارد ہوا ہے، یعنی تمھیں براہِ راست ہم کلامی کا شرف بخشا، توریت کی تختیاں عطا کیں جس میں ہر چیز کی وضاحت تھی اور تمہیں اپنا رازداں بنایا، نبی معصوم ہوتا ہے پھر یہاں بذنبك کا کیا مطلب ہے؟ اسکا مختصر جواب یہ کہ ذنب کا اطلاق اس معمولی غلطی پر ہوتا ہے جو سہوا بلا قصد صادر ہو، وہ عصمت کے منافی نہیں ہے۔

﴿أتلو منی علی أمرٍ قدر الله عليَّ قبل أن يخلقني باربعين سنة﴾ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ: تقدیر کی کتابت باری تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے فرمائی جس کی رو سے یہ واقعہ بھی اتنی ہی مدت پہلے لکھا جانا چاہئے؟: "التعلیق الصبیح" میں اس کا جواب ابن الجوزی کے حوالے سے یہ لکھا ہے: فیجوز أن تكون قصة آدم بخصوصها كتبت قبل خلقه باربعين سنة ممکن ہے کہ آدم کے قصے کو خصوصی طور پر صرف چالیس سال پہلے لکھا گیا ہو کیونکہ وہ اس پوری مدت میں مٹی کی صورت میں رہے، اس کے بعد ہی روح پھونکی گئی: ذلك مدة لبثه طينا الى أن نفخت فيه الروح امام نوویؒ نے حدیث کے اس ٹکڑے کا مفہوم یہ بتلایا ہے: ومعنی کلام آدم انك یا موسٰی تعلم ان هذا كتب علی قبل ان اخلق وقدر علی فلا بد من وقوعه ولو حرصت انا والخلائق اجمعون علی رد مثقال ذرة منه لم نقدر فلم تلو منی علی ذلك موسیٰ تمہیں معلوم ہے کہ میری پیدائش سے پہلے ہی وہ مکتوب اور مقدر ہو چکا تھا اور اس کا وقوع یقینی تھا، اگر میں اور ساری مخلوق مل کر بھی اسے ذرا بدلنا چاہتے تو بھی ہم کامیاب نہیں ہوتے، تو اس پر تمہاری ملامت کیونکر درست ہے۔

﴿فحج آدم موسی﴾ حج حجا نصر کے باب سے آتا ہے، معنی دلیل میں غالب ہونا جب کہ احتجاج دلیل و دعویٰ پیش کرنے کو کہتے ہیں۔

تقدیر سے سہارا لینے کا مسئلہ

یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ارتکاب معصیت کے عذر میں تو تقدیر کا سہارا لینا درست نہیں، بلکہ شرعا بدترین گناہ ہے کیونکہ تمام گنہگار اور جرائم پیشہ لوگ سزا سے بچنے کے لئے تقدیر کا

سہارا لینے لگیں اور خود کو معصوم قرار دے کر تمام نافرمانیوں کو تقدیر کا نتیجہ قرار دیں تو یہ اختیار واکتساب کا انکار اور قانون کے ساتھ بدترین مذاق ہوگا، پھر شرعی حدود وتعزیرات نیز اخروی عذاب وتہدیدات بے معنی ہوکر رہ جائیں گے پھر حضرت آدم جیسے جلیل القدر پیغمبر نے تقدیر کا سہارا کیوں لیا؟ امام نوویؒ جواب دیتے ہیں۔

فان قیل فالعاصی منا لوقال هذه المعصیة قدرها الله علی لم یسقط عنه اللوم والعقوبة بذلك وان كان صادقا فیما قاله فالجواب ان هذا العاصی باق فی دار التكلیف جار علیه احكام المكلفین من العقوبة واللوم والتوبیخ وغیرها وفی لومه وعقابته زجر له ولغیره عن مثل هذ الفعل وهو محتاج الی الزجر مالم یمت فاما آدم فمیت خارج عن دار التكلیف وعن الحاجة الی الزجر فلم یكن فی القول المذكور له فائده بل فیه ایذاء وتخجیل والله اعلم

(مسلم،ص:۲/۳۳۵)

اگر ہم میں سے کوئی گنہگار عذر پیش کرے کہ یہ نافرمانی تو اس کی قسمت میں اللہ نے لکھ دی تھی اس صورت میں ملامت وسزا اس سے ساقط نہیں ہوگی، گرچہ وہ اپنے قول میں سچا ہے کیونکہ یہ گنہگار دار التکلیف میں ہے اور اس پر مکلّف ہونے کی وجہ سے زجر وملامت اور سزا کے احکام جاری ہوں گے اور اس کی ملامت وسزا میں اس گناہ سے بچنے کے لئے دوسروں کو بھی عبرت ہے، اسی لئے تاحیات وہ سزا کا مستحق ہے، لیکن جہاں تک حضرت آدمؑ کا سوال ہے تو وہ مرچکے ہیں دار التکلیف سے ان کا نہ کوئی تعلق ہے اور نہ زجر وتوبیخ کی انہیں ضرورت ہے چنانچہ ان سے اس طرح کہنے میں کوئی فائدہ نہیں بلکہ تکلیف دینا اور شرمندہ کرنا ہے۔

امام نوویؒ کے اسی جواب کی تشریح حضرت کشمیریؒ نے: اجیب بأن الممنوع انما هو ما كان فی دار التكلیف وتلك المناظر وقعت بعد الخروج عنه (فیض الباری۴،تفسیر طٰہٰ) سے، مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ نے: هذه دار التكلیف فلا یجوز مثل ذلك فی نشأة الدنیا لما یلزمه علیه من ابطال التكلیف واما فی نشأة الأخرة فیجوز لعدم بقاء التكلیف (بذل/السنۃ/القدر) سے، اور ملا علی قاریؒ نے:

احتج بذلك بعد اندفاع مواجب الكسب منه وارتفاع احكام التكليف عنه (مرقاۃ/قدر/۲) سے کی ہے، دیگر شراح نے بھی اشکال کا یہی جواب دیا ہے، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے فرمایا کہ معصیت کے ارتکاب میں تقدیر سے سہارا لینے کی دو قسمیں ہیں:

۱: للاجتراء علىٰ المعاصي ودفع المعرة عن نفسه یہ بلاشبہ غلط اور گناہ ہے۔

۲: مايكون تسلية النفس والاعتذار عما صدر منه یعنی دل کی تسلی اور جو کچھ گناہ ہوا اس پر معذرت وشرمندگی کے لئے تقدیر کا سہارا لیا جائے، تو یہ چیز مستحسن ہے، شیخ الاسلام حضرت کشمیریؒ نے فیض الباری (۴/ ۲۰۶) میں اس توجیہ کو: اجود الأجوبة قرار دیا ہے، چنانچہ واقعہ ہے کہ دار التکلیف میں حضرت آدمؑ تقدیر کا سہارا تو کیا لیتے توبہ کے الفاظ بھی اس وقت تک زبان سے نہ نکالے جب تک باری تعالیٰ نے ان کا القاء نہ کیا، پھر: ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنكونن من الخاسرين کے ذریعہ گریہ وزاری شروع کردی، اس مکالمے سے حضرت آدمؑ کے غایت ادب کا پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ: ان کے پاس معقول جواب تھا، لیکن خالق ومعبود کے سامنے لب بھی نہ ہلائے اور اپنے قصور کی معافی چاہتے رہے، پھر جب مخلوق میں سے ایک نے یہ سوال کیا تو ایسا جواب دیا کہ: حضرت موسیٰ جیسا اولوالعزم پیغمبر بھی خاموش ہوگیا...... حدیث بخاری (تفسیر/ طٰہٰ/ قدر/ ۱۰ توحید/ ۳۷) صحیح مسلم (قدر/۲) سنن ابی داؤد (سنۃ/ القدر) اور جامع ترمذی (قدر/۲) وغیرہ میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی صحیح ہے۔

(۸۳/۶) حَدَّثَنَا عَبْدُاللهِ بْنُ عَامِرِ بْنِ زُرَارَةَ ثَنَا شَرِيْكٌ عَنْ مَنْصُوْرٍ عَنْ رِبْعِيٍّ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتَّى يُؤْمِنَ بِارْبعٍ بِاللهِ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، وَأَنِّي رَسُوْلُ اللهِ وَبِالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْقَدْرِ.

کوئی بندہ مومن نہیں ہوسکتا جب تک چار چیزوں پر وہ ایمان نہ لائے: اللہ وحدہ لاشریک پر، مجھ پر کہ میں اللہ کا رسول ہوں، مرنے کے بعد زندہ ہونے پر، تقدیر پر۔

حدیث باب میں ایمان کی چند بنیادوں کا ذکر ہے، تمام ارکان کا حصر نہیں، کیونکہ مذکورہ

چاروں قسموں کے علاوہ مزید ایسی چیزیں موجود ہیں، جن کی تصدیق کے بغیر ایمان کا کوئی اعتبار نہیں، جیسا کہ خود قرآن نے بیان کیا ہے: ''والمؤمنون کل اٰمن باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ'' یہاں آسمانی کتابوں فرشتوں اور رسولوں کو بھی ایمان کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، علامہ سندھی اور ملا علی قاری نے مرقاۃ (قدر/حدیث ۱۰) میں ہذا نفی لاصل الایمان لا نفی لکمالہ کی وضاحت کی ہے، سیوطی فرماتے ہیں فمن لم یومن بواحد من الاربعۃ لم یکن مومنا۔

﴿باللہ وحدہ لا شریك لہ﴾ اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسی ہستی ہے، جو اپنی ذات وصفات میں یکتا اور ہر نقص وعیب سے پاک ہے، تمام تر کمالات سے وہ متصف ہے، پوری کائنات اس کی تابع ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں، اسی طرح تمام تصرفات اسی کے قبضے میں ہیں اور کسی بھی حیثیت سے اس کا کوئی شریک سہیم نہیں ہے۔

﴿وانی رسول اللہ﴾ ایمان بالرسل یہ ہے کہ بندوں کی ہدایت وفلاح کے لئے اس نے کچھ برگزیدہ اور پاکیزہ انسانوں کو منتخب فرما کر ہر قبیلے اور قوم کی جانب مبعوث فرمایا: انہوں نے انسانوں کو شیطانی راستے سے بچنے اور رحمانی جادہ پر چلنے کا پیغام دیا، ان میں سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام اور سب سے آخری حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ کے بعد اب کسی کو نبوت نہیں ملے گی اور دین محمدی قیامت تک باقی رہے گا۔

﴿وبالبعث بعد الموت﴾ کا مطلب یہ ہے، ایک دن زمین وآسمان اور پوری کائنات کو ختم کر دیا جائے گا، پھر باری تعالیٰ تمام جن وانس کو زندہ کریں گے، اور ان کا حساب وکتاب ہوگا، جس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا، وہ جنت میں جائے گا، اور جس کی برائیاں نیکیوں سے زیادہ ہوں گی، اس کو جہنم میں بھیج دیا جائے گا، ہر ایک کو دوسرے کا حق دینا ہوگا اور تمام راز اس دن کھل جائیں گے، اگر ایمان ہے، تو سزاء کے بعد اس کو بھی جنت ملے گی، جب کہ کفار ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

﴿والقدر﴾ تقدیر پر ایمان یہ ہے کہ نظام کائنات کو ایک علیم وحکیم ہستی چلا رہی ہے، دنیا میں فرد وملت کی بابت جو بھی اچھے یا برے واقعات پیش آتے ہیں، اسی طرح عالم کے ذرّے ذرّے کے حالات بھی دنیا کی پیدائش سے ہزاروں سال پہلے لوح محفوظ میں درج کر دیئے گئے

ہیں، اب قیامت تک جو کچھ ہوگا وہ اسی تقدیری خاکے کے تحت منظر عام پر آئیگا، روایت جامع ترمذی (قدر/۱۰) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی بھی سند درست ہے۔

(۸۳/۷) حَدَّثَنَا أَبُوبَكْرِ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ وَعَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَا: ثَنَا وَكِيعٌ ثَنَا طَلْحَةُ بْنُ يَحْيٰ بْنِ طَلْحَةَ بْنِ عبيدِ اللهِ عَنْ عَمَّتِهِ عَائِشَةَ بنتِ طَلْحَةَ عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ قَالَتْ: دُعِيَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى جَنَازَةِ غُلَامٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ فَقُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللهِ طُوْبٰى لِهٰذَا عصفُوْرٌ مِنْ عَصَافِيْرِ الْجَنَّةِ لَمْ يَعْمَلِ السُّوْءَ وَلَمْ يُدْرِكْهُ قَالَ اَوغَيْرُ ذَالِكَ يَاعَائِشَةُ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ لِلْجَنَّةِ أَهْلاً خَلَقَهُمْ لَهَا وُهُمْ فِي اَصْلَابِ اٰبَائِهِمْ وَخَلَقَ لِلنَّارِ اَهلاً خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُوَ فِي اَصْلَابِ اٰبَائِهِمْ.

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ: (ایک مرتبہ) رسول اللہ ﷺ کو ایک انصاری بچے کی نماز جنازہ پڑھانے کے لئے مدعو کیا گیا تو میں نے عرض کیا یہ تو بڑا سعید اور قابل رشک بچہ ہے، جو حقیقتاً جنت کا ایک پرندہ ہے، کیونکہ اس نے کوئی برائی کی اور نہ ہی اسے تکلیف کا زمانہ ملا، آپؐ نے فرمایا عائشہ!! (یہ کیا کہہ رہی ہو) کیا کچھ اور کہوگی (سنو) اللہ نے جنت کے واسطے ایک مخلوق کو پیدا کیا ہے اور ان کے لئے جنت اس وقت مقدر کردی جب کہ وہ اپنے آباء واجداد کی پشت ہی میں تھے، اسی طرح اس نے ایک مخلوق جہنم کے لئے پیدا کی اور ان کے لئے جہنم اسی وقت مقدر فرمادی جب کہ وہ اپنے باپوں کی پشت ہی میں تھے۔

﴿طوبی﴾ یہ اطیب کا مؤنث ہے یا کو واؤ میں تبدیل کردیا گیا ہے راجح قول کے مطابق اس کے معنی خیر وسعادت وبشارت وکرامت، عیش رغید اور آنکھوں کی ٹھنڈک کے ہیں: ''کل مستطاب فی الجنة من بقاء بلا فناءٍ، وعز بلاز وال، وغنی بلا فقر'' یعنی دائمی زندگی، لافانی عزت اور ابدی راحت وغناء جیسی جنت کی تمام نعمتیں اس میں داخل ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کچھ معنی منقول ہیں، لیکن وہ مرجوح ہیں اور قرآن وحدیث میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، ارشاد باری ہے: ''الذین آمنوا وعملوا الصلحٰت طوبی لهم وحسن مآب'' (الرعد/۲۹) اسی طرح مشہور حدیث ہے: ''بدا الاسلام غریبًا وسیعود

غريبًا فطوبى للغرباء" حدیث باب میں بھی حضرت عائشہؓ نے اس لفظ کو انہیں معانی میں استعمال کیا ہے۔

﴿عصفور من عصافير الجنة﴾ کبوتر سے چھوٹے ہر اس پرندے کو کہا جاتا ہے، جس کی چونچ مخروطی ہو اور وہ اپنے پوٹے کو زمین سے لگا کر بیٹھتا ہو، ابن الملک کے بقول بچے کو حضرت عائشہؓ نے پرندے سے تشبیہ دو وجہ سے دی ہے، ۱ وہ پرندے کے طرح چھوٹا ہے، ۲ پرندے کی طرح معصوم اور غیر مکلّف ہے ملاعلی قاریؒ نے دوسری توجیہ کو راجح قرار دیا ہے، بعض اہل علم جنت میں پرندوں کے وجود کے منکر ہیں اس لئے وہ اسے تشبیہ نہیں مانتے ملا علی قاریؒ نے آیت: ولحم طير مما يشتهون اور حدیث: ان في الجنة طيرًا كامثال البخت تأتي الرجل فيصيب منها ثم تذهب كان لم ينقص منها شيءٌ کے ذریعے اسے غلط قرار دیا ہے، ابن حجر مکیؒ نے اس سلسلے میں: جعل الله ارواحهم في جوف طيرٍ خضرٍ ترد انهار الجنة تأكل من ثمارها وتأوى الى قناديل من ذهب معلقةٍ في ظل العرش کی حدیث پیش کی ہے، جو سب سے واضح دلیل ہے، اس کے علاوہ امام ترمذیؒ نے اپنی جامع میں: باب ما جاء في صفة طير الجنة کا باب قائم کیا ہے، جس کے تحت وہ حدیث درج ہے، جس میں تصریح ہے کہ: حوض کوثر پر ایسے پرندے ہوں گے، جن کی گردنیں اونٹ کی طرح لمبی ہوں گی: فيه طير اعناقها كاعناق الجزر.

﴿لم يعمل السوء﴾ سوء مفعولیت کی بنا پر منصوب ہے معنی گناہ ملاعلی قاریؒ نے محدث مظہر کا قول نقل کیا ہے کہ: ذنب کا تعلق صرف حقوق اللہ سے ہوتا ہے، حقوق العباد میں نافرمانی پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ: بچہ کسی مسلمان کا مال ضائع کردے یا اسے قتل کردے یا چوری کرلے تو تاوان و دیت اس سے بھی لی جائے گی اور چوری کا مال بھی واپس کرنا ہوگا ہاں ہاتھ نہیں کٹے گا۔

﴿ولم يدر كه﴾ "ہ" ضمیر غلام کی طرف راجع ہے اور هو ضمیر مستتر سوء کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی اس کے برائی میں مبتلا ہونے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے جب کہ اس نے تکلیف کا زمانہ ہی نہیں پایا۔

﴿او غیر ذالك﴾ ملا علی قاریؒ نے اس کی متعدد نحوی ترکیبیں نقل کی ہیں، لیکن ان میں سے تین زیادہ قرین قیاس ہیں:

۱۔ واؤ مفتوح راء مضموم اور کاف مکسور ہے تقدیر عبارت یوں گی: اتعتقد ین ما قلت والحق غیر ذالك وھو عدم الجزم بکونه من اھل الجنة تو اس صورت میں واؤ حالیہ ہوا۔

۲۔ دوسری ترکیب انہوں نے یہ نقل کی ہے کہ ہمزہ استفہام تو انکاری ہے واؤ عاطفہ ہے جس کا معطوف محذوف ہے اور غیر ضمیر کے باعث مرفوع ہے، اب تقدیر عبارت یوں ہوگی: أوقع ھذا ویحتمل غیر ذلك .

۳۔ علامہ طیبیؒ نے ایک تیسری توجیہ یہ کی ہے کہ: یہاں او، بل کے معنی میں ہے اور خود قرآن میں اس کی نظیر موجود ہے: مأة الف اویزیدون تو عبارت یہ ہوئی: بل غیر ذلك محتمل ملا علی قاریؒ نے پہلی ترکیب کو اوروں کی نسبت صحیح اور مشہور قرار دیا ہے، سنن نسائی کے طریق میں صراحت ہے کہ: یہ جنازہ آپ کے پاس لایا گیا اور نماز پڑھانے کے بعد حضرت عائشہؓ کی حضور ﷺ سے گفتگو ہوئی۔

کفار کی نابالغ اولاد کا مسئلہ

حدیث کے ضمن میں ایک معرکۃ الآراء بحث کفار و مشرکین کے نابالغ بچوں سے متعلق ہے آیا وہ معصوم و غیر مکلف ہونے کی بنیاد پر جنت کے مستحق ہوں گے، یا اپنے آباء واجداد کے تابع ہوکر جہنم میں جائیں گے، ملا علی قاریؒ سات مذاہب نقل کرتے ہیں، ۱: انھم من اھل النار تبعًا للابوین ۲: اھل الجنة نظرًا الی اصل الفطرة ۳: خدم اھل الجنة ۴: یکونون بین الجنة والنار لا معذبین ولا منعمین ۵: من علمه الله تعالٰی ان یومن ویموت علیه ان عاش ادخله الله الجنة ۶: من علمه انه یفجر ویکفر ادخله النار ۷: التوقف وعدم القطع بشیٔ (مرقاۃ قدر فصل اول) امام نوویؒ کی تصریح کے مطابق اصولاً یہاں تین رائیں پائی جاتی ہیں۔ واما اطفال المشرکین ففیھم ثلثة مذاھب .

سکوت کا موقف

۱۔ امت کا ایک طبقہ اطفال مشرکین کے بارے میں توقف اور کف لسان کا قائل

ہے، انہیں جنتی یا دوزخی قرار دینا اس کے نزدیک صحیح نہیں، یہ لوگ اللہ: اعلم بما کانوا عاملین (متفق علیہ) اور حدیث باب کے جملے: اوغیر ذلك یا عائشة سے استدلال کرتے ہیں، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے: بذل المجھود باب ذراری المشرکین میں ملاعلی قاریؒ کے حوالے سے اسی کو اکثر اہل سنت والجماعت کا مذہب قرار دیا ہے، اور مجالس حکیم الاسلام میں امام ابوحنیفہؒ کا بھی یہی قول بتایا گیا ہے، علامہ سندھیؒ بھی میں اسی کو احوط واسلم قرار دیتے ہیں اور انہیں امام نوویؒ کا یہ دعوی تسلیم نہیں کہ اطفال مشرکین کے جنتی ہونے پر علماء امت کا اجماع ہو چکا ہے، لیکن تورپشتی اور ابن حجر مکی کا کہنا ہے کہ: یہ ارشادات اس وقت کے ہیں جب کہ اطفال مشرکین کی بابت کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، چنانچہ وہ اس کے خلاف نہیں کہ اب وہ اصح قول کے مطابق جنتی ہیں: هذا قبل ان ینزل فیهم شئ فلا ینافی ان الاصح انهم من اهل الجنة (مرقات کتاب القدر فصل اول) اب رہا: اوغیر ذلك سے استدلال کرنا، تو امام نوویؒ فرماتے ہیں: نهاها عن المسارعة الی القطع من غیر ان یکون عندها دلیل قاطع[1] یعنی تنبیہ کی وجہ جلد فیصلہ کرنے کی ممانعت تھی، حالانکہ اس موقف کی حضرت عائشہؓ کے پاس کوئی منصوص دلیل نہیں تھی۔

دوزخی ہونے کی رائے

۲۔ اس سلسلہ میں دوسرا اصولی موقف یہ ہے کہ: عہد طفولیت میں انتقال کرنے والے کفار کے تمام بچے اپنے آباء واجداد کے تابع ہو کر ہمیشہ کے لئے جہنم میں بھیج دیئے جائیں گے، ان حضرات کا استدلال سورۃ نوح کی آیت: ربّ لاتذر علی الارض من الکافرین دیّارا انك ان تذرهم یضلوا عبادك ولا یلدوا الا فاجرًا کفارا سے ہے، وہ کہتے ہیں، آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ کافر کافر ہی کو پیدا کرتا ہے، اسی لئے حضرت نوح نے کفار کے ساتھ ان کے بچوں کی بھی تباہی وبربادی کی دعاء کی، تو جس طرح وہ دنیا میں تابع ہو کر برباد ہوئے اسی طرح آخرت میں بھی تابع ہو کر وہ جہنم میں جائیں گے، ان کا دوسرا استدلال حضرت خدیجہؓ کی روایت سے ہے: قالت یا رسول الله این اطفالی منك قال فی الجنة قالت

[1] صحیح مسلم ج:۲/۳۳۷

فاطفالی من غیرك قال فی النار یہاں صراحتاً اولاد مشرکین کو جہنمی قرار دیا گیا، تیسرا استدلال سنن ابی داؤد: **باب ذرا ری المشرکین** کی روایت: **الوائدة والموؤدة فی النار** سے ہے کیونکہ عرب زمانہ جاہلیت میں کم سن اور نومولود بچیوں ہی کو زندہ درگور کیا کرتے تھے اس حدیث میں انہیں کے جہنمی ہونے کی صراحت ہے ان نقلی دلائل کے علاوہ یہ حضرات ایک عقلی دلیل بھی دیتے ہیں، اور وہ یہ کہ اولاد مشرکین اگر واقعۃً مسلمان ہیں تو اہل ایمان کی طرح نماز جنازہ پڑھ کر انہیں دفن کیوں نہیں کیا جاتا، خوارج میں فرقہ ازارقہ اس موقف کا بڑی شدت کے ساتھ قائل ہے۔

ان کے دلائل کا جواب

حضرت نوح علیہ السلام کی بددعاء سے ان حضرات کا استدلال درست نہیں حضرت نوحؑ کو جب یہ بتایا گیا: **لن یؤمن من قومك الامن قدامن** (ہود/۳۶) تو آپ نے ان کے بچوں تک کے لئے تباہی کی دعاء کی کیونکہ اب ایمان کی کسی سے توقع نہ تھی چنانچہ علامہ آلوسی نے روح المعانی (جز ۲۹/۸۰) میں حضرت قتادہ، محمد بن کعب اور ربیع بن زبیر وغیرہ سے نقل کیا ہے: **مَا دَعَاعلیهم الا بعد ان اخرج اللّٰہ تعالٰی کل مؤمن من اصلابهم واعقم ارحام نساءهم** یعنی جب باری تعالیٰ نے ان کی نسلوں سے ہر مومن کو نکال لیا اور ان کی عورتوں کے رحم اہل ایمان کے لئے بانجھ ہوگئے تو پھر حضرت نوحؑ نے ان کو بددعاء دی، اس سے پتہ چلا کہ ان کے بچوں کی تباہی تابعیت کی بناء پر نہیں بلکہ فطرت کے مسخ ہونے اور آئندہ ظاہر ہونے والے فسق وفجور کی بنیاد پر تھی، لہٰذا مخصوص واقعہ سے عموم پر استدلال درست نہیں۔

اب رہا دوسرا استدلال تو وہ حد درجہ کمزور ہے کیونکہ حضرت خدیجہؓ کی حدیث نہایت ضعیف بلکہ موضوع بھی ہوسکتی ہے، چنانچہ علامہ ابن حزم ظاہری لکھتے ہیں: **اما حدیث خدیجة فساقط مُطرَح لم یروها قط من فیه خیر**[1]

حضرت خدیجہؓ کی حدیث اس درجہ ساقط و ناقابل اعتبار ہے کہ کسی بھی صحیح راوی نے اس کی روایت نہیں کی لہٰذا مضبوط اور مستند احادیث کے ہوتے ہوئے احکام کے باب میں ایسی روایت

[1] کشف الحاجہ ص: ۱۷۴.

سے استدلال کرنا درست نہیں، تیسرے استدلال کے متعدد جواب دیئے گئے ہیں، پہلا جواب ابن عبدالبر نے دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ: یہ حدیث ابومعاذ کے علاوہ زہری سے کسی نے روایت نہیں کی اور وہ ناسی الحدیث ہیں، اس لئے استدلال درست نہیں ابن عبدالبر کا یہ جواب محل نظر ہے، کیونکہ روایت: **ابراهيم بن موسى عن ابن ابي زائدة عن ابي عن عامر** کی سند سے سنن ابی داوٗد: **باب في ذراري المشركين** میں موجود ہے اور مصنف نے دوسری سند: **قال يحيىٰ قال ابي فحدثني ابواسحاق ان عامرًا حدثه بذلك عن علقمة عن ابن مسعود عن النبي صلى الله عليه وسلم** نقل کی ہے، دونوں میں ابومعاذ اور زہری کا کہیں پتہ نہیں، دوسرا جواب دیتے ہوئے ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ: ممکن ہے یہ موؤدہ بالغہ ہو، چنانچہ ابن حزم کا کہنا ہے کہ یہاں علی الاطلاق حکم بیان نہیں کیا گیا، بلکہ اس کا مورد سلمہ بن یزید کی بہن تھی، جو بالغ ہو چکی تھی، اس لئے استدلال درست نہیں صاحب تنظیم الاشتات نے **اشعة اللمعات** اور **التعليق الصبيح** کے حوالے سے تیسرا جواب یہ نقل کیا ہے کہ یہاں وائدہ سے دایہ اور موؤدہ سے موؤدہ لہا مراد ہے، یعنی لڑکی ماں تو اب کوئی اشکال نہیں، اب رہا عقلی استدلال تو اس میں کوئی وزن نہیں، کیونکہ نماز جنازہ اور تدفین دنیاوی امور ہیں، جو تعامل نہ ہونے کی وجہ سے ان پر جاری نہیں ہوں گے، جب کہ فطرت وعصمت اور نجات ومغفرت کا حکم اخروی ہے اس لئے استدلال کا کوئی موقع نہیں، اس صورت میں تو بہت سے اشکالات کھڑے ہو جائیں گے مثلاً ایک شخص علانیہ مسلمان تھا، موت کے بعد کافر ورثاء نے اس کا جنازہ پڑھا نہ ہی اسلامی طریقہ پر دفن کیا تو کیا اس کو بھی جہنمی کہا جائیگا۔

جمہور کا موقف

۳ ان دو مسلکوں کے برعکس جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ اطفال مشرکین کفر وتکذیب میں آباءواجداد کے تابع نہیں بلکہ منصوص فطری سلامتی کی بنیاد پر آخرت میں انکو مسلمانوں کے زمرہ میں شمار کر کے جنت عطاء کی جائے گی اس سلسلہ میں وہ مندرجہ ذیل نقلی دلائل پیش کرتے ہیں۔

۱ : **وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰى**

اَنۡفُسِهِمۡ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ قَالُوا بَلٰى (اعراف/۱۷۲) وجہ استدلال یہ ہے کہ: آدم کی پوری نسل اپنے اس اقرار ایمانی کی بنا پر نفس الامر میں مومن ہے اور بلوغ کے بعد کافرانہ و باغیانہ افعال ہی اس اقرار و معاہدہ کو متأثر کر سکتے ہیں، نابالغ بچوں کا اقرار جوں کا توں باقی ہے، اس لئے وہ جنتی ہوں گے۔

۲ : وَلَا تَكۡسِبُ كُلُّ نَفۡسٍ اِلَّا عَلَيۡهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى یہ آیت تابع ہونے کی صراحتاً تردید کر رہی ہے۔

۳: لَا يَصۡلٰهَا اِلَّا الۡاَشۡقَى الَّذِىۡ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (اللیل/۱۶) جہنم کا وہی مستحق ہوگا، جس نے امور غیبیہ تعلیمات دین اور وحی الٰہی کی تردید و تکذیب کی اور حق سے اعراض کیا ہو اطفال مشرکین چونکہ غیر مکلف ہیں، اس لئے تکذیب و تولی کا ان پر اطلاق نہیں ہوگا۔

۴: وما كنا معذبين حتى نبعث رسولاً (بنی اسرائیل/۱۵) ظاہر ہے کہ رسول کو نابالغ بچوں کی جانب نہیں بھیجا جاتا لہٰذا ان کی تعذیب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۵: فطرة الله التى فطر الناس عليها (روم/۳۰) فطرت سے مراد طبعی سلامتی ہے جو ایمان و اسلام کی ہی ایک تعبیر ہے نابالغ بچے کیوں کہ فطرت ہی پر مرے ہیں، اس لئے ان کے جہنم میں جانے کی کوئی وجہ نہیں یہی مضمون بخاری کی حدیث میں آیا ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه سلم ما من مولو دالا يولد على الفطرة فابواه يهود انه او ينصرانه (قدر/۳)

امام بغوی نے مستخرج البرقانی علی البخاری کے حوالے سے شرح السنہ (۱/۱۵۶) میں سمرہ بن جندب کی روایت نقل کی ہے، جس میں صراحت ہے کہ اولاد مشرکین بھی اسی تکوینی فطرت کے حکم میں ہیں، فرمایا: "كل مولود يولد على الفطرة فقال بعض الناس يا رسول الله واولاد المشركين؟ قال واولاد المشركين"

۶: سنن ابی داؤد اور مسند احمد (۵/ ۵۸) میں روایت ہے کہ ایک صحابیہؓ نے عرض کیا یا رسول الله من فى الجنة آپ نے جواباً ارشاد فرمایا: النبى فى الجنة والشهيد فى الجنة والموؤدة فى الجنة حافظ ابن حجر نے اسے حسن قرار دیا ہے، یہاں زندہ درگور کی

جانیوالی لڑکی کے بارے میں جنتی ہونے کی صراحت ہے، اسی پر دوسرے اطفال مشرکین کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

۷ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ: حضرت ابراہیمؑ کو رسول اللہ ﷺ نے معراج میں دیکھا: **راہ النبیؐ فی الجنة وحوله اولاد الناس قالوا یا رسول اللہ ﷺ واولاد المشرکین قال واولاد المشرکین** بخاری کی دوسری روایت میں سمرہ بن جندبؓ کے حوالہ سے حضور ﷺ کا ایک طویل خواب منقول ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ سے متعلق ان بچوں کی بابت آپ نے فرمایا: **اما الولد ان الذین حوله فکل مولود مات علی الفطرة فقال بعض المسلمین یا رسول اللہ واولاد المشرکین فقال رسول اللہ ﷺ واولاد المشرکین** انبیاء کا خواب وحی کے حکم میں ہوتا ہے، اس لئے دونوں احادیث کی رو سے اولاد مشرکین جنتی ثابت ہوتے ہیں۔

۸ امام بغویؒ نے شرح السنہ (۱/ ۱۵۷) میں **معمر عن قتادة عن الحسن** کی سند سے حضرت سلمان کا یہ اثر نقل کیا ہے: **ان سلمان قال اولاد المشرکین خدم اهل الجنة** اسی طرح کا دوسرا اثر ابوداؤد طیالسی مسند بزار اور طبرانی میں حضرت سمرہؓ سے اور مسند ابویعلی میں حضرت انسؓ سے منقول ہے: **عن سمرة قال اولاد المشرکین خدم اهل الجنة** حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو گرچہ ضعیف قرار دیا ہے لیکن وہ شاہد اور متابع تو پھر بھی بن سکتا ہے۔

۹ مسند ابویعلی میں حضرت انسؓ سے اور مسند بزار میں ابن عباس سے مرفوع روایت ہے: **قال ؑ سالت ربی اللاهین من ذریة البشر الایعذبهم فاعطانیهم،** **لاهین** سے نابالغ بچے مراد ہیں کہ: حضور کی دعاء کے باعث وہ عذاب سے محفوظ کردیئے گئے حافظ ابن حجر نے اس سند کو حسن قرار دیا ہے۔

(۱۰) اس سلسلے کی سب سے مکمل وواضح روایت حضرت عائشہ کی ہے مصنف عبدالرزاق میں منقول ہے: **عن أبی معاذ عن الزهری عن عروة عن عائشة قال سألت خدیجة النبیؐ عن اولاد المشرکین فقال هم مع آبائهم ثم سألته بعد ذلك قال اللہ اعلم بما کانوا عاملین ثم سألتهٗ بعد ما استحکم الاسلام فنزل ولا تزر**

وازرة وزر اخریٰ قال هم علی الفطرة او قال هم فی الجنة روایت گرچہ ضعیف ہے، لیکن زیر بحث مسئلے میں وہ تمام نصوص ودلائل کا نچوڑ معلوم ہوتی ہے، امام نوویؒ نے انہی دلائل کی بنیاد پر اسی کو صحیح اور اہل تحقیق کا مذہب قرار دیا ہے۔

یہاں پہنچ کر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مسئلہ تقدیر کی طرح ذراری المشرکین بھی ایسا ہی موضوع ہے، جس پر گفتگو فتنوں کا دروازہ کھول دیتی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رسولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسلَّمَ لا يَزالُ امرُ هٰذهِ الامةِ مُوامرًا اَوْقالَ مقاربًا مَالَمْ يتكلمُوْا فِي الولدانِ والقدرِ (اخرجه الحاكم فی المستدرك وقال صحيح علی شرط الشيخين وافقه الذهبی)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس امت کا معاملہ اس وقت تک درست رہے گا، جب تک مسلمان دو مسئلوں میں گفتگو نہ کریں، نابالغ بچوں کی نجات کا مسئلہ دوم تقدیر کا مسئلہ۔

حدیث باب صحیح مسلم (قدر/۶) سنن نسائی (جنائز/۵۷) سنن ابی داود (سنہ/۱۷) میں بھی موجود ہے، ابن ماجہ اور صحیح مسلم کی سند ایک ہے۔

(۸۴/۸) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ اَبِي شَيْبَةَ وَعَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَا ثَنَا وَكِيعٌ ثَنَا سُفْيَانُ الثَّوْرِيُّ عَنْ زِيَادِ بنِ اسْمَاعِيلَ الْمَخْزُومِيِّ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبَّادِ بن جَعْفَرٍ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ جاءَ مُشْرِكُوْ قُرَيْشٍ يُخَاصِمُوْنَ النَّبِيَّ فِي الْقَدْرِ فَنَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بقدرٍ.

مشرکین قریش رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر تقدیر کی بابت جھگڑنے لگے، تو یہ آیت نازل ہوئی، جس دن وہ اوندھے منہ آگ میں گھسیٹے جائیں گے (کہا جائے گا) آگ کا مزہ چکھو ہم نے ہر چیز پہلے ٹھہرا کر بنائی ہے۔

سحب (ف) سحبًا، زمین پر گھسیٹنا مجہول سے جمع کا صیغہ ہے، ذوقوا، ذوق سے فعل امر جمع ہے، سقر، دوزخ کا نام ہے اور غیر منصرف ہے، کل شیٔ، مفعول مقدم ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، تمام قراء اس کے نصب پر متفق ہیں، لیکن ابو السماک نے مبتداء

قرار دے کر اسے مرفوع بھی پڑھا ہے، زمانہ جاہلیت کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ: عرب بھی قدر کے قائل تھے، یہاں قدر سے کیا مراد ہے امام نووی تحریر فرماتے ہیں: ”المراد بالقدر هنا القدر المعروف وهو ماقدره الله وقضاه وسبق به علمه وارادته واشار الباجي الى خلاف هذا وليس كما قال وفي هذهٖ الآية الكريمة والحديث تصريح باثبات القدر وانه عام في كل شئ فكل ذلك مقدر في الازل معلوم لله مراد له“ یہاں قدر سے معروف تقدیر ہی مراد ہے، جس کو مقدر کر کے اللہ نے فیصلہ فرمایا اور وہ علم الٰہی میں موجود ہے، اس سلسلے میں علامہ باجی نے جو کچھ کہا ہے، وہ صحیح نہیں ہے تو اس آیت اور حدیث میں تقدیر کے ثبوت کی تصریح ہے کہ: وہ ہر چیز میں عام ہے اور تمام چیزیں اللہ کے نزدیک مقدر معلوم اور مراد ہیں (مسلم قدر/۴)

امام نوویؒ کی طرح اکثر ائمہ نے آیت سے تقدیر ہی مراد لی ہے، یعنی ہم نے دنیا کی ہر چیز کو تقدیر ازل کے مطابق بنایا ہے، اور ازل میں ہی اس کی مقدار، زمان ومکان اور بڑھنا گھٹنا لکھ دیا گیا ہے علامہ باجی کی طرح دوسرے علماء نے لغوی معنی مراد لے کر یہ مطلب بیان کیا ہے کہ: باری تعالیٰ نے حکیمانہ انداز میں ہر چیز کو ہیئت، صورت، حجم، فطرت، صلاحیت اور مختلف المزاج بنایا ہے اور زمانے کی ضرورت کے لحاظ سے اشیاء میں تنوع اور اختراع ظاہر ہوتا ہے...... حدیث صحیح مسلم (قدر/۴) اور جامع ترمذی (قدر/ ۱۶) میں بھی آئی ہے مسلم اور ابن ماجہ کی سند ایک ہے۔

(۹/۸۵) حَدَّثَنَا أَبُوْبَكْرِبْنُ أَبِیْ شَيْبَةَ قَالَ ثَنَا مَالِكُ بْنُ اِسْمَاعِيْلَ ثَنَا يَحْيٰى بْنُ عُثْمَانَ مَوْلٰى اَبِیْ بَكْرٍ ثَنَا يَحْيٰى بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ ابِی مُلَيْكَةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهُ دَخَلَ عَلٰى عَائِشَةَ فَذَكَرَ لَهَا شَيْئًا مِنَ الْقَدْرِ فَقَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ تَكَلَّمَ فِی شَیْءٍ مِنَ الْقَدْرِ سُئِلَ عَنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ لَمْ يَتَكَلَّمْ فِيْهِ لَمْ يُسْئَلْ عَنْهُ.

جس شخص نے قضا و قدر کی بابت ذرا بھی گفتگو کی قیامت کے دن اس سے باز پرس کی جائے گی اور جس نے اس سلسلے میں کچھ نہ کہا اس سے سوال نہیں ہوگا۔

قضا وقدر عالم غیب کی ایسی حقیقتیں ہیں، جن کا ادراک عالم شہادت میں قطعاً ممکن نہیں، کیونکہ انسان کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے، وہ عالم بالا تو درکنار، اپنے گردوپیش کی اشیاء کے بھی حقائق کو ذرّہ برابر نہیں سمجھ سکتا، اس لئے اس محدود وقاصر عقل سے امور غیب کو جاننے کی کوشش کرنا علامہ ابن خلدون کے بقول ایسا ہی ہے، جیسا کہ: کوئی دیوانہ سونا تولنے کے ترازو سے پہاڑ کو تولنے کا ارادہ رکھے، یہی وجہ ہے کہ پچھلی امتوں میں جن لوگوں نے بھی مسئلہ تقدیر میں بحث ومباحثہ شروع کیا، تو وہ اسے حل تو کیا کرپاتے شکوک وشبہات میں الجھ کر اپنا دامن ایمان بھی تارتار کر بیٹھے رسول اللہ ﷺ نے اسی لئے صحابہ کرامؓ کو خصوصاً اس مسئلے میں قیل وقال کی بالکل اجازت نہیں دی، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ کی روایت ہے کہ: ایک مرتبہ آپ جب باہر تشریف لائے، تو لوگ قضا وقدر کی بابت بحث ومباحثہ میں مشغول تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ انور ایسا سرخ ہوگیا گویا اس پر سرخ انار نچوڑ دیا گیا ہو، پھر فرمایا: بهذا امرتم اولهذا خلقتم تضربون القرآن بعضه ببعض بهذا هلكت الأمم قبلكم حدیث باب بھی انہیں تعلیمات کا ایک حصہ ہے، جن میں آپ نے امت کو تقدیر کی بابت آگاہ فرمایا ہے، امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ: حدیث میں تكلم فى القدر کے بجائے تكلم من القدر کے الفاظ آئے ہیں، جو قدر کی بابت قلت کلام اور ممانعت میں مبالغہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں، یعنی اس باب میں لب کشائی ہی نہ کی جائے: هذا ابلغ من ان يقال فى القدر لافادة المبالغة فى القلة والنهى عنه شارحین حدیث کے نزدیک یہ ممانعت ہر قسم کی گفتگو کو شامل ہے، چاہے، اس کے ذریعہ مسئلہ تقدیر کا اثبات ہو، نفی ہو، حق کا اظہار ہو، یا باطل کا ابطال ہو، بہرصورت (ضرورت شدیدہ کو چھوڑ کر) گفتگو درست نہیں، مولانا ادریس کاندھلوی فرماتے ہیں کہ: جب معمولی کلام کی اجازت نہیں، تو مسئلہ میں غور وخوض اور بلاضرورت بحث ومباحثہ کی ممانعت تو بدرجہ اولیٰ ہوگی، اس احتیاط اور ممانعت کی علت کیا ہے، تو تجربات کی روشنی میں اس کا جواب یہ ہے کہ یہ چیز عملی قوت کو برباد کرکے شکوک وشبہات کے بھنور میں لا مارتی ہے، تو گویا حدیث کا پہلا ٹکڑا وعید ہے اور دوسرا بشارت ہے، ان لوگوں کے لئے جو تقدیر پر ایمان لاکر نجات ومغفرت کی فکر کرتے ہیں، لایعنی بحثوں میں نہیں پڑتے، علامہ طیبیؒ، سندھیؒ،

اور مولانا کاندھلویؒ کا کہنا ہے کہ حدیث میں سئل عنه اور لم يسئل عنه سے مراد تہدید وعید ہے یعنی اس شخص کو ڈرایا دھمکایا جائے۔

حدیث باب کی سند میں یحییٰ بن یحییٰ محدثین کے نزدیک بالاتفاق ضعیف ہیں، اس لئے حافظ بوصیری نے زوائد بن ماجہ (۵۲/۱) میں اسے هذا اسناد ضعيف لاتفاقهم على ضعف يحيٰى بن عثمان قرار دیا ہے۔

قال ابو الحسن القطان حدثناه حازم بن يحيٰى ثنا عبدالملك بن سنان ثنا يحيٰى بن عثمان فذكر نحوه .

(۱۰/۸۶) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا أَبُوْ مَعَاوِيَةَ ثَنَا دَاوُدُ بْنُ أَبِيْ هِنْدٍ عَنْ عَمرو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ: خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى اَصْحابِهِ وَهُمْ يَخْتَصِمُوْنَ فِي الْقَدْرِفَكَانَّمَا يُفقأُ فِي وَجْهِهِ حَبُّ الرُّمَّانِ مِنَ الْغَضَبِ فَقَال: بِهٰذَا: أُمِرْتُمْ اَوْ لِهٰذَا خُلِقْتُمْ تَضْرِبُوْنَ الْقُرْآنَ بَعْضَه بِبَعْضٍ بِهٰذَا هَلَكَتْ الْأُمَمُ قَبْلَكُمْ ، قَالَ : فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بنِ عَمرو : مَا غَبَطْتُ نَفْسِيْ بِمَجْلِس تَخَلَفْتُ فِيْهِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مَا غَبَطْتُ نَفْسِيْ بِذَالِكَ الْمَجْلِسِ وَتَخَلُّفِيْ عَنْهُ.

رسول اللہ ﷺ جب صحابہؓ کے پاس تشریف لائے، تو وہ قضاء وقدر میں بحث ومباحثہ کر رہے تھے، (یہ دیکھ کر) آپ کو غصہ آیا اور چہرۂ انور اس طرح سرخ ہوگیا، گویا اس پر انار نچوڑ دیا گیا ہو، پھر فرمایا کہ تمہیں یہی حکم دیا گیا ہے؟ یا تم اسی لئے پیدا ہوئے ہو؟ تم قرآن کی ایک آیت کو دوسری سے لڑاتے ہو، (یاد رکھو!) تم سے پہلی امتیں اسی وجہ سے ہلاک ہوگئیں، عبداللہ بن عمرو کا کہنا ہے کہ: مجھے رسول اللہ ﷺ کی ہر اس مجلس پر رشک آیا جس میں میں حاضر نہ ہو سکا، لیکن اس مجلس کی غیر حاضری پر مجھے کوئی افسوس نہیں۔

نبی اپنی امت پر حد درجہ شفیق ہوتا ہے، اس لئے جب آپ نے دیکھا کہ: حضرات صحابہؓ سے ایسا عمل سرزد ہو رہا ہے، جو نہایت خطرناک اور پچھلی امتوں کی تباہی کا باعث ہے تو از راہ شفقت وتعلق آپ کو نہایت غصہ آیا۔

﴿وھم یختصمون فی القدر﴾ علامہ سندھیؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں: بالاثبات والنفی وکان منھم کلا کان یستدل بما یناسب مطلوبہ من الآیات ولذلك انکرعلیھم بقولہ تضربون القرآن بعضہ ببعضٍ[1] وہ لوگ تقدیر کے اثبات وانکار میں جھگڑ رہے تھے اوران میں سے ہرایک اپنے موقف کی تائید میں قرآنی آیات سے بھی استدلال کررہاتھا، اسی لئے آپؐ نے: "تضربون القرآن بعضہ ببعض" کہہ کرانہیں اس چیز سے روکا ملاعلی قاریؒ نے اس تخاصم کی مزید وضاحت کی ہے فرماتے ہیں۔

فیقول بعضٌ اذا کا ن الکُلُّ بالقدرِ فلم الثوابُ والعقابُ کما قالت المعتزلۃُ والاخرُ یقول فما الحکمۃ فی تقدیرِ بعضٍ للجنۃِ وبعض للنارفیقُول الاخر لان لھم فیہ نوع اختیار کسبی فیقول الآخرفمن اوجد ذٰلك الاختیار والکسب واقدرھم علیہ وما أشبہ ذٰلك (مرقاۃ، باب القدر فصل ثانی)

یعنی بعض صحابہؓ کا کہنا تھا کہ: جب ہر چیز مقدر ہے تو ثواب وعقاب کے کیا معنیٰ؟ جیسا کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے جب کہ دوسرے لوگوں کا اشکال یہ تھا کہ کچھ لوگوں کے لئے جنت اور کچھ کے لئے دوزخ مقدر کرنے میں کیا حکمت ہے؟ اس کا جواب جب اس نے یہ دیا کہ بندوں کو کسب واختیار حاصل ہے، تو دوسرے نے اس دلیل کو توڑتے ہوئے کہا کہ یہ کسب اختیار کس نے پیدا کیا اوراس پر بندوں کو کس نے قدرت دی وغیرہ وغیرہ۔

﴿فکأنما یفقأ فی وجھہ حب الرمان من الغضب﴾

فقأ، یفقأ، فقاءً، (ف) پھاڑنا، نچوڑنا۔مجہول واقع ہے، ترمذی کی روایت میں یہ الفاظ ملتے ہیں: فغضب حتی احمر وجھہ حتی کانما فقیٔ فی وجنتیہ حب الرمان یہ چہرے کی سرخی کی ایک بلیغ تعبیر ہے، جو نبوی جلال وغضب کی شدت کو ظاہر کرتی ہے، اورحدیث باب کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی منقول ہے، ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ: یہاں غصے کی وجہ تھی کہ: مسئلے تقدیر اسرار الٰہی میں سے ہے، جس کی جستجو وادراک کرنا ممنوع ہے: انما غضب لان القدر سرٌّ من اسرار اللّٰہ تعالٰی وطلب سر اللّٰہ منھی۔[2]

---

[1] سنن مصطفیٰ ص:۶۵ [2] مرقاۃ باب الایمان بالقدر فصل ثانی حدیث ۵

﴿بهذا أمرتم أو لهٰذا خلقتم﴾ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ یہاں ہمزۂ استفہام انکاری ہے، علامہ سندھی اسی کو مزید کھول کر لکھتے ہیں هذا البحث على القدر واختصام فيه، هل هو المقصود من خلقكم؟ او هو "الذى وقع التكليف به حتیٰ اجترأتم عليه؟ يريد انه ليس بشيء من الامرين فاى حاجة اليه" کیا تقدیر میں غور وخوض اور جھگڑنا ہی تمہاری تخلیق کا مقصد ہے؟ کیا اسی کا مکلّف بنایا گیا ہے، جو اس مسئلے میں تم اتنی جرأت کر رہے ہو؟ فرمان رسالت کی غرض یہ ہے کہ: دونوں میں سے کوئی بھی تمہارا مقصود نہیں تو بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے، ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ یہ ایک نہایت نازک مسئلہ ہے، جس میں غور وخوض سے انسان قدری یا جبری ہونے سے نہیں بچ سکتا: "ولان من يبحث فيه لا يامن من ان يصير قدريا او جبريًا" ترمذی میں: "بهذا أمرتم" کے ساتھ: "ام بهذا ارسلت اليكم" کے الفاظ آئے ہیں۔

﴿بهٰذا هلكت الامم قبلكم﴾ ترمذی میں: انما هلك من كان قبلكم حين تنازعوا فى هذا الامر کے الفاظ ہیں، یہی تقدیر میں غور وخوض کی ممانعت کی علت ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ: یہ ایسا سنگین جرم ہے، جس کے سرزد ہوتے ہی عذاب وہلاکت مسلط ہو جاتے ہیں اور کوئی مہلت نہیں ملتی، ترمذی میں مزید یہ کلمات بھی ملتے ہیں: عزمت عليكم عزمت عليكم ان لا تنازعوا فيه.

﴿ما غبطت...... الخ﴾ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص ایک قدیم الاسلام صحابیؓ ہیں، جو رسول اللہ ﷺ کی احادیث کو لکھنے کا اہتمام رکھتے تھے، اس لئے وہ کسی مجلس میں نہ پہنچ پاتے اور معلوم ہوتا کہ آپؐ نے فلاں فلاں قیمتی بات ارشاد فرمائی، تو انہیں نہایت رنج ہوتا، لیکن کہتے ہیں کہ: اس مجلس کا مجھے کوئی غم نہیں ہوا بلکہ غیر حاضری کی کچھ خوشی ہی ہوئی کیونکہ اس مجلس کے حاضرین پر رسول اللہ ﷺ نے غضب کا اظہار فرمایا، صحابیؓ کی غیر حاضری پر خوشی بالکل ایسی ہی ہے جیسے کہ: بنی جزیمہ کے قتل کے بعد جب رسول اللہؐ نے خالد بن ولید کے طرز عمل سے براُت کا اظہار کیا، تو انہوں نے بھی یہ تمنا کی کہ: کاش میں آج کے بعد ایمان لایا ہوتا اور رسول اللہؐ کے غصے سے بچ جاتا اسی طرح کا ایک واقعہ اسامہ بن زید کا بھی ہے، جب رسول اللہ ﷺ

نے ان سے: هل لا شققت قلبه کہا تو انہوں نے بھی یہی تمنا کی۔

عمرو بن شعیب کی تحقیق

بوصیری نے حدیث کو زوائد (۵۳/۱) میں اسناده صحیح، رجاله ثقات کہا ہے، روایت ترمذی میں بھی منقول ہے، امام نے اس سند کو غریب قرار دیا ہے جبکہ ابن ماجہ کی حدیث عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده سے مروی ہے، یہ بڑی مشہور مگر مختلف فیہ سند ہے جس کی ضمیر اور اعتباریت میں محدثین نے کافی بحثیں کی ہیں، ابیہ کی ضمیر کا مرجع تو بلاشبہ عمرو ہیں جبکہ جدہ کی ضمیر راجح قول کے مطابق شعیب کی طرف لوٹتی ہے، حافظ نے تقریب (۲۸۰۶) میں لکھا ہے ثبت سماعه من جده یعنی شعیب کا اپنے دادا عبداللہ بن عمرو صحابی سے سماع ثابت ہے جن کی وفات صحیح قول کے مطابق طائف میں ٹھیک واقعۂ حرہ کے دن ہوئی، ذہبی، نووی، سیوطی اور شیخ مجددی کی بھی یہی رائے ہے۔

(۸۷/۱۱) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ أَبِیْ شَيْبَةَ، وَعَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، قَالَا: حَدَّثَنَا وَكِيْعٌ، ثَنَا يَحْيٰى بْنُ أَبِیْ حَيَّةَ أَبُوْ جَنَابِ الْكَلْبِیُّ، عَنْ أَبِيْهِ ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ "لَاعُدْوٰی وَلَاطِيَرَةَ وَلَا هَامَةَ" فَقَامَ اِلَيْهِ رَجُلٌ أَعْرَابِيٌّ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! أَرَأَيْتَ الْبَعِيْرَ يَكُوْنُ بِهِ الجَرَبُ فَيُجْرِبُ الاِبِلَ كُلَّهَا ؟ قَالَ: "ذٰلِكُمُ الْقَدْرُ، فَمَنْ أَجْرَبَ الْأَوَّلَ؟

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چھوت چھات بدشگونی اور بدفالی کی کوئی حقیقت نہیں (یہ سن کر) ایک دیہاتی نے کھڑے ہو کر عرض کیا اے اللہ کے رسول آپ نے اونٹ تو دیکھا ہے؟ اگر اسے خارش ہوتی ہے، تو تمام اونٹوں کو اس میں مبتلا کر دیتا ہے، رسول اللہؐ نے فرمایا یہ بھی تقدیر ہے (اور ذرا یہ بتاؤ) پہلے اونٹ کو خارش میں کس نے مبتلا کیا؟

﴿لا عدوی﴾ عدا یعدو کا مصدر ہے، معنی تجاوز کرنا، پھر مستقلاً اس کا استعمال متعدی امراض کے لئے ہونے لگا یعنی انتقال الداء من المریض به الی الصحیح بوساطة ما توربشتی نے لکھا ہے: مجاوزة العلة من صاحبها الی غیره بالمجاورة والقرب" یعنی قرب واختلاط کی وجہ سے مریض کی بیماری کا دوسرے تک پہنچ جانا علامہ سندھیؒ، مولانا خلیل

احمد سہان پوری اور دوسرے شارحین نے بھی یہی قول نقل کیا ہے، اس مادے کا استعمال عربی میں افعال کے باب سے ہوتا ہے، مثلاً: **أعدى زيد بكرا من علة اوخلق** یعنی زید نے بکر کو اپنی کوئی بیماری یا عادت لگادی۔

تعدی امراض کی بحث

اس روایت سے تعدی کی نفی ہوتی ہے کہ: کوئی بیماری اڑ کر نہیں لگتی سب اللہ کے فیصلے کی پابند ہیں، چنانچہ ابن ماجہ (طب/۴۴) میں رسول اللہ ﷺ کا واقعہ منقول ہے: **اخذ بيد رجل مجذوم فادخلها معه في القصعة ثم قال كل ثقة بالله وتوكلا عليه** اور اسی طرح کا دوسرا واقعہ طبرانی میں منقول ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: **كان لي مولى، به هذا الداء فكان ياكل في صحافي ويشرب في اقداحي وينام على فراشي** لیکن دوسری طرف ایسی احادیث بھی موجود ہیں، جو صراحتاً تعدی کا پتہ دیتی ہیں۔

۱۔ صحیح بخاری (طب/۱۹) کی حدیث: **فر من المجذوم كما تفر من الأسد.**

۲۔ بخاری (طب/۵۴) صحیح مسلم (السلام/۲۶) میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت: **لا يورد الممرض على المصح.**

۳۔ صحیح مسلم (السلام/۲۹) میں اسی ضمن کا ایک واقعہ موجود ہے: **كان في وفد ثقيف رجل مجذوم فارسل اليه النبيﷺ انا قد بايعناك فارجع.**

۴۔ امام ابن ماجہ (طب/۴۴) میں حدیث نقل کی ہے: **لا تديموا النظر الى المجذومين** اس کی سند ضعیف ہے۔

پہلی حدیث میں جذامی کو دیکھ کر بھاگنے کی، دوسری میں بیمار اونٹوں کو تندرست اونٹوں سے بچانے کی، تیسری میں مجذوم سے اجتناب ومصافحہ نہ کرنے کی، اور چوتھی میں اس سے نظر تک بچانے کی تاکید ہے، جس سے اسلام میں تعدی کے اعتراف کا پتہ چلتا ہے اور دونوں قسموں کی احادیث میں کھلا تعارض نظر آتا ہے۔

پہلا موقف

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری کتاب الطب باب الجذام میں اس تعارض کو رفع کرنے

کے لئے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ تعدی کی نفی ناسخ اور اختلاط سے اجتناب وفرار منسوخ ہے، عیسی بن دینار مالکی کا یہی موقف ہے، لیکن امام نووی نے دو بنیاد پر اس قول کی تردید کی ہے پہلی تو یہ نسخ اس جگہ پر ہوتا ہے، جہاں دونوں قسم کی احادیث میں تطبیق ممکن نہ ہو، یہاں یہ صورت نہیں بلکہ ہم نے جمع وتطبیق کر دی ہے: احدهما أن النسخ يشترط فيه تعذر الجمع بين الحديثين ولم يتعذر بل قد جمعنا بينهما[1] دوسری شرط تاریخ کو جاننا اور ناسخ کا مؤخر ہونا ہے، یہاں یہ چیز بھی مفقود ہے: الثاني انه يشترط فيه معرفة التاريخ وتأخر الناسخ وليس ذلك موجوداً هنا[2].

تطبیق وتوجیہ

نسخ کے بجائے یہاں دونوں طرح کی روایتوں میں تطبیق وتوفیق لازم ہے، امام نوویؒ: والجمع بينهما هو الصواب الذى عليه جمهور العلماء کہہ کر اس کی تائید کرتے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ یہاں زمانۂ جاہلیت میں مشہور تعدی کی نفی ہے کہ: فی نفسہ کوئی چیز مؤثر بالذات نہیں، سب اللہ کے فیصلہ کے تابع ہیں، لیکن جواز واستحباب فرار واجتناب کا بھی نکلتا ہے، کیونکہ اس کا مقصد تعدی کا خوف نہیں، بلکہ مجذوم کی دل شکنی سے بچنا ہے، تطبیق ہی کے ضمن میں یہ توجیہ بھی کی جاتی ہے کہ: "لاعدوی" کے مخاطب وہ لوگ ہیں، جن کا ایمان وتوکل مضبوط ہے، خواہ کتنے ہی بیمار ہوجائیں تعدی کو وہ اس کا سبب نہیں سمجھتے جب کہ فرمن المجذوم کے مخاطب وہ حضرات ہیں، جنہیں توکل کی یہ قوت حاصل نہیں خواہ کسی وجہ سے بیمار ہوں وہ اسے تعدی ہی سمجھیں گے، اس لئے عقیدے کی حفاظت کے لئے یہ حکم بھی دیا گیا۔

حافظ ابن حجر ملا علی قاریؒ اور علامہ عینی کی تفصیلی بحثوں کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے تعدی کی مطلقاً اور کلی نفی نہیں کی ہے، بلکہ ان کا مقصد اس جاہلی عقیدے پر چوٹ لگانا ہے، جس کی رو سے لوگ جاہلیت میں امراض کو مؤثر بالذات سمجھتے تھے، ورنہ اسباب عادیہ کے طور پر تو تعدی کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا، کیونکہ نظر وخیال سے بڑھ کر آج یہ مشاہدہ بن چکی ہے اور رسول کی حدیث مشاہدے کے خلاف نہیں ہوسکتی، دوسری صدی ہجری کے محدث امام ابن قتیبہ

---

[1] [2] شرح مسلم ۲/۲۳۰

نے تاویل مختلف الحدیث، (۸۱) میں، ابن قیم نے الطب النبوی (۵/۱۰۴) میں، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغۃ (۲/۱۹۵) میں اور حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ (۴/۲۸۷) میں یہی موقف اختیار کیا ہے، نیز امام بیہقی، ابن الصلاح، ابن رجب اور ابن مفلح وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے۔

﴿ولا طیرة﴾ ابن حجر کی تصریح کے مطابق وہ تطیر کا مصدر ہے، علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں: وأصله أنهم كانوا في الجاهلية اذا خرجوا لحاجة فان رأوا الطير طار عن يمينهم فرحوا به واستمروا واذا طار عن يسارهم تشاءموا به ورجعوا وربما هيجوا الطير لتطير فيعتمدوا ذٰلك یہ دراصل جاہلیت میں فال کا طریقہ تھا کہ کسی کام سے نکلتے اور پرندہ ان کے دائیں سمت پرواز کرتا تو اسے مبارک سمجھ کر خوش ہوتے اور کام جاری رکھتے لیکن وہ اگر ان کی بائیں سمت سے اڑتا تو منحوس سمجھ کر لوٹ آتے یہ بات اتفاقی نہ تھی، بلکہ بسا اوقات وہ فال کے لئے بیٹھے بٹھائے پرندے کو اڑاتے تھے، تمام عربوں کا یہی عقیدہ تھا، البتہ کچھ سمجھ دار لوگ اس خیال کے منکر بھی تھے اور اس کو چھوڑنے پر فخر کرتے تھے، حافظ نے فتح الباری، کتاب الطب، باب الطیرة میں اسی قسم کے ایک شاعر کا کلام بھی نقل کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال کی تردید فرمائی کہ پرندے کے دائیں بائیں اڑنے کی کوئی حقیقت نہیں اور فلاح وخسران کا تعلق تو صرف اللہ سے ہے اور ہوگا وہی جو تقدیر میں لکھا ہے۔

﴿ولا هامة﴾ امام لغت ابوزید انصاری سے قاضی عیاضؒ نے اسے مشدد نقل کیا ہے لیکن امام نووی نے: والهامة بتخفيف الميم على المشهور کی وضاحت کر کے اسے جمہور محدثین کا قول بتلایا ہے[1]، شیخ الاسلام حضرت کشمیریؒ، ملا علی قاریؒ اور مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کی بھی یہی رائے ہے، هامة سے کیا مراد ہے؟ امام نوویؒ نے اس کے متعدد جواب دیئے ہیں۔

۱: ان العرب كانت تعتقد ان عظام الميت وقيل روحه تنقلب هامة تطير[2] عربوں کا عقیدہ تھا کہ بوسیدہ ہو کر مردے کی ہڈیاں یا اس کی روح هامة بن جاتی ہے

[1] شرح مسلم ۲/۲۳۰ [2] صحیح مسلم ۲/۲۳۰

اور وہ فضا میں اڑتی ہے امام نوویؒ نے اسے: "هذا تفسير اكثر العلماء" قرار دیا ہے۔

۲: وهی الطائر المعروف من طير الليل وقيل هی البومة[1] یعنی رات کا مشہور پرندہ اور ایک قول کے مطابق وہ الو ہے، عرب اسے منحوس سمجھتے تھے، اگر وہ کسی کے گھر پر آکر بیٹھ جاتا: فرأها ناعية له نفسه او بعض اهله[2] تو اس کو یہ سمجھتا کہ وہ اس کی یا اس کی گھر والوں میں کسی کی موت کی خبر دے رہا ہے، امام مالک بن انسؒ کی یہی رائے ہے۔

۳: بعض عربوں کا عقیدہ تھا کہ: جس مقتول کا انتقام نہیں لیا جاتا اس کی روح هامة بن کر اسقونی اسقونی پکارتی ہے، پھر جب بدلہ لے لیا جاتا ہے، تو وہ فوراً اڑ جاتی ہے۔

جبکہ شیخ الاسلام حضرت کشمیریؒ نے لکھا: نوع من الطائر كان العرب يزعمون انه اذا تصوت يذره بلقع فرده الشرع ان هذا الزعم باطل ولا دخل له فی العمارة والتخريب[3] عرب یہ سمجھتے تھے کہ: یہ پرندہ اگر کسی جگہ بولے گا، تو اس کو ویران کر ڈالے گا شریعت نے اس کی تردید کی کہ تعمیر و تخریب صرف اللہ کے حکم سے ہوتی ہے۔

﴿أرءيت البعير يكون به الجرب فيجرب الابل كلها﴾ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں دیہاتی کے الفاظ اس طرح منقول ہیں: "يا رسول الله فما بال الابل تكون فی الرمل كانها الظباء فيجيی البعير الاجرب فيدخل فيها فيجربها كلها" یعنی ہم کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ صحرا کے اونٹ ہرنوں کی طرح صاف ستھرے ہوتے ہیں، لیکن ایک کھجلی زدہ اونٹ آکر ان سب کو کھجلی میں مبتلا کر دیتا ہے، یہ تو تعدی کی کھلی دلیل ہے۔

﴿قال ذلكم القدر﴾ یہ بھی تقدیر کی کارفرمائی ہے، ورنہ فمن اجرب الاول"[4] گر تعدی ہی سے بیماری لگتی ہے، تو پہلے اونٹ کو بیماری کس کی لگی؟ جیسا کہ امام نوویؒ لکھتے ہیں: ولو كان الجرب بالعدوی بالطبائع لم يجرب الاول لعدم المعدی[5] علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں: كما ان الله سبحانه وتعالیٰ وهو الموثرفی الجرب الاول كذلك هو المؤثرفی الجرب الثانی جس طرح باری تعالیٰ کے حکم سے پہلے کو کھجلی ہوئی دوسرے کو بھی اسی کے حکم سے ہوئی تو یہ تعدی نہیں اللہ کا حکم ہے۔

۱، ۲، ۳ صحیح مسلم ۲/۲۳۰ ۴ فیض الباری ۴/۳۶۸

حدیث صحیح بخاری (الطب/ ۲۵) صحیح مسلم (السلام/ ۲۶) جامع ترمذی (قدر/ ۹) اور سنن ابی داؤد (الطب/ ۲۶) میں بھی آئی ہے جب کہ ابن ماجہ کی سند کو بوصیری نے زوائد (۱/ ۵۳) میں هذا اسناد ضعيف : لضعف يحيى بن ابى حية ولكونه روى عن أبيه بصيغة العنعنة فانه كان يدلس کہا ہے، ابن حجرؒ نے بھی تقریب التہذیب (۷۵۳۷) میں ضعفوه لكثرة تدليسه کا تبصرہ کیا ہے جبکہ ابوحیہ مجہول ہیں، اس لیے سند ضعیف ہے۔

(۱۲/ ۸۸) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا يَحْيَى بْنُ عِيْسَى الجرَّارُ عَنْ عَبْدِالاَعْلَى بْنِ اَبِيْ الْمُسَاوِرْ عَنِ الشَّعْبِيِّ قَالَ لَمَّا قَدِمَ عَدِيُّ بْنُ حَاتِمٍ الْكُوْفَةَ أَتَيْنَاهُ فِيْ نَفَرٍ مِنْ فُقَهَاءِ اَهْلِ الكوفةِ فَقُلْنَا لَهُ حَدِّثْنَا مَا سَمِعْتَ مِن رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا عَدِيَّ بْنَ حَاتِمٍ أَسْلِمْ تَسْلَمْ قُلْتُ وَمَا الإِسْلَامُ فَقَالَ تشهد أَنْ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّيْ رسولُ اللّٰهِ وتُؤْمِنَ بِالاقدار كُلِّهَا خَيْرِهَا وشَرِّهَا حُلْوِهَا وَمُرِّهَا.

سنن ابن ماجہ میں روایت مختصر ہے جب کہ امام طبرانیؒ نے اوسط کبیر (۱۷/ ۶۹، ۸۷) میں صالح بن مالک الخوارزمی عن عبدالاعلی بن ابی المساور عن الشعبی کی سند سے اسے مفصل نقل کیا ہے۔

امام شعبی سے مروی ہے کہ: حضرت عدی بن حاتم طائی جب کوفہ تشریف لائے، تو فقہاء کوفہ کی ایک جماعت کے ہمراہ ہم ان سے ملاقات کیلئے حاضر ہوئے اور کہا کہ: رسول اللہ ﷺ سے آپ نے جو حدیث سنی ہو وہ ہمیں بھی سنادیں، انہوں نے کہا کہ جب آپ ﷺ نبوت سے سرفراز کئے گئے، تو عربوں میں کوئی شخص ایسا نہ تھا، جس سے مجھ کو آپ سے زیادہ بغض اور آپ سے زیادہ نفرت ہو، اسی لئے میں نے روم جا کر نصرانیت اختیار کر لی، لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ تو اخلاق حسنہ کی دعوت دیتے ہیں، اور لوگ آپ کے گرد جمع ہو چکے ہیں، تو میں نے رختِ سفر باندھ کر اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت صہیب، بلال، اور سلمان بھی وہیں موجود تھے، آپ نے فرمایا اے عدی بن حاتم! اسلام قبول کر لو نجات پا جاؤ گے، میں نے کہا، أخ أخ اور اونٹ کو بیٹھا دیا پھر اس طرح آپ کے پاس بیٹھ گیا کہ میرا گھٹنا آپ کے گھٹنے سے ملا ہوا

تھا، میں نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ اسلام کیا ہے؟ فرمایا تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں اور رسولوں پر ایمان لاؤ اسی طرح اچھی، بری اور خوشگوار و نا گوار تقدیر پر ایمان رکھو، اے عدی بن حاتم! قیامت اس وقت تک نہیں آسکتی، جب تک تم کسریٰ کے خزانے فتح نہ کرلو اے عدی بن حاتم! قیامت اس کو وقت تک نہیں آسکتی جب تک ایک آزاد عورت اپنے ہودج میں گھر سے نکلے اور اس کو کوئی خوف نہ ہو یہاں تک کہ وہ کسی پناہ وحفاظت کے بغیر بیت اللہ کا طواف کرے، اے عدی بن حاتم! قیامت اس وقت تک نہیں آسکتی، یہاں تک کہ مال و دولت کا بورا دیکھو، تم اس کے ساتھ گھومو گے لیکن کسی شخص کو ایسا نہ پاؤ گے جو اسے قبول کرلے، تم اس کے ساتھ شہروں میں گھومو گے اور آخر میں یہی کہو گے کاش میں نہ ہوتا میں مٹی ہوتا۔

عدی بن حاتم

فقہاء کوفہ کا حضرت عدی بن حاتم کی خدمت میں حاضر ہونا ان کے حدیث کے شوق اور صحابہؓ کی حد درجہ محبت وعظمت پر دلالت کرتا ہے، جو اس زمانہ کا ایک عمومی مزاج تھا، حضرت عدی حاتم طائی کے بیٹے ہیں، جن کی سخاوت ضرب المثل تھی، ان کے خاندان نے قبیلہ طے پر ایک زمانہ تک حکومت کی اور ظہور اسلام کے وقت وہ خود حکمراں تھے، اسلامی لشکر نے جب ان کے علاقے کا رخ کیا تو یہ اپنے اہل وعیال کو لے کر شام چلے گئے، اتفاق سے ان کی ایک عزیزہ رہ گئیں، جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہوئیں اور ان کی عاجزانہ درخواست پر رسول اللہ ﷺ نے بغیر کسی فدیئے کے انہیں رہا کر دیا، انہیں کی ترغیب پر حضرت عدی نے مدینہ منورہ آکر رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی اور آپ کی سادگی اور عوام کے ساتھ محبت سے بھرا سلوک دیکھ کر مسلمان ہوگئے، آپ نے انہیں حکومت پر برقرار رکھا، وفات نبویؐ کے بعد جب عرب میں ارتداد کی آگ پھیلی تو عدی نہ صرف خود ثابت قدم رہے، بلکہ اپنے قبیلے کو بھی انہوں نے تھامے رکھا اور صدقات لے کر خود صدیق اکبر کی خدمت میں حاضر ہوئے عہد فاروقی میں قادسیہ سمیت بیشتر جنگوں میں شرکت کی انہیں حضرت عثمانؓ کے طرز حکومت سے اختلاف تھا، اس لئے ان کی شہادت کے بعد انہوں نے حضرت علیؓ کی پرزور حمایت کی اور امیر معاویہ کے خلاف تمام جنگوں میں شریک رہے حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ان کی زندگی پردۂ خفاء میں ہے مختار ثقفی کے

خروج تک ان کی حیات کا پتہ چلتا ہے، ابن سعد کے مطابق ۶۷ ہجری میں انہوں نے کوفے میں وفات پائی حضرت عدی آخری دور میں مسلمان ہوئے، لیکن رسول اللہ ﷺ کے پاس ان کی مسلسل حاضری ہوتی تھی، اسی لئے حدیث کی کتابوں میں ان سے چھیاسٹھ احادیث مروی ہیں؛ جن میں چھ متفق علیہ ہیں، جب کہ امام بخاری تین میں، اور امام مسلم دو میں منفرد ہیں، ان کے تلامذہ کی فہرست میں عمر بن حریث، عبداللہ بن معقل، تمیم بن طرفہ، خیثمہ بن عبدالرحمٰن، محل بن خلیفہ طائی، عامر الشعبی، عبداللہ بن عمر، ہلال بن منذرہ، سعید بن جبیر، قاسم بن عبدالرحمٰن، عباد بن جیش وغیرہ کے نام ملتے ہیں، عدی ہر وقت باوضو اور نہایت صوام وقوام تھے، فیاضی ورثے میں ملی تھی، رسول اللہ ﷺ اور خلفاء سب ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

فقہاء کوفہ کی درخواست پر حضرت عدی بن حاتم نے اس حدیث کا انتخاب فرمایا جس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ: اس وقت قدریہ اور جبریہ فرقوں کا ظہور ہو چکا تھا، ان کے فتنے سے متنبہ کرنے کے لئے حضرت عدی نے یہ حدیث سنائی کیونکہ عقیدے کی حیثیت درخت کی جڑ کی سی ہے، جس طرح جڑ کے بغیر شاخوں کا وجود نہیں ہوسکتا، اسی طرح صحیح عقیدے کے بغیر عبادات ومعاملات کا اعتبار نہیں۔

حافظ بوصیری نے زوائد ابن ماجہ (۵۳/۱) میں روایت کی بابت لکھا ہے: هذا اسناد ضعيف لاتفاقهم على ضعف عبد الاعلى وله شاهد من حديث جابر رواهُ الترمذي لیکن امام ترمذی نے اپنی روایت کو غریب قرار دیا ہے، کیونکہ عبداللہ بن میمون ایک راوی منکر الحدیث ہے، جبکہ عبدالاعلیٰ بن ابی المساور کو حافظ نے تقریب (۳۷۳۷) میں متروك كذبه ابن معين کہا ہے۔

(۸۹/۱۳) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ نُمَيْرٍ، ثَنَا اَسْبَاطُ بْنُ مُحَمَّدٍ، ثَنَا الْاَعْمَشُ عَنْ يَزِيْدَ الرَّقَاشِيِّ عَنْ غُنَيْمِ بْنِ قَيْسٍ عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى الْاَشْعَرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ للّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ''مَثَلُ الْقَلْبِ مَثَلُ الرِّيْشَةِ تُقَلِّبُهَا الرِّيَاحُ بِفَلَاةٍ''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دل کی مثال پر کی سی ہے، جسے ہوائیں چٹیل میدان میں الٹ

پلٹ کرتی ہیں۔

مسند احمد میں یہ روایت مثل القلب کریشة بارض فلاة یقلبها الریاح ظهر البطن کے الفاظ میں آئی ہے۔

فَلَاةٌ، جمع: فَلٰی وفلوات کے معنی عربی میں: "الارض الواسعة القفرة" ہے یعنی ایسی چٹیل زمین جو گھاس پھوس سے بھی نا آشنا ہو۔

﴿تُقَلِّبُهَا﴾ قلب وتقلیب دونوں سے مشتق ہوسکتا ہے، علامہ سندھیؒ نے تقلیب کوراجح قرار دیا ہے لکھتے ہیں: والثانی هو الا شهر والاظهر فی مقام المبالغة بدلالة علی التکثیر وهو الاوفق بجمع الریاح لیظهرالتقلب اذ لو استمر الریح علی جانب واحد لم یظهر التقلب مبالغہ کے پیش نظر یہاں دوسرا لفظ زیادہ راجح اور واضح نظر آتا ہے کیونکہ قلب کی بہ نسبت تقلب میں معنی کی کثرت اور زیادتی ہے جو ریاح جمع کے شایان شان ہے، کیونکہ تقلب اسی صورت میں ظاہر ہوگا، اس کے برخلاف ہوا اگر ایک ہی سمت چلے گی تو تقلب کا ظہور مشکل ہے، تو اس طرح یہ پورا جملہ ریشة کی صفت ہے، اگر کوئی پر آبادی میں پڑا ہو اور ہوا بھی بس ایک ہی قسم کی چل رہی ہو، تو اس میں تقلب نہ ہوگا، جتنا کہ اس صورت میں ہوگا، جب کہ چٹیل میدان میں ہو اور ہوائیں بھی چاروں طرف سے چل رہی ہوں، اس صورت میں الٹ پلٹ کر وہ اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیں گی، حدیث میں وارد تشبیہ کی بابت ملا علی قاریؒ اور علامہ سندھیؒ لکھتے ہیں: والمعنی صفة القلب العجیبة الشان، وورود مایرد علیه من عالم الغیب من الدواعی وسرعة تقلبها لسبب الدواعی کریشة واحدة تقلبها الریاح بارض خالیة من العمران یعنی دل کا بھی عجیب وغریب حال ہے، اس پر عالم غیب کے رجحانات ودواعی کے الہام اوران کے سبب آن کی آن میں اس کی کیفیات وحالات اس تیزی سے تبدیل ہوتے ہیں، جس طرح کے چٹیل میدان میں ہوائیں پر کو الٹ پلٹ کر دیتی ہیں، ملا علی قاریؒ کے الفاظ میں: القلب ینقلب ساعة من الخیر الی الشرو بالعکس[1] یعنی اس پر ہمہ دم الہام ربانی اور القاء شیطانی کی بارش ہوتی

[1] مرقاة المفاتیح باب الایمان بالقدر حدیث ۱۰

ہے، ایک لمحہ میں وہ خیر سے شر اور شر سے خیر کی طرف مائل ہوتا ہے، بندوں کے قلوب حدیث کی تصریح کے مطابق باری تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے، انہیں موڑ دیتا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے امت کو یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینك کی دعاء مانگنے کی تاکید فرمائی ہے۔

امام نے اس روایت کو باب القدر کے تحت درج کیا ہے، جو بظاہر بے جوڑ سا لگتا ہے کیونکہ اس میں کہیں بھی ایسا کوئی تذکرہ نہیں لیکن غور کیا جائے تو حدیث اور باب کے درمیان گہرا تعلق نظر آتا ہے اور یہ اس صورت میں کہ قلب کے تمام تغیرات وتصرفات بھی قضاوقدر کے تحت باری تعالیٰ کے نزدیک مقرر اور طے شدہ ہیں، حافظ بوصیری نے زوائد ابن ماجہ (۱/۵۴) میں حدیث کے درجہ کے بارے میں لکھا ہے: هذا اسنادفيه يزيد ابن ابان الرقاشي وقد اجمعوا علی ضعفه اس لئے سند ضعیف ہے۔

(۹۰/۱۴) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا خَالِيْ يَعْلٰی عَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ سَالِمِ بْنِ اَبِی الجَعْدِ عَنْ جَابِرٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ الی النَّبِيِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِن لِی جَارِيَةً اَعْزِلُ عَنْهَا، قَالَ سَيَاتِيْهَا مَاقُدِّرَ لها فَأَتَاهُ بَعْدَ ذٰلِكَ فَقَالَ قَدْ حَمَلَتِ الْجَارِيَةُ، فَقَالَ النبیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا قُدِّرَ لِنَفْسٍ شَيْئٌ اِلَّا هِیَ كَائِنَةٌ.

ایک انصاری شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! میرے پاس ایک باندی ہے، میں اس سے عزل کرتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ: اس کے حق میں جو مقدر ہو چکا ہے، وہ اس کو ہو کر ہی رہے گا، کچھ دنوں بعد یہ شخص پھر آیا اور (متحیرانہ انداز میں) بولا کہ (عزل کے باوجود) باندی حاملہ ہو گئی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کی تقدیر میں جو لکھ دیا گیا ہے، وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔ ھی ضمیر الشئ المقدر کی ہے اور تانیث شئ مقدر کو نفس کے معنی میں لینے کی وجہ سے ہے۔

عزل کی بحث

عزل کیا ہے؟ اور محدثین نے اس کی کیا تعریف کی ہے؛ اس سوال کا جواب امام نووی

نے: العزل هو ان يجامع فاذا قارب الانزال نزع وانزل خارج الفرج[1].

حافظ ابن حجر نے: ای النزع بعد الايلاج ينزل خارج الفرج[2].

اور شاہ عبدالغنی مجددیؒ نے: العزل اراقة المنی خارج الفرج خوفا من تعلق الولد[3] کے الفاظ میں دیا ہے، جس کا مشترک مفہوم یہ ہے کہ: انسان بعض خانگی ضرورت اور صنف نازک کے اعذار کے پیش نظر اس طرح وطی کرے کہ انزال کے وقت بیوی سے الگ ہوجائے اور مادہ منویہ کو باہر خارج کرے تاکہ بچہ پیدا نہ ہو۔

اس حدیث کے علاوہ عزل کی بابت صحاح مین اور بھی روایات موجود ہیں، چنانچہ صحیح بخاری (نکاح/عزل) اور صحیح مسلم (نکاح/عزل) میں حضرت جابرؓ کی روایت منقول ہے: کنا نعزل والقرآن ینزل مسلم کے طریق میں مزید صراحت ہے: کنا نعزل علی عهد رسول الله ﷺ فبلغ ذلك نبی الله فلم ينهانا دوسری روایت سنن ابی داؤد میں آئی ہے، جس میں آپ نے سائل سے فرمایا: ولو اراد الله ان يخلقه ما استطعت ان تصرفه (نکاح/عزل) دونوں میں مطلق حلت واباحت کا پتہ چلتا ہے، اس کے برخلاف کچھ احادیث ایسی بھی منقول ہیں، جن سے عزل کی حرمت وممانعت ظاہر ہوتی ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں روایت ہے، آپ ﷺ سے عزل کی بابت دریافت کیا گیا، تو آپ نے فرمایا: ذلك الوأد الخفی یہ خفیہ قتل ہے۔ (نکاح/۲۴) دوسری روایت بھی مسلم ہی کی ہے، حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں: سئل النبیؐ عن العزل فقال لا عليكم الاتفعلوا ذاكم فانما هو القدر (نکاح/عزل) حضرات صحابہ میں بھی اس سلسلے میں دو روایتیں ہیں، حضرت علیؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، حضرت جابرؓ، ابن عباسؓ، خباب بن الارتؓ اور حضرت حسنؓ مطلق اباحت کے قائل ہیں تابعین میں سعید بن مسیّب، طاؤس، عطا اور امام نخعی کا بھی یہی موقف ہے، جب کہ حضرت عمرؓ، ابن عمرؓ، ابن مسعودؓ، حضرت عثمان، ابوامامہ اور ابوبکر سے کراہت منقول ہے، اگر عورت آزاد ہے، تو جمہور امت کے نزدیک عزل میں اس کی اجازت ضروری ہے ابن عبدالبر نے اس پر تمام فقہاء کا اجماع نقل کیا ہے[4]۔

---

[1] مسلم ج:۱/۴۶۴
[2] فتح الباری ۹/۲۴۴
[3] ابن ماجہ کتاب القدر حاشیہ
[4] فتح الباری ۹/۲۴۷

امام شافعیؒ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ حرہ سے اجازت کی ضرورت نہیں ہے: لان المراۃ لا حق لھا فی الجماع اصلا عندہ[1] امام شافعیؒ کے اصول و مذہب کے پیش نظر یہ رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، باندی سے اجازت لینے کی بالاتفاق کوئی ضرورت نہیں، اگر آقا نے اس کا نکاح کسی اور کے ساتھ کر دیا ہو، تو اب عزل کی صورت کیا ہوگی اجازت باندی دے گی یا آقا؟ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک مولی کی اجازت ضروری ہے: لان العزل یخل لمقصود الولد وھو حق المولی فیعتبر رضاءہ[2] امام احمد کا بھی راجح قول یہی ہے، احناف میں صاحبین کو اس سے اختلاف ہے، ان کے نزدیک اجازت باندی کا حق ہے: لان الوطی حقھا حتی ثبت لھا ولایۃ المطالبۃ بالوطی وفی العزل ینقص حقھا فیشترط رضاھا کما فی الحرۃ[3] امام احمد کے چار اقوال میں سے ایک قول صاحبین ہی کے مطابق ہے[4]، جب کہ امام شافعیؒ کے نزدیک شوہر کو بالکلیہ اختیار ہے، عزل میں باندی اور اس کے مولیٰ کی اجازت کی کوئی ضرورت نہیں[5]،

فیملی پلاننگ کی حقیقت

مختصر یہ کہ فی نفسہ عزل جائز ہونے کے باوجود کوئی محبوب و پسندیدہ فعل نہیں اسلئے بعض مخصوص حالات اور ضرر شدید کے موقع پر ہی انفراداً اس کی اجازت دی جاتی ہے، لیکن اس کو اجتماعی تحریک بنانا کسی صورت جائز نہیں اسلئے موجودہ زمانہ میں جو فیملی پلاننگ تحریک چل رہی ہے، وہ دراصل باری تعالیٰ کی رزاقیت کے انکار پر مبنی اور نظام ربوبیت کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے، اس میں وہی عربوں کی جاہلی فکر موجود ہے، جس کے باعث وہاں بچوں کو زندہ درگور کیا جاتا تھا، اس لئے اس شیطانی تحریک کو جواز فراہم کرنے کی خاطر عزل کی آڑ لینا نصوص پر ظلم اور شرعاً سنگین جرم ہے، آبادی کو کنٹرول میں رکھنا وسائل و ذرائع مہیا کرنا اور تمام جانداروں کو رزق فراہم کرنا باری تعالیٰ کی ذمہ داری ہے، انسانوں کو اس میں کوئی دخل نہیں: حدیث صحیح مسلم

---

۱ تنظیم الاشتات: ۳/۳۱۶
۲ تنظیم الاشتات: ۳/۳۱۶
۳ ایضاً
۴ فتح الباری: ۹/۲۲۸
۵ تنظیم الاشتات ۳/۳۱۶

(نکاح/عزل) سنن ابی داوٗد (نکاح/عزل) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند کے بارے میں حافظ بوصیری نے زوائد (۱/۵۴) میں لکھا ہے، **هذا اسناد صحيح، رجاله ثقات.**

(۹۱/۱۵) **حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا وَكِيعٌ عَنْ سُفْيَانَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عِيْسٰى عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِي الْجَعْدِ عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزِيْدُ فِي الْعُمْرِ اِلَّا الْبِرُّ وَلَا يَرُدُّ الْقَدْرَ اِلَّا الدُّعَاءُ وَاِنَّ الرَّجُلَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِخَطِيْئَةٍ يعملها.**

فرمایا کہ: عمر میں اضافہ صرف نیکی کرتی ہے اور دعاء کے علاوہ کوئی چیز تقدیر کو نہیں ٹال سکتی اور بندہ اس گناہ کی پاداش میں رزق سے محروم کردیا جاتا ہے، جس کا وہ ارتکاب کرتا ہے۔

حدیث میں تقدیر، عمر اور رزق کا تذکرہ ہے، یہ تینوں چیزیں ہی ناقابل تبدیل ہونے میں ضرب المثل ہیں، انہیں کے بالمقابل تین چیزوں کا اور تذکرہ ہے، دعاء، نیکی اور گناہ یہ نہایت مؤثر ہیں۔

تقدیر کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ مبرم، ۲۔ معلق، پہلی کا تعلق باری تعالیٰ کے علم ازل سے ہے، اس میں کوئی تغیر و تبدیلی نہیں ہوتی، ام الکتاب اسی کو کہتے ہیں، جب کہ دوسری کا تعلق فرشتوں سے ہوتا ہے، اس کے احکامات اسباب سے معلق اور مشروط ہوتے ہیں، اس لئے اس میں تبدیلی ہوجاتی ہے: **يمحو الله ما يشاء ويثبت** سے یہی قسم مراد ہے، حدیث باب کا تعلق دونوں میں کس کے ساتھ ہے یہ یہاں غور و فکر کا موضوع ہے، دوسری قسم مراد لیتے ہیں، تو اس میں کوئی اشکال نہیں، لیکن لفظ قدر کے اطلاق کو دیکھتے ہوئے اگر پہلی قسم مراد ہے، تو حدیث کے کیا معنی ہوں گے، اس سلسلے میں شارحین حدیث سے تین رائیں منقول ہے۔

۱۔ تینوں چیزوں کی اہمیت و طاقت کو بیان کیا گیا ہے، اس کا ظاہر مقصود نہیں ہے، فی نفسہ عمر میں کوئی زیادتی نہیں ہوتی، لیکن نیکی میں اتنی طاقت و تاثیر ہے کہ اگر عمر میں اضافہ ہوا کرتا تو نیکی ہی کی بدولت ہوتا تقدیر کو کوئی چیز ٹالتی تو وہ صرف دعاء ہوتی مقررہ رزق میں اگر کمی ہوا کرتی تو اس کا سبب گناہوں کی نحوست و خباثت ہوتا شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی یہی رائے ہے۔

۲۔ عمر میں زیادتی، قدر کا ٹلنا اور گناہ کے باعث رزق کی محرومی کا مطلب برکت، یسر اور

نحوست ہے، یعنی نیکی کے باعث عمر میں اضافہ تو نہیں ہوگا لیکن اس کے مقررہ اوقات میں برکت دے دی جائے گی اور وہ ایسے کارہائے نمایاں انجام دے گا، جن کے لئے طویل عمر درکار ہے، اسلاف واکابر کی زندگیاں اسی کی دلیل ہیں، اسی طرح تقدیر تو نہیں ٹلے گی، لیکن دعا کی بنا پر حادثات وواقعات کو اتنا آسان وہلکا کردیا جائے گا کہ بندہ بسہولت انہیں برداشت کرلے جب کہ ملا علی قاریؒ نے اس سے مصائب وآلام کو دفع کرنا مراد لیا ہے، اور قضاء وقدر کا لفظ ان کے نزدیک مجازی ہے۔

رزق سے محرومی کے معنی یہ ہوں گے کہ: اس کی روزی کی برکت اٹھالی جائے گی اور اس سے جو فوائد ہوتے ہیں، وہ بندے کو نہ حاصل ہوسکیں گے، یہاں یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ فساق وکفار کو مسلمانوں کے مقابلے بعض موقعوں پر زیادہ رزق حاصل ہوتا ہے، تو اس کا کیا سبب ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ کفار اور حد سے گذرے ہوئے مسلمانوں کے لئے یہ ضابطہ نہیں انہیں دنیا میں چھوٹ دی جاتی ہے۔

۳۔ خداوند قدوس کو ما کان وما یکون کا علم ہے، اس لئے تقدیر کی کتابت کے وقت اس کو علم تھا، کہ یہ بندہ نیکی وتقویٰ اختیار کرے گا، تو اس کی برکت سے ازل ہی میں اس کی عمر بڑھا کر لکھ دی گئی، اسی طرح جس بندے کی بابت علم تھا کہ: وہ کوئی غیر معمولی دعا کرے گا، تو دعا کے باعث اس کی قسمت میں بلاء ومصیبت کو نہیں لکھا گیا، پھر جس کے بارے میں باری تعالی جانتے تھے کہ: وہ گناہ ومعاصی کا ارتکاب کرے گا تو اس کے سبب کتابت ہی کے وقت رزق میں کمی کردی گئی تو دراصل عمر میں زیادتی کا سبب نیکی ہوئی، تقدیر دعا کی وجہ سے ٹلی اور گناہ ہی کی بناء پر روزی سے محروم کیا گیا، اس لئے حدیث باب میں تینوں کی جانب فاعلیت کی نسبت کردی گئی ہے، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی کا رجحان یہی معلوم ہوتا ہے، اور پہلی دونوں توجیہات کے بالمقابل یہ توجیہہ زیادہ منطقی ہے...... حافظ بوصیری نے زوائد ابن ماجہ (۱/۵۴) میں لکھا ہے:
سألت شيخنا ابا الفضل العراقي عن هذا الحديث فقال هذا حديث حسن یہی روایت جامع ترمذی (قدر/۶) میں آئی ہے امام نے اسے حسن غریب قرار دیا ہے۔

(۹۶/۱۶) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ ثَنَا عَطَاءُ بْنُ مُسْلِمٍ اَلْخَفَّافُ ثَنَا

اَلْاَعْمَشُ عَنْ مُجَاهِدٍ عَنْ سُرَاقَةَ بْنِ جُعْشُمٍ وَقَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ الْعَمَلُ فِيْمَا جَفَّ بِهِ الْقَلَمُ وَجَرَتْ بِهِ الْمَقَادِيْرُ أَمْ فِيْ أَمْرٍ مُسْتَقْبَلٍ قَالَ بَلْ فِيْمَا جَفَّ بِهِ الْقَلَمُ وَجَرَتْ بِهِ الْمَقَادِيْرُ وَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ.

سراقہ بن جعشم سے روایت ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول عمل بھی ان چیزوں میں ہے، جن پر قلم خشک ہوگیا اور وہ تقدیر بن گئی یا وہ امر مستقبل ہے، آپ نے فرمایا نہیں وہ ان ہی چیزوں میں ہے، جن کو قلم نے لکھ دیا ہے اور وہ تقدیر بن گئی ہے، تو ہر شخص کو وہی اسباب فراہم ہیں، جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

سراقہ بن جعشم کی یہی روایت صحیح مسلم (قدر/۱) میں ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے: "یا رسول اللّٰہ بین لنا دیننا کأنا خلقنا الآن فیما العمل الیوم أفیما جفت به الاقلام وجرت به المقادیر ام فیما نستقبل قال لا بل فیما جفت به الاقلام وجرت به المقادیر قال فیم العمل قال زهیر ثم تکلم ابوالزبیر بشئ لم أفهمهٗ فسألت ما قال فقال اعملوافکل میسر یعنی ہم جو اچھا یا برا عمل کرتے ہیں کیا وہ لکھا جا چکا یا اس کا تعلق تقدیر سے نہیں بلکہ مستقبل سے ہے؟ اسی مضمون کی ایک روایت جامع ترمذی میں بھی آئی ہے، اس میں بھی صحابہؓ نے یہی سوال کیا ہے: ففیم العمل یارسول اللّٰہ ان کان امر قد فرغ منه تو رسول اللہؐ نے جواب دیا: سدّدوا وقاربوا فان صاحب الجنة یختم لهٗ بعمل أهل الجنة وان عمل أی عمل وان صاحب النار یختم لهٗ بعمل اهل النار وان عمل ایّ عملٍ راہِ راست پر جمے رہو اور میانہ روی اختیار کرو، سعید کا خاتمہ جنتیوں کے عمل پر اور شقی دوزخیوں کے عمل پر مرے گا چاہے پہلے کچھ کرلے، پھر رسول اللہؐ نے مزید فرمایا: فرغ ربکم من العباد فریق فی الجنة وفریق فی السعیر یہی نصیحت بخاری کی روایت میں آپ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو کی ہے، یا اباهریرة جف القلم بما أنت لاق.

﴿جف القلم﴾ کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب امام نووی نے: ای مضت به المقادیر وسبق علم اللّٰہ تعالٰی به وتمت کتابته فی اللوح المحفوظ وجف القلم الذی کتب به وامتنعت فیه الزیادة والنقصان حافظ ابن حجرؒ نے: اشارة الی

ان الذی کتب فی اللوح المحفوظ لا یتغیر حکمہٗ فھو کنایۃ عن الفراغ من الکتابۃ لان الصحیفۃ حال کتابتھا تکون رطبۃ اوبعضھا وکذلک القلم فاذا انتھت الکتابۃ جفت الکتابۃ والقلم[1].

تورپشتی نے: جف القلم کنایۃ عن جریان القلم بالمقادیر وامضاء ھا اورملا علی قاریؒ نے: ای علی ما علم اللّٰہ وحکم بہ فی الازل لا یتغیر ولا یتبدل وجفاف القلم عبارۃ عنہ کے الفاظ میں دیا ہے، سب کا مشترکہ مفہوم یہ ہے کہ باری تعالیٰ کو انسانی اعمال وحرکات تک کا مکمل علم تھا، اس لئے کاتب تقدیر نے وہ تمام چیزیں لوح محفوظ میں لکھ دی ہیں اوران کی کتابت کو بھی ہزاروں سال گذر گئے ہیں، اب دنیا کی کوئی چیز قیامت تک اس خاکے سے انحراف نہیں کرسکتی، اس لئے کسی چیز کے کم ہونے یا نئی چیز کے درج ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، امام نوویؒ نے لکھا ہے: وکتابۃ اللّٰہ تعالیٰ ولوحہ وقلمہٗ والصحف المذکورۃ فی الاحادیث کل ذلک مما یجب الایمان بہ وأما کیفیۃ ذلک وصفتہٗ فعلمھا الی اللّٰہ تعالیٰ ولا یحیطون بشیٔ من علمہ الا بما شاء واللّٰہ اعلم یعنی کتابت، لوح محفوظ، قلم اورصحیفوں پرایمان لانا ضروری ہے، رہا ان کی کیفیت وصفت کا معاملہ تو اس کا علم اللہ ہی کو ہے، جس کے علم کا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا اوربس اتنا ہی اخذ کرسکتا ہے جتنا اس کی مرضی ہو، تو خلاصہ یہ نکلا اعمال مستانف نہیں ہوتے اورلوح محفوظ میں ایک ایک چیز لکھی ہے، اس لئے ہوا میں اڑنے والے ایک ذرے اورآسمان سے ٹپکنے والے ایک قطرہ کو بھی ہم غیر مکتوب نہیں کہہ سکتے.... حدیث صحیح مسلم (قدر/۱) میں بھی آئی ہے ابن ماجہ کی سند میں دو کمزوریاں ہیں ایک تو عطا بن مسلم ضعیف راوی ہیں، جن کے حافظہ پر ابوزرعہ، ابن حبان اور ابن حجر وغیرہ نے تنقید کی ہے جب کہ دوسرا عیب حافظ بوصیری نے زوائد (۵۵/۱) میں یہ بیان کیا ہے، کہ مجاہد کا سماع سراقہ سے ثابت نہیں اس لئے روایت میں اتصال نہ رہا، اور وہ منقطع قرار پاتی۔ ھذا اسناد فیہ مقال، مجاھد لم یسمع من سراقۃ والاسناد منقطع.

---

[1] مسلم/۲/۳۳۴

(۹۳/۱۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بنُ المُصَفّٰى الحِمْصِيُّ حَدَّثَنا بَقِيَّةُ بْنُ الوَلِيْدِ عَنِ الْاَوْزَاعِيِّ عَنِ ابنِ جريجٍ عَنْ ابِی الزُّبَيْرِ عَنْ جابر بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مَجُوْسَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ الْمُكَذِّبُوْنَ بِأَقْدَارِ اللّٰهِ اِنْ مَرِضُوْ فَلَا تَعُوْدُوْهُمْ وَاِنْ مَاتُوْا فَلَا تَشْهَدُوْهُمْ وَاِنْ لَقِيْتُمُوْهُمْ فَلَا تُسَلِّمُوْا عَلَيْهِمْ"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: اس امت کے مجوسی تقدیر الٰہی کو جھٹلانے والے ہیں، اگر یہ بیمار ہوں تو ان کی عیادت نہ کرو، اگر مر جائیں، تو ان کی مشایعت نہ کرو اور اگر ملاقات ہو تو انہیں سلام نہ کرو۔

مذاہب عالم میں ایک طبقہ مجوس کا بھی ہے، جو دو خدا کے قائل ہیں، ۱۔ یزدان، ۲۔ اُہرمن، پہلا خیر کا اور دوسرا شر کا خالق ہے، ان دونوں کو وہ نور و ظلمت سے تعبیر کرتے ہیں، یہاں قدریہ کو امت مسلمہ کا مجوسی قرار دیا گیا ہے، تشبیہ کی بنیاد یہ ہے کہ یہ لوگ تقدیر الٰہی کا انکار کر کے بندے کو مختار کل مانتے ہیں، ان کے نزدیک اصلح واحسن فعل باری تعالیٰ پر واجب ہے، اسی طرح وہ بھی خیر کا تو اللہ کو لیکن شر کا خالق نفس وشیطان کو قرار دیتے ہیں، نتیجہ تعدد الٰہ کی صورت میں نکلا، بوداؤد کی روایت میں هم شيعة الدجال وحق على الله ان يلحقهم بالدجال کا بھی اضافہ ہے۔

صحیحین کی روایت: حق المسلم على المسلم خمس، رد السلام وعيادة المريض واتباع الجنائز واجابة الدعوة وتشميت العاطس کی رو سے عیادت، جنازے کی مشایعت اور سلام ہر مسلمان کا واجبی حق ہے، یہاں اس سے بھی روکا گیا ہے، ملا علی قاریؒ ابن حجر مکیؒ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ: جن لوگوں نے قدریہ کو کافر قرار دیا ہے ان کے نزدیک یہ الفاظ حقیقت پر مبنی ہیں، جب کہ فاسق کہنے والے حضرات انہیں زجر وتوبیخ اور قدریہ کے عقائد کی تغلیظ و تقبیح پر محمول کریں گے، (مرقاۃ المفاتیح، باب القدر، فصل ثانی ۱۳)

حافظ بوصیری سندی حیثیت پر کلام کرتے ہوئے زوائد ابن ماجہ (۱/۵۵) میں لکھتے ہیں: هذا اسناد ضعيف فيه بقيّة بن الوليد وهو مدلس وقد عنعنه اسی طرح حافظ سیوطی نے الجامع الصغیر میں اور مناوی نے فیض القدیر (۲/ ۵۲۱) میں اس حدیث کو ضعیف

قرار دیا ہے، جب کہ ابن الجوزی نے: "العلل المتناهية" (۱/۱۴۴) میں، ابن القیسرانی نے: تذكرة الموضوعات (۱۰۹۰) میں اور سراج الدین قزوینی نے کتاب المصابیح[1] میں اسے موضوع کہا ہے، لیکن علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ: یہ روایت سنن ابی داؤد، (سنۃ/قدر) اور مستدرک حاکم، میں بھی موجود ہے، حاکم نے صحیح قرار دیا ہے، نیز حافظ ابن حجر نے اسے صحیح علی شرط مسلم کہا ہے[2] ذھبی اور مولانا سہارنپوری کی بھی یہی رائے ہے،[3] اس لئے ابن ماجہ کی سند کمزور ہونے سے متن حدیث پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

باب فضائل اصحاب رسول اللہ ﷺ

ہم شروع میں بتلا چکے ہیں کہ امام نے سنن ابن ماجہ کے مقدمہ کو تین بنیادوں پر قائم کیا ہے، یہاں پہلا محور ما انا علیہ یعنی سنت رسول کی اہمیت وعظمت کا اختتام ہوا اب فضائل صحابہ کے ذریعہ وہ دوسرے محور واصحابی کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں تاکہ فرقہ ناجیہ کی دونوں شرطوں کی تکمیل ہو جائے۔

صحابی کی تعریف!

عمرو بن بن یحیٰ وغیرہ نے سختی برتتے ہوئے صرف اس شخص کو صحابی قرار دیا ہے جو رؤیت نبی کے ساتھ طویل صحبت اور روایتِ حدیث کا حامل ہو لیکن جمہور محدثین نے اس موقف کو تسلیم نہیں کیا اور ان کے نزدیک ابن حجر کے الفاظ میں صحابی کی تعریف یہ ہے مَنْ لَقِيَ النبيَّ صَلى اللّٰه عليه وسلم مُومِنًا بِهِ ومَاتَ عَلى الإسلامِ[5]

صحابہ کا مقام

قرآن کریم میں انبیاء کے حواریوں کے احوال مختصر اور احادیث میں مفصل مذکور ہیں رسول اللہ ﷺ تمام انبیاء کے امام ہیں اور آپ کی بعثت قیامت تک تمام انسانوں کے لئے ہے

---

[1] بذل المجہود، ج:۵ باب فی القدر
[2] سنن مصطفیٰ باب القدر حدیث ۱۷
[3] مستدرک، ج:۱ص:۸۵
[4] بذل المجہود، ج:۵، باب فی القدر
[5] نخبۃ الفکر، ص:۸۱

اس لئے ضروری تھا کہ ہادی ومرشد کی طرح آپ کے صحابہ بھی صحیح جانشین اور حواریین کی بنسبت ممتاز صفات کے حامل ہوں، قرن اول کی تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے کہ صحابہ کرام دنیا کا اک عجیب ومنفرد طبقہ تھا ایمان ان کے دلوں میں پہاڑوں کی طرح راسخ اور مضبوط تھا دین کی خاطر اپنے خاندان سے کٹ گئے، گالیاں کھائیں، طعنے سنے، پشتوں کو داغدار کیا گیا، پتھر پھینکے گئے، بیوی بچوں سے محروم ہوئے، فاقہ کو برداشت کیا، درخت کے پتے کھائے، سوکھے چمڑوں کو بھگو کر چبایا، تمام عرب سے دشمنی مول لی، محبوب وطن کو چھوڑا، نبی کی خاطر جان ومال کو خطرے میں ڈالا، بے پایاں دولت لٹائی، اپنا خون دیا، پسینہ بہایا، جنگیں لڑیں، دلدوز معرکوں میں کودے، موت سے پنجہ آزمائی کی، نبی کی طرف آنے والے نیزوں کو انہوں نے اپنی پیٹھوں پہ روکا، بھوکے پیٹ خندقیں کھودیں، محض ایک کھجور پر گذر بسر کر کے پورے پورے لشکر نے جہاد کیا، پکے ہوئے پھلوں کو چھوڑ کر شہادت کی راہ لی، کفر وشرک کے شعلوں کو اپنے خون سے بجھایا اور دین کی سر بلندی کے لئے انہوں نے آخری سانس تک قربانی دی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بجا فرمایا: اِن اللّٰهَ نَظَرَ فِي قُلُوبِ العِبَادِ فنَظَرَ قلبَ مُحَمَّدٍ صَلى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلم فَبعَثَهُ بِرِسَالَتِهٖ ثُم نَظَرَ فِي قُلوبِ العِبادِ بعدَ قلبِ مُحمدٍ صَلى اللّٰهُ عَليهِ وَسلمَ فَوَجَدَ قلوبَ اَصحابِهٖ خيرَ قُلوبِ العِبَادِ فَاختَارَهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ وَنُصرَةِ دِيْنِهٖ (ابوداؤد طیالسی)

اللہ نے بندوں کے دلوں پر نظر ڈالی تو محمد ﷺ کا قلب سب سے بہتر پایا چنانچہ آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا پھر رسول اللہؐ کے بعد دوسرے قلوب پر نظر فرمائی تو آپ کے صحابہ کے دل تمام لوگوں کے قلوب سے بہتر نظر آئے چنانچہ ان کو اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین کی نصرت کے لئے منتخب فرمالیا۔

جب آزمائش کی بھٹیوں میں تپ کر وہ ہر مرحلے پر کھرا سونا ثابت ہوئے تو باری تعالیٰ کی جانب سے رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُم وَرَضُوْا عَنه، كُنتُم خيرَ اُمةٍ، لتكُونوا شهداءَ عَلى الناسِ، اُوْلٰئِكَ هُم الصَادِقُونَ، اُولئِكَ هُمُ الرَاشِدُوْنَ اور اُولٰئِكَ هُمُ المُفلحونَ کا اعلان کیا گیا اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انفرادی اور اجتماعی طور پر ان کے فضائل ومناقب بیان کئے ہیں أصحَابِي كَالنجوم، مَثَلُ اَصحابِي فِي اُمتِي كَالْمِلحِ

فی الطَعامِ لَا یَصلُحُ الطَعامُ الّا بالملحِ، اَکرِمُوا أصحَابِی فانّھُم خیارُکم لاتَمَسُّ النارُ مَسلماً رَانی ورأی مَن رانی اسی طرح صحیحین کی روایت میں حضرت ابوسعید کے حوالے سے منقول ہے کہ آئندہ زمانے میں صحابہ کی برکت سے فتوحات ہونگی ان کی محبت کو حضور نے اپنی محبت اور ان سے بغض کو اپنی ذات سے بغض رکھنا قرار دیا فَمن أَحبُّھُم فبِحُبی اَحبَّھُم وَمَن اَبغَضَھُم فبِبُغضِی اَبغَضَھُم اور ان کا یہ مرتبہ قرار پایا کہ دوسرے امتی اگر پہاڑ برابر سونا بھی خیرات کردیں تو بھی وہ صحابہ کے چند سیر صدقے کو نہیں پہنچ سکتے، فلو أن أحدَکم اَنفَقَ مِثلَ اُحَدٍ ذھباً مَا بَلَغَ مُدَ احدِھم ولا نِصیفَہٗ وہ قرآن وسنت کے شارح وترجمان ہیں اس لئے رسولؐ نے اپنے طریقے کے ساتھ ان کے طریقے کا بھی تذکرہ کیا مَا اَنَا عَلَیہِ واَصحَابِی یعنی اب دین کی تعبیر وتشریح کی صحت کا معیار سنت رسول کے ساتھ سنت صحابہ بھی ہے اور ان دونوں سے مل کر ہی صحیح معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

قرآن وسنت میں وارد صحابہ کے انہی فضائل کے پیش نظر امت ان کی عقیدت واحترام میں ڈوبی رہی اور انہیں ہمیشہ سند وحجت کا درجہ دیا کیونکہ ان کی ذات پر معمولی حرف گیری دین میں اعتماد واعتبار کی فضاء کو یکلخت ختم کردے گی اَلصَحَابَۃُ کُلُّھُم عُدول اسی کی پیش بندی ہے جس سے بس ایک دو گمراہ فرقوں نے ہی انحراف کیا ہے۔ ورنہ اہل سنت والجماعت نے صحابہ پر تنقید کو بدترین معصیت اور ایسا کبیرہ گناہ قرار دیا ہے جس کی سزا کوڑے اور قتل ہے، علامہ نووی شرح مسلم (۳۱۰/۲) میں تحریر فرماتے ہیں: قال القاضی سَبُّ اَحدِھم مِنَ المَعَاصِی والکَبَائِر ومذھبُ الجَمھورِ أنہٗ یُعزَّر ولایُقتَلُ وقال بعضُ المالکیۃ یُقتَلُ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کی تصریح کے مطابق فقہاء کوفہ کی ایک جماعت نے بھی مالکیہ کی طرح شاتم رسول کے قتل کا فتویٰ دیا ہے شیخ الاسلام الصارم المسلول علی شاتم الرسول میں مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وقال القاضی ابویعلی الذی عَلَیہِ الفقھاء فی سبٍّ لِلصحابۃِ اِن کَانَ مُستَحِلاً لِذلِکَ کُفِّرَ وان لَم یَکن مُستَحِلاً فُسِّقَ ولَم یُکَفَّرُ سواءٌ کَفَّرَھُم اَوطَعَنَ فِی دِینِھِم مَعَ اسلامِھِم.

حافظ ابن نجیم تو یہاں تک فرماتے ہیں کل کافر تَابَ فتوبتُهٗ مقبولةٌ فی الدنیا والآخرةِ الاّ الکافرَ فی سبِّ النبیِّ وسبِّ الشیخین او احدِهما اوبالسحرِ وبالزندقةِ[1] یعنی ہر کافر کی توبہ دنیا وآخرت میں مقبول ہے لیکن ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں جنہوں نے سب نبی یا شیخین کو شتم کر کے کفر اختیار کیا ہو یہی حکم ساحر وزندیق کا بھی ہے ملا علی قاریؒ نے بھی اس ضمن میں یہی لکھا ہے وقد صَرَّحَ بعضُ علمائِنا بِاَنَّهٗ یُقتَلُ مِن سبِّ الشَیخین[2] یہ ہے سب صحابہ کی بابت ائمہ اربعہ کا موقف۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسئلہ کتنا خطرناک ہے جس کی سزا اکثر علماء کے نزدیک قتل اور کم سے کم درّے لگانا ہے، تاریخ میں جن بزرگوں نے شیعوں پر کفر کا فتوی دیا ہے اس کی بھی اہم وجہ تکفیر صحابہ ہے۔

مشاجرات

اسی کے ضمن میں ایک علمی بحث مشاجرات صحابہ کی بھی ہے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ان میں آپس میں جو اختلاف ہوا اور معاملہ جنگ وجدال تک پہنچ گیا جیسا کہ جنگ جمل وجنگ صفین، اس کی بابت علماء نے گرچہ حضرت علی کی حقانیت اور ان کے مخالفین کے خطاء اجتہادی پر اجماع ظاہر کیا ہے لیکن اس کے باوجود اس آویزش میں غور وخوض تک کرنے سے منع فرمایا اور امت کو کف لسان اور سکوت ہی کا مشورہ دیا، قرطبی نے سورۂ حجرات کی تفسیر میں (۱۶/ ۳۲۲) ابن الہمام نے شرح مسامرہ (۱۳۲) میں، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے شرح العقیدۃ الواسطیہ (۴۵۶، ۱۵۷) میں، علامہ سفارینی نے شرح عقائد (۲/۳۸۶) میں یہی وضاحت فرمائی ہے اور امت نے صحابہ کے ادب واحترام میں انہیں وجنگ جدال نہیں بلکہ مشاجرات کا نام دیا ہے جو خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ جنگیں چار ونا چار ہوئیں جس طرح درخت کی شاخوں کا باہم الجھنا فطرت کا تقاضہ ہے اسی طرح شجرۂ نبوت کی ٹہنیاں بھی باہم برسر پیکار ہو جائیں تو گھبرانے کی ضرورت نہیں اس میں بھی سیکڑوں حکمتیں اور امت کے لئے ہزاروں نصیحتیں موجود ہیں۔

---

[1] مرقاۃ المفاتیح باب مناقب الصحابہ فصل اول حدیث ۱

فرق مراتب

مسند احمد کی روایت کے مطابق صحابہ کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے یہی عدد انبیاء کرام کا بھی ہے اس لئے بعض علماء نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ہر صحابی کسی ایک نبی کی سیرت وخصوصیات کا حامل تھا روایات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے جن میں حضورؐ نے ابوبکر کو ابراہیم وعیسیٰ سے حضرت عمر کو نوح وموسیٰ سے اور حضرت علی کو ہارون سے تشبیہ دی ہے فضیلت ومنقبت میں صحابہ کی پوری جماعت ایک درجے میں ہے یا ان میں باہم فرق مراتب پایا جاتا ہے؟ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ سب ایک درجے کے ہیں ان میں تفریق مناسب نہیں لیکن اکثریت فرق مراتب کی قائل ہے کیونکہ جب انبیاء ورسل کے درجات مختلف ہیں اور ان میں بھی ایک دوسرے کے مقابلے میں افضل پائے جاتے ہیں تو صحابہ کی تفضیل میں کیا اشکال ہے جب کہ نصوص خود اس کو بیان کرتی ہیں جیسا کہ قرآن کی آیت لَایَستوِی القاعدُون مِنَ المُؤمنِین غیرُ اولی الضَرَرِ والمُجاھدُون فی سبیلِ اللّٰہِ، لا یَستوِی مِنکُم مَن اَنفَقَ مِن قَبلِ الفتحِ وقاتَلَ اولئك اعظمُ درجَۃً مِن الذین انفقوا من بعدُ وقاتلُوا وکلاً وعدَ اللّٰہ الحسنی (حدید/۱۰) اسی طرح سنن ابوداؤد (سنۃ/ ۸) میں ابن عمر کی حدیث کنا نقولُ ورسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم حَیٌّ افضلُ امۃِ النبی ﷺ بعدہٗ ابوبکر ثم عمرُ ثم عثمانُ رضی اللّٰہ عنھم تفضیل کے باب میں شیعوں نے حضرت علی کو، راوندیہ نے حضرت عباس کو، خطابیہ نے حضرت عمر کو، اور اہل سنت والجماعت نے صدیق اکبر کو سب سے افضل قرار دیا ہے جب کہ ایک جماعت جس میں ابن عبدالبر کا بھی شمار ہے اس طرف گئی ہے کہ عہد رسالت میں وفات پانے والے صحابہ وفات نبوی کے بعد زندہ رہنے والوں سے افضل ہیں امام نوویؒ نے وھذ الاطلاق غیر مرضی ولامقبول[1] کہہ کر اس کی تردید کی ہے ابومنصور بغدادی فرماتے ہیں اصحابنا مُجمِعُون علی اَن افضلَھم الخلفاءُ الاربعۃُ علی الترتیبِ المذکورِ ثم تمامُ العشرۃِ ثم اھلُ بدرٍ ثم اُحدٍ ثم بیعۃِ الرضوان ومِمَن لہٗ مزیۃُ اھلِ العَقَبَتَین مِنَ الانصار وکذلك السابقُون

---

[1] شرح مسلم ۲/۲۷۲ کتاب فضائل الصحابۃ

الاوّلون[1] سابقین اولین سے مراد سعید بن مسیّب وغیرہ کے نزدیک مَن صَلّٰی اِلَی القِبلَتَین، شعبی کے نزدیک اھل بیعۃ الرضوان اور عطاء ومحمد بن کعب کے نزدیک اہل بدر ہیں ابن سعد نے صحابہ کو پانچ طبقوں میں تقسیم کیا ہے (۱) اہل بدر (۲) سابقین اولین جنہوں نے حبشہ کو ہجرت کی ہو اور وہ احد وغیرہ میں شریک ہوئے ہوں (۳) خندق وغیرہ میں شریک ہوئے ہوں (۴) فتح مکہ اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک ہوں (۵) وہ کمسن صحابہ جنہوں نے عہد رسالت میں غزوات میں شرکت نہیں کی دلائل کے لحاظ سے ابو منصور بغدادی کی تقسیم زیادہ دل لگتی ہے گرچہ کوفہ کے بعض اہل سنت نے حضرت علی کو عثمان پر فوقیت دی ہے لیکن جمہور اہل سنت کا مسلک تقدیم عثمان ہے امام نوویؒ لکھتے ہیں والصحیحُ المشہورُ تقدیمُ عثمانَ[2] اسی ضمن کی ایک بحث خدیجہ وعائشہ اور فاطمہ وعائشہ کی افضلیت کی بھی ہے جس کی بابت علماء کے اقوال مختلف ہیں اور ترجیح کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

تفضیل ظنی ہے یا قطعی؟

تفضیل کا مسئلہ طے ہونے کے بعد ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحابہ کی افضلیت قطعی اوراخروی ہے یا محض ظاہری ودنیوی ہے امام ابوالحسن اشعریؒ کا رجحان قطعیت کی جانب ہے جب کہ امام ابوبکر باقلانی اسے ظنی واجتہادی کہتے ہیں دل لگتی بات اشعریؒ کی معلوم ہوتی ہے۔

فَضلُ اَبی بکرٍ الصَدِیقِ

نام عبد اللہ، کنیت ابوبکر اور لقب صدیق وعتیق تھا، آپ کے والد کا نام عثمان اور کنیت ابوقحافہ ہے جب کہ والدہ ماجدہ کا اسم گرامی سلمہ اور کنیت ام الخیر ہے والد کی طرف سے سلسلۂ نسب اس طرح ہے عبدُ اللّٰہ بنِ عثمانَ بنِ عامرِ بنِ عمروِ بنِ کعبِ بنِ سعدِ بنِ تمیمِ بنِ مرّۃَ بنِ کعبِ بنِ لُوی القرشیُّ التیمیُّ، والدہ کا سلسلہ یہ ہے ام الخیرِ بنتِ صخرِ بنِ عامرِ بنِ کعبِ بنِ سعدِ بنِ تمیمِ بنِ مُرۃَ اس طرح آپ کا نسب چھٹی پشت میں مرۃ پر پہنچ کر حضور ﷺ سے مل جاتا ہے ابوقحافہ قریش کے اکابر کی طرح اپنے آبائی مذہب پر

---

[1][2] شرح مسلم ۲/۲۷۲ کتاب فضائل الصحابۃ

جمے رہے اور ٹھیک فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے جب کہ ام الخیر شروع ہی میں مسلمان ہوگئی تھیں، حضرت ابوبکر جسمانی طور پر نحیف ولاغر تھے، چہرہ کم گوشت اور رنگ گندمی تھا، پیشانی بلند وفراخ اور آنکھیں ذرا اندر دھنسی ہوئی تھیں بالوں میں سفیدی آجانے کے بعد آپ مہندی کا خضاب کرنے لگے تھے، فطرت شروع ہی سے بڑی سلیم پائی تھی زمانہ جاہلیت میں بھی کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا اور تمام کبائر سے محفوظ رہے اہل مکہ کے درمیان ان کی شہرت وشناخت ایک امین وراست باز دولت مند تاجر کی تھی، علم وتجربہ اور حسن اخلاق کے باعث قریش ان کی کافی عزت کرتے اور خون بہا کا مال انہیں کے پاس جمع ہوتا رسول اللہ ﷺ کے وہ شروع ہی سے ہمنشیں تھے اور تجارت وغیرہ میں بھی آپ کی رفاقت رہی تھی۔

اسلام

قربت کے اس طویل دور میں انہوں نے آپ کو ہر ہر زاوئے سے دیکھا تھا اس لئے نبوت کے بعد سب سے پہلے ابوبکر ہی ایمان لائے اور دین کی نشر واشاعت کو، نبی کی طرح انہوں نے بھی اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنالیا، وہ دعوت کی ہر ملاقات میں حضورؐ کے ساتھ ہوتے اور عرب قبائل سے آپ کا تعارف کراتے تھے عثمانؓ بن عفان، زبیر بن العوامؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، طلحہ بن عبید اللہؓ، عثمان بن مظعونؓ، ابوسلمہؓ اور خالد بن سعید بن العاصؓ آپ ہی کی ترغیب پر مسلمان ہوئے سابقین اولین میں غلاموں اور لونڈیوں کی بھی خاص تعداد تھی، صدیق اکبر نے زرِ کثیر صرف کر کے انہیں مشرکین کے پنجوں سے نجات دلائی، بلالؓ، عامر بن فہیرہ، زنیرہ، نہدیہ، جاریہ، بنی مؤمل اور بنت نہدیہ صدیقی جود وکرم کے ذریعے آزاد ہوئے، اہل مکہ کو یہ دین پسند نہ تھا، اس لئے وہ مسلمانوں کو ستانے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے، دیگر صحابہ کی طرح صدیق اکبر بھی ان تکلیفوں سے محفوظ نہ تھے اور مشرکین آپ کی نبوت نوازی پر بڑے چراغ پا رہتے مکے کی زمین تنگ ہونے کے بعد جب مسلمانوں کی ایک جماعت نے حبشے کو ہجرت کی تو ابوبکر نے بھی وطن چھوڑنے کا فیصلہ کیا لیکن جب آپ برک الغماد پہنچے تو ابن الدغنہ وہاں سے آپ کو اپنے ساتھ واپس لے آیا اور کہا کہ تم جیسے با اخلاق شخص کا مکہ سے نکلنا مناسب نہیں۔

ہجرت

مدینہ منورہ میں اسلام پھیل جانے کے بعد دوسرے صحابہ کی طرح آپ نے بھی وہاں کا قصد کیا لیکن بارگاہ نبوت سے حکم ملا کہ ابھی جلدی نہ کرو مجھے بھی عنقریب ہجرت کا حکم ہوگا تم میرے ساتھ چلنا، چنانچہ ہجرت کے سفر میں ابوبکر ہی حضورؐ کے ساتھ تھے اور غار ثور سے قبا تک ہر جگہ تاریخ میں آپ کی جانثاری کے واقعات ملتے ہیں مکے کے برعکس اسلام مدینے میں آزاد تھا اسلئے حضورؐ نے دینی تعلیم وتربیت اور دنیا کی امامت وقیادت کیلئے اللہ کے گھر کی تعمیر ضروری سمجھی اس سلسلے میں جو زمین خریدی گئی اس کی قیمت بھی حضرت ابوبکر ہی نے ادا کی حارثہ ابن زبیر سے آپ کی مواخاۃ قائم ہوئی مکی دعوت کی طرح مدنی جہاد میں بھی وہ حضورؐ کے ساتھ رہے اور تقریباً ہر غزوے ہی میں آپ نے شرکت کی اور تبوک کے موقع پر تو گھر کا سارا اثاثہ لاکر حضورؐ کے قدموں میں ڈال دیا اسلئے حضورؐ نے اپنی آخری تقریر میں فرمایا تھا کہ ابوبکر کے مال سے مجھے جتنا فیض پہنچا ہے اتنا کسی کی دولت سے نہیں پہنچا، ۹ ھ میں جب حضورؐ نے صحابہ کو حج کیلئے روانہ فرمایا تو ان کا امیر ابوبکر ہی کو مقرر کیا اس طرح مرض الوفات میں بھی وہ مسجد نبوی کے امام رہے۔

خلافت

وفات نبوی کے بعد ثقیفہ بنو ساعدہ میں خلافت کی بابت جو اختلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا اسے بھی ختم کرنے میں بلاشبہ صدیقی حکمت وتدبر کو دخل تھا آپ ایک منفرد شان رکھتے تھے، اس لئے صحابہ نے بالاتفاق آپ کو اپنا خلیفہ بنایا جس وقت حضرت ابوبکر عظیم منصب پر فائز ہوئے ہیں وہ بڑا خطرناک اور بھیانک وقت تھا ایک طرف مدعیان نبوت اٹھ کھڑے ہوئے تھے، تو دوسری جانب منکرین زکوٰۃ نے ایک بحران کھڑا کر دیا تھا جب کہ تیسری طرف ارتداد کی لہر نے پورے عرب میں بغاوت کی آگ لگادی تھی صدیق اکبرؓ نے نہایت الوالعزمی کے ساتھ اس طوفان کا مقابلہ کیا حضرت اسامہ کی فوجی مہم کو روانہ فرمایا، سجاح، طلیحہ، اسود عنسی اور مسیلمہ کذاب کا قلع قمع کرنے کے لئے خالد بن ولید کو بھیجا مرتدین کی خبر لینے کے لئے علاء ابن حضرمی روانہ ہوئے اور منکرین زکوٰۃ کے ساتھ بھی نہایت سختی سے پیش آئے نتیجتاً چند ہی مہینوں

میں فضا بدل گئی ارتداد کا قصہ پاک ہوا، انکار زکوٰۃ کا فتنہ دب گیا، جھوٹی نبوت کا قلع قمع کر دیا گیا اور حالات پھر اسی ڈگر پر آ گئے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے، اندرونی انتشار کو ختم کرنے کے بعد صدیق اکبر نے بیرونی فتوحات پر توجہ دی، جہاد کا کی طویل سلسلہ شروع ہوا، روم وایران پر فوج کشی کی گئی اور بہت سارے علاقے اسلامی قلمرو میں داخل ہو گئے۔

جنگ یمامہ میں حفاظ کی ایک بڑی تعداد شہید ہو جانے کے بعد آپ کو قرآن کی حفاظت کی فکر ہوئی، صحابہ کے مشورے سے آپ نے ایک نہایت اہتمام کے ساتھ اسے ایک صحیفے میں جمع فرما دیا، اس طرح ملک کی نظم ونسق میں نئے اضافے کئے، تعزیر وحدود کی تعیین کی، بیت المال کی عمارت تعمیر کرائی، افتاء کا شعبہ قائم کیا مجاہدین کی اخلاقی تربیت پر خصوصی توجہ دی جنگی سامان کی فراہمی ہوئی، آپ کے فضائل ومنقبت اور دینی خدمات کا شمار مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، حدیث کی کتابوں میں آپ کی بابت بے شمار روایات موجود ہیں صدیق اکبر کو شعر وادب کا ذوق تھا خطابت کے شہسوار تھے، نسب دانی میں مرجع شمار کئے جاتے تھے، اور تفسیر وحدیث اور فقہ واجتہاد میں ان کا مقام بلاشبہ سب سے بلند تھا۔

وفات

جمادی الاخریٰ ۱۳ھ دوشنبہ کی رات کو آپ کا وصال ہوا اس وقت عمر تریسٹھ سال تھی اسماء بنت عمیس نے آپکو غسل دیا حضرت عمرؓ نے نماز پڑھائی، حضرت عثمان، طلحہ، عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور خلیفۂ دوم نے حضورؐ کے پہلو میں آخری آرام گاہ تک پہنچایا انہوں نے چار شادیاں کیں پہلی بیوی قتیلہ یا قتلہ ہیں ان سے عبداللہ اور حضرت اسماء پیدا ہوئے دوسری ام رومان ہیں، یہ حضرت عائشہ اور عبدالرحمٰن کی ماں تھیں، تیسری اسماء بنت عمیس ہیں محمد بن ابی بکر انہیں کے بیٹے ہیں اور چوتھی حبیبہ بنت خارجہ تھیں جو حضرت ابوبکر کی سب سے چھوٹی صاحبزادی ام کلثوم کی ماں ہیں۔

(۹۴/۱) حدثنا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، حَدَّثَنَا وَكِيعٌ، حَدَّثَنَا أَعْمَشُ، عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ مُرَّةَ، عَنْ أَبِي الْأَحْوَصِ، عَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ: قَالَ: رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلَا إِنِّي أَبْرَأُ إِلَى كُلِّ خَلِيلٍ مِنْ خُلَّتِهِ، وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا لَا تَّخَذْتُ أَبَابَكْرٍ خَلِيلًا، إِنَّ صَاحِبَكُمْ خَلِيلُ

اللّٰهِ " قَالَ وَكِيعٌ يَعْنِي نَفْسَهُ

سنو! میں ہر خلیل کی خلت سے براءت کرتا ہوں اگر میں کسی کو خلیل بناتا تو یقیناً ابوبکر کو بناتا بیشک تمہارا ساتھی اللہ کا خلیل ہے، حضرت وکیع نے فرمایا کہ صاحب سے آپ خود کو مراد لیتے ہیں۔

بیت اللہ پر ہلالی پرچم لہرانے کے بعد دین کی تکمیل ہوگئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخرت کی تیاری میں لگ گئے ۱۱ھ صفر کے آخری عشرے میں اپنے غلام ابوہم کے ہمراہ آپ بقیع تشریف لے گئے واپسی پر طبیعت ناساز ہوگئی یہ چہار شنبہ اور حضرت میمونہ کی باری کا دن تھا اسی حالت میں آپ باری باری ازواج مطہرات کے یہاں قیام فرماتے رہے لیکن پانچویں دن جب طبیعت مزید ناساز ہوئی تو ان کی اجازت سے مستقل حضرت عائشہ کے حجرے میں قیام پذیر ہوگئے، اور سب سے آخری نماز آپ نے مغرب کی پڑھائی اس کے بعد جمعہ کے دن یہ منصب حضرت ابوبکر کو عطا ہوا انہوں نے تین دن امامت فرمائی واقعہ قرطاس اسی دوران پیش آیا اور مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکالنے اور وفود کے ساتھ سخاوت واحسان کا معاملہ کرنے کی وصیت فرمائی اسی دن آپ پر ۷ مشکیں پانی ڈالا گیا افاقہ ہوا تو عباس وعلی کے سہارے مسجد میں تشریف لائے حضرت ابوبکر، ظہر کی نماز پڑھا رہے تھے رسول اللہ کو دیکھ کر انہوں نے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن آپ نے منع فرمادیا اور ان کے پہلو میں بیٹھ کر امامت فرمائی نبی کو دیکھ کر ابوبکر نے اور ابوبکر کو دیکھ کر صحابہ نے ارکان ادا کئے نماز سے فراغت کے بعد آپ نے منبر پر فروکش ہو کر اپنی زندگی کا آخری خطبہ دیا جس میں حمد وثنا کے بعد اصحاب احد کے لئے دعاء مغفرت، انصار کے ساتھ حسن اخلاق کی تاکید، حضرت اسامہ کی صلاحیت وامارت کی توثیق اور دیگر وصیتوں کے بعد صحیح مسلم کے طریق کے مطابق آپ نے فرمایا عَبدٌ خيَرهُ اللّٰهُ بَيْنَ أن يُوتيَهُ زهرةَ الدنيا وبينَ مَاعِندَهُ فَاختارَ ماعندَه کہ ایک بندے کو اللہ نے اختیار دیا کہ وہ دنیا کی نعمتیں لے یا باری تعالیٰ کا قرب، تو اس نے قرب الٰہی کو اختیار کرلیا راوی حدیث مسلم ابوسعید بیان کرتے ہیں فَبكَى ابُوبكرٍ وَبَكى فَقَالَ فَدينَاكَ بِابَائِنَا وامهَاتِنَا قال فكانَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم هُو المُخيَّرُ وكَانَ ابُوبكرٍ اَعلَمَنَا یہ وفات نبوی کا اشارہ تھا اس لئے یہ سنتے ہی حضرت ابوبکر بے تحاشہ روئے اور کہا ہمارے ماں باپ آپ پر قربان

ہوں عبد مخیر اللہ کے رسول ہی تھے، اور ابو بکر اس بات کو ہم سب سے زیادہ جانتے تھے۔

﴿الا انی ابرأ الٰی کل خلیل من خلته﴾

خلة محبت و تعلق کا کونسا درجہ ہے؟ قاضی عیاض اور حافظ ابن حجر نے اس سلسلے میں متعدد معنی نقل کئے ہیں۔

(۱) الِافتقارُ والامتناعُ فخلیلُ اللّٰهِ المُنقَطِعُ اِلیه کسی ایک ہی کا ہو کر اسی پر منحصر ہو جانا تو خلیل اللہ کا مطلب باری تعالٰی کی طرف مکمل یکسو ہونا ہے (۲) الاختصاصُ، خصوصی تعلق۔ (۳) الاصطِفاءُ کسی کو محبت کے لئے منتخب کر لینا۔ (۴) صَفَاءُ المَودةِ بِتَخَلُّلِ الاَسرَارِ ایسی مخلصانہ محبت کہ راز و نیاز میں کوئی خفا باقی نہ رہے۔ (۵) الخلیلُ من لایَسَعُ قَلبُهُ لِغَیرِ الخَلِیلِ یعنی اتنی زیادہ محبت کہ اس کے بعد دل میں کسی دوسرے کے تعلق کی گنجائش ہی نہ رہے امام نوویؒ اس جملے کی یوں وضاحت کرتے ہیں ای اَبرأ اِلَیه مِن مُخالَّةِ ایاہ[1] یعنی میں ہر شخص سے اپنی گہری دوستی سے برأت کرتا ہوں کیونکہ یہ تو صرف اللہ کا حق ہے۔

﴿ولو کنت متخذاً خلیلاً لا تخذت ابا بکر خلیلاً﴾ خلیل کے معنی کی تعین کے بعد امام نوویؒ کے الفاظ میں حدیث کا مطلب یہ ہوا ومعنی الحدیثِ اَنَّ حُبَّ اللّٰهِ تعالٰی لم یُبقِ فی قَلبِهِ مَوضِعاً لِغَیرِہٖ[2] اللہ کی محبت نے کسی دوسرے کی محبت کی دل میں گنجائش نہیں چھوڑی علامہ سندھی نے اسی مفہوم کو کچھ اور پھیلایا ہے لو جَازَ لِی اَن اَتخِذَ صدیقاً مِنَ الخَلقِ تَتَخَلَّلُ محبتُه فِی باطِنِی وَقلبِی ویَکونُ مطَّلِعاً علٰی سِرِّی لَاتَّخَذتُ اَبا بکرٍ لکِن مَحبُوبِی بھٰذہِ الصِفَةِ ھُو اللّٰهُ اگر مخلوق میں میرے لیے کسی کو ایسا دوست بنانا جائز ہوتا جس کی محبت میرے دل کے گہرائیوں میں ہوتی اور وہ میرے راز کو بھی جانتا تو اس کے لیے میں ابو بکر کو منتخب کرتا لیکن میرا ایسا محبوب تو صرف اللہ ہے۔

یہاں یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ محبت وخلة میں کون افضل ہے امام نوویؒ نے متکلمین کے تین اقوال نقل کئے ہیں[3]۔

(۱) ھُما بِمعنی فلا یکونُ الحَبِیبُ اِلاخلیلاً ولا یکونُ الخلیلُ اِلا حبیبًا

---

[1] صحیح مسلم ۲/۲۷۳ [2] [3] صحیح مسلم ۲/۲۷۲

دونوں مترادف ہیں اسی لئے ہر حبیب خلیل ہے اور ہر خلیل حبیب ہے۔

(۲) الحبیبُ یُرفَعُ لِاَنہا صفةُ نبینا ﷺ وھو أفضلُ مِنَ الخلیلِ حبیب کا درجہ اونچا ہے کیونکہ وہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے اور وہ خلیل سے افضل ہیں۔

(۳) الخلیل أرفع خلیل کا درجہ اونچا ہے فقد ثَبتتَ خُلةُ نَبینا ﷺ للّٰہ تعالیٰ.

تینوں میں کونسا قول راجح ہے عموماً محدثین نے اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا، ہمارے نزدیک پہلی رائے زیادہ وزنی ہے تو آپ کی فضیلت حضرت ابراہیم پر بایں معنی ثابت ہوگی کہ وہ صرف خلیل تھے جب کہ حضور حبیب بھی ہیں، تو ان کی بنسبت اللہ تعالیٰ سے آپ کا دوہرا تعلق ہوا، بعض روایتوں میں خلیلی من امتی ابوبکر کے جو الفاظ آتے ہیں محققین کے نزدیک وہ ضعیف و ناقابل اعتبار ہیں حقیقت حدیث باب ہی میں منقول ہے اسی طرح حضرت ابوہریرہ اور ابوذر غفاری جو اللہ کے رسول کو خلیلی کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں حافظ ابن حجر نے لکھا ذٰلك جَائِزٌ لَھم ولایَجُوزُ لِلواحد منھم اَن یقول اَنا خلیلُ النبیؐ[1] یہ کہنا جائز ہے، کیونکہ حضورؐ ان میں سے ہر ایک کے خلیل تھے ہاں البتہ کسی صحابی کے لئے یہ کہنا درست نہیں کہ میں نبی کا خلیل ہوں۔

﴿ان صاحبکم خلیل اللّٰہ﴾ صحیح مسلم میں وقَد اِتَّخذَ اللّٰہُ صَاحِبَکُم خلیلاً منقول ہے...... حدیث مسلم (فضائل/۴۰) ترمذی (مناقب/۱۰) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی پہلے راوی کو چھوڑ کر بعینہٖ مسلم کی ہے۔

(۹۵/۲) حَدَّثَنَا أَبُوْ بَكْرِ بْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ، وَعَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، قَالَا: ثَنَا اَبُوْمَعَاوِيَةَ، ثَنَا الْأَعْمَشُ، عَنْ أَبِيْ صَالِحٍ، عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ "مَا نَفَعَنِيْ مَالٌ قَطُّ ، مَانَفَعَنِيْ مَالُ اَبِيْ بَكْرٍ" قَالَ فَبَكَى اَبُوْبَكْرٍ، وَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ أَنَا وَمَالِيْ! اِلَّالَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!

کسی کے مال نے مجھے اتنا فائدہ نہیں پہنچایا جتنا کہ ابوبکر کے مال نے پہنچایا راوی کہتے ہیں کہ ابوبکر رو پڑے اور عرض کیا اے اللہ کے رسول میں اور میرا مال آپ ہی کا تو ہے۔

---

[1] فتح الباری ۱۳/۷

صحیح مسلم میں اِنَّ مِن أمنَّ النَّاسِ عليَّ في مَالِهِ وصُحبَتِهٖ اَبُوْبكرٍ منقول ہے یہ در اصل اوپر والی حدیث ہی کا ایک حصہ ہے ترمذی میں اس سے پہلے ما لِاَحدٍ عِندَنَا يَدٌ الا وقَد كَافِيْنَاه مَاخَلَا اَبُوبكرٍ فاِنَّ له عِندَنَا يداً يُكَا فِيهِ اللّٰهُ بها يومَ القِيَامَةِ بھی آیا ہے یعنی میں نے سب کے احسانات کا بدلہ چکا دیا سوائے ابوبکر کے ان کو اللہ تعالیٰ قیامت ہی میں اس کا صلہ دے گا۔

اسلام کو ابتدائی دور میں جب اسباب وسائل کی سخت ضرورت تھی حضرت ابوبکر نے اس وقت اپنی دولت کو لٹایا ابن سعد سے منقول ہے أسلَمَ أبُوبكرٍ وَلهُ اَربعُون الفاً، أنفَقَهَا كُلَّها عَلى رسولِ اللّٰهِ صلى الله وسلم وفى سبيلِ اللّٰه اسی طرح سابقین اولین میں بلال حبشی، عامر ابن فہیرہ، زنیرہ اور نہدیہ وغیرہ جیسے غلاموں کو خرید کر انہوں نے آزاد کیا حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ مسجد نبوی کی زمین کی قیمت بھی رسول اللہ نے انہی سے دلوائی تھی غزوۂ تبوک کے موقع پر جب آپ نے صحابہ سے تعاون کی اپیل کی تو انہوں نے سارا اثاثہ لا کر نبی کے قدموں میں رکھ دیا۔

صحابہ کرام اپنی فضیلت پر خوش ہونے کے بجائے تواضع میں رو پڑے تھے، یہ دراصل صدیق اکبر کی خلافت کا اشارہ ہے پہلا اشارہ آپ نے ۹/ھ میں انہیں امیر الحج بنا کر کیا دوسرا شارہ امامت کی صورت میں ظاہر ہوا حدیث باہمیں اور زیادہ واضح اشارہ ہے امام ترمذی نے ابواب المناقب ''باب مناقب ابی بکر'' میں اسے اپنی سند سے روایت کیا ہے جس کو وہ حسن غریب من هذا الوجه قرار دیتے ہیں جب کہ ابن ماجہ کی سند صحیح ہے بوصیری نے زوائد (۵۴/۱) میں لکھا ہے ''هذا اسناد رجاله ثقات''

(۹۶/۳) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ ثَنَا سُفْيَانُ عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عُمَارَةَ، عَنْ فِرَاسٍ عَنِ الشَّعْبِيِّ، عَنِ الْحَارِثِ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى اللّٰه عليه وسلم اَبُوْبَكرٍ وَعُمَرُ سَيِّدَاكُهُولِ اَهْلِ الْجَنَّةِ مِنَ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ اِلَّا النَّبِيِّيْنَ وَالْمُرْسَلِيْنَ لَاتُخبِرْهُمَا يَاعَلِيُّ! مَادَامَ حَيَّيْنِ.

ابوبکر اور عمر انبیاء ورسل کو چھوڑ کر جنت میں اگلے پچھلے تمام ادھیڑ عمر لوگوں کے سردار

ہوں گے، اے علی! وہ دونوں جب تک زندہ رہیں تم انہیں اس کی اطلاع نہ کرنا۔

﴿سیدا کھول اھل الجنۃ﴾ ترمذی میں پس منظر بھی موجود ہے حضرت علی کہتے ہیں کنتُ مع رسولِ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اِذ طَلَعَ اَبُوْبَکْرٍ وَعُمَرُ پھر آپ نے یہ فضیلت بیان کی کھل کی بابت ملا علی قاریؒ نے قاموس کے حوالہ سے "من جاوزَ الثلاثین اواربعاً وثلاثین الی احدی وخمسین[1]" کی وضاحت کی ہے جس کی رو سے ہر وہ شخص کھل ہے جو ۳۰ سے ۵۱ یا ۳۴ سے ۵۱ کے درمیان ہو طیبی فرماتے ہیں اُعْتُبِرَ مَا کَانُوْا علیہِ فی الدُّنیا وَاِلا فَلیس فی الجنۃِ کُھَلٌ یعنی دنیا کے اعتبار سے کھل کہا گیا ورنہ جنت میں کوئی ادھیڑ نہ ہوگا جیسا کہ مسلم وترمذی کی روایت بتلاتی ہے۔[2]

یہاں ایک اشکال ترمذی کی روایت الحسن والحسین سیدا شباب اھل الجنۃ[3] سے ہوتا ہے، کہ جنتی سب جوان ہوں گے اور ان کے سردار حضرت حسنینؓ ہوں گے تو پھر حدیث باب کا کیا مطلب ہوگا حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں فمَا وَرَدَ فِی شَانِ الحسنَین رضی اللّٰہ عنھما دُونَ ماوَرَدَ فی شانِ الشَیخین فَلا یَلزمُ المعارضۃُ فھُما سید ان لِمَن ماتَ شاباً وھذان لِلکُلِّ[4] یعنی حضرت حسنین کی فضیلت شیخین کی فضیلت سے بالکل الگ ہے اس لئے کوئی تعارض نہیں کیونکہ وہ دونوں صرف جواں مردوں کے سردار ہوں گے اور یہ حضرات تمام جنتیوں کے سردار ہوں گے۔

﴿من الأولین﴾ ملا علی قاری نے لکھا ہے ای مِن اولیاءِ الأُمَمِ المُتقدمین فَیَکُونَان افضلَ مِن اَصحابِ الکھفِ ومُومنِ ال فِرعَونَ ومِنَ الخَضَرِ أیضاً عَلی القَولِ بِاَنہ ولی[5] یعنی امم سابقہ کے تمام اولیاء کے بھی سردار ہوں گے کیونکہ وہ اصحاب کہف، فرعون کے دربار کے مومن اور خضر سے بھی افضل ہیں بشرطیکہ خضر کو نبی کے بجائے ولی مانا جائے۔

﴿والاخرین﴾ ملا علی قاری فرماتے ہیں ای مِن اولیاءِ ھٰذہِ الأُمَّۃ وعُلمائِھم وشُھدائِھم یعنی امت محمدیہ کے اولیاء علماء اور شہداء کے بھی سردار ہوں گے۔

---

1. مرقاۃ المفاتیح مناقب ابی بکر وعمر فصل دوم حدیث ۲
2. صحیح مسلم جامع ترمذی
3. ترمذی ابواب المناقب مناقب الحسن والحسین
4. الکوکب الدری ۲/ ۳۱۸
5. مرقاۃ/ ابی بکر وعمر

﴿الا النبین والمرسلین﴾ انبیاء ورسل کے سردار نہیں ہوں گے اس کے ذریعہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خصوصا استثناء کیا گیا کیونکہ وہ امت محمدیہ کے آخرین میں شامل ہیں اسی طرح خضر بھی بشرطیکہ ان کو نبی مانا جائے ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں فخرجَ عِیسی عَلیه السلام و کذا الخَضِرُ علی القول بِنبوَّتهٖ[1]۔

﴿لاتخبرهما یا علی! ما داما حییّن﴾ یہ فضیلت شیخین کو بتانے سے کیوں منع کیا؟ اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا کہ بشری تقاضے کے تحت عجب میں مبتلا ہونے کا اندیشہ تھا ملا علی قاری نے لکھا ہے اِن مَنْزِلَتهُمَا عِندهٗ صلی الله علیه وسلم اعلیٰ مِن ذلک[2] یعنی اللہ کے رسول کے نزدیک دونوں حضرات کا مقام اس سے کہیں زیادہ بلند ہے کہ ان کے بارے میں اس طرح کا اندیشہ کیا جائے بلکہ حضرت گنگوہی نے اور زیادہ سختی کے ساتھ لکھا ہے فَمَنقَصَةٌ لَهُمَا بِسُوءِ ظَنٍّ باَصحابِ النبی صلی الله علیه وسلم وحَطٌّ لهما عن دَرجتِهما عجب کی بات حضرات شیخین کی شان میں گستاخی اور صحابہ سے بدگمانی کرنا ہے جو یقیناً جائز نہیں اب اس کی قریب تر دو ہی توجیہات ہیں۔

(۱) ملا علی قاری فرماتے ہیں انما معناه والله اعلم لا تُخبرهُما یَاعَلیُّ قَبلی لِأُبَشرَهُمَا بِنَفسِی فَیَبلُغُهُمَا السرورُ منی[3] ممانعت کی وجہ یہ تھی کہ آپ بنفس نفیس انہیں بشارت دیں اور مسرت کا یہ پیغام انہیں براہ راست آپ کی جانب سے پہنچے حضرت گنگوہی نے ایک دوسری علمی شق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے فیکونُ العلمُ الحاصلُ لهما بِخَبرِهٖ عِلمُ یقینٍ بِخِلافِ اِخبارِ علیٍ فَاِنَ العِلمَ الحاصلَ بهٖ لکانَ ظنیاً[4] کیونکہ خود آپ کی خبر دینے کی صورت میں شیخین کو علم یقین حاصل ہوگا جب کہ حضرت علی کی اطلاع کا درجہ ظنی علم کا ہوگا۔

(۲) حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں انما نهٰی عنِ الاَخبارِ لیکونَ مَا یَحصُلُ لَهما بعدَ الحَشرِ نعمةً غیرَ مُتَرقِبَة فیکونُ السرورُ بهٖ اَوفَرَ منه اِذا کَانَا یَجد انهٖ عَلی انتظارِ منهما وتَرَقب[5] ممانعت کی وجہ یہ تھی کہ یہ چیز انہیں محشر میں نعمت غیر مترقبہ کے طور پر معلوم ہو تو خوشی اس سے کہیں زیادہ ہوگی جب کہ وہ انتظار وامید کے بعد اس مقام کو پائیں۔

---

[1] [2] [3] مرقاۃ المفاتیح مناقب ابی بکر وعمر فصل دوم حدیث ۲ [4] [5] الکوکب الدری ۲/۳۱۹

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ نے پہلی کو ترجیح دی ہے لیکن یہ بات محلِ نظر ہے کیونکہ حضور کا مقصد اگر خود بشارت دینا ہوتا تو لا تخبرهما یا علی پر اکتفاء کرلیا جاتا مادا ما حیین کے تو یہ الفاظ ہی بتاتے ہیں کہ آپکا مقصد یہ نہ تھا بلکہ ان دونوں سے اس فضیلت کو مخفی ہی رکھنا تھا اس لئے ہمارے ناقص خیال میں دوسری توجیہ زیادہ وزنی ہے علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے ذَکرَ لِافَادةِ التَابیدِ لأن لا یُظَنُّ تخصیصُ النبی بالحَال وِالا فلا یُتصورُ الاخبارُ بعدَ الموتَ یہ خبر ہمیشہ کے لئے ہے اور اس میں نبی کی بابت حال کا گمان نہ کیا جائے ورنہ فوت کے بعد اطلاع کا کوئی جواز نہیں۔

حدیث ترمذی (مناقب/۱۰) میں بھی آئی ہے اور امام نے اسے حسن غریب من هذا الوجه والولیدبن محمد الموقری یضعف فی الحدیث کہا ہے جب کہ ابن ماجہ کی سند میں حسن بن عمارہ راوی مسلم، نسائی، ابوحاتم، ابن معین، ساجی، دارقطنی، احمد بن حنبل اور ابن حجر کے نزدیک بالاتفاق متروکؒ[1] ہے، اس لئے الدیباجۃ (۱/ ۴۶۱) میں اسناده ضعیفٌ کا فیصلہ کیا ہے۔

(۴/۹۷) حَدَّثَنَا عَلِیُّ بْنُ مُحَمَّدٍ وَعَمْرُو بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ قَالاَ ثَنَا وَکِیعٌ ثَنَا الْأَعْمَشُ عَنْ عَطِیَّةَ بْنِ سَعْدٍعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اَهْلَ الدَّرَجَاتِ الْعُلٰی یَرَاهُمْ مَنْ اَسْفَلَ مِنْهُمْ کَمَا یُرٰی الْکَوْکَبُ الطَّالِعُ فِیْ الْاُفُقِ مِنْ اٰفَاقِ السَّمَاءِ وَاِنَّ اَبَا بَکْرٍ وَعُمَرَ مِنْهُمْ وَاَنْعَمَا

حضور ﷺ نے فرمایا کہ سب سے بلند درجے والے جنتیوں کو ان سے نچلے درجے کے جنتی ایسے دیکھیں گے جیسا کہ آسمان کے کنارے پر طلوع ہونے والا تارہ دکھائی پڑتا ہے ابوبکر وعمر انہیں بلند مرتبہ لوگوں میں ہیں بلکہ ان سے بھی کچھ آگے ہی ہیں۔

﴿ان أهل الدرجات العلی یراهم من اسفل منهم﴾ مشکوۃ باب مناقب ابی بکرو عمر فصل دوم میں یہ حدیث مصنف نے شرح السنۃ کے حوالے سے نقل کی ہے جس میں خط کشیدہ الفاظ قدرے مختلف ہیں یعنی اِن اهلَ الجنةِ لَیتراؤونَ اهلَ عِلیین کما

---

[1] ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب (۲/۲۶۳)

تَرون الکَوکب الدُریُّ فی السّماءِ یعنی اہل جنت اہل علیین کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم آسمان میں درخشاں ستارے کو دیکھتے ہو۔

﴿کما یری الکوکب الطالع﴾ مشکوٰۃ میں الکوکب الدری اور مسند احمد میں ان الفاظ کے ساتھ الغابر کا بھی اضافہ ہے ملا علی قاریؒ نے اس کا مطلب المُضِیئی کَالدُرا والدافِعُ بِنورِہ ظلمةَ مَاحولهٗ[1] نقل کیا ہے یعنی موتی کی طرح روشن یا اپنی تابنا کی سے اردگرد کی تاریکیوں کو چھانٹنے والا ستارہ، گویا ان حضرات کا مقام اتنا بلند ہے کہ وہ دوسرے جنتیوں کو تارے کی مانند دکھائی دیں گے۔

﴿وان ابا بکر وعمر منهم وانعما﴾ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ تقدیر عبارت یوں ہے ای استقرا منهم وانعما[2] وہ دونوں ان لوگوں میں شامل ہیں انعما اشمل کی طرح ہے یعنی مادے کو باب افعال میں پہنچا کر ابتداء وبلوغ کے معنی پیدا کرنا اشمل شمال کی طرف جانا اور اعرق عراق میں پہنچا، کلام عرب میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں تو ملا علی قاریؒ کے الفاظ میں ابتدائی معنی تو دخل فی النعیم[3] اور انتہائی معنی زَادَا فی الدرجةِ والرتبةِ وتَجاوزا عن کونِهما اهلَ عِلیین فی المنزلة[4] ان کا مقام ومرتبہ بڑھ گیا بلکہ وہ اہل علیین سے بھی آگے بڑھ گئے علامہ سندھیؒ نے بھی یہی دو مفہوم نقل کئے ہیں جب کہ سیوطی کے حوالے سے انہوں نے حضرت ابوسعید کی وما انعما کی تشریح هما اهل لذلك نقل کی یعنی وہ دونوں اس مقام کے مستحق ہیں...... سند کی بابت الدیباجة علی ابن ماجہ (۱/۴۶۴) میں اسنادہ حسن کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

(۵/۹۸) حَدَّثَنَا عَلِیٌّ بْنُ مُحَمَّدٍ، ثَنَا وَکِیْعٌ، ح وَحَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ، ثَنَا مُؤَمَّلٌ قَالَا: ثَنَا سُفْیَانُ، عَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ عُمَیْرٍ، عَنْ مَوْلًی لِرِبْعِیِّ بْنِ حِرَاشٍ، عَنْ رِبْعِیِّ بْنِ حِرَاشٍ عَنْ حُذَیْفَةَ بْنِ الْیَمَانِ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم اِنِّیْ لَا اَدْرِیْ مَاقَدْرُ بَقَائِیْ فِیْکُمْ، فَاقْتَدُوْا بِالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِیْ وَاَشَارَ اِلٰی اَبِیْ بَکْرٍ وَعُمَرَ.

---

[1] [2] [3] [4] مرقاۃ المفاتیح مناقب ابی بکر وعمر فصل دوم حدیث ۱

فرمایا مجھے معلوم نہیں کہ میں تم میں کب تک موجود رہوں گا اس لئے میرے بعد ان دونوں کی اقتدا کرنا اور آپ نے ابوبکر و عمر کی طرف اشارہ کیا۔

جامع ترمذی میں پس منظر کے طور پر حضرت حذیفہ کا یہ بیان بھی موجود ہے کنا جلوسا عند النبی ﷺ (انی لا ادری ماقدر بقائی فیکم) طیبیؒ نے ما کو استفہامیہ قرار دے کر اس کے معنی یہ بتلائے لَا اَدْرِیْ کَمْ مدةَ بَقائی فِیکُم اَقَلِیلٌ اَم کَثِیْرٌ مجھے اپنی عمر کی بابت معلوم نہیں کہ وہ زیادہ ہے یا تھوڑی علامہ سندھی اور ملا علی قاری نے بھی یہی قول نقل کیا ہے۔

﴿فاقتدوا باللذین من بعدی﴾ علامہ سندھی لکھتے ہیں وفیه تنبیهٌ علی خِلَافِتِهِما بعده ﷺ یہ ان کی خلافت کا اشارہ ہے تعیین نہیں کیونکہ امت مشورہ کی بنیاد پر خلافت صدیقی کے انعقاد کا عقیدہ رکھتی ہے امام طحاویؒ نے مشکل الاثار میں ان الفاظ کی یہ وضاحت کی ہے اَنْ تَمَثَّلُوْا مِثْلَهُمَا وان تَحذوا حذوهُمَا فِيْمَا يكونُ بينَهما مِن اَمرِ الدينِ وَالا تَخْرجوا عنهما الى غيرهما[1] یعنی تم لوگ ان کی پیروی اور نقش قدم کی اتباع کرنا اور ان کی موافقت سے انحراف نہ کرنا۔ گویا رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعہ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وفات کے بعد ابوبکر و عمر ہی یکے بعد دیگرے آپ کی امت کی قیادت کریں گے۔

حدیث ترمذی (مناقب/ابی بکر) میں بھی آئی ہے، ابن ماجہ کی سند میں مؤمل بن اسمٰعیل عدوی کو محدثین نے منکر کثیر الخطاء کثیر الغلط اور ابن حجر نے تقریب (۷۰۲۹) میں صدوق سیئی الحفظ قرار دیا ہے اس لئے سند کو الدیباجہ علی ابن ماجہ (۱/ ۴۶۵) میں اسناده حسن لغیره قرار دیا گیا ہے جب کہ ترمذی کی سند اس سے بہتر ہے۔

(۶/۹۹) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ، ثَنَا يَحْيَى بْنُ آدَمَ، ثَنَا ابْنُ الْمُبَارَكِ ، عَنْ عُمَرَ بْنِ سَعِيْدِ بْنِ اَبِي حُسَيْنٍ ، عَنِ ابْنِ اَبِي مُلَيْكَةَ، قَالَ: سَمِعتُ ابْنَ عَبَّاسٍ يَقُوْلُ لَمَّا وُضِعَ عُمَرُ عَلَى سَرِيْرِهٖ، اِكْتَنَفَهُ النَّاسُ يَدْعُوْنَ وَيُصَلُّوْنَ اَوْقَالَ يُثْنُوْنَ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْهِ قَبْلَ اَنْ يُّرْفَعَ وَاَنَافِيْهِمْ فَلَمْ يَرُعْنِي اِلَّارَجُلٌ قَدْ زَحَمَنِيْ وَاَخَذَ بِمَنْكَبِيْ فَالْتَفَتُّ فَاِذَا عَلِيُّ بْنُ اَبِي طَالِبٍ

[1] الدیباجہ علی ابن ماجہ ۱/ ۴۶

فَتَرَحَّمَ عَلَى عُمَرَ، ثُمَّ قَالَ: مَاخَلَّفْتَ اَحَدًا اَحَبَّ اِلَيَّ اَنْ اَلْقَى اللّٰهَ بِمِثْلِ عَمَلِهِ مِنْكَ، وَاَيْمُ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُ لا ظُنَّ لَيَجْعَلَنَّكَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ مَعَ صَاحِبَيْكَ وَذٰلِكَ اَنِّي كُنْتُ اَكْثَرَ اَنْ اَسْمَعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "ذَهَبْتُ اَنَا وَاَبُوْ بَكْرٍ وَعُمَرُ، وَدَخَلْتُ اَنَا وَاَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ وَخَرَجْتُ اَنَا وَاَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ" فَكُنْتُ اَظُنُّ لَيَجْعَلَنَّكَ اللّٰهُ مَعَ صَاحِبَيْكَ.

ابوملیکہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب حضرت عمرؓ کو تخت پر رکھا گیا تو ان کے گرد لوگوں کی بھیڑ لگ گئی وہ سب محاسن کو یاد کرنے کے ساتھ ان کے لئے دعائے مغفرت کررہے تھے اس وقت جنازہ نہیں اٹھا تھا اور میں بھی وہاں پر موجود تھا کہ اچانک ایک شخص نے مجھے خوف زدہ کردیا مجھے دھکیلتے ہوئے آگے آیا اور میرا کاندھا پکڑ لیا مڑ کر دیکھا تو وہ حضرت علیؓ تھے وہ رحمت کی دعا کررہے تھے اور کہہ رہے تھے، اے عمرؓ تم نے اپنے بعد کوئی شخص ایسا نہیں چھوڑا کہ اس کے عمل کو لے کر میں اللہ سے ملنے کی آرزو کروں خدا کی قسم مجھے اس بات کا یقین تھا کہ اللہ تم کو تمہارے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ ہی رکھے گا اور یہ اس لئے کہ میں نے بارہا حضور ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں اور ابوبکر وعمر آئے، میں اور ابوبکر وعمر داخل ہوئے، میں اور ابوبکر وعمر نکلے، مجھے اسی وقت سے یقین تھا کہ خداوند قدوس تم کو بھی ضرور تمہارے دونوں ساتھیوں کے ساتھ رکھے گا۔

﴿لما وضع عمر علی سریرہ﴾ یہاں دو احتمال ہیں۔

(۱) لِلْغُسلِ بعدَ المَوتِ یعنی موت کے بعد آپ کو غسل دینے کے لئے تخت پر رکھا گیا، ملاعلی قاری اور شیخ عبدالحق دہلویؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

(۲) دوسرا احتمال علامہ سندھیؒ نے یہ ظاہر کیا ہے للحمل الی المقبرۃ یعنی غسل وتکفین کے بعد قبرستان لے جانے کے لئے انہیں جنازے پر رکھا گیا اس وقت لوگ جمع ہوئے اور حضرت علی نے آکر خراج عقیدت پیش کیا بخاری ومستدرک حاکم میں منقول ہے کہ وفات سے پہلے خلیفہ ثانی نے حضرت عائشہ سے ان کے حجرے میں دفن ہونے کی اجازت مانگی تھی انہوں نے بخوشی مرحمت فرمادی پھر بھی حضرت عمر نے تدفین سے پہلے ورثہ کو دوبارہ اجازت

لینے کی تاکید کی تھی چنانچہ جب دفن طے ہوگیا تو غالباً حضرت علی نے آ کر یہ باتیں کہیں علامہ سندھیؒ نے وهو الأوفق بقوله قبل أن يرفع لکھ کر اسی کو ترجیح دی ہے اور امام نووی کا قول والسرير هنا النعش[1] بھی اسی کی تائید میں ہے کیونکہ نعش تیار جنازے کو کہتے ہیں ذوق بھی پہلی توجیہ میں بعد اور دوسری میں واقعیت محسوس کرتا ہے۔

﴿يدعون ويصلون﴾ شیخ الاسلام حضرت کشمیریؒ فرماتے ہیں وَلَعَلَّهُ كَانت عندَهُم سُنةُ الامواتِ أن يُقالَ عندَهم نحوُ تِلكَ الكلماتِ كما هو المعروفُ بَينَنا أيضاً فإنا اذا حضَرنَا ميتًا نقولُ بنحوِ تلك الكلماتِ[2].

شاید موت کے وقت یہ صحابہ کا طریقہ تھا کہ مرحومین کے پاس پہنچ کر رحمت و مغفرت پر مشتمل دعائیہ کلمات کہے جائیں جیسا کہ وہ آج بھی ہمارے یہاں رائج ہے ہم جب کسی جنازے کے پاس پہنچتے ہیں تو اس طرح کے الفاظ کہتے ہیں۔

﴿فلم يرعني﴾ روعاً سے مشتق ہے گھبراہٹ میں مبتلا کر دینا۔

﴿فترحم على عمر﴾ بخاری کے طریق میں يرحمك الله کے الفاظ منقول ہیں۔

﴿وان كنت لأظن﴾ یہ انی کا مخفف ہے بخاری کی روایت میں لأرجو ہے

﴿ماخلفتَ احداً احب الی﴾ ابن حجر نے لکھا ہے کہ احب میں رفع نصب دونوں جائز ہیں رفعی حالت میں اسے مبتداء محذوف کی خبر مانا جائے گا جب کہ نصب کی صورت میں وہ احداً کی صفت ہے۔

﴿ذلك انی كنت اكثر ان اسمع﴾ بخاری میں لأني كثيراً ما كنت اسمع کے الفاظ ہیں علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ اكثر مبتداء ہے خبر محذوف ہے اور پورا جملہ كنت کی خبر ہے۔

﴿ليجعلنك الله مع صاحبيك﴾ ملا علی قاریؒ نے مرقاۃ المفاتیحؒ میں حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں علامہ قسطلانی نے ارشاد الساری میں دو قول نقل کئے ہیں (۱) یہاں حضرت علی کی مراد روضۂ اقدس میں حضرت عمر کی تدفین ہے کہ دنیا کی طرح وہ آخرت کی منزل میں بھی

---

[1] صحیح مسلم ۲/۲۷۴ [2] فیض الباری ۴/۶۴ [3] ارشاد الساری ۶/۱۰۲

نبی وصدیق کے قرب وجوار میں رہیں گے۔

(۲) یہاں موت کے بعد جنت میں ان دونوں حضرات کے ساتھ حضرت عمر کی رفاقت مراد ہے عموماً محدثین نے دونوں اقوال میں ترجیح سے گریز کیا ہے اور شیخ عبدالغنی مجددی نے تطبیق دیتے ہوئے لکھا ہے ای فی الدفن والبعث یوم الحشر والمرافقة فی الجنة یہ عمدہ توجیہ ہے لیکن ہمارے نزدیک حضرت علی نے یہاں قرب تدفین کو ہی مرادلیا ہے کیونکہ جنت میں رفاقت تو دوسرے صحابہ کو بھی ہوگی.........حدیث صحیح بخاری (مناقب/۳۴،۳۳)، صحیح مسلم (فضائل الصحابہ۲) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی بالکل صحیح ہے۔

(۱۰۰/۷) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مَيْمُوْنٍ الرُّقِّيُّ ثَنَا سَعِيْدُ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ اِسْمٰعِيلَ بْنِ اُمَيَّةَ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ اَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ فَقَالَ هٰكَذَا نُبْعَثُ

رسول اللہ ﷺ ابوبکر وعمر کے درمیان باہر نکلے اور فرمایا ہمیں اسی طرح اٹھایا جائے گا۔

جامع ترمذی میں یہ روایت قدرِ وضاحت کے ساتھ آئی ہے خرَجَ ذَاتَ یومٍ فدخلَ المسجد وَابوبکرٍ وعمرُ احدُهمَا عن یَمینهٖ والاٰخرُ عن شِمالهٖ وهو اخِذٌ بِاَیدیهِما فَقالَ هکذا نُبعثُ یَومَ القِیامةِ .

﴿هکذا نبعث﴾ ملا علی قاری کہتے ہیں ای نخرُج منَ القبورِ اِلیٰ مَوضعِ النُّشورِ[۱] علامہ دمیری فرماتے ہیں فیه واللّٰه اعلم اشارةٌ اِلی اَنهمَا یُدفَنانِ مَعه فِی تُربةٍ ویَقومَانِ مَعه فِیهَا فِی صُحبتهٖ[۲] حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک ہی جگہ شیخین کی تدفین کی طرف اشارہ ہے، پھر قیامت میں بھی وہ دونوں آپ ہی کے ساتھ قبر سے اٹھیں گے، حدیث باب کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو امام ترمذی نے نقل کی ہے۔

قال رسول اللّٰه ﷺ انا أول من تَنشقُّ عنه الارضُ ثم ابوبکرٍ ثم عمرُ ثم اتی اهلَ البقیعِ فیُحشرُون معی ثم اَنتَظِرُ اهلَ مکةَ حتیٰ اُحشَرَ بَینَ الحَرمَین ......حدیث ترمذی مناقب ابی بکر میں بھی آئی ہے اور مصنف نے اس پر هذا حدیث غریب

---

۱ مرقاۃ المفاتیح ۳۱۶/۱۱ ۲ الدیباجہ علی ابن ماجہ ۴۷/۱۳

وسعید بن مسلمة لیس عند هم بالقوی کا تبصرہ کیا ہے یہ راوی ابن ماجہ کی سند میں بھی موجود ہے اس لئے الدیباجہ علی ابن ماجہ (۱/۴۷۱) میں اسناده ضعیف کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

(۱۰۱/۸) حَدَّثَنَا اَبُوْشُعَيْبٍ صَالِحُ بْنُ الْهَيْثَمِ الْوَاسِطِيُّ، ثَنَا عَبْدُ الْقُدُّوْسِ بْنُ بَكْرِ بْنِ خُنَيْسٍ ثَنَا مَالِكُ بْنُ مِغْوَلٍ عَنْ عَوْنِ بْنِ اَبِيْ جُحَيْفَةَ، عَنْ اَبِيْهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ سَيِّدَا كُهُوْلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ مِنَ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ اِلَّا النَّبِيِّيْنَ وَالْمُرْسَلِيْنَ"

تمام رواۃ ثقہ ہیں اس لئے الدیباجه علی ابن ماجه (۱/۴۷۷) میں مصنف نے اسناده صحیح لغیره کا فیصلہ کیا ہے شرح باب کی تیسری حدیث میں گذر چکی ہے۔

(۱۰۲/۹) حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ عَبْدَةَ، وَالْحُسَيْنُ بْنُ الْحَسَنِ الْمَرْوَزِيُّ قَالَا: حَدَّثَنَا الْمُعْتَمِرُ بْنُ سُلَيْمَانَ عَنْ حُمَيْدٍ عَنْ اَنَسٍ قَالَ: قِيْلَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَيُّ النَّاسِ اَحَبُّ اِلَيْكَ؟ قَالَ "عَائِشَةُ" قِيْلَ: مِنَ الرِّجَالِ؟ قَالَ "اَبُوْهَا"

پوچھا گیا اے اللہ کے رسول!! آپ کو سب سے زیادہ کن محبوب ہے، فرمایا عائشہ، پوچھا گیا مردوں میں؟ فرمایا اس کے والد۔ غزوۂ موتہ کے بعد شامی قبائل کی تادیب کے لئے رسول اللہ ﷺ نے جمادی الاخری آٹھ ہجری میں تین سو انصاری ومہاجرین پر مشتمل ایک لشکر روانہ فرمایا جس کے امیر حضرت عمرو بن العاص تھے، بعد میں حضرت ابوعبیدہؓ کی امارت میں دو سو صحابہ کی ایک کمک اور بھیجی گئی جس میں ابوبکر وعمر بھی شامل تھے، دشمنوں کو شکست دینے کے بعد جب ابن العاص ذات السلسل کی جنگ سے واپس آئے تو قسطلانی نے بیہقی کے حوالے سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے: فحدثتُ نفسی أنه لم یَبعثنِی عَلی قومٍ فِیهم ابوبکرٍ وعمرُ اِلا لِمَنزِلةِ لِی عندهٗ فأتیتُهٗ حتی قعدتُ بین یَدیْه فقلتُ یا رسولَ اللّٰه أیُّ النَّاسِ الخ[1] یعنی ابوبکر وعمر کی سربراہی کرنے کے بعد مجھے یہ خیال ہوا کہ میرا آپ کے نزدیک بڑا مرتبہ ہے چنانچہ میں نے آکر پوچھا۔

﴿قال عائشة﴾ ابن حجر نے صحیح ابن حبان اور ابن خزیمۃ کے حوالے سے ابن العاص کا یہ قول نقل کیا ہے انی لستُ اَعنی النساءَ اعنی الرجالَ[2] میں عورتوں کے بارے میں نہیں

[1] ارشاد الساری ۶/۴۲۶ [2] فتح الباری ۷/۲۶

بلکہ مردوں کی بابت پوچھ رہا ہوں۔

﴿قال ابوھا﴾ صحیح مسلم اور ترمذی میں حضرت عائشہ کی حدیث اس طرح ہے ثم مَن بعدَ ابی بکرٍ قَالت عمر ثم قیل لھا مَن بعدَ عمرَ قال ابُو عُبَیدۃَ بن الجراح کا بھی اضافہ ہے جب کہ صحیح بخاری میں اس کے بعد عمرو بن العاص کا یہ بیان بھی ہے "فعد رجَالاً" رسول اللہ ﷺ نے اور بھی چند لوگوں کے نام گنائے "فَسکَتُّ مخافۃَ اَن یَجعَلَنِی فی آخرھم، میں ڈر کر خاموش ہو گیا مبادا مجھے سب سے آخر میں کر دیں" شیخ الاسلام حضرت کشمیریؒ فرماتے ہیں "وھذا شأنُ الانبیاء عَلَیھم السلامُ لایتکلمُون الا بحقٍ فی المَنشطِ والمَکرہ[1]" انبیاء کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ مسرت وغم کسی موقع پر بھی حق بات کے علاوہ کوئی چیز زبان سے نہیں نکالتے صحابہ میں فضیلت کی یہی ترتیب تھی بخاری میں محمد ابن الحنفیہ کی روایت موجود ہے "قلت لأبی ای الناس خیر بعد النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ابوبکر قلت ثم من قال عمر وخشیت ان یقول عثمان قلت ثم أنت قال ما أنا الا رجل من المسلمین[2]" ذخیرہ حدیث میں اس مضمون کی بہت سی روایات موجود ہیں اس لئے اہل حق شیخین کو بالاتفاق تمام صحابہ سے افضل قرار دیتے ہیں اس لئے شیعوں سے متأثر ہو کر چند تفضیلیوں نے ان پر جو عثمان وعلی کو فوقیت دی ہے وہ اجماع صحابہ کی مخالفت ہے، مکمل بحث باب کے شروع میں موجود ہے.......... حدیث بخاری (مناقب/۲۳، مغازی/۶۵) مسلم (صحابہ/۱) اور ترمذی (مناقب/ عائشہ) میں بھی آئی ہے ترمذی نے پہلے طریق کو "حسن صحیح" اور دوسرے کو "حسن غریب" قرار دیا ہے جب کہ ابن ماجہ کی سند کو الدیباجہ علی ابن ماجہ (۱/۴۷۶) میں "اسنادہ صحیح لغیرہ" قرار دیا گیا ہے۔

فَضلُ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنہُ

نام عمر، کنیت ابوحفص، لقب فاروق ہے، والد کا نام خطاب اور والدہ کا نام ختمہ تھا سلسلۂ نسب اس طرح ہے عمر بنُ الخَطابِ بنِ نُفیلِ بنِ عَبدِ العُزیٰ بنِ رَباحِ بن عبدِ اللّٰہِ

[1] فیض الباری ۴/۱۴۰
[2] بخاری کتاب المناقب باب لو کنت نخذاً خلیلا

بنِ قُرطِ بن رَزَاحِ بنِ عَدِی بنِ کعبِ بنِ لُوی بنِ فِھرِ بنِ مالكٍ، عدی پر پہنچ کر آٹھویں پشت میں آپ کا نسب رسول اللہ ﷺ سے مل جاتا ہے کیونکہ عدی کے دوسرے بھائی مرہ تھے اور وہ رسول اللہ ﷺ کے اجداد میں سے ہیں حضرت عمرؓ کا رنگ گندم گوں، سر چندلا، رخسار کم گوشت، داڑھی گھنی، موچھیں واضح اور قد نہایت لمبا تھا بنو عدی قریش کا ممتاز خاندان تھا اور قضاء وسفارت کے عہدے اس میں چلے آرہے تھے حضرت عمرؓ کے نانا ہاشم بن مغیرہ جنگ میں قریش کی قیادت کرتے تھے آپ ہجرت سے چالیس سال پہلے پیدا ہوئے بچپن اور لڑکپن کے حالات پردۂ خفا میں ہیں قریشی جوانوں کی طرح نسب دانی، خطابت، سپہ گری، پہلوانی اور شہہ سواری پر عبور حاصل کیا نیز پڑھنا لکھنا بھی سیکھا جس کا جاہلیت میں بالکل رواج نہ تھا ذریعہ معاش تجارت تھا اس کی وجہ سے آپ نے دور دور ملکوں کا سفر کیا فہم وتدبر اور تجربہ کاری کی وجہ سے قریش نے انہیں اپنا سفیر بنایا۔

اسلام

شروع میں اسلام کے مخالف تھے اور مسلمانوں کو ستایا کرتے تھے، ۷ھ نبوی میں انہوں نے دین کو قبول کیا ان کے ایمان لانے کا جو قصہ عموماً مشہور ہے دارقطنی، ابن الجوزی ور حافظ ذہبیؒ نے اس پر تنقید کی ہے کیونکہ راوۃ پائے اعتبار سے ساقط ہیں مسند احمد بن حنبل کی روایت کے مطابق وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مسجد حرام میں قرآن سن کر متاثر ہوئے تھے جب کہ بخاری میں تصریح ہے کہ انہیں ایک بت سے لا الہ الا اللہ کی آواز آئی تھی، بہر حال وہ چالیسویں مسلمان تھے آپ کے اسلام سے مسلمانوں کو بڑی تقویت پہنچی اور انہوں نے علی الاعلان کعبے میں جا کر نماز ادا کی حضور ﷺ نے اس وقت انہیں فاروق کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

ہجرت

چھ سال بعد جب مکہ سے ہجرت کا حکم ہوا تو یہ فریضہ بھی دوسرے صحابہ کے برخلاف ڈنکے کی چوٹ ادا کیا مدینے میں آپ کا قیام عوالی میں تھا اور مواخاۃ عتبہ بن مالک سے کرائی گئی تھی جب دعوت وجہاد کا وسیع سلسلہ شروع ہوا تو حضرت عمرؓ چھوٹے بڑے تمام معرکوں میں حضور ﷺ

کے ساتھ تھے اور تبوک کے موقع پر تو انہوں نے اپنا آدھا مال لا کر حضورؐ کے قدموں میں ڈال دیا حضور ﷺ آخر تک آپ سے خوش رہے وفات نبوی کے بعد جب خلافت کے مسئلے پر بنو ساعدہ میں اختلاف رونما ہوا تو اسے فرو کرنے اور حضرت ابو بکر کی خلافت کو قائم کرنے میں سب سے اہم رول حضرت عمرؓ ہی کا تھا دور صدیقی میں وہ خلیفۂ اول کے دست راست بنے رہے اور تمام اہم امور خصوصاً تدوین قرآن میں بھی آپ کی شرکت رہی۔

خلافت

۱۳ھ بروز دوشنبہ جمادی الثانی کے آخری عشرہ میں حضرت ابو بکر کا انتقال ہوا انہوں نے بحیثیت خلیفہ حضرت عمرؓ کا تقرر کر دیا تھا چنانچہ مسند خلافت پر فائز ہوتے ہی حضرت عمرؓ نے صدیق اکبر کی مہمات کی تکمیل شروع کی روم وایران پر یلغار کر کے آپ نے قیصر و کسریٰ کی حکومتیں الٹ دیں ایک طرف قادسیہ اور نہاوند جیسی عظیم فتوحات ملیں تو دوسری جانب شام واردن اور فلسطین و مصر پر بھی اسلام کا پھریرا لہرا دیا مسجد و مدرسے قائم ہوئے عدالتیں بنیں امام اور قاضیوں کا تقرر ہوا مسافروں کے لئے سراؤں کا قیام عمل میں آیا ہر طرف نئے نئے شہر بسائے گئے دار الخزانہ اور جیل کی تعمیر بھی حضرت عمرؓ کی ایجاد ہے آپ کے فضائل اتنی بڑی تعداد میں مذکور ہیں کہ ان کا شمار بھی کچھ آسان نہیں۔

شہادت

ذی الحجہ ۲۳ھ میں آپ کی شہادت ہوئی فیروز نامی غلام نے فجر کی نماز میں آپ پر خنجر سے حملہ کیا زخم کے صدمے سے حضرت عمرؓ گر پڑے اور نماز کی تکمیل حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے فرمائی جب آپ کو اپنی شہادت کا یقین ہو چلا تو لوگوں کے اصرار پر علی، عثمان، زبیر، طلحہ، سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف پر مشتمل چھ نفری شوریٰ مقرر کر دی کہ جس پر پانچ کا اتفاق ہو جائے وہی خلیفہ ہو بعد ازاں حضرت عائشہؓ سے حضورؐ کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت لی پھر کچھ نصیحت ووصیت کے بعد یکم محرم بروز ہفتہ ۲۴ھ میں آپ نے امت کو داغ مفارقت دیا تدفین ابو بکر کے پہلو میں ہوئی۔

ازواج واولاد

حضرت عمرؓ نے متعدد نکاح کیے پہلی بیوی حضرت عثمان بن مظعون کی ہمشیرہ زینب تھیں ان کا بحالت اسلام مکہ میں انتقال ہوگیا دوسری بیوی قریبہ بنت امیہ المخزومی تھیں جب کہ تیسری کا نام ملیکہ بنت جرول تھا کفروشرک کی بناء پر دونوں کو طلاق دیدی چوتھی جمیلہ ہیں کسی وجہ سے ان کو بھی طلاق دے دی پانچویں عاتکہ بنت زید تھیں ان کا پہلا نکاح عبداللہ بن ابی بکر سے ہوا تھا بعد میں حضرت عمرؓ کی زوجیت میں آئیں جب کہ آپ کی چھٹی بیوی رسول اللہ ﷺ کی نواسی اور حضرت فاطمہؓ کی لخت جگر ام کلثوم تھیں خاندان نبوت سے رشتہ داری قائم کرنے کے لئے حضرت عمرؓ نے ۱۷ھ میں ان کے ساتھ چالیس ہزار مہر پر نکاح کیا تھا آپ کی اولاد میں حضرت حفصہ ام المؤمنین ہونے کی حیثیت سے سب سے زیادہ ممتاز ہیں حضرت عمرؓ نے انہیں کے نام پر اپنی کنیت رکھی جب کہ اولاد ذکور میں عبداللہ، عبیداللہ، عاصم، ابوشحمہ، عبدالرحمٰن، زید اور مجیر کے نام ہمیں تاریخ کی کتابوں میں دکھائی پڑتے ہیں ان ساتوں میں اول الذکر تین حضرات اپنے علم وفضل کے لحاظ سے نہایت مشہور وممتاز ہیں۔

(۱۰۳/۱) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ، ثَنَا اَبُوْ اُسَامَةَ اَخْبَرَنِی الْجَرِیْرِیُّ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ شَقِیْقٍ قَالَ: قُلْتُ لِعَائِشَةَ اَیُّ اَصْحَابِهِ کَانَ اَحَبَّ اِلَیْهِ ؟ قَالَتْ اَبُوْبَکْرٍ قُلْتُ ثُمَّ اَیُّهُمْ ؟ قَالَتْ عُمَرُ، قُلْتُ ثُمَّ اَیُّهُمْ ؟ قَالَتْ اَبُوْعُبَیْدَةَ .

میں نے حضرت عائشہ سے کہا کہ آپ کے صحابہ میں آپ کو کون زیادہ محبوب تھا فرمایا ابوبکر، میں کہا کہ پھر کون؟ فرمایا عمر، میں نے کہا پھر کون؟ فرمایا ابوعبیدہ۔

شرح وتخریج فضائل ابوبکر کی آخری حدیث کے تحت گذر چکی ہے اس لئے یہاں ہم صرف افضلیت ومحبت کے اسباب پر مختصر گفتگو کریں گے مولانا مبارکپوریؒ نے لکھا ہے:

واعلم اَن المَحبةَ مُختلفةٌ بالأسبابِ والأشخاصِ فَقد یَکونُ لِلجُزئیَّةِ وقد یَکونُ بسببِ الاِحسانِ وقد یَکونُ بسببِ الحُسنِ والجمالِ واسبابٍ اُخَرَ لاَ یمکنُ تفصلُیها ومحبتُه ﷺ لفاطمةَ بسببَ الجزئیةِ والزُهدِ والعِبادةِ ومحبتُهُ لِعَائِشَةَ بسبَبِ الزَوجیةِ والتَفقُه فی الدینِ ومحبةُ ابی بکرٍ وعمرَ وابی عُبیدةَ

بسبَب القِدَمِ فی الاسلامِ واِعلاءِ الدینِ ووَفورِ العلمِ فان الشَیخَین لا یخفیٰ حالُهما لأحدٍ مِنَ النَّاسِ واما ابُوعبیدةَ فقَد فَتَحَ اللّٰهُ تعالیٰ علی یَدَیهِ فُتوحاً عَظیماً فی خلافةِ الشَیخَین وسماه ﷺ امینَ هٰذهِ الامةِ والمراد فی هٰذا الحدیث محبتُه علیه السلام لهٰذا السببِ فلا یَضُر ما جاء فی الاحادیث الأخر شدةُ محبتِهِ علیہ السلام لِعائشةَ وفَاطمةؓ لأن تلك المحبة بسببِ اُخر (تحفة الاحوذی)

خلاصہ یہ نکلا کہ حضرت فاطمہ جزئیت، زہد اور عبادت کے باعث، حضرت عائشہ زوجیت وفقاہت کی بناپر، شیخین وابوعبیدہ علم وفضل، جہاد وقربانی اور قدامت فی الایمان کی وجہ سے اللہ کے رسول کو محبوب تھے.........حدیث باب میں حضرت عائشہ نے عثمان وعلی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا اور شیخین کے بعد ابوعبیدہ کو شمار کیا ہے محدثین کا کہنا ہے کہ یہ کسی جزئی فضیلت کی بناپر ہے ورنہ مجموعی فضائل کی رو سے عثمان وعلی ابوعبیدہ سے افضل ہیں جیسا کہ ابوداؤد کی روایت میں ابن عمر فرماتے ہیں کُنَّا نَقولُ ورسولُ اللّٰه ﷺ حَیٌّ افضلُ اُمةِ النَبیِّ ﷺ بعده ابوبکرٍ ثم عمرُ ثم عثمانُ رضی اللّٰه عنهم[1] ابومنصور بغدادی نے اس پر اہل السنّت والجماعت کا اجماع نقل کیا ہے کہ امت میں سب سے افضل ترتیباً خلفاء اربعہ پھر عشرہ مبشرہ اسکے بعد اصحاب بدر پھر حاضرین احد اور انکے بعد عقبۂ اولیٰ وثانیہ میں شرکت کرنے والے حضرات کا درجہ ہے۔

(۱۰۴/۲) حَدَّثَنَا اِسْمٰعِیلُ بْنُ مُحَمَّدٍ الطَّلْحِیُّ ثَنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ خِرَاشٍ الْحَوْشَبِیُّ عَنِ الْعَوَّامِ بْنِ حَوْشَبٍ عَنْ مُجاهِدٍ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا اَسْلَمَ عُمَرُ نَزَلَ جَبْرِیلُ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ لَقَدْ اِسْتَبْشَرَ اَهْلُ السَّمَاءِ بِاِسْلَامِ عُمَرَ.

جب حضرت عمر اسلام لائے تو جبریل نازل ہوئے اور فرمایا محمد!! عمر کے اسلام سے آسمان والوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا ہے۔

﴿استبشر اهل السماء﴾ استبشار کے معنی علامہ سندھیؒ نے اَظهرُوا الفَرحَ والسُّرُورَ بِاِسلامِهٖ لأنهٗ سببٌ لِتقویةِ الدِینِ الحقِ اور اہل السماء سے مراد ملائکہ ومقربین ہیں.........حدیث باب کی روایت میں امام ابن ماجہ منفرد ہیں اور سند میں ایک راوی

---

[1] ابوداؤد/ ۲ـ۲/ التفضیل

عبداللہ بن خراش موجود ہے جس کو ابوزرعہ نے لیسَ بِشَیٌٔ ضعیفٌ، امام بخاری نے منکرُ الحدیثِ ابن حبان نے ثِقَۃٌ رُبما اَخطأ ابوحاتم نے منکر الحدیثِ ذَاھبُ الحدیثِ ضَعیفُ الحدیثِ، نسائی نے لیسَ بِثقۃٍ دارقطنی نے ضعیفٌ ابن عدی نے عامۃُ مَا یَرویہِ غیرُ محفوظٍ، ساجی نے ضعیفُ الحدیثِ جدًا لیسَ بشیٌٔ کانَ یَضعُ الحدیث اور محمد بن عمار موصلی نے کذابٌ کہا ہے ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ۱۷۳/۵ اس لئے بوصیری نے زوائد ابن ماجہ (۵۶/۱) میں ھٰذا اسنادہ ضعیف لاتفاقھم علی ضعف عبد اللّٰہ بن خراش کا فیصلہ کیا ہے گرچہ روایت صحیح ابن حبان مستدرک حاکم اور طبرانی کبیر میں آئی ہے لیکن سب کا مدار عبداللہ بن خراش پر ہے، اس لئے ضعف کا کوئی ازالہ نہیں ہوتا اور تمام طرق کمزور ٹھہرتے ہیں۔

(۱۰۵/۳) حَدَّثَنَا اِسْمَاعِیْلُ بْنُ مُحَمَّدٍ الطَّلْحِیُّ، اَنْبَانَا دَاوُدُ بْنُ عَطَاءٍ الْمَدِیْنِیُّ عَنْ صَالِحِ بْنِ کَیْسَانَ عَنْ ابْنِ شِہَابٍ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیِّبِ عَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : اَوَّلُ مَنْ یُّصَافِحُہُ الْحَقُّ عُمَرُ، وَاَوَّلُ مَنْ یُّسَلِّمُ عَلَیْہِ وَاَوَّلُ مَنْ یَّاْخُذُ بِیَدِہٖ فَیُدْخِلُہُ الْجَنَّۃَ .

پہلی روایت کی طرح یہ بھی ابن ماجہ کی انفرادیات میں سے ہے صحاح خمسہ میں اسے کسی نے نقل نہیں کیا کیونکہ ایک راوی داؤد بن عطا مزنی معتبر نہیں الدیباجہ علی ابن ماجہ (۴۸۳/۱) میں اس کے بارے میں پوری تفصیل موجود ہے امام احمد نے اسے لیس بشیٔ ابوزرعہ وامام بخاری نے منکرُ الحدیثِ ،امام نسائی نے ضعیفٌ، ابوحاتم نے لیسَ بِالْقَوِیِّ ضعیفُ الحدیثِ منکرُہ، دارقطنی نے متروکٌ اور ابن حجر نے ضعیفٌ من الثامنۃ کا تبصرہ کیا ہے اس لئے بوصیری نے زوائد ابن ماجہ (۵۶/۱) میں لکھا ہے ھذا اسنادضَعِیفٌ فیہ داؤد بن عطاء المدینی وقد اتفقوا علی ضُعفِہ وباقی رِجالِہ ثقاتٌ اور حافظ عماد الدین بن کثیر نے جامع المسانید میں لکھا ہے ھذا الحدیثُ منکرٌ جدًا وما ھوا بعدَ مِن ان یَکونَ موضُوعاً والآفۃ فِیہِ من داؤدَ بن عطاءٍ اور ذہبی نے مستدرک (۸۴/۳) کی تعلیق میں اِنہ موضوعٌ وفی اسنادہ کذابٌ کی رائے قائم کی ہے اسی طرح امام ابن الجوزی

نے العلل المتناهية في الاخبار الواهية (۱/۱۹۲) میں اسے موضوع قرار دیا ہے۔
یہ روایت وسند کی بحث تھی جہاں تک درایت کا تعلق ہے تو اس لحاظ سے بھی یہ روایت صحیح حدیث سے ٹکراتی ہے امام ابوداوٗد نے كتابُ السنةِ بابٌ فی الخُلفاءِ میں روایت نقل کی ہے عن ابی هريرة قال: قَالَ رسولُ اللّٰهِ ﷺ اَتَانِی جبريلُ فأخذَ بِيدِی فأرَانی بابَ الجنةِ الذِی يَدخُلُ مِنهُ امتِی فَقَالَ ابُوبكرٍ يَا رسولَ اللّٰهِ ﷺ وَدِدْتُ انی كنتُ مَعَكَ حتى انظرَ اليهِ فقالَ رسولُ اللّٰهِ ﷺ اَمَا انكَ يَا اَبَا بَكرٍ اولُ مَنْ يَدخلُ الجنةَ مِن اُمتِی حضرت ابوبکر نے جب دروازے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے فرمایا اے ابوبکر میری امت میں سے جنت میں سب سے پہلے تم ہی داخل ہو گے، ملا علی قاری نے مرقات المفاتیح باب مناقب ابی بکر فصل اول کے تحت اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے ای فَتَرى بابَها وتَدخُلُها قبلَ كُلِ اَحدٍ من اُمتِی وَفِيه دليلٌ على انه اَفضلُ الاُمةِ وإِلا لَمَا سبَقَهُم فی دُخُولِ الجنةِ ايماءٌ الى اَنه اسبَقُ الاُمةِ ايمانا لقوله تعالىٰ والسابقون السابقون اولئك المقربون.......... روایت ودرایت کی بنیاد پر حدیث باب موضوع ہی لگتی ہے جس کو محدثین کے نزدیک وضع کی تنبیہ کے بغیر بیان کرنا حرام ہے اور شرح کا تو کسی صورت میں جواز نہیں ہے۔

(۱۰۶/۴) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بنُ عُبَيْدٍ اَبُوْ عُبَيْدٍ الْمَدِيْنِيُّ ثَنَا عَبْدُ الْمَلِكِ بْنُ الْمَاجِشُوْنَ حَدَّثَنِی الزَّنْجِيُّ بْنُ خَالِدٍ ، عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : "اَللّٰهُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ خَاصَّةً"

فرمایا اے اللہ اسلام کو خصوصاً عمر بن خطاب کے ذریعہ تقویت پہنچا۔

امام ترمذی نے مناقب عمر میں یہ حدیث قدرے مفصل نقل کی ہے یعنی اَللّٰهُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ بِاَحَبِّ هٰذَيْنِ الرَّجُلَيْنِ اِلَيْكَ بِاَبِی جَهْلٍ اَوْ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ وَكَانَ اَحَبُّهُمَا اِلَيْهِ عُمَرُ یعنی ابوجہل وعمر دونوں میں جو آپ کو زیادہ پسند ہو اس کے ذریعہ دین کو تقویت پہنچا راوی ابن عمر کہتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک حضرت عمر زیادہ محبوب تھے یہ روایت

حسنٌ صحیحٌ غریبٌ ہے جب کہ ترمذی ہی کی دوسری روایت میں تصریح ہے کہ اس دعا کے بعد فاصبح فغدا علی رسول اللہ ﷺ فاَسلمَ جب صبح ہوئی تو حضرت عمر نے چاشت کے وقت آ کر دار ارقم میں حضور کے ہاتھ پر ایمان قبول کیا امام ترمذی نے اس حدیث پر غریبٌ مِن ھذا الوجہِ وقد تُکلمَ فی النضر ابی عمرو ھو یَروی المناکیر کا تبصرہ کیا ہے ملا علی قاری نے دلائل النبوۃ کے حوالہ سے مناقب عمر میں لکھا ہے کہ جب حضرت عمر اپنی بہن کے گھر میں قرآن سن کر مبہوت ہوئے تو حضرت خباب نے پردہ سے نکل کر کہا یا عُمَر ان رسولَ اللّٰہِ ﷺ باتَ سَاھِراً یُناجِی اللّٰہ عزوجل ان یُعِزَّ الاسلامَ بِكَ اوبِاَبی جھلٍ وانا ارجُو ان تَکونَ دعوتُہ قد سبقت فیك عمر اللہ کے رسول نے پوری رات جاگ کر یہ دعا کی ہے کہ باری تعالیٰ تمہارے یا ابوجہل کے ذریعہ اسلام کو تقویت پہنچا، مجھے امید ہے کہ آپ کی دعاء تمہارے حق میں قبول ہوگئی۔

ابن ماجہ، ترمذی اور دلائل لنبوۃ سے ہم نے یہ روایتیں نقل کی ہیں ہر سند میں گرچہ کچھ نہ کچھ ضعف ہے لیکن تعدد طرق اور کثرت راوۃ کی بنیاد پر روایت حسن لغیرہ بن جاتی ہے جو احکام وعبادت میں نہ سہی لیکن تاریخ وتراجم میں تو اعلیٰ درجے کی چیز ہے اور یہ مسئلہ تاریخ ہی سے متعلق ہے مکے کے جاہل معاشرے میں جن لوگوں کو سر برآوردہ سمجھا جاتا تھا ان میں حضرت عمر بھی شامل تھے آپ ایک مضبوط اور رعب دار شخصیت کے مالک تھے ایسی مؤثر شخصیت اگر کسی تحریک کی پشت پر کھڑی ہو جائے تو اس کی وسعت وترقی یقینی ہوا کرتی ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اہتمام کے ساتھ آپ کے اسلام وایمان کی دعا فرمائی چنانچہ جب حضرت عمر ایمان لائے تو صحابہ نے خوشی سے ایسا نعرہ مارا کہ مکے کی چوٹیاں دہل گئیں اور رنج وغم سے مشرکین کے دل بیٹھ گئے علامہ قسطلانی نے ارشاد الساری (۶/۱۰۰) میں حضرت صہیب سے نقل کیا ہے لَمَّا اَسلَم عمرُ قَالَ المشرکونَ اِنتَصف القَومِ مِنا جب حضرت عمر اسلام لائے تو مشرکوں نے کہا کہ مسلمانوں نے ہم سے بدلہ لے لیا، ترمذی کی روایت میں ابوجہل اور عمر دونوں کی تصریح ہے جب کہ ابن ماجہ میں صرف حضرت عمر کا تذکرہ ہے شیخ محمد دی انجاح الحاجۃ میں تطبیق دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ لَعَلَّہ ﷺ دَعَا بِاِیمانِ اَبی جھلٍ وعمرَ بْنِ الخطابِ اولًا

ولَمَّا عُلِمَ اَن کفرَ اَبی جهلٍ مُقدرٌ فِی تَقدیرِ الهیٍ أئِس مِن اِیمانِه ودَعا لِعُمَر خَاصةً، پہلے تو غالباً حضور نے ابوجہل اور عمر کے ایمان کی دعا مانگی، لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ ابوجہل کے لیے کفر مقدر ہے تو آپ نے اس سے مایوس ہو کر صرف حضرت عمر کیلئے دعا کی۔

محمد بن عبید اور عبدالملک بن ماجشون اور زنجی بن خالد محدثین کے نزدیک صدوق ہونے کے باوجود حافظے کے لحاظ سے ضعیف ہیں اس لئے بوصیری نے زوائد ابن ماجہ (۱/ ۵۷) میں هذا اسناد ضعیف کا فیصلہ کیا ہے۔

(۵/ ۱۰۷) حَدَّثَنَا عَلِیُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا وَکِیعٌ ثَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَمْرِو بْنِ مُرَّةَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلْمَةَ قَالَ سَمِعْتُ عَلِیًا یَقُوْلُ خَیْرُ النَّاسِ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَبُوْبَکْرٍ وَخَیْرُ النَّاسِ بَعْدَ اَبِیْ بَکْرٍ عُمَرُ.

الدیباجہ علی ابن ماجہ (۱/ ۴۸۸) میں مصنف نے روایت کو اسناده صحیح لغیره قرار دیا ہے۔ اور وہ بخاری و مسلم کے علاوہ ابوداؤد میں بھی موجود ہے مباحث گذر چکے۔

(۶/ ۱۰۸) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْحَارِثِ الْمِصْرِیُّ اَنْبَاَنَا اللَّیْثُ بْنُ سَعْدٍ حَدَّثَنِیْ عُقَیْلٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَخْبَرَنِیْ سَعِیْدُ بْنُ الْمُسَیَّبِ أَنَّ اَبَا هُرَیْرَةَ قَالَ کُنَّا جُلُوْسًا عِنْدَ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ بَیْنَا اَنَا نَائِمٌ رَاَیْتُنِیْ فِی الْجَنَّةِ فَاِذَا اَنَا بِامْرَاَةٍ تَتَوَضَّأُ اِلٰی جَنْبِ قَصْرٍ فَقُلْتُ لِمَنْ هٰذَا الْقَصْرُ فَقَالَتْ لِعُمَرَ فَذَکَرْتُ غَیْرَتَهٗ فَوَلَّیْتُ مُدْبِراً قَالَ اَبُوْهُرَیْرَةُ فَبَکٰی عُمَرُ فَقَالَ أَعَلَیْكَ بِاَبِیْ وَاُمِّیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغَارُ.

حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا ہم نبی ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: میں سویا ہوا تھا میں نے اپنے آپ کو جنت میں دیکھا اور سامنے ایک عورت محل کے پہلو میں بیٹھی وضوء کررہی ہے میں نے پوچھا یہ کس کا محل ہے اس نے کہا عمر کا تو معاً مجھے عمر کی غیرت یاد آئی اور میں پلٹ کر واپس آگیا حضرت ابوہریرہ نے کہا کہ عمر رو پڑے اور عرض کیا میرے ماں باپ قربان ہوں اے اللہ کے رسول کیا میں آپ پر غیرت کرونگا؟

﴿تتوضأ﴾ یہاں توضی سے یا تو لغوی وضوء مراد ہے جو حسن و نظافت کو دوبالا کرنے

کے لئے کیا جائے گا یا وضوءِ شرعی مراد ہے کرمانی اور قرطبی نے پہلی کو اور قسطلانی نے دوسری کو ترجیح دی ہے جنت تکلیف کا محل نہیں اس لئے خلاصہ دونوں اقوال کا ایک ہی ہے کہ وضوءِ شرعی جنت کا سبب بنا اور وضوءِ لغوی حسن میں زیادتی کا سبب ہوگا۔

﴿الی جنب قصر﴾ ترمذی کی ایک دوسری روایت میں قصر کی صفت مُرَبَّعٍ مُشرِفٍ مِن ذَهَبٍ منقول ہے یعنی سونے کا بلند وچوکور محل

﴿لمن هٰذا القصر﴾ ترمذی ہی کی مذکورہ روایت میں اس کے بعد قالوا لِرَجُلٍ مِنَ العربِ فقُلتُ اَنَا عَرَبِیٌّ لِمَن هَذا القَصرُ قَالوا لِرَجُلٍ مِنْ قُرَیشٍ فَقُلتُ اَنَا قُرَیشِیٌّ لِمَن هَذا القَصرُ قَالوا لِرَجُلٍ مِن اُمةِ مُحمدٍ صَلی اللّٰہ علیہِ وسلم فقلتُ اَنا مُحمدٌ لِمَن هٰذا القصرُ قالوا لِعُمرَ کا بھی اضافہ ہے۔

﴿فبکیٰ عمر﴾ یہ شکر وتواضع میں تھا جو صحابہ کی عام عادت تھی، نبی کا خواب وحی کی طرح ہوتا ہے اس لئے یہ فضیلت عمر کی مضبوط دلیل ہے.......... حدیث بخاری (بدء الخلق/۸، مناقب/۳۴، تعبیر/۳۱، ۳۲) اور صحیح مسلم (فضائل/عمر) میں بھی آئی ہے اور پہلے راوی کو چھوڑ کر ابن ماجہ کی سند بعینہٖ بخاری کی ہے۔

(۱۰۹/۹) حَدَّثَنَا اَبُوْسَلَمَةَ ، یَحْیٰی بْنُ خَلَفٍ ، ثَنَا عَبْدُ الْاَعْلٰی ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِسْحَاقَ عَنْ مَکْحُوْلٍ، عَنْ غُضَیْفِ بْنِ الْحَارِثِ عَنْ اَبِیْ ذَرٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: اِنَّ اللّٰهَ وَضَعَ الْحَقَّ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ، یَقُوْلُ بِهٖ.

اللہ نے حق کو عمرؓ کی زبان میں رکھ دیا ہے وہ حق کہتے ہیں۔

سنن ابی داوٗد اور جامع ترمذی میں لسان کے ساتھ قلب کا بھی تذکرہ ہے امام طیبی نے لکھا ہے ظهورُ الحقِ وَاستعلاءُهُ عَلی لسانِهٖ[1] کہ وضع کا مطلب ان کی زبان پر حق کا ظہور واجراء ہے علامہ سندھی فرماتے ہیں تَعْدِیتُهُ بِعَلٰی لِتَضْمِینِهٖ مِنَ الْاِجْراءِ وفیه تعیینُ الظهور یعنی وضع فعل کو علی کے ذریعے متعدی کرنے سے اجراء کا مفہوم اس میں شامل

[1] مرقاۃ المفاتیح ۱۱/۲۹۹

ہو گیا اور اب اس کے حتمی معنی ظہور کے ہوں گے اسی کیفیت کو مسلم شریف کی حدیث میں یَکُوْنُ فِی الامَمِ قبلَکم مُحدَثُونَ فاِن یَکن فی اُمتی مِنهم احدٌ فاِن عُمَرَ بنَ الخَطابِ مِنهُم سے تعبیر کیا گیا ہے اور محدث کے معنی ابن وہب نے ملهمون[1] امام بخاری نے یجری الصوابُ عَلی لِسانِهِم[2] اور کرمانی نے الملئکة تُکلِمُهُم[3] بیان کئے ہیں جس سے انکی سلامتِ قلب، روشن طبیعت اور نبوت سے قریب مزاج کا پتہ چلتا ہے چنانچہ صحیح مسلم (۲/۲۷۶) میں خود حضرت عمرؓ کا قول مروی ہے وافقتُ رَبی فی ثلثٍ فی مقامِ اَبراهِیمَ وفی الحجابِ وفی اُساریٰ بدرٍ نیز اذان، حرمت خمر اور ابن ابی کی نماز جنازہ کی بابت آپ ہی کے مطابق وحی نازل ہوئی اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لو کان بعدی نَبِیٌّ لکانَ عُمَرُ ...... حدیث سنن ابی داؤد (الخراج/۱۸) ترمذی (مناقب/۱۱) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند کو الدیباجہ علی ابن ماجہ (۱/۴۹۲) میں اسناده صحیح لغیره کہا گیا ہے۔

فَضْلُ عُثْمَانَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ

نام عثمان، کنیت ابو عبداللہ اور ابو عمر اور لقب ذوالنورین ہے والد کا نام عفان اور والدہ کا نام اروی تھا سلسلہ نسب اس طرح ہے عثمانُ بْنُ عَفَّانَ بْنُ ابی العاص بن امیة بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی القرشی جب کہ والدہ کا سلسلہ یہ ہے اروی بنت کریز بن ربیعه بن حبیب بن عبد شمس بن عبد مناف ماں و باپ کے یہ دونوں سلسلے پانچویں پشت یعنی عبد مناف پر حضور ﷺ سے مل جاتے ہیں اس کے علاوہ ان کی نانی بیضاء ام الحکیم حضرت عبداللہ کی سگی بہن اور رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی تھیں بنی امیہ کا خاندان جاہلیت میں نہایت معزز تھا اور قریش کے خاندانوں میں بنی ہاشم کے سوا اس کا کوئی ہمسر نہ تھا قریش کا مشہور عہدہ ''عقاب'' یعنی فوجی پرچم کی علمبرداری اسی خاندان کے لئے مخصوص تھی جنگ فجار میں سپہ سالار اموی سردار حرب بن امیہ تھے حضرت عثمان واقعہ فیل کے چھٹے سال پیدا ہوئے بچپن اور

---

[1] مسلم ۲/۲۷۶ [2] ایضا
[3] عمدۃ القاری ۱۶/۱۹۹

لڑکپن کے حالات پردۂ خفا میں ہیں معاش کا ذریعہ تجارت تھا پہلے ہی سے کچھ لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے اور ان کا شمار مکے کے معزز اور دولت مند لوگوں میں ہوتا تھا۔

اسلام

زندگی کی ۳۴ بہاریں گزرنے پر مکے میں اسلام کا ظہور ہوا آپ صدیق اکبر کی تبلیغ سے شروع ہی میں ایمان لے آئے حضرت عثمانؓ نہایت خوبصورت تھے رنگ گندمی، قد معتدل، اور ناک بلند و خم دار تھی رخسار بھرے ہوئے تھے ڈاڑھی گھنی تھی چہرے پر چیچک کے ہلکے ہلکے داغ تھے سر کی زلفیں لمبی ہوا کرتی تھی جب کہ دانت پیوستہ اور چمکدار تھے حضور ﷺ نے اسلام کے بعد اپنی صاحبزادی حضرت رقیہ کا انہیں کے ساتھ نکاح کر دیا جو پہلے ابولہب کے بیٹے عقبہ سے منسوب تھیں سابقین اولین کی طرح انہوں نے بھی اہل مکہ کی زیادتیاں برداشت کیں اور ہجرت کی اجازت ملنے کے بعد اپنی اہلیہ رقیہ کو لے کر حبشہ کوچ کیا چند سال بعد قریش کے اسلام کی بابت ایک غلط خبر پا کر آپ کو مکہ واپس آئے اور ہجرت مدینہ تک پھر یہیں رہے۔

جود و سخاء

مسلمانوں کے مدینہ منتقل ہو جانے کے بعد میٹھے پانی کا ایک اہم مسئلہ تھا حضرت عثمانؓ نے یہودی کا کنواں رومہ ۲۰ ہزار میں خرید کر مسلمانوں کیلئے وقف کر دیا بدر کے سوا تمام غزوات میں شریک رہے اور عدم شرکت کی وجہ بھی حضرت رقیہ کی بیماری تھی جس کی وجہ سے حضور ﷺ نے انہیں مدینے ہی میں تیمارداری کے لئے چھوڑ دیا تھا حدیبیہ میں آپ ہی کی وجہ سے بیعت رضوان ہوئی تھی انہوں نے حجۃ الوداع میں بھی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا تبوک کے موقع پر آدھی یا تہائی فوج کے اخراجات برداشت کئے اور مسلمانوں کو مزید ایک ہزار اونٹ ستر گھوڑے اور ایک ہزار دینار کا گرانقدر عطیہ عنایت کیا خلافت صدیقی میں ان کا شمار بھی مجلس شوریٰ کے اراکین میں تھا حضرت عمرؓ کا خلافت نامہ بھی حضرت ابوبکرؓ نے آپ ہی سے لکھوایا تھا شہادت کے موقعہ پر حضرت عمرؓ نے جو چھ رکنی کمیٹی بنائی تھی اس میں آپ سرفہرست تھے۔

خلافت

۴ محرم الحرام ۲۴ھ دوشنبہ کے دن حضرت عثمانؓ خلیفہ مقرر ہوئے ابتدائی چھ سالوں میں

اسلامی حکومت نے بڑی ترقی کی اور آرمینیہ، آذر بائیجان، طرابلس، قبرص، الجزائر، مراکش، طبرستان، خراسان، طخارستان، کرمان، غزنی، کابل اور ایشیاء وافریقہ کے بے شمار علاقے اسلامی قلمرو میں داخل ہو گئے گو کہ انہیں اطمینان کے ساتھ صرف پانچ سال حکومت کرنے کا موقع ملا لیکن اس قلیل عرصے ہی میں انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے شہادت فاروقی کے باعث مصر، آرمینیہ، آذر بائجان، اور خراسان میں جو بغاوتیں ہوئیں حضرت عثمان نے انہیں نہایت کامیابی سے دبادیا مفتوح ملکوں کو صوبوں میں تقسیم کیا ملک کے انتظامی معاملات میں رائے قائم کرنے کے لئے زیرک لوگوں کی ایک مجلس شوری بنائی بحری جنگ کے لئے بیڑا تیار کرایا جہاد میں استعمال ہونے والے گھوڑوں اور مویشیوں کے لئے چراہ گاہیں بنائی گئیں، مدینہ منورہ کو سیلاب سے بچانے کے لئے خیبر کی سمت مہروز نامی ایک بند تعمیر کیا ۲۹ھ میں مسجد نبوی کی دوسری توسیع کی مؤذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں فوجی نظام کو نہایت جدید اور مربوط بنایا مصحف صدیقی کو رائج کر کے کلام اللہ کے دوسرے نسخے تلف کر دیئے تاکہ مسلمانوں میں اختلاف نہ ہو۔

فضائل

حضرت عثمان کاتب وحی تھے اس لئے قرآن سے آپ کو خصوصی شغف تھا مرویات کی کل تعداد ۱۴۶ ہے جن میں ۳ متفق علیہ ہیں ۸ صرف بخاری نے اور پانچ مسلم نے نقل کی ہیں فقہ واجتہاد میں بھی آپ کا پایہ بلند تھا اور شیخین کی طرح ان کے فقہی فیصلے کتابوں میں منقول ہیں یوں تو وہ ایک بلند مرتبہ صحابی ہیں اور ان کے بیشمار فضائل ومناقب احادیث میں آئے ہیں لیکن خوف خدا، فکر آخرت، حب رسول، حیاء وزہد، تواضع، ایثار، سخاوت، فیاضی، صلہ رحمی، حلم برد باری، اور اللہ کے راستہ میں جان ومال کی قربانی دینا آپ کی زندگی کے روشن عنوان ہیں۔

شہادت

آخری چھ سال کا عرصہ آپ نے بڑے دکھ اور اضطراب کے ساتھ گزارا یہود ونصاریٰ کے پروردہ لوگوں نے پہلے آپ پر اقربا پروری، ناعاقبت اندیشی، اور شیخین کی سنت سے انحراف کا الزام لگایا پھر ۳۵ھ ایام حج میں مدینہ میں آدھمکے مسجد نبوی میں آپ پر پتھراؤ کیا اور خلافت

سے معزول کرنے کے لئے وہ آپ کے گھر کا محاصرہ کر کے بیٹھ گئے اکابر صحابہ نے انہیں فہمائش کی نوجوان صحابہ نے حضرت کے گھر پر پہرہ دیا اور خود خلیفہ ثالث نے باغیوں کو اپنی خدمات اور فضائل یاد دلائے لیکن کسی چیز کا ان پتھروں پر اثر نہ ہوا اور ۱۸ھ ذی الحجہ جمعہ کے دن وہ دیواریں پھاند کر ان کے گھر میں کود گئے سب سے پہلے غافقی نے حملہ کیا پھر کنانہ بن بشر نے پیشانی پر ضرب لگائی اور عمرو بن الحمق سینہ پر چڑھ گیا اور پے در پے نیزوں کے زخم لگائے آخر میں سعدان بن حمران نے آپ کو شہید کر ڈالا تین انگلیاں زوجۂ محترمہ حضرت نائلہ کی بھی شہید ہوئیں مدینہ پر باغیوں کا تسلط تھا صحابہ و تابعین بالکل بے دست و پا تھے اس لئے دو دن تک تدفین نہ ہو سکی سنیچر کی رات بعض صحابہ نے اپنی جانوں پر کھیل کر انہیں دفن کیا نماز جنازہ زبیر بن العوام یا جبیر بن مطعم نے پڑھائی۔

ازواج واولاد

حضرت عثمان نے متعدد نکاح کئے ام کلثوم ورقیہ سے کوئی اولاد زندہ نہیں بچی فاختہ بنت غزوان سے ایک لڑکا عبداللہ پیدا ہوا وہ بھی بچپن ہی میں فوت ہو گیا، ام عمرو بن جندب کے بطن سے خالد، عمرو، ابان، عمر، و مریم پیدا ہوئے فاطمہ بنت ولید نے دو بیٹوں ولید، وسعید کو جنم دیا ام البنین بنت عیینہ سے ایک صاحبزادے عبدالملک بچپن ہی میں فوت ہو گئے رملہ بنت شیبہ سے عائشہ، ام ابان اور عمرو پیدا ہوئے نائلہ بنت القرافصہ نے مریم کو جنم دیا شہادت کے وقت یہی حضرت عثمان کے پاس موجود تھیں صاحبزادوں میں سب سے مشہور حضرت ابان ہی ہیں جنہوں نے اموی دور میں بڑا رسوخ اور اعزاز حاصل کیا۔

(۱/۱۱۰) حَدَّثَنَا اَبُوْمَرْوَانَ مُحَمَّدُ بْنُ عُثْمَانَ الْعُثْمَانِيُّ، ثَنَا، اَبِيْ عُثْمَانُ بْنِ خَالِدٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِي الزِّنَادِ، عَنْ اَبِيْهِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ: اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لِكُلِّ نَبِيٍّ رَفِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ، وَرَفِيْقِيْ فِيْهَا عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ

ہر نبی کا جنت میں کوئی رفیق ہوگا اور وہاں میرے رفیق عثمان بن عفان ہیں۔

علامہ سندھی نے لکھا ہے والمقصود ھھنا ھو الاخبار بانه یقوم فی الجنة

رفیقاً لا الحصر یہاں صرف حضرت عثمان کی تعیین نہیں بلکہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ وہ بھی جنت میں رفیق ہوں گے اب طبرانی کی روایت ان کل نبی خاصة من اصحابه وان خاصتی من أصحابی ابوبکر وعمر سے کوئی تعارض نہ رہا ملا علی قاری (مناقب/عثمان) میں فرماتے ہیں یستفاد منه ان لکل نبیٍ رفیقاً وان له رفقاء اس سے یہ ثابت ہوا کہ ہر نبی کا ایک رفیق ہے جب کہ حضور کے کئی رفقاء ہیں، آگے فرماتے ہیں، فی تخصیص ذکره اشعار بتعظیم منزلته ورفع قدره، یہاں ان کا تذکرہ ان کے قدر ومنزلت کو بڑھانے کے لیے کیا گیا ہے۔

پہلے راوی محمد بن عثمان کو ابن حجر نے تقریب (۴۹۹) میں صدوق یخطیٔ من العاشرة اور عثمان بن خالد کو متروك الحدیث من العاشرة قرار دیا ہے کیونکہ ان پر محدثین نے موضوع ومنکر احادیث بیان کرنے کا تبصرہ کیا ہے اس لئے بوصیری نے زوائد، ۱/ ۵۷ میں هذااسناد ضعیف فیه عثمان بن خالد وهو ضعیف باتفاقهم، کی وضاحت کی ہے جب کہ امام ترمذی نے اپنی سند کو لیس اسناده بالقوی وهو ینقطع کہا ہے اس لئے ابن الجوزی کے نزدیک روایت قطعاً درست نہیں۔ سیوطی نے جامع صغیر (۲/ ۳۵۷) میں، مناوی نے فیض القدیر (۵/ ۲۸۸) میں اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

(۱۱۱/۱) حَدَّثَنَا اَبُوْ مَرْوَانَ مُحَمَّدُ بْنُ عُثْمَانَ الْعُثْمَانِیُّ، ثَنَا اَبِیْ عُثْمَانَ بْنَ خَالِدٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِی الزِّنَادِ، عَنْ اَبِی الزِّ نَادِ، عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَقِیَ عُثْمَانَ عِنْدَ بَابِ الْمَسْجِدِ فَقَالَ: یَاعُثْمَانُ هٰذَا جِبْرِیْلُ اَخْبَرَنِیْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ زَوَّجَكَ اُمَّ کُلْثُوْمٍ بِمِثْلِ صَدَاقِ رُقَیَّةَ، عَلٰی مِثْلِ صُحْبَتِهَا.

رسول اللہ ﷺ کو حضرت عثمان مسجد نبوی کے دروازہ پر ملے تو آپ نے فرمایا عثمان! یہ جبرئیل ہیں انہوں نے مجھ کو بتایا کہ اللہ نے رقیہ کی صحبت ومہر کے برابر پر تمہارا نکاح ام کلثوم سے کر دیا ہے۔ رقیہ وام کلثوم کا نکاح اولا ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کے ساتھ ہوا تھا لیکن ابھی رخصتی نہیں ہوئی کہ آپ کو نبوت سے سرفراز کر دیا گیا ابولہب نے رسول اللہ ﷺ کی دل

آزاری کے لئے اپنے دونوں بیٹوں سے طلاق دلوادی بعد میں یہی دونوں یکے بعد دیگرے حضرت عثمان کے نکاح میں آئیں ان کا پہلا نکاح بعثت کے ابتدائی زمانہ میں اور دوسرا غزوۂ بدر کے بعد ہوا اس وقت نکاح کے بہت سے احکام نازل بھی نہ ہوئے تھے اس لئے دونوں کے مہر کی کسی روایت میں تصریح نہیں ملتی امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے کتاب النکاح میں روایت نقل کی ہے عن عمر بن الخطاب ماعلمت رسول اللہ ﷺ نکح شیئا من نساءہ ولاأنکح شیئا من بناته علی اکثر من ثنتی عشرة اوقیة یعنی کسی بیوی اور بیٹی کا مہر بارہ اوقیہ چاندی (۴۸۰ درہم) سے زیادہ نہ تھا مصنف احسن الفتاوی حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب کی تحقیق بھی یہی ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت ام کلثوم کا مہر بھی رقیہ کی طرح چارسو درہم تھا علامہ سندھی نے لکھا ہے صداق المرأة مهر ها والکسرا فصح من الفتح گویا یہ نکاح حضرت زینب کے نکاح کی طرح تھا...... امام شافعی اور ابن حنبل کے نزدیک ہر وہ چیز مہر ہوسکتی ہے جس پر فریقین راضی ہوں اور وہ مال ہو بیع میں ثمن بن سکتی ہو امام مالک کے یہاں اس کی کم سے کم مقدار چوتھائی دینار ہے جب کہ حنفیہ دس درہم کے قائل ہیں...... یہ بعینہ پہلی سند ہے اس لئے بوصیری نے زوائد ابن ماجہ (۱/ ۵۸) میں لکھا ہے۔

هذا الاسناد حکمه حکم الاسناد الذی قبله کہ پہلی حدیث کی طرح یہ بھی ضعیف ہے۔

(۱۱۲/۳) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ اِدْرِيْسَ عَنْ هِشَامِ بْنِ حَسَّانَ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيْرِيْنَ، عَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ، قَالَ ذَكَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِتْنَةً فَقَرَّبَهَا، فَمَرَّ رَجُلٌ مُقَنَّعٌ رَأْسَهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا يَوْمَئِذٍ عَلَى الْهُدَى فَوَثَبْتُ فَاَخَذْتُ بِضَبْعَيْ عُثْمَانَ، ثُمَّ اِسْتَقْبَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقُلْتُ هٰذَا؟ قَالَ: هٰذَا.

رسول اللہ ﷺ نے ایک فتنہ کا ذکر کر کے اسے بہت ہی قریب بتلایا ایک شخص اپنے سر کو ڈھانکے ہوئے گذرا تو آپ نے فرمایا یہ اس وقت حق پر ہوگا راوی ابن عجرہ کہتے ہیں کہ میں لپکا اور عثمان کے دونوں بازو پکڑ لئے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف رخ کر کے میں نے کہا: یہ؟ فرمایا ہاں یہی۔

﴿فقربها﴾ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں ای قرب النبی ﷺ الفتن یعنی وقوعها. آپ نے فتنوں کے وقوع کو قریب بتلایا، شیخ مجددیؒ کا کہنا ہے ان اتیانها قریب فان اول فتنة وقعت فی الاسلام فتنة عثمان. کیوں کہ تاریخ میں سب سے پہلا فتنہ عثمانؓ کی شہادت ہے۔

﴿مقنع﴾ علامہ سندھیؒ لکھتے ہیں من التنقیع وهو ستر الرأس بالرداء والقاء طرفه علی الکتف تنقیع کا مطلب چادر سے سر کو ڈھانکر اسے کاندھے پر ڈال لینا۔ رَأسُه اس کا نائب فاعل ہے۔

﴿ضبعی﴾ ضبع کا تثنیہ ہے اضافت کی وجہ سے نون گر گیا معنی بازو، کلائی۔

﴿قال هذا﴾ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں فیه مبالغة فی استحضار القضية وتاکیدها بتحقق الصورة الجلية یہاں مذکورہ فتنہ کے استحضار وتاکید میں زور واہتمام نظر آتا ہے گویا وہ آنکھوں کے سامنے آگیا صحابی تحقیق کے لیے حضرت عثمان کو لے آئے تاکہ ان کے حدیث کا مصداق ہونے میں کوئی شبہ نہ رہے......... یہ فتنہ حضرت عثمان کے دور خلافت میں رونما ہوا اور اسی میں آپ نے اپنی جان کی قربانی دی صحیح مسلم فضائل عثمان کی حدیث میں بھی "افتح وبشره بالجنة علی بلوی" (یعنی ابوبکر وعمر کے بعد آپ نے باغ میں عثمان کے لئے یہ کہہ کر دروازہ کھلوایا) کے الفاظ میں اسی فتنہ کی طرف اشارہ ہے......... بوصیری نے زوائد ابن ماجہ (۱/ ۵۸) میں لکھا ہے هذا اسناد منقطع قال ابوحاتم محمد بن سیرین لم یسمع کعب بن عجرة وباقی رجاله ثقات امام ترمذی نے یہی حدیث باب مناقب عثمان میں اپنی سند سے نقل کی ہے اور اسے "حسن صحیح" قرار دیا ہے۔

(۱۱۳/۴) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا اَبُوْمُعَاوِيَةَ، ثَنَا الْفَرَجُ بْنُ فَضَالَةَ، عَنْ رَبِيْعَةَ بْنِ يَزِيْدَ الدِّمَشْقِيِّ، عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ "يَا عُثْمَانُ! اِنْ وَلَّاكَ اللّٰهُ هٰذَا الْاَمْرَ يَوْماً، فَاَرَادَكَ الْمُنَافِقُوْنَ اَنْ تَخْلَعَ قَمِيْصَكَ الَّذِيْ قَمَّصَكَ اللّٰهُ فَلَا تَخْلَعْهُ يَقُوْلُ ذٰلِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ قَالَ النُّعْمَانُ فَقُلْتُ لِعَائِشَةَ مَا مَنَعَكِ اَنْ تُعْلِمِيْ النَّاسَ بِهٰذَا؟ قَالَتْ اُنْسِيْتُهُ.

فرمایا اے عثمان! اگر اللہ تعالیٰ تمہیں کبھی خلافت سے نوازے اور منافق یہ چاہیں کہ تمہاری اس قمیص کو اتار دیں جو تم کو اللہ نے پہنائی ہے تو تم اسے مت اتارنا یہ بات آپ نے تین مرتبہ فرمائی نعمان کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے کہا کہ آپ نے یہ بات اس وقت لوگوں کو کیوں نہ بتلائی انہوں نے فرمایا یہ چیز مجھے بھلادی گئی۔

﴿ان ولاك الله﴾ علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں ای یجعلك والیا لهذا الأمر حضرت عمر کی شہادت کے بعد یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور حضرت عثمان خلیفہ بن گئے ابتدائی چھ سال کا عرصہ تو فتوحات کا ہے لیکن آخری چھ سال سازشوں سے پر ہیں۔

رسول اللہ کے فرمان کے مطابق بالآخر وہ وقت آپہنچا جب باغیوں نے محاصرہ کر کے آپ سے خلافت چھوڑنے کو کہا۔

﴿فلا تخلعه﴾ ملا علی قاری لکھتے ہیں والمعنی ان قصدوا عزلك فلا تعزل نفسك عن الخلافة لاجلهم لكونك على الحق و كونهم على الباطل[1] یعنی اگر وہ تم کو معزول کرنا چاہیں تو تم خلافت سے دستبردار مت ہونا، کیونکہ حق تمہارے ساتھ ہوگا اور وہ باطل پر ہوں گے، اسی وصیت کی بنا پر حضرت عثمان نے شہادت تو حاصل کر لی لیکن فرمان رسالت کی خلاف ورزی نہیں کی، مجددی فرماتے ہیں: وفیه دلیل ان قتلة عثمان كانوا منافقين اما في الايمان و اما في الاعمال.

﴿مامنعك ان تعلمي الناس بهذا﴾ نعمان راوی نے حضرت عائشہ سے عرض کیا کہ جب بات یہ تھی تو تمہیں اسی وقت مسلمانوں کو بتانا چاہئے تھا تا کہ ہر شخص حضرت عثمان کی استقامت کا راز جانتا اور ان سے کسی کو بھی غلط فہمی نہ ہوتی۔

﴿انسیته﴾ افعال سے مجہول واحد متکلم کا صیغہ ہے یعنی مجھے یہ بات بالکل بھلادی گئی ورنہ میں اس کا ضرور اظہار کرتی .... فرج بن فضالہ کو محدثین نے ضعیف، منکر، متروک اور نا قابل اعتبار قرار دیا ہے اس لئے الدیباجہ علی ابن ماجہ (۱/۵۰۱) میں اسے اسنادہٗ ضعیف کہا گیا ہے جب کہ امام ترمذی نے مناقب عثمان میں حدیث باب کو نقل کرنے کے

---

[1] مرقاۃ المفاتیح ۱۱/۳۲۸

بعد وفی الحدیث قصۃ طویلۃ وھذا حدیث حسن غریب تحریر فرمایا ہے شارح ترمذی مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی (۲۰۰/۱۰) میں لکھا ہے لم اقف علی من اخرج ھذا الحدیث بالقصۃ الطویلۃ، لیکن بوصیری کی تصریح کے مطابق یہ پورا واقعہ مسند ابی بکر بن ابی شیبہ میں منقول ہے۔

(۱۱۴/۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ نُمَيْرٍ وَعَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَا ثَنَا وَكِيْعٌ ثَنَا اِسْمَاعِيْلُ بْنُ اَبِيْ خَالِدٍ عَنْ قَيْسِ بْنِ اَبِيْ حَازِمٍ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ مَرَضِهٖ وَدِدْتُ اَنَّ عِنْدِيْ بَعْضَ اَصْحَابِيْ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَا نَدْعُوْلَكَ اَبَابَكْرٍ؟ فَسَكَتَ قُلْنَا اَلَا نَدْعُوْلَكَ عُمَرَ؟ فَسَكَتَ قُلْنَا اَلَا نَدْعُوْ لَكَ عُثْمَانَ قَالَ نَعَم فَجَاءَ عُثْمَانُ فَخَلَابِهٖ فَجَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ يُكَلِّمُهٗ وَوَجْهُ عُثْمَانَ يَتَغَيَّرُ قَالَ قَيْسٌ فَحَدَّثَنِيْ اَبُوْسَهْلَةَ مَوْلٰى عُثْمَانَ اَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ قَالَ يَوْمَ الدَّارِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَهِدَ اِلَيَّ عَهْداً وَاَنَا صَائِرٌ اِلَيْهِ وَقَالَ عَلِيٌّ فِيْ حَدِيْثِهٖ وَاَنَا صَابِرٌ عَلَيْهِ قَالَ قَيْسٌ فَكَانُوْا يَرَوْنَهٗ ذٰلِكَ الْيَوْمِ.

رسول اللہ ﷺ نے اپنے مرض میں فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ میرا کوئی صحابی میرے پاس رہے ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول کیوں نہ ہم ابوبکر کو بلالیں؟ آپ نے ہمیں کوئی جواب نہ دیا ہم نے عرض کیا کیوں نہ ہم عمر کو بلالیں؟ آپ پھر خاموش رہے ہم نے کہا کیوں نہ ہم عثمان کو بلالیں؟ فرمایا ہاں! جب عثمان آئے تو آپ نے ان سے تنہائی میں ملاقات کی رسول اللہ ﷺ ان سے گفتگو فرمانے لگے تو عثمان کا چہرہ بدلنے لگا قیس کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت عثمان کے غلام ابوسہلہ نے بیان کیا کہ حضرت عثمان نے محاصرے کے زمانے میں فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ایک خصوصی عہد لیا تھا میں نے اس پر قائم رہنے کا عہد کرلیا ہے جب کہ علی نے اپنی حدیث میں فرمایا کہ میں اس پر جما ہوا ہوں قیس کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے لوگ محاصرے کے زمانے میں آپ کو ثابت قدم دیکھ رہے تھے۔

ایسے مخصوص وقت میں حضرت عثمان کو بلوانا فضیلت کے ساتھ اس بات کا بھی اشارہ ہے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی موجودگی سے اطمینان وسکون ملتا تھا۔

﴿وجه عثمان يتغير﴾ ملا علی قاری نے لکھا ہے ای من البیاض والحمرة الى الصفرة[1] ان کا چہرہ سرخ وسفید سے پیلا ہوگیا گویا حضور نے انہیں آئندہ کے تمام مصائب وآلام سے خبردار کیا۔

﴿ابو سهلة﴾ یہ حضرت عثمان کے آزاد کردہ غلام تھے اور محاصرے کے وقت وہ آپ کے پاس موجود تھے دوسرے مخلصین کی طرح ان کی بھی خواہش تھی کہ باغیوں کے خلاف طاقت استعمال کی جائے اس درخواست کے جواب میں حضرت نے مندرجہ ذیل جملہ کہا۔

﴿عهد الى عهد افانا صائر اليه﴾ طیبی فرماتے ہیں ای اوصانی بأن اصبر ولا اقاتل[2] ملا علی قاری نے لکھا ہے قلت الأظهر ان العهد كان مركبا من عدم الخلع وترك القتال للدفع بل لمجرد الصبر للوصول الى مقام الجمع[3] میرے نزدیک یہ عہد دو چیزوں پر مشتمل تھا پہلی خلافت سے دستبردار نہ ہونا دوسری مزاحمت کیلئے قتال سے پرہیز کرنا اور جنت میں پہنچنے کیلئے صبر کرنا حضرت گنگوہیؒ نے عہد کے ضمن میں چوتھی حدیث کی نشاندہی کی ہے۔

بوصیری نے زوائد (۱/۵۹) میں لکھا ہے هذا اسناد صحيح رجاله كلهم ثقات امام ترمذی نے ابوسہلہ کی روایت مناقبِ عثمان کے تحت نقل کرکے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔

فَضْلُ عَلِيِّ بْنِ اَبِىْ طَالِبٍؓ

نام علی کنیت ابوتراب، ابوالحسن اور لقب حیدر تھا والد کا نام ابوطالب اور والدہ کا نام فاطمہ تھا آپ خاندان بنی ہاشم کے چشم وچراغ اور رسول اللہ ﷺ کے چچیرے بھائی ہیں ابوطالب نے حضور ﷺ کی نصرت وحمایت میں جو عظیم رول ادا کیا ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔

ان کی ولادت بعثت سے دس سال پہلے ہوئی ہے آپ کے والد ابوطالب معاشی تنگی میں مبتلا تھے اس لئے ان کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے حضرت عباس نے جعفر کو اور حضور نے علی کو اپنی پرورش میں لے لیا تھا، چنانچہ وہ اس وقت سے حضور ہی کے زیر سایہ رہے یہ نبوی تربیت ہی

---

[1] [2] [3] مرقاۃ المفاتیح ۱۱/۳۲۱

کا اثر تھا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے دین کا آوازہ بلند کیا تو آپ نے اس دعوت پر فوراً لبیک کہا اور پوری زندگی پھر اسی کے لیئے وقف کردی دعوتی ملاقاتوں میں بھی حضرت علی حضور کے ساتھ رہتے تھے بعثت کے چوتھے سال جب خاندان بنو ہاشم کو مدعو کیا گیا تو اس تقریب کا انتظام بھی حضرت علی ہی کے سپرد تھا اور اس میں صرف انہوں نے ہی نبوی دعوت کا مثبت جواب دیا تھا مکہ کی زندگی میں دیگر صحابہ کی طرح حضرت علی کو بھی ستایا گیا انہوں نے بڑی استقامت کے ساتھ ان مظالم کو برداشت کیا ہجرت نبوی کے موقع پر آپ ہی حضور کے بستر پر سوئے تھے جو یقیناً بڑے خطرے کا کام تھا۔

ہجرت

پھر تمام معاملات سے فراغت کے بعد انہوں نے بھی فوراً مدینہ کی راہ لی، شروع میں کلثوم بن ہدم کے یہاں مہمان ہوئے مواخات حضور نے اپنے ساتھ کرائی تھی ۲ھ میں آپ کا حضرت فاطمہ سے نکاح ہوا اور تقریباً دس گیارہ ماہ بعد حارث بن نعمان کے مکان میں رخصتی ہوئی حضرت علی نے تمام ہی غزوات میں شریک ہوکر کارہائے نمایاں انجام دیئے حجۃ الوداع میں یمن سے آکر شرکت کی متعدد سرایا آپ کی امارت میں بھیجے گئے وفات کے بعد حضور کے غسل وتجہیز وتکفین میں حضرت علی شریک تھے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر کی بیعت میں تھوڑا توقف فرمایا لیکن پھر مجمع عام میں آکر بیعت کی وہ دور صدیقی میں مجلس شوریٰ کے رکن رکین تھے حضرت عمر بھی اپنے زمانۂ خلافت میں ان پر خصوصی اعتماد کرتے تھے اور ان کے مشوروں کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی بیت المقدس جاتے وقت کارگذار خلیفہ انہوں نے علی ہی کو بنایا تھا شیخین کی طرح حضرت عثمان کے بھی وہ خصوصی مشیر رہے اور باغیوں کو بھی کافی سمجھایا۔

خلافت

شہادت عثمانی کے بعد ذی الحجہ ۳۵ھ میں انصار ومہاجرین کے اصرار پر آپ نے خلافت کا بارگراں اٹھایا اس وقت حضرت علی کے سامنے سب سے اہم مسئلہ قاتلین عثمان سے قصاص لینا تھا لیکن حالات کی ستم ظریفی کہ وہ اپنی تمام مخلصانہ کوششوں کے باوجود اس میں کامیاب نہیں

ہوئے اسی مسئلہ کو لے کر بعد میں جنگ جمل ہوئی حضرت علی نے خلافت پر فائز ہوتے ہی یک قلم تمام عثمانی عمال کو معزول کر دیا مؤرخین کے نزدیک یہ ایک سیاسی غلطی تھی جس کا حضرت علی کو کافی نقصان بھی اٹھانا پڑا اور اسی بناء پر امیر معاویہ ان کے خلاف قصاص کا دعویٰ لے کر اٹھے جس کے نتیجے میں کافی طویل جنگیں ہوئیں آپ نے کوفے کو دار الخلافہ بنایا جنگوں نے جب طول پکڑا تو تحکیم کا فیصلہ ہوا لیکن بالآخر وہ بھی ناکام رہی اس موقع پر خوارج کے فرقہ کا ظہور ہوا جس کی حضرت علیؓ کو مسلح سرکوبی کرنی پڑی شروع میں امیر معاویہ کا قبضہ صرف شام پر تھا پھر مصر قابو میں آیا اور انہوں نے مزید علاقوں کی طرف پیش رفت کی جس کے نتیجے میں دونوں فریقوں میں جھڑپیں ہوئیں جب خانہ جنگی زیادہ بڑھی تو ۴۰ھ میں امیر معاویہ اور حضرت علی نے اپنے اپنے مقبوضات پر صلح کر لی، حضرت علی کا پورا دور خانہ جنگی کا دور ہے اور انہیں کبھی سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملی، لیکن اس کے باوجود انہوں نے بیت المال، محاصل، تعزیر ودفاع اور عدل والنصاف میں خلافت کو فاروقی خطوط پر استوار کیا۔

حضرت علی زہد وعبادت، امانت ودیانت، شجاعت وتواضع، اصابت رائے اور آہ سحر گاہی کا پیکر تھے تفسیر وحدیث، فقہ وافتاء، قضا واجتہاد، اسرار وحکم، شعر وخطابت، اور دیگر علوم میں انہیں پورا ملکہ حاصل تھا اور سلوک وتصوف کے تو تمام سلسلے آپ ہی سے پھوٹے۔

ازواج واولاد

حضرت علی نے بالترتیب نو شادیاں کی بیویوں کے نام یہ ہیں فاطمہؓ زہراء ام البنینؓ بنت حرام، لیلی بنتؓ مسعود، اسماء بنتؓ عمیس، صہباؓ یا ام حبیب بنت ربیعہ، امامہؓ بنت ابی العاص، خولہؓ بنت جعفر، ام سعیدؓ بنت عروہ، محیاط بنت امراء القیسؓ، ان کے علاوہ کچھ باندیاں بھی تھیں، حضرت علی کی کل اولاد کی تعداد ۳۱ رہے چودہ لڑکے اور سترہ لڑکیاں ان میں صرف امام حسن امام حسین محمد ابن حنفیہ اور عمر سے سلسلہ نسب چلا بیشتر حضرت حسین کے ساتھ کربلا میں شہید ہوئے۔

شہادت

واقعہ نہروان کے بعد خوارج نے علی، معاویہ اور عمرو بن عاص کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا

فیصلہ کیا اور تینوں حضرات کے لئے الگ الگ آدمی متعین ہوئے رمضان ۴۰ھ میں صبح سویرے تینوں بزرگوں پر حملہ ہوا، امیر معاویہ پر وار اوچھا پڑا جب کہ عمرو بن عاص اس دن امامت کے لئے نہیں آئے اس لئے ان کا قائم مقام شخص دھوکے میں مارا گیا حضرت علیؓ پر ابن ملجم نے حملہ کیا وار اتنا کاری تھا کہ زندگی کی امید نہ رہی آپ نے حضرت حسنین کو بلا کر کچھ نصیحتیں کیں اور بیس رمضان المبارک ۴۰ھ جمعہ کی رات کو نبوی کہکشاں کا یہ درخشاں ستارہ ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا نماز جنازہ حضرت حسن نے پڑھائی اور کوفے ہی کے قبرستان میں آپ دفن کئے گئے خوارج کے ڈر سے قبر کو مخفی رکھا گیا تھا اس لئے وہ آج تک نامعلوم چلی آتی ہے شہادت کے وقت حضرت علی کی عمر ۶۳ سال تھی اور خلافت کی مدت چار سال نو مہینے رہی۔

(۱۱۵/۱) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، ثَنَا وَكِيعٌ ، وَأَبُوْمُعَاوِيَةَ ، وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ نُمَيْرٍ، عَنِ الْأَعْمَشِ عَنْ عَدِيِّ بْنِ ثَابِتٍ، عَنْ زِرِّ بْنِ حُبَيْشٍ ، عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: عَهِدَ إِلَيَّ النَّبِيُّ الْأُمِّيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَنَّهُ لَا يُحِبُّنِي إِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا يُبْغِضُنِي إِلَّا مُنَافِقٌ .

مجھ سے نبی امی نے وعدہ فرمایا کہ مجھ سے صرف مومن محبت کرے گا اور منافق ہی بغض رکھے گا۔

صحیح مسلم میں ان الفاظ سے پہلے والذی فلق الحب وبرأ النسمة بھی منقول ہے یعنی اس ذات کی قسم جس نے دانے کو پھاڑا اور جاندار کو وجود بخشا............حضرت علی کو سبقت اسلام کے ساتھ قرابت نبی، جہاد وقربانی اور مختلف فضائل بھی حاصل ہیں جن کے باعث وہ اسلام کا ایسا نشان تھے جو مومن کو محبت اور منافق کو بغض پر مجبور کرتا ہے۔

﴿لا یحبنی الا مومن﴾ علامہ سندھی نے لکھا ہے أی: حبأ لائقا لا علی وجه الافراط فان الخروج عن الحد غیر مطلوب ، ولیس من علاماته بل قد یودی الی الکفر والطغیان فان قوما قد خرجوا عن الایمان بالافراط فی حب عیسی، یعنی معتدل محبت جو حد سے متجاوز نہ ہو کیونکہ حد سے تجاوز نہ مطلوب ہے اور نہ ہی وہ حقیقی محبت کی علامت ہے بلکہ وہ بسا اوقات انسان کو کفر وطغیان تک پہنچا دیتی ہے جیسا کہ حضرت عیسی علیہ السلام کی محبت میں مبالغہ کے باعث کچھ لوگ ایمان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے ملا علی قاری نے ایک

اور شق کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے حبا مشروعا مطابقا للواقع من غیر زیادۃ ونقصان لیخرج النصیری والخارجی[1] یہاں ایسی شرعی محبت مراد ہے جو حقیقت کے عین مطابق ہو اور اس میں افراط وتفریط نہ ہو اب نصیری اور خارجی دونوں ہی اس زمرے سے نکل گئے سندھی اور قاری دونوں کی تشریح کا خلاصہ یہ نکلا کہ حد سے زیادہ محبت بھی گمراہی کا باعث ہوگی جیسا کہ شیعہ اور نصیری اور حضرت علی کی شان میں گستاخی ضلالت کا سبب ہے جیسا کہ خوارج اور نواصب، مسند احمد اور مستدرک حاکم کی روایت میں منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کو مخاطب کر کے فرمایا فیك مثلٌ من عیسی ابن مریم بَغَضَتِ الیھودُ حتی بَھتُوا امَّہٗ واحبَّتہُ النصاری حتی اَنزلوہُ بمَنزلتہ التی لیسَت لہ ثم قال یَھلك فِیّ رجلان محبٌ مُفرِطٌ یَقرِظُنی بمَا لَیس فِیّ ومُبغِضٌ یَحمِلُہ شَنَانِی علی اَن یبھتنی یعنی تم عیسی کے مشابہ ہو یہودیوں نے ان سے دشمنی کی تو ان کی ماں تک پر بہتان لگادیا اور نصاری نے انسے محبت کی تو اس مقام پر پہنچا دیا جو ان کی شان نہ تھی حضرت علی نے فرمایا: دو طرح کے لوگ میری بابت ہلاک ہوں گے ایک محبت میں غلو کرنے والا جو میری وہ خوبیاں بیاں کرے گا جو مجھمیں نہیں ہیں دوسرا بغض رکھنے والا جو دشمنی میں مجھ پر بہتان لگائیگا۔

﴿ولا یبغضنی الامنافق﴾ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب بغض پر نفاق کا فیصلہ ہے تو ان صحابہ وتابعین کو کیا کہا جائے گا جنہوں نے حضرت سے جنگ تک لڑی شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی جواب دیتے ہیں واما الحروب الواقعۃ بینھم فان وقع من بعضھم بغض لبعض فذاك من غیر ھذہ الجھۃ بل للامر الطاری الذی اقتضی المخالفۃ ولذلك لم یحکم بعضھم علی بعض بالنفاق وانما کان حالھم فی ذلك حال المجتھدین فی الاحکام للمصیب اجران وللمخطی اجر واحد[3] یہ بغض وعداوت کی بنا پر نہیں بلکہ شرعی اجتہاد کی وجہ سے جنگ ہوئی اسلئے وہ حدیث کے ذیل میں نہیں آتیں..... حدیث صحیح مسلم (ایمان/۳۱) سنن نسائی (ایمان/۱۹،۲۰) اور جامع ترمذی (مناقب علی) میں بھی آئی ہے ابن ماجہ کی سند بالکل صحیح ہے پہلے راوی کو چھوڑ کر یہ مسلم کا طریق ہے۔

---

[1] مرقاۃ المفاتیح ۱۱/ ۳۳۷ [2] مرقاۃ المفاتیح ۱۱/ ۳۳۷ [3] فتح الملہم ۱/ ۲۲۳

(۱۱۶/۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ، ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ، ثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ سَعْدِ بْنَ اِبْرَاهِيْمَ، قَالَ: سَمِعْتُ اِبْرَاهِيْمَ بْنَ سَعْدِ بْنِ أَبِيْ وَقَّاصٍ، يُحَدِّثُ عَنْ اَبِيْهِ ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَالَ لِعَلِيٍّ اَلَا تَرْضَى اَنْ تَكُوْنَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى .

کیا تم اس پر راضی نہیں کہ میرے تعلق سے تمہارا درجہ وہی ہو جو ہارون کا موسیٰ کے تعلق سے تھا۔

اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت شام کی سرحد پر رومیوں کے لئے ایک چیلنج بنتی جا رہی تھی قیصر نے رومی باج گذار اور غسانی عربوں کی ایک فوج لے کر مدینے پر حملے کا ارادہ کیا رسول اللہ ﷺ نے دفاع کے بجائے اقدام کرتے ہوئے ایک عظیم لشکر کے ساتھ تبوک کا رخ کیا مدینے کا انتظام محمد بن مسلمہ یا سباع بن عرفطہ کو سونپا اور اہل بیت کی حفاظت کے لئے حضرت علی کو مقرر کیا مسلم کی حدیث میں صراحت ہے خلف رسول اللّٰه ﷺ علی بن أبی طالب فی غزوة تبوك، فضل اللہ تورپشتی نے لکھا ہے فأرجف به المنافقون وقالوا: ماخلفه الا استثقالاً وتخففاً منه[1] منافقوں نے یہ کہہ کر حضرت علی کو دل برداشتہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں یہاں اس لئے چھوڑ دیا کہ آپ کے دل میں علی کی کوئی وقعت نہیں اور ان کو آپ ایک بوجھ سمجھتے ہیں اسلامی لشکر ابھی مقام جرف ہی میں تھا حضرت علی مغموم و مسلح ہو کر وہاں پہنچے مسلم میں صراحت ہے انہوں نے شکایت کی یا رسول اللّٰه تخلفنی فی النساء والصبیان .تو آپ نے ان کی دلجوئی کے لئے حدیث باب کے کلمات ارشاد فرمائے مسلم کی حدیث میں آخر میں غیر أنه لانبی بعدی کا بھی اضافہ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جب اعتکاف کے لئے کوہ طور پر تشریف لے گئے تو آپ نے ہارون کو جانشین بنایا، سورۂ اعراف میں ہے وقال موسی لأخیه هارون أخلفنی فی قومی وأصلح ولا تتبع سبیل المفسدین[2] حدیث میں اسی جانشینی کی طرف اشارہ ہے شیعوں نے اسے حضرت علی کی خلافت بلافصل کی دلیل بنایا ہے جس کا جواب قاضی عیاض نے یہ دیا ہے ان هارون المشبه به لم یكن خلیفة بعد موسیٰ بل توفی فی حیاة

---

[1] مرقاۃ المفاتیح ۳۳۶/۱۱ [2] سورۂ اعراف ۱۴۲

موسی وقبل وفاة موسی نحو اربعين سنة على ماهو مشهور عند أهل الأخبار والقصص[1] یعنی حضرت ہارونؑ جو مشبہ بہ ہیں وہ حضرت موسیؑ کے خلیفہ نہیں بنے بلکہ ان سے چالیس سال پیشتر ہی وفات پا گئے تو حضرت علی کیوں کر خلیفہ ہو سکتے ہیں مشبہ اور مشبہ بہ میں مکمل مطابقت ضروری ہے خطابی، طیبی، سندھی، ملا علی قاری حضرت گنگوہی اور مولانا مبارک پوری سے بھی یہی جواب منقول ہے لیکن شیعہ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ انتقال ہونا الگ چیز ہے اگر موسیٰؑ کے بعد ہارونؑ زندہ ہوتے تو یوشع کے بجائے بلاشبہ وہی خلیفہ ہوتے حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ تجزیہ کرتے ہیں کہ حضرت ہارونؑ کی نیابت پوری قوم کے لئے تھی جب کہ حضرت علی کی یہ قائم مقامی صرف اہل بیت تک محدود تھی مدینے کی حکومت وخلافت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا کیونکہ انتظام تو مذکورہ دو صحابیوں کو سونپا گیا تھا جب کہ مسجد نبوی کی امامت ابن ام مکتوم کو عطا کی گئی اس لئے وہ خلافت کی دلیل نہیں بلاشبہ یہ فضیلت ہے لیکن اس سے بڑی فضیلت وہ ہے جب آپ نے اسیران بدر کے معاملے میں ابوبکر کو ابراہیم وعیسیٰ سے اور عمر کو نوح وموسیٰ سے تشبیہ دی یہ انبیاء جب حضرت ہارون سے افضل ہیں تو شیخین بھی حضرت علی سے افضل قرار پائیں گے[2]۔

حدیث کو امام بخاری، امام مسلم اور امام ترمذی نے مناقب علی کے باب میں درج کیا ہے اور ابن ماجہ کی سند بعینہٖ صحیح بخاری کی ہے کیونکہ غندر محمد بن جعفر کا لقب ہے۔

(۱۱۷/۴) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ، ثَنَا اَبُوالْحَسَنِ ، اَخْبَرَنِیْ حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ زَيْدِ بْنِ جُدْعَانَ ، عَنْ عَدِيِّ بْنِ ثَابِتٍ، عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ، قَالَ: أَقْبَلْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِیْ حَجَّتِهِ الَّتِیْ حَجَّ ، فَنَزَلَ فِیْ بَعْضِ الطَّرِيْقِ، فَاَمَرَ الصَّلٰوةَ جَامِعَةً، فَاَخَذَ بِيَدِ عَلِيٍّ، فَقَالَ: "اَلَسْتُ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا: بَلٰى قَالَ: "اَلَسْتُ اَوْلٰى بِكُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِهٖ" قَالُوْا: بَلٰى قَالَ: "فَهٰذَا وَلِيُّ مَنْ اَنَا مَوْلَاهُ اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ اَللّٰهُمَّ عَادِ مَنْ عَادَاهُ"

---

[1] شرح نووی مسلم ۲/۲۶۸ [2] سیرت المصطفیٰ ۳

ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ کے اس حج میں رفاقت کی جو آپ نے کیا پھر حضرت نے ایک جگہ قیام فرما کر نماز با جماعت کا حکم دیا اور حضرت علی کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کیا میں مومنوں کے نزدیک ان کی جانوں سے زیادہ محبوب نہیں ہوں؟ حاضرین نے کہا کیوں نہیں آپ نے پھر فرمایا کیا میں ہر مومن کے نزدیک اس کی جان سے زیادہ محبوب نہیں ہوں؟ صحابہ نے کہا کیوں نہیں تو آپ نے فرمایا یہ بھی ہر اس شخص کا محبوب ہے جس کا میں محبوب ہوں مولائے کریم اسے اپنا محبوب بنالے جو علی کو محبوب بنائے اور اسے دھتکار دے جو علی سے دشمنی کرے۔

حجۃ الوداع سے چند ماہ بیشتر رسول اللہ ﷺ نے تین صحابہ کا ایک دستہ یمن روانہ فرمایا جامع ترمذی مناقب علی میں منقول ہے کہ اس کا امیر حضرت علی کو بنایا جب مہم کامیاب ہوگئی تو حضرت علی نے مال غنیمت میں سے ایک باندی اپنے لئے منتخب کرلی بعض صحابہ نے اس پر نکیر فرمائی اور چار حضرات نے یہ طے کرلیا کہ رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کر کے ہمیں علی کی بابت خبر دینی ہے ترمذی کی دوسری روایت میں یہ بھی صراحت ہے کہ حضرت علی نے ایک قلعہ کو فتح کر کے یہ باندی حاصل کی تھی اور حضرت خالد بن ولید نے اس سلسلہ میں ایک شکایتی خط لے کر براء بن عازب کو آپ کی خدمت میں بھیجا جسے پڑھ کر چہرۂ انور بدل گیا اور آپ نے براء کو مخاطب کر کے فرمایا **ما تری فی رجل یحب اللّٰہ ورسولہ ویحبہ اللّٰہ ورسولہ** پھر آپ خاموش ہو گئے اور پہلی روایت کے مطابق جب یہ چاروں حضرات مکہ پہنچے اور چاروں نے باری باری مجمع میں کھڑے ہو کر حضرت علی کی شکایت کی تو آپ نے اعراض فرمایا یہاں تک کہ چہرہ مبارک پر غصہ کے اثرات ظاہر ہوئے اور ان چاروں سے فرمایا: **ما تریدون من علی، ماتریدون من علی، ماتریدون من علی، ان علیا منی وأنا منہ، وھو ولی کل مومن من بعدی**" حدیث باب اسی واقعہ سے متعلق آپ کی تقریر کے اضافی ٹکڑے ہیں جو آپ نے غدیر خم پر فرمائی۔ یہ مدینہ سے مکے کے راستے میں جحفہ سے تین میل کی دوری پر واقع ہے۔

﴿**ألست اولی بالمؤمنین**﴾ علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں **معناہ ألست أحق بالمحبۃ والتوقیر والاخلاص بمنزلۃ الأب للاولاد** یعنی کیا میں محبت، عظمت اور اخلاص میں مسلمانوں کے لئے ان کے باپ کی طرح نہیں ہوں ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں

وفیه ایماء الی قوله تعالی النبی اولی بالمؤمنین من أنفسهم وأزواجه امهاتهم[1]
﴿فهذا ولی من أنا مولاه﴾ القاموس المحیط (۴/۴۰۴) أقرب الموارد (۲/۱۴۸۸)
اور مجمع بحار الانوار (۵/۱۱۲) میں مولیٰ کے اکیس معنی لکھے ہیں (۱) المالك (۲) العبد (۳) المعتِق (۴) المعتَق (۵) الصاحب (۶) القریب کابن العم ونحوه (۷) الجار (۸) الحلیف (۹) الإبن (۱۰) العم (۱۱) النزیل (۱۲) الشریك (۱۳) ابن الأخت (۱۴) الولی (۱۵) الرب (۱۶) الناصر (۱۷) المنعم (۱۸) المنعم علیه (۱۹) المحب (۲۰) التابع (۲۱) الصهر، ان معانی کی روشنی میں علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں محبوب من انا محبوبه میں جس کا محبوب ہوں علی بھی اس کے محبوب ہیں سندھی نے مزید لکھا ہے کہ اگلی عبارت سے مولی کا مفہوم متعین ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں علی کی دوستی کی ترغیب اور دشمنی پر تنبیہ ہے اس لئے شیعوں کا خلافت پر استدلال درست نہیں حضرت علی کی شکایت پر آپ کو ناگواری کیوں ہوئی؟ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اس پر بڑا مفصل اور بلیغ کلام کیا ہے اور اس کے ان کے نزدیک تین اسباب ہیں۔

(۱) تَركُهم النُصحَ لِعَلِیٍّ حتی اَعلمُو النَبِیَّ ﷺ به ولم یُؤْذِنُوا علیاً بِمَا خَالَجَ خَواطِرهُم حتَی یَتَبیَّنَ لهم عذرُه وکان المَانِعُ لهم عَن ذلك خوفُ الفِتنةِ واَنْ یَجِدَ علَیْهِمْ پہلا سبب ان حضرات کا حضرت علی کی خیر خواہی چھوڑ دینا ہے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے جا کر تو علی کی شکایت کر دی لیکن حضرت علی کو اپنے احساسات سے آگاہ نہیں کیا ورنہ کوئی توجیہ سامنے آتی شاید اس کی وجہ فتنہ کا خوف ہو کیونکہ اس صورت میں حضرت علیؓ کو بھی ان پر غصہ آ سکتا تھا۔

(۲) الثانی لِلْغضبِ حَملُهم فعلَ علیٍّ علی الوَجهِ الغَیرِ المَشرُوعِ بل کانَ علیهم حملُهُ علی الوجهِ الْمشرُوعِ آپکے غصہ کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ان حضرات نے حضرت علی کے فعل کو عدم جواز پر محمول کیا حالانکہ ان کی فضیلت اور قرابت نبی کی بنیاد پر ان حضرات کو اسے جواز پر محمول کرنا چاہئے تھا جیسا کہ دوسرے محدثین نے بھی لکھا ہے کہ خمس سے اس

[1] مرقاۃ المفاتیح ۱۱/۳۴۹

طرح کے استفادہ کی حضور نے آپ کو پیشگی اجازت دی تھی اور اس کا استبراء رحم بھی ہو چکا تھا۔

(۳) الثالثُ أنهُم لَوْاذَنُوه بِذَلِكَ في خلوةٍ لم يَغضِبْ وإنمَا أسْخطَهُ صَلَى الله عليه وسلم قولُهم ذلك بمَحضرِ النَّاسِ اگر وہ یہ اطلاع تنہائی میں دیتے تو آپ کو غصہ نہ آتا مجمع عام میں ان کی اس گفتگو نے آپ کو رنجیدہ کر دیا............ اس لئے ضروری ہوا کہ ان کے اس فعل پر نکیر کر کے حضرت علی کے مقام کو بتایا جائے حدیث باب اسی کی وضاحت ہے .... علی بن زید بن جدعان کو محدثین نے ضعیف، مخطی اور متروک قرار دیا ہے اس لئے بوصیری نے زوائد ابن ماجہ (۶۰/۱) میں هذااسناد ضعيف لضعف علي بن زيد بن جدعان کا فیصلہ کیا ہے لیکن تعدد طرق کی بناء پر ملا علی قاری نے لکھا ہے واقل مرتبته أن يكون حسنافلاالتفات لمن قدح في ثبوت هذا الحديث[1]

(۱۱۸/۴) حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ اَبِيْ شَيْبَةَ، ثَنَا وَكِيْعٌ، ثَنَا اِبْنُ اَبِي لَيْلَى ثَنَا الْحَكَمُ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِيْ لَيْلَى قَالَ: كَانَ اَبُوْلَيْلَى يَسِيْرُ مَعَ عَلِيٍّ فَكَانَ يَلْبَسُ ثِيَابَ الصَّيْفِ فِيْ الشِّتَاءِ وَثِيَابَ الشِّتَاءِ فِيْ الصَّيْفِ فَقُلْنَا، لَوْسَاَلْتَهُ فَقَالَ : اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَعَثَ اِلَيَّ وَاَنَا اَرْمَدُ الْعَيْنِ ، يَوْمَ خَيْبَرَ قُلْتُ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنِّي اَرْمَدُ الْعَيْنِ ، فَتَفَلَ فِيْ عَيْنِيْ ، ثُمَّ قَالَ: "اَللّٰهُمَّ أَذْهِبْ عَنْهُ الْحَرَّ وَالْبَرْدَ" قَالَ: فَمَا وَجَدْتُ حراً وَلَا بَرْداً بَعْدَ يَوْمَئِذٍ وَقَالَ: "لَاَبْعَثَنَّ رَجُلاً يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ لَيْسَ بِفَرَّارٍ" فَتَشَرَّفَ لَهُ النَّاسُ، فَبَعَثَ اِلَى عَلِيٍّ، فَاَعْطَاهَا اِيَّاهُ.

عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ ابو لیلیٰ حضرت علیؓ کے ساتھ رات میں چل رہے تھے اور حضرت علیؓ گرمی کے کپڑے سردیوں میں اور سردی کے کپڑے گرمیوں میں پہن لیتے تھے ہم نے ابو لیلیٰ سے کہا کہ کاش تم اس کے بارے میں ان سے کچھ پوچھ لیتے (چلتے چلتے) حضرت علیؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن مجھے بلا بھیجا اس وقت میری آنکھیں دکھ رہی تھیں میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ میں تو آشوب چشم کا مریض ہوں تو آپ نے آنکھوں میں اپنا

[1] مرقاۃ المفاتیح ۳۴۹/۱۱

لعاب دہن ڈال کر دعا فرمائی اے اللہ اس سے سردی اور گرمی کو دور کر دے حضرت علی نے بتلایا کہ اس دن کے بعد سے میں نے سردی اور گرمی کو محسوس نہیں کیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں یقیناً ایسے شخص کو بھیجوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور وہ دونوں اس سے محبت کرتے ہیں وہ ہر گز بھاگنے والا نہیں ہے لوگوں کو اسے دیکھنے کا شوق ہوا تو آپ نے علی کے پاس کسی کو بھیجا اور جھنڈا انہیں کو عطا کیا۔

﴿فکان یلبس...... لو سالته﴾ معجم اوسط طبرانی میں منقول ہے عن علی انه قیل له نراك فی الحر الشدید وعلیك ثیاب الشتاء ونراك فی الشتاء وعلیك ثیاب الصیف وتمسح العرق. ہم آپ کے جسم پر شدید گرمی میں سردیوں کے کپڑے اور سردیوں میں گرمیوں کے کپڑے دیکھتے ہیں اور آپ اس موسم میں پسینہ پونچھتے ہیں۔

﴿وانا أرمد العین﴾ پورا جملہ الی کی ضمیر متکلم سے حال واقع ہے اور رمد سمع کے باب سے آتا ہے، معنی آنکھ کا دکھنا۔

﴿یوم خیبر﴾ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے معارف الحدیث (۳۵۹/۸) میں لکھا ہے کہ خیبر مدینے سے تقریباً ایک سو چوراسی کیلومیٹر کی دوری پر شمال میں واقع ہے۔

﴿فتفل فی عینی﴾ تفلا ضرب اور نصر سے آتا ہے معنی تھوکنا، بخاری اور مسلم کی روایت میں بصق فی عینه منقول ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کا معجزہ تھا چنانچہ صحیحین کی روایت میں تصریح ہے فبرأ کان لم یکن به وجع یعنی آپ اس طرح صحیح ہو گئے، گویا کوئی شکایت تھی ہی نہیں اسی طرح ان سے ہمیشہ کیلئے سردی و گرمی کی شدت کے احساس کا دور ہو جانا دوسرا معجزہ تھا۔

﴿لابعثن رجلا الخ﴾ یہ دراصل ایک تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ ہے صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ڈیڑھ ہزار صحابہ کا لشکر لے کر خیبر کی طرف روانہ ہوئے یہاں یہودی عرصۂ دراز سے رہتے تھے اور غزوۂ خندق میں انہوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے در پردہ مشرکین مکہ کو مدد پہنچائی تھی اس لئے ان کی بیخ کنی ضروری تھی مسلمانوں کو دیکھ کر وہ اپنے قلعوں میں چھپ گئے اشیائے خوردنی کی کمی نہ تھی اس لئے وہ اپنے کو مفتوح نہ سمجھتے تھے جب حملہ ہوا تو پہلے قلعہ ناعم فتح ہوا پھر قلعہ قموص کا محاصرہ کیا گیا حضور نے پہلے ابوبکر پھر عمر کو اسے

زیر کرنے کے لئے بھیجا لیکن وہ فتح نہ ہوا پھر آپ نے ارشاد فرمایا بخاری و مسلم میں ہے لاعطین ھذہ الرایة غدا رجلا یفتح اللّٰہ علیه لوگوں کو اشتیاق ہوا و کلھم یرجون ان یعطیھا لیکن آپ نے علی کو بلا کر پہلے ان کی آنکھوں میں لعاب ڈالا پھر جھنڈا ان کو عطا کیا حضرت علی نے پوچھا اقاتلھم حتی یکونوا مثلنا آپ نے فرمایا انفذ علی رسلك حتی تنزل بساحتھم ثم ادعھم الی الاسلام واخبرھم بما یجب علیھم من حق اللّٰہ فیه فواللّٰہ لان یھدی اللّٰہ بك رجلا واحد اخیرلك من ان یکون لك حمر النعم اسی فرمان کے مطابق جنگ سے پہلے حضرت علی نے انہیں اسلام کی دعوت دی جو ٹھکرا دی گئی پھر مرحب سے مقابلہ ہوا اور حضرت علی نے اسے وہیں ٹھنڈا کر دیا اسی پورے واقعہ کی طرف حدیث میں اشارہ ہے ...... بوصیری زوائد ابن ماجہ میں (۶۰/۱) میں لکھتے ہیں ھذااسناد ضعیف ابن ابی لیلیٰ شیخ وکیع ھو محمد وھو ضعیف الحفظ لا یحتج بما ینفرد لیکن غزوہ خیبر سے متعلق احادیث کو امام بخاری اور امام مسلم نے مناقب علی میں بھی نقل کیا ہے۔

(۱۱۹/۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مُوْسَی الْوَاسِطِیْ، ثَنَا الْمُعَلّٰی بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ثَنَا بْنُ اَبِیْ ذِئْبٍ عَنْ نَافِعٍ، عَنْ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ ”اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّةِ وَاَبُوْھُمَا خَیْرٌ مِّنْھُمَا“

حسن حسین جنت کے جوانوں کے سردار ہیں اور ان کے والد دونوں سے افضل ہیں۔

﴿سید اشباب اھل الجنة﴾ شاب کا اطلاق کہاں تک ہوتا ہے علامہ سندھی نے لکھا ہے وھو من بلغ الی ثلثین حدیث کی وضاحت میں متعدد توجیہات ہیں لیکن ابوبکر وعمر سیدا کھول اھل الجنة کے پیش نظر علامہ سندھیؒ کی توجیہ انھما سیدا کل من مات شابا ودخل الجنة راجح ہے امام طیبی نے بھی اس کو نقل کیا ہے ملا علی قاریؒ نے مظہر کے حوالے سے ھما أفضل من مات شابا فی سبیل اللّٰہ من اصحاب الجنة[1] تحریر فرمایا ہے مجددیؒ نے امام نوویؒ کے حوالے سے بھی وضاحت کی ہے۔

---

[1] مرقاۃ المفاتیح ۳۹۰/۱۱

حدیث کی سند کا ایک راوی معلیٰ بن عبد الرحمن قطعا قابل اعتبار نہیں اس کی بابت علی بن مدینی نے کان یضع الحدیث دار قطنی نے ضعیف کذاب ابن حجر نے متھم بالوضع وقدرمی بالرفض اور ابن معین نے احسن أحواله عندی أنه قیل له عند موته ألا تستغفر الله تعالی، فقال لا أرجو أن یغفر لی وقد وضعت فی فضل علی سبعین حدیثا کا تبصرہ کیا ہے ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب (۱۲۱۴/۱۰) اسی لئے بوصیری نے زوائد (٦١) میں لکھا ہے هذااسناد ضعیف ، المعلیٰ بن عبد الرحمن اعترف بوضع سبعین حدیثا فی فضل علی، اصول حدیث کے مطابق جس راوی کا کذب حدیث میں ثابت ہو جائے اس کی تمام مرویات موضوع قرار پاتی ہیں اس لئے یہ سند ضعیف سے آگے بڑھ کر موضوع ہے خصوصاً وابوهما خیر منهما پر اس کا اثر پڑے گا ہم نے اسی لئے اس کی شرح نہیں کی جب کہ الحسن والحسین سید اشباب أهل الجنة ترمذی میں بھی منقول ہے اور امام نے اسے صحیح حسن قرار دیا ہے۔

(١٢٠/٦)حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ اَبِیْ شَیْبَةَ وَسُوَیْدُ بْنِ سَعِیْدٍ ، وَاِسْمَاعِیْلُ بْنُ مُوْسیٰ قَالُوْا: ثَنَا شَرِیْكٌ ، عَنْ اَبِیْ اِسْحَاقَ، عَنْ حَبْشِیِّ بْنِ جُنَادَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ "عَلِیٌّ مِنِّی وَاَنَا مِنْهُ، وَلَا یُؤَدِّیْ عَنِّی اِلَّاعَلِیٌّ"

علی مجھ سے ہیں میں علی سے ہوں میری طرف سے پیغام صرف علی ہی پہنچا سکتے ہیں۔

فتح مکہ کے بعد اگلے سال سورۂ توبہ نازل ہوئی جس میں کفار و مشرکین کی بابت خصوصی احکامات دیئے گئے اور ان کے ساتھ معاہدوں کو فسخ کر کے انما المشر کون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا وغیر جیسی سخت ہدایات از یں رسول اللہ ﷺ نے ذیقعدہ ۹ ہجری میں جب حضرت ابو بکرؓ کو امیر حج بنا کر بھیجا تو انہیں تمام کفار و مشرکین کو اللہ کے احکامات پہنچانے کی بھی تاکید کی بعد میں حضور ﷺ نے محسوس کیا کہ عربی روایت کی رو سے کوئی معاہدہ اسی وقت منعقد یا فسخ مانا جاتا ہے جو جماعت کا سردار خود کرے یا اس کا کوئی نسبی قریبی رشتہ دار اس کام کو انجام دے۔

جیسا کہ فضل اللہ تورپشتی نے لکھا ہے کان من دأب العرب اذا کان بینهم

مقاولة في نقيض وابرام وصلح ونبذ عهد ان لا يودى ذلك الاسيد قوم اومن يليه من ذوى قرابته القريبة ولا يقبلون ممن سواهم[1] چنانچہ اس موقع پر اہم اعلانات کے لئے آپ نے حضرت علی کو مکہ مکرمہ بھیجتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار فرمایا جس پر حدیث باب مشتمل ہے۔

حضرت علی جب مکہ پہنچے تو صدیق اکبر نے ان سے پوچھا آپ امیر کی حیثیت سے بھیجے گئے یا مامور کی حیثیت سے انہوں نے کہا امیر آپ ہی ہیں میں مامور کی حیثیت سے آیا ہوں۔

شیعوں نے حدیث باب کو حضرت علی کی خصوصیت قرار دے کر ان کی خلافت پر استدلال کیا ہے لیکن اس طرح کے کلمات کو صرف ان ہی کا امتیاز قرار دینا درست نہیں وہ دیگر صحابہ کے لئے بھی ثابت ہیں چنانچہ جامع ترمذی میں العباس منی وانا منه صحیح مسلم میں (۲/ ۲۹۵) حضرت جلیبیب کی شہادت کے بعد آپ نے هذا منی وانا منه فرمایا اسی طرح صحیح مسلم ہی میں (۲/ ۳۰۲) منقول ہے کہ اشعریوں سے خوش ہو کر ان کی بابت آپ نے ارشاد فرمایا هم منی وانا منهم مسند احمد بن حنبل میں بنی ناجیہ کے بارے میں بھی آپ کی شہادت انا منهم وهم منی موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ امتیاز دوسروں کو بھی حاصل ہے اس لئے اگر وہ خلافت کی دلیل ہے تو حضرت علی کے ساتھ حضرت عباس، حضرت جلیبیب، اشعری صحابہ اور بنی ناجیہ بھی شریک ہوں گے، جس کو شیعہ تسلیم نہیں کرتے اس لئے ان کا استدلال غیر منصفانہ ہے امام ترمذی نے مناقب علی میں حدیث باب کی تخریج کی ہے اور سند پہلے راوی کو چھوڑ کر دونوں کی ایک ہے جس کو امام ترمذی نے حسن غریب صحیح قرار دیا ہے الدیباجه علی ابن ماجه (۱/ ۵۲۳) میں اسے اسناده صحیح لغیره کہا گیا ہے۔

(۱۲۱/۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ اِسْمَاعِيلَ الرَّازِيُّ ثَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ مُوْسٰى اَنْبَاَنَا الْعَلَاءُ بْنُ صَالِحٍ عَنِ الْمِنْهَالِ عَنْ عَبَّادِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ عَلِيٌّ اَنَا عَبْدُ اللّٰهِ وَاَخُوْ رَسُوْلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا الصِّدِّيْقُ الْاَكْبَرُ لَا يَقُوْلُهَا بَعْدِيْ اِلَّا كَذَّابٌ صَلَّيْتُ قَبْلَ النَّاسِ بِسَبْعِ سِنِيْنَ.

[1] مرقاۃ المفاتیح ۱۱/ ۳۴۲

میں اللہ کا بندہ اوراس کے رسول کا بھائی ہوں میں صدیق اکبر ہوں اس کو میرے بعد صرف کذاب ہی کہے گا، میں نے لوگوں سے سات سال پہلے نماز پڑھی ہے۔

بوصیری نے زوائد ابن ماجہ (۱/ ٦١) میں لکھا ہے هذا اسناد صحيح رجاله ثقات لیکن ہمارے نزدیک یہ فیصلہ محلِ نظر ہے کیونکہ رواۃ اس درجہ کے نظر نہیں آتے پہلے راوی علاء بن صالح کی گرچہ ابن معین، ابوداؤد اور ابن حبان نے توثیق کی ہے لیکن امام بخاری نے لا یتابع اور ابن المدینی نے روی احادیث منا کیر کی شہادت دی ہے، ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب (۸/۱٦۴) دوسرے راوی منہال بن عمرو ہیں جن کو اگر ثقہ اور صدوق کہا گیا ہے تو جوز جانی نے سيئ المذهب وقد جرح حديثه اور ابن حجر نے صدوقٌ رُبَما وَهِمَ بھی قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب (۱/۲۸۳) تیسرے راوی عباد بن عبداللہ کو امام بخاری نے فيه نظر ابن مدینی نے ضعيف الحديث امام احمد نے هو منكر ابن حزم نے هو مجهول اور ابن حجر نے ضعيف من الثالثة کہا ہے (تہذیب التہذیب ۵/ ۸٦) اب قارئین خود فیصلہ کریں کہ بوصیری کے قول سیسند کی صحت کا جو مضبوط تأثر ملتا ہے وہ کہاں تک درست ہے۔

یہ روایتاً بحث تھی اب درایت کی رو سے اس کا جائزہ لیتے ہیں یہاں حضرت علی خود کو رسول اللہ کا بھائی، اللہ کا بندہ اور صدیق اکبر قرار دیتے ہیں پھر فرماتے ہیں صرف جھوٹا ہی کہے گا ایک تو ہاضمیر کا مرجع ہی سرے سے غائب ہے اگر بتکلف اس سے سابقہ جملہ مراد لیا جائے تب بھی معنی درست نہیں ہوتے کیوں کہ پہلے تو علی اپنے یہ فضائل بیان کرتے ہیں اور پھر دوسرے جملے میں کہتے ہیں کہ ایسا کہنے والا جھوٹا ہوگا کیوں؟ اگر وہ حقیقت ہے تو اس کا قائل جھوٹا کیسے ہوسکتا ہے اور اگر یہ جھوٹا ہے تو پہلی چیز حقیقت نہیں ہوسکتی یہاں دونوں جملوں میں کھلا تضاد ہے ان میں لا محالہ ایک کو غلط کہنا پڑے گا۔

دوسری چیز حضرت علی کا تمام مسلمانوں سے سات سال پہلے نماز پڑھنا ہے وہ یقیناً سابقین اولین میں سے ہیں لیکن یہ امتیاز دوسرے صحابہ کو بھی حاصل ہے اور حضرت ابوبکر اور حضرت خدیجہ ان میں سب سے مقدم ہیں پھر حضرت علی نے ان سے سات سال پہلے نماز کیسے

پڑھ لی ؟ ابن کثیر نے التاریخ ، (۲۷/۳) میں لکھا ہے کیف یمکن ان یصلی قبل الناس بسبع سنین هذا لا یتصور اصلاً اگر یہ کہا جائے کہ نماز کی فرضیت سات سال بعد ہوئی لیکن حضرت علی شروع ہی سے نماز پڑھتے تھے تو فوراً اشکال ہوگا کہ یہ فضیلت دوسرے صحابہ کو بھی حاصل ہے اور کیا کوئی یہ ثابت کر سکتا ہے کہ فرضیت سے پہلے صرف حضرت علی نماز پڑھتے تھے دوسرے صحابہ کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا صاف بات یہ ہے کہ روایت شیعی ذہن کی پیداوار ہے اور اس میں شیخین کی مخالفت کا رنگ موجود ہے اسی لئے ابن الجوزی نے اسے الموضوعات (۱/۳۴۱) میں هذا موضوع والمتهم به عباد بن عبد الله، امام ذہبی نے میزان الاعتدال (۲/ ۳۶۸) میں هذا کذب علی علیّ ابن کثیر نے التاریخ (۲۷/۳) میں هذا الحدیث منکر بکل حال ولا یقوله علیّ امام شوکانی نے فوائد المجموعة میں فی اسناده عباد بن عبد الله وهو المتهم بالوضع کی شہادت دی ہے اس لئے یہ موضوع ہی ہے اور اس کی شرح کا کوئی جواز نہیں۔

(۱۲۲/۸) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٌ، ثَنَا أَبُوْمُعَاوِيَةَ، ثَنَا مُوْسٰی بْنُ مُسْلِمٍ، عَنِ ابْنِ سَابِطٍ وَهُوَ: عَبْدُ الرَّحْمٰنِ عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِيْ وَقَّاصٍ ، قَالَ: قَدِمَ مُعَاوِيَةُ فِيْ بَعْضِ حَجَّاتِهِ، فَدَخَلَ عَلَيْهِ سَعْدٌ، فَذَكَرُوْا عَلِيًّا فَنَالَ مِنْهُ، فَغَضِبَ سَعْدٌ، وَقَالَ: تَقُوْلُ هٰذَا لِرَجُلٍ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ" وَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ : "أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ" وَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ: لَأُعْطِيَنَّ الرَّأْيَةَ الْيَوْمَ رَجُلًا يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ؟"

حضرت معاویہ اپنے کسی حج کے موقع پر تشریف لائے تو حضرت سعد بن وقاص ان سے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے لوگوں نے حضرت علی کا تذکرہ چھیڑ دیا حضرت معاویہ نے بھی کوئی جملہ کہہ دیا جس پر حضرت سعد کو غصہ آ گیا انہوں نے کہا تم اس شخص کے بارے میں یہ کہتے ہو جس کی بابت میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے میں جس کا محبوب ہوں علی بھی اس کے محبوب ہیں اور یہ بھی فرماتے ہوئے سنا کہ علی تمہارا میرے نزدیک وہی مقام ہے جو حضرت

ہارون کا موسیٰ کے یہاں تھا مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اسی طرح میں نے آپ کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا کہ میں آج اس شخص کو جھنڈا دونگا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔

﴿قدم معاوية في بعض حجاته﴾ مسلم وترمذی میں امرّ معاوية بن ابی سفيان سعداً منقول ہے یعنی امیر معاویہ نے سعد کو کسی جگہ عامل بنایا۔

﴿فنال منه﴾ نیل کا صلہ جب من آتا ہے تو اس کے معنی ہیں گالی دینا عیب لگانا، علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے، ومقتضى حسن الظن ان يحسن السب على تخطئة ونحوها مما يجوز بالنسبة الى اهل الاجتهاد لااللعن، صحابی سے حسن ظن کا تقاضا ہے کہ سب کو غلطی کی کی نشاندہی کرنے پر محمول کیا جائے، لعنت وملامت پر نہیں، مجتہدین کو اس کی اجازت ہے۔

﴿فغضب سعد﴾ مسلم وترمذی میں منقول ہے کہ معاویہ نے ان سے پوچھا مامنعك أن تسبّهٗ آپ کس وجہ سے علی کو غلط نہیں جانتے جس کے جواب میں انہوں نے یہ تین حدیثیں پیش کیں مسلم وترمذی میں ایک چوتھی روایت کا بھی تذکرہ ہے یعنی ولما نزلت هذه الأية ندع ابنائنا وابناءكم دعا رسول الله ﷺ عليا وفاطمة وحسنا وحسينا فقال: اللّٰهم هولآء اهلي امیر معاویہ ایک صحابی ہو کر خلیفہ رابع کی بابت حضرت سعد کو سب کا حکم کریں سمجھ میں نہیں آتا!!اس لئے امام نوویؒ نے یہ تاویل کی ہے کہ انہوں نے سب کا حکم نہیں دیا بلکہ انما سئله عن السبب المانع له من السب سب سے رکنے کا سبب پوچھا ہے جس کا مفہوم یہ ہوا كانه يقول هل امتنعت منه تورعا أوخوفا اوغير ذلك فان كان تورعا واجلا لاله عن السب فانت مصيب محسن وان كان غير ذلك فله جواب آخر[1] کہ تم احتیاطاً سب سے اجتناب کرتے ہو یا کوئی خوف وغیرہ ہے اگر اس کا سبب احتیاط اور حضرت علیؓ کا احترام ہے تو تمہارا موقف صحیح اور درست ہے اگر اس کے علاوہ کوئی اور بات ہے تو ہم اس کے جواب کے لئے حاضر ہیں۔ مذکورہ حدیث پر کلام گذر چکا ہے۔ حدیث مسلم اور ترمذی میں فضائل علی کے باب میں درج ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی صحیح ہے۔

---

[1] شرح مسلم ۲/۲۷۸

فضل الزبير رضى الله عنه

زبیر نام، کنیت ابوعبداللہ اور لقب حواری رسول تھا والد کا نام عوام اور والدہ کا نام صفیہ ہے پورا شجرہ اس طرح ہے، زبیر بن العوام بن خویلد بن اسد بن عبد العزی بن قصی بن کلاب ابن مرۃ بن کعب بن لوی القرشی الاسدی قصی پر پہنچ کر ان کا سلسلۂ نسب حضور ﷺ سے مل جاتا ہے، آپ کی والدہ رسول اللہ کی حقیقی پھوپھی تھیں جب کہ حضرت زبیر ام المومنین حضرت خدیجہ کے بھتیجے تھے اور ان کا نکاح صدیق اکبر کی بڑی صاحبزادی حضرت اسماء سے ہوا تھا اس طرح بیک وقت ان کے حضورؐ سے کئی رشتے تھے۔

حضرت زبیر ہجرت سے ۲۸ سال قبل پیدا ہوئے بچپن کے حالات بہت کم معلوم ہیں سولہ سال کی عمر میں ایمان لائے ایک مرتبہ جب مکہ میں حضور کی گرفتاری کی غلط خبر مشہو ہوئی تو حضرت زبیر نے تلوار سونت لی مؤرخین کے نزدیک یہ پہلی تلوار تھی جو اسلام کی خاطر برہنہ ہوئی آپ کے چچا نوفل نے دیگر مشرکین کی طرح بہت ستایا اور چٹائی میں لپیٹ کر دھونی بھی دی لیکن حضرت زبیر کے پایۂ استقامت میں فرق نہ آیا۔

ہجرت

پہلے حبشہ کو ہجرت کی پھر وہاں سے آکر مدینہ منورہ میں جا بسے شروع میں مواخاۃ حضرت طلحہ کے ساتھ ہوئی لیکن بعد میں آپ کا یہ تعلق سلمہ بن سلامہ سے قائم ہوا تمام ہی غزوات میں انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے حضورؐ نے انہیں حواری رسول کا لقب دیا اور ان کے لئے آپ نے "فداك ابى وامى" کے امتیازی الفاظ ارشاد فرمائے وفات نبوی سے سخت صدمہ پہنچا اور دور صدیقی میں گوشہ نشین رہے پھر جب دور فاروقی آیا تو آپ نے یرموک، فسطاط، اسکندریہ، اور مصر وغیرہ کی فتوحات میں اپنی جوانمردی کے جوہر دکھائے فاروق اعظم کی شہادت کے بعد حضرت عثمانؓ کی خلافت آپ ہی کی رائے سے منعقد ہوئی لیکن دور صدیقی کی طرح دورِ عثمانی عزلت میں گزرا۔

شہادت

حضرت عثمان کی شہادت پر انہیں بہت رنج ہوا اور حضرت عائشہ کی رفاقت میں عثمان کے قصاص کا دعویٰ لے کر اٹھے جمادی الاخری ۳۶ ہجری کو بصرہ میں جنگ جمل پیش آئی حضرت علی نے اسی دوران انہیں حضور کی ایک حدیث یاد دلادی جس سے حضرت زبیر کا دل جنگ سے اچاٹ ہو گیا اور وہ واپس حجاز کی طرف چل پڑے بصرہ سے باہر آ کر انہوں نے ظہر کی نماز کے لئے نیت باندھی تو عین سجدہ کی حالت میں ابن جرموز شقی نے آپ کو شہید کر دیا یہ شخص جب حضرت زبیر کی تلوار اور زرہ لے کر بارگاہ مرتضوی میں حاضر ہوا تو حضرت علی نے اسے جہنم کی خوش خبری سنائی۔

ازواج واولاد

زبیر نے مختلف اوقات میں پانچ شادیاں کیں، پہلی بیوی اسماء بنت ابی بکر تھیں جن سے عبداللہ، عروۃ، منذر، خدیجۃ الکبری، ام الحسن، اور عائشہ کل چھ بچے پیدا ہوئے، دوسری بیوی کا نام ام خالد بنت خالد بن سعید ہے، ان کے بطن سے پانچ بچے خالد، عمر، حبیبہ سودہ اور ہند پیدا ہوئے، تیسری رباب بنت انیف تھیں، جو مصعب، حمزہ اور رملہ کی ماں ہیں چوتھی بیوی کا نام زینب بنت بشر ہے ان کے تین بچے عبیدہ، جعفر اور حفصہ پیدا ہوئے جب کہ پانچویں بیوی ام کلثوم بنت عقبہ تھیں جن سے صرف ایک لڑکی زینب پیدا ہوئی اس طرح ان کی اولاد کی تعداد اٹھارہ ہے حضرت زبیر کا رنگ گندمی اور بدن چھریرا تھا بال کاندھوں تک تھے اور قد کافی بلند وبالا تھا خصوصاً پاؤں تو اس قدر لمبے تھے کہ گھوڑے پر چڑھ کر بھی وہ زمین تک پہنچ جاتے حضرت زبیر کی کل عمر ۶۴ سال کی ہوئی اور شہادت کے بعد وہ وادی السباع میں مدفون ہوئے، نور اللہ مرقدہ واحسن مثواہ.

(۱۲۳/۱) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا وَكِيعٌ، ثَنَا سُفْيَانُ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ، عَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ قُرَيْظَةَ "مَنْ يَأْتِينَا بِخَبَرِ الْقَوْمِ؟" فَقَالَ الزُّبَيْرُ: اَنَا فَقَالَ مَنْ يَأْتِينَا بِخَبَرِ الْقَوْمِ؟" قَالَ

الزُّبَيْرُ: أَنَا ثَلَاثًا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ "لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيٌّ، وَإِنَّ حَوَارِيَّ الزُّبَيْرُ"

رسول اللہ ﷺ نے بنی قریظہ کی (غداری) کے دن فرمایا ہمارے پاس ان کی خبر کون لائیگا؟ حضرت زبیر نے کہا میں، آپ نے پھر فرمایا ہمارے پاس قبیلہ کی خبر کون لائے گا؟ حضرت زبیر نے عرض کیا میں، ایسا تین مرتبہ ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا ہر نبی کے کچھ حواری ہوتے ہیں اور میرے حواری زبیر ہیں۔

صحیح بخاری وصحیح مسلم میں منقول ہے ندب رسول الله ﷺ الناس يوم الخندق فانتدب الزبير ثم ندبهم فانتدب الزبير ثم ندبهم فانتدب الزبير، ندب کے معنی ترغیب دینا اور بلانا ہے ابن ماجہ کے طریق کے مطابق آپ کی یہ ترغیب من يأتيني بخبر القوم کے الفاظ میں تھی انتدب پکار پر لبیک کہنا۔

غزوہ خندق راجح قول کے مطابق ۵ھ کے اخیر میں ہوا جو یقیناً مسلمانوں کے لئے بڑی سخت آزمائش تھی دشمن خندق کا محاصرہ کئے ہوئے تھے اور دباؤ برابر بڑھ رہا تھا ایسے خطرناک وقت بنی قریظہ نے مسلمانوں سے کئے ہوئے معاہدے کی خلاف ورزی کر کے علانیہ مشرکین مکہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا یہ خبر بڑی ہوش ربا تھی جس کی تحقیق کے لئے آپ نے مسلمانوں کو پکارا اور ہر مرتبہ حضرت زبیر سب سے پہلے کھڑے ہوئے۔

﴿لكل نبي حواري﴾ علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے بتشديد الياء لفظه مفرد ...... والياء فيه نسبة، یائے مشدد نسبتی ہے جیسے اسلامی اور لفظ مفرد ہے جس کے لغوی معنی سفیدی اور خالص ہونے کے ہیں حوراء جمع حور اسی سے مشتق ہے جب کہ اصطلاحی معنی حافظ ابن حجرؒ نے متعدد نقل کئے ہیں (۱) هو الذي يصلح للخلافة (۲) هو الوزير، یہ دونوں اقوال قتادہ سے مروی ہیں (۳) ابن عیینہ کے نزدیک الناصر راجح ہے (۴) یونس بن حبیب سے الحواري الخالص منقول ہے (۵) ابن الکلبی الحواري الخليل کی رائے رکھتے ہیں[۱] مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے زہری کا قول الحواريون خلصاء الانبياء عليهم الصلوٰة والسلام نقل کیا ہے[۲] قرآنِ کریم کی آیت قال الحواريون نحن

۱؎ فتح الباری ۷/۸۰ ۲؎ تحفۃ الاحوذی ۱۰/۲۲۳

انصار اللہؐ کو سامنے رکھتے ہوئے امام نووی، علامہ قسطلانی اور سندھی نے خاصتی وناصری کے معنی کو ترجیح دی ہے۔

﴿وان حواری الزبیر﴾ یہاں یائے نسبتی مشددہ کے ساتھ حواری میں یاءِ متکلم بھی موجود ہے امام نووی نے قاضی عیاض کے حوالے سے لکھا ہے ضبط جماعة من المحققین بفتح الیاء من الثانی کمصرخی وضبط اکثرھم بکسرھا محققین کے نزدیک یاء مشدد پر فتحہ ہے جب کہ اکثر کسرہ پڑھتے ہیں تین یاؤں کی موجودگی میں ایک کو لازماً حذف کیا جاتا ہے قراءۃ کا یہ اختلاف اسی بنیاد پر ہے کہ ساقط ہونے والی یاء نسبتی دو یاؤں میں سے ایک ہے یا وہ متکلم کی ہے، پہلے قول کی بنیاد پر ایک یائے نسبت کو حذف کرنے کے بعد دوسری نسبتی یاء کو یائے متکلم میں مدغم کردیں گے اور اس کا اعراب فتح کے ساتھ ہوگا جب کہ دوسری صورت میں یاء متکلم کو حذف کیا جائے گا اور اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے یاء مشددہ مجرور ہوجائے گی...... یوں تو تمام صحابہ ہی خلصاء وحواری تھے لیکن حضرت زبیر پر یہ رنگ ایسے ہی غالب تھا جیسے ابوبکر پر صدق کا، عمر پر صواب کا، عثمان پر حیاء کا، علی پر قضاء کا اور ابوعبیدہ پر امانت کا ...... حدیث کو امام بخاری، امام مسلم اور امام ترمذی نے کتاب فضائل الصحابۃ میں مناقب زبیر کے تحت نقل کیا ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی عمدہ ہے۔

(۱۲۴/۲) حَدَّثَنَا عَلِیُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا اَبُوْمُعَاوِیَةَ ثَنَا هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَیْرِعَنِ الزُّبَیْرِ قَالَ لَقَدْ جَمَعَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَبَوَیْهِ یَوْمَ اُحُدٍ .

رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ احد کے دن میرے لئے فدائیانہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

﴿لقد جمع لی رسول اللّٰه ﷺ ابویه یوم احد﴾ یہ الفاظ فداك ابی وأمی ہیں، جن کی تحقیق سعد بن ابی وقاص کے ترجمہ میں آئے گی، علامہ سندھیؒ کہتے ہیں والمقصود به التکریم و التعظیم، اس میں اکرام وعظمت ہے ملا علی قاری نے لکھا ہے وفی هذه التفدیة تعظیم لقدره واعتداد لعمله واعتبار لامره اس فدائیت میں ان

[1] صحیح مسلم ۲/ ۲۸۱

کے مرتبے کی عظمت ان کے کارنامے کی وقعت اوران کی رائے پراعتماد جھلکتا ہے۔

یہ الفاظ ان کے علاوہ کسی اور کے لئے بھی ثابت ہیں اس کا جواب اوراشکال کا حل حضرت سعد بن ابی وقاص کے ترجمے میں آئے گا.......... حضرت زبیر کے لئے یہ الفاظ غزوہ خندق میں ثابت ہیں جیسا کہ بخاری کی روایت میں آیا ہے من یاتی بنی قریظة فیاتینی بخبرهم فانطلقت فلما رجعت جمع لی رسول اللّٰه ﷺ ابویه وقال فداك ابی وامی، جب کہ احد میں حضرت زبیر کے لیے ان کا ثبوت مشکل ہے، حدیث باب میں یوم احد کو ابن عساکر وغیرہ رواۃ کا وہم بتلاتے ہیں.......... حدیث امام بخاری امام مسلم اور امام ترمذی نے مناقب زبیر میں نقل کی ہے اور سند ابن ماجہ کی بھی عمدہ ہے۔

(۱۲۵/۳) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ، وَهَدِيَّةُ بْنُ عَبْدِ الْوَهَّابِ قَالَا: ثَنا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ، عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ ،عَنْ اَبِيْهِ قَالَ: قَالَتْ لِيْ عَائِشَةُ: يَا عُرْوَةُ! كَانَ اَبُوَاكَ مِنَ (الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَا اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ) اَبُوْبَكْرٍ وَالزُّبَيْرُ.

حضرت عائشہ نے مجھ سے کہا اے عروہ تمہارے دونوں باپ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا اپنے زخمی ہونے کے بعد یعنی ابوبکر اور زبیر۔

غزوۂ احد میں روحاء واپسی کے بعد مشرکین مکہ نے دوبارہ مدینہ پر حملہ کا ارادہ کیا جس کو روکنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب احد کو لے کر حمراء الاسد تشریف لے گئے جو مدینہ سے آٹھ دس میل دور تھا اس اقدامی پوزیشن سے مشرکوں پر رعب طاری ہو گیا اور انہیں پھر حملے کی ہمت نہ ہوئی یہاں تین دن قیام کرنے کے بعد حضورؐ جمعہ کے دن واپس مدینہ منورہ پہنچے صحابہ نے احد میں زخموں سے چور ہونے کے باوجود اس طرح صدائے نبوت پر لبیک کہا اس کی تعریف میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور للذین احسنوا منهم واتقوا اجر عظیم کی خوشخبری سنائی گئی حدیث باب میں حضرت عائشہؓ نے اپنے بھانجے عروہ کو اس فضیلت کی خبر دی کہ تمہارے والد اور تمہارے نانا کو یہ مقام حاصل تھا.......... حدیث صحیح بخاری (مغازی/۲۷) صحیح مسلم (فضائل/۴۵) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی درست ہی ہے۔

فَضلُ طَلحةَ بنِ عُبَیدِ اللّٰہِ رضی اللّٰہ عنہ

نام طلحہ کنیت ابو محمد اور لقب فیاض وخیر تھا والد کا نام عبد اللہ اور والدہ کا نام صعبہ تھا وہ قبیلہ تیم سے تعلق رکھتے تھے سلسلہ نسب اس طرح ہے طلحة بن عبید الله بن عثمان بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرة بن کعب بن لوئی بن غالب اس طرح مرہ پر پہنچ کر ساتویں پشت میں ان کا نسب حضورؐ سے مل جاتا ہے حضرت طلحہ کا رنگ سرخ وسفید، بدن گٹھا ہوا، سینہ چوڑا اور قد ذرا پست تھا اور پاؤں بھی نہایت پر گوشت تھے ہجرت سے چوبیس یا پچیس سال قبل پیدا ہوئے ابتدائی حالات نامعلوم ہیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ وہ بچپن ہی سے تجارت میں مشغول ہوئے اور نوجوانی میں دور دراز ممالک کا سفر کیا۔

اسلام

اسی دوران ایک مرتبہ تجارت کے لئے بصریٰ تشریف لے گئے وہاں ایک راہب نے ان کو حضورؐ کے مبعوث ہونے کی بشارت دی جس کا ان پر کوئی خاص اثر نہ ہوا لیکن جب مکہ واپس آئے تو صدیق اکبر کی کوشش سے انہوں نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر کلمہ توحید پڑھا یہ بالکل ابتدائی زمانہ تھا اس لئے ان کا شمار نویں مسلمان کے طور پر ہوتا ہے مکی زندگی میں تمام مصائب برداشت کیے، اور ان کے حقیقی بھائی عثمان بن عبید اللہ نے ایک مرتبہ صدیق اکبر اور آپ کو ایک رسی میں باندھ کر مارا لیکن توحید کا نشہ پھر بھی نہ اترا مکے میں کل ملا کر انہوں نے ایک خاموش تجارتی زندگی بسر کی چنانچہ جس وقت حضور ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے جا رہے تھے حضرت طلحہ اس وقت اپنے تجارتی قافلے کے ساتھ شام سے واپس آرہے تھے راستے ہی میں انہوں نے دونوں حضرات سے ملاقات کر کے انہیں اہل مدینے کے انتظار واشتیاق کی خبر دی اور ہدیہ کے طور پر کچھ شامی کپڑے بھی پیش کیے۔

ہجرت

اس سفر سے واپسی کے فوراً بعد ہی حضرت ابو بکر کے اہل وعیال کو لے کر طلحہ مدینہ منورہ پہنچے شروع میں اسعد بن زرارہ کے مہمان ہوئے اور ان کی مواخاۃ ابیبن کعب سے کرائی گئی، ہجرت

کے بعد وہ کسی خاص مہم پر شام بھیجے گئے اور غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں غنیمت میں بھی حصہ دیا اور بدر کے اجر وثواب کا بھی یقین دلایا جب کہ غزوۂ احد ان کی زندگی کا درخشاں باب ہے جس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت میں اپنے جسم کو نیزوں اور تلواروں کی دھار پر رکھ دیا تھا صدیق اکبرؓ کی تصریح کے مطابق اس دن ان کے جسم پر ستر سے زیادہ زخم آئے اور انگلیاں بھی شہید ہوئیں اسی لئے حضرات شیخین احد کو یوم طلحۃ کہا کرتے تھے غزوہ احد کے بعد فتح مکہ تک جس قدر غزوات ہوئے حضرت طلحہ سب میں نمایاں طور پر شریک رہے غزوۂ تبوک کے موقعہ پر انہوں نے بیش قیمت رقم پیش کی تھی جس کی وجہ سے حضور نے انہیں فیاض کا لقب دیا وہ حجۃ الوداع میں بھی حضور کے ہم رکاب تھے اور جب آفتاب نبوت دنیا سے غروب ہوا تو انہیں اس کا اتنا شدید صدمہ ہوا کہ ثقیفہ بنی ساعدہ میں جس وقت خلافت کا فیصلہ ہو رہا تھا یہ اس وقت کسی گوشہ میں بیٹھے آہ وبکاء میں مصروف تھے دور صدیقی میں وہ ہر طرح سے خلیفہ اول کے دست وبازو رہے اسی طرح عہد فاروقی میں بھی مجلس شوریٰ کے اہم رکن تھے اپنی شہادت کے موقعہ پر خلیفہ ثانی نے جو چھ نفری خلافت کی کمیٹی بنائی تھی اس میں حضرت طلحہ کا بھی نام تھا لیکن انہوں نے اپنے اوپر حضرت عثمان کو ترجیح دی اور انہیں کی تائید سے وہ خلیفہ منتخب ہوئے۔

شہادت

عہد عثمانی کے بعد انہوں نے ابتداءً ابحالت مجبوری حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی لیکن پھر قصاص عثمان کے مسئلہ پر انہوں نے حضرت عائشہؓ کے اور زبیر کی معیت میں حضرت علی کے خلاف خروج کیا دس جمادی الاخری ۳۶ ہجری کو دونوں فوجوں کا سامنا ہوا حضرت زبیر خلیفہ رابع کی جانب سے ایک حدیث سامنے آتے ہی جنگ سے بددل ہو گئے حضرت طلحہ نے جب انہیں شکستہ خاطر دیکھا تو خود بھی جنگ سے کنارہ کش ہونے کی رائے قائم کر لی لیکن اس موقعہ کو غنیمت جان کر مروان بن الحکم نے ان کے پاؤں میں ایسا تیر مارا جو پیغام قضا ثابت ہوا یہ شخص حضرت عثمان کی شہادت کے سلسلے میں حضرت طلحہ سے بدظن تھا الغرض ۶۲ یا ۶۴ سال کی عمر میں ان کی شہادت ہوئی اور غالبًا اسی میدان جنگ کے کسی گوشہ میں مدفون ہوئے بے شمار فضائل

ومناقب کے علاوہ خشیتِ الٰہی، جود وسخا، تنگ دستوں کی کفالت، حسنِ معاشرت، اور توکل ان کی زندگی کے روشن باب ہیں۔

ازواج واولاد

انہوں نے مختلف اوقات میں حمنہ بنت جحش، ام کلثوم بنت ابی بکر صدیق، سعدی بنت عوف، ام ابان بنت عتبہ بن ربیعہ اور خولہ بنت القعقاع سے شادی کی ہر ایک سے اولاد ہوئی محمد، عمران، عیسی یحییٰ، اسماعیل، اسحاق، زکریا، یعقوب، موسیٰ اور یوسف یہ ان کے دس لڑکوں کے نام ہیں، جب کہ صاحبزادیاں چار تھیں ام اسحاق، عائشہ، صعبہ اور مریم۔ اسد الغابہ میں منقول ہے کہ حضرت طلحہ کی قبر نشیب میں تھی اس لئے اکثر غرق آب رہی تھی حضرت عبداللہ بن عباس نے ایک خواب کی بنیاد پر ان کی لاش کو دوسری جگہ منتقل کیا تو دیکھنے والوں کا بیان تھا کہ ان کا جسم اتنے دنوں بعد بھی بالکل اسی طرح محفوظ تھا، یہاں تک کہ آنکھوں میں جو کافور لگایا گیا تھا وہ بھی زائل نہیں ہوا تھا رضی اللہ عنہ۔

(۱۲۶/۱) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ وَعَمْرُو بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ الْاَوْدِيُّ قَالَا ثَنَا وَكِيعٌ ثَنَا الصَّلْتُ الْاَزْدِيُّ ثَنَا اَبُوْنَضْرَةَ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ طَلْحَةَ مَرَّ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ شَهِيْدٌ يَمْشِيْ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ .

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ حضرت طلحہ (ایک مرتبہ) حضور ﷺ کے پاس سے گذرے تو آپ نے فرمایا یہ شہید ہے جو زمین پر چل رہا ہے۔

یہاں شہید سے کیا مراد ہے؟ شارحین نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں شیخ الاسلام ابو حفص سہروردی اس لفظ کو حقیقت پر محمول کر کے فرماتے ہیں الموت عبارة عن الغيبوبة عن عالم الشهادة وقد كان هذا حاله من الا نجذاب بكليته الى عالم الملكوت[1] موت دنیا سے غیوبت کا نام ہے حضرت طلحہ زہد وتقوے اور تعلق مع اللہ کی بنا پر مکمل عالم غیب سے وابستہ تھے اس وقت جسمانی پردے پھٹ جاتے ہیں اور روحانی جلوہ گری زیادہ نظر آتی ہے ہمارے نزدیک یہ توجیہ محل نظر ہے کیونکہ شہادت کا مطلب اگر فنا فی اللہ ہے تو یہ درجہ تو دوسرے

[1] مرقاۃ المفاتیح مناقب عشرۃ مبشرۃ فصل دوم

صحابہ کو بھی حاصل تھا اس میں حضرت طلحہ کی کیا خصوصیت؟

دوسری توجیہ ملا علی قاری نے کی ہے یحتمل ان یکون ایماء الی حصول الشهادة فی ماٰله الدالة علی حسن خاتمته و کماله[1] یہاں انجام کے اعتبار سے حضرت طلحہ کے حسن خاتمہ اور مستقبل میں ان کی شہادت کی طرف اشارہ ہے ترمذی کی روایت ہے کہ غزوۂ احد کے دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا من سره ان ینظر الی شهید یمشی علی وجه الارض فلینظر الی طلحة[2] اس حدیث کی بنا پر ذوق ایک تیسری توجیہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ یہ کہ حضرت طلحہ نے نبی کے دفاع میں اپنی جان کو جوکھم میں ڈال دیا جس کے بعد ان کا بچنا ناممکن اور شہید ہو جانا یقینی تھا لیکن وہ معجزانہ طور پر پھر بھی بچ گئے تو زندگی کے باوجود انہیں شہادت کا مقام حاصل ہو گیا اور قیامت میں ان کا شمار غزوہ احد کے شہیدوں ہی میں ہوگا ہماری توجیہ الفاظ سے زیادہ قریب تر ہے۔

امام ترمذی نے روایت کو هذا حديثٌ غريبٌ لا نعرفُ الا من حديث الصلت بن دينار وقد تكلم بعض اهل العلم فی الصَّلْتِ بن دینار وضَعَّفَهٗ کہا ہے اس کی بنیاد صلت بن دینار ہے جس کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے ابن حجر نے تقریب (۲۹۴۷) میں متروكٌ ناصبیٌ لکھا ہے یہ ابن ماجہ کی سند میں بھی موجود ہے اسی لئے مولانا لطیف الرحمٰن بہرائچی نے الدیباجہ علی ابن ماجہ (۱/۵۳۶) میں اسناده ضعيف کا فیصلہ کیا ہے۔

(۲/۱۲۷) حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ الْاَزْهَرِ، ثَنَا عَمْرُو بْنُ عُثْمَانَ ثَنَا زُهَيْرُ بْنُ مُعَاوِيَةَ، حَدَّثَنِیْ اِسْحَاقُ بْنُ يَحْيىٰ بْنُ طَلْحَةَ عَنْ مُوْسٰى بْنُ طَلْحَةَ، عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ اَبِیْ سُفْيَانَ قَالَ: نَظَرَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰی طَلْحَةَ فَقَالَ: "هٰذَا مِمَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ" ۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت طلحہ کی طرف دیکھ کر فرمایا یہ ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے اپنی نذر پوری کر دی۔

---

[1] مرقاۃ المفاتیح مناقب عشرۃ مبشرۃ فصل دوم

[2] ترمذی مناقب طلحہ

صحیح بخاری میں منقول ہے کہ انس بن نذر کو غزوۂ بدر میں شریک نہ ہونے کا بڑا غم تھا چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے آئندہ جہاد میں سرفروشی کا عہد کیا جس میں ان کے کچھ دوسرے ساتھی بھی شریک تھے غزوۂ احد کے موقع پر ان صحابہ نے اپنا عہد پورا کر دکھایا کچھ تو شہید ہو گئے اور کچھ شہادت کی تمنا کرتے ہوئے پھر کسی اور موقع کا انتظار دیکھنے لگے انہیں کی تعریف میں یہ آیت نازل ہوئی رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر وما بدلوا تبديلاً[1] نحب کے معنی نذر، مدت، وقت، اور موت کے آتے ہیں جو اپنی نذر پوری کردے اسے کہا جاتا ہے قضى فلان نحبه فلاں مرگیا گویا موت اس کی نذر تھی اسی کو ملا علی قاری نے الموت كأنه الزم نفسه ان تقاتل حتى تموت[2] اور علامہ سندھی نے وفى نذره وعزمه على أن يموت في سبيل الله سے تعبیر کیا ہے جامع ترمذی میں روایت مفصل ہے ان اصحاب رسول الله ﷺ قالوا لاعرابى جاهل سله عمن قضى نحبه من هو ...... وكانوا لا يجترءون على مسئلة يوقرونه ويها بونه ...... فسأله الاعرابى فأعرض عنه ثم سأله فاعرض عنه ثم سأله فاعرض عنه ثم انى اطلعت من باب المسجد وعلىّ ثياب خضر فلما رانى النبى ﷺ قال اين السائل عمن قضى نحبه قال الاعرابى انا يا رسول الله قال هذا ممن قضى نحبه[3] صحابہ کرام کیونکہ خود سوال کرنے سے بچتے تھے اس لئے اعرابی سے سوال کرایا اور جب میں مسجد کے دروازہ سے نکلا تو آپ نے اس کے سوال کے جواب میں مجھے پیش کردیا حضرت طلحہ نے احد میں شہادت کے تمام جتن کر ڈالے تھے۔

گو وہ معجزانہ طور پر بچ گئے اس لئے ان کو زندگی ہی میں شہید قرار دیا گیا اب آخرت میں ان کو دوہرا شہید سمجھا جائے گا ایک احد میں شہادت کی بناء پر اور دوسرے موت کے وقت شہید ہونے کی وجہ سے حدیث ترمذی میں بھی آئی ہے ابن ماجہ کی سند میں عمرو بن عثمان راوی کو ضعیف، منکر اور متروک کہا گیا ہے یہی حال دوسرے راوی اسحاق بن یحییٰ بن طلحہ کا ہے

---

۱ مرقاۃ المفاتیح مناقب عشرۃ مبشرۃ فصل دوم

۲،۳ ترمذی مناقب طلحہ

محدثین نے ان کوضعیف، کوتاہ فہم اور مخطی قرار دیا ہے اس لئے روایات درجہ صحت سے گر جاتی ہے اور الدیباجہ علی ابن ماجہ (۱/۵۳۸) میں اسے اسنادہ ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

(۱۲۸/۳) حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ سِنَانٍ، ثَنَا يَزِيْدُ بْنُ هَارُوْنَ ، اَنْبَأَنَا اِسْحَاقُ عَنْ مُوْسٰى بْنِ طَلْحَةَ قَالَ: كُنَّا عِنْدَ مُعَاوِيَةَ فَقَالَ: اَشْهَدُ لَسَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ طَلْحَةُ مِمَّنْ قَضٰى نَحْبَهُ.

پہلی کی بہ نسبت یہ حدیث زیادہ مضبوط ہے اور الدیباجہ علی ابن ماجہ (۱/۵۷۰) میں اسے اسنادہ صحیح لغیرہ قرار دیا گیا ہے۔

(۱۲۹/۴) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا وَكِيْعٌ عَنْ اِسْمَاعِيْلَ عَنْ قَيْسٍ قَالَ رَأَيْتُ يَدَ طَلْحَةَ شَلَّاءَ وَقٰى بِهَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ اُحُدٍ .

﴿قیس بن ابی حازم﴾ حضور کے زمانے ہی میں ایمان لائے لیکن جب بیعت کے لئے حاضر ہوئے تو آپ کی وفات ہو چکی تھی عشرہ مبشرہ میں سے نو حضرات سے روایت کرنے والے یہ واحد تابعی ہیں سو سے زائد عمر پا کر ۹۸ ہجری میں ان کا انتقال ہوا۔

﴿شلاء﴾ شل شلاً سمع سے آتا ہے معنی خشک ہونا، لنجا ہونا، اشل کا مؤنث ہے اور ترکیب میں حال واقع ہے، غزوۂ احد میں پانسہ پلٹ جانے کے بعد بخاری کی روایت کے مطابق ایک وقت ایسا آیا کہ لم يبق مع رسول الله ﷺ في بعض تلك الايام التي قاتل فيهن رسول الله ﷺ غير طلحة وسعدؓ[1] مشرکین نے موقع غنیمت جان کر تابڑ توڑ حملہ کر دیا جس کو تنہا حضرت طلحہ نے روکا اور تلواروں کی ضرب سے ان کے ہاتھ کی انگلیاں تک کٹ گئیں حاکم کی روایت کے مطابق احد میں پینتیس یا انتالیس زخم آئے حضرت طلحہ خود فرمایا کرتے تھے عقرت يومئذٍ في سائر جسدي حتى عقرت في ذكري، پورا جسم حتی کہ شرمگاہ تک زخمی ہوئی صحابہ جب حضور کے پاس دوبارہ پہنچے تو حضرت طلحہ زخموں سے چور ہو کر زمین پر پڑے تھے حضور نے فرمایا اپنے بھائی طلحہ کو سنبھالو اس نے جنت واجب کر لی، یہی ارشاد آپ نے اس وقت فرمایا جب چٹان پر چڑھنے کے لئے انہوں نے حضور کو سہارا دیا ان کے

---

[1] صحیح بخاری ۱/۵۲۷، ۲/۵۸۱

کارنامے احد میں بے حد نمایاں رہے اس لئے حضرت ابوبکر صدیق جب احد کا تذکرہ فرماتے تو کہتے وہ طلحہ کا دن تھا اور اس کی وجہ علامہ سندھی کے الفاظ میں جعل نفسه وقاية له ﷺ .... حدیث صحیح بخاری (مناقب/۴۲ مغازی/ ۱۸) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کے بھی تمام رواۃ ثقہ ہیں پہلے راوی کو چھوڑ کر وہ بعینہٖ بخاری کی سند ہے۔

فَضْلُ سَعْدِ ابْنِ أَبِيْ وَقَّاصٍ رضی اللہ عنہ

نام سعد کنیت ابواسحاق، والد کا نام مالک اور کنیت ابووقاص تھی، جب کہ والدہ کا نام حمنہ تھا، وہ قریش کی زہری شاخ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے رشتہ میں حضورؐ کے ماموں بھی ہوتے تھے، ان کا قد بلند، جسم فربہ، ناک چپٹی، سر بڑا اور ہاتھ کی انگلیاں نہایت موٹی اور مضبوط تھیں شروع ہی میں ایمان لائے اور ترتیب کے لحاظ سے ان کا نمبر ساتواں ہے مکہ میں ہر طرح کی سختیاں برداشت کیں شعب ابی طالب میں بھی قید رہے رسول اللہ کی اجازت کے بعد مدینہ ہجرت کی اور عبیدہ بن حارث کی سرکردگی میں جو سب سے پہلا سریہ روانہ ہوا تھا، اس میں حضرت سعد بھی تھے انہوں نے اس موقعہ پر اسلام کی راہ میں کفار پر سب سے پہلا تیر چلایا اور شروع سے آخر تک اعلاء کلمۃ اللہ کے تمام معرکوں میں شریک رہے خصوصاً غزوہ احد میں تو حضورؐ کی حفاظت میں انہوں نے کلیدی رول ادا کیا اور زندگی کے ہر موڑ پر وہ نبی کے دست راست ثابت ہوئے، وفاتِ نبوی کے بعد انہوں نے خلیفہ اول کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کا ہر طرح سے تعاون کیا دور فاروقی میں جب حضرت عمر نے ایران کا محاذ کھولا تو سپہ سالاری کے لئے آپ ہی کا انتخاب ہوا چنانچہ حضرت سعد نے بہترین قیادت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قادسیہ، بہرہ شیر، بابل، مداین، اور تکریت جیسے مضبوط قلعے اسلامی قلم رو میں داخل کر دیئے۔

ان فتوحات کے بعد آپ نے کوفہ شہر کی تعمیر کی اور کچھ دنوں وہاں کے امیر بھی رہے لیکن پھر بنو اسد کی دشمنی کے باعث حضرت عمر نے ان کو مدینہ بلا لیا خلیفہ ثانی نے شہادت کے وقت جن چھ آدمیوں کو خلافت کے لئے نامزد کیا تھا ان میں حضرت سعد بھی تھے دور عثمانی میں وہ پھر کوفے کے والی بنائے گئے لیکن تین سال بعد پھر معزول ہو گئے حضرت عثمان کی شہادت کے

بعد جب مسلمانوں میں باہمی خونریزی شروع ہوئی تو تمام جنگوں سے کنارہ کش رہے۔

حضرت سعد بہت زاہد و عابد، متواضع و متقی، اور بلند پایہ صحابی تھے، طبیعت کچھ رہبانیت کی طرف مائل تھی، انہوں نے مختلف اوقات میں نو شادیاں کیں بیویوں کے نام یہ ہیں (۱) بنت الشہاب، (۲) بنت قیس بن معدی کرب، (۳) ام عامر بنت عمرو، (۴) زبد، (۵) ام بلال بنت ربیع، (۶) ام حکیم بنت قارظ، (۷) سلمی بنت حفص، (۸) ظبیہ بنت عامر، (۹) ام حجر، ان کے بطن سے حضرت سعد کے ۳۴ اولادیں ہوئیں سترہ لڑکے سترہ لڑکیاں، لڑکوں کے نام یہ تھے، (۱) اسحاق اکبر، (۲) عمر، (۳) محمد، (۴) عامر، (۵) اسحاق اصغر، (۶) اسماعیل، (۷) ابراہیم، (۸) موسیٰ، (۹) عبداللہ، (۱۰) عبداللہ اصغر، (۱۱) عبدالرحمٰن (۱۲) عمیر اکبر (۱۳) عمیر اصغر، (۱۴) عمرو، (۱۵) عمران، (۱۶) صالح، (۱۷) عثمان اسی طرح لڑکیوں کے نام ملاحظہ ہوں (۱) ام الحکیم کبریٰ، (۲) حفصہ، (۳) ام القسم، (۴) کلثوم، (۵) ام عمران، (۶) ام الحکیم صغریٰ، (۷) ام عمرو (۸) ہند، (۹) ام الزبیر، (۱۰) ام موسیٰ، (۱۱) حمنہ، (۱۲) ام عمر (۱۳) ام ایوب، (۱۴) ام اسحاق، (۱۵) رملہ، (۱۶) عمرہ، (۱۷) عائشہ۔

حضرت سعد نے مدینہ سے دس میل کے فاصلہ پر مقام عقیق میں اپنا ایک محل بنایا تھا آخری زندگی انہوں نے وہیں گزاری بڑھاپے میں قویٰ مضمحل ہو گئے تھے اور آنکھوں کی بینائی بھی جاتی رہی تھی، انہوں نے وصیت کی تھی کہ جنگ بدر میں میرے جسم پر جو اونی کپڑا تھا اسی کا کفن دیا جائے ۵۵ھ ہجری میں ان کا انتقال ہوا اور جنازہ مسجد نبوی میں پڑھا گیا نماز میں امہات المومنین بھی شریک تھیں اور تقریباً ۸۷ سال کی عمر ہوئی۔

(۱۳۰/۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ، ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ، ثَنَا شُعْبَةُ عَنْ سَعْدِ بْنِ إِبْرَاهِيمَ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ شَدَّادٍ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: مَارَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَمَعَ أَبَوَيْهِ لِأَحَدٍ غَيْرَ سَعْدِ بْنِ مَالِكٍ فَإِنَّهُ قَالَ لَهُ يَوْمَ أُحُدٍ إِرْمِ سَعْدُ فِدَاكَ أَبِيْ وَأُمِّيْ.

حضرت علی فرماتے ہیں کہ سعد بن مالک کے علاوہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کسی کے لئے جمع بین الأبوین کرتے نہیں دیکھا، آپ نے اُن سے غزوۂ اُحد میں فرمایا سعد تیر چلاؤ،

میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں۔

﴿جمع أبويه﴾ جامع ترمذی کی روایت میں أباه و أمه کی وضاحت ہے دونوں کا مطلب ابن حجر عسقلانی نے فداك أبي و أمي قرار دیا ہے۔

﴿غير سعد بن مالك﴾ حضرت علی نے ان الفاظ کو صرف حضرت سعد کی فضیلت وامتیاز قرار دیا، حالانکہ صحیحین کی روایت میں وہ حضرت زبیر کے لئے بھی ثابت ہیں پھر تطبیق کس طرح ہوگی؟ محدثین نے اُس کے تین جواب دیئے ہیں۔

(۱) پہلا جواب نووی نے دیا ہے، فرماتے ہیں فيُحمل قول عليؓ على نفي علم نفسه أي لا أعلمه جمعَهما اِلاَّ لسعد بن أبي وقاص[۱] حضرت علی کے قول کو صرف اُن کے عدم علم پر محمول کیا جائے گا، یعنی میں حضور کے تفدية بالأبوين کو صرف حضرت سعد کے حق میں جانتا ہوں مُلا علی قاری نے اسے اِن عليًا لم يطلع على ذلك[۲] سے تعبیر کیا ہے۔

(۲) دوسرا جواب ملا علی قاری نے دیا ہے لکھتے ہیں الظاهر الاطلاق المقيّد بنفي السماع بلا واسطة وهو لاينافي أنه اطلع على تفدية الزبير بواسطة الغير[۲] بظاہر یہاں اس فضیلت کو براہ راست حضور سے سننے کی نفی ہے، جس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ انہوں نے حضرت زبیر کے حق میں اس فضیلت کو دوسرے کے واسطے سے بھی نہیں سنا، حضرت علی کو اس کا علم تھا لیکن واسطے کہ ساتھ جب کہ حضرت سعد کی بابت انہوں نے یہ فضیلت خود اپنے کانوں سے سنی تھی۔

(۳) تیسرا جواب حافظ بن حجر نے یہ دیا ہے مراده بذلك بقيد يوم اُحدٍ[۴]
یعنی حضرت علی کے ذہن میں یہاں غزوۂ اُحد کی قید ملحوظ ہے کہ اس موقع پر یہ فضیلت صرف حضرت سعد ہی کے لئے ثابت ہے، جب کہ حضرت زبیر کے لئے یہ الفاظ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ خندق میں کہے ہیں اس لئے کوئی اشکال نہیں ہمارے نزدیک پہلے دونوں جواب بعید اور تیسرا راجح ہے رہا یہ اشکال کہ مُسند احمد اور ابن ماجہ کی روایت غزوۂ اُحد میں بھی یہ فضیلت

---

[۱] شرح مسلم ۲/۲۸۱ — [۲، ۳] مرقاۃ المفاتیح ۱۱/۳۵۶، مناقب العشرۃ
[۴] فتح الباری ۷/۸۴

حضرت زبیر کے لئے ثابت کرتی ہے، تو وہ غالباً رُواۃ کا وہم ہے غزوۂ اُحد کے مدو جزر کی تمام تفصیلات پر غور کرنے سے بھی مکمل انشراح ہو جاتا ہے کہ اُس موقع پر زبان رسالت سے یہ الفاظ صرف حضرت سعد ہی کیلئے نکلے سیدنا زبیر کے لئے نہیں ابن عساکر کی بھی یہی رائے ہے۔

﴿ارم﴾ رمٰی (ض) رَمْیًا سے امر حاضر کا صیغہ ہے مجزوم ہونے کی بنا پر حرف علت ساقط ہو گیا، معنی تیر چلانا، جامع ترمذی میں اس کے بعد ایها الغُلام الحَزَوّر کا بھی اضافہ ہے حَزَوَّ راُس نوعمر کو کہتے ہیں جو بہت مضبوط اور گٹھیلا ہو، حضرت کی عمر اس وقت کم ہی تھی۔

﴿فداك أبی و أمی﴾ فدی (ض) فَدیً وفِدَیً وفِداءً معنی فدیہ دے کر چھڑانا ایک کو دوسرے پر قربان کر دینا، فداك مُرکب اضافی ہو کر خبر مقدم ہے، أبی و أمی مبتداء مؤخر ہوا، اس کے معنی امام نووی نے انما هو كلام والطاف واعلام لمحبته له ومنزلته اور محشی ترمذی نے انه كناية عن الرضٰی بتلائے ہیں، یعنی یہ الفاظ حضور کے دل میں حضرت سعد کی قربت و محبت اور قدر و منزلت کا پتہ دیتے ہیں گویا وہ آپ کی رضامندی کا اشارہ ہیں ملا علی قاری اس مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں۔ وفی هٰذهٖ التَفدِيَة تعظيمٌ لقدرهٖ واعتِدادٌ بِعَمَلِهٖ واعتبارٌ بأمرهٖ وذلك لأن الانسان لا يَفدِی الا مَن يُعظِّمُهٗ فَيبذُلُ نفسَه أو أعَزَّ اهلَه له یعنی اس جملہ میں حضرت کے مرتبہ کی عظمت، اُن کے کارنامے کی اہمیت اور اُن کی قربانی کی وقعت کا اظہار ہے، کیونکہ انسان فدائیت کا اظہار اُس شخص کے لئے کرتا ہے جس کی اُس کے دل میں عظمت ہو، پھر وہ اپنی جان اور عزیز قریب کو بھی اُس پر قربان کر دیتا ہے، حضرت سعد نے کیونکہ بے حد خطرناک وقت میں حضور کا دفاع کیا اس لئے آپ کی جانب سے انہیں یہ خلعت عطا ہوئی، امام نووی لکھتے ہیں وفيه فضيلة الرمی والحَث عليه والدعاءُ لمن فَعَل خيرا کہ یہاں تیر اندازی کی ترغیب و فضیلت اور جو ایسا نیک کام انجام دے اُس کے لئے دعاء کا بیان ہے۔

حدیث بخاری (ادب/ ۱۰۳) صحیح مسلم (فضائل/ ۴۴) اور ترمذی (مناقب/ ۱۷، استیذان/ ۹۶) میں بھی آئی ہے، ابن ماجہ کی سند کو الدیباجہ علی ابن ماجہ)(۱/ ۵۴۳) میں اسنادہ صحیح قرار دیا گیا ہے۔

(۱۳۱/۳) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ رُمْحٍ أَنْبَأَنَا اللَّيْثُ بْنُ سَعْدٍ ح وَحَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ، ثَنَا حَاتِمُ بْنُ إِسْمَاعِيْلَ وَإِسْمَاعِيْلُ بْنُ عَيَّاشٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ قَالَ سَمِعْتُ سَعْدَ بْنَ أَبِي وَقَّاصٍ يَقُوْلُ لَقَدْ جَمَعَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ أُحُدٍ أَبَوَيْهِ فَقَالَ اِرْمِ سَعْدُ فِدَاكَ أَبِيْ وَأُمِّيْ

مباحث پہلی حدیث کے تحت گذر چکے اور حدیث صحیح بخاری (مناقب/سعد) مسلم (فضائل/سعد) اور ترمذی (مناقب/سعد، استیذان/ ۹۶) میں بھی موجود ہے، تحویل سند کے ساتھ ابن ماجہ کے دو طریق ہیں پہلا صحیح مسلم کا ہے جب کہ دوسرا حاتم کی وجہ سے کمزور ہے، بہر حال روایت صحیح ہے۔

(۱۳۲/۳) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ إِدْرِيْسَ وَخَالِيْ يَعْلٰى وَوَكِيْعٌ عَنْ إِسْمَاعِيْلَ عَنْ قَيْسٍ قَالَ سَمِعْتُ سَعْدَ بْنَ أَبِيْ وَقَّاصٍ يَقُوْلُ إِنِّيْ لَأَوَّلُ الْعَرَبِ رَمٰى بِسَهْمٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ.

میں عربوں میں سب سے پہلا وہ شخص ہوں جس نے اللہ کے راستے میں تیر چلایا۔

دور فاروقی میں جب عجم پر چڑھائی کی گئی تو سب سے بڑا مرکز کوفہ تھا، جس کے والی سعد بن ابی وقاص تھے، اُنہوں نے جب لوگوں کو جہاد پر اُبھارا تو جرح بن سنان اور بنو اسد کے چند لوگوں نے جنگ میں شرکت سے گریز کیا، حضرت نے اُن کی شکایت دربار خلافت میں کر دی اُس پر یہ لوگ اُن کے دشمن ہو گئے، اور مدینہ پہنچ کر یہ شکایت کی کہ وہ نماز اچھی طرح پڑھانے پر قادر نہیں ہیں، اس الزام کی تحقیق کے لئے محمد بن مسلمہ کوفہ آئے ہر جگہ اس بات کو جھٹلایا گیا، وہ حضرت سعد اور بنو اسد کو لے کر مدینہ پہنچے وہاں بھی الزام غلط ثابت ہوا، تاہم حضرت عمر نے مصلحۃً انہیں کوفہ کی ولایت سے معزول کر دیا، حضرت سعد کو اپنے اوپر لگنے والے اس بیہودہ الزام سے بڑی تکلیف ہوئی اور اُس کی صفائی میں اُن کے زخمی دل سے جو آہ نکلی حدیث باب اُس کا ایک ابتدائی ٹکڑا ہے، مکمل روایت امام بخاری یوں نقل کرتے ہیں۔

عن قيس قال سمعت سعدا يقول انى لأول العرب رمى بسهم فى سبيل الله وكنا نغز ومع النبى صلى الله عليه وسلم وما لنا طعام الاورق الشجر حتى

ان احدنا يضع كما يضع البعير أو الشاة ماله خلط ثم أصبحت بنو أسد تعزّرني على الاسلام لقد خِبتُ اذن وضل عملي.

حضرت سعد فرماتے ہیں کہ، میں اللہ کی راہ میں تیر چلانے والا سب سے پہلا عرب ہوں، ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ درختوں کے سوکھے پتے چبا چبا کر جہاد کرتے تھے، یہاں تک کہ ہماری اجابت بھی اونٹ اور بکریوں جیسی ہوتی تھی، لیکن آج یہ بنو اسد پیدا ہوئے ہیں جو مجھے اسلام سکھاتے ہیں، تب تو میں ناکام رہا، اور میرا عمل ضائع ہو گیا۔

﴿انى الأول العرب﴾ موصوف ہے اور رَمٰى بسهم فى سبيل الله، جملہ فعلیہ ہو کر صفت ہوا، پھر دونوں مل کر اِنَّ کی خبر ہوئے، یہاں حضرت سعد کا اشارہ اُس سریہ کی طرف ہے جو عبیدہ بن حارث کی سرکردگی میں وادیٔ رابغ کی طرف بھیجا گیا، اُس میں ساٹھ مجاہدین شریک ہوئے یہ غزوۂ بدر سے پہلے اسلامی تاریخ کا دوسرا سریہ تھا، جب یہ لوگ رابغ پہنچے تو وہاں قریش کے دو سو سواروں سے مڈبھیڑ ہوگئی، باختلاف روایت ابوسفیان یا عکرمہ یا مکرز بن حفص اُن کا سربراہ تھا، باقاعدہ جنگ کی نوبت نہ آئی، لیکن حضرت ابن ابی وقاص نے اُن پر ایک تیر داغ دیا، یہ اسلام کی راہ میں چلایا جانے والا سب سے پہلا تیر تھا، حدیث باب میں حضرت سعد اسی امتیاز وفضیلت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، امام نوویؒ نے لکھا ہے فيه منقبة ظاهرة وجواز مدح الانسان نفسه عند الحاجة[1] حدیث میں اُن کی کھلی فضیلت ہے اور ایسے موقعہ پر انسان کے لئے اپنی تعریف اور کارناموں کا تذکرہ کرنا جائز ہے...... حدیث بخاری (مناقب/۴۵، رقاق/۱۷) مسلم (زہد/۹) اور ترمذی (زہد/۲۶) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند کو الديباجة على ابن ماجة (۵۴۶/۱) میں اسنادُه صحيح قرار دیا گیا ہے۔

(۱۳۳/۴) حَدَّثَنَا مَسْرُوْقُ بْنُ الْمَرْزُبَانِ ثَنَا يَحْيَى بْنُ أَبِي زَائِدَةَ عَنْ هَاشِمِ بْنِ هَاشِمٍ قَالَ سَمِعْتُ سَعِيْدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ يَقُوْلُ، قَالَ سَعْدُ بْنُ أَبِي وَقَّاصٍ مَا أَسْلَمَ أَحَدٌ فِي الْيَوْمِ الَّذِيْ أَسْلَمْتُ فِيْهِ، وَلَقَدْ مَكَثْتُ سَبْعَةَ أَيَّامٍ، وَإِنِّي لَثُلُثُ الْإِسْلَامِ

[1] شرح نووی مسلم ۲/۲۰۸

اُس دن کوئی شخص ایمان نہیں لایا جس دن میں نے اسلام قبول کیا، میں سات دن تک ٹھہرا رہا، اور میں دین اسلام کا تیسرا آدمی ہوں۔

﴿ما اسلم احد فی الیوم الذی اسلمت فیہ﴾ یہ الفاظ دوسری کتابوں میں مختلف طریقے سے منقول ہیں لیکن زیادہ راجح ابن ماجہ ہی کی ترتیب ہے حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے لااشکال فیه اذ لامانع ان لا یشارکه احدٌ فی الاسلام یوم اسلم[1] یعنی جس دن حضرت سعد نے اسلام قبول کیا اس دن کوئی دوسرا ایمان نہیں لایا، یہاں فخر وامتیاز کا اظہار مقصود ہے جب کہ حافظ کے مفہوم کو مان کر کوئی امتیاز نظر نہیں آتا اس لئے الیوم سے اگر مطلق زمانہ مراد لیا جائے تو وہ بایں معنی راجح ہوگا، کہ میں نے اس وقت دین قبول کیا جب کہ دوسروں نے اس کی ہمت نہیں کی کیونکہ وہ بے حد صبر آزما دور تھا۔

﴿ولقد مکثت سبعة ایام﴾ شارحین سے اس جملہ کی بابت کچھ منقول نہیں غالبا اس کا مفہوم یہ ہے کہ سات دن تک میں نے اپنے اسلام کو چھپایا اور کسی پر اس کا اظہار نہیں کیا۔

﴿وان لثلث الاسلام﴾ علامہ عینیؒ نے عمدۃ القاری میں لکھا ہے کہ یہ ان احادیث کے خلاف ہے، جن میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شروع میں حضرت ابوبکر، خدیجہ، سمیہ، عمار، زید، بلال، عامر بن فہیرہ اور شقران کی تصریح ملتی ہے اس کے تین مفہوم بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) پہلا مفہوم علامہ طیبی نے یہ لکھا ہے یعنی یوم اسلمت کنت ثالث من اسلم فاکون ثلث اهل الاسلام وبقیت علی ماکنت علیه سبعة ثم اسلم بعد ذلك من اسلم[2] یعنی جس دن میں ایمان لایا تو اس دن اسلام قبول کرنے والوں میں میرا تیسرا نمبر تھا، سات دن تک پھر کوئی ایمان نہیں لایا اس کے بعد ہی دوسروں نے ایمان قبول کیا۔

(۲) دوسرا مطلب ملا علی قاریؒ نے یہ بیان کیا ہے یحمل قول سعد علی الاحرار البالغین لیخرج الاعبد المذکورون وعلی اولم یکن اطلع علی اولئك[3] یعنی حضرت سعد کے قول کو آزاد بالغوں پر محمول کیا جائے گا تا کہ حضرت علی اور غلاموں کا استثناء ہو سکے، یا پھر انہیں سابقین کا علم نہ تھا۔

---

[1] فتح الباری [2] حاشیہ ابن ماجہ [3] مرقاۃ المفاتیح ۱۱/۳٦٦

(۳) تیسرے معنی شیخ الاسلام حضرت کشمیریؒ نے یہ لکھے ہیں ولا یستقیم کونہ ثلثا فاولوہ بان ام المومنین خدیجۃ کانت من النساء اما علی فکان من الصبیان وبعدہ یزول الاشکال[1] یعنی حضرت خدیجہ تو عورتوں میں تھیں علی بچے تھے، تو حضورؐ اور ابو بکر کے بعد یہی تیسرے ہوئے۔

ہمارے نزدیک تیسری توجیہ راجح ہے حدیث بخاری (مناقب/سعد) میں بھی آئی ہے اور پہلے راوی کو چھوڑ کر سند دونوں کی یکساں ہے جب کہ مسروق کو حافظ نے تقریب (۶۶۰۳) میں صدوق لہ اوھام کہا ہے اس لئے سند کا درجہ صحیح لغیرہ بنتا ہے

فضائل العشرۃ رضی اللہ عنہم

انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد سب سے بلند مقام صحابہ کا ہے ان کی جماعت کا ہر فرد آسمان ہدایت کا ایسا درخشاں ستارہ تھا جس کی روشنی میں امت کے قافلے قیامت تک جادۂ منزل پر رواں دواں رہیں گے صحابہ مزاج وطبیعت اور عادت واطوار میں بھی نبی کا عکس و پرتو تھے اسلئے وفات کے بعد انہوں نے ہی خلافت کا بار گراں اٹھا کر قرآن وسنت کی قندیلیں پوری دنیا میں روشن کیں فرق مراتب ایک اجماعی مسئلہ ہے جس کی رو سے ان دس حضرات کو سب سے افضل اور ممتاز قرار دیا گیا جن کو آنحضرت ﷺ نے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی ہے جو بلا شبہ ان کی قربانیوں کا نتیجہ تھی یہ لوگ غزواتی فضیلت کے بھی حامل ہیں، حضرت عثمان، طلحہ اور سعید بن زید بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے لیکن حکما انہیں بھی بدری قرار دے کر غنیمت میں حصہ دیا گیا کیونکہ رسول اللہ ﷺ ہی کے حکم پر یہ حضرات اس وقت دوسری ذمہ داریوں پر مامور تھے۔

(۱۳۴/۱) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ، ثَنَا عِيسَى بْنُ يُونُسَ ثَنَا صَدَقَةُ بْنُ الْمُثَنَّى اَبُوالْمُثَنَّى النَّخَعِيُّ عَنْ جَدِّهِ رِيَاحِ بْنِ الْحَارِثِ سَمِعَ سَعِيدَ بْنَ زَيْدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ نُفَيْلٍ يَقُوْلُ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَاشِرَ عَشَرَةٍ، فَقَالَ: " اَبُوْبَكْرٍفِىْ الْجَنَّةِ ، وَعُمَرُ فِىْ الْجَنَّةِ، وَعُثْمَانُ فِىْ الْجَنَّةِ،

[1] فیض الباری ۴/ ۶۸

وَعَلِيٌّ فِي الْجَنَّةِ وَطَلْحَةُ فِي الْجَنَّةِ ، وَالزُّبَيْرُ فِي الْجَنَّةِ ، وَسَعْدٌ فِي الْجَنَّةِ، وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ فِي الْجَنَّةِ" فَقِيلَ لَهُ: مَنِ التَّاسِعُ، فَقَالَ أَنَا

رسول اللہ ﷺ دس میں کے دسویں تھے آپ نے فرمایا ابوبکر جنتی ہیں، عمر جنتی ہیں، عثمان جنتی ہیں، علی جنتی ہیں، طلحہ جنتی ہیں، زبیر جنتی ہیں، سعد جنتی ہیں، عبدالرحمٰن جنتی ہیں۔ پوچھا گیا نواں کو؟ سعید بن زید نے کہا کہ نواں میں ہوں۔

سنن ابی داؤد میں روایت کا پس منظر اس طرح نقل کیا گیا ہے عن عبد الرحمٰن بن الاخنس انه كان في المسجد فذكر رجل عليا فقام سعيد بن زيد فقال اشهد على رسول الله ﷺ انى سمعته وهو يقول عشرة فى الجنة[1] امیر معاویہ کے عہد میں مغیرہ بن شعبہ کوفہ کے والی تھے سعید بن زید ایک مرتبہ جب ان کے پاس پہنچے تو حاضرین میں سے کسی نے حضرت علی کو کچھ کہہ دیا جس پر حضرت سعید کو غصہ آ گیا اور انہوں نے یہ حدیث سنائی ابن ماجہ کی طرح اس میں بھی ابوعبیدہ کا تذکرہ نہیں ہے ابوداؤد کی دوسری روایت میں راوی کہتے ہیں كنت قاعدا عند فلان فى مسجد الكوفة وعنده اهل الكوفة فجاء سعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل فَرَحَّبَ به وَحَيَّاهُ و اقعده عند رجله على السرير فجاء رجل من اهل الكوفة يقال له قيس بن علقمه فاستقبله وسب فَسَبَّ فقال سعيد من يَسُبُّ هذا الرجل قال يسب عليا قال الأرى اصحاب رسول الله ﷺ يسبون عندك ثم لا تنكر ولا تغير[2] میں کوفے کی مسجد میں مغیرہ بن شعبہ کے پاس بیٹھا تھا ان کے پاس کوفے کے اور لوگ بھی تھے کہ سعید بن زید تشریف لائے مغیرہ نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور خاص اپنے پاس تخت پر بٹھایا اسی دوران ایک کوفی قیس بن علقمہ وارد ہوا حضرت مغیرہ نے اس سے اچھی طرح ملاقات کی پھر وہ گالی دینے لگا حضرت سعید نے پوچھا یہ کس کو برا کہہ رہا ہے مغیرہ بولے علی کو اس پر انہوں نے کہا کہ تمہارے سامنے رسول اللہ کے صحابہ کو لوگ گالیاں دیتے ہیں اور تم نکیر و تنبیہ نہیں کرتے پھر یہ حدیث سنائی ترمذی میں یہ بھی وضاحت ہے کہ وہ نو ناموں کو گنا کر دسویں پر خاموش ہو گئے لوگوں نے جب نُنشدك بالله يا ابا الاعور

[1] [2] سنن ابی داؤد کتاب السنۃ باب فی الخلفاء

من العاشر؟ پر اصرار کیا تو انہوں نے جواب دیا نَشَدَ تُمُونی باللّٰہ، ابو الاعور فی الجنۃ[1] اس روایت میں چونکہ ابوعبیدہ کا بھی تذکرہ ہے اس لئے امام ترمذی کی وضاحت کے مطابق امام بخاری کے نزدیک یہی روایت اصح ہے ابن ماجہ کی سند بھی صحیح ہے۔

(۱۳۵/۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ حَدَّثَنَا اِبْنُ اَبِیْ عَدِیٍّ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ حُصَیْنٍ ، عَنْ هِلَالِ بْنِ یَسَافٍ ،عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ ظَالِمٍ، عَنْ سَعِیْدِ بْنِ زَیْدٍ قَالَ: اَشْهَدُ عَلَی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ : اَنِّیْ سَمِعْتُهٗ یَقُوْلُ: اثْبُتْ حِرَاءُ ! فَمَا عَلَیْكَ اَلَا نَبِیٌّ اَوْ صِدِّیْقٌ اَوْشَهِیْدٌ" وَعَدَّهُمْ: رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ، اَبُوْبَكْرٍ، وَعُمَرُ، وَعُثْمَانُ، وَعَلِیٌّ، وَطَلْحَةُ ، وَالزُّبَیْرُ، وَسَعْدٌ، وَابْنُ عَوْفٍ، وَسَعِیْدُ بْنُ زَیْدٍ .

سعید بن زید سے روایت ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا اے حراء ٹھہر جا تیرے اوپر صرف نبی ،صدیق یا شہید ہے، رسول اللہ ﷺ نے ان کو شمار کرایا وہ ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد، عبدالرحمن بن عوف اور سعید بن زید ہیں۔

یہی روایت ترمذی میں موجود ہے اور اس میں پس منظر کے طور پر کنامع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کا بھی اضافہ ہے، صحیح مسلم کے طریق میں کان علی جبل حراء تحرك ہے یعنی ان حضرات کے اوپر چڑھنے کے بعد حراء پہاڑ میں لرزش پیدا ہوئی اس کا کیا سبب تھا محدثین میں صرف علامہ قسطلانی نے اس کا جواب دیا ہے۔

اَلْحِكْمَةُ لذلك أنه لَمَّا اَرجفَ قال النبی ﷺ أن یُبَیِّنَ ان هٰذه الرَّجفَةَ لیست من جنس رَجفةِ الجبلِ بقوم موسٰی علیه السلام لما حَرَّفُوا الكلمَ وان تلك رَجفةِ الغضبِ وهٰذهٖ هَزَّةُ الطَّرَبِ ولهٰذا نَصَّ علی مقام النبوة وَالصِّدِّیقِیَّةِ والشهادة التی توجد سرورما اتصلت به لا رجافه فاقر الجبل لذلك واستقر.

اس میں حکمت یہ ہے کہ جب پہاڑ میں جنبش ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے یہ مناسب سمجھا کہ اس لرزش کی حقیقت کو بیان کردیں کہ وہ اس زلزلے سے قطعاً الگ ہے جو کلام اللہ میں تحریف

---

[1] جامع ترمذی ابواب المناقب عبدالرحمن بن عوف

کے باعث موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو پیش آیا تھا وہ زلزلۂ غضب تھا اور یہ فرحت وطرب کی لرزش، اسی لئے آپ نے نبوت، صدیقیت اور شہادت کے مقام کی وضاحت فرمائی جس سے یقیناً اس مقام کے حاملین کو پہاڑ ملنے پر خوشی ہوئی پھر آپ نے اس کو جب ٹھہر جانے کا حکم دیا تو وہ قرار پا گیا۔

یہ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کا معجزہ تھا ترمذی اور ابوداؤد میں بھی یہی نام منقول ہیں حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح کا تینوں میں تذکرہ نہیں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی فرماتے ہیں کہ ابوعبیدہ بلاشبہ عشرہ مبشرہ میں ہیں لیکن اس موقع پر وہ ان حضرات کے ساتھ موجود نہیں تھے[1] جب کہ صحیح مسلم کی حضرت ابوہریرہ والی روایت میں صرف سات حضرات کی صراحت ہے ابوعبیدہ کے ساتھ اس میں عبدالرحمٰن بن عوف اور سعید بن زید کے نام بھی موجود نہیں جو یقیناً اختصار کا نتیجہ ہے، اور ترجیح اصحاب سنن کی روایت کو ہوگی۔

حدیث میں دو باتیں غور طلب ہیں پہلی یہ کہ ابن ماجہ اور دوسری کتابوں میں یہ واقعہ حراء سے متعلق ہے جب کہ بخاری ومسلم کی دوسری احادیث میں اسی طرح کا واقعہ احد سے متعلق بھی آیا ہے، یہ دونوں ایک ہیں یا الگ الگ دو مستقل واقعات ہیں؟ حافظ ابن حجر نے فتح الباری[2] میں علامہ عینی نے عمدۃ القاری[3] میں ملا علی قاری نے مرقاۃ المفاتیح[4] میں دونوں کو الگ الگ واقعہ قرار دیا ہے اور بیشتر محدثین بھی اسی کو راجح، قرین قیاس اور حقیقت کے قریب مانتے ہیں۔

دوسری بحث یہاں سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعید بن زید سے متعلق ہے کہ وہ ان تین طبقوں میں کس میں شمار ہوں گے نبوۃ تو ختم ہو چکی، رہے صدیق وشہید، تو ابوبکر پہلے کے مصداق ہیں، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، شہداء ہیں یہ حضرات کس کا مصداق ہوں گے، محدثین نے اس کے دو جواب دیئے ہے، پہلا یہ کہ وہ تینوں حکمی شہید ہیں اور ان کی وفات ایسے امراض میں ہوئی ہے جن کے مردوں کو حدیث میں شہید کہا گیا ہے، دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ تینوں صدیق وشہید ہیں اور اس کی دلیل قرآن کی آیت والذین آمنوا باللہ ورسلہ اولئك هم الصديقيون والشهداء عند ربهم ہے[5]

---

[1] معارف الحدیث ۴۳۸/۸ [2] فتح الباری ۳۲/۷ [3] عمدۃ القاری ۱۹/۱۶، ۱۹
[4] مرقاۃ المفاتیح ۴۳۲/۱۱ [5] سورہ حدید

حدیث صحیح مسلم (الفضائل ابوعبیدہ) سنن ابی داؤد (السنۃ/ ۹) اور جامع ترمذی (مناقب أبی الأعور) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی عمدہ ہے

فضل ابی عبیدة بن الجراح

نام عامر، کنیت ابوعبیدہ اور لقب امین الامۃ تھا، والد کا نام عبداللہ ہے لیکن دادا کی طرف منسوب ہو کر وہ ابن الجراح کے نام سے مشہور ہوئے سلسلۂ نسب اس طرح ہے **عامر بن عبداللہ بن الجراح بن ہلال بن اھیب بن ضبة بن حارث بن الفھر** اس طرح پانچویں پشت میں فہر پر آپ کا سلسلہ حضور سے مل جاتا ہے والدہ بھی فہری تھیں اور مؤرخین کے مطابق وہ مسلمان بھی ہوئیں حضرت ابوعبیدہ بعثت سے ستائیس یا اٹھائیس سال قبل پیدا ہوئے قد لمبا، جسم نحیف ولاغر اور چہرہ کم گوشت تھا داڑھی گھنی نہ تھی اور سامنے کے دو دانت حضور کی خود کی کڑیاں کھینچنے میں شہید ہو گئے تھے۔

فضائل

آپ بالکل شروع ہی میں صدیق اکبر کی دعوت پر مسلمان ہوئے مکہ میں تمام مصائب سہے اور دو مرتبہ حبشہ ہجرت کی مدینہ ہجرت کے بعد ان کی مواخاۃ حضورؐ نے سعد بن معاذ سے کرائی تھی غزوۂ بدر، احد، خندق، بنوقریظہ، حدیبیہ، فتح مکہ، حنین، طائف اور حجۃ الوداع تقریباً تمام غزوؤں میں شریک رہے وفات نبوی کے بعد صدیق اکبر نے سقیفہ بنوساعدہ میں خلافت کے لئے حضرت عمر کے ساتھ ابوعبیدہ کا نام بھی پیش کیا تھا دورِ صدیقی میں وہ مجاہدوں کے سپہ سالار مقرر کئے گئے اور دمشق، فحل، حمص، یرموک، بیت المقدس اور دیگر اہم علاقوں کو فتح کیا، سترہ ہجری میں حضرت عمرؓ نے خالد بن ولید کو معزول کر کے حضرت ابوعبیدہ کو دمشق کا والی مقرر کیا یوں تو ان کی پوری زندگی ہی خوبیوں اور محاسن کا مرقع ہے لیکن خدا ترسی، اتباع سنت، زہد وتقویٰ، مساوات وتواضع، رحم دلی اور سخاوت وایثار ان کی زندگی کے روشن باب ہیں۔

وفات

اٹھارہ ہجری میں جب شام میں طاعون کی وبا پھیلی تو حضرت عمرؓ کے حکم پر وہ تمام مجاہدوں

کو لے کر ایک بلند اور صحت بخش مقام جابیہ آگئے لیکن یہاں پہنچ کر انہیں طاعون کا مرض لاحق ہوا اسی حالت میں انہوں نے پہلے معاذ بن جبل کو اپنا جانشین بنایا پھر حاضرین کے سامنے ایک نہایت مؤثر اور پرزور تقریر کی تھوڑی دیر میں آپ کا انتقال ہوگیا اس وقت عمر اٹھاون سال تھی حضرت ابوعبیدہ کے خانگی حالات پردۂ خفا میں ہیں تاہم اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان کی صرف دو بیویوں سے اولاد ہوئی ہند بن جابر سے یزید پیدا ہوئے اور ورجاء کے بطن سے عمیر نے جنم لیا لیکن یہ دونوں ہی لاولد فوت ہوئے۔

(۱۳۶/۱) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، ثَنَا وَكِيعٌ، عَنْ سُفْيَانَ ح وَحَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ ثَنَا شُعْبَةُ، جَمِيعاً عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ عَنْ صِلَةَ بْنِ زُفَرَ عَنْ حُذَيْفَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِأَهْلِ نَجْرَانَ سَأَبْعَثُ مَعَكُمْ رَجُلًا أَمِيناً حَقَّ أَمِينٍ قَالَ فَتَشَرَّفَ لَهُ النَّاسُ فَبَعَثَ أَبَا عُبَيْدَةَ بْنَ الْجَرَّاحِ .

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران سے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ حد درجہ امانت دار شخص کو بھیجوں گا تو لوگوں کو اس اعزاز کی خواہش ہوئی تو آپ نے ابوعبیدہ بن الجراح کو بھیج دیا۔

فتح مکہ کے بعد گویا فتوحات کا سیلاب آگیا اور تمام قبائل اس کثرت سے اسلام قبول کرنے کے لئے مدینہ منورہ آئے کہ ۹ ہجری کا نام ہی "عام الوفود" پڑ گیا اہل معازی نے ان کی تعداد ستر سے زائد بتلائی ہے حدیث باب کا تعلق بھی اسی سلسلہ کے ایک وفد سے ہے جو یمن، شام اور حجاز کے وسطی علاقے نجران سے آیا تھا اس میں ساٹھ آدمی تھے جن میں چودہ سر برآوردہ لوگ تھے صحیح بخاری میں ان الفاظ سے پہلے پس منظر بھی منقول ہے جَاءَ العاقبُ والسيدُ صاحبَا نجرانَ الى رسول اللّٰه ﷺ يُريدان أن يُلاعنَاهُ قال فقال احدُهما لصاحبه لا تفعَل فو اللّٰه لئن كان نبياً فلاعنّا لا نُفلِحُ نحنُ ولا عَقِبُنا من بعدِنا قال انا نعطيك ما سألتنا وابعث معنا رجلا أمينًا ولا تبعث معنا الا أمينًا دس ہجری میں یہ فتح ہوا آبادی بیشتر عیسائی تھی آپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی جو انہوں نے قبول نہ کی اور آپ سے حضرت عیسیٰ کی بابت استفسار کیا اسی کے جواب میں ان مثل عيسى عند اللّٰه

کمثل آدم الخ نازل ہوئی وہ پھر بھی ایمان نہ لائے تو حضور نے انہیں مباہلہ کی دعوت دی لیکن سید نے عاقب سے کہا ایسا نہ کرو خدا کی قسم اگر یہ نبی ہوئے اور ہم نے ان سے مباہلہ کرلیا تو نہ ہم کبھی کامیاب ہوں گے نہ بعد میں ہماری اولاد چنانچہ انہوں نے مباہلہ سے پہلو تہی کر کے دو ہزار حلوں کے ساتھ صلح کر لی جس میں کچھ چاندی بھی دینی تھی اور جزیہ پر بھی راضی ہو گئے دوسرے روز سات دفعات پر مشتمل ایک عہد نامہ تحریر کیا گیا اور چلتے وقت صلح کا مال وصول کرنے کے لئے انہوں نے کسی امین کی فرمائش کی آپ نے اس کے لئے ابوعبیدہ کو منتخب فرمایا یہ روایت کا پس منظر تھا شرح اگلی حدیث کے تحت آئے گی وہ دونوں اصالۃ تو ایک ہی روایت ہیں لیکن بعض طرق میں وہ مستقل دو حدیثیں بن گئی ہیں، حدیث بخاری (مناقب/۱۴۹، مغازی/۷۴، اخبار الاحاد/۱) مسلم (صحابہ/۷) اور ترمذی (مناقب/۱۹، ۲۴) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بعینہ صحیح بخاری کی ہے۔

(۱۳۷/۲) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، ثَنَا يَحْيَى بْنُ آدَمَ، ثَنَا إِسْرَائِيلُ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنْ صِلَةَ بْنِ زُفَرَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِأَبِي عُبَيْدَةَ بْنِ الْجَرَّاحِ هٰذَا أَمِينُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوعبیدہ کی بابت فرمایا کہ یہ اس امت کے امین ہیں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں وَأَمَّا الْأَمِينُ فَهُوَ الثِّقَةُ الْمَرْضِيُّ[1] یعنی امین کا مطلب قابل اعتماد پسندیدہ اور سعادت مند شخص ہے ابن حجر نے فتح الباری (۹۳/۷) میں عینی نے عمدۃ القاری (۲۳۸/۶) میں قسطلانی نے ارشاد الساری (۱۳۲/۶) میں اور ملا علی قاریؒ نے مرقاۃ المفاتیح (۲۵۷/۱۱) میں بھی طیبی اور عینی ہی کی رائے نقل کی ہے امام نوویؒ مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں قال العلماء والأمانة مشتركة بينه وبين غيره من الصحابة لكن النبي صلى الله عليه وسلم خص بعضهم بصفات غلبت عليهم وكانوا بها أخص[2] یعنی امانت تو تمام صحابہ میں مشترک تھی لیکن آپ نے بعض صحابہ کو ان صفات کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے جن کا ان پر خاص غلبہ تھا ابن حجر مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں، کالحیاء لعثمان

۱، ۲۔ صحیح مسلم ۲۸۲/۲

والقضاء لعلی ونحو ذلك[1] حضرت ابوبکر کی رحم دلی، عمر کی صلابت، زبیر کی حواریت، طلحہ کی شہادت وغیرہ بھی اسی ضمن کی چیز ہیں...... یہ سند بھی عمدہ ہے حدیث کی تخریج گذر چکی۔

فضلُ عَبدِاللّٰهِ بنِ مسعودٍ رضی اللہ عنہ

نام عبداللہ، کنیت ابوعبدالرحمٰن، والد کا نام مسعود اور والدہ کا نام ام عبد تھا نسبی شجرہ یہ تھا

عبد الله بن مسعود بن غافل بن حبيب بن شمخ بن فار بن مخزوم بن صاهلة بن كاهل بن الحارث بن تميم بن سعد بن هزيل بن مدركة بن الياس بن مضر.

آپ کے والد عبد بن حارث کے حلیف تھے زمانۂ جاہلیت ہی میں ان کا انتقال ہوا لیکن والدہ مشرف بہ اسلام ہوکر بلند پایہ صحابیہ بنیں، حضرت عبداللہ عقبہ بن معیط کی بکریاں چراتے تھے، حضور کے ایک معجزے (یعنی بکری کے خشک تھن کا دودھ سے بھر جانا) کو دیکھ کر شروع ہی میں ایمان لائے اور مسلمانوں میں ان کا نمبر چھٹا تھا۔

سابقین اولین گویا کفار کے لئے مشقِ ستم کا ذریعہ تھے اس لئے ابن مسعود کو بھی خوب ستایا گیا پہلی ہجرت انہوں نے حبشہ کی کی پھر جب یہ سنا کہ تمام مشرکین ایمان لے آئے تو انہوں نے مکہ کا قصد کیا لیکن یہاں آکر خبر غلط نکلی مجبوراً دوبارہ حبشہ تشریف لے گئے پھر جب مسلمانوں کو مدینہ منورہ کا مرکز مل گیا تو ابن مسعود ہجرت کر کے اس روز مدینہ پہنچ گئے جب کہ رسول اللہ ﷺ بدر کی تیاری فرما رہے تھے، مواخات معاذ بن جبل کے ساتھ قائم ہوئی اور رہائش کے لئے حضور ﷺ نے انہیں مسجد نبوی کے قریب ایک زمین عطا فرمائی بدر میں ابوجہل کا سر تن سے جدا کیا اور تمام غزوات میں دادِ شجاعت دی۔

وفات نبوی کے بعد دور صدیقی پورا غم فراق وعزلتمیں گذرا اور عہد فاروقی میں ہی ان کا قدم خلوت سے نکلا اور جنگ یرموک میں اہم کارنامے انجام دیئے خلیفۂ دوم نے انہیں ۲۲ ہجری میں تعلیم وقضاء کے لئے کوفے کا والی بنایا جہاں دس سال تک انہوں نے علم ومعرفت کے دریا بہائے حضرت عثمان کے دور میں فتنہ پردازوں کی کوششوں سے وہ معزول ہوئے اور

---

[1] فتح الباری ۷/۹۳

کوفے کی علمی بزم چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے آئے۔

ساٹھ سال سے زائد عمر پا کر ۳۲ ہجری میں انتقال فرمایا صحیح روایت کے مطابق نمازِ جنازہ حضرت عثمانؓ نے پڑھائی اور جنت البقیع میں انہیں ابن مظعون کے پہلو میں دفن کیا گیا فضائل وخصوصیات احادیث کے تحت آئیں گی۔

(۱۳۸/۱) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا وَكِيعٌ ثَنَا سُفْيَانُ عَنْ اَبِي اِسْحَاقَ عَنِ الْحَارِثِ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كُنْتُ مُسْتَخْلِفاً أَحَدًا عَنْ غَيْرِ مَشْوَرَةٍ لَاسْتَخْلَفْتُ ابْنَ أُمِّ عَبْدٍ.

فرمایا اگر میں مشورے کے بغیر کسی کو خلیفہ بناتا تو یقیناً ابن ام عبد کو بناتا۔

حدیث میں یہ بات غور طلب ہے کہ یہاں خلافت سے محض کسی لشکر کی امارت مراد ہے یا مطلق امارت کبریٰ، جامع ترمذی میں یہ حدیث لو کنت مومراً من غیر مشورة لامرت علیھم ابن أم عبد کے الفاظ میں آئی ہے تورپشتی نے لکھا ہے. اراد بہ تأمیرهٗ علی جیش بعینہٖ اواستخلافہٖ فی أمر من اموره حال حیاتہٖ[1] آپ کا مقصد یہاں بس کسی لشکر کی امارت یا اپنی زندگی ہی میں کسی کام کی ذمہ داری سونپنا ہے کیونکہ تمام خوبیوں کے باوجود ابن مسعودؓ قریشی نہیں ہیں جب کہ خلافت کبریٰ میں قریشیت شرط ہے کما ورد فی الحدیث الائمة من قریش ہمارے نزدیک یہ توجیہ محل نظر ہے کیونکہ ترمذی کی روایت میں اگر تأمیر کا لفظ خلافت پر نہیں بلکہ کسی لشکر کی سربراہی پر دلالت کرتا ہے تو علیھم کا لفظ اس توجیہ کے خلاف ہے کیونکہ اس سے مراد مطلقاً امت مسلمہ ہے سیوطی کی الجامع الصغیر میں علی امتی کے الفاظ آئے ہیں جو یقیناً امامت کبریٰ پر دلالت کرتے ہیں پھر استخلاف کے معنی بھی خلیفہ بنانا ہی ہے جزئی امارت نہیں اس لئے حدیث باب میں خلافت عامہ ہی مراد لینا راجح ہے رہا الائمة من قریش سے استدلال تو اس کا اسلوب خبر پر دلالت کرتا ہے کوئی مستقل اصول یا کلیہ وضع نہیں کرتا اس لئے خلافت کے لئے قریشی ہونا شرط نہیں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں لو کان زید حیا ما استخلف رسول اللّٰہ ﷺ غیره یہی چیز عین شہادت کے موقع پر حضرت عمر سے

---

[1] مرقاة المفاتیح ۱۱/۴۳۳

مروی ہے لو کان سالم مولی ابی حذیفة حیا لاستخلفته حالانکہ زید وسالم قریشی نہیں ہیں اسی لئے متقدمین میں امام ابوحنیفہؒ اور متاخرین میں حضرت کشمیریؒ قریشیت کو خلافت کے لئے شرط نہیں مانتے، ساتویں صدی ہجری تک امت کی قیادت مسلسل قریش ہی کے پاس رہی اس لئے علماء کی ایک خاصی تعداد دونوں کو لازم وملزوم سمجھتی رہی لیکن جب عباسیوں کا زوال ہوگیا اور مسند خلافت پر ترک آبیٹھے تو اس شرط کی شدت بھی مدہم پڑتی گئی چنانچہ حافظ ابن حجر اور علامہ عینی کے یہاں اس پر وہ زور نہیں ہے جو امام نوویؒ وغیرہ کی تحریروں میں دکھائی پڑتا ہے پھر عثمانی ترکوں کی چار سو سالہ خلافت میں یہ شرط علمی حلقوں کے دماغوں ہی سے نکل گئی۔

﴿من غیر مشورة﴾ انفرادی خصوصاً اجتماعی امور میں اہل الرائے سے مشورہ کرنا رسول اللہ ﷺ کی دائمی سنت تھی مشورہ کا مقصد ایسے صحیح فیصلے تک پہنچنا ہے جو فرد و جماعت کے حق میں خیر ہی خیر ہو اور ضرر اس میں کم سے کم ہو یہ عموماً غیر معلوم احوال واشخاص میں درکار ہوتا ہے اور اجتماعیت کی برکت سے معاملہ کے تمام پہلو سامنے آجاتے ہیں رسول اللہ ﷺ صحابہ کو یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ابن مسعود کی صلاحیت ودیانت اتنی روشن ہے کہ ان کو کوئی منصب دینے کے لئے کسی مشورہ کی ضرورت نہیں اسلامی نظام خلافت میں امیر المومنین کو تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں گو مشورہ ان کے لئے مناسب ہے لیکن محض اپنی صواب دید پر بھی وہ کوئی رائے قائم کرسکتے ہیں جیسا کہ صدیق اکبر نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف تنہا فیصلہ کیا اور صحابہ کو شرح صدر بعد میں ہوا۔ حدیث باب ترمذی میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند کو الدیباجه علی ابن ماجه (۱/۵۹) میں اسناده صحیح قرار دیا گیا ہے۔

(۱۳۹/۲) حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ عَلِيِّ الْخَلَّالُ، ثَنَا يَحْيَى بْنُ آدَمَ، ثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنِ عَيَّاشٍ عَنْ عَاصِمٍ، عَنْ زِرٍّ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ: اَنَّ أَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ بَشَّرَاهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ”مَنْ اَحَبَّ اَنْ يَقْرَأَ الْقُرْآنَ غَضًّا كَمَا اُنْزِلَ، فَلْيَقْرَأْهُ عَلَى قِرَاءَةِ ابْنِ اُمِّ عَبْدٍ“

ابوبکر وعمر نے ابن مسعود کو یہ بشارت دی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص قرآن کریم کو

---

[۱] طبقات ابن سعد قسم ۱/۳/۳۱ [۲] اسد الغابہ ۲/۲۳۶

اسی طرح زندہ وتابندہ پڑھنا چاہے جیسا کہ وہ نازل کیا گیا تو ابن ام عبد کی قرأت میں قرآن کریم کی تلاوت کرے۔

مسند احمد ابن حنبل (۴۵۴/۱) میں حدیث باب کا شان ورود یہ لکھا ہے دَخَلَ رسولُ اللّٰہ ﷺ المسجدَ وھو بین ابی بکرٍ وعمرَ اذ ابنُ مَسعُود یُصَلِّی وَاذَا ھو یَقرأُ النساءَ فانتھی الی رأس المِائَۃِ فجعل ابن مسعود یَدعُو وھو قائم یُصَلی فقال النبی ﷺ اِسْأَل تُعطَہُ اِسَأل تُعْطَہُ ثُمَّ قَالَ.

پھر حدیث باب کا ذکر ہے صبح کو صدیق اکبر ابن مسعود کے پاس گئے تا کہ انہیں اس فضیلت کی خوشخبری سنائیں انہوں نے ابن مسعود سے پوچھا تم نے رات اللہ سے کیا مانگا انہوں نے عرض کیا اللھم انی اسئلك ایماناً لا یرتد ونعیما لا ینفد ومرافقۃ محمد ﷺ فی اعلی جنۃ الخلد پھر عمر نے جا کر یہی خوشخبری سنائی لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ صدیق اکبر پہلے آچکے ہیں تو بڑی حسرت سے کہا یرحم اللہ ابا بکر ما سبقتہٗ الی خیر قط الاسبقنی الیہ تجوید وتلاوت میں جن چار صحابہ کو رسول اللہ ﷺ نے ممتاز قرار دیا ہے ان میں پہلا نام ابن مسعود ہی کا ہے صحیح بخاری کی روایت ہے استقرئوا القرآن من أربعۃ من عبد اللّٰہ بن مسعود وسالم مولی ابی حذیفۃ وابی بن کعب ومعاذ بن جبلؓ ایک بار آپ نے ان سے خود قرآن پڑھنے کی فرمائش کی بخاری ومسلم کی روایت ہے ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں جب سورۂ نساء کی آیت فکیف اذا جئنا من کل أمۃ بشھید وجئنا بك علی ھؤلاء شھیداً پر پہنچا تو آپ نے مجھے روک دیا میں نے دیکھا فإذا عیناہ تذرفانؐ آپ کی آنکھیں بہہ رہی تھیں، حضرات صحابہ بھی ان کی عالمانہ شان کا اعتراف کرتے تھے چنانچہ ابو مسعود انصاری کی یہ شہادت مسلم باب فضائل الصحابہ/ ۱۸ میں موجود ہے ما أعلم رسول اللّٰہ ﷺ ترك بعدہ اعلم بما أنزل اللّٰہ من ھذا القائم اسی طرح مسلم کے اسی باب میں خود ان کا یہ قول بھی ملتا ہے انی اعلمھم بکتاب اللّٰہ ولو اعلم أن احداً اعلم منی لو حلت الیہ ... یہ تمام تر روایات ان کی عالمانہ شان خصوصا علوم القرآن میں ان کے بلند مرتبہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں حدیث باب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

سند کی تحقیق

سند کے پہلے راوی ابوبکر بن عیاش ضبط کے اعتبار سے مضبوط نہیں ابن حجر نے تقریب التہذیب (۶۲۴) میں لکھا ہے ثقة عابد الا أنه لما كبر ساء حفظه و كتابه صحيح دوسرے راوی عاصم بن بہدلہ کا بھی یہی حال ہے محدثین نے انہیں سیئ الحفظ قرار دیا ہے حافظ ابن حجر تقریب التہذیب (۲۸۵) میں تحریر فرماتے ہیں صدوق له اوهام حجة فی القرأة وحديثه في الصحيحين مقرون اس لئے سند مضبوط نہیں مولانا لطیف الرحمٰن خان بہرائچی نے اسے الدیباجہ علی ابن ماجہ (۵۶۱/۱) میں حسن لغیرہ قرار دیا ہے۔

(۳/۱۴۰) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ اِدْرِيْسَ، عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ سُوَيْدٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ يَزِيْدَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْنُكَ عَلَيَّ أَنْ تَرْفَعَ الْحِجَابَ وَأَنْ تَسْتَمِعَ سِوَادِيْ حَتّٰى أَنْهَاكَ .

فرمایا تمہیں اجازت ہے کہ تم پردہ کو اٹھا کر میری راز کی بات بھی سن لو الا یہ کہ میں ہی تمہیں روک دوں۔

کسی کے گھر میں داخل ہونے کیلئے شریعت نے مستقل آداب واصول سکھلائے ہیں لیکن جب صاحب خانہ کو کسی سے انس ہوجائے اور اعتماد کی بناء پر گھریلو کاموں میں اس کی ہر وقت ضرورت ہو تو اجازت ظاہری سے کہیں زیادہ معنوی ہوجاتی ہے اور اہل خانہ اسکے دخول میں زیادہ بار وتکلف محسوس نہیں کرتے ابن مسعود کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے خادم خاص تھے اور بارگاہ رسالت میں ان کی ہر وقت حاضری ہوتی تھی اس لئے آپ نے ان کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ فرمایا:

﴿اذنك علي﴾ سندھیؒ لکھتے ہیں ای فی الدخول علیؐ نوویؒ فرماتے ہیں وفيه دليل لجواز اعتماد العلامة في الاذن في الدخول[۳] یعنی حدیث اندر داخلہ کی اجازت میں اس طرح کی علامتوں پر اعتماد کے جواز کی دلیل ہے، نووی نے اس کی دو مثالیں دی ہیں۔

---

[۱] صحیح بخاری، ۵۳۱/۱ [۲] بخاری ۶۵۹/۲/ مسلم ۲۷۰/۱
[۳] کتاب السلام باب جواز جعل الاذن رفع حجاب اوغیرہ من العلامات، صحیح مسلم

(۱) اِذَا جَعَلَ الرَّجُلُ ذلك عَلَامَةً بينَه وبينَ خَدَمِهِ ومَمَالِيْكِهِ وكِبارِ اَولادِهِ وأهلِه فمتى أرخىٰ حجابَهُ فَلا دُخولَ عَلَيهِ اِلا بالْاِسْتِيذانِ فاِذا رَفَعَه جازَ بلا اِسْتِيذانٍ یعنی اگر کوئی شخص اپنے خدام، موالی، دیگر اہل خانہ اور اپنی بالغ اولاد کے لئے اس طرح کی کوئی علامت مقرر کردے تو رفع حجاب کے وقت بغیر اجازت اندر جانا جائز ہے اس کے برعکس اگر پردہ پڑا ہے تو اذن کے بغیر داخلہ کی اجازت نہ ہوگی۔

(۲) فَاِذَا جَعَلَ الأميرُ اَوِالقاضِي اونحوُهمَا وغيرُهم رَفعَ السَّترِ الذى على بَابِه علامةً فى الاِذنِ فى الدخول عليه للناس عامةً اولطائفةٍ خاصةٍ اولشخصٍ اوجعل علامةَ غَيرِ ذلك جَازَ اعتمادُها والدخولُ اذاوُجِدَ بِغَير اِستيذان یعنی امیر وقاضی وغیرہ اگر دروازے پر پڑے پردہ کو عام یا مخصوص افراد کے لئے دخول کی علامت قرار دے دیں یا اس کے علاوہ کوئی دوسری علامت مقرر کردیں تو اس پر اعتماد کر کے بلا اجازت اندر داخل ہونا جائز ہے۔

﴿ان ترفع الحجاب﴾ صحیح مسلم میں أن یُرفع الحجاب فعل مجہول غائب کا صیغہ ہے اور یہی راجح ہے کیونکہ رفع حجاب کا حق اہل خانہ کو ہے واردین وصادرین کو نہیں اس صورت میں بے پردگی کا یقینی خطرہ ہے۔

﴿وأن تسمع سوادى حتى انهاك﴾ سوادِ سین کے کسرہ کے ساتھ ہے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے امام نوویؒ نے لکھا ہے اتفق العلماء على ان المراد به السرار[1] یعنی سواد کے معنی پوشیدہ اور کانوں میں بات کرنے کے ہیں ایسے وقت قرب ودخول کی اجازت نہیں جب کہ انسان پوشیدہ طریقہ پر کوئی گفتگو کر رہا ہو یہ ابن مسعود ہی کی خصوصیت ہے کہ ان کو اس وقت بھی دخول کی اجازت دی گئی، علامہ سندھیؒ نے ایک اور نکتہ یہاں پیدا کیا ہے ولعل ذلك اذا لم يكن فى الدار حرمة یعنی یہ عام حالات کا حکم ہے لیکن ازواج مطہرات اگر گھر میں ہوں گی تو اس وقت پوشیدہ باتوں کو سننے کی اجازت نہ ہوگی حضرت ابن مسعودؓ کے لئے دخول وملاقات کی یہ آسانیاں اس لئے فراہم کی گئیں تاکہ خدمت نبوت میں

[1] صحیح مسلم ۲/۲۱۵

انہیں کوئی پریشانی نہ ہو وہ صاحب النعلین والسواك والوسادة تھے[1] اوراتنی کثرت سے خدمت میں حاضر ہوتے تھے کہ ابوموسیٰ اشعری نے جب ان کو اتنا قریب دیکھا تو اہل بیت ہی کا ایک فرد سمجھا مانری الا ان عبد اللّٰہ بن مسعود رجل من اھل بیت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لما نری من دخولہ ودخول امہ علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم حدیث باب ہی کی بنیاد پر ان کو صاحب السرالذی لا یعلمہ غیرہ[2] بھی کہا جاتا ہے...... حدیث باب صحیح مسلم (السلام/٦) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی عمدہ ہے۔

فضل عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ

نام عباس، کنیت ابوالفضل، والد کا نام عبدالمطلب اور والدہ کا نام قتیلہ تھا وہ رسول اللہؐ کے حقیقی چچا ہیں لیکن عمر میں صرف دوتین سال بڑے تھے، حضرت عباسؓ بچپن میں گم ہو گئے تھے جس پر ان کی والدہ نے کعبے کو غلاف سے ملبوس کرنے کی نذر مانی تھی، چنانچہ ان کے مل جانے کے بعد یہ نذر پوری ہوگئی، اور ان کی والدہ وہ پہلی خاتون قرار پائیں جنہوں نے جاہلیت میں بیت اللہ کو دیبا وحریر سے مزین کیا۔

حضرت عباسؓ نہایت خوبصورت، سرخ وسفید اور بلند و بالا تھے، جاہلیت میں سقایہ اور رفادہ کی ذمہ داریاں انہیں اپنے والد سے وراثت میں ملی تھیں، گو وہ شروع میں مسلمان نہیں ہوئے لیکن دل سے وہ اسلام کی اشاعت کے خواہاں تھے اور حضور ﷺ کی ہر موقع پر حفاظت وحمایت کرتے تھے، چنانچہ بیعت عقبہ کے موقع پر انہیں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ لے گئے تھے اور انہوں نے انصار کو آزمایا بھی تھا، بدر میں مجبوراً قریش کے ساتھ تھے، اس لئے آپ نے انہیں قتل کرنے سے منع کیا تھا، لیکن جب قیدی ہو کر آئے تو دیگر اسیرانِ بدر کی طرح ان سے بھی فدیہ لیا گیا وہ مسلمان ہونے کے باوجود ایک عرصہ تک مکہ مکرمہ میں رہے اور کفار کے رازوں کو مدینہ منتقل کرتے رہے فتح مکہ سے کچھ پہلے انہیں ہجرت کی اجازت ملی اور اپنے اہل وعیال کو لے کر مدینہ آبسے، سب سے پہلے فتح مکہ میں آکر شرکت کی پھر حنین میں آپ ہی حضورؐ

[1] صحیح بخاری، ۵۳۱/۱
[2] بخاری ومسلم مناقب عبداللہ بن مسعود

کے گھوڑے کی باگیں تھامے ہوئے تھے اور آپ ہی کی بلند آواز پر صحابہ پلٹ کر آئے تھے، اسی طرح طائف، حجۃ الوداع، اور غزوۂ تبوک میں بھی شرکت کی، وفات کے بعد جن لوگوں نے حضورؐ کی تجہیز و تکفین میں حصہ لیا ان میں حضرت عباسؓ بھی تھے اور لوگوں نے حضورؐ کی تعزیت انہیں سے کی عہد خلافت میں صحابہ کرام ان کا نہایت احترام کرتے تھے، اور خشک سالی کے موقع پر انہیں سے دعائیں کراتے تھے، جیسا کہ حضرت عمرؓ کے واقعہ میں بھی منقول ہے۔

حضرت عباسؓ شروع ہی سے مالدار تھے اور ان کا سودی کاروبار بھی چلتا تھا، جسے حضورؐ نے فتح مکہ پر بند کرنے کا اعلان کیا وہ بڑے رقیق القلب تھے، آنکھوں سے فوراً آنسو نکل آتے تھے، ۸۸ر سال کی عمر میں انہوں نے ۳۲ھ بروز جمعہ رجب یا رمضان میں دنیا کو خیرباد کہا حضرت عثمانؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور عبداللہ بن عباسؓ نے قبر میں اتارا حضرت عباسؓ نے متعدد شادیاں کیں اور ان کی بہت اولاد ہوئی پہلی بیوی لبابہ بنت حارث سے فضل، عبداللہ، عبیداللہ، عبدالرحمٰن، قثم، معبد اور ام حبیبہ پیدا ہوئے دوسری بیوی سے کثیر، تمام، صفیہ، اور امیہ پیدا ہوئے جب کہ تیسری بیوی حجلہ کے بطن سے حارث نے جنم لیا۔

(۱۴۱/۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ طَرِيفٍ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُضَيْلٍ ثَنَا الْأَعْمَشُ عَنْ أَبِي سَبْرَةَ النَّخَعِيِّ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ كَعْبٍ الْقُرَظِيِّ عَنِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ قَالَ كُنَّا نَلْقَى النَّفَرَ مِنْ قُرَيْشٍ وَهُمْ يَتَحَدَّثُونَ فَيَقْطَعُونَ حَدِيثَهُمْ فَذَكَرْنَا ذٰلِكَ لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَتَحَدَّثُونَ فَإِذَا رَأَوُا الرَّجُلَ مِنْ أَهْلِ بَيْتِي قَطَعُوا حَدِيثَهُمْ وَاللّٰهِ لَا يَدْخُلُ قَلْبَ رَجُلٍ الْإِيمَانُ حَتَّى يُحِبَّهُمْ لِلّٰهِ وَلِقَرَابَتِهِمْ مِنِّي

حضرت عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہم قریش کے لوگوں سے ملتے تو وہ باتیں کرتے ہوتے، لیکن ہمیں دیکھ کر اپنی گفتگو ختم کر دیتے، ہم نے اس کا تذکرہ حضورؐ سے کیا تو آپ نے فرمایا لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ بات چیت کرتے ہیں لیکن میرے اہل بیت کے فرد کو دیکھتے ہی وہ خاموش ہو جاتے ہیں اللہ کی قسم کسی شخص کے دل میں اس وقت تک ایمان داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کی رشتہ داری کی وجہ سے اہل بیت سے محبت نہ کرے۔

ترمذی میں ان العباس دخل علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مغضباً فقال ما اغضبك کا پس منظر بھی موجود ہے۔

﴿کنا نلقی النفر من قریش وھم یتحدثون فیقطعون حدیثھم﴾ قطع حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے ای عند لقائنا غضبا وعداوۃ لنا لا اخفاء للحدیث عنا لکونہ سراً والا فلا لوم علی اخفاء الأسرار ہمیں دیکھتے ہی گفتگو کا ختم کر دینا عداوت وغضب ہی کی بنا پر تھا ورنہ ان کی گفتگو میں کوئی ایسی راز کی بات نہ تھی جسے وہ ہم سے چھپانا چاہتے تھے ذاتی رازوں کو چھپانے پر کسی کو ملامت نہیں کی جا سکتی شیخ مجددی فرماتے ہیں: اما انھم کانوا یسرون من العباس حسدابہ واما لانھم یرونہ اجنبیایخافون افشاء السرفاوعد ھم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بذلك الوعید یعنی یا تو حسد کی وجہ سے چھپاتے تھے یا انھیں غیر سمجھتے تھے، جس سے راز کھلنے کا خطرہ ہوتا ہے، تو حضورؐ نے اس وعید کے ذریعہ انھیں تنبیہ کی کہ یہ سلوک مناسب نہیں۔ جامع ترمذی میں قوسین کی عبارت قال یا رسو ل اللّٰہ مالنا ولقریش اذا تلاقوا بینھم تلاقوا بوجوہ مستبشرۃ واذا لقونا لقونا لغیر ذالك کی صورت میں منقول ہے، یعنی ہمارے بارے میں قریش کی عجیب روش ہے کہ جب باہم ملتے ہیں تو چہرے کھلے ہوتے ہیں، لیکن جب ہم سے ملاقات ہوتی ہے تو انداز دوسرا ہوتا ہے۔

﴿فقال﴾ ترمذی میں فغضب رسول اللّٰہ ﷺ حتی احمر وجھہ کا بھی تذکرہ ہے۔

﴿واللّٰہ لا یدخل قلب رجل الایمان حتی یحبھم للّٰہ ولقرابتھم منی﴾

ترمذی میں ان الفاظ کے بعد ایھا الناس من اذیٰ عمی فقد اذانی فانما عم الرجل صنو ابیہ کا بھی اضافہ ہے..... حدیث باب میں قرابت نبوت کو عظیم فضیلت بتلایا گیا ہے نبی کی صحبت اکسیر کا درجہ رکھتی ہے اس لئے اس سے جو بھی خونی یا ازواجی رشتہ رکھتا ہے اس کو دوہری نسبت حاصل ہو جاتی ہے جس کی بنا پر اہل ایمان کے نزدیک یہ لوگ بڑے محبوب ومحترم ہوتے ہیں قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کے تعلق سے ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ علیکم اھل البیت فرما کر خاندانِ نبوت کے اسی تقدس کو اجاگر کیا ہے اور حضرت موسیٰؑ کی اہلیہ کے بارے

میں قرآن میں جو ہر جگہ واحد مونث حاضر کے بجائے جمع مونث حاضر کا صیغہ ملتا ہے وہ بھی اسی احترام کی طرف اشارہ ہے رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت کی پارسائی اور طہارت وتقوی کی شہادت انما یرید اللّٰہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا والی آیت میں دی ہے جس کا مصداق ازواج مطہرات کے علاوہ حضور نے اللّٰھم ھؤلاء اھل بیتی[1] کی دعا کر کے علیؓ، فاطمہؓ اور حسنینؓ کو قرار دیا ہے حضرت عباس بھی تقریباً اسی زمرے میں شامل ہیں اس لئے سورۂ شوریٰ کی آیت: ۲۳ قل لا اسئلکم علیه اجراً الا المودة فی القربیٰ کی رو سے امت کے ہر فرد کو ان سے محبت کرنی چاہئے اور جس نے نبی کی قرابت کا لحاظ نہیں کیا وہ آپ کے غضب کا مورد بنے گا حدیث باب یہی بتاتی ہے اس لئے اہل بیت سے محبت اہل سنت والجماعت کا شعار رہا ہے..... ترمذی کی حدیث ہے انی ترکت فیکم ما ان اخذتم به لن تضلوا کتاب اللّٰہ وعترتی اهل بیتی[2] حدیث ترمذی مناقب عم النبی میں بھی موجود ہے اور اس کی سند کو مصنف نے حسنٌ قرار دیا ہے جب کہ ابن ماجہ کی سند کو بوصیری نے ھذا اسناد رجاله ثقات الا ان محمد بن کعب روایته عن العباس یقال مرسلة قرار دیا ہے اور الدیباجہ علی ابن ماجہ (۱/ ۵۶۷) میں حسن لغیرہٖ کہا گیا ہے۔

(۱۴۲/۲) حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ بْنِ الضَّحَّاكِ، ثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ عَيَّاشٍ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَمْرٍو عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ، عَنْ كَثِيرِ بْنِ مُرَّةَ الْحَضْرَمِيِّ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ''إِنَّ اللّٰهَ اتَّخَذَنِي خَلِيلًا كَمَا اتَّخَذَ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا فَمَنْزِلِي، وَمَنْزِلُ إِبْرَاهِيمَ فِي الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُجَاهَيْنِ وَالْعَبَّاسُ بَيْنَنَا مُؤْمِنٌ بَيْنَ خَلِيلَيْنِ''

فرمایا: مجھ کو اللہ نے ابراہیم کی طرح خلیل بنایا ہے، تو قیامت کے دن میرا اور ابراہیم کا مقام جنت میں آمنے سامنے ہوگا اور حضرت عباس ہم دونوں خلیلوں کے درمیان مؤمن کی حیثیت سے ہوں گے۔

حدیث باب کے راوی عبدالوہاب بن ضحاک بہت گئے گذرے ہیں، جن کو امام بخاری

---

[1] [2] ترمذی مناقب اہل بیت

نے عنده عجائب، امام نسائی نے ليس بثقة متروك، عقیلی، دار قطنی اور بیہقی نے متروك صالح بن محمد نے منكر الحديث عامة حديثه كذب ابن حبان نے كان يسرق الحديث لا يحل الاحتجاج به، حاکم اور ابونعیم نے روى أحاديث موضوعة، امام ابوداؤد نے كان يضع الحديث قد رأيتهٗ اور ابن حجر نے متروك كذبه ابو حاتم من العاشرة قرار دیا ہے اس لئے بوصیری نے زوائد ابن ماجہ، (۶۲/۱) میں لکھا ہے هذا اسنادٌ ضعيفٌ لاتفاقهم على ضعف عبد الوهاب جب کہ ابن الجوزی نے الموضوعات (۳۳،۳۲/۲) میں اس پر وضع کا حکم لگایا ہے ابن عراق نے تنزيه الشريعة المرفوعة، عن الاحاديث الشنيعة الموضوعة (۱۷/۲) میں علامہ شوکانی نے فوائد المجموعة فی الاحاديث الموضوعة (۴۰۳،۴۰۲) میں وهو موضوع اور علامہ کمال الدین دمیری نے الدیباجہ میں اسے موضوع قرار دیا ہے نیز درایۃ بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انبیاء جنت میں سب سے اونچے مقام پر ہوں گے ان کے درمیان کسی امتی کو کیسے رکھا جا سکتا ہے جب کہ اسے ایمانی سبقت اور غزواتی فضیلت بھی حاصل نہ ہو اس لئے روایت اور درایت دونوں لحاظ سے یہ غالباً موضوع ہی ہے۔

فضائل الحسن والحسین ابنی علی بن ابی طالبؓ

حضرت حسن رضی اللہ عنہ

نام حسن، کنیت ابو محمد، لقب ریحانۃ النبی تھا والد خلیفہ رابع حضرت علیؓ اور والدہ جگر گوشہ رسولؐ فاطمہ زہراء تھیں آپ کی ولادت رمضان ۳ھ میں ہوئی شکل وصورت میں وہ رسول اللہ ﷺ سے مشابہت رکھتے تھے اور آٹھ سال تک دامن نبوت ہی میں پرورش پائی حضورؐ کو ان سے نہایت محبت تھی اور وہ آپ کے ساتھ طفلانہ شوخیاں کرتے تھے وفات نبوی کے بعد حضرات شیخین نے ان سے غایت درجے کا تعلق رکھا اور حضرت عمرؓ نے آپ کا وظیفہ کبار صحابہ کے برابر مقرر کیا عہد عثمانی میں پوری طرح جوان ہوئے اور طبرستان کی یلغار میں مجاہدانہ کردار ادا کیا

محاصرے کے وقت وہ ہر آن حضرت عثمان کی حفاظت پر مامور تھے اور انہیں کی مدافعت میں باغیوں نے آپ کو زخمی بھی کیا خلیفہ ثانی کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ مقرر ہوئے اور اختلاف ظاہر ہوا اس موقع پر حضرت حسن حضرت علیؓ ہی کے ساتھ رہے اور تاحیات انہیں کے فرمانبردار رہے حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد آپ مسند خلافت پر متمکن ہوئے لیکن باہمی خونریزی سے ان کا دل اوب چکا تھا اس لئے حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوگئے تاکہ عالم اسلام دوبارہ متحد ہوکر پھر وسعت وترقی کے جادہ پر گامزن ہو اس سال کو تاریخ میں عام الجماعۃ کہا گیا حضرت حسنؓ نے کثرت سے شادیاں کیں لیکن اس سلسلے میں تاریخی روایتوں میں مبالغہ کیا گیا ہے صحابہ کی عمومی صفات کے علاوہ حضرت حسن میں خطابت کا وصف پورے کمال کے ساتھ موجود تھا نہایت حلیم وبردبار عابد وزاہد، شب زندہ دار، مصلح ومربی، فیاض وسخی اور اخلاق رسول کا کامل نمونہ تھے، ۵۰ھ میں آپ کی بیوی جعدہ بن اشعث نے زہر دیدیا جس کے باعث حالت نازک ہوگئی اور روضہ نبوی میں دفن ہونے کی اجازت چاہی تیسرے دن آپ کا انتقال ہوگیا سعید بن العاص والی مدینہ نے جنازہ پڑھایا اور بقیع الغرقد میں آپ کو دفن کردیا گیا روضۂ اقدس میں مروان نے دفن نہ ہونے دیا آپ کی وفات سے اہل مدینہ کو بے پناہ رنج ہوا بازار بند ہوگئے گلیوں میں سناٹا چھا گیا اور ثعلبہ بن ابی مالک کے بقول تدفین میں اتنا مجمع تھا کہ اگر سوئی بھی پھینک دی جاتی تو وہ زمین پر نہ گر پاتی مختلف بیویوں سے آپ کی کل دس اولادیں ہوئیں آٹھ لڑکے زید، عمر، قاسم، ابوبکر، طلحہ، حسن، عبیداللہ اور عبدالرحمٰن جب کہ لڑکیاں ام حسن اور ام اسحاق صرف دو تھیں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ

نام حسین، کنیت ابوعبداللہ، لقب ریحانۃ النبی اور سید شباب اھل الجنۃ تھا والد علی مرتضٰی اور والدہ جگر گوشۂ رسول سیدہ بتول فاطمہؓ تھیں اس لحاظ سے آپ کی ذات محترم قریش کا خلاصہ اور بنی ہاشم کا عطر تھی شعبان ۴ھ میں آپ کی ولادت ہوئی خود رسول اللہ ﷺ نے کانوں میں اذان دی اور نام حسین رکھا حکم نبوی کے مطابق والدین نے عقیقہ بھی کیا حضورؐ کو

ان دونوں ہی سے بیحد محبت تھی اور انہیں پیار کرنے کے لئے آپ روزانہ حضرت فاطمہؓ کے گھر جاتے تھے وفات نبوی کے وقت حضرت حسینؓ سات سال کے تھے عہد صدیقی اور عہد فاروقی دونوں میں ان کا خاص خیال رکھا گیا اور قرابت رسول کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے ان کا وظیفہ بھی پانچ ہزار مقرر کیا عہد عثمانی میں وہ پوری طرح جوان ہو چکے تھے چنانچہ حضرت حسن ہی کے ساتھ پہلی مرتبہ طبرستان کے جہاد میں شریک ہوئے اور محاصرے کے وقت حضرت عثمان کی حفاظت پر مامور تھے حضرت علیؓ کے دور میں انہوں نے جنگ جمل، صفین اور خوارج کی سرکوبی میں بھر پور حصہ لیا حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ان کے بڑے بھائی حسنؓ نے جب خلافت سے دستبرداری کا ارادہ کیا تو حضرت حسینؓ نے اس کی پرزور مخالفت کی، لیکن حضرت حسن نے ان کی بات نہیں مانی مجبوراً وہ بھی امیر معاویہ کے مطیع ہو گئے ۴۹ھ میں حضرت حسن کا انتقال ہو گیا اور ۵۶ھ میں امیر معاویہ نے یزید کو ولی عہد مقرر کر کے تمام اہل مدینہ سے اس کی بیعت لی صرف چند لوگوں نے اس سے اختلاف کیا جن میں حضرت حسین بھی شامل تھے امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید خلافت پر متمکن ہوا اور اس نے سب سے پہلے سیدنا حسین وغیرہ سے بیعت لینے ہی کی طرف توجہ مبذول کی اس کے نتیجے میں کربلا جیسا دردناک حادثہ پیش آیا یہ ۶۱ھ تھا۔

واقعہ کربلا

سیدنا حسین اور یزید کے سلسلے میں برصغیر میں بڑی افراط وتفریط سے کام لیا جا رہا ہے اس لئے یہاں ہم اہل سنت والجماعت کا معتدل موقف پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یزید کے دور حکومت میں سیدنا حسین اور اہل بیت کی شہادت کا جو دردناک حادثہ پیش آیا اس کے سلسلے میں تین نقطہ نظر سامنے آئے

ناصبی موقف

ایک طبقے کا خیال ہے کہ یزید لائق وفائق تابعی اور صحابی کا بیٹا ہے اسکی ولی عہدی کی تجویز بھی ایک صحابی ہی نے پیش کی تھی اور صحابہ وتابعین کی ایک جماعت نے اس کی بیعت واطاعت کی جن میں بدری صحابہ تک موجود ہیں اسلئے وہ خلیفہ راشد نہ سہی تو خلیفہ

عادل ضرور ہے اور اس کے خلاف سیدنا حسینؓ کا اقدام سراسر بغاوت تھا جس کو بحیثیت خلیفہ یزید کے لئے کچلنا ضروری تھا چنانچہ اہل بیت کا قتل شرعی رو سے صحیح ہے اور اس سلسلے میں یزید قابل ملامت نہیں نیز وہ حسین کی شہادت سے خودخوش نہ تھا اور نہ ہی اس نے ابن زیاد کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا یہی وجہ ہے کہ حسین کے سر کو دیکھ کر وہ بھرے دربار میں رو پڑا، ابن زیاد کو اس نے بد عائیں دیں اور اہل بیت کی ضیافت ودلجوئی کر کے انہیں بڑے احترام وعقیدہ کے ساتھ مدینہ روانہ کیا اس لئے وہ بالکل بے قصور ہے یہ ناصبی حضرات کا عقیدہ ہے۔

شیعی عقیدہ

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ خلافت کا مدار وراثت پر نہیں بلکہ لیاقت وفضیلت پر ہے اس لئے اکابر کی موجودگی میں معاویہ اور ان کے ہمنواؤں کا یزید کو ولی عہد بنانا امت کے ساتھ غداری اور اہل بیت سے خلافت کو ہمیشہ کے لئے غصب کرنا تھا وہ فاسق وفاجر، بددین وملحد اور پکا شرابی تھا بنی ہاشم سے جاہلی ادھار چکانے اور غزوۂ بدر میں مارے گئے اپنے عزیزوں کا بدلہ لینے کے لئے ہی اس نے گھیر کر اہل بیت کے گلوں پر چھری چلائی اس لئے وہ اور اس کے تمام ہمنوا پکے کافر ہیں اور ان پر لعنت کرنا ضروری ہے یہ شیعی نقطہ نظر ہے۔

اہل سنت کا مسلک

ہمارے نزدیک یہ دونوں نقطۂ نظر افراط وتفریط پر مبنی اور محض جذبات کی عکاسی ہیں ایک گروہ یزید کو بچانے کے لئے سیدنا حسین اور تمام صحابہ کو باغی قرار دے کر مباح الدم کہتا ہے جب کہ دوسرا گروہ یزید کے غصے میں امیر معاویہ، عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ اور دیگر بیعت کرنے والے صحابہ وتابعین کی بھی خبر لے ڈالتا ہے حق ان دونوں کے درمیان ہے حضرت حسین یزید کو بالکل خلافت کا اہل نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ امیر معاویہ کی وفات کے بعد حجاز کے اکابر اور اہل حل وعقد نے بھی جب اس کی بیعت نہ کی اور عراق والے بھی اس کی اطاعت پر راضی نہ ہوئے تو اہل شام کی بیعت پوری امت پر تھوپی نہیں جاسکتی تھی اس لئے حضرت حسینؓ کے نزدیک یزید کی حیثیت اس سلطان کی تھی جو غلبہ پانا چاہتا تھا لیکن اسے ابھی پورا غلبہ حاصل نہ ہوا

تھا اس لئے وہ اسے روکنے اور خلافت کو وراثت وملوکیت سے ہٹا کر منہاج نبوت پر قائم کرنے کے لئے اٹھے اور یہ دینی فریضہ تھا لیکن کربلا پہنچ کر جب آپ کو معلوم ہوا کہ تمام لوگ اس کی حکومت پر راضی ہو چکے ہیں اور وہ مکمل غلبہ پا چکا ہے تو دعوائے خلافت سے دستبردار ہو کر آپ نے تین تجویزیں پیش کیں، جن میں سے ایک امّا ان اضع یدی فی یدیزید تھی یعنی آپ سلطان متغلب کی حیثیت سے شاید اس کی بیعت پر راضی ہو گئے لیکن ابن زیاد بدنہاد نے اپنی غیر مشروط بیعت پر اصرار کیا جس کے نتیجے میں کربلا کا حادثہ پیش آ گیا اس سلسلے میں کتنی ہی ٹھوس تاویلیں کر کے یزید کی برأت کی جائے تاہم یہ حقیقت ہے کہ یزید کے دورِ حکومت میں، یزید کے کارندوں نے، یزید کی خوشنودی کے لئے نواسۂ رسول ریحانہ بتول کو شہید کر دیا اور اس نے ان کا کوئی قصاص نہیں لیا اہل بیت کی تباہی پر وہ آبدیدہ ہوا اس کے گھر میں ماتم کیا گیا اور ابن زیاد کو اس نے خوب بددعائیں دیں لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس غم میں اس نے انتقامی کاروائی کیوں نہ کی جو اس پر شرعاً واجب تھی ظاہر ہے نواسۂ رسول کا خون اور اہل بیت کا لہو اتنا سستا تھا کہ یزید کے چند ٹہوکوں سے اس کی تلافی ہو جائے پھر کربلا کے علاوہ اس کی فرد جرم میں دو واقعے اور بھی ایسے موجود ہیں جن کی تو کوئی تاویل نہیں ہو سکتی پہلا مدینۃ الرسول پر حملہ کر کے انصار ومہاجرین کو تہہ تیغ کرنا دوسرا مکہ معظّمہ پر چڑھائی اور صحابہ وتابعین کے قتل کے ساتھ کعبۃ اللہ کی حرمت کی دھجیاں اڑانا یہ تین جرم اتنے شدید اور بدتر ہیں کہ کوئی مسلمان ان کے ارتکاب کا تصور نہیں کر سکتا اس لئے علماء نے یزید کے کفر پر بحثیں کیں ہیں اور احمد بن حنبل، امام ابن الجوزی، علامہ تفتازانی، علامہ آلوسی اور قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تو اسے صراحۃً کافر کہا ہے نیز ابن الجوزی نے یزید پر لعنت کو جائز قرار دینے کے لئے الردُّ علی المتعصب العنید المانع من ذم یزید نامی کتاب بھی لکھی ہے لیکن جمہور اہل سنت والجماعت کا متفقہ فیصلہ یزید کے فاسق ہونے کا ہے اور اکابر واسلاف نفرت کے اظہار کے لیے اس کے نام کے ساتھ بے دولت اور پلید کا لفظ بھی استعمال کرتے رہے ہیں مجدد الف ثانی، عبدالحق محدث دہلوی شاہ عبد العزیز دہلوی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا شمار انہیں علماء میں ہے اس لئے شیعوں کی ضد میں سیدنا حسین، اہل بیت، اہل مدینہ اور اہل مکہ کے اقدام کو غلط

ثابت کرنے کا جو خطرناک مشغلہ محمود عباسی، اور پاکستان میں اس کے گمراہ مریدوں (حبیب الرحمٰن کاندھلوی عظیم الدین محبت وغیرہ) نے اختیار کر رکھا ہے اس کا اہل سنت والجماعت سے کوئی تعلق نہیں وہ سراسر ناصبیوں اور بد دینوں کا شیوہ ہے۔

(۱۴۳/۱) حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ عَبْدَةَ، ثَنَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ، عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِيْ يَزِيْدَ عَنْ نَافِعِ بْنِ جُبَيْرٍ، عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ، اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لِلْحَسَنِ: "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ أُحِبُّهُ، فَاَحِبَّهُ وَاَحِبَّ مَنْ يُحِبُّه" قَالَ: وَضَمَّهٗ اِلٰى صَدْرِهٖ.

فرمایا اے اللہ میں حسن سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت فرما اور ہر اس شخص کو تو اپنا محبوب بنالے جو حسن سے محبت رکھتا ہو، راوی کہتے ہیں پھر آپ نے ان کو سینے سے لگایا۔

صحیح بخاری میں اس کا پس منظر بھی موجود ہے حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں خرج النبی ﷺ فی طائفة النهار لا يكلمني ولا أكلمه حتى أتي سوق بني قينقاع، بخاری ہی کے دوسرے طریق میں ہے فانصرف وانصرفت صحیح مسلم میں منقول ہے حتى أتي خباء فاطمة یہاں تک کہ آپ حضرت فاطمہ کے خیمہ پر پہونچے پھر آپ نے فرمایا أثم لكع أثم لكع کیا یہاں بچہ ہے حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں فظننا انه انما تحبسه أمه لأن تغسله وتلبسه سخابا ہم نے محسوس کیا کہ حضرت فاطمہ نے حسن کو روک لیا تاکہ نہلا دھلا کر انہیں مشک وخوشبو کا ہار پہنا دیں اس کے بعد جب وہ باہر آئے تو آپ نے انہیں سینے سے لگا کر وہ کلمات ارشاد فرمائے جن پر حدیث باب مشتمل ہے۔

﴿وأحب من يحبه﴾ امام نووی فرماتے ہیں فيه حث على حبه وبيان لفضيلته رضي الله عنه[1] حدیث میں حسن کی فضیلت کا بیان اور ان سے محبت کرنے کی ترغیب ہے ملا علی قاری نے لکھا ہے اللهم اجعلنا من محبيه ومواليه ولا تجعلنا من مبغضيه ومعاديه فان محبوب المحبوب محبوب[2] اے اللہ ہمیں بھی حسن کا عاشق وہمنوا بنادے ان کا دشمن اور بغض رکھنے والا نہ بنا کیونکہ محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوتا ہے خود اسی حدیث کے راوی حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں فما كان أحد أحب الي من الحسن بن

[1] شرح مسلم ۲/۲۸۲
[2] مرقاۃ المفاتیح ۱۱/۳۷۹

علی بعد قال لی رسول اللہ ﷺ ما قال[1] اس کے بعد سے حسن میرے لیے سب سے زیادہ محبوب ہو گئے۔

﴿وضمه الی صدره﴾ امام نوویؒ فرماتے ہیں فیه استحباب ملاطفة الصبی ومداعبته رحمة لهم ولطفا واستحباب التواضع مع الاطفال وغیرهم[2] حدیث میں پیار و شفقت کے طور پر بچے کو گلے لگانا اور اس سے کھیلنے کا استحباب نکلتا ہے نیز بچوں وغیرہ کے ساتھ گھل ملنا مستحب ہے رسول کی یہ دعا ضرور قبول ہوئی ہوگی اس لئے جو اللہ کا محبوب بننا چاہتا ہے وہ اپنے سینے میں حسن کی محبت کو بسا لے۔

حدیث بخاری (بیوع/ ۴۸، لباس/ ۵۸) صحیح مسلم (الصحابۃ/ ۸) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی صحیح ہے پہلے راوی کو چھوڑ کر وہ بعینہٖ بخاری و مسلم کی سند ہے۔

(۱۴۴/۲) حَدَّثَنَا عَلِیُّ بْنُ مُحَمَّدٌ ثَنَا وَکِیْعٌ عَنْ سُفْیَانَ عَنْ دَاوُدَ بْنِ اَبِیْ عَوْفٍ اَبِی الْجَحَّافِ وَکَانَ مَرْضِیًّا عَنْ اَبِیْ حَازِمٍ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَیْنَ فَقَدْ أَحَبَّنِیْ وَمَنْ اَبْغَضَهُمَا فَقَدْ أَبْغَضَنِیْ.

فرمایا جس نے حسن، حسین سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان سے دشمنی کی اس نے مجھ سے دشمنی کی۔

علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے بیان مابینهما وبینه ﷺ من الاتحاد بسبب الجزئیة والکلیة فصار حبهما حبه وبغضهما بغضه، وهٰذا یدل علٰی أن محبتهما فرض لایتم الا یمان بدونها، ضرورة أن محبتهٗ کذلك یعنی رسول اللہ ﷺ اور حضرت حسن ؓ کے درمیان پائے جانے والے اس تعلق کی حدیث میں وضاحت کی گئی ہے جو کل وجز ہونے کی حیثیت سے دونوں کے درمیان موجود ہے تو حسنین کی محبت حضور کی محبت قرار پائی اور ان دونوں سے دشمنی دراصل حضورؐ سے دشمنی ہے یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ ان دونوں سے محبت فرض ہے جس کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوگی کیونکہ وہ حضور ہی کی محبت ہے...... بوصیری نے

---

1. صحیح بخاری ۲/۸۷۴
2. شرح مسلم ۲/۲۸۲

زوائد ابن ماجہ (۶۲/۱) میں لکھا ہے هذا اسناد صحيح رجاله ثقات لیکن سند کے ایک راوی داؤد بن ابی عوف کمزور ہیں عقیلی نے انہیں كان من غلاة الشيعة ازدی نے زائغ ضعیف ابن حبان نے يخطی قرار دیا ہے جب کہ امام نسائی نے ليس به بأس کہہ کر ایک طرح سے ان کی توثیق کی ہے اس لئے ابن حجر فرماتے ہیں صدوق شيعي ربما اخطا من السادسة ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب (۱۷۰/۳) اس لئے بوصیری کے برخلاف الدیباجہ علی ابن ماجہ (۵۷۴/۱) میں اسے حسن لغیرہ قرار دیا گیا ہے جو بذات خود ضعیف ہوا کرتی ہے۔

(۱۴۵/۳) حَدَّثَنَا يَعْقُوْبُ بْنُ حُمَيْدِ بْنِ كَاسِبٍ، ثَنَا يَحْيَى بْنُ سُلَيْمٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُثْمَانَ بْنِ خُثَيْمٍ ، عَنْ سَعِيْدِ بْنِ اَبِيْ رَاشِدٍ ، اَنَّ يَعْلَى بْنَ مُرَّةَ حَدَّثَهُمْ: اَنَّهُمْ خَرَجُوْا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى طَعَامٍ دُعُوْا لَهُ، فَاِذَا حُسَيْنٌ يَلْعَبُ فِي السِّكَّةِ، قَالَ: فَتَقَدَّمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَامَ الْقَوْمِ وَبَسَطَ يَدَيْهِ، فَجَعَلَ الْغُلَامُ يَفِرُّ هَاهُنَا وَهَاهُنَا وَيُضَاحِكُهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى اَخَذَهُ فَجَعَلَ اِحْدَى يَدَيْهِ تَحْتَ ذَقْنِهِ ، وَالْاُخْرَى فِيْ فَاْسِ رَاْسِهِ فَقَبَّلَهُ وَقَالَ: حُسَيْنٌ مِنِّي وَاَنَا مِنْ حُسَيْنٍ، اَحَبَّ اللّٰهُ مَنْ اَحَبَّ حُسَيْنًا، حُسَيْنٌ سِبْطٌ مِنَ الْاَسْبَاطِ.

صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ ایک کھانے کی تقریب میں شرکت کے لئے نکلے جس میں وہ مدعو تھے تو اچانک دیکھا کہ حسین گلی میں کھیل رہے ہیں راوی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ صحابہ سے آگے بڑھ گئے اور ہاتھ پھیلا دیئے تو وہ بچہ ادھر ادھر بھاگنے لگا رسول اللہ ﷺ اس کو ہنساتے رہے یہاں تک کہ آپ نے اس کو پکڑ لیا پھر ایک ہاتھ ان کی ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور دوسرا آپ نے ان کے سر کے نچلے حصہ پر رکھ کر انہیں بوسہ دیا پھر فرمایا حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں اللہ اس شخص سے محبت فرمائے جو حسین سے محبت کرے حسین نواسوں کے نواسے ہیں۔

﴿حسين منی و انا من حسين﴾ محاورے میں اس کا صحیح مفہوم ہے حسین میرے ہیں اور میں حسین کا ہوں شرح حضرت علیؓ کے ترجمے میں گذر چکی ہے۔

﴿أحب اللّٰه من احب حسيناً﴾ ملا علی قاری فرماتے ہیں فان محبته محبة الرسول ومحبة الرسول محبة اللّٰه حسین کی محبت رسول کی محبت ہے اور رسول کی محبت اللہ کی محبت ہے۔

﴿حسين سبط من الأسباط﴾ اس کی شرح میں چند اقوال منقول ہیں (۱) سبط یہاں قبیلے کے معنی میں ہے والمقصود الاخبار فی بقائہ وکثرۃ اولادہ (۲) المراد أنه امة من الأمم فی الخير یعنی سورۂ ہود ۶۵ میں ان ابراهيم كان امة کی طرف حضرت حسین کو بھی ایک امت قرار دیا ہے (۳) علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں انه حقيق بذلك واهل له یعنی وہ نواسہ ہونے کے مستحق اور اس کے اہل ہیں ورنہ صلبی اولا د ہونے کے باوجود حضرت نوح کے بیٹے کو انه ليس من اهلك کہہ دیا گیا مذکورہ تینوں توجیہ اہمیت کی حامل ہیں لیکن ذوق ایک چوتھی توجیہ کا بھی تقاضہ کرتا ہے وہ یہ کہ سبط کو نکرہ تعظیم و تفخیم کے لئے لایا گیا ہے جیسا کہ لا تزال طائفة من امتی میں ہے اور مطلب یہ ہوا کہ وہ روئے زمین کے تمام نواسوں میں سب سے عظیم و بلند مقام نواسے ہیں.......... حدیث جامع ترمذی مناقب حسنین میں بھی آئی ہے اور مصنف نے اسے حسن قرار دیا ہے جب کہ بوصیری نے هذااسناد حسن، رجاله ثقات کہا ہے۔

(۱۴۶/۴) حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ عَلِيِّ الْخَلَّالُ وَعَلِيُّ بْنُ الْمُنْذِرِ قَالَا حَدَّثَنَا اَبُوْغَسَّانَ ثَنَا اَسْبَاطُ بْنُ نَصْرٍ عَنِ السُّدِّيِّ عَنْ صُبَيْحٍ مَوْلٰى اُمِّ سَلْمَةَ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَلِيٍّ وَفَاطِمَةَ وَالْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ أَنَا سِلْمٌ لِمَنْ سَالَمْتُمْ وَحَرْبٌ لِمَنْ حَارَبْتُمْ

رسول اللہ ﷺ نے علی فاطمہ، حسن اور حسین سے کہا میری اس سے صلح ہے جس سے تم نے صلح کر لی اور اس شخص سے جنگ ہے جس سے تم نے جنگ کی۔

علامہ سندھی نے سلم کا ترجمہ مصالح اور حرب کا محارب کیا ہے اور مصدر کو رجل عدل کی طرح مبالغہ کے لئے لایا گیا ہے اگر اہل بیت ہونے کی حیثیت سے کوئی شخص ان سے جنگ کرے تو یہ حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہوگی بصورت دیگر اس کی تاویل شدت

وغلطت سے کی جائے گی اور امیر معاویہ وغیرہ پر اس کا اطلاق نہیں ہوگا کیونکہ ان کے موقف کی بنیاد بھی کتاب وسنت کے دلائل پر تھی اور مطلقا وہ محارب نہ تھے حدیث جامع ترمذی مناقب فاطمہ میں بھی آئی ہے اور مصنف نے اسے حدیث غریب قرار دیا ہے، دونوں کی سند میں اسباط بن نصر اور سعدی دو راوی ضعیف ہیں، حافظ نے پہلے کوئی صدوق کثیر الخطاء یغرب من الثامنه اور دوسرے کو صدوق یهم ورمی بالتشیع من الرابعة قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو تقریب (۳۲۱-۳۶۳) اسلئے الدیباجہ (۱/۵۷۹) میں اسے حسن لغیرہ قرار دیا گیا ہے۔

فضل عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ

نام عمار کنیت ابوالیقظان والد کا نام یاسر اور ماں کا نام سمیہ تھا یاسر نسلاً قحطانی اور وطناً یمنی تھے اپنے بھائی کی تلاش میں وہ مکہ آئے اور یہیں اقامت کر لی بنومخزوم سے حلیفانہ تعلق پیدا ہوا اور حذیفہ بن المغیرہ المخزومی کی لونڈی سمیہ سے ان کی شادی ہوئی حضرت عمار انہیں کے بطن سے پیدا ہوئے اور ابوحذیفہ نے انہیں بچپن میں آزاد کر دیا صہیب رومی کے ساتھ بالکل شروع میں مسلمان ہوئے اسوقت ظاہراً سات اور حقیقتاً تیس آدمی ایمان لا چکے تھے، عمار اور ان کے والدین کیونکہ غریب الدیار تھے اس لئے مشرکین مکہ نے انہیں ہی سب سے زیادہ مشقِ ستم بنایا حتی کہ ان کے والدین ان سختیوں کو برداشت نہ کر سکے اور یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے سمیہ ابوجہل کے نیزے سے شہید ہوئیں اور یاسر کو مشرکوں کی تکلیفوں نے جاں بحق کیا غالباً عمار نے پہلے حبشہ ہجرت کی اور پھر مدینہ منورہ کی طرف رختِ سفر باندھا یہاں مبشر بن عبدالمنذر کے مکان پر اقامت کی اور مواخات حذیفہ بن الیمان سے ہوئی مسجد نبوی کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بدر سے تبوک تک تمام غزدوں میں وہ شریک رہے وفات نبوی کے بعد دور صدیقی کی اہم جنگوں میں حصہ لیا اور عہد فاروقی ۲۰ ہجری میں انہیں کوفے کا والی بنایا گیا یہ ذمہ داری انہوں نے نو سال تک نبھائی پھر کوفہ والوں کی شرارت سے انہیں اس عہدے سے معزول کر دیا گیا عہد عثمانی میں شورش و ہنگامہ کی تحقیق کے لئے جو مجلس قائم ہوئی تھی اس کے ایک رکن عمار بھی تھے انہیں حضرت عثمان کے طرز حکومت اور عمال کے کردار سے سخت اختلاف تھا خلیفہ ثالث کی

شہادت کے بعد انہوں نے حضرت علیؓ کی بیعت کی اور جنگ جمل اور جنگ صفین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور صفین میں ہی انکی شہادت ہوئی جس سے حق وناحق کا فیصلہ ہوگیا اور بہت سے صحابہ حضرت علیؓ کے حامی ہوگئے حضرت علیؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اس وقت ان کی عمر ۹۱ سال تھی وہ نہایت بلند وبالا، آنکھیں نرگسی چوڑا سینہ، اور خوب بھرے ہوئے بدن کے مالک تھے بوقت شہادت گرچہ دسویں دھائی میں داخل ہوچکے تھے تاہم بڑھاپے کے آثار پھر بھی بہت کم تھے۔

(۱/۱۴۷) حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ، وَعَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، قَالَا: ثَنَا وَكِيعٌ، ثَنَا سُفْيَانُ عَنْ اَبِيْ اِسْحَاقَ، عَنْ هَانِي بْنِ هَانِي عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ قَالَ: كُنْتُ جَالِساً عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَى اللّٰهُ وَسَلَّمَ فَاسْتَأْذَنَ عَمَّارُ بْنُ يَاسِرٍ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ائْذَنُوْا لَهُ مَرْحَبًا بِالطَّيِّبِ الْمُطَيَّبِ.

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ہم حضور ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ عمار بن یاسر نے اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا انہیں اجازت دو خوش آمدید ہے نیک فطرت اور پاکباز کے لئے۔

﴿الطیب﴾ فعیل کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے اور مطیب تفعیل سے مفعول ہے پہلے کے معنی پائداری کے ساتھ صاف اور عمدہ ہیں جب کہ دوسرے کا مطلب ہے وہ شخص جس کو پاک وصاف اور عمدہ فطرت کا بنایا گیا ہو ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں فیه مبالغة كظل ظليل حدیث میں بھی و اجعله هاديا مهديا اسی کی مثال ہے علامہ سندھیؒ نے اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں كأنه جبل على الاستقلال والسلامة ثم زاد الله تعالىٰ ذلك بما اعطاه من علم الكتاب والسنة فقيل الطيب والمطيب گویا انہیں استقامت اور قلب کی سلامتی پر پیدا کیا گیا پھر کتاب وسنت کا علم عطا کر کے اللہ نے ان صفات کو اور زیادہ مستحکم کر دیا اسی بناء پر ان کو الطيب المطيب کہا گیا ہے شیخ عبدالحق نے اسی مفہوم کو ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے لعله اشارة على جوهر ذاته طاهر طيب ثم طيبه وهذبه الشرائع والعمل بها وصار نوراً على نور شاید یہ ان کی خلقت کے پاک وروشن ہونے کا اشارہ ہے، پھر شریعت اور اعمال صالحہ نے اسے مزید جلا بخشی اور وہ سونے پر سہاگہ ہوگئے۔

امام ترمذی نے مناقب عمار میں حدیث باب کو نقل کر کے اسے "حسن صحیح"

قرار دیا ہے لیکن یہ رائے محل نظر ہے کیونکہ دونوں کی سند میں ہانی بن ہانی ، ایک راوی ہے جس کو ابن مدینی ، امام شافعی ، ابن حجر اور محدثین کی جماعت نے مجھول و مستور قرار دیا ہے اس لئے الدیباجہ علی ابن ماجہ (۱/۵۸۲) میں اسے اسنادہ ضعیف کہا گیا ہے۔

(۲/۱۴۸) حَدَّثَنَا نَصْرُ بْنُ عَلِيِّ الْجَهْضَمِيُّ، ثَنَا عَثَّامُ بْنُ عَلِيٍّ عَنِ الْأَعْمَشِ ، عَنْ اَبِيْ اِسْحَاقَ عَنْ هَانِئِ بْنِ هَانِئٍ قَالَ: دَخَلَ عَمَّارٌ عَلٰى عَلِيٍّ فَقَالَ: مَرْحَبًا بِالطَّيِّبِ الْمُطَيَّبِ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مُلِئَ عَمَّارٌ اِيْمَانًا اِلٰى مُشَاشِهِ .

عمار حضرت علی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا مرحبا اے طیب و مطیب میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے کہ عمار اپنے رگ و ریشہ تک ایمان سے بھرے ہوئے ہیں۔

مشاش کا واحد مشاشة ہے المجعم الوسیط میں اس کے دو معنی لکھے ہیں (۱) رأس العظم اللَّیِّنِ الذی یُمکنُ مَضغُه ہڈی کا وہ آخری ملائم سرا جس کو چبانا ممکن ہو۔

(۲) ما برز من عظم المنكب مونڈھے کی ہڈی کا سب سے اوپری حصہ علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں انه طیب بأصل الخلقة و اللّٰه تعالٰی اراد فیه ذلك بحیث ملأه منه یعنی فطرتاً ہی وہ طاہر و طیب تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمان سے بھر کر طبعی نکوئی میں اضافہ فرمایا گویا ان کے رگ و پے اور جوڑ جوڑ میں ایمان سرایت کر گیا ہے، مجددی فرماتے ہیں: ای دخل الایمان فی قلبه وتفسح فی صدره حتی سری الی عروقه وعظامه فی سائر الجسد، (یعنی ایمان ان کے دل میں داخل ہو کر سینے میں پھیلا پھر جسم کی تمام رگوں اور جوڑوں میں سرایت کر گیا اور یہاں نور ایمان مراد ہے) یہ تعبیر ایمان کے کامل ہونے کی ہے اور اسی کے باعث فتح الباری (۷/۹۱) میں دم عمار ولحمه حرام علی النار ان تطعمه کا اعلانِ نبوی موجود ہے ہانی بن ہانئ کے باعث یہ روایت ضعیف ہے لیکن امام نسائی نے کتاب الایمان باب تفاضل اھل الایمان کے تحت اسے اسحاق بن منصور وعمرو بن علی عن عبد الرحمن قال حدثنا سفیان عن الاعمش عن ابی عمار عن عمرو بن شرحبیل عن رجل من اصحاب النبی صلی اللّٰه علیه وسلم کی سند سے روایت

کیا ہے جو عمدہ طریق ہے اس لئے حدیث کے ثبوت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

(۱۴۹/۳) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ اَبِيْ شَيْبَةَ، ثَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ مُوْسٰى ح وَحَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ وَعَمْرُو بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَاجَمِيْعًا: ثَنَا وَكِيْعٌ، عَنْ عَبْدِ الْعَزِيْزِ بْنِ سِيَاهٍ، عَنْ حَبِيْبِ بْنِ أَبِيْ ثَابِتٍ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "عَمَّارٌ ، مَاعُرِضَ عَلَيْهِ أَمْرَانِ اِلَّااِخْتَارَ الْاَ رْشَدَ مِنْهُمَا"

فرمایا عمار کو جب بھی دو باتیں پیش کی گئیں تو انہوں نے اس صورت کو اختیار کیا جو رشد وہدایت کی زیادہ ضامن ہے۔

﴿الارشد منهما﴾ دوسرے طرق میں اشدهما ، أيسرهما اور اسداهما منقول ہے ملاعلی قاری فرماتے ہیں والأظهر في الجمع بين الروايات أنه كان يختار اصلحهما وأصوبهما في ما تبين ترجيحه والاّ فاختار أيسرهما یعنی تمام روایات میں تطبیق بایں معنی ہوگی کہ ترجیح ظاہر ہونے کی صورت میں وہ اس صورت کو اختیار کرتے تھے جو زیادہ صلاح وصواب پر مشتمل ہو بصورت دیگر دونوں میں آسان کو اختیار فرماتے تھے، جس کی وجہ علامہ سندھیؒ نے لما جُبِلَ عليه من الا ستقامة والسداد لکھی ہے، یعنی وہ فطرۃً سلیم اورراست باز تھے، مجددی نے یہ وضاحت کی ہے، ما كان انفع لنفسه وما كان ارفق لمن تبعه، یعنی جو ان کے لیے مفید ونافع اور دوسرے پیروکاروں کے لیے آسان ہوتی تھی اسی کو اختیار کرتے صحابہ کا بھی عمومی مزاج یہی تھا اور فقہ اسلامی کی تدوین میں اس کو ملحوظ رکھا گیا ہے نیز یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جنگ صفین میں حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا اور حضرت امیر معاویہ غلطی پر تھے، کیوں کہ حضرتؓ عمار نے اس موقع پر حضرت علی کا ساتھ دیا تھا، مجددی فرماتے ہیں: وفيه دليل على ان الرشد مع علي رضى الله عنه في خلافته وان معاويةؓ اخطأ في اجتهاده ولم يكن على الرشد لان عمارا رضى الله عنه اختار مرافقة علي وكان معه يوم صفين حتى استشهدفي تلك الحرب ...... حديث جامع ترمذی مناقب عمار میں بھی موجود ہے مصنف نے اس پر هذا حديث حسن

غریب لا نعرفه الا من هٰذا الوجه من حدیث عبد العزیز بن سیاه کا تبصرہ کیا ہے، جن کو حافظ تقریب (۴۱۰۰) میں صدوق یتشیع کہتے ہیں، جب کہ ابن ماجہ کی سند کو مولانا لطیف الرحمٰن خان بہرائچی نے الدیباجہ (۱/۵۸۵) میں حسن لغیرہٖ قرار دیا ہے۔

فَضلُ سَلمانَ وَاَبی ذَرٍّ والمِقدادِ

حضرت سلمان فارسی

یہ اصفہان کے ایک مجوسی خاندان کے فرد تھے، شروع کا نام مابہ تھا اسلام کے بعد سلمان ہوا حضورؐ نے سلمان الخیر کا لقب دیا آپ کی کنیت ابو عبداللہ تھی اور سلسلہ نسب اس طرح ہے مابہ بن لوذخشان بن مورسلان بن بہبوذان بن فیروز بن سہرک، آپ کے والد زمیندار تھے اسی لئے بہت ناز ونعم میں پلے شروع میں پکے مجوسی تھے اور ہر وقت آتش کدہ کی خدمت میں مشغول رہتے تھے لیکن ایک مرتبہ گرجے میں عبادت کا منظر دیکھ کر وہ عیسائیت کی طرف مائل ہو گئے اور اس کے سرچشمہ کی تلاش میں شام جا کر ایک پادری کے پاس رہنے لگے اس طرح یکے بعد دیگرے وہ موصل، نصیبین اور عموریہ کے پادریوں کی صحبت اٹھاتے رہے آخری پادری کی پیشین گوئی کی بنیاد پر وہ ایک تجارتی قافلے کے ہمراہ نبی آخر الزماں کی تلاش میں نکلے قافلے والوں نے دھوکہ دیا اور انہیں عرب میں غلام بنا کر بیچ ڈالا پھر اسی حالت میں وہ مدینہ منورہ پہنچے ادھر وہاں حضور ہجرت فرما کر تشریف لے آئے تھے حضرت سلمان کو جب اطلاع ہوئی تو انہوں نے آپ سے ملاقات کی اور پادری کی بتائی ہوئی علامات دیکھ کر وہ ایمان لے آئے تفصیلات سیرت ابن ہشام میں موجود ہیں یہود کی غلامی کی وجہ سے بدر واحد میں شریک نہ ہو سکے حضور نے بڑے بھاری معاوضہ پر انہیں آزاد کرایا اور مؤاخاۃ حضرت ابو درداء سے قائم کی سب سے پہلے غزوۂ احزاب میں شریک ہوئے اور انہیں کی تجویز پر کفار کو روکنے کے لئے خندق کھودی گئی پھر تمام غزوات میں ان کی شرکت ہوئی وفات نبوی کے بعد دور صدیقی میں وہ عراق میں رہنے لگے اور عہد فاروقی میں ایران کی فوج کشی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اسی زمانے میں مدائن کے گورنر بنے حضرت سلمان عابد وزاہد اور فیاض وسخی ہونے کے ساتھ حضور سے اتنی قربت رکھتے

تھے، کہ آپ نے سلمان منا اهل البیت کا اعلان فرما کر انہیں اہل بیت میں شامل فرمایا وہ نہایت دراز قامت تھے اور عمر ڈھائی سو سے ساڑھے تین سو کے درمیان ہوئی ان کا انتقال مدائن میں ۳۶ھ یا ۳۷ھ میں ہوا قبر بھی وہیں ہے۔

حضرت مقداد بن عمرو

نام مقداد کنیت ابوالاسود اور والد کا نام عمرو کندی تھا سلسلہ نسب یہ ہے مقداد بن عمرو بن ثعلبه بن مالك بن ربیعه بن ثمامه بن مطرود النهرانی اصل وطن بہرا تھا لیکن ان کے خاندان کے کسی فرد نے قتل وغارت گری کا ارتکاب کیا اس لئے انتقام کے خوف سے پہلے کندہ آئے پھر مکہ مکرمہ آ کر آباد ہو گئے یہاں انہوں نے اسود بن یغوث کے خاندان سے حلیفانہ تعلق پیدا کیا اور اس نے ان کو اپنا متبنیٰ بنالیا چنانچہ عمرو کے بجائے وہ اسود ہی کی کنیت سے مشہور ہوئے مکے کے قیام کے کچھ دنوں بعد ہی توحید کی صدا گونجی جس نے انہیں اپنا شیدائی بنالیا، وہ بالکل ابتدائی زمانہ تھا چنانچہ مشرکین کے ہاتھوں ہر طرح کی پریشانیاں اٹھائیں اسی ظلم وستم سے مجبور ہو کر انہوں نے حبشہ ہجرت کی عین ہجرت مدینہ کے وقت وہاں سے واپس ہوئے بعض دشواریوں کی وجہ سے کچھ دنوں مکہ ہی رہے پھر حضرت عتبہ بن غزوان کے ہمراہ بہت کچھ کھو کر مدینہ پہنچ گئے حضور نے انہیں بنی عدیلہ کے محلے میں رہنے کے لئے جگہ عطا فرمائی حضرت ابی بن کعب کی دعوت پر انہوں نے خود بھی یہیں رہنا پسند کیا غزوۂ بدر کے موقعہ پر حضور نے جب صحابہ سے مشورہ کیا تو شیخین کے بعد تیسری تقریر آپ ہی نے کی تھی، جس سے صحابہ میں سرفروشی کا جذبہ پیدا ہو گیا اور چہرہ انور بھی خوشی سے دمک اٹھا وہ بہترین تیر انداز اور نیزہ باز تھے نیز شہ سواری میں بھی انہیں کمال حاصل تھا محدثین ومورخین کی تصریح کے مطابق بدر میں صرف آپ ہی کے پاس گھوڑا تھا جس کے ذریعہ انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

بدر کے بعد دوسرے تمام غزووں میں شریک رہے ۲۰ ہجری میں جب مصر پر فوج کشی ہوئی تو حضرت عمر نے دس ہزار مجاہدین کی کمک پر جن چار حضرات کو امیر بنایا تھا ان میں سے ایک یہ بھی تھے حضرت مقداد نہایت جفاکش، صاف گو، ملنسار، زندہ دل، حاضر جواب رائے قائم کرنے میں محتاط، اور دیگر محاسن کا مجموعہ تھے، تملق، خوشامدانہ تعریف سے انہیں سخت نفرت تھی

ایسے لوگوں کے منہ میں انہوں نے نبوی ہدایت کے مطابق ایک مرتبہ خاک بھی جھونکی ہے
ذریعہ معاش خیبر کی ایک جاگیر تھی ان کا پیٹ بہت بڑا تھا اس کی جراحت کی گئی جو ناکام ہوئی
اور مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر آپ نے اسی حالت میں انتقال کیا یہ ۳۳ ہجری کا زمانہ تھا
حضرت عثمان نے نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع میں دفن ہوئے عمر ستر برس کی تھی، وہ خوب لحیم شحیم
تھے ابرو پیوستہ اور داڑھی خوبصورت تھی حضور کے چچا زبیر کی صاحبزادی ضباعہ سے ان کی شادی
ہوئی اور پسماندگان میں کریمہ نامی صرف ایک لڑکی چھوڑی۔

(۱۵۰/۱) حَدَّثَنَا اِسْمَاعِيْلُ بنُ مُوْسٰى وَسويدُ بنُ سَعِيْدٍ قَالاَ ثَنَا شَرِيْكٌ
عَنْ اَبِى رَبِيعَةَ الاِيادِىِّ عَنِ ابنِ بُرَيدَةَ عن اَبِيْه قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰه ﷺ
اِنَّ اللّٰه أَمَرَنِىْ بِحُبِّ اَرْبَعَةٍ وَأَخْبَرَنِىْ اَنَّهُ يُحِبُّهُمْ، قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰه مَنْ
هُمْ؟ قَالَ عَلِىٌّ مِنْهُمْ ، يَقُوْلُ ذٰلِكَ ثَلاَثًا وَاَبوذر وسلمان و المِقْدَادُ.

فرمایا مجھ کو اللہ نے چار سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے اور بتایا کہ باری تعالیٰ بھی ان سے
محبت کرتے ہیں پوچھا گیا اے اللہ کے رسول کون ہیں؟ فرمایا ان میں علی بھی ہیں پھر ابوذر،
سلمان اور مقداد ہیں۔

حدیث کے پہلے راوی اسماعیل بن موسیٰ کمزور ہیں اور ان پر شیعیت کا بھی الزام لگا ہے
ابن حجر نے تقریب (۴۹۲) میں لکھا ہے صدوق یخطی ورمی بالرفض امام ترمذی کہتے
ہیں کہ روایت حسن غریب ہے اور وہ صرف شریک ہی کی سند سے مروی ہے...... سیوطی،
حاکم اور مناوی نے حدیث کو گرچہ صحیح کہا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک کمزور درجے کی
روایت ہے اور اس کی داخلی شہادت یہ بھی ہے کہ یہاں صرف انہیں بزرگوں کا تذکرہ کیا گیا
ہے جو شیعوں کے نزدیک بھی محترم ہیں راوی کی شیعیت کے بعد یہ چیز اور اسے مشکوک بنادیتی
ہے بہرحال یہ جلیل القدر بزرگ ہیں اور دیگر صحابہ کی طرح اہل سنت بھی ان سے محبت کرتے
ہیں۔ سند کو الدیباجہ علی ابن ماجہ (۱/ ۵۸۸) میں حسن لغیرہ کہا گیا ہے۔

(۱۵۱/۲) حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ سَعِيْدٍ الدَّارِمِىُّ ثَنَا يَحْيٰى بْنُ اَبِىْ بُكَيْرٍ ثَنا زائدَةُ
بْنُ قُدَامَةَ عَنْ عَاصِمِ بْنِ اَبِى النَّجُوْدِ عن زِرِّ بْنِ حُبَيْشٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْن

مَسْعُوْدٍ قَالَ: "كَانَ اَوَّلَ مَنْ اَظْهَرَ اِسْلَامَهُ، سَبْعَةٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبُوبَكْرٍ وَعَمَّارٌ وَاُمُّهُ سُمَيَّةُ وَصُهَيْبٌ وَبِلَالٌ وَالْمِقْدَادُ فَاَمَّا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَنَعَهُ اللّٰهُ بِعَمِّهِ اَبِيْ طَالِبٍ وَاَمَّا اَبُوْبَكْرٍ فَمَنَعَهُ اللّٰهُ بِقَوْمِهِ وَاَمَّا سَائِرُهُمْ فَاَخَذَهُمُ الْمُشْرِكُوْنَ وَاَلْبَسُوْهُمْ اَدْرَاعَ الْحَدِيْدِ وَصَهَرُوْهُمْ فِي الشَّمْسِ فَمَا مِنْهُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ وَاتَاهُمْ عَلٰى مَا اَرَادُوْا اِلَّا بِلَالًا فَاِنَّهُ هَانَتْ عَلَيْهِ نَفْسُهُ فِي اللّٰهِ وَهَانَ عَلٰى قَوْمِهِ فَاَخَذُوْهُ فَاَعْطُوْهُ الْوِلْدَانَ فَجَعَلُوْا يَطُوْفُوْنَ بِهِ فِيْ شِعَابِ مَكَّةَ وَهُوَ يَقُوْلُ: اَحَدٌ اَحَدٌ"

اسلام کو جن لوگوں نے سب سے پہلے ظاہر کیا وہ سات ہیں، حضور، ابوبکر، عمار، ان کی ماں سمیہ، صہیب، بلال، مقداد، تو حضور آپ کی حفاظت اللہ نے آپ کے چچا ابوطالب کے ذریعہ کی، ابوبکر کی حفاظت ان کے قبیلے نے کی، بقیہ کو مشرکین نے پکڑ کر لوہے کی زنجیریں پہنائیں اور چلچلاتی دھوپ میں پگھلایا۔ ان میں ہر ایک کو مجبوراً وہی کرنا پڑا، جو مشرکین نے چاہا سوائے بلال کے، اللہ کی خاطر جان کی ان کے نزدیک کوئی قیمت نہ تھی اور کفار نے بھی انہیں نرم چارا سمجھا تو پکڑ کر انھوں نے لڑکوں کے حوالے کردیا وہ انھیں لے کر مکے کی گلیوں میں گھومتے تھے اور بلال احد احد کہتے۔

تین سال خفیہ تبلیغ کے بعد جب رسول اللہ ﷺ نے کوہ صفاء پر چڑھ کر توحید کا زوردار آوازہ لگایا تو حسب عادت کفار ومشرکین بھڑک اٹھے اور دین آخر کو دبانے کے لئے انہوں نے تحقیر واستہزاء تنقید و پروپیگنڈہ، بہتان تراشی اور سودے بازی کے ساتھ ظلم وستم کا حربہ بھی استعمال کیا قبائلی نظام میں رسول اللہ ﷺ کی حفاظت بنی ہاشم وابوطالب نے کی جب کہ صدیق اکبر اپنے خاندان بنی تیم کی پناہ میں رہے اس لئے مذاق وایذاء رسانی کے سواء وہ ان کے زیادہ درپے نہ ہوسکے لیکن باقی لوگ جو بیچارے غلام تھے اور قبائلی لحاظ سے ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا تو انہیں مشرکین نے پکڑ کر خوب مشق ستم بنایا انہیں لوہے کی زرہیں پہنا کر چلچلاتی دھوپ میں لٹایا انہیں میں ایک سمیہ ہیں جو ابوحذیفہ کی باندی اور عمار بن یاسر کی والدہ تھیں یہ تینوں بے پناہ

ستائے گئے اور حضور ﷺ نے ان سے فرمایا صبراً یا ال یاسر موعدکم الجنة ابوجہل نے سمیہ کو نیزہ مار کر شہید کر دیا، اور یہ اسلام میں سب سے پہلی شہادت تھی۔

حضرت صہیب رومیؓ

دوسرے صہیب رومی ہیں ان کا نام صہیب بن سنان، کنیت ابویحیٰ اور والدہ کا نام سلمہ بنت قعید تھا اسد الغابہ فی معرفة الصحابة (۳/۳۰) میں حافظ نے ان کا سلسلہ نسب بھی لکھا ہے صہیب بن سنان بن مالك بن عبد عمرو بن عقيل بن عامر بن جندلة بن جذيمه بن كعب بن سعد بن اسلم بن اوس مناة بن النمری بن قاسط بن هذب بن افصى بن دعمى بن جديلةَ بن اسد بن ربيعة بن نزار الربعی النمری لیکن مسند احمد (۱۶/۶) میں مذکور ہے کہ وہ اپنے خاندان اور قوم کو بھول گئے تھے، پھر یہ نسب نامہ کہاں سے آیا یہ غور و فکر کا موضوع ہے اصلی وطن موصل کا ایک گاؤں ہے جولب دجلہ یا الجزیرہ میں واقع تھا ان کے والد و چچا کسریٰ کی جانب سے اُبُلَہ کے حاکم تھے جب وہاں رومیوں نے حملہ کیا تو صہیب کو وہ پکڑ کر لے گئے وہیں پل بڑھ کر یہ جوان ہوئے ان کی بہن امیمہ اور چچا لبید نے ہر جگہ تلاشا لیکن ناکام رہے مستدرک حاکم (۳/ ۳۹۷) کی روایت کے مطابق بنی کلب نے خرید کر انہیں مکہ پہنچایا اور ان سے عبداللہ بن جدعان نے لے کر آزاد کر دیا جب کہ طبقات ابن سعد (۱۶۱/۳/۱) کی روایت بتاتی ہے کہ وہ خود بھاگ کر آئے اور عبداللہ سے حلیفانہ تعلق قائم کیا پھر مکہ ہی میں رہے تا آنکہ اسلام ظاہر ہوا انہیں نبوت سے پہلے ہی رسول اللہ ﷺ کی صحبت حاصل تھی عمار بن یاسر کے ساتھ شروع ہی میں مسلمان ہوئے جب کہ رسول اللہ دارالارقم میں مقیم تھے اور صرف ۳۰ آدمی ایمان لائے تھے، بلال و عمار کی طرح انہیں بھی خوب ستایا گیا اور ہجرت کے موقع پر مشرکین نے ان کا سارا مال چھین لیا مدینہ میں وہ سعد بن خیثمہ کے یہاں ٹھہرے اور حارث بن الصمہ کے ساتھ مواخات قائم ہوئی عہد نبوی کے تمام غزوات میں شریک تھے حضرت عمرؓ کی نماز جنازہ پڑھائی اور تین دن تک کارگزار خلیفہ رہے قد پستہ، سرخ چہرہ سر کے بال گھنے اور زبان میں لکنت تھی حضرت صہیب بڑے خوش اخلاق حاضر جواب، صاحب فضل و کمال بذلہ سنج، لطیفہ گو مہمان نواز، غرباء پرور اور نہایت کشادہ دست تھے۔

تیسرے بلال ومقداد تھے اول الذکر کا تعارف آگے آئے گا جب کہ آخر الذکر کا ترجمہ گزر چکا ہے منع کے معنی روکنا حمایت وحفاظت کرنا درع (ج) ادراع ودروع زرہ صھر (فتح) پگھلانا فمامنھم من احد الاوقدواتاھم علی ماارادوا واتی یواتی مواتاۃ موافقت کرنا واطاعت کرنا یعنی ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے رخصت پر عمل کرتے ہوئے ازراہ توریہ مشرکین کی بات مان لی لیکن بلال نے عزیمت پر عمل کیا، مجددی نے لکھا ہے، (ای قد وافقوا المشرکین علی ما ارادوا منھم تقیۃ، والتقیۃ فی مثل ھذہ الحال جائزۃ لقولہ تعالٰی الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان والصبر علی اذَاھُمْ مستحب وقد عملوا علی الرخصۃ وعمل بلال علی العزیمۃ

﴿ھانت علیہ نفسہ﴾ یعنی بلال کے نزدیک اللہ کے راستے میں اپنی جان کی کوئی قیمت نہ تھی اور شہادت پر کمر بستہ تھے، مجددی فرماتے ہیں، (ای حَقَّرَ نَفْسَہٗ فی وَحْدَ انیۃِ اللّٰہ تعالٰی وجعل ھو قتلہ فی سبیل اللّٰہ اَیسَرَ من اجراء کلمۃ الکفر. وھان علی قومہ اور مشرکین مکہ کے نزدیک بلال کی کوئی حقیقت نہ تھی کیونکہ وہ غریب الدیار اور غلام تھے شعب (ج) شعاب پہاڑی راستہ یہ حدیث صحاح میں صرف ابن ماجہ نے روایت کی ہے محدث بوصیری زوائد ابن ماجہ (۶۴/۱) میں کہتے ہیں ھذا اسناد رجالہ ثقات اس لئے روایت صحیح ہے۔

فضائل بلال رضی اللہ عنہ

نام بلال کنیت ابوعبداللہ والد کا نام رباح اور والدہ کا نام حمامہ تھا یہ حبشی نژاد غلام تھے مکہ ہی میں پیدا ہوئے ان کے آقا بنی جمح تھے، یہ بالکل شروع میں ایمان لائے اور اپنے اسلام کا اعلان بھی کر دیا جس کے باعث بڑی مشقتوں کا سامنا ہوا ابوجہل، امیہ بن خلف، اور دیگر مشرکین نے انہیں ایسی تکلیفیں پہنچائیں کہ ان کے تصور ہی سے دل بیٹھنے لگتا ہے جب ظلم حد سے بڑھا تو صدیق اکبر نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا حضور کی اجازت سے مدینہ ہجرت کی اور ابورویحہ عبداللہ بن عبدالرحمن الخثعمی سے مواخاۃ قائم ہوئی مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد اذان کا طریقہ

شروع ہوا تو اسے ادا کرنے کی ذمہ داری حضرت بلال ہی کو دی گئی کیونکہ ان کی آواز نہایت بلند اور دلکش تھی حضرت بلال سفر وحضر ہر موقع پر حضورؐ کے ساتھ رہتے تھے، تمام غزوات میں شریک رہے بدر میں انہوں نے ہی امیہ بن خلف کو تہہ تیغ کیا تھا فتح مکہ کے موقع پر آپ ہی حضور کے ساتھ تھے اور آپ نے ہی کعبہ کی چھت پر اذان دی تھی وفات نبوی کے بعد پور دور صدیقی مدینہ ہی میں گذرا کیونکہ خلیفہ اول نے اپنے سے جدا ہونے کی اجازت نہ دی دور فاروقی میں شام کی مہم میں شریک ہوئے ۱۶ھ میں حضرت عمرؓ نے جب شام کا سفر کیا تو دوسرے صحابہ کے علاوہ مقام جابیہ میں بلال نے ان کا استقبال کیا اور خلیفہ دوم کی فرمائش پر بیت المقدس میں اذان دی پھر شام کے ایک قصبے خولان میں مستقل اقامت اختیار کر لی حضرت ابودرداء کے خاندان میں ان کی شادی ہوئی اسی دوران اپنے ایک خواب کی بنیاد پر روضۂ نبوی کی زیارت کے لئے وہ مدینہ حاضر ہوئے قبر مبارک سے لپٹ کر بہت روئے اور حضرات حسنین کی فرمائش پر مسجد نبوی میں اذان دی نعرہ توحید بلند کرتے ہی لوگوں کو حضور کا دور یاد آ گیا سب رونے لگے اور عورتیں تک بیقرار ہو کر پردوں سے نکل پڑیں۔

حضرت بلالؓ کو حضور کی خصوصی صحبت حاصل رہی ہر وقت کی حاضری کے علاوہ سفر کی رفاقت، عیدین اور استسقاء کے موقع پر بلّم لے کر آگے چلنا اور وعظ و پند کی مجلسوں میں ساتھ ساتھ جانا آپ کا مشغلہ تھا نہایت عابد زاہد اور جہاد کے عاشق تھے ان کا قد لمبا، جسم لاغر، رنگ سیاہ، بال گھنے خمدار اور سفید تھے، حضرت بلالؓ نے متعدد شادیاں کیں اور ان کی بعض بیویاں نہایت معزز گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں لیکن کسی سے اولاد نہیں ہوئی ۲۰ھ میں انتقال ہوا جب کہ عمر ۶۰ سال کی تھی باب الصغیر کے قریب دمشق ہی میں دفن ہوئے قبر آج تک محفوظ و مشہور ہے۔

(۱۵۲/۱) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، ثَنَا وَكِيعٌ، عَنْ حَمَّادِبْنِ سَلَمَةَ عَنْ ثَابِتٍ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَقَدْ اُوْذِيْتُ فِي اللّٰهِ وَمَا يُؤْذَىٰ اَحَدٌ وَلَقَدْ اُخِفْتُ فِي اللّٰهِ وَمَا يُخَافُ اَحَدٌ وَلَقَدْ اَتَتْ عَلَيَّ ثَالِثَةٌ وَمَا لِيْ وَلِبِلَالٍ طَعَامٌ يَا كُلُهُ ذُوْكَبِدٍ اِلَّا مَاوَارٰى اِبِطُ بِلَالٍ.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں جتنا اللہ کے راستہ میں ستایا گیا ہوں کبھی کوئی شخص نہیں

ستایا گیا اسی طرح جتنا مجھے دھمکایا گیا ہے اتنا کوئی شخص نہیں دھمکایا گیا اور تین دن تو ایسے گذرے ہیں کہ میرے اور بلال کے لئے کھانے کی کوئی چیز نہ تھی سوائے اس تھوڑی سی مقدار کے جو بلال کی بغلوں میں چھپی ہوئی تھی۔

تاریخ نبوت ورسالت کے ہر فرد کی طرح رسول اللہ ﷺ کو بھی اپنی قوم سے بڑی تکلیفیں پہنچیں اور آپ کے مخاطبین کا ظلم وستم پہلے زمانوں کی بنسبت بے انتہا شدید وسخت تھا استہزا ومذاق، جھوٹا پروپیگنڈہ، بہتان تراشی، ظلم وزیادتی آپ کی بیٹیوں کو طلاق دلوانا، راستے میں کانٹے بچھانا، مغلظات گالیاں دینا، گھر میں غلاظت ڈالنا، پشت مبارک پر اوجھڑی لاکر رکھنا، چہرہ انور پر تھوکنا، فرزند نبوت کے انتقال پر خوشیاں منانا، سر مبارک پر کوڑا ڈال دینا، طائف میں پتھر مارنا سماجی بائیکاٹ کرنا فقر وفاقہ پر مجبور کرنا، قتل کی سازشیں کرنا، کاشانۂ نبوت کا محاصرہ کرلینا، مکہ سے نکلنے پر مجبور کرنا، مدینہ پر چڑھ چڑھ کر جانا، اور قبائل عرب کو بھڑکا کر حملہ کی دعوت دینا، یہ سب اسی قبیل کے واقعات ہیں۔

﴿ولقدت اتت علی ثالثة الخ﴾ ترمذی میں ثلاثون مابین یوم ولیلة ہے واری مفاعلت سے ہے معنی پیچھے کرنا چھپانا امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ ہجرت سے پہلے کسی سفر کا واقعہ ہے جس میں بلال آپ کے ساتھ تھے، لیکن یہ بات محل نظر ہے سفر میں آخر کھانے کی چیزوں کو بغل میں چھپانے کی کیا ضرورت پیش آئی غالب گمان کے مطابق یہ شعب ابی طالب کا واقعہ ہے جب کہ آپ کو بنو مطلب اور بنو ہاشم کے ساتھ ایک گھاٹی میں پناہ لینی پڑی تھی غلے کی مشرکین نے خصوصا پابندی لگائی تھی اس لئے حضرت بلال مشرکین کے خوف سے کھانے کی چیزیں اپنی بغل میں چھپا کر لے جاتے ہوں گے اسی عرصے میں ایسا وقت بھی آیا ہوگا کہ تین دن یا ترمذی کی روایت کے مطابق تیس دن تک بلال کی قوت لایموت کے علاوہ آپ کو کوئی چیز کھانے کو نہ ملی ہوگی...... یہ روایت سنن اور شمائل ترمذی اور مسند احمد بن حنبل میں بھی آئی ہے سیوطی اور مناوی نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ابن ماجہ میں بھی اس کی سند بالکل صحیح ہے اس سے بلال کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ وہ اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر کس کس طرح سے آپ کو کھانے کی چیزیں پہنچاتے تھے اور خود بھی وہ اس غم میں برابر کے شریک تھے۔

(۱۵۳/۲) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ حَدَّثَنَا أَبُوْ أُسَامَةَ عَنْ عُمَرَ بْنِ حَمْزَةَ عَنْ سَالِمٍ أَنَّ شَاعِرًا مَدَحَ بِلَالَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ فَقَالَ بِلَالُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ خَيْرُ بِلَالٍ فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: كَذَبْتَ لَابَلْ بِلَالُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ خَيْرُ بِلَالٍ.

ایک شاعر نے بلال بن عبداللہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ بلال سب سے بہتر بن بلال ہیں، ابن عمر نے فوراً ٹوکا، تم جھوٹ کہتے ہو، رسول اللہ کے بلال بہترین بلال ہیں۔

مصری محدث احمد شاکر نے مسند احمد کی تعلیق میں اس حدیث کے معنی یہ بیان کئے کہ لغت میں بلال کے معنی تری ونمی کے ہیں لیکن یہاں کنایتاً اس سے جود وسخاء مراد ہے یعنی شاعر انہیں سب سے بڑا فیاض قرار دے رہا ہے اس پر عبداللہ بن عمر کو غصہ آیا اور انہوں نے کہا یہ غلط ہے سب سے بڑے فیاض تو رسول اللہ تھے، محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی علیہ الرحمہ[1] نے اس پر استدراک لکھا کہ یہ مطلب ہرگز نہیں بلکہ پہلے بلال سے مراد عبداللہ بن عمر کے فرزند ہیں ان کا نام بھی بلالؓ تھا اور دوسرے بلال سے مراد بلال بن رباح صحابی اور خادم رسول ہیں یعنی ابن عمر کو حضرت بلال کی ممکنہ توہین بھی گوارہ نہ ہوئی اور انہوں نے شاعر کی تادیب کی کہ وہ ان کے فرزند کو صحابی سے آگے نہ بڑھائے کشف الحاجہ اور تکمیل الحاجۃ میں حدیث کی جو تشریح کی گئی ہے وہ بلاشبہ تسامح ہے۔ سند کی بابت بوصیری زوائد (۶۴/۱) میں لکھتے ہیں هذا اسناد فيه مقال من اجل عمر بن حمزه.

عمر بن حمزہ کو احمد بن حنبل ابن معین نسائی اور ابن حجر نے ضعیف قرار دیا ہے اس لئے روایت درجہ صحت سے گر جاتی ہے الدیباجۃ علی ابن ماجہ (۵۹۶/۱) اسے اسناده ضعيف کہا گیا ہے اور یہی حال مسند احمد کی روایت کا ہے عمر بن حمزہ اس میں بھی موجود ہیں۔

فضائل خباب رضی اللہ عنہ

نام خباب اور کنیت ابوعبد ہے نسب اس طرح ہے خباب بن ارت بن جندب بن سعد بن خزيمة بن كعب بن سعد بن زيد مناة بن تميم زمانۂ جاہلیت میں انہیں پکڑ کر مکہ

[1] ترجمان الاسلام / محدث جلیل نمبر، ص: ۷۴

میں کسی نے بیچ دیا بالکل شروع ہی میں مسلمان ہوئے اور ایمان لانے والوں میں ان کا چھٹا نمبر ہے انکا مکہ میں کوئی پرسان حال نہ تھا اسلیۓ مشرکین کے ہاتھوں انہوں نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں، ایک بار مشرکین مکہ نے انہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹادیا جس سے کمر کی چربی پگھل گئی اور اس پر برص کی طرح سفید داغ ہو گئے، زمانۂ جاہلیت میں لوہاری کا کام کرتے تھے، اور اسلام کے بعد بھی یہی مشغلہ رہا، اسی سلسلے میں ایک مرتبہ ان کا عاص بن وائل پر کچھ قرض ہو گیا جس کی ادائیگی کیلیۓ اس نے نبوت کے انکار کی شرط رکھی جس کو انہوں نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ اگر تو مر کر بھی دوبارہ زندہ ہو جائے تو میں ایمان نہیں ٹھکرا سکتا اس پر اسے تعجب ہوا کہ مرنے کے بعد بھی دوبارہ زندہ ہوں گے اس نے کہا اگر یہی بات ہے تو پھر اسی وقت اپنا قرض لے لینا جس پر سورہ مریم کی آیتیں أفرأيت الذي كفر بأياتنا...... ونرثه ما يقول ويانينا فردا نازل ہوئی جس میں اس کی بیہودہ گوئی پر سخت نکیر کی گئی ہے حضرت عمر کے بہن و بہنوئی کا واقعہ مشہور ہے حضرت خباب ہی انہیں قرآن پڑھاتے تھے اور انہوں نے ہی پردے سے نکل کر حضرت عمر کو یہ خوشخبری سنائی تھی کہ حضور نے تمہارے یا ابوجہل کے ایمان کی اللہ سے دعا کی ہے وہ شاید تمہارے حق میں قبول ہو چکی ہے حضورؐ کے ساتھ انہوں نے مدینہ منورہ ہجرت کی شروع سے اخیر تک تمام غزووں میں شریک رہے۔ ابن حجر نے (تقریب ۱۶۹۸) میں سن وفات ۳۷ھ لکھا ہے ابن حبان صراحت کی ہے کہ یہ سانحہ صفین سے واپسی کے دوران پیش آیا حضرت علی نے جنازہ پڑھا۔

(۱۵۴/۱) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، وَعَمْرُو بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَا: ثَنَا وَكِيعٌ، ثَنَا سُفْيَانُ، عَنْ اَبِي اِسْحَاقَ، عَنْ اَبِي لَيْلَى الْكِنْدِيِّ، قَالَ: جَاءَ خَبَّابٌ اِلَى عُمَرَ، فَقَالَ اُدْنُ، فَمَا أَحَدٌ اَحَقَّ بِهٰذَا الْمَجْلِسِ مِنْكَ اِلَّا عَمَّارٌ، فَجَعَلَ خَبَّابٌ يُرِيْهِ آثَاراً بِظَهْرِهِ مِمَّا عَذَّبَهُ الْمُشْرِكُوْنَ.

حضرت خباب حضرت عمر کے پاس آئے تو انہوں نے کہا کہ قریب آجاؤ کیونکہ اس مسند پر بیٹھنے کا تم سے زیادہ کوئی مستحق نہیں ہے سوائے عمار کے تو حضرت خباب ان کو اپنی پیٹھ کے وہ نشانات دکھانے لگے جو مشرکین کی تعذیب کا نتیجہ تھے۔

طبقات ابن سعد میں بھی یہ روایت موجود ہے لیکن وہاں عمار کے بجائے حضرت عمر نے

بلال کا نام لیا ہے اس پر خباب نے عرض کیا کہ امیر المومنین مجھ سے زیادہ تو بلال بھی مستحق نہیں ہیں کیونکہ مکے میں ان کچھ حامی موجود تھے لیکن میرا تو کوئی بھی پرسان حال نہ تھا اسی لئے ایک مرتبہ انہوں نے مجھے دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا کر ایک شخص کو سینے پر کھڑا کر دیا تا کہ میں حرکت نہ کرسکوں پھر اس کے بعد کرتہ اٹھا کر حضرت خباب نے یہ نشانات دکھلائے حضرت عمر اپنی مجلس میں سابقین اولین کو بہت اہمیت دیا کرتے تھے یہ واقعہ اسی کی دلیل ہے بخاری (۵۱۰/۱) میں حضرت خباب سے منقول ہے۔

شكونا الى النبى ﷺ وهو مُتَوَسِّدٌ بُرْدَةً له فى ظل الكعبة فقلنا الا تستنصر لنا الا تدعو الله لنا قال: كان الرجل فيمن قبلكم يحفر له فى الارض فيجعل فيها فيجاء بالمنشار فيوضع على رأسه فيُشَقُّ باثنين وما يصده عن دينه ويُمْشِطُ بِأمْشَاطِ الحديد مادون لحمه من عظم اوعصب وما يصده ذلك عن دينه والله ليتممن هذا الامر حتى يسير الراكب من صنعاءِ الى حضرموت لايخاف الاّ الله والذئب على غنمه ولكنكم تستعجلون .

ہم نے رسول اللہ ﷺ سے تکلیفوں کی شکایت کی آپ کعبے کے سائے میں اپنی چادر پر تکیہ لگائے ہوئے تھے ہم نے عرض کیا آپ ہمارے لئے مدد طلب نہیں فرماتے؟ دعا نہیں فرماتے ارشاد فرمایا تم سے پہلی امتوں میں ایسا بھی ہوا ہے کہ گڑھا کھود کر ایک شخص کو اس میں ڈالا جاتا پھر سر پر رکھ کر آرہ چلا دیا جاتا اور اس کے دو ٹکڑے کر دیئے جاتے لیکن یہ چیز اسے دین سے پھر بھی نہ روک پاتی اسی طرح لوہے کی کنگھی سے اس کی ہڈیوں اور پٹھوں تک کو چھیل کر گوشت الگ کر دیا جاتا لیکن یہ ظلم بھی اسے دین سے نہ روک پاتا خدا کی قسم یہ دین غالب آکر رہے گا یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا لیکن اس کو اللہ کے علاوہ کسی کا خوف نہ ہوگا اور اپنی بکری پر وہ صرف بھیڑیئے ہی کا اندیشہ کرے گا لیکن تم جلدی کر رہے ہو۔

یہ روایت حدیث باب کی تفصیل و منظر کشی ہے حضرت عمر کے اس اعزاز دینے پر مولانا عبدالغنی مجددی نے انجاح الحاجہ میں لکھا ہے **وفيه جواز المدح فى مواجهة الرجل ان كان لا يخاف على دينه وجواز اظهار بعض الاعمال الصالحة اظهارا للنعم الالهية لقوله**

جل شانه: واما بنعمة ربك فحدث[1]" یعنی اسی کی بابت فخر وغرور کا اندیشہ نہ ہو تو حدیث کی رو سے سامنے بھی اس کی تعریف کی جاسکتی ہے اور تحدیث نعمت کے طور پر اس کے کارناموں کو بیان کیا جاسکتا ہے...... بوصیری نے زوائد (۱/ ۶۵) میں لکھا ہے هذااسناد صحیح .

(۱۵۵/۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى ثَنا عَبْدُالْوَهَّابِ بْنُ عَبْدِالْمَجِيْدِ ثَنَا خَالِدُ الْحَذَّاءِ عَنْ اَبِىْ قِلَابَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اَرْحَمُ اُمَّتِىْ بِاُمَّتِىْ اَبُوْبَكْرٍ وَاَشَدُّهُمْ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ عُمَرُ، وَاَصْدَقُهُمْ حَيَاءً عُثْمَانُ وَاَقْضَاهُمْ عَلِىُّ بْنُ اَبِىْ طَالِبٍ وَأَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ اُبَىُّ بْنُ كَعْبٍ وَاَعْلَمُهُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مَعَاذُ بْنُ جَبَلٍ وَافْرَضُهُمْ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ، اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَمِيناً وَأَمِينُ هَذِهِ الْأُمَّةِ اَبُوْ عُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ.

﴿ارحم امتی بامتی ابوبکر﴾ ملا علی قاری فرماتے ہیں أی اکثرهم رحمةً[2] وہ فطرۃً نرم دل تھے اسی لئے مکہ میں بلال وعمار کی تکلیفیں دیکھ کر انسے نہیں رہا گیا اور سب کو خرید کر آزاد کردیا بدر کے قیدیوں کو انہوں نے قتل کے بجائے فدیہ لے کر چھوڑنے کا مشورہ دیا اور اسی نرم دلی کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تشبیہ دی۔

﴿واشدهم فی امر الله عمر﴾ قاری فرماتے ہیں ای اقواهم فی دین الله[3] زمانہ جاہلیت اور عہد اسلام میں ان کی سختی وپختگی کے واقعات مشہور ہیں۔

﴿وأصدقهم حیاء عثمان﴾ علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے ای اکثرهم حیاء فان الاکثر حیاءً یکون ادق فی اظهار آثاره ان میں سب سے زیادہ شرم وحیاء ہے اور زیادہ باحیا انسان اظہار حیاء میں بھی بہت جھجھکتا ہے۔

﴿واقضاهم علی بن ابی طالب﴾ علامہ سندھی سے نقل کیا ہے، هذه منقبة عظیمة لان القضاء للحق والفصل بینه وبین الباطل یقتضی علماً کثیراً وقوة عظیمة فی النفس یہ عظیم فضیلت ہے کیونکہ صحیح فیصلہ اور حق وباطل کے درمیان فرق کرنا بہت زیادہ علم اور زبردست شخصی طاقت ولیاقت کا تقاضا کرتا ہے، فقہ وفتاوی میں حضرت علی کو امتیاز

---

[1] انجاح الحاجہ [2] [3] مرقاۃ المفاتیح ۱۱/ ۲۶۰ مناقب العشرۃ فصل ۲/ ۲

حاصل تھا وہ ذہانت طبعی اور انتقال ذہنی کی ایسی دولت سے مالا مال تھے کہ مشکل مسائل میں صحابہ بلکہ امیر معاویہ تک ان کی طرف رجوع کرتے تھے حضور نے ان کو یمن کا قاضی بنایا تھا آپ کے فتاوی کا جو ذخیرہ موجود ہے اس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

﴿واقرؤهم لكتاب الله أبی بن كعب﴾ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے اعلمهم بقرائة القرآن[1] یہ انصاری خزرجی تھے ان کا شمار کاتبین وحی میں ہوتا ہے اور ان صحابہ میں وہ بھی شامل ہیں جنہوں نے عہد رسالت ہی میں قرآن کریم کو حفظ کیا ان کی قاریانہ شان ہی کے پیش نظر حضرت عمر نے مسجد نبوی میں انہیں تراویح پڑھانے کے لئے مقرر کیا انیس ہجری میں مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا۔

﴿واعلمهم بالحلال والحرام معاذ بن جبل﴾ خزرجی صحابی ہیں بیعت عقبہ سے لے کر تمام غزوات میں شریک ہوئے رسول اللہ ﷺ نے علمی وفقہی حیثیت کے پیش نظر انہیں بھی یمن کا قاضی بنا کر بھیجا اور جن چار سے صحابہ کو آپنے قرآن سیکھنے کا حکم دیا ان میں ایک وہ بھی شامل ہیں ۳۸ سال کی عمر پا کر ۱۸ ہجری میں عمواس کے طاعون میں انتقال فرمایا۔

﴿وأفرضهم زيد بن ثابت﴾ ملا علی قاری اور علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے ای اکثرهم علماً بالفرائض[2] حدیث میں فرائض کو نصف العلم کہا گیا ہے یہ اس کے امام تصور کئے جاتے تھے اور کتابوں میں ان کی قیمتی رائیں آج بھی ملتی ہیں ۴۵/ہجری میں انتقال ہوا۔

﴿ألاوان لكل امة اميناً﴾ حضرت ابوعبیدہ کے ترجمہ میں شرح گذر چکی ہے روایت کا ترجمۃ الباب کے مطابق حضرت خباب سے کوئی تعلق نہیں، شیخ مجددی کے نزدیک یہاں شاید کوئی مستقل باب تھا جو چھوٹ گیا ہے ورنہ اس کے علاوہ کوئی توجیہ معقول نہیں ہے......امام ترمذی نے حدیث کو (مناقب/۲۴) میں ذکر کر کے اسے غریب قرار دیا ہے جب کہ ابن ماجہ کی سند عمدہ ہے اور اس سے غرابت بھی دور ہو جاتی ہے۔

حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا وَكِيعٌ، عَنْ سُفْيَانَ عَنْ خَالِدِ الْحَذَّاءِ عَنْ اَبِي قِلَابَةَ مِثْلَهُ حدیث کی سند عمدہ[3] ہے شرح گذر چکی ہے۔

---

۱ ۲ مرقاۃ المفاتیح ۱۱/۲۶۰ مناقب العشرۃ فصل ۲/۲

فضل ابی ذر رضی اللہ عنہ

نام جندب، کنیت ابوذر لقب مسیح الاسلام ہے والد کا نام جنادہ اور ماں کا نام رملہ تھا، وہ قبیلۂ غفار سے تعلق رکھتے تھے، یہ قبیلہ ڈاکہ زنی میں مشہور تھا اس لئے ابوذر کا بھی جاہلیت میں یہی پیشہ تھا لیکن جلد ہی وہ خدا پرستی کی طرف مائل ہوئے اور ظہور اسلام سے پہلے ہی انہوں نے اپنی اصلاح کرنی شروع کردی، صحیح بخاری باب اسلام أبی ذر کے مطابق خدمت نبوی میں حاضری سے پہلے انہوں نے رات میں عبادت کرنی شروع کردی تھی جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی خبر پہنچی تو صحیحین کی حدیث کے مطابق انہوں نے تحقیق کے لئے پہلے اپنے بھائی حضرت انیس کو مکہ بھیجا پھر ان کے بیان پر جب مطمئن نہ ہوئے تو خود حرم میں آپہنچے خود حضور کو پہچانتے نہ تھے اور کسی سے دریافت کرنا مناسب نہ تھا تا آں کہ حضرت علی سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے خاموشی سے انہیں دربار رسالت میں پہنچادیا اسی وقت ایمان لے آئے آپ نے انہیں وطن پہنچ کر دعوت کے کام پر مامور کیا کہ جب ہمارے غلبہ کا علم ہو تو چلے آنا لیکن انہوں نے علانیہ حرم میں توحید کا اعلان کیا جسے سن کر لوگوں نے انہیں بری طرح مارا حضرت عباس نے بمشکل بچایا دوسرے دن بھی وہی منظر دکھائی دیا رسول اللہ ﷺ نے انہیں جب اس سے منع کیا تو انہوں نے طبرانی کی روایت کے مطابق عرض کیا انہ لا بد منہ و ان قتلت یعنی اعلان تو ضرور ہوگا خواہ مجھے قتل کردیا جائے صحیح مسلم باب فضائل ابی ذر کی روایت کے مطابق جب وہ وطن پہنچے تو اس وقت ان کی والدہ اور بھائی بھی مسلمان ہوگئے اس طرح تاریخ کے وہ پانچویں مسلمان کہلائے ان کی کوشش سے قبیلۂ غفار اور قبیلۂ اسلم کے لوگ بھی مسلمان ہوگئے جس پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں غفر اللہ لها واسلم سالمها اللہ کا پروانہ دیا جامع ترمذی کی حدیث میں آپ نے ان کو ابو ذر یمشی بزهد عیسی بن مریم فرمایا غزوۂ احد کے بعد مدینہ حاضر ہوئے تبوک کے علاوہ کسی غزوہ میں شرکت کی تفصیل نہیں ملتی شیخین کے دور میں شام جا کر بس گئے لیکن آپ کے زہد اور غیرت کی بناء پر انتشار ہوا تو حضرت عثمان نے انہیں مدینہ بلالیا یہاں بھی وہی صورت حال پیش آئی نیتجۃً ''ربذہ'' میں جا کر رہنے لگے آپ لمبے

سیاہی مائل تھے ڈاڑھی گھنی اور بال سب سفید ہو چکے تھے ۳۱ ہجری میں وہیں انتقال فرمایا اتفاقاً صحابہ وتابعین کی ایک جماعت وہاں پہنچ گئی حضرت عبداللہ بن مسعود نے نماز جنازہ پڑھا کر انہیں سپرد خاک کیا اولاد حضرت کی کوئی نہ تھی۔

(۱/۱۵۶) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ نُمَيْرٍ ثَنَا الْاَعْمَشُ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عُمَيْرٍ، عَنْ اَبِيْ حَرْبِ بْنِ اَبِي الْاَسْوَدِ الدَّيْلِيْ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ : "مَا اَقَلَّتِ الْغَبْرَاءُ وَلَا اَظَلَّتِ الْخَضْرَاءُ مِنْ رَجُلٍ اَصْدَقَ لَهْجَةً مِنْ اَبِيْ ذَرٍّ"

زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے ابوذر سے زیادہ کھری بات کہنے والا کوئی نہیں ہے۔

جامع ترمذی میں آخر میں ولا اوفی من ابی ذر شبه عیسی بن مریم یعنی فی الزهد کا بھی اضافہ ہے۔

﴿ما اقلت الغبراء﴾ قل قلة (ض) معنی کم ہونا لیکن اگر وہ قلا مصدر سے آئے تو اس کے معنی اٹھانے اور بلند کرنے کے ہوتے ہیں یہاں اس کا استعمال باب افعال میں ہوا ہے جس میں دونوں معنی کی گنجائش ہے قرآن کریم نے بھی اس کو دوسرے معنی میں استعمال کیا ہے حتی اذا اقلت سحابا ثقالا. غبراء اغبر کا مؤنث ہے معنی زمین وجہ تسمیہ یہاں گرد وغبار کا ہونا ہے۔

﴿ولا اظلت الخضراء﴾ اظل افعال سے ہے معنی سایہ کرنا اوپر ہونا خضراء اخضر کا مؤنث ہے آسمان کو کہتے ہیں اس سے پہلے قبة محذوف مانا گیا ہے ماہرین لغت کے نزدیک وجہ تسمیہ آسمان کا نیلا وسرسبز ہونا ہے۔

﴿من رجل﴾ امام طیبی ملا علی قاری اور علامہ سندھیؒ نے من کو زائد قرار دیا ہے اور رجل اقلت کا مفعول ہے لهجة کی وضاحت علامہ سندھیؒ نے اللسان وما ینطق به من الکلام یعنی زبان اور گفتگو کا آلہ ومقام سے کی ہے۔

﴿اصدق لهجة من ابی ذر﴾ شیخ مجددی فرماتے ہیں کہ تنازع فعلین کے طریقہ پر اصدق مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے، علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں المراد به انه بلغ

فی الصدق نهایته والمرتبة الا علی یعنی وہ صدق وبلندی کے آخری مقام تک پہنچ گئے ہیں شیخ عبدالحق محدث دہلوی اس کی مزید وضاحت کرتے ہیں المراد انه لا یذهب الی التوریة والمعاریض فی الکلام ولا یواسی مع الناس ولا یسامحهم فی الحق ویقول الحق ان کان مرا[1] مجددی کہتے ہیں: وفیه فضیلة له بانه کان ناطقا بالحق لا یخاف فی الله لومة لائم یعنی گفتگو میں وہ توریہ کے بھی قائل نہیں ہے نہ منہ دیکھی بات کرتے ہیں نہ حق کے مسئلہ میں لوگوں کو کوئی رعایت دیتے ہیں وہ حق کہتے ہیں چاہے کڑوا ہو اور اس میں وہ کسی ملامت سے نہیں ڈرتے، الغرض ظاہر وباطن یکساں ہے۔

حدیث امام ترمذی نے مناقب ابی ذر میں دو سندوں سے نقل کی ہے پہلی کو حسن اور دوسری کو انہوں نے غریب قرار دیا ہے پہلے راوی کو چھوڑ کر دونوں کا سلسلہ یکساں ہے اور ایک راوی عثمان بن عمیر بے حد کمزور ہیں امام احمد نے انھیں منکر الحدیث دارقطنی نے متروك لم یحتج به ابن حبان نے اختلق حتی کان لا یدری مایقول لا یجوز الا حتجاج به، ابن عدی نے ردئ المذهب غال فی التشیع یومن بالرجعة ویکتب حدیثه مع ضعفه، اور ابن حجر نے تقریب (۴۵۰۷) میں ضعیف واختلط وکان یدلس ویغلو فی الشیخ قرار دیا ہے جس کی رو سے سند حد درجہ ضعیف ہو جاتی ہے اور ترمذی حاکم، مسند احمد اور ابن حبان کے طرق کی بنا پر وہ حسن لغیرہ کہی جا سکتی ہے۔

فضل سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ

انصار کے اصولا دو قبیلے تھے اوس وخزرج، پہلے کے سردار سعد بن معاذ اور دوسرے کے سعد بن عبادہ تھے بیعت عقبہ کے بعد جب مصعب بن عمیر کو رسول اللہ ﷺ نے معلم بنا کر بھیجا تو انہی کے ہاتھ پر سعد بن معاذ نے اسلام قبول کیا اور بنی اشہل کو مخاطب کر کے کہا کہ تمام مردوں اور عورتوں سے اس وقت تک میری بات چیت حرام ہے جب تک تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لاتے چنانچہ اصیرم کو چھوڑ کر شام تک ان کا پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا انہوں

[1] المعات بحوالہ ترمذی ۲/۲۲۰ حاشیہ ۶

نے بدر، احد، اور خندق میں شرکت کی غزوہ خندق ہی میں ان کے حبان بن عرقہ نامی ایک قریشی مشرک کا تیر لگا جس سے ہاتھ کی شہ رگ کٹ گئی صحیح بخاری (۵۹۱/۲) کے مطابق انہوں نے دعاء مانگی۔ اللہ آپ جانتے ہیں کہ مجھے سب سے زیادہ آپ کی راہ میں اس قوم سے لڑنا محبوب ہے جس نے تیرے رسول کو جھٹلایا اور اسے مکے سے نکالا میرا خیال ہے کہ اب ہماری ان سے جنگ ختم ہو چکی اگر قریش سے جنگ باقی ہے تو مجھے زندہ رکھ تاکہ میں ان سے جہاد کروں اگر جنگ ختم ہو چکی تو اس زخم کو بہادے اور اسی میں مجھے موت دیدے۔

اللّٰهم انك تعلمُ انه ليس احدٌ احبَّ الي ان اجاهدَهم فيك من قوم كذّبوا رسولك واخرجوه اللّٰهم فاني اَظُنُّ انك قد وضعتَ الحربَ بيننا وبينهم فان كان بقي من حرب قريش شئ فَاَبْقِنيْ لهم حتى اجاهدهم فيك وان كنت وضعت الحرب فافجرها واجعل موتتي فيها ابن ہشام (۲۲۷/۲) میں اتنا اضافہ ہے کہ مجھے اس وقت تک موت نہ دے جب تک بنی قریظہ کے معاملے میں میری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہوں چنانچہ غزوہ بنی قریظہ میں یہودیوں نے انہی کو حکم بنایا وہ مدینہ میں تھے گدھے پر سوار ہو کر آئے اور مردوں کو قتل، عورتوں اور بچوں کو قیدی اور اموال کو غنیمت بنانے کا فیصلہ کیا رسول اللہ ﷺ نے اسے الٰہی فیصلہ قرار دیا زندگی کے آخری دنوں میں حضور نے ان کا خیمہ مسجد نبوی ہی میں لگوادیا تاکہ عیادت آسانی سے کرسکیں بالآخر زخم پھوٹ پڑا اور اسی میں ان کی موت واقع ہوگئی یہ ذی القعدہ ۵ھ کے اواخر کا واقعہ ہے انہیں بقیع میں دفن کیا گیا تدفین کے بعد خود رسول اللہ ﷺ کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی صحابہ کو ان کی موت کا ایسا صدمہ ہوا جو شاذونادر ہی کسی کی وفات پر ہوا ہوگا حضرات شیخین تک رو رہے تھے جنازے میں ۷۰ ہزار فرشتوں نے شرکت کی اور ان کی والدہ کبشہ صحابیہ نے بڑا دلدوز مرثیہ کہا، عمر ۳۷ سال ہوئی۔

(۱۵۷/۱) حَدَّثَنَا هَنَّادُ بْنُ السَّرِيِّ ، ثَنَا اَبُوْ الْاَحْوَصِ ، عَنْ اَبِىْ اِسْحٰقَ عَنِ الْبَرَاءِ بنِ عَازِبٍ قال اُهدِيَ لِرَسولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَليهِ وَسلمَ سَرَقَةٌ مِن حَرِيرٍ فَجَعَلَ الْقَوْمُ يَتدَا وَلُوْنَهَا بَيْنَهُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "اَتَعْجَبُوْنَ مِنْ هٰذَا؟" فَقَالُوْا لَهُ : نَعَمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ:

"وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ! لَمَنَادِیْلُ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ فِی الْجَنَّةِ خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا"

حضرت براء کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کو بطور ہدیہ ایک ریشم کا حلہ پیش کیا گیا تو صحابہ کرام اسے چھو چھو کر دیکھ رہے تھے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم کو یہ اچھا لگ رہا ہے صحابہ نے کہا جی ہاں اے اللہ کے رسول تو آپ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے جنت میں سعد بن معاذ کے رومال و تولئے اس سے زیادہ عمدہ اور ملائم ہیں۔

غزوۂ تبوک میں جب رسول اللہ ﷺ نے دفاع کے بجائے رومیوں کے خلاف اقدامی پوزیشن اختیار کی تو اس سے نہ صرف رومی مرعوب ہوئے بلکہ سرحدی قبائل نے قیصر سے ناطہ توڑ کر اسلام کی باجگذاری اختیار کر لی، انہی میں دومۃ الجندل کا فرمانروا اکیدر تھا اسے خالد بن ولید گرفتار کر کے لائے اس نے دو ہزار اونٹ آٹھ سو گھوڑے، چار سو زرہیں اور چار سو نیزوں کی ادائیگی پر صلح کر لی حدیث باب میں مذکور ریشم کا حلہ اسی اکیدر کی طرف سے ہدیہ کیا گیا تھا بخاری میں صراحت ہے ان اُکَیْدَر دَومَۃَ اَھْدٰی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم.

تو تاریخی اعتبار سے یہ حضرت سعد کی وفات کے پانچ سال بعد کا واقعہ ہے۔(سرقة) معنی ریشم کا ٹکڑا صحیحین کی ایک روایت میں جبة سندس اور دوسری میں حلة سریر منقول ہے جب کہ بخاری کے دوسرے طریق میں وضاحت ہے جبة من دیباج منسوج فیھا الذھب فلبسھا رسول اللہ ﷺ فصعد المنبر فقام او قعد اس کے بعد صحابہ کے لمس و تعجب کی وہ صورت پیش آئی جس کا روایات میں تذکرہ ہے علامہ سندھی نے لکھا ہے فخاف النبی ﷺ المیل فی الدنیا فزھد فیھا ورغبھم فی الاٰخرة بما قال یعنی وقتی طور پر صحابہ کا میلان دنیا کی طرف ہو گیا تو آپ نے اس کی حقارت بیان کر کے جنت کی عظمت کا احساس دلایا تا کہ ہمہ وقت ان کی توجہ آخرت ہی کی طرف رہے۔

﴿لمنا دیل سعد بن معاذ﴾ مندیل کی جمع ہے تولیہ جس سے ناک وغیرہ صاف کی جاتی ہے امام نوویؒ نے لکھا ہے قال العلماء ھٰذہ اشارة الٰی عظیم منزلة سعد و ان ادنی ثیابہ ، فیھا خیر من ھٰذہٖ لأن المندیل ادنی الثیاب[1] حدیث سے جنت میں

[1] مسلم ۲/۲۹۵

حضرت سعد کے مقام کی بلندی کا پتہ چلا کہ وہاں ان کا معمولی کپڑا یہاں کے عمدہ کپڑے سے بہتر ہے ملا علی قاری فرماتے ہیں ان ارفع شیٔ من ھٰذہٖ لا یقاوم موضع شیٔ من تلک[1] دنیا کی اعلیٰ درجہ کی چیز وہاں کی ادنیٰ کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

علامہ عینیؒ[2] اور قسطلانیؒ[3] نے بھی حدیث کے ذیل میں یہی لکھا ہے...... حدیث بخاری (ہبۃ/۲۵، بدء الخلق / ۸، مناقب/۷۰، النذور/۳) صحیح مسلم (صحابہ/۲۰) اور ترمذی (لباس/۱، مناقب/۴۲) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی عمدہ ہے۔

(۱۵۸/۲) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا اَبُوْمُعَاوِيَةَ عَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ اَبِيْ سُفْيَانَ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِهْتَزَّ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ عَزَّوَجَلَّ لِمَوْتِ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ .

فرمایا عرش الٰہی سعد بن معاذ کی وفات پر جھوم اٹھا۔

یہاں اهتزاز عرش کا مسئلہ غور طلب ہے حضرت امام مالکؒ نے تو اسے متشابہ قرار دے کر اس کی شرح پر نکیر کی ہے جب کہ متاخرین اس کی توجیہ کے حق میں ہیں اور امام نووی نے اس سلسلے میں چند اقوال نقل کئے ہیں۔

(۱) المراد اهتزاز سرير الجنازة هو النعش یعنی یہ حرکت اس چارپائی میں پیدا ہوئی جس پر میت رکھی تھی۔

(۲) هو كناية عن تعظيم شان و فاته والعرب تنسب الشئ المعظم الى أعظم الأشياء فيقولون اظلمت لموت فلان الارض وقامت له القيامة ان کی وفات کی اہمیت وعظمت کی طرف اشارہ ہے کیوں کہ عرب عظیم چیز کو اعظم الاشیاء کی طرف منسوب کر کے کہتے ہیں فلاں کی موت سے دنیا تاریک ہوگئی اور قیامت آ گئی۔

(۳) المراد اهتزاز اهل العرش وهم حملتهٗ وغيرهم من الملائكة عرش سے مراد اہل عرش اور اس کو اٹھانے والے دیگر فرشتے ہیں۔

---

[1] مرقاۃ المفاتیح ۱۱/۴۱۵ [2] عمدۃ القاری ۲/۲۶۷
[3] ارشاد الساری ۶/۱۵۸

(۴) اِهْتِزَازُ الْعَرْشِ تَحَرُّكُهُ فَرَحاً بِقدومِ رُوحِ سَعدٍ وجعلَ اللّٰه تعالٰی فی العرش تمییزًا حصل به ولا مانع منه كما قال تعالٰی وان منها لما يَهْبِطُ مِنْ خَشيَةِ اللّٰه یعنی حضرت سعد کی روح کی آمد پر وہ خوشی سے جھوم اٹھا کیوں کہ عرش میں احساس ہے جس کے ذریعہ وہ اس واقعے سے متاثر ہوا آیت قرآنی وان منہا الخ اسی کی دلیل ہے امام نووی نے پہلے کو باطل قرار دیا جب کہ دوسرا اور تیسرا قول مرجوح لیکن باوزن ہے اور چوتھی رائے کو امام نووی نے وھو المختار کہا ہے حافظ ابن حجر نے فتح الباری (۱۲۴/۷) میں، علامہ قسطلانی نے ارشاد الساری (۶/ ۱۵۸) میں ملا علی قاری نے مرقاۃ المفاتیح (۴۱۵/۱۱) میں حضرت شیخ سہارنپوریؒ نے الکوکب الدری (۳۳۳/۱) میں اور مولانا عبدالغنی مجددیؒ گنگوہی نے انجاح الحاجۃ میں بھی اسی کی تائید کی ہے...... حدیث صحیح بخاری (مناقب/۷۰) صحیح مسلم (صحابہ/۲۰) ترمذی (مناقب/۴۲) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجۃ کی سند بھی عمدہ ہے۔

فضل جریر بن عبد اللّٰہ البجلی رضی اللہ عنہ

نام جریر اور کنیت ابوعمر تھی، والد عبداللہ تھے یمن کے شاہی خاندان کے فرد اور قبیلہ بجیلہ کے سردار تھے راجح قول کے مطابق رمضان ۱۰ھ میں وہ ایمان لائے اور بیعت کے وقت حضور ﷺ نے ان کے ساتھ بڑے اکرام کا معاملہ فرمایا غزوات تو سب نمٹ چکے تھے اس لئے انہیں صرف حجۃ الوداع میں آپ کی صحبت کا موقع ملا اور خطبے کے موقع پر مجمع کو خاموش کرنے کی خدمت انہیں کے سپرد تھی حجۃ الوداع کے بعد حضورؐ نے انہیں ذی الحلیفہ کے کعبۂ یمانی کو ڈھانے کے لئے روانہ فرمایا آپ نے ایکسو پچاس سواروں کے دستے کو لے کر یمن کے اس صنم کدے کو جلا دیا اور حضور ﷺ کی دعاؤں کے مستحق ہوئے۔

وفات کے وقت وہ یمن میں تھے اور اس غم ہائے بیکراں کو سن کر مدینہ منورہ آئے عہد صدیقی خاموشی کے ساتھ گزر الیکن دور فاروقی میں جب ایران پر فوج کشی ہوئی تو وہ میمنہ کے افسر بنائے گئے اور انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اس طرح جنگ یرموک میں بھی آپ پیش پیش رہے اور مدائن کے بعد حلوان کی مہم آپ ہی نے سر کی اس طرح اہواز وتستر کا سہرا بھی

آپ ہی کے سر ہے نیز حضرت عمرؓ نے مسلمانوں اور ایرانیوں کے تاریخی معرکے میں جن چار آدمیوں کو سپہ سالار بنایا تھا ان میں ایک حضرت جریر تھے۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں وہ ہمدان کے گورنر تھے اور ان کی شہادت کے بعد انہوں نے حضرت علیؓ کی بیعت کی حضرت علیؓ نے امیر معاویہ کو بیعت کے لئے جو خط لکھا تھا اسے جریر ہی لے کر گئے تھے لیکن پھر حضرت علیؓ کے مصاحب اشتر کی باتیں سن کر انہوں نے تمام معاملات سے علیحدگی اختیار کر لی اور قرقیسہ میں آ کر پوری زندگی گزار دی۔

وہ نہایت حسین وجمیل آدمی تھے حتی کہ حضرت عمر انہیں **یوسف ھذہ الامۃ** کہا کرتے تھے گرچہ انہیں حضورؐ کی صحبت کے زیادہ مواقع میسر نہیں آئے لیکن پھر بھی انہوں نے فیضان نبوت سے بہت استفادہ کیا چنانچہ کتابوں میں ان کی سو حدیثیں ملتی ہیں جن میں سے آٹھ متفق علیہ ہیں اور ایک میں بخاری اور سات میں مسلم منفرد ہیں حضور ﷺ ان کے ساتھ بہت محبت واکرام کا معاملہ فرماتے تھے اور انہیں کبھی شرف باریابی سے محروم نہ کرتے تھے یہی سلوک ان کے ساتھ خلفاء کا بھی رہا ۵۴ھ میں ان کی وفات ہوئی اور عمر، منذر، عبید اللہ، ایوب اور ابراہیم نامی پانچ لڑکے چھوڑے رضی اللہ عنہ۔

(۱۵۹/۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ نُمَيْرٍ، ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ اِدْرِيْسَ، عَنْ اِسْمٰعِيْلَ بْنِ اَبِيْ خَالِدٍ عَنْ قَيْسِ بْنِ اَبِيْ حَازِمٍ عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الْبَجَلِيِّ قَالَ: مَا حَجَبَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مُنْذُ اَسْلَمْتُ وَلَا رَآنِيْ اِلَّا تَبَسَّمَ فِيْ وَجْهِيْ وَلَقَدْ شَكَوْتُ اِلَيْهِ اَنِّيْ لَا اَثْبُتُ عَلَى الْخَيْلِ فَضَرَبَ بِيَدِهٖ فِيْ صَدْرِيْ وَقَالَ اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْهُ وَاجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا .

جب سے میں نے اسلام قبول کیا حضور نے مجھے شرف باریابی سے محروم نہیں فرمایا اور مجھے جب بھی دیکھا تبسم فرمایا میں نے شکایت کی کہ میں گھوڑے پر جم کر نہیں بیٹھ سکتا تو آپ نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر مار کر کہا اللہ اسے جما دے اور ہادی ومہدی بنا دے۔

حدیث باب میں حضرت جریر حضور ﷺ سے قربت اور غایت درجہ تعلق کو بیان فرما رہے ہیں کہ آپ نے مجھے کبھی شرف باریابی سے محروم نہیں فرمایا یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت

جریر کو حضورؐ زنان خانے میں بھی آنے سے بھی نہ روکتے تھے ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ جریر کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ اذا کان فی بیته فاستأذنت علیه [۱] یعنی عمومی مجلس میں ملاقات کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہاں اگر آپ گھر میں ہوتے تو میں داخلے کی اجازت لیتا تھا قسطلانی کہتے ہیں کہ اس سے امہات المومنین کی بے پردگی لازم نہیں آتی لا یلزم منه النظر الی امهات المؤمنین [۲] حضرت گنگوہیؒ اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مردوں کی مجلس میں تو آپ مجھے روکتے ہی نہ تھے وان کان فی نساء حجبهن واذن لی اوخرج بنفسه النفیسة الی [۳] یعنی یا تو اوزاج کو پردہ کرا کر مجھے داخلے کی اجازت دیتے یا بنفس نفیس باہر تشریف لے آتے قسطلانیؒ کا کہنا ہے کہ یہ چیز حضور ﷺ کی طرف سے جریر کے لئے خصوصی لطف وعنایت اوراستقبال واکرام کے طور پر تھی وذلك اکراما ولطفاً وبشاشة [۴] امام نوویؒ مزید فرماتے ہیں فیه استحباب هذا اللطف للوارد وفیه فضیلة ظاهرة لجریر یعنی جریر کی فضیلت کے ساتھ حدیث باب سے ہر ملاقاتی کے لئے اس طرح کے لطف وعنایت کا مستحب ہونا معلوم ہوتا ہے مولانا عبدالغنی دہلوی ما منعنی...... من اعطاء طلبته کے مفہوم کا اور اضافہ کرتے ہیں یعنی حضرت جریر نے جو چیز بھی مانگی آپ نے کبھی منع نہیں کیا اور عطا فرمائی اور ہمیشہ ہی میرے ساتھ بڑی فرحت ومحبت کا معاملہ فرمایا۔

﴿ولقد شکوت الخ﴾ فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے چاروں طرف بت شکن دستے روانہ فرمائے جنہوں نے عرب کے تمام مندروں کو ڈھا کر شرک کی جڑ کاٹ دی لیکن یمن کا صنم کدہ پھر بھی باقی رہا شیخ الاسلام حضرت کشمیریؒ نے لکھا ہے ان النصاریٰ لما تسلطوا علی الیمن رأوا ان العرب یطوفون بالکعبة شرفها اللّٰه تعالیٰ ویحبونها فبنوا بیتا مضاهاة لها وسموها کعبة یمانیة تمییزاً عن الکعبة شرفها اللّٰه تعالیٰ فانها یقال لها الشامیة [۵] یعنی عربوں کی طرح عیسائی اس کا حج بھی کرتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جریر سے جب هل انت مریحی من ذی الخلصة بل الکعبة الیمانیة [۶]

۱۔ فتح الباری باب ذکر جریر
۲۔ ارشاد الباری جلد ۶ ص: ۱۷۰
۳۔ الکوکب الدری جلد ۲ ص ۳۴۳
۴۔ مسلم ثانی ص ۲۹۶
۵۔ فیض الباری ۴/۱۲۰
۶۔ صحیح مسلم ۲/۲۹۷

فرمایا تو انہوں نے گھوڑے پر جم کر نہ بیٹھنے کی شکایت کی حضور نے اس پر ان کو ثبات وہدایت کی دعا دی حضرت جریر کہتے ہیں **فنفرت الیه فی مأة وخمسین من الاحمس فکسرناه وقتلنا من حدنا عندهٗ فأتیته فاخبرته قال فدعالنا ولأحمس** [1] یعنی بنی احمس کے ایک سو پچاس گھڑ سواروں کو لے کر ہم نے اس کو جلا کر خاکستر کر دیا اور جس نے مزاحمت کی اس کو قتل کر دیا حضور نے اس کارنامہ پر حضرت جریر اور احمس کے قبیلے کو دعا دی آج بھی اس دعا سے ہر مشکل کام کو آسان کیا جا سکتا ہے، طالبان کے ذریعہ مورتیاں توڑنے کی مخالفت کرنے والے نام نہاد علماء کے لیے یہ حدیث ایک تازیانہ ہے جو ان کے موقف کی دھجیاں اڑا دے گی۔

حدیث بخاری (جہاد/۱۶۲،۱۹۲، مناقب/ ۷۹) مسلم (صحابہ/۲۴) اور ترمذی (مناقب/ ۳۳) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بعینہ بخاری کی ہے۔

فضل اهل بدر

جہاد وقتال کی مشروعیت کے بعد تاریخ اسلام کا پہلا معرکہ غزوۂ بدر کی صورت میں ظاہر ہوا یہ دراصل قرآنی اصطلاح میں یوم الفرقان تھا جس نے حق وباطل کے درمیان حد فاصل قائم کر کے کفر وشرک کے خلاف ایک دائمی جہاد کا آغاز کیا مسلمان اس وقت تعداد، اسلحہ کسی لحاظ سے جنگ کی پوزیشن میں نہ تھے اور صورت حال پورے طور پر مشرکوں کے حق میں تھی نیز وہ ہر لحاظ سے فوجی برتری رکھتے تھے رسول اللہ ﷺ نے اسی کے پیش نظر ایک طرف صحابہ میں جوش وجذبہ کی روح پھونکی تو دوسری جانب پوری رات فتح ونصرت کی دعاء اس والہانہ انداز سے کی کہ رحمت الٰہی جوش میں آئی اور مشرکین سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے فرشتوں کا پورا لشکر اتر آیا بالآخر معرکۂ کارزار گرم ہوا اور مسلمانوں نے آن کی آن میں لوہے کے پہاڑوں کو ریت کے تودوں کی طرح ڈھا دیا اگر وہ لوگ مادی پیمانوں سے حالات کا جائزہ لیتے اور فرعونی لشکر کے مقابلے میں ذرا بھی سستی دکھاتے تو آج اسلام کی تاریخ دوسری ہوتی اور عرب سے باہر کوئی نبی آخر الزماں کے ظہور سے بھی واقف نہ ہوتا ان حضرات نے کیونکہ اپنا خون دے کر فتح مبین

---

[1] صحیح مسلم۲/۲۹۷

حاصل کی اس لیے اسلام میں بدریوں کا مقام سب سے بلند ہے باری تعالیٰ نے اعملوا ماشئتم فقد وجبت لکم الجنّة کے ذریعے ان کی مغفرت کا اعلان فرمایا ہے کیونکہ اب قیامت تک امت کی ہر فتح بدر ہی کی فتح کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔

(۱/۱۶۰) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ وَاَبُوْكُرَيْبٍ قَالاَ ثَنَا وَكِيْعٌ ثَنَا سُفْيَانُ عَنْ يَحْيٰى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ عَبَايَةَ بْنِ رِفَاعَةَ عَنْ جَدِّهٖ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ: "جَاءَ جِبْرَئِيْلُ اَوْمَلَكٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا تَعُدُّوْنَ مَنْ شَهِدَ بَدْرًا فِيْكُمْ قَالُوْا خِيَارُنَا قَالَ كَذٰلِكَ هُمْ عِنْدَنَا خِيَارُ الْمَلٰئِكَةِ"

جرئیل یا اور کوئی فرشتہ حضور کے پاس آیا اور کہا کہ تم اپنے بدری اصحاب کو کیا درجہ دیتے ہو، فرمایا وہ ہمارے منتخب وممتاز افراد ہیں، فرشتہ نے کہا اسی طرح ہمارے یہاں بھی بدری سب سے ممتاز ہیں۔

بدر میں مسلمانوں کی نصرت وتسلی کے لئے فرشتوں کا نزول قرآنی آیات سے ثابت ہے کہ باری تعالیٰ نے پہلے ایک ہزار پھر تین ہزار اور آخر میں پانچ ہزار فرشتے میدان جنگ میں اتارے علامہ سہیلی اور امام قرطبی نے تصریح کی ہے کہ وہ سب مردوں کی شکل میں تھے، چنانچہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم کی روایات میں جن کی سند حسن ہے مذکور ہے کہ فرشتے زرد رنگ کا عمامہ باندھ کر اترے تھے اور شملہ کمر پر لٹک رہا تھا جب کہ بعض روایات میں سیاہ اور سفید عماموں کا بھی ذکر ہے لیکن سیوطی کے نزدیک وہ سب ضعیف ہیں صحیح قول زرد رنگ ہی کا ہے باری تعالیٰ نے فاضربوا فوق الأعناق واضربوا منهم كل بنان کی انہیں خصوصی تعلیم دی تھی اس لئے فرشتوں کے مقتولین صحابہ کے مقتولین سے الگ تھے اور ان کی گردن و پوروں پر آگ کے سیاہ نشان تھے ملائکہ میں حضرت جبرئیل کی وضاحت تو خود بخاری باب شهود الملئكة بدرا میں موجود ہے جب کہ میکائیل اور اسرافیل کا نام مسند احمد، بیہقی بزار، ابویعلیٰ اور مستدرک کی روایات میں آیا ہے حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے ان تین کے علاوہ مزید کسی کے نام کی تصریح نہیں لیکن یہ بہر حال طے ہے کہ جس طرح صحابہ کرام کی جماعت میں سب سے افضل لوگوں کو یہ شرف حاصل ہوا اسی طرح فرشتوں میں بھی منتخب اور نہایت مقرب حضرات کو ہی بدر میں بھیجا گیا ہوگا اسی لئے روایت بالا کے مطابق ان کا مقام ملائکہ میں سب

سے بلند ہے مسلمانوں کی نصرت وتقویت اور تکثیر سواد کے لئے فرشتوں کا نزول دوسرے غزوات میں بھی ثابت ہے جیسا کہ غزوۂ حنین کے بارے میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے و أنزل جنود الم تروھا لیکن ابن عباس کے بقول انہوں نے قتال صرف غزوۂ بدر ہی میں کیا مجاہد سے بھی یہی منقول ہے مگر بخاری مسلم کی ایک حدیث میں جبرئیل ومیکائیل کا غزوۂ احد میں بھی قتال کرنا مذکور ہے حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ کہتے ہیں کہ یہ قتال تمام مسلمانوں کی طرف سے نہ تھا بلکہ صرف حضور کے لئے تھا اس لئے ابن عباس کا قول بالکل درست ہے حدیث صحیح بخاری (مغازی/۱۱) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی عمدہ ہے۔

(۱۶۱/۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الصَّبَاحِ ثَنَا جَرِيْرٌ ح وَحَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا وَكِيْعٌ ح وَثَنَا اَبُوْ كُرَيْبٍ ثَنَا اَبُوْمُعَاوِيَةَ جَمِيْعاً عَنِ الْأَعْمَشِ عَنْ اَبِيْ صَالِحٍ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَسُبُّوْا أَصْحَابِيْ فَوَ الَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ أَنَّ اَحَدَكُمْ اَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَباً مَا اَدْرَكَ مُدَّ اَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيْفَهٗ

فرمایا! میرے صحابہ کو برا مت کہو اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تم میں سے کوئی اگر احد پہاڑ کے برابر سونا خیرات کردے تو بھی وہ صحابی کے ایک مد یا آدھے مد کی برابری نہیں کرسکتا۔

فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے ہر طرف بت شکن دستے روانہ فرمائے ان ہی میں ایک دستہ خالد بن ولید کا تھا جو بنی جزیمہ کی طرف بھیجا گیا تھا صحیح بخاری (مغازی/۶۰) میں واقعہ موجود ہے فدعاھم الی الاسلام فلم یحسنوا ان یقولوا اسلمنا فجعلوا یقولون صبأنا صبأنا فجعل خالد یقتل ویاسر ودفع الی کل رجل منا اسیرہٗ حتی اذا کان یوم امر خالد أن یقتل کل رجل منا أسیرہٗ فقلت واللّٰہ لا اقتل أسیری ولا یقتل رجل من اصحابی اسیرہٗ یعنی خالد کی دعوت پر اسلمنا کہنے کے بجائے صبانا کہنے لگے اور مطلب وہی تھا کہ ہم نے پچھلے دین کو چھوڑ دیا لیکن خالد بن ولید نے غلط فہمی سے انہیں قتل اور گرفتار کرنا شروع کردیا اور ایک دن ہمیں بھی یہ حکم دیا کہ سب اپنے اپنے قیدی کو قتل کریں تو میں نے (ابن عمرؓ) کہا کہ نہ میں اپنے قیدی کو قتل کروں گا اور نہ ہی میرا کوئی ساتھی یہ کام کرے گا پھر

جب ہم نے آ کر یہ بات اللہ کے رسول کو بتلائی تو آپ نے ہاتھ اٹھا کر دو مرتبہ فرمایا **اللّٰھم انی ابرء الیك مما صنع خالد** اس سریہ میں عبدالرحمٰن بن عوف بھی تھے مسلم کی حدیث میں صراحت ہے **کان بین خالد بن الولید وبین عبدالرحمن بن عوف شيء فسبه خالد** یعنی اسی مسئلے میں خالد اور عبدالرحمٰن کے درمیان کچھ اختلاف ہو گیا جس کی بناء پر خالد نے عبدالرحمٰن کو نازیبا الفاظ کہہ دیئے تو آپ نے وہ کلمات ارشاد فرمائے جن پر حدیث مشتمل ہے۔

﴿**لاتسبوا أصحابی**﴾ یہاں اصحابی سے کون مراد ہے محدثین کے اس سلسلے میں تین قول ہیں:

(۱) شیخ تقی الدین سبکی فرماتے ہیں **من أسلم قبل الفتح وأنه خطاب لمن أسلم بعد الفتح** یہ حکم فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کرنے والوں کے لئے ہے اور **لا تسبوا** کے مخاطب فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والے ہیں[1]۔

(۲) **فالمراد باصحابی اصحاب مخصوصون وهم السابقون علی المخاطبین فی الاسلام** یعنی وہ صحابہ یہاں مراد ہیں جو مخاطب سے پہلے ایمان لائے ہیں یہ سیوطی کا قول ہے[2] ابن ماجہ کا اشارہ بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

(۳) ملا علی قاری نے لکھا ہے **یمکن ان یکون الخطاب للامة الاعم من الصحابة حیث علم بنور النبوة ان مثل هذا یقع فی اهل البدعة فنها هم بهذه السنة**[3] ممکن ہے پوری امت کو خطاب ہو اور **اصحابی** سے مراد بلا تفریق تمام صحابہ ہوں کیونکہ نور نبوت سے آپ کو یہ پتہ چل گیا کہ اہل بدعت اس کا ارتکاب کریں گے اس لئے ان کو تنبیہ کرنے کے لئے آپ نے یہ ارشاد فرمایا:

ہمارے نزدیک عہد رسالت تک تو سیوطی کا قول معتبر ہے وفات نبوی کے بعد ملا علی قاری کا قول راجح نظر آتا ہے جب کہ پہلے کی تردید علامہ سندھی نے کر دی ہے سب **صحابة** کے خلاف ہر دور میں امت مسلمہ کا موقف چٹان کی طرح رہا تفصیل باب کے شروع میں گذر چکی ہے۔

﴿**لو أن احدکم أنفق ..... ذهبا**﴾ **ذهبا احد** ممیز کی تمیز ہے اور پورا جملہ شرط واقع ہے۔

﴿**ما ادرك مداحدهم ولا نصیفه**﴾ شرط کی جزا ہے **مد** ایک مقررہ وزن ہے جس

---

[1] سنن المصطفیٰ ابن ماجہ باب غزوۂ بدر [2] [3] مرقاۃ المفاتیح ۱۱/ ۲۷۲، باب مناقب الصحابۃ

کی مقدار اہل عراق کے نزدیک دو رطل اور اہل حجاز کے یہاں ایک اور تہائی رطل ہے نصیف کے معنی نصف یعنی آدھے کے ہیں ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے والمعنی لاینال احدکم بانفاق مثل احد ذھبا من الاجر والفضل ماینال احدھم بانفاق مدطعام او نصیفه لم یقارنه من مزید الاخلاص وصدق النیة وکمال النفس[1] تو اس جملے کے معنی یہ ہوئے کہ تم میں کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کر کے اتنا اجر وثواب نہیں کما سکتا جتنا کہ کوئی صحابی ایک یا آدھے مد غلے کو خیرات کر کے کما سکتے ہیں اور اس کی وجہ ان کے حددرجہ اخلاص نیت کی سچائی اور فضیلت مرتبی ہے۔ حدیث صحیح بخاری، (مناقب/۳۳) صحیح مسلم (صحابہ/ ۴۷) سنن ابي داوٗد (السنة/ ۱۱) جامع ترمذی (مناقب/۵۰) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی عمدہ ہے۔

(۱۶۲/۳) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، وَعَمْرُو بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ ، قَالَا: ثَنَا وَكِيعٌ، قَالَ : حَدَّثَنَا سُفْيَانُ ، عَنْ نُسَيْرِ بْنِ ذُعْلُوقٍ، قَالَ: كَانَ ابْنُ عُمَرَ يَقُولُ: لَاتَسُبُّوْا اَصْحَابَ مُحَمَّدٍ ﷺ فَلَمُقَامُ أَحَدِهِمْ سَاعَةً خَيْرٌ مِنْ عَمَلِ أَحَدِكُمْ عُمْرَهُ.

محمد ﷺ کے صحابہ کے بارے میں زبان نہ کھولو کیونکہ ان میں سے کسی کا تھوڑی دیر کے لئے بھی (جہاد میں) کھڑا رہنا تم میں سے ہر ایک کی زندگی بھر کی عبادت سے افضل ہے۔

نبی کی صحبت کا دنیا میں کوئی بدل نہیں وہاں جو بھی ایک گھڑی گذار دے اسے قوت ایمان، سوز دل، انشراح صدر، اخلاص واستحضار اور اطاعت واتباع کی وہ کیفیت نصیب ہوتی ہے جو وفات کے بعد کسی کی صحبت سے ممکن ہی نہیں امام نووی نے لکھا ہے وفضیلة الصحبة ولو لحظة لا یوازیھا عمل ولا ینال درجتھا بشئ والفضائل لا توخذ بقیاس ذلك فضل اللّٰه یوتیه من یشاء[2] ایک لمحے کی صحبت نبوت کا مقابلہ کوئی عمل نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کے درجے کو کسی ذریعہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے فضائل قیاسی نہیں عطائی ہوتے ہیں پہلی حدیث میں مالی عبادت کا تذکرہ تھا یہاں بدنی عبادت موضوع ہے حدیث کی وضاحت علامہ سندھی نے فلمقام احدھم قیامه فی الجهاد فی طاعة الرسولؐ علیه الصلوٰة والسلام

[1] مرقاۃ المفاتیح ۲۷۳/۱۱ [2] مسلم ۳۱۱/۲

بای وجه کان او وجوده عنده سے کی ہے یعنی کسی صحابی کا رسولؐ کے کہنے پر جہاد میں کھڑا ہونا یا آپ کے پاس موجود ہونا ایسا عمل ہے جس کا امتیوں کے اعمال سے کوئی مقابلہ نہیں بوصیری نے زوائد (۱/ ٦۵) میں لکھا ہے هذا اسناد صحیح رجاله ثقات.

فضل الانصار رضی اللہ عنہ

دین کی نصرت وحمایت میں حضرات انصار کی بڑی قربانیاں ہیں حضور کی ابتدائی دعوت پر فوراً لبیک کہنا، دور دراز سے آکر بیعت کرنا، تمام عرب کی مخالفت مول لے کر رسول اللہ ﷺ کو ٹھکانا دینا، بے یار ومددگار مہاجرین کو اپنی جان ومال میں شریک کرنا، مشرکین مکہ کی دھمکیوں سے مرعوب نہ ہونا، بدر واحد میں اسلام کی کھیتی کو اپنے خون سے سینچنا، مدینہ کو دعوت وجہاد کا مرکز بنانا، شاتمین رسول کو کیفر کردار تک پہنچانا، خود بھوکا رہ کر اسلام کے جیالوں کی ضیافت کرنا اور آپ کی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ اخذ کرنا یہ وہ چیزیں ہیں جن میں کوئی قوم ان کی شریک وسہیم نہیں اس لئے رسول اللہ ﷺ نے جہاں فرداً فرداً انصاری صحابہ کے فضائل ومناقب بیان کئے وہیں بحیثیت قبیلہ انہیں تمام لوگوں پر ترجیح دے کر اسلام کا شعار قرار دیا، ان کی محبت وعداوت کو اللہ کی محبت وعداوت بتلایا ان سے تعلق رکھنے والے کو مومن اور بغض رکھنے والے کو منافق کہا اور عین مرض الوفات میں آپ نے سربرآوردہ صحابہ کو انصار کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی یہ تمام چیزیں رسول اللہؐ کی جانب سے احسان شناسی اور ان حضرات کے فضائل وقربانیوں کی غماز ہیں۔

(۱/۱٦۳) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، وَعَمْرُو بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَا: ثَنَا وَكِيعٌ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ عَدِيِّ بْنِ ثَابِتٍ. عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ أَحَبَّ الْأَنْصَارَ أَحَبَّهُ اللّٰهُ وَمَنْ أَبْغَضَ الْأَنْصَارَ أَبْغَضَهُ اللّٰهُ قَالَ شُعْبَةُ قُلْتُ لِعَدِيٍّ أَسَمِعْتَهُ مِنَ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ؟ قَالَ إِيَّايَ حَدَّثَ.

فرمایا: جو انصار سے محبت کرے گا اللہ اس سے محبت کرے گا اور جو انصار سے بغض رکھے گا اللہ اس سے بغض رکھے گا شعبہ کہتے ہیں میں نے عدی سے کہا کیا تم نے یہ حدیث براء بن عازب

سے سنی ہے؟ انہوں نے کہاہاں مجھ ہی سے انہوں نے بیان کیا۔

بخاری، مسلم اور ترمذی کی روایت میں ان الفاظ سے پہلے **لا یحبهم الا مومن ولا یبغضهم الا منافق** کا بھی اضافہ ہے اس کے علاوہ بھی حدیث میں انصار کے فضائل موجود ہیں صحیح مسلم میں روایت منقول ہے **اية المنافق بغض الأنصار واية المومن حب الأنصار**[1] حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا **لا يبغض الأنصار رجل يومن بالله والاخرة**[2] مسلم ہی کی تیسری حدیث میں آپ نے انہیں **انكم لا حب الناس الي** کا پروانہ دیا اور فرمایا **لو كنت موثراً بها أحداً لاثرت بها عشيرتي**[3] اگر میں اپنے گھر والوں پر کسی کو ترجیح دونگا تو یقیناً انصار کو دونگا۔

﴿ومن ابغضهم﴾ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے **اى بغير سبب شرعيى بالنسبة الى بعض افرادهم** یعنی بغیر شرعی سبب کے ان کے بعض افراد سے بغض رکھنا مراد ہے علامہ سندھی فرماتے ہیں **والا فكثيراً ماتجرى معاملة تؤدى الى المحبة والبغض** ورنہ بسا اوقات کوئی خاص معاملہ بغض ومحبت کا سبب بن جاتا ہے ایسی بغض ومحبت اس کے زمرے میں نہیں آتی جن کی بنیاد انصار کے تاریخی پس منظر کے علاوہ ہو...... حدیث بخاری (مناقب/۶۲) مسلم (ایمان/۳۱) اور ترمذی (مناقب/۵۷) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی عمدہ ہے۔

(۱۶۴/۲) **حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ حَدَّثَنَا ابْنُ اَبِىْ فُدَيْكٍ عَنْ عَبْدِ الْمُهَيْمِنِ بْنِ عَبَّاسِ بْنِ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْأَنْصَارُ شِعَارٌ وَالنَّاسُ دِثَارٌ وَلَوْ أَنَّ النَّاسَ اسْتَقْبَلُوْا وَادِياً اَوْ شِعْبًا وَاسْتَقْبَلَتِ الْأَنْصَارُ وَادِيًا لَسَلَكْتُ وَادِىَ الْاَنْصَارِ وَلَوْ لَا الْهِجْرَةُ لَكُنْتُ امْرَأً مِنَ الْاَنْصَارِ.**

انصار تو شعار ہیں بقیہ دوسرے لوگ دثار ہیں اگر سارے لوگ ایک راہ چلیں اور انصار دوسری راہ تو میں انصار ہی کی راہ چلوں گا اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار ہی کا ایک فرد ہوتا۔

---

[1] [2] صحیح مسلم کتاب الایمان باب الدلیل علی ان حب الانصار
[3] مسلم کتاب الفضائل من فضائل الانصار

صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوة الطائف میں حدیث باب کا پس منظر یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حنین کی فتح کے بعد جب رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت مؤلفۃ القلوب میں تقسیم کیا اور انصار کو کچھ نہ دیا تو وہ کبیدہ خاطر ہوئے رسول اللہ ﷺ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے انہیں جمع کر کے یہ تقریر فرمائی **یا معشر الأنصار الم أجدکم ضلالاً فهداکم الله بی وکنتم متفرقین فألفکم الله بی وعالة فأغناکم الله بی** کیا میں اس وقت تمہارے پاس نہیں آیا جب کہ تم گمراہ تھے اللہ نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت دی تم منتشر تھے اللہ نے میرے ذریعے تمہیں جوڑ دیا تم تنگ دست تھے اللہ نے میرے ذریعے تمہیں خوشحال بنایا، انصار ہر جملے پر **الله ورسوله امن** کہہ رہے تھے پھر آپ نے فرمایا کیا تم اس پر راضی نہیں کہ لوگ اونٹوں اور بکریوں کو لے کر واپس ہوں اور تم نبی کو لے کر اپنے گھروں کو لوٹو اس کے بعد جو مضمون ارشاد فرمایا حدیث باب اسی پر مشتمل ہے۔

﴿**الأنصار شعار**﴾ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے **وهو الثوب الذی یلی شعر البدن**[1] یعنی بالکل اندر پہننے والا کپڑا، آگے فرماتے ہیں **شبه الانصار بالشعار لرسوخ صداقتهم وخلوص مودتهم والمعنى انه اقرب الناس الى مرتبة واولهم منی منزلة**[2] ان کے خلوص محبت اور غایت تعلق کی بنیاد پر انصار کو شعار سے تشبیہ دی گئی اور معنی یہ ہوئے کہ وہ مرتبہ میں مجھ سے سب سے زیادہ قریب ہیں اور میرے نزدیک سب سے زیادہ قابل ترجیح ہیں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے **وهی استعارة لطیفة لفرط قربهم منه واراد ایضا انهم بطانته وخاصته وانهم الصق به واقرب الیه من غیرهم**[3] ان سے غایت تعلق کا یہ ایک لطیف استعارہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ انصار آپ کے خواص اور محرم راز ہیں دوسروں کے مقابلے میں وہی نبی سے زیادہ قریب اور ان کے گرویدہ ہیں۔

﴿**والناس دثار**﴾ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں **هو الثوب الذی فوق الشعار** یعنی اندر والے کپڑے کے اوپر جو کپڑا ہوتا ہے دثار اسی کو کہتے ہیں مطلب یہ ہوا کہ انصار کے مقابلے میں دوسرے لوگوں سے تعلق ثانوی درجہ کا ہے یاد رہے کہ یہاں الناس میں مہاجرین شامل

---

[1] [2] مرقاۃ المفاتیح ۱۱ ۴۲۳ [3] فتح الباری ۸ ۵۲

نہیں ہیں کیونکہ ان کا مقام انصار سے بھی بلند ہے۔

﴿ولو ان الناس استقبلوا وادیا او شعبا﴾ وادی پہاڑوں اور ٹیلوں کے درمیان اس کشادگی کو کہتے ہیں جہاں سیلاب کا پانی گزرتا ہے جمع أودیة جب کہ شعب ذرا تنگ پہاڑی راستہ اور درہ کو کہتے ہیں، جمع شعاب آتی ہے تشبیہ کی وجہ خطابی نے یہ لکھی ہے ان ارض الحجاز کثیرة الاودیة والشعاب پھر فرماتے ہیں فاذا ضاق الطریق عن الجمیع فسلك رئیس شعبا تبعه قومه حتی یفضوا الی الجادة[1] یعنی راستہ کی تنگی کی وجہ سے جب بیک وقت سب لوگ نہیں گذر سکتے تو سردار آگے بڑھ کر راستہ کا انتخاب کرتا ہے اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں یہاں تک کہ عام شاہراہ پر پہنچ جاتے ہیں اگر یہ معنی مراد ہے تو اس کا مطلب انصار کی معرفت اور راستبازی کو بتلانا ہے جب کہ وادی کی دوسری توجیہ رائے سے کی گئی ہے ملا علی قاری فرماتے ہیں اراد ﷺ بذلك حسن موافقته ایاهم وترجیحهم فی ذلك علی غیرهم[2] یعنی انصار کی وفاداری اور قربانی کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کے مقابلے میں ان کی رائے کی موافقت اور ترجیح کا عزم کیا ہے۔

﴿ولولا الهجرة لكنت امرأ من الانصار﴾ محدثین نے یہاں متعدد توجیہات بیان کی ہیں ہمارے نزدیک ان میں سب سے زیادہ راجح علامہ قرطبی کی توجیہ ہے فرماتے ہیں لولا ان ثواب الهجرة أعظم لاخترت ان یکون ثوابی ثواب الأنصار[3] یعنی ہجرت کا ثواب اگر سب سے زیادہ نہ ہوتا تو میں نصرت کے ثواب کو اختیار کرتا علامہ بدرالدین عینی نے اسی کو اور وضاحت کے ساتھ لکھا ہے فرماتے ہیں والغرض منه التعریض بانه لا فضیلة أعلی من النصرة بعد الهجرة وبیان أنهم بلغوا من الكرامة مبلغا لولا أنه من المهاجرین یعد نفسه من الأنصار رضی الله عنهم[4] یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہجرت کے بعد نصرت سے بڑی کوئی فضیلت نہیں اور انصار عظمت کے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر آپ مہاجرین میں سے نہ ہوتے تو اپنے کو انصار ہی میں شمار کرتے حضرت گنگوہی نے فرمایا ان الله انعم علی بفضیلة الهجرة ولو لا ذلك لجعلنی من الانصار[5] باری

[1] [2] مرقاة المفاتیح ۱۱/۴۲۳
[3] فتح الباری ۸ص/۵۱
[4] عمدة القاری ۱۶/۲۵۵
[5] الکوکب الدری ۲

تعالیٰ نے مجھے ہجرت کی فضیلت سے نوازا ہے اگر یہ نہ ہوتی تو مجھے اللہ تعالیٰ انصار ہی میں پیدا فرماتا خلاصہ یہ نکلا کہ سب سے افضل عمل ہجرت ہے اس لئے مہاجرین کا مقام امت میں سب سے بلند ہے پھر درجہ نصرت کا ہے اس لحاظ سے انصار فضیلت میں دوسرے نمبر پر ہیں رسول اللہ ﷺ یہ بتانا چاہتے کہ اگر ہجرت نہ ہوتی تو نصرت کے سب سے افضل ہونے کی حیثیت سے انصار پہلے مقام پر ہوتے اور باری تعالیٰ مجھے بھی اسی طبقہ میں پیدا فرماتا...... حدیث بخاری (مناقب/۶۱، مغازی/۵۸) اور جامع ترمذی (مناقب/۵۷) میں بھی آئی ہے ابن ماجہ کی سند کے بارے میں بوصیری نے زوائد (۱/۶۶) میں لکھا ہے هذااسناد ضعيف والافة فيه من عبد المهيمن بن عباس وباقي رجال الاسناد ثقات، عبد المہیمن کو محدثین نے ضعیف منکر اور متروك قرار دیا ہے۔

(۳/۱۶۵) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ اَبِيْ شَيْبَةَ ثَنَا خَالِدُ بْنُ مَخْلَدٍ حَدَّثَنِيْ كَثِيْرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنُ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ "رَحِمَ اللّٰهُ الْاَنْصَارَ، وَاَبْنَاءَ الْاَنْصَارِ، وَاَبْنَاءَ اَبْنَاءِ الْاَنْصَارِ"

فرمایا اللہ تعالیٰ انصار پر رحم فرمائے انصار کے بیٹوں پر اور بیٹوں کے بیٹوں پر رحم فرمائے۔

صحیح مسلم میں یہ مضمون اللّٰهم اغفرولابناء ا اللا نصار ولأنصار ولأبناء ابناء الأنصار منقول ہے جب کہ جامع ترمذی میں اس کے الفاظ اللّٰهم اغفر للأنصار ولذراری الانصار ولذراری ذراريهم آئے ہیں علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے انه دعاء للقرون الثلثة یعنی یہ قرون ثلثہ تک انصار کے حق میں دعا ہے ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں ولا يبعد أن يراد به أبنائهم ولو سائق الى يو م القيامة اور یہ بات بھی بعید نہیں ہے کہ حدیث میں قیامت تک ان کی اولا د در اولا د مراد ہو ہمارے نزدیک یہ مفہوم الفاظ حدیث اور نبوی مزاج سے زیادہ قریب ہے... حدیث مسلم (فضائل/۷۸) اور ترمذی (مناقب/انصار) میں بھی موجود ہے، ابن ماجہ کی سند کو الد باجہ علی ابن ماجہ (۱/۱۲۱) میں ضعیف قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس کے ایک راوی خالد بن مخلد کو محدثین نے صدوق ہونے کے باوجود منکر الحدیث، غالی شیعہ اور نا قابل اعتبار قرار دیا ہے جب کہ دوسرے راوی کثیر بن عبد اللہ کو

ضعیف ، منکر، متروك اور کذاب تک کہا گیا ہے اس لئے ، بوصیری زوائد میں فرماتے ہیں: هذا اسناد ضعيف فيه كثير بن عبدالله وهو متهم .

فضلُ عبد الله بن عباس رضي الله عنه

نام عبداللہ اور کنیت ابوالعباس تھی آپ کے والد حضرت عباس رسول اللہ ﷺ کے حقیقی چچا تھے جب کہ والدہ ام الفضل ام المؤمنین حضرت میمونہ کی حقیقی بہن تھیں تو اس طرح دونوں سلسلوں سے آپ کو تقرب نبوی حاصل تھا پیدائش شعب ابی طالب مکے میں ہوئی جب کہ مشرکین نے بنی ہاشم اور بنی مطلب کا بائیکاٹ کر رکھا تھا حضورؐ نے اپنے لعاب دہن سے ان کی تحنیك فرمائی۔

حضرت عباسؓ نے ظاہراً فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا جب کہ ام الفضل بالکل شروع ہی میں مسلمان ہو گئیں تھیں حتی کہ ابن سعدؒ کی ایک روایت میں انہیں خدیجہ کبری کے بعد دوسری مسلم خاتون قرار دیا گیا ہے تو اس طرح شروع ہی سے حضرت عبداللہؓ نے ایمان وتوحید کی لوریوں میں پرورش پائی اور ۸ ھ میں فتح مکہ سے ذرا پہلے مسلمان ہو کر مدینہ پہنچ گئے اس وقت ان کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔

مناقب وکارنامے

عبداللہ شروع ہی سے نہایت ذہین وفطین تھے اور اپنی خالہ حضرت میمونہؓ کے پاس کثرت سے جایا کرتے تھے اس لئے انہیں اندرون خانہ حضورؐ کے معمولات دیکھنے کا خوب موقع ملا اور متعدد خدمات پر خوش ہو کر آپ نے انہیں علم وفقہ کی دعا بھی دی ہے وفات نبوی کے وقت ان کی عمر صرف ۱۳ سال تھی اور صدیق اکبر کے دور میں وہ بلوغ کو پہنچے جب کہ شباب کا آغاز حضرت عمر کے عہد میں ہوا جو انہیں بڑے بڑے صحابہ پر فوقیت دیتے تھے اور اکثر پیچیدہ ومشکل مسائل انہیں سے حل کراتے تھے۔

حضرت عثمانؓ کے دور میں انہوں نے افریقہ پر ہونے والی فوج کشی میں شرکت کی اور ۳۵ ھ میں جب حضرت عثمان محصور ہو گئے تو انہوں نے ابن عباس کو امیر الحج بنا کر مکہ بھیجا جب

وہاں سے واپس ہوئے تو حضرت عثمان شہید ہو چکے تھے اس موقع پر انہوں نے حضرت علیؓ کو نہایت قیمتی مشورے دیئے جنگ جمل میں وہ حضرت علیؓ کے حامی تھے چنانچہ فتح کے بعد انہیں بصرہ کا گورنر بنایا گیا اور زیادان کے مشیر اور بیت المال کے مہتمم مقرر ہوئے اسی طرح جنگ صفین میں بھی انہوں نے امیر معاویہ کے خلاف خوب داد شجاعت دی تحکیم کے موقع پر حضرت علیؓ نے ابوموسیٰ اشعری کی جگہ انہیں کو حکم بنانا چاہا تھا لیکن لوگوں کو اس پر اعتراض ہوا پھر فیصلہ سنانے کے لئے جب دومۃ الجندل کا اجتماع ہوا تو ابوموسیٰ کے ساتھ جانے والی فوج کے مذہبی نگراں ابن عباس ہی تھے انہوں نے اس موقع پر بھی ابوموسیٰ کو قیمتی مشورہ دیا ثالثی ناکام ہونے کی صورت میں خارجی فرقے کا ظہور ہوا جس سے بحث ومباحثے کے لئے حضرت علیؓ نے ابن عباس کو بھیجا لیکن یہ کوشش ناکام رہی مجبوراً انہوں نے طاقت استعمال کی جس سے نہروان میں خارجیوں کا زور ٹوٹ گیا بصرے کی ولایت حضرت علیؓ کی شہادت تک قائم رہی پھر جب حسن ومعاویہ میں مصالحت شروع ہوئی تو انہوں نے امیر معاویہ کو خط لکھ کر امان حاصل کی اور مکہ جا کر گوشہ نشین ہو گئے حضرت حسین نے ۶۰ھ میں جب یزید کے خلاف خروج کیا تو ابن عباسؓ نے انہیں کوفہ جانے سے روکنا چاہا لیکن مشیت الٰہی پوری ہو کر رہی یزید کے مرنے کے بعد عبداللہ بن زبیر نے مکہ میں خلافت کا دعویٰ کیا اور ابن عباس پر بھی بیعت کے لئے زور ڈالا وہ تیار نہ ہوئے اور اپنے حامیوں کی مدد سے طائف منتقل ہو گئے اور تاحیات وہیں رہے ابن عباسؓ تفسیر میں بند مقام رکھتے تھے اسی طرح حدیث، فقہ فرائض، اور دیگر علوم میں بھی ان کا پایہ کم نہ تھا اکرام مسلم، حب رسول، احترام امہات المومنین اور دیگر محاسن ان کی ذات کا جز لاینفک تھے ۶۸ھ میں طائف میں انتقال ہوا اور احباب وتلامذہ نے محمد بن الحنفیہ کی امامت میں جنازہ پڑھ کر سپرد خاک کیا عین تدفین کے وقت قبر سے آواز آئی یاایتها النفسُ المطمئنة ارجعى الى ربك راضية مرضية.

(۱۶۶/۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنّٰى، وَاَبُوبَكْرِ بْنُ خَلَّادِ الْبَاهِلِيّ، قَالَا: ثَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ، حَدَّثَنَا خَالِدُ الْحَذَّاءَ، عَنْ عِكْرِمَةَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: ضَمَّنِي رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِلَيْهِ وَقَالَ: "اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْحِكْمَةَ وَتَاوِيْلَ الْكِتَابِ"

مجھ کو نبی ﷺ نے سینے سے لگا کر فرمایا: اے اللہ! اسے حکمت اور قرآن کی تاویل سکھلا دے۔

صحیح بخاری کتاب الوضوء باب وضع الماء عند الخلاء میں حدیث کا پس منظر خود ابن عباس نے یہ بیان کیا ہے ان النبی ﷺ دخل الخلاء فوضعت له وضوء قال من وضع هذا فأخبر فقال اللّٰهم فقّههُ فی الدین.

﴿علمه الحكمة﴾ حکمت سے کیا مراد ہے اس کا جواب امام بخاری نے الاصابة فی غیر النبوة حافظ ابن حجر نے الفهم عن الله ونور یفرق به بین الالهام والوسواس اور ملا علی قاریؒ نے اتقان العلم والعمل سے دیا ہے جس کا خلاصہ یہ نکلا کہ نبی کے علاوہ کسی امتی میں علم وعمل کی پختگی اصابت رائے اور الہام ونور کی جو اعلیٰ سے اعلیٰ توفیق مل سکتی ہے اسی کا نام حکمت ہے گویا وہ قرآن وسنت کی ترجمانی کا نام ہے۔

﴿وتاويل الكتاب﴾ تاویل کے معنی "لسان العرب" (۱۱/۳۳) میں احمد بن یحی سے التاويل والمعنى التفسير منقول ہے ابن الاثیر نے نہایہ میں لکھا ہے والمراد بالتاويل نقل ظاهر اللفظ عن وضعه عن اصله الى ما يحتاج الى دليل لولاه ماترك ظاهر اللفظ یعنی حقیقی معنی کی عکاسی کرنے والے ظاہر لفظ کو کسی دلیل سے وابستہ کرنا اور دلیل نہ ہو تو ظاہر کو نہیں چھوڑا جاتا وما يعلم تاويله الا الله میں اس کا یہی مفہوم ہے۔

ان کے حق میں نبوی دعاء امر واقعہ بن کر ظاہر ہوئی اور خود صحابہ کرام انہیں ترجمان القرآن، امام التفسیر، حبر الأمہ اور بحر العلم کا لقب دیتے تھے فتح الباری (۷/۱۰۰) میں ابن مسعودؓ کا یہ قول موجود ہے نعم ترجمان القرآن ابن عباس لوادرك اسناننا ما عاشره منا أحد ابن عباس قرآن کے بہترین ترجمان ہیں اگر وہ ہماری عمر کے ہوتے تو ہم میں سے کوئی بھی ان کی برابری نہ کر پاتا حضرت سعد بن ابی وقاص کا قول سیر اعلام النبلاء (۳/۳۴۷) میں نقل کیا گیا ہے مارأيت أحداً احضر فهماً ولا ألب لبًا ولا اكثر علما ولا اوسع حلماً من ابن عباس میں نے ابن عباس سے زیادہ حاضر دماغ، عقلمند، وسیع العلم اور حلیم وبرد بار شخص نہیں دیکھا اسی لئے حضرت عمر بعض اوقات انہیں بدری صحابہ پر بھی فوقیت دیا کرتے تھے اور مشکل مسائل میں خصوصاً ان کا تعاون لیتے فرمایا کرتے تھے ذلك فتى الكهول له لسان

سئول وقلب عقول کہ یہ نوجوان پختہ عمر لوگوں کا سافہم وبصیرت رکھتے ہیں ان کی زبان بہت سوال کرنے والی اور دل غور وتجزیہ کرنے والا ایسی ہی شہادت مجمع الزوائد (۹/ ۲۷۷) میں ابن عمر نے دی ہے کوئی بھی ان سے مسئلہ پوچھتا تو اسے ابن عباس کے پاس بھیجتے اور فرماتے کہ وہ قرآن کے سب سے بڑے عالم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والے علوم واحکام کو سب سے زیادہ جانتے ہیں الغرض تفسیر کے جملہ علوم پر انہیں پورا عبور حاصل تھا اور علوم قرآن میں وہ اکابر صحابہ کی ہمسری کرتے تھے...... حدیث بخاری (علم/ ۱۵، وضو/ ۱۰ مناقب/ ۴۹، اعتصام/۱) مسلم (فضائل/ ابن عباس) اور ترمذی (مناقب/ ابن عباس) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی عمدہ ہے۔

باب في ذكر الخوارج

سنن ابن ماجہ کا مقدمہ دراصل اہل سنت والجماعت کے عقائد کی تشریح ہے اسی لئے ما انا علیه واصحابی کی تعریف کے فوراً بعد امام ان گمراہ فرقوں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے ان دو بنیادوں میں سے کسی ایک سے بھی انحراف کیا اور ان کے قدم جادہ حق سے بھٹک گئے اس میں شیعوں کو فوقیت واولیت حاصل ہے اور امت میں گمراہانہ تحزب کی بنیاد بھی یہی ہیں لیکن امام نے صراحۃً یہاں ان کا کوئی تذکرہ نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ تکفیر صحابہ کے قائل ہیں جس کے نتیجہ میں قرآن وحدیث کا پورہ ذخیرہ ان کے نزدیک ناقابل اعتبار ٹھہرتا ہے اس لئے فضائل صحابہ کا پورا باب دراصل شیعت کی تردید ہے اور احادیث وروایات کے ذریعہ یہاں امام نے مثبت ومعروضی طریقے پر مذہب اہل تشیع کی بنیادیں ہلادیں ہیں۔

خوارج کی تاریخ

اسی ضمن کا دوسرا فرقہ خواج کا ہے یہ حضرت علی اور امیر معاویہ کے دور کی پیداوار ہیں ۳۷ ہجری میں جب دونوں حضرات کے درمیان صلح کی پیش رفت ہوئی اور مسئلہ خلافت کی بابت حضرت عمرو بن عاص اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کو حکم بنایا گیا تو بنوتمیم نے اسے ناپسند کیا اور حضرت علی کو دوبارہ امیر معاویہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی یہ صریح عہد شکنی تھی جس کا ارتکاب

وہ کبھی نہ کر سکتے تھے انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں فیصلہ کی میعاد تک انتظار کرنا ہے خوارج اس پر بڑے کبیدہ خاطر ہوئے اور کوفہ واپسی کے فوراً بعد ہی یہ لوگ بارہ ہزار کا لشکر لے کر حروراء میں جا بسے حضرت عبداللہ بن عباس نے انہیں فہمائش وتنبیہ کی ان کی ناکامی پر خود حضرت علی وہاں تشریف لے گئے اور سمجھا بجھا کر انہیں دوبارہ کوفہ لے آئے یہاں بدخواہوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ خوارج کی خاطر داری کے لئے حضرت علی نے تحکیم کو کفر مان کر اس سے توبہ کی ہے انہیں اس کا علم ہوا تو منبر پر کھڑے ہو کر اس کی تردید کی خوارج کو یہ بات کبھی اچھی نہ لگ سکتی تھی وہ برہم ہو کر لا حکم الا للہ کے نعرے لگانے لگے اور رفتے رفتے انہوں نے ایک جماعت کی صورت اختیار کر لی چھ مہینے بعد جب دومۃ الجندل میں تحکیم کا افسوسناک نتیجہ ظاہر ہوا تو یہ لوگ حضرت علی کی بیعت توڑ کر ابن وھب راسبی کے جھنڈے تلے جمع ہوئے اور کوفہ بصرہ، انمبار اور مدائن وغیرہ دوسرے تمام مقامات سے آ کر اس فکر کے لوگ نہروان میں اکٹھے ہو گئے اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کر دیا۔

خوارج بیشتر بدوی قبائل سے تعلق رکھتے تھے ان کی بود وباش بھی شہروں کے بجائے جنگلوں اور دیہاتوں ہی میں تھی اس لئے وہ بڑے جفاکش جذباتی اور پکے ضدی تھے مخاطب کے موقف کو سنجیدگی سے لینا اور دلائل کی بنیاد پر حق کو قبول کرنا گویا انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا تاریخی دستاویز بتاتی ہیں کہ خوارج کی پیدائش میں کسی بیرونی طاقت کا دخل نہ تھا وہ بڑے مخلص اور نہایت عبادت گذار بھی تھے لیکن ان کے غلط تصور دین نے دلوں پر مہر لگا کر ان کے اندر ایسی انانیت پیدا کر دی کہ وہ کبھی کسی لچک کے روادار نہ ہوئے اور قرآن وسنت اور صحابہ کرام جیسی بے داغ شخصیتیں ان کی ہٹ دھرمی کو کم نہ کر سکیں۔

عقائد ونظریات

خوارج کا عقیدہ ہے کہ بیعت صرف خدا کی ہے کوئی امیر اور خلیفہ نہیں علی ومعاویہ اور ان کے حامی تمام صحابہ وتابعین کافر ہیں حضرت عثمان حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت عائشہ بھی کافر ہیں صحابہ قطعاً حجت نہیں مرتکب کبیرہ کافر ہے اور آخرت میں وہ مخلد فی النار ہوگا رویت باری تعالیٰ ممکن نہیں ہے کلام اللہ مخلوق ہے کوئی خاندان دوسرے خاندان سے افضل نہیں حتی کہ

قریش کو بھی دیگر قبائل پر کوئی فوقیت نہیں ہے ہر مسلمان خلافت کا امیدوار ہو سکتا ہے بلکہ غیر قریشی کو ہی خلیفہ بنانا افضل ہے خلیفہ کے انتخاب میں تمام مسلمانوں کا مشورہ ضروری ہے اور ملی امور کثرت رائے ہی سے طے کیے جا سکتے ہیں خوارج کا ہر مخالف کافر ہے اسی کا گھر دار الحرب ہے اس سے قتال ضروری ہے ظالم یا فاسق ہونے کی صورت میں خلیفہ کو قتل یا معزول کرنا ضروری ہے جو لوگ ظالم و فاسق ائمہ کے خلاف خروج نہیں کرتے اور سکوت و توقف سے کام لیتے ہیں وہ بھی کافر ہیں اسی طرح بعض خوارج حالت حیض میں فوت شدہ نمازوں کی قضا کے قائل ہیں۔

چنانچہ نہروان میں انہیں جو بھی اپنا مخالف دکھائی دیا اس سے وہ سختی سے پیش آئے عبداللہ بن خباب اور انکی حاملہ بیوی کو بڑی بے دردی سے قتل کیا ام سنان اور صیداد کو مشق ستم بنایا الغرض جو بھی ملا اسے تلوار کے زور پر اپنے مذہب کی دعوت دی بصورت دیگر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

معرکہ نہروان

حضرت علی کو جب ان جگر خراش واقعات کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے صورت حال کی تحقیق کے لئے حارث بن مرہ کو بھیجا خوارج نے انہیں بھی قتل کر دیا اب حالات کی نزاکت کے پیش نظر انہوں نے شام پر فوج کشی کو مؤخر کر کے بروقت اس فتنے کی سرکوبی ضروری سمجھی اور پورا ایک لشکر لے کر نہروان پہنچ گئے پہلے حضرت ابو ایوب انصاری اور قیس بن سعد کو بھیج کر انہیں سمجھانا چاہا ان دونوں حضرات کو ناکامی ہوئی تو خارجی سردار ابن الکوا کو بلا کر خود ہر طرح سمجھایا لیکن جن کے دل تاریک اور عقلیں سٹ گئیں تھیں وہ پھر بھی نہ مانے مجبوراً صفیں ترتیب دے کر حضرت علی نے ان پر حملہ کیا ۵۰۰ خارجیوں کی ایک جماعت مقابلے سے پہلو بچا گئی کیونکہ اسے خلیفہ رابع سے جنگ میں تردد تھا اسی طرح ایک بڑا گروہ کوفہ چلا گیا اور ایک ہزار آدمیوں نے حضرت علی کے ہاتھ پر توبہ کی اب عبداللہ بن وہب راسبی کے پاس صرف چار ہزار خارجی بچے لیکن وہ سب سخت جان لڑاکو تھے انہوں نے جم کر مقابلہ کیا وہ کٹ کٹ کر گرتے رہے لیکن ان کے جوش میں کوئی فرق نہیں آیا شریح بن اوفی کا ایک پاؤں کٹ گیا تو دوسرے پاؤں پر کھڑے ہو کر لڑتا رہا الغرض حضرت علیؓ نے ان سب کو تہہ تیغ کر دیا اور ایک بھی زندہ نہ بچا تاریخ میں اسی جنگ کو معرکۂ نہروان کہا جاتا ہے۔

نہروان سے خارجیوں کی دو جماعتیں پہلو بچا گئیں تھیں اس لئے یہ لوگ حضرت علی کی شہادت کے بعد بھی عالم اسلام میں موجود رہے اور امیر معاویہ، مروان بن حکم عبدالملک بن مروان، یزید بن عبدالملک، ہشام بن عبدالملک، مروان ثانی، مروان بن محمد بن مروان اموی حکمرانوں، اسی طرح عباسی امراء کے خلاف خروج کر کے امت میں انتشار واضطراب پیدا کرتے رہے آج ان میں سے صرف فرقہ اباضیہ عمان اور دوسری عرب ریاستوں میں پایا جاتا ہے شیخ ابوزہرہ مصری لکھتے ہیں کہ یہ لوگ معتدل اور تشدد وغلو سے دور تھے اسی لئے وہ آج تک موجود رہے جب کہ دوسرے فرقے مندرجہ ذیل ہیں۔

مختلف فرقے

(۱) ازارقہ...... یہ نافع بن ازرق حنفی ربعی کی طرف منسوب ہے خوارج میں یہ سب سے زیادہ طاقتور اور سخت جان تھے، مذکورہ عقائد کے ساتھ وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ محصن زانی کا رجم ساقط ہے کیونکہ وہ قرآن میں مذکور نہیں پاکدامن مردوں پر تہمت لگانے والوں پر کوئی حد نہیں ہے، یہ صرف پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے والوں پر مخصوص ہے اسی طرح ان کے نزدیک انبیاء سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب بھی ہوسکتا ہے......... نافع کی سرکردگی میں ان لوگوں نے ۱۹ سال تک امویوں اور حضرت ابن زبیر سے جنگ کی نافع کے بعد عبداللہ اور اس کے بعد قطری بن فجاءہ نے اس فرقے کی قیادت کی اسی کے دور میں یہ لوگ روبہ زوال ہوئے اور شکست کھاتے کھاتے ان کا خاتمہ ہی ہوگیا۔

(۲) فرقۂ نجدات ...... یہ لوگ بنی حنفیہ کے ایک شخص نجدہ بن عویمر کی جانب منسوب ہیں ان کا وطن یمامہ تھا ۶۶ ہجری میں نجدہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان لوگوں نے بڑا عروج حاصل کیا اور بحرین، عمان، حضرموت، یمن اور طائف پر قابض ہوگئے اسی دور عروج میں ان لوگوں کو اپنے قائد نجدہ سے اقربا پروری اور احباب نوازی کی شکایت ہوئی اس نے کوئی کان نہیں دھرا نتیجتاً یہ گروہ تین فرقوں میں تقسیم ہوگیا کچھ لوگوں نے نجدہ کی کوتاہیوں سے چشم پوشی کی اور اس کی کوئی گرفت نہیں کی تاریخ میں یہی لوگ حقیقی نجدات قرار پائے ایک گروہ عطیہ بن اسود حنفی کی قیادت میں بغاوت کر کے سجستان چلا گیا اور وہیں اقامت اختیار کر لی دوسرے گروہ نے

نجدہ کو قتل کر کے اپنا لیڈر ابو فدیک کو بنایا اسی کے دور میں عبد الملک بن مروان اموی نے ان کی سرکوبی کے لئے ایک لشکر بھیجا جس نے ان کا صفایا کر کے ابو فدیک کا سر خلیفہ کی خدمت میں بھیج دیا اس طرح یہ فرقہ پوری طرح مٹا دیا گیا ازارقہ اپنے مخالفوں اور جنگ سے اجتناب کرنے والے خوارج کو بھی کافر کہتے ہیں، نجدہ اس سے اختلاف کرتے ہیں لیکن ان کے نزدیک ذمی اور معاہد کا قتل جائز ہے۔

(۳) فرقۂ صفریہ...... یہ زیاد ابن اصفر کا پیرو ہے یہ فرقہ ازارقہ سے کم اور دوسرے تمام فرقوں سے زیادہ متشدد تھا، کبائر کا ارتکاب کرنے والوں کو یہ لوگ کافر نہیں سمجھتے بلکہ اسی گناہ کے ساتھ انہیں موسوم کرتے ہیں جیسے سارق اور زانی وغیرہ عبید اللہ بن زیاد نے ان کی سرکوبی کے لئے ایک لشکر بھیجا جو غالب آیا اور ان کے سردار ابو بلال مرداس کو قتل کر دیا اس کے بعد صفریہ نے عمران بن حطان کو اپنا امام بنا لیا جو شاعر و زاہد تھا۔

(۴) فرقہ عجاردہ عبد الکریم بن عجرد کی طرف منسوب ہے جو عطیہ بن اسود حنفی کا پیرو تھا یہ لوگ مزاجاً نجدات سے زیادہ قریب ہیں جنگ سے جی چرانے والے خارجیوں کو کافر نہیں کہتے بلکہ بشرط دیانت انہیں منصب وعہدے تک دیتے ہیں ان کے نزدیک ہجرت فضیلت کا سبب تھی فرض نہیں اسی طرح مخالف کا مال اس وقت تک غنیمت قرار نہیں دیتے جب تک کہ وہ قتل نہیں کر دیا جاتا یہ لوگ قدر و جبر، بندے کی قدرت اور مخالفین کی اولاد سے سلوک جیسے مسائل کی بنیاد پر بہت جلد فرقوں میں بٹ گئے اور آپس میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا جس کے نتیجہ میں شعیبیہ میمونیہ اور ثعالبہ تین فرقوں نے جنم لیا۔

خارجی مذہب کی بنیاد کیونکہ تشدد وغلو پر ہے اس لئے کچھ لوگ اتنے آگے بڑھے کہ وہ اسلام کے دائرے سے نکل گئے اور کفران کا مقدر ٹھہرا ابو منصور بغدادی نے اپنی کتاب الفرق بین الفرق میں اس ذیل میں خوارج کے دو فرقوں کا ذکر کیا ہے جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

(۱) یزیدیہ...... یزیدیہ بن انیسہ کی جانب منسوب ہے جو پہلے اباضی تھا پھر اس نے یہ عقیدہ ایجاد کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خداوند قدوس عجم میں ایک اور رسول مبعوث کریں گے اس پر ایسی کتاب نازل ہوگی جو شریعت محمدی کو منسوخ کر دے گی۔

(۲) میمونیہ ...... یہ لوگ میمون عجردی کے پیرو تھے بنات اولاد، بھتیجیوں اور بھانجیوں سے ان کے نزدیک نکاح جائز ہے اور مجوس کی طرح وہ محارم کی حرمت کے قائل نہیں اسی طرح سورۂ یوسف کو قرآن تسلیم نہیں کرتے۔

(۱/۱۶۷) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ اَبِيْ شَيْبَةَ، ثَنَا اِسْمَاعِيْلُ بْنُ عُلَيَّةَ، عَنْ اَيُّوْبَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيْرِيْنَ عَنْ عَبِيْدَةَ عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ قَالَ وَذَكَرَ الْخَوَارِجَ فَقَالَ : فِيْهِمْ رَجُلٌ مُخْدَجُ الْيَدِ اَوْمَوْدُوْنُ الْيَدِ، اَوْمَثْدُوْنُ الْيَدِ، وَلَوْلَا اَنْ تَبْطَرُوْا لَحَدَّثْتُكُمْ بِمَا وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَقْتُلُوْنَهُمْ عَلٰى لِسَانِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْتُ اَنْتَ سَمِعْتَهُ مِنْ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: اِيْ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ

عبیدہ کہتے ہیں کہ حضرت علی نے خوارج کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ان میں ایک شخص ایسا ہوگا جس کا ہاتھ ناقص، ناکارہ یا بدبودار ہوگا اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم اترانے اور اکڑنے لگو گے تو میں تم سے اس اجر وثواب کو ضرور بیان کرتا جس کا وعدہ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ان لوگوں سے کیا ہے جو خوارج سے جنگ کر رہے ہیں میں نے پوچھا آپ نے اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے انہوں نے فرمایا ہاں رب کعبہ کی قسم، تین مرتبہ۔

﴿وذکر الخوارج﴾ سنن ابوداؤد میں ان علیا ذکر اهل نهروان کی تصریح ہے، نہروان بغداد اور واسط کے درمیان ایک وسیع وعریض خطے کا نام ہے جس میں اسکاف، جرجرایہ اور صافیہ وغیرہ جیسی کئی بستیاں واقع ہیں غالباً ۳۷ھ میں حضرت علی کی وہاں خوارج سے مشہور جنگ ہوئی۔

﴿محدج الید او مودون الید او مثدون الید﴾ امام نوویؒ نے پہلے دونوں لفظ کے معنی ناقص الید اور تیسرے کے صغیر الید مجتمعها کثندوة الثدی لکھے ہیں یعنی اس کا ہاتھ ناقص اور گوشت کا ایسا چھوٹا سا لوتھڑا ہوگا جیسے کہ پستان کی گھنڈی ہوتی ہے اس سے بدبو بھی آتی ہوگی بخاری کی روایت میں مثل ثدی المرأة او مثل البضعة اور صحیح مسلم میں علیه شعرات بیضٌ کا بھی اضافہ ہے۔

﴿ولو لا أن تبطروا الخ﴾ بطر بطراً سمع کے باب سے آتا ہے جس کے معنی نعمتوں کی بہتات کی وجہ سے اترانا، ناشکری کرنا اور دوسروں کو حقیر سمجھنا، علامہ سندھی فرماتے ہیں والمراد لولا خشية أن تفرحوا فرحاً يودى الى ترك الاعمال وكثرة الطغيان، یعنی اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ تم فرحت و مسرت میں مست ہو کر نیک اعمال چھوڑ بیٹھو گے اور حد درجہ سرکشی پر اتر آؤ گے تو میں اس عمل کا اجر و ثواب بیان کرتا، حضرت علیؓ نے یہ بات اس وقت کہی جب کہ ان کے ساتھی خوارج کی سرکوبی میں مصروف تھے اور نہروان کا معرکہ جیتا جا چکا تھا، ان کی لاشوں میں وہ شخص بھی مل گیا جس کی خبر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی حضرت علیؓ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا اور اس وقت انہوں نے ساتھیوں کو مخاطب کر کے اجمالاً یہ خوشخبری سنائی کہ وہی حضور ﷺ کی اس بشارت کا مصداق ہیں کیونکہ انہوں نے اس شخص کو قتل کیا جس کی وضاحت خود رسول اللہ ﷺ نے کی تھی لیکن اجر و ثواب کو بیان نہ کیا مبادا لوگ خود پسندی کا شکار ہو جائیں، بخاری میں خود ابو سعید خدریؓ کا یہ بیان موجود ہے واشهد أن عليا قتلهم وأنا معه جيئ بالرجل على النعت الذى نعت النبى صلى الله عليه وسلمؐ کہ میں خود حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ میں تھا جب کہ اس شخص کی لاش لائی گئی جس کی صفات حضورؐ نے بیان کی تھیں جب کہ مسلم کے الفاظ اشهد أن على بن ابى طالب قاتلهم وأنا معه فامر بذلك الرجل فالتمس فوجد فأوتى به حتى نظرت اليه على نعت رسول الله ﷺ الذى نعت منقول ہے اجر و ثواب کی بابت روایات میں زیادہ تصریح نہیں ملتی بس بخاری اور ترمذی میں فان فى قتلهم أجراً لمن قتلهم يوم القيامة منقول ہے۔

﴿ثلث مرات﴾ عبیدہ وضاحت کرتے ہیں کہ حضرت علی نے اى ورب الكعبة کا جملہ تین مرتبہ کہا چنانچہ صحیح مسلم کے طریق میں وہ تین ہی مرتبہ منقول ہے۔ حدیث مسلم (زکوٰۃ/ ۳۰) اور سنن ابی داؤد (السنۃ/ ۲۸) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی صحیح ہے۔

(۲/۱۶۸) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ اَبِىْ شَيْبَةَ وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَامِرِ بْنِ زُرَارَةَ قَالَا ثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ عَيَّاشٍ عَنْ عَاصِمٍ عَنْ زِرٍّ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ

---

۱. صحیح مسلم ۱/۳۴۳ ۲. بخاری ۲/۱۰۲۴

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَخْرُجُ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ قَوْمٌ اَحْدَاثُ الْأَسْنَانِ، سُفَهَاءُ الْأَحْلَامِ، يَقُوْلُوْنَ مِنْ خَيْرِ قَوْلِ النَّاسِ، يَقْرَأُوْنَ الْقُرْاٰنَ لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ يَمْرُقُوْنَ عَنِ الْإِسْلَامِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ فَمَنْ لَقِيَهُمْ فَلْيَقْتُلْهُمْ فَإِنَّ قَتْلَهُمْ أَجْرٌ عِنْدَ اللّٰهِ لِمَنْ قَتَلَهُمْ ۔

فرمایا: آخری زمانے میں کچھ لوگ نکلیں گے جو نوعمر اور بے وقوف ہونگے، وہ لوگوں میں سب سے عمدہ بول بولیں گے، قرآن پڑھیں گے جو ان کے حلق سے نیچے نہیں اتریگا وہ اسلام سے اسی طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے تو جو مسلمان بھی ان کو پائے وہ ان کو قتل کرے کیونکہ ان کے قتل پر اللہ کے یہاں اس شخص کے لئے اجر ہے جس نے ان کو قتل کیا۔

﴿یخرج فی اخر الزمان﴾ آخری زمانے سے کیا مراد ہے ابن تین فرماتے ہیں کہ یہاں صحابہ کا آخری زمانہ مراد ہے لیکن اس قول پر ایک طاقت ور اعتراض یہ کیا گیا کہ صحابہ کا آخری زمانہ تو پہلی صدی ہجری کے اختتام پر مانا جاتا ہے جب کہ ان لوگوں کا خروج اس سے ساٹھ ستر سال پہلے ہوا تو یہ رائے کیونکر درست ہوسکتی ہے؟ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے خلافت راشدہ کا آخری زمانہ مراد ہے جو الخلافة بعدی ثلاثون کی رو سے تیس سال قائم رہی اور حضرت علیؓ آخری زمانے میں منصب خلافت پر جلوہ افروز ہوئے پہلی کی بنسبت یہ رائے زیادہ قرین قیاس ہے اور محدثین بھی اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔

﴿أحداث الأسنان سفهاء الأحلام﴾ واحد حدث ہے معنی جوان، نوعمر، اسنان سن کی جمع ہے جس کے معنی عمر کے ہیں سفهاء کا واحد سفيه ہے یعنی جاہل بے وقوف اور أحلام حلم کی جمع ہے عقل بردباری جب کہ سفيه الحلم بدعقل کو کہتے ہیں امام نووی نے پہلے کے معنی صغا ر الأسنان اور دوسرے کے ضفاف العقول[1] لکھے ہیں یعنی نوعمری کی بنا پر وہ کم عقل ہوں گے علامہ سندھی فرماتے ہیں فان حداثةَ السِّنِّ مَحلٌ لِلْفَسادِ عادةً عموماً نوعمری ہی فساد کا سبب اور اس کی آماجگاہ ہوتی ہے اور اس کمزوری کا احساس بھی نہیں ہوتا چنانچہ وہ لوگ کج فہمی کے باوجود خود کو شریعت کا ترجمان اور امت کا پاسبان سمجھیں گے حضرت علی نے

---

1. صحیح مسلم ۱/۳۴۲

بذات خود اور کبھی دوسرے صحابہ کے ذریعے خوارج کو جس طرح سمجھایا اور ان کی جانب سے جس ہٹ دھرمی اور رعونت کے بے لچک رویے کا اظہار ہوا وہ اسی کی ایک مثال ہے۔

﴿یقولون من خیر قول الناس﴾ امام نووی فرماتے ہیں معناه فی ظاهر الأمر کقولهم لا حکم اِلّا للّٰه ونظائرهم من دعائهم الی کتاب اللّٰه تعالیٰ بظاہر اس کے معنی خارجیوں کا نعرہ لاحکم الا للّٰه ہے اور بات بات پر قرآن کی دہائی دینا اسی کی مثال ہے حافظ ابن حجر نے لکھا ہے انتزعوها من القرآن وحملوها علی غیر محملها یہ نعرہ انہوں نے قرآن سے اخذ کیا اور اسے غلط معنی بتائے اسی کے رد میں حضرت علیؓ نے کلمة حق ارید بها الباطل کا مشہور جملہ کہا تھا۔

﴿یقرأون القرآن﴾ یہاں قراءت کے دو مفہوم ہیں ایک تلاوت کی کثرت دوسرے قرآن سے استدلال کی کثرت خواہ غلط ہی کیوں نہ ہو چنانچہ حضرت علیؓ نے جب تحکیم کو کفر ماننے سے انکار کیا تو لاحکم اِلّا للّٰه کے ساتھ ایک خارجی نے بلند آواز سے یہ آیت پڑھی: ولقد اوحی الیك والی الذین من قبلك لئن اشرکت لیحبطن عملك ولتکونن من الخاسرین اے محمد ﷺ! تمہاری طرف اور تم سے پہلے انبیاء کی طرف وحی بھیجی گئی اب تم نے اگر شرک کیا تو تمہارا عمل غارت ہو جائے گا اور تم یقیناً خسارہ اٹھانے والوں میں ہوؤ گے، حضرت علیؓ نے برجستہ قرآن ہی سے جواب دیا فاصبر انّ وعد اللّٰه حق ولا یستخفنك الذین لا یوقنون تم صبر کرو یقیناً خدا کا وعدہ حق ہے اور جو لوگ یقین نہیں رکھتے وہ ہرگز تمہیں نہ اکھاڑیں یعنی راہِ راست سے نہ ہٹائیں۔

﴿لا یجاوز تراقیهم﴾ تراقی ترقوة کی جمع ہے معنی ہنسلی کی ہڈی، علامہ سندھی نے لکھا ہے ای حلوقهم بالصعود الی محل القبول، قبولیت کی جگہ تک پہنچنے کے لئے وہ ان کے حلق سے اوپر نہیں چڑھے گا اوالنزول الی القلوب لیؤثر فی قلوبهم یا دلوں میں نہیں اتر سکے گا اور اس کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا دلوں کی تاریکی کے بعد ان پر مہر لگا دی جاتی ہے پھر قرآن بھی اثر انداز نہیں ہوتا انبیاء اور اسلام کے مخالفین اسی نحوست کا شکار ہوتے ہیں۔

ع فتح الباری، ۶/ ۳۸۵ علامات النبوۃ کتاب احادیث الانبیاء

خوارج کا شرعی حکم

﴿یمرقون من الاسلام کما یمرق السهم من الرمیة﴾ مروق نصر کے باب سے آتا ہے معنی دور نکل جانا جب کہ رمیہ اس شکار کو کہتے ہیں جس پر تیر پھینکا جاتا ہے جمع رمایا یعنی اہل عرب اتنے زور سے تیر پھینکتے تھے کہ وہ رائفل کی گولی کی طرح شکار کو چیرتا ہوا دوسری طرف نکل جاتا تھا بظاہر یہ الفاظ خوارج کے ارتداد کا فیصلہ کرتے ہیں لیکن جمہور نے انہیں شدت اور تغلیظ پر محمول کیا ہے اور خوارج پر کسی نے کفر کا فتویٰ نہیں دیا امام نوویؒ نے قاضی عیاض سے نقل کیا ہے اجمع العلماء علی أن الخوارج واشباههم من أهل البدع والبغی متی خرجوا علی الامام وخالفوا رای الجماعة وشقوا العصا وجب قتالهم بعد انذارهم والا عتذار الیهم[1] یعنی علماء نے خوارج وغیرہ کے بدعتی اور باغی ہونے پر اتفاق کیا ہے اگر وہ امام پر خروج کر کے جماعت سے الگ ہو جائیں اور اطاعت کا قلادہ اتار پھینکیں تو تنبیہ اور موقف کی صفائی کے بعد ان سے قتال کرنا واجب ہے حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی نے بھی خطابی کے حوالے سے لکھا ہے اجمع علماء الاسلام علی ان الخوارج مع ضلالتهم فرقة من فرق المسلمین وأجازوا مناکحهم واکل ذبائحهم وأنهم لا یکفرون ماداموا متمسکین بأصل الاسلام[2] یعنی وہ مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ ہے ان سے شادی کی اجازت ہے ان کا ذبیحہ بھی کھایا جا سکتا ہے اور جب تک وہ اسلام کی بنیادوں سے جڑے ہیں انہیں کافر نہیں کہا جائے گا۔

امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں لکھا ہے حضرت علیؓ نے اہل قبلہ ہونے کی بنیاد پر تنبیہ کے بغیر ان سے جنگ نہیں کی اور فتح کے بعد کسی کو قیدی بنایا نہ زخمی کو قتل کیا نہ بھاگنے کا تعاقب کیا اور ان کے بیوی بچوں اور مال میں بھی کوئی تصرف نہیں کیا یہ تقریباً اجماعی مسئلہ ہے ہاں اگر ان باغیوں کے پاس اسلامی بیت المال کا کچھ سامان ہے جو مسلم حکومت کے مفاد میں ان کو دیا گیا تھا ان کی ذاتی ملکیت نہ تھی تو وہ سارا سامان وصول کر لیا جائے گا۔

اس ضمن میں یہ مسئلہ بھی آتا ہے کہ دوران جنگ مسلم باغیوں کے ہتھیار اور سامان کا استعمال

---

[1] زمر/آیت ۶۵ [2] روم/آیت ۶۰

جائز ہے یا نہیں امام نوویؒ نے لکھا ہے **لایحل الانتفاع بشیٔ من دوابهم وسلاحهم فی حال الحرب عندنا وعبد الجمهور وجوزه ابوحنیفةؒ والله اعلم**[1] لیکن مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے تصریح کی ہے کہ امام ابوحنیفہ ضرورت شدیدہ اور گھمسان کی جنگ ہی میں اس کے جواز کے قائل نہیں عام حالات میں نہیں امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی بھی یہی رائے ہے۔[2]

حدیث بخاری (استتابۃ المرتدین/۵) مسلم (زکوٰۃ/۳۰) نسائی (محاربۃ/۲۲) ابوداؤد (سنۃ/۲۸) ترمذی (فتن/۲۲) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی عمدہ ہے۔

(۱۶۹/۳) حَدَّثَنَا أَبُوْبَكْرِ بْنُ اَبِیْ شَيْبَةَ ثَنَا يَزِيْدُ بْنُ هَارُوْنَ أَنْبَأَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَمْرٍو، عَنْ أَبِیْ سَلْمَةَ، قَالَ : قُلْتُ لِأَبِیْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِیِّ: هَلْ سَمِعتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَذْكُرُ فِی الْحَرُوْرِيَّةِ شَيْئًا؟ فَقَالَ : سَمِعْتُهُ يَذْكُرُ قَوْمًا يَتَعَبَّدُوْنَ : "يَحْقِرُ أَحَدُكُم صَلَاتَهُ مَعَ صَلَاتِهِمْ، وَصَوْمَهُ مَعَ صَوْمِهِمْ يَمْرُقُوْنَ مِنَ الدِّيْنِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ، أَخَذَ سَهْمَهُ فَنَظَرَ فِیْ نَصْلِهِ فَلَمْ يَرَشَيْئًا فَنَظَرَ فِیْ رِصَافِهِ فَلَمْ يَرَشَيْئًا فَنَظَرَ فِیْ قَدْحِهِ فَلَمْ يَرَشَيْئًا فَنَظَرَ فِی الْقُذَذِ فَتَمَارٰی هَلْ يَرٰی شَيْئًا أَمْ لَا"

ابوسلمہ سے روایت ہے کہ میں نے ابوسعید خدری سے عرض کیا کہ کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ کو حروریہ کی بابت کچھ ذکر کرتے ہوئے سنا ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نے آپ سے ایسے لوگوں کا تذکرہ سنا ہے جو اتنے عبادت گذار ہوں گے کہ تم ان کی نماز کے مقابلے میں اپنی نماز کو اور ان کے روزے کے مقابلے میں اپنے روزے کو حقیر وکمتر سمجھو گے لیکن وہ دین سے اس طرح دور جا پڑیں گے جیسا کہ تیر شکار کو پھاڑ کر دور جا گرتا ہے پھر تیر انداز اپنے تیر کو اٹھا کر اس کے پھل کو دیکھتا ہے تو وہاں خون کا کوئی قطرہ نہیں پاتا پھر وہ اس کے پٹھے کو دیکھتا ہے وہاں بھی کچھ نہیں پاتا تو اس کی لکڑی میں دیکھتا ہے وہاں بھی کچھ نظر نہیں آتا ہے پھر اس کے پر میں دیکھتا ہے تو اسے شبہ ہوتا ہے کچھ خون ہے یا نہیں۔

---

[1] مسلم ۱/۳۴۲ [2] اعلاء السنن ۱۲/ ابواب احکام البغاۃ

[3] اعلاء السنن ۱۲/ باب الاختلاف فی الانتفاع بسلاح البغاۃ

﴿في الحرورية﴾ علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے نسبة الى الحروراء بالمد والقصر وهو موضع قريب من الكوفة حروراء کی طرف منسوب ہے جس میں مد وقصر کی دونوں قراءتیں ہیں کوفے کے قریب ایک حروراء وتقاقدو عندها على قتال أهل العدل ان کا نام حروریہ اس لئے پڑگیا کیونکہ انہوں نے حروراء میں قیام کیا اور وہیں اہل حق سے قتال پران کے درمیان معاہدہ ہوا۔

﴿يحقر أحدكم صلاته..........صومهم﴾ حقر حقراً ض سے آتا ہے معنی ذلیل وحقیر سمجھنا علامہ سندھی لکھتے ہیں اى يعد صلاته حقيرة قليلة بالنظر الى صلاتهم یعنی ان کی نماز کو دیکھ کر اپنی نماز کو تم میں ہر کوئی حقیر سمجھے گا یہی روایت صحیح مسلم میں حضرت علیؓ سے بھی منقول ہے جس میں مزید صراحت ہے يقرأون القران ليس قراءتكم الى قرائتهم بشيء ولا صلاتكم الى صلاتهم بشيء ولاصيامكم الى صيامهم بشئ يقراءون القران يحسبون أنهم لهم وهو عليهم[1] یعنی تمہاری قراءت، نماز اور روزے کو ان کی قراءت، نماز اور روزے سے کوئی مناسبت نہ ہوگی وہ سمجھیں گے کہ قرآن کریم ان کی شفاعت کرے گا حالانکہ وہ ان کے خلاف گواہ ہوگا، امام نوویؒ نے نصل کے معنی ہو حديد السهم لکھے ہیں یعنی تیر کا پھل جب کہ رصاف کی بابت ان کی رائے ہے هو مدخل النصل من السهم[2] یعنی لوہے کے پھل کو تیر سے جوڑنے کی جگہ، سندھی مزید وضاحت کرتے ہیں وهو عصب يلوى على مدخل النصل فى السهم یعنی درحقیقت یہ اس جھلی کا نام ہے جو لوہے کو تیر سے جوڑ کر اس کے اوپر باندھی جاتی ہے قدح کا ترجمہ دونوں نے تیر کی لکڑی بتلایا ہے۔

قذذ قذة کی جمع ہے معنی تیر کا پر۔ عرب کے تیر انداز اتنی قوت سے تیر پھینکتے تھے کہ وہ شکار کو پھاڑ کر ایسی تیزی سے دوسری طرف نکل جاتا تھا کہ اس پر خون کا ایک دھبہ بھی نہ لگتا تھا اس وقت شکاری کو شک ہوتا تھا کہ وہ شکار کے لگا ہے یا نہیں، حقیقت جاننے کے لئے وہ شروع سے آخر تک تیر کو غور سے دیکھتا تھا تو پر میں جا کر کہیں اسے خون کی رنگت کا شبہ ہوتا تھا لیکن یہ چیز بھی اتنی کم ہوتی تھی کہ وہ پھر بھی فیصلہ نہ کر پاتا تھا کہ واقعی خون ہے یا اور چیز، تماری کے معنی

---

[1] صحیح مسلم ۱/۳۴۱ [2] مسلم ۱/۳۴۳

اصل تو جھگڑا کرنے کے ہے لیکن یہاں یہ شکاری کے شک وتذبذب کی کیفیت کے آخری درجے کی تعبیر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال سے یہ حقیقت سمجھائی ہے کہ خوارج اتنی تیزی سے دین سے باہر ہو جائیں گے کہ تیر کی طرح ان پر بھی دین کا کوئی اثر باقی نہ بچے گا، شیخ مجددیؒ فرماتے ہیں وفیہِ دَلِیلٌ علی کَثرۃ الصلوۃ والصیام او القربات لا ینفعُ مع العقیدۃ الفاسدۃِ یعنی عقیدے کی خرابی کی صورت میں روزہ نماز کی کثرت بھی کوئی فائدہ نہیں دیتی، حدیث باب بخاری (فضائل القرآن/۳۶، ادب، ۹۵ وغیرہ) اور مسلم (زکوٰۃ/۳۰) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی صحیح ہے۔

(۱۷۰/۴) حَدَّثَنَا اَبُوْبَکْرِ بْنُ اَبِیْ شَیْبَۃَ ثَنَا اَبُوْأُسَامَۃَ عَنْ سُلَیْمَانَ بْنِ الْمُغِیْرَۃِ عَنْ حُمَیْدِ بْنِ هِلَالٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِالصَّامِتِ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ بَعْدِیْ مِنْ أُمَّتِیْ اَوْسَیَکُوْنُ بَعْدِیْ مِنْ أُمَّتِیْ قَوْماً یَقْرَأُوْنَ الْقُرْآنَ لَا یُجَاوِزُ حُلُوْقَهُمْ یَمْرُقُوْنَ مِنَ الدِّیْنِ کَمَا یَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِیَّۃِ ثُمَّ لَا یَعُوْدُوْ فِیْهِ هُمْ شِرَارُالْخَلْقِ وَالْخَلِیْقَۃِ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الصَّامِتِ فَذَکَرْتُ ذٰلِکَ لِرَافِعِ بْنِ عَمْرٍو أَخِیْ الْحَکَمِ بْنِ عَمْرٍو الْغِفَارِیْ فَقَالَ وَأَنَا اَیْضاً قَدْ سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ.

فرمایا: میری امت میں یقیناً میرے بعد کچھ لوگ ہوں گے جو قرآن کی تلاوت کریں گے لیکن وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا وہ دین سے اس طرح دور جا پڑیں گے لیکن جس طرح کہ تیر شکار سے نکل جاتا ہے پھر اس میں لوٹ کر نہیں آئیں گے وہ مخلوق میں سب سے بدتر ہوں گے عبداللہ بن صامت تابعی کہتے ہیں کہ میں نے یہی حدیث حکم بن عمرو غفاری کے بھائی رافع بن عمرو سے بیان کی تو انہوں نے فرمایا کہ میں بھی یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے سن چکا ہوں۔

﴿القرآن﴾ صحیح مسلم کی حدیث میں لینا رطبا کا بھی اضافہ ہے اس کی وضاحت گذر چکی ہے لیکن یہاں چند افادات اور نقل کئے جاتے ہیں قرأت کی بابت قرطبی نے لکھا ہے ھو کنایۃ عن حسن الصوت[1] امام نوویؒ نے یہاں قاضی عیاض سے دو قول نقل کئے ہیں۔

[1] فتح الباری کتاب استتابۃ المرتدین باب فن ترک قتال خوارج

(۱) لا تفقه قلوبهم ولا ينتفعون بما تلوا منه ولا لهم حظ سوى تلاوة الفم والحنجرة والحلق[۱] یعنی ان کے دلوں میں بصیرت نہ ہوگی اس لئے تلاوت سے فائدہ نہ اٹھا سکیں گے اور زبان، گلے اور حلق کی تلاوت کے سوا ان کا قرآن میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔

(۲) لا يَصعدُ لهم عملٌ ولا تلاوةٌ ولايُتقبَّلُ[۲] ان کی تلاوت وعمل آسمان پر نہ جاسکیں گے اور نہ ہی وہ قبول کئے جائیں گے حافظ ابن حجرؒ قرآن کے مفہوم کو وسیع کر کے لکھتے ہے ينطقون بالشهادتين ولا يعرفونها بقلوبهم[۳] توحید ورسالت کی تسبیح تو جپیں گے لیکن قلبی معرفت سے محروم ہوں گے تاریخ نے ان واقعات کی تصدیق کردی اور خوارج کے اندر ان صفات کا اہل نظر نے خود مشاہدہ کیا۔

﴿هم شرا الخلق والخليقة﴾ سندھیؒ نے خلق کا ترجمہ الناس اور خليقة کا البهائم کیا ہے نوویؒ فرماتے ہیں وتاوله الجمهور اى شرا لمسلمين اونحو ذلك[۴] یعنی وہ سب سے بدتر مسلمان ہوں گے۔ حدیث صحیح مسلم (زکوٰۃ/۳۰) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی درست ہے۔

(۵/۱۷۱) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكرِ بْنُ اَبِىْ شَيْبَةَ وَسُوَيْدُ بْنُ سَعِيْدٍ قَالَا: ثَنَا اَبُوْالْاَحْوَصِ عَنْ سِمَاكٍ ، عَنْ عِكْرِمَةَ ، عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "لَيَقْرَأَنَّ الْقُرْآنَ نَاسٌ مِنْ اُمَّتِىْ يَمْرُقُوْنَ مِنَ الْاِسْلَامِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ"

بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے هذا اسناد ضعيف والعلة فيه من سماك.

(۶/۱۷۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الصَّبَّاحِ أَنْبَأَنَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ عَنْ اَبِى الزُّبَيْرِ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْجِعْرَانَهِ وَهُوَ يَقْسِمُ التِّبْرَ وَالْغَنَائِمَ وَهُوَ فِىْ حِجْرِ بِلَالٍ فَقَالَ رَجُلٌ اِعْدِلْ يَا مُحَمَّدُ فَاِنَّكَ لَمْ تَعْدِلْ فَقَالَ وَيْلَكَ وَمَنْ يَعْدِلُ بَعْدِىْ اِذَا لَمْ

---

۱ ۲ شرح مسلم ۱/۳۴۲
۳ فتح الباری کتاب استیابۃ المرتدین باب من ترک قتال الخوارج
۴ شرح مسلم ۱/۳۴۲

اَعْدِلْ فَقَالَ عُمَرُ دَعْنِیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی اَضْرِبَ عُنُقَ ھٰذَا الْمُنَافِقِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ ھٰذَا فِیْ اَصْحَابٍ اَوْاُصَیْحَابٍ لَہٗ یَقْرَأُوْنَ الْقُرْاٰنَ لَا یُجَاوِزُ تَرَاقِیَھُمْ یَمْرُقُوْنَ مِنَ الدِّیْنِ کَمَا یَمْرُقُ السَّھْمُ مِنَ الرَّمِیَّۃِ۔

رسول اللہ ﷺ جعرانہ میں سونے کے ڈلے اور مال غنیمت کو تقسیم فرمارہے تھے اور وہ حضرت بلال کی گود میں تھا تو ایک شخص نے کہا اے محمدؐ! انصاف کرو کیونکہ تم نے انصاف نہیں کیا آپ نے فرمایا تجھ پر افسوس ہے میرے علاوہ کون انصاف کرے گا اگر میں انصاف نہ کروں؟ حضرت عمر نے عرض کیا مجھے اجازت دیجئے اے اللہ کے رسول تاکہ میں اس منافق کی گردن ماردوں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ یقیناً اپنے ان ساتھیوں میں شامل ہے جو قرآن کو پڑھیں گے لیکن وہ ان کے حلق سے نیچے نہ اترے گا وہ دین سے ایسے ہی دور جاپڑیں گے جیسا کہ تیر شکار سے نکل کر دور جاپڑتا ہے۔

﴿بالجعرانة﴾ یہ طائف کے راستے میں مکے سے قریب ایک جگہ کا نام ہے فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حنین پر چڑھائی کی اور بالآخر دشمنوں کو شکست دے کر جعرانہ میں مال غنیمت جمع فرمایا پھر طائف سے فارغ ہو کر تین روز تک ہوازن کا انتظار کیا لیکن جب وہ نہیں آئے تو آپ نے مال غنیمت کی تقسیم شروع کردی اور قریش وانصار کی بنسبت مولفۃ القلوب کو ترجیح دی جس سے انہیں شکایت بھی ہوئی مذکورہ شخص بھی تقسیم سے غیر مطمئن تھا۔

﴿وھو یقسم التبر والغنائم﴾ واحد تبرہ اور غنیمة ہے پہلے کے معنی بغیر ڈھلا سونا اور چاندی ہے جب کہ دوسرے کا مطلب واضح ہے۔

﴿وھو فی حجر بلال﴾ صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں وفی ثوب بلال فضة ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقبض منھا یعطی الناس یعنی سونے وچاندی کے بہ ڈھلے حضرت بلالؓ کی چادر میں تھے آپ اس میں سے لے کر لوگوں کو دے رہے تھے۔

﴿فقال رجل﴾ صحیح مسلم کے طریق میں ذوالخویصرة رجل من بنی تمیم کی صراحت ہے یعنی اس کا نام ذوالخویصرہ تھا اور وہ بنی تمیم کے قبیلے سے تھا، بخاری، مسلم اور نسائی

میں اس کی یہ صفات بھی مذکور ہیں غائر العینین مشرف الوجنتین ناشز الجبهة کث اللحیة محلوق الرأس مشمر الازار سنن نسائی میں رجل اسود مطموم الشعری علیه ثوبان بیضان کا بھی اضافہ ہے یعنی۔وہ کالا گنجا آدمی تھا اور اس کے جسم پر دو سفید کپڑے تھے۔

﴿ومن یعدل بعدی اذا لم اعدل﴾ مسلم کی حدیث میں ان الفاظ کا اور اضافہ ہے لقد خبت وخسرت ان لم اکن اعدل اگر میں نے انصاف نہیں کیا تو میں خائب وخاسر ٹھہرا، دوسرے طریق میں ہے فمن یطیع الله ان عصیت أیأمنني علی أهل الأرض کتنی عجیب بات ہے کہ دنیا والوں کے معاملے میں باری تعالیٰ تو مجھ سے مطمئن ہے لیکن تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتے۔

﴿فقال عمر﴾ بخاری ومسلم کے ایک طریق میں بھی حضرت عمر ہی کی صراحت ہے لیکن مسلم کے دوسرے طرق میں خالد بن ولید کا نام ملتا ہے امام نووی فرماتے ہیں لیس فیهما تعرض بل کل واحد منهما استأذن فیه یعنی پہلے حضرت عمر نے اور پھر حضرت خالد بن ولید نے اسے قتل کرنے کی اجازت مانگی۔

﴿اواُصیحاب له﴾ اصحاب کی تصغیر ہے جس سے اس کے ساتھیوں کی قلت کی طرف اشارہ ہے حدیث باب میں جواب مختصر ہے جب کہ بخاری، مسلم میں وہ مفصل منقول ہے اور باب کی تیسری حدیث بھی اسی کی ایک کڑی ہے صحیحین میں اس کے بعد ان ادرکتهم لأقتلنهم قتل عاد اور دوسرے طریق میں لان ادرکتهم لأقتلنهم قتل ثمود آیا ہے حدیث کے راوی حضرت ابوسعید خدری نے شہادت دی ہے واشهد ان علیا بن ابی طالب قاتلهم وأنا معه فامر بذلك الرجل فالتمس فوجد فاتی به حتی نظرت الیه علی نعت رسول الله صلی الله علیه وسلم الذی نعت یعنی حضرت علیؓ نے خوارج سے جنگ کی تو ابوسعید خدری بھی آپ کے ساتھ تھے آخر میں خلیفہ رابع نے اس شخص کو ڈھونڈنے کا حکم دیا وہ جب لایا گیا تو وہ ویسا ہی تھا جیسا حضورؐ نے بیان کیا۔

گستاخِ رسول

شاتم رسول اتنا بڑا مجرم ہے کہ پوری امت نے اسے واجب القتل قرار دیا ہے لیکن یہاں رسول اللہ ﷺ نے اسے قتل کرنے کی اجازت نہیں دی اس کی کئی وجوہات ہیں پہلی یہ کہ آپ منافقوں کے قتل کو بھی ناپسند کرتے تھے مبادا دشمن غلط پروپیگنڈہ کریں یہ شخص تو پھر مسلمان تھا اور بشری تقاضا اس کی جرأت کا سبب تھا اس لئے غالباً آپ نے اسے معاف فرمادیا، شاتم رسول پر بحث گزر چکی ہے۔

دوسری وجہ حضرت کشمیریؒ نے تکوینی بتلائی ہے فرماتے ہیں لأنه علم أنه ان قدر الله سبحانه خروجهم لا يصد عن تقديره امر فلا يتمكنون من قتله وهكذا وقع فانهم طلبوه يقتلوه فلم يجدوه[1] آپ کو علم تھا کہ جب اللہ نے اس کی نسل سے ایک قوم کا ظہور مقدر کردیا ہے تو صحابہ اس کے قتل پر قادر نہ ہوسکیں گے چنانچہ یہی ہوا بعد میں جب انہیں قتل کی اجازت ملی تو اس کو نہ پاسکے...... حدیث بخاری (استتابۃ المرتدین/ ۵ وغیرہ) مسلم (زکوۃ/ ۳۰) اورنسائی (محاربۃ/ ۲۲) میں بھی آئی ہے ابن ماجہ کی سند کی بابت بوصیری نے اسناد صحیح کا فیصلہ کیا ہے[2]۔

(۱۷۳/۷) حَدَّثنا اَبُوْبَكْرِ بْنُ اَبِيْ شَيْبَةَ ثَنَا اِسْحَاقُ الْاَزْرَقُ عَنِ الْاَعْمَشِ عَنِ ابْنِ اَبِي اَوْفى، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْخَوَارِجُ كِلَابُ النَّارِ"

حافظ بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے رجاله ثقاة الا ان فيه انقطاعا فان الاعمش لم يسمع من ابن ابی اوفی اس لئے حدیث ضعیف قرار پاتی ہے پھر براہ راست کسی کو کتا کہنا نبی کی شان سے بعید لگتا ہے۔

(۱۷۴/۸) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ ثَنَا يَحْيَى بْنُ حَمْزَةَ حَدَّثَنَا الْاَوْزَاعِيُّ، عَنْ نَافِعٍ ،عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: يَنْشَأُ نَشْءٌ يَقْرَؤُنَ الْقُرْآنَ لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ كُلَّمَا خَرَجَ قَرْنٌ قُطِعَ ، قَالَ ابْنُ عُمَرَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: كُلَّمَا خَرَجَ قَرْنٌ قُطِعَ" اَكْثَرَ مِنْ عِشْرِيْنَ مَرَّةً "حَتّٰى يَخْرُجَ فِيْ عِرَاضِهِمُ الدَّجَّالُ"

---

[1] صحیح مسلم ۳۴۱/۱ [2] فیض الباری ۳۹۸/۴

نشأ، نشئة، فتح اور کرم سے آتا ہے معنی نو پید ہونا نشیٔ نسل، قرن جمع قرون کے مختلف معنی آتے ہیں لیکن یہاں راجح نسل کے معنی ہیں۔

﴿کلما خرج قرن قطع﴾ علامہ سندھی لکھتے ہیں ای ظهرت طائفة منهم استحق أن يقطع ، یعنی جب بھی خوارج کا کوئی گروہ مسلمانوں میں ظاہر ہو اس کا قلع قمع کر دیا جائے۔

﴿اکثر من عشرین مرّة﴾ یہ ابن عمر کا قول ہے یا حضور کا فرمان؟ حضرت مولانا عبدالغنی مجددی نے انجاح الحاجۃ میں دونوں احتمال ظاہر کیے ہیں ابن عمرؓ کے قول ہونے کا مطلب بالکل واضح ہے یعنی انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بیس سے زیادہ سنی ہے جب کہ دوسری صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ خوارج بیس مرتبہ سے زیادہ ظاہر ہوں گے اور ہر دفعہ اہل حق کے ذریعہ ان کا زور توڑ دیا جائے گا اموی اور عباسی دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کے بعد بھی بار بار خروج کیا اور بنی امیہ کے تو کسی خلیفہ کا دور عمر بن عبدالعزیز کو چھوڑ کر ان کی بغاوت سے خالی نہیں لیکن یہ تعداد کتنی ہے اس کا صحیح علم اللہ ہی کے پاس ہے۔

﴿حتی یخرج فی عراضهم الدجال﴾ بعض حضرات نے اس کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ آخر زمانے میں دجال بھی خوارج ہی کی نسل سے ظاہر ہوگا ہمارے نزدیک یہ درست نہیں کیونکہ صحیح احادیث نسلاً اس کے یہودی ہونے کا فیصلہ کرتی ہیں جب کہ خوارج اکثر عرب تھے............عراض عرض کی جمع ہے جس کے مختلف معنی ہیں لیکن یہاں راجح پہاڑ اور گھاٹی کے معنی ہیں اب دو مفہوم سمجھ میں آتے ہیں ایک تو یہ کہ دجال بھی ان ہی گھاٹیوں اور پہاڑوں سے خروج کرے گا جہاں سے خوارج نے کیا یہ عراق وشام کا علاقہ ہے اور احادیث میں صراحت ہے کہ دجال ان دونوں ملکوں کی گھاٹیوں سے نکلے گا جب کہ دوسری بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ مسلسل خروج کرتے رہیں گے یہاں تک کہ جب دجال کا ظہور ہوگا تو خوارج کے باقی ماندہ لوگ بھی اس کے پیچھے لگ جائیں گے نسائی کی حدیث لایزال یخرجون حتی یخرج آخرهم مع المسیح الدّجال اسی کی دلیل ہے......سند کی بابت بوصیری نے زوائد میں لکھا ہے هذا اسنادٌ صحیح وقد احتج البخاری بجمیع رواته.

(۹/۱۷۵) حَدَّثَنَا بَكْرُ بْنُ خَلَفٍ اَبُوْبِشْرٍ، حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ، عَنْ مَعْمَرٍ عَنْ قَتَادَةَ، عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ "يَخْرُجُ قَوْمٌ فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ، أَوْفِيْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، يَقْرَؤُنَ الْقُرْآنَ لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ، اَوْحُلُوْقَهُمْ، سِيْمَاهُمُ التَّحْلِيْقُ اِذَا رَأَيْتُمُوْهُمْ، أَوْ لَقِيْتُمُوْهُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ"

آخر زمانے یا اس امت میں کچھ لوگ ظاہر ہوں گے جو قرآن کو پڑھیں گے وہ ان کے گلے یا حلق سے نہیں اترے گا ان کی علامت تحلیق ہوگی جب تم ان کو دیکھو یا ملو تو انہیں قتل کر دینا۔

خروج کا شرعی حکم

اسلامی نظام خلافت امت کی پہلی ترجیح ہے جو امراء کی مکمل پیروی کا تقاضہ کرتا ہے حتی کہ قرآن نے اللہ اور رسول کے بعد انہیں کی اطاعت پر زور دیا ہے یا أیها الذین امنوا اطیعوا اللّٰه وأطیعوا الرسول وأولی الأمرمنکم بخاری کی حدیث ہے من یطیع الأمیر فقد أطاعنی ومن یعص الأمیر فقد عصانی اگر کوئی امیر فاسق ہو جائے تب بھی خروج وقتال جائز نہیں مسلم کی حدیث میں صحابہ نے ایسے امراء کی بابت استفسار فرمایا، افلا نقاتلهم کیا ہم نے ان جنگ نہ کریں؟ آپ نے فرمایا لا ماصلوا[1] نہیں جب تک وہ نماز پڑھیں امام نوویؒ نے اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے لا یجوز الخروج علی الخلفاء بمجرد الظلم والفسق مالم یغیر واشیئا من قواعد الاسلام محض فسق وظلم کی بنیاد پر بغاوت جائز نہ ہوگی الا یہ کہ وہ اسلامی بنیادوں ہی کو ڈھانے لگیں اور ان سے کفر صریح سرزد ہو، حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے اعلاء السنن/۱۲ میں اس مضمون کی احادیث پر باب محاربة أهل البغی وامتناع الخروج علی الامام ولوجابراً فاسقاً مالم یأت بکفر بواح کا ترجمہ قائم کیا ہے جو مذکورہ موقف ہی کی وضاحت کرتا ہے اس صورت میں ائمہ سے خروج وقتال باتفاق امت حرام ہے جیسا کہ امام نوویؒ شرح مسلم میں تصریح کرتے ہیں أما الخروج علیهم وقتالهم فحرام باجماع المسلمین وان کانوا فسقة ظالمین.

مذکورہ صورت میں اگر کوئی فرد یا جماعت امیر المسلمین کے خلاف خروج وبغاوت کریگی تو

---

[1] مسلم ۲/۱۲۸

اہل سنت والجماعت کے نزدیک وہ کبیرہ کے ارتکاب کی بنا پر فاسق قرار دی جائے گی علامہ آلوسی لکھتے ہیں الباغی علی الامام ولو جائراً فاسقاً مرتکب الکبیرۃ ان کان بغیہ بلا تاویل اوبتأویل قطعی البطلان قرآن نے ان سے قتال کا حکم دیا ہے فان بغت احدٰھما علی الأخری فقاتلوا التی تبغی حتی تفیئ الی امر اللّٰہ حضرت علیؓ کے دور میں جب خوارج نے بغاوت کی تو ان کے ساتھ خلیفہ رابع نے جو سلوک کیا وہ احادیث وآثار کی کتابوں میں محفوظ ہے مسند احمد، مستدرک حاکم، بیہقی اور فتح القدیر کی تفصیلی روایت بتلاتی ہے کہ حضرت ابن عباس نے پہلے خوارج کو دلیلیں دے کر سمجھایا اوران کے تمام شبہات کو دور کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں دو ہزار لوگوں نے جنگ سے علیحدگی اختیار کی اور باقی کو حضرت علیؓ نے گھیر کر قتل کر دیا، مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے ان احادیث پر اعلاء السنن /۱۲ میں باب یستحب للامام أن یدعوا البغاۃ الی العود الی الجماعۃ ویکشف عن شبھتھم کا ترجمۃ الباب قائم کیا ہے اورامام قدوری نے لکھا ہے۔

اذا تغلب قوم من المسلمین علی بلد وخرجوا من طاعۃ الامام دعاھم الی العود الی الجماعۃ وکشف عن شبھتھم ولا یبدأھم بالقتال حتی یبدءوہ فان بدأو قاتلھم حتی یفارق جماعتھم......ولا یبدأھم بالقتال یہ امام قدوری کی منفرد رائے ہے جب کہ دوسرے فقہاء نے لکھا ہے کہ جب وہ لشکر فراہم کرلیں تو ان کی جانب سے یورش کا انتظار نہیں ہوگا بلکہ فوراً قتال ضروری ہے حضرت علیؓ کا اسوہ بھی یہی بتاتا ہے۔

﴿سیما ھم التحلیق﴾ سنن ابی داوٗد میں تحلیق کے ساتھ تسمید کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی امام ابوداوٗد نے استئصال الشعر بتلائے ہیں اسلئے اب دوسری توجیہات کی یہاں کوئی گنجائش نہیں رہتی تحلیق سے حلق رأس ہی مراد ہے چنانچہ محدثین نے تصریح کی ہے کہ خوارج کے یہاں تحلیق کا خاصا اہتمام تھا لیکن یہ محض علامت کے طور پر ہے اور علامت امام نووی کی تصریح کے مطابق حرام اور مباح دونوں ہوسکتی ہیں فرماتے ہیں وانما ھو علامۃ لھم والعلامۃ قد تکون بحرام وقد تکون بمباح[1] مثلا دجال کی علامت کا نا ہونا

---

[1] صحیح مسلم ۱/۳۴۲

ہے حالانکہ کانا ہونا شرعاً کوئی ناجائز اور حرام نہیں ہے اسی طرح عمدہ قرآن پڑھنا بھی خوارج کی علامت ہے جو محمود ہی نہیں بلکہ مطلوب بھی ہے اس لئے مذکورہ علامت سے تحلیق کے عدم جواز پر استدلال نہیں کیا جاسکتا مولانا عبدالغنی مجددی نے انجاح الحاجۃ میں لکھا ہے **ليس فيه ذم التحليق بل هي علامة لتلك الفرقة** رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کی سنت گرچہ وفرہ، جمہ اورلمہ ہی ہے لیکن تحلیق کے جواز میں بھی کوئی شبہ نہیں، جیسا کہ متعدد روایات سے پتہ چلتا ہے اورخلیفہ رابع کی بابت ابوداؤد **كتاب الطهارة باب في غسل من الجنابة** میں وضاحت ہے کہ وہ تحلیق ہی کے عادی تھے فرماتے تھے **ومن ثم عاديت راسي** یعنی میں اپنے بالوں کا دشمن ہوگیا حدیث مختصراا بوداؤد (سنہ/ ۲۹) میں بھی آتی ہے اورابن ماجہ کی سند درست ہے۔

(۱۷۶/۱۰) حَدَّثَنَا سَهْلُ بْنُ أَبِیْ سَهْلٍ ثَنَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ عَنْ أَبِیْ غَالِبٍ عَنْ أَبِیْ أُمَامَةَ يَقُوْلُ شَرُّ قَتْلَى قُتِلُوْا تَحْتَ أَدِيْمِ السَّمَاءِ وَخَيْرُ قَتِيْلٍ مَنْ قَتَلُوْ، كِلَابُ اَهْلِ النَّارِ قَدْ كَانَ هٰؤُلَاءِ مُسْلِمِيْنَ فَصَارُوْا كُفَّارًا قُلْتُ يَا أَبَا أُمَامَةَ هٰذَا شَئٌ تَقُوْلُهُ قَالَ بَلْ سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ .

آسمان کے نیچے قتل کیے جانے والے یہ بدترین مقتول ہیں، اور بہترین مقتول ہے وہ شخص جس کو انہوں قتل کیا اور یہ اہل دوزخ کے کتے ہیں پہلے مسلمان تھے پھر کافر ہو گئے ابو غالب کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے ابوامامہ یہ آپ کہہ رہے ہیں؟ انہوں فرمایا نہیں بلکہ یہ الفاظ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنے ہیں۔

روایت کا پس منظر ترمذی میں نقل کیا گیا ہے **رأى بوامامة رءوساً منصوبة على درج دمشق** یعنی دمشق کے راستہ پر خوارج کے سروں کو رکھا ہوا دیکھ کر انہوں نے یہ بات کہی۔

﴿**شر قتلى...... من قتلو**﴾ ترمذی میں صراحت ہے کہ پھر انہوں نے **يوم تبيعض وجوه وتسود وجوه** والی آیت آخر تک پڑھی، علامہ سندھی نے لکھا ہے کہ یہاں خبر محذوف ہے تقدیر عبارت **هم شر قتلى** ہے۔

﴿**وخير قتيل من قتلوا**﴾ یہاں **قتلوا** کے بعد ضمیر مفعولی مقدر ہے جو **من** موصولہ کی طرف لوٹتی ہے سندھی نے اسکے معنی یہ لکھے ہیں **خير قتيل من قتله الخوارج فانه شهيد.**

﴿کلاب أهل النار﴾ یہ ھم مبتدامحذوف کی دوسری خبر ہے کما صرح السندھی

﴿هذا شيء تقوله﴾ ترمذی میں أنت سمعته من رسول اللهﷺ منقول ہے۔

﴿بل سمعته من رسول الله﴾ ترمذی میں یہ مزید اضافہ ہے لولم اسمعه الا مرة اومرتين اوثلاث او اربع حتى عد سبعاً ماحد ثتكموهُ یعنی اگراس مضمون کو میں نے آپ سے ایک مرتبہ یا دومرتبہ یا تین چار یہاں تک کہ سات تک شمار کرایا، نہ سنا ہوتا تو میں اس کوتم سے بیان نہ کرتا حدیث ترمذی (تفسیر/آل عمران) میں بھی آئی ہے مصنفؒ نے اس کو حسن کہاہے ابن ماجہ کی سند کا بھی تقریباً یہی درجہ ہے۔

باب فيما أنكرت الجهمية

عہد صحابہ کے بعد جب مسلمانوں کا عجمی فلسفوں سے واسطہ پڑااور یہودیوں نے اسلام میں داخل ہوکر عیسائیت کی طرح دین محمدی کی عمارت کومنہدم کرنا چاہاتو بعض سادہ لوح جوکم علم تھے اورانہوں نے اچھی تربیت بھی نہیں پائی تھی ان فتنوں کیلئے نرم چارہ ثابت ہوئے اورمتعدد فرقے ظہور میں آگئے۔

تعارف

انہیں میں ایک فرقہ جبریہ،جہمیہ ہے اس کا آغاز عہد بنی امیہ کے اوائل میں ہوااوراموی دور کے آخر میں اسنے ایک مکتب فکر کی شکل اختیار کرلی۔اس کا بانی کون تھا؟اس کے جواب میں تاریخ ہمارے سامنے جعد بن درھم،ابان بن سمعان اور جہم بن صفوان کے نام پیش کرتی ہے تینوں ہی کا یہودیوں سے کھلا تعلق تھااوراس کا ظہور شہر ترمذ سے ہوا،ابن خُزیمہ نے اپنی صحیح میں ابن قدامہ کی سند سے ابومعاذ بلخی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جہم بن صفوان علم اور علماء سے دور ہونیکے باوجود بڑا فصیح وبلیغ اور چرب زبان تھا ۱۳۰ ھجری میں مسلم بن احوذ مازنی نے اسے خراسان کے شہر مُرو میں قتل کردیا وہ صرف معرفت قلب کوعین ایمان قرار دیتا تھا،حضرت امام ابوحنیفہؒ سے اس موضوع پراس کا مناظرہ بھی ہوا ہے جسے شیخ ابوزہرہ نے علامہ مکی کی المناقب کے حوالے

۱۔ صحیح مسلم ۱/۳۴۲

سے اپنی مشہور کتاب أبو حنیفة حیاته وعهده آرائه و فقهه میں نقل کیا ہے۔

عقائد

جہمیہ جو خود کو صوفیا بھی کہتے ہیں کا عقیدہ ہے کہ ایمان صرف معرفت قلب کا نام ہے اسکے بعد بندہ چاہے زبان سے انکار کرے وہ کامل الایمان ہے، اسی طرح ایمان کے بعد اعمال صالحہ کی کوئی ضرورت نہیں اور افعال سیئہ سے ایمان متأثر نہیں ہوتا خدا کا علم وکلام دونوں حادث یعنی مخلوق ہیں اشیاء کے وجود سے پہلے اللہ کو اسکا علم نہیں ہوتا بندہ مجبور محض ہے اسے کوئی اختیار نہیں اور اسکے تمام افعال کا خالق اللہ ہے اللہ کی ذات کے علاوہ کوئی چیز قدیم نہیں یہ باری تعالیٰ کی تمام صفات کے منکر، ہیں اور اسکو ایسی کسی صفت کے ساتھ متصف کرنا جائز نہیں سمجھتے جو بندوں میں بھی پائی جاتی ہو چنانچہ انہوں نے اللہ کے حی اور عالم ہونے کا انکار کیا کیونکہ وہ بندوں کی بھی صفات ہیں اور اسکو صرف فاعل، خالق اور قادر کہا جو بندوں کے اوصاف نہیں ہیں، انبیاء اور امتیوں کا ایمان یکساں ہے، اس میں ادنی کوئی فرق نہیں آخرت میں سزاء کے بعد جنت اور جہنم کو فناء کردیا جائے گا اور قرآن وحدیث میں جو خالدین کی وضاحت ہے اس کا مطلب بس کثرت ہے جہم نے امام ابو حنیفہؒ کے بقول تشبیہ کی نفی میں اتنی شدت برتی کہ وہ تعطیل و تجمید کا قائل ہوگیا، اس کے قتل کے بعد امام ابو منصور ماتریدی اور ابوالحسن اشعری کے جانشینوں نے دوسرے فرقوں کی طرح جہمیہ کا بھی صفایا کرڈالا اور آج وہ بس کتابوں تک محدود ہے۔

(۱/۱۷۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ نُمَيْرٍ ثَنَا أَبِيْ وَوَكِيْعٌ ح وَحَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا خَالِيْ يَعْلَى، وَوَكِيْعٌ وَابُوْ مُعَاوِيَةَ قَالُوْا ثَنَا اِسْمَاعِيْلُ بْنُ أَبِيْ خَالِدٍ عَنْ قَيْسِ بْنِ أَبِيْ حَازِمٍ عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ كُنَّا جُلُوْسًا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَنظَرَ اِلَى الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، فَقَالَ اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ هٰذَا الْقَمَرَ لَا تَضَامُّوْنَ فِيْ رُؤْيَتِهِ فَأَنْ اِسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَا تُغْلَبُوْا عَلٰى صَلوٰةٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا فَافْعَلُوْا ثُمَّ قَرَأَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا.

ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے آپ نے چاند کی طرف دیکھا جو چودہویں رات کا تھا پھر فرمایا تم یقیناً بہت جلد اپنے رب کو ایسے ہی دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو اس کے دیدار میں تم بھیڑ نہیں کرو گے تو اگر تم کو اس بات پر قدرت ہو کہ سورج کے طلوع اور غروب سے پہلے والی نماز میں تم مغلوب نہ کئے جاؤ تو اس کو کرو پھر آپ نے مذکورہ آیت پڑھی۔

﴿ليلة البدر﴾ سنن ابی داؤد میں ليلة أربع عشرة کی بھی وضاحت ہے۔

﴿كما ترون هذا القمر﴾ علامہ سندھی نے لکھا ہے کہ یہ جملہ مصدر کی صفت ہے اور وہ غالبا رویۃ محذوف ہے امام نووی فرماتے ہیں أی تَرونَهٗ رُؤيَةً مُحَقَّقَةً لا شك فيها ولا مشقةَ كما ترون هذا القمر رؤيةً محققةً بلا مَشتقةٍ فهو تشبيه للرؤية بالرؤية بالمرئى والرؤيا مختصة بالمومنين[1] یعنی تم یقیناً بغیر کسی مشقت کے باری تعالیٰ کو ضرور دیکھو گے جس طرح کہ بلا مشقت تم چاند کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو تو یہاں رویت کی رویت سے تشبیہ ہے مرئی کی مرئی سے تشبیہ نہیں ہے اور رؤیت باری اہل ایمان کے لئے مخصوص ہوگی چاند اور باری تعالیٰ کی رؤیت میں ایک باریک فرق بیان کرتے ہوئے مولانا عبدالغنی مجددی نے لکھا ہے لا يحيط بكنهه أحدكما فى قوله تعالىٰ مثل نوره كمشكوة فيها مصباح یعنی باری تعالیٰ کا رویت کے وقت کوئی احاطہ نہ کر سکے گا جبکہ ہم چاند کا احاطہ کر لیتے ہیں۔

﴿لا تضا مون فى رؤيته﴾ امام نوویؒ نے اس کی دو لغات لکھی ہیں تَضامُّون جو ضم (ن) ضما (ن) سے دراصل تتضا مّون ہے اور ان کے نزدیک معنی تتلطفون فى التوصل إلى رؤيته یعنی تم چاند کو دیکھنے میں آسانی محسوس کرتے ہو دوسری لغت تُضامُوْن جو دراصل ضام (ض) ضیما سے مجہول مخاطب کا صیغہ ہے اور نووی کے نزدیک معنی هل يلحقكم ضيم وهو المشقة والتعب ہے یعنی کیا تمکو پریشانی و تکلیف ہوتی ہے نووی کا رجحان یہی معلوم ہوتا ہے۔

﴿أن لا تغلبوا﴾ یہ مجہول سے جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے جس کے معنی علامہ سندھی نے یہ بتلاتے ہیں لايغلبنكم الشيطان حتى تتركوهما اوتؤخروهما عن الأول یعنی شیطان تم

---

[1] مسلم ۱/۲۲۸

پر ایسا ہرگز غالب نہ آئے کہ تم فجر وعصر کی نمازوں کو چھوڑ دو یا ان کو اول وقت سے مؤخر کر دو سندھی مزید فرماتے ہیں دلالة علی أن المحافظ علی هاتين الصلاتين خليق بأن يرى ربه یہ الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ ان دونوں نمازوں کا اہتمام کرنے والا دیدار الٰہی کے لائق ہے[1]۔

رؤیت باری

یہاں دو باتیں غور طلب ہیں پہلی رؤیت باری کیا دنیا میں ممکن ہے تو اہل سنت والجماعت کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے امام نووی نے لکھا ہے واما رؤيت الله فى الد نيا فقد قدمنا انها ممكنة ممکن تو ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب اَرنى اَنظُر اليك کا مطالبہ کیا تھا اور نبی ناممکن کا مطالبہ نہیں کرتا، لیکن نووی نے لکھا ہے لكن الجمهور من السلف والخلف من المتكلمين وغير هم أنها لا تقع فى الدنيا[2] سلف وخلف متکلمین وغیرہ امکان رؤیت کے باوجود دنیا میں اس کے وقوع کے قائل نہیں۔

دوسری بات آخرت میں زیارت باری سے متعلق ہے جس کے قرآن میں متعدد دلائل ہیں لیکن دو آیتیں اتنی قطعی اور واضح ہیں کہ انکی رؤیت سے الگ کوئی تفسیر تاویل نہیں، پہلی سورۃ قیامہ کی آیت، وجوه يو مئذ نا ضرة اِلى ربها نا ظرة کہ بہت سے تروتازہ چہرے اس دن اپنے پروردگار کا دیدار کر رہے ہوں گے دوسری سورہ مطففین کی آیت، ثم إنهم عن ربهم يومئذ لمحجوبون یعنی کفار کو اس دن دیدار خداوندی سے روک دیا جائیگا ان دونوں کے علاوہ دیگر قرآنی دلائل کی حیثیت اشارات کی ہے جبکہ احادیث میں رؤیت کے مضمون کو امام نووی کی تصریح کے مطابق ۲۰ صحابہ نے نقل کیا ہے جو تواتر سے بھی اوپر کا درجہ ہے کیونکہ حافظ سیوطی نے تدريب الراوى میں لکھا ہے کہ کسی حدیث کو اگر دس صحابہ بھی روایت کر دیں تو وہ متواتر ہو جاتی ہے اس لئے رؤیت باری پر اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے۔

مسلمانوں میں معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ نے رؤیت باری کا صراحۃ انکار کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ رؤیت کا وقوع اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مرئی ایک محدود مکان اور معین سمت میں نہ ہو اور وہ رائی کے سامنے ہو دونوں کے درمیان مناسب مسافت ہو مرئی نہ اتنی قریب ہو کہ قرب

[1] نور/آیت ۳۵ [2] مسلم ۱/۹۹

کی وجہ سے دکھائی نہ دے جیسے ناک، رخسار اور لب وغیرہ اور نہ وہ اتنی دور ہو کہ بعد کی وجہ سے وہاں تک آنکھ کی رسائی نہ ہو سکے اسی طرح اسکے وقوع کی لئے قوت باصرہ کی شعاعوں کا مرئی سے اتصال بھی لازمی ہے ظاہر ہے کہ باری تعالیٰ مکان، سمت، بعد، قرب وغیرہ سے بالاتر ہیں اور یہ چیزیں اسکی ذات کے منافی ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ تمام چیزیں ان لوگوں کی کم عقلی پر دلاکت کرتی ہیں کہ نادانوں نے مغیبات کو موجودات پر قیاس کرلیا اور دنیا و آخرت کے فرق کو ملحوظ نہ رکھ سکے عالم بالا کی تو چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی عقل کی گرفت میں نہیں آسکتی علامہ تفتازانی کا ایک جملہ **قیاس الغا ئب علی الشاهد فا سدٌ** ان کے تمام دلائل کو چھلنی کر دیتا ہے، اور عمر نسفی فرماتے ہیں **فیری لا فی مکان ولاعلی جهة من مقابلة واتصال شعاع اوثبوت مسافة بین الرائی وبین اللّٰه تعالیٰ** اس لئے اب عقل ونقل کی رو سے رویت کی بابت کوئی اشکال نہیں رہتا۔

حدیث صحیح بخاری (**مواقیت الصلاة ۱۵/ ۔ ۲۵ توحید ۲۴/**) سنن ابی داؤد (**سنة ۲۰/**) جامع ترمذی (**صفة الجنة ۱۶/**) اور صحیح مسلم (**کتاب المسا جد باب بیان ان اول وقت المغرب عندغروب الشمسر**) میں بھی آئی ہے ابن ماجہ کی سند بھی درست ہے۔

(۱۷۸/۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ نُمَيْرٍ، ثَنَا يَحْيَى بْنُ عِيسَى الرَّمْلِيُّ، عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ أَبِيْ صَالِحٍ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: تَضَامُّوْنَ فِيْ رُؤْيَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ؟ قَالُوْا: لَا قَالَ: فَكَذٰلِكَ، لَا تَضَامُّوْنَ فِيْ رُؤْيَةِ رَبِّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

(۲) فرمایا، تم تو چودہویں رات میں چاند دیکھنے میں کوئی مشقت محسوس کرتے ہو صحابہ نے عرض کیا نہیں فرمایا اسی طرح قیامت کے دن تم اپنے رب کو دیکھنے میں بھیڑ نہیں کروگے۔

﴿**تضا مون فی رؤیة القمر**﴾ سندھی نے لکھا ہے **بتقدیر حرف الاستفهام** کہ یہاں حرف استفہام محذوف ہے اور جملہ سوالیہ ہے حدیث کے تمام روات ثقہ ہیں۔

(۱۷۹/۳) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ الْهَمْدَانِيُّ، ثَنَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ اِدْرِيْسَ عَنْ الْأَعْمَشِ، عَنْ أَبِيْ صَالِحٍ السَّمَّانِ، عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ، قَالَ: قُلْنَا:

يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ، أَنَرَى رَبَّنَا؟ قَالَ: تُضَامُّوْنَ فِي رُؤْيَةِ الشَّمْسِ فِي الظَّهِيْرَةِ فِيْ غَيْرِ سَحَابٍ؟ قُلْنَا: لَا، قَالَ: فَتَضَارُّوْنَ فِي رُؤْيَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ فِيْ غَيْرِ سَحَابٍ؟ قَالُوْا: لَا، قَالَ: اِنَّكُمْ لَاتَضَارُّوْنَ فِيْ رُؤْيَتِهِ اِلَّا كَمَا تَضَارُّوْنَ فِيْ رُؤْيَتِهِمَا .

ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کیا ہم اپنے رب کو دیکھ سکیں گے فرمایا جب بادل نہ ہو تو دوپہر کو تم سورج دیکھنے میں مشقت اُٹھاتے ہو؟ ہم نے کہا نہیں، فرمایا جب بادل نہ ہو تو چودہویں رات میں تم چاند دیکھنے میں کوئی مشقت اٹھاتے ہو، وہ بولے نہیں فرمایا تم یقیناً اس کو دیکھنے میں تکلیف محسوس نہیں کرو گے جیسا کہ چاند وسورج کو دیکھنے میں تم کوئی پریشانی نہیں اٹھاتے۔

﴿تضارون﴾ علامہ سندھی کے نزدیک پورا جملہ هل تضارون ہے یہ ضر سے تفاعل کا صیغہ ہے معنی تکلیف اٹھانا، علامہ سندھی نے اس کے معنی ای یصیبکم ضرر، اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے تصابون الضرر بیان کیے ہیں رویت باری کی اکثر احادیث میں تضامون کی تعبیر آئی ہے جس کی تحقیق گذر چکی ہے۔

﴿إلا كما تضارون فى رؤيتها﴾ سنن ابی داود کی روایت میں اس سے پہلے والذی نفسی بیده کا بھی اضافہ ہے۔

حدیث ابوداود (سنۃ/۲۰) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی عمدہ ہے۔

(۴/۱۸۰) حَدَّثَنَا أَبُوْبَكْرِ بْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ ، ثَنَا يَزِيْدُ بْنُ هَارُوْنَ ، اَنْبَأَنَا حَمَّادُ بْنُ سَلْمَةَ، عَنْ يَعْلَى بْنِ عَطَاءٍ، عَنْ وَكِيْعِ بْنِ حُدَسٍ، عَنْ عَمِّهٖ أَبِيْ رَزِيْنَ قَالَ، قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ أَنَرَى اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟ وَمَا اٰيَةُ ذٰلِكَ فِيْ خَلْقِهٖ قَالَ يَا أَبَا رَزِيْنَ أَلَيْسَ كُلُّكُمْ يَرَى الْقَمَرَ مُخْلِيًا بِهٖ قَالَ قُلْتُ بَلٰى، قَالَ فَاللّٰهُ اَعْظَمُ وَذٰلِكَ اٰيَةٌ فِيْ خَلْقِهٖ .

اللہ کے رسول کیا ہم میں سے ہر ایک قیامت کے دن اللہ کو دیکھے گا، اور باری تعالیٰ کی مخلوق میں رویت کی کوئی مثال ہے؟ فرمایا، ابورزین! کیا تم میں سے ہر ایک چاند کو تنہا نہیں دیکھتا؟ میں نے کہا کیوں نہیں، فرمایا اللہ سب سے زیادہ عظیم ہے اور مخلوق میں یہ اسی کی نشانی ہے۔

﴿منخليا به﴾ اِخلاء ب صلے کے ساتھ آتا ہے معنیٰ تنہائی میں ملنا، علامہ سندھی نے اُسے اسی باب کا اسم فاعل قرار دیا ہے اور معنی یہ لکھے ہیں أى منفرداً برؤيته من غير أن يزاحمه صاحبه فى ذلك، یعنی وہ تنہا اسطرح چاند کو دیکھتا ہے کہ اس میں کوئی شخص اسکی مزاحمت نہیں کرتا، رؤیت کی احادیث میں سورج کے بجائے چاند سے تشبیہ دینا دو وجہ سے ہے پہلی یہ کہ سورج پر نظر نہیں ٹھہرتی دوسری اس کا دیدار چاند کی طرح فرحت وسرور نہیں بخشتا۔

حدیث ابوداؤد (سنة/۲۰) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بابت بوصیری نے زوائد میں لکھا ہے وكيع ذكره ابن حبان فى الثقات وباقى رجاله احتج بهم مسلم جس کے پیش نظر علامہ سندھیؒ نے فالحديث حسن کا فیصلہ کیا ہے۔

(۱۸۱/۵) حَدَّثَنَا أَبُوبَكْرِ بْنُ أَبِى شَيْبَةَ، ثَنَا يَزِيْدُ بْنُ هَارُوْنَ، أَنْبَأَنَا حَمَّادُ بْنُ سَلْمَةَ ، عَنْ يَعْلَى بْنِ عَطَاءٍ، عَنْ وَكِيعِ بْنِ حُدُسٍ، عَنْ عَمِّهِ اَبِىْ رَزِيْنَ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ضَحِكَ رَبُّنَا مِنْ قُنُوْطِ عِبَادِهِ وَقُرْبِ غِيَرِهِ، قَالَ :قُلْتُ، يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَوَيَضْحَكُ الرَّبُّ؟ قَالَ: نَعَمْ، قُلْتُ، لَنْ نَعْدِمَ مِنْ رَبٍّ يَضْحَكُ خَيْرًا.

فرمایا ہمارا رب اپنے بندوں کی مایوسی اور ان کے غیر اللہ سے قریب ہونے پر ہنستا ہے، ابورزین کہتے ہیں کہ میں نے کہا اے اللہ کے رسول کیا باری تعالیٰ ہنستے ہیں؟ فرمایا جی ہاں، میں نے عرض کیا پھر تو ہم اس رب کے فضل وکرم سے ہرگز محروم نہ ہوں گے جو ہنستا ہے۔

﴿ضحك ربنا﴾ یہ باری تعالیٰ کی ایک ثابت شدہ صفت ہے محققین نے تشبیہ سے بچتے ہوئے اس کے مختلف معانی نقل کیے ہیں علامہ سندھیؒ کے حوالے سے توان کو ترتیب وار نقل کرتے ہیں۔

(۱) الضحك من الله الرضا وارادة الخير ضحک الٰہی کا معنی راضی ہونا اور خیر کا ارادہ کرنا ہے۔

(۲) بسط الرحمان بالإقبال وبالإحسان باری تعالیٰ کا الطاف وعنایات کی بارش کرنا۔

(۳) امر ملائكته بالضحك واذن لهم فيه یعنی حدیث کا مطلب یہاں فرشتوں کو ہنسنے کا حکم دینا ہے اور باری تعالیٰ کی طرف اسکی نسبت ایسی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے السلطان قتله

إذا أمر بقتله یعنی فعل کی نسبت حکم دینے والے کی طرف کر دینا ابن حبان نے اپنی صحیح میں لکھا ہے کہ کلام عرب میں اس طرح کی بہت مثالیں ہیں۔

(۴) **المراد به إيجاد الانفعال فی الغير** یہاں تاثیر کو دوسرے میں پیدا کرنا ہے یعنی باری تعالیٰ بندے کو خوش کرتا ہے اور ہنساتا ہے۔

(۵) پانچواں قول علامہ سندھیؒ نے محققین کے حوالے سے یہ لکھا ہے **أن الضحك و أمثاله مما هو من قبيل الانفعال إذا نسب الى الله تعالىٰ يراد به غايته،** یعنی ہنسا وغیرہ تأثر کی قبیل کی چیز ہے ان کا انتساب جب باری تعالیٰ کی طرف کیا جائے گا تو مراد ان کا نتیجہ ہوگا جیسا کہ رحم کا نتیجہ احسان اور غصہ کا نتیجہ ضرب وقتل ہے تو گویا پہلا قول اس اعتبار سے راجح نظر آتا ہے کہ اس میں نتیجہ ہی ملحوظ ہے۔

﴿**من قنوط عباده**﴾ یہ نصر سے آتا ہے معنی مایوس ہونا علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے، **ولعل المراد ههنا هو الحاجة و الفقر،** کہ شاید اس سے مراد فقر وفاقہ ہے اب انہی کے الفاظ میں مطلب یہ ہوا، **رضی عنهم ويفيد بالإحسان إذا نظر إلى فقرهم وفاقتهم وذلتهم وحقاوتهم وضعفهم،** یہی راجح ہے ورنہ قنوط تو غضب الٰہی کا سبب ہے۔

﴿**وقرب غِيَرِه**﴾ یہاں، غین، پر کسرہ اور، یا، پر فتحہ ہے اور ضمیر سندھی کے نزدیک اللہ کی طرف لوٹتی ہے علامہ سندھی کے بقول یہ دراصل، **تغيير الحال وتحويله،** کے معنی میں ہے یعنی حالات کو ردوبدل کر دینا اب ان کے نزدیک مطلب یہ ہوا، **أنه تعالىٰ يضحك من أن العبد يصير مايوسا من الخير بأدنى شر وقع عليه مع قرب تغييره تعالىٰ الحال من الى الخير، مر من فرض الى عافية، ومن بلاء ومحنة الى سرور وفرحة،** یعنی باری تعالیٰ اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ ذرا سی تکلیف پر بندہ خیر سے ناامید ہونے لگا حالانکہ بہت جلد باری تعالیٰ اس شر کو خیر سے بیماری کو صحت سے مصیبت وآزمائش کو فرحت ومسرت سے بدلنے والے ہوتے ہیں۔

﴿**لن نعدم من رب يضحك خيرا**﴾ **خيرا، لن نعدم** کا مفعول ہے جو ضرب کے باب سے آتا ہے معنی کم کرنا، ختم کرنا، علامہ سندھیؒ صحابی کی مراد کو واضح کرتے ہوئے لکھتے

ہیں، یرید أن الرب الذی من صفاته الضحك لانفقد خیره، بل کلما احتجنا الی خیر وجدناه فانا اذا اظهرنا الفاقة لدیه یضحك فیعطی، یعنی وہ رب جس کی صفت خوش ہونا ہے ہم اس کے فضل سے محروم نہیں ہوں گے بلکہ جب بھی خیر کے خواستگار ہوں گے وہ ہمیں نصیب ہوگی کیونکہ اگر ہم اس کے سامنے فقر وفاقہ کا اظہار کریں گے تو وہ خوش ہوگا اور عنایت فرمائے گا۔

مجددیؒ فرماتے ہیں لا ان الضحك علامة الرضا فاذا رضی ربنا کیف یدخلنا النار. ہنسا راضی ہونے کی علامت ہے تو جب ہمارا رب ہم سے راضی ہوگا تو وہ ہمیں دوزخ میں کیوں داخل کریگا۔

(۱۸۲/۶) حَدَّثَنَا أَبُوبَكْرِ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ، وَمُحَمَّدُ بْنُ الصَّبَّاحِ ، قَالَا، ثَنَا يَزِيْدُ بْنُ هَارُوْنَ ، أَنبَأَنَا حَمَّادُ بْنُ سَلْمَةَ، عَنْ يَعْلَى بْنِ عَطَاءٍ ، عَنْ وَكِيعِ بْنِ حُدُسٍ، عَنْ عَمِّهِ أَبِي رَزِيْنَ، قَالَ: قُلْتُ ، يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَيْنَ كَانَ رَبُّنَا قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَ خَلْقَهُ ، قَالَ : كَانَ فِي عَمَاءٍ، مَاتَحْتَهُ هَوَاءٌ، وَمَافَوْقَهُ هَوَاءٌ وَمَاءٌ، ثُمَّ خَلَقَ عَرْشَهُ عَلَى الْمَاءِ.

ابورزین سے روایت ہے کہ میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے ہمارا رب کہاں تھا آپ نے فرمایا کہ وہ عماء میں تھا، نہ اس کے نیچے ہوا تھی اور نہ ہی اسکے اوپر ہوا، اور پانی تھا پھر اس نے پانی پر اپنے عرش کو پیدا کیا۔

باری تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پھر لوح محفوظ کو اس کے بعد پانی کو پھر عرش کو اور اسکے بعد زمین و آسمان اور پوری کائنات کو پیدا کیا، حضرت ابورزین صحابہ کی جماعت کے وہ ممتاز فرد ہیں جنہوں نے آنحضرت ﷺ سے بیشتر سوالات عقلی کیے ہیں، انہی میں ایک سوال یہ ہے کہ نظام کائنات کی تخلیق سے پہلے باری تعالیٰ کی کیا شان تھی صحابی کا سوال شان باری سے متعلق تھا یا انہوں نے مکان باری کی بابت دریافت کیا تھا؟ اس سلسلے میں چار رائیں منقول ہیں۔

(۱) علامہ طیبی کا کہنا ہے کہ سائل نے سوال تو مکان ہی کے متعلق کیا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے جناب باری کے لامکان ہونے کی تصریح کی یہ جواب علی اسلوب الحکیم ہے۔

(۲) سوال شان باری سے متعلق تھا کیونکہ أین کے لفظ سے کبھی تو مکان کے متعلق سوال کیا جاتا ہے اور کبھی محض شان وکیفیت کی وضاحت مطلوب ہوتی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ عالم کی تکوین میں ایجاد سے پہلے اللہ کی کیا شان وکیفیت تھی، حضرت مولانا ادریس کاندھلوی نے تحفۃ القاری شرح مشکلات بخاری (۸۶/۲۰۔۸۵) میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔

(۳) تیسری رائے یہ ہے کہ ان کا سوال اس خلق کے بارے میں تھا جو نظام کائنات سے پہلے وجود میں آئی ملا علی قاری نے، مرقاۃ المفاتیح باب بدء، الخلق، فصل دوم میں، ان السوال کان عماخلق قبل ان یخلق خلقه، اور حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی نے فیض الباری (۱/۴) میں، السوال کان عن هذاعالم المشهود ای این کان ربناقبل ان یخلق هذاالعالم، لامطلق الخلق، کے ذریعہ اسی رجحان کو ظاہر کیا ہے۔

(۴) ملاعلی قاری نے چوتھا خیال یہ ظاہر فرمایا ہے کہ، التقدیر این کان عرش ربنا، کہ سوال مکان وشان سے متعلق نہیں بلکہ عرش سے متعلق ہے (بدء الخلق فصل سوم مرقاۃ)

عماء کی تحقیق!

عماء بمد وقصر، دونوں کے ساتھ منقول ہے پہلی صورت میں ملاعلی قاری نے اس کے متعدد معنی بیان کئے ہیں (۱) السحاب الرقیق (۲) السحاب الکثیف، المطبق (۳) الدخان یرکب رأس الجبال (٤) الضباب (٥) السحاب المرتفع (٦) المطر الرقیق او الأسود او الأبیض، حضرت گنگوہی نے الکوکب الدری (۲۳۰/۲) میں اس کا ترجمہ غمامة بیضاء اور حضرت کشمیری نے فیض الباری (٤ / ١) میں، الضبابة اور (۱۹۴/۴) میں سدیم یعنی باریک کہرے سے کیا ہے لیکن یہ تمام معانی ظاہر ہے باری تعالیٰ کے شایان شان نہیں جیسا کہ ملاعلی قاری تحریر فرماتے ہیں ولا شك ان واحدا من هذه المعانی لا یناسب المقام التبیانی الاّ أن یقال أن السحاب کنایة عن حجاب الجلال، یہی حضرت گنگوہی کہتے ہیں ولا یتوهم أن ظرفیة العدم له تبارك وتعالیٰ مما لا یعقل لانه لیس ظرفا له فان وجوده حق لا یرتاب فیه، لیکن سیوطی نے قاضی ناصر الدین ابن المنیر کے حوالے سے یہ تاویل وتوجیہ نقل کی ہے کہ فی یہاں علیٰ کے معنی

میں ہے اور اس کے معنی استیلاء کے ہیں یعنی خداوند قدوس اس بادل پر مستولی وحاوی تھا جس سے اس نے اپنی تمام مخلوقات کو پیدا کیا حضرت کشمیریؒ نے بھی سحاب کو **ولعله مادة للاکوان کلها** کہا ہے۔[1]

دوسری صورت میں اس کے معنی امام ترمذی نے یزید بن ہارون، حماد بن سلمہ اور وکیع بن احدس کے حوالہ سے، **لیس معه شیء**، نقل کئے ہیں یہ بعینہ صحیح بخاری (بدء الخلق /۱) میں وارد حدیث کی تعبیر ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، **کان اللّٰه ولم یکن شئی قبله**، علامہ سندھیؒ، حضرت گنگوہیؒ اور حضرت کشمیریؒ کا رجحان اسی کی جانب ہے۔

ابوعبید کہتے ہیں، **لا یدری احد من العلماء کیف کان ذلك العماء**، نیز ملا علی قاری نے علماء کے حوالے سے لکھا ہے، **وکل امر لا تدرکه عقول بنی اٰدم ولا یبلغ کنهه والوصف ولا یدرکه الفطن**، مولانا ادریس کاندھلویؒ بھی اسی دوسرے معنی کو راجح قرار دے کر فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے، **فی شان خفی لایدرك بالأبصار ولا بالبصائر**، کہ وہ ایسی خفی شان میں تھا کہ بصارت وبصیرت اس کے تصور سے بھی عاجز ہیں نیز اس کیفیت پر عماء کا اطلاق کرنے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ خداوند قدوس کی شان جلال وکبریائی کے ایسے پردوں میں ہے جہاں تک انسانی عقل کی رسائی ممکن نہیں اسی شق کا مؤید حضرت علیؓ کا وہ واقعہ بھی ہے جس میں آپ سے **این اللّٰه** کا سوال کیا گیا تو حضرت نے جواب دیا کے جس ذات نے این کو اینیت بخشی وہ این کی اینیت سے وراء الوراء ہے یعنی باری تعالیٰ خالق اور این مخلوق ہے تو وہ کیونکر اس کا ظرف بن سکتا ہے، سندھی کے الفاظ میں جواب کا خلاصہ یہ نکلا **الارشار الی عدم المکان**، جبکہ مولانا گنگوہی فرماتے ہیں کہ عماء سے کچھ بھی مراد لیا جائے حدیث میں اشارہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ سے متعلق ایسا سوال نہ کیا جائے کیونکہ اسکی کیفیت کا عقل میں آنا ممکن نہیں قاضی بیضاوی سے بھی یہی منقول ہے، **المراد بالعماء مالاتقبلهٗ الاوهام و لأتدرکه العقول والأفهام**، بلکہ سندھی کی تصریح کے مطابق علما نے تو یہاں تک لکھ دیا **هذامن حدیث الصفات فنؤمن به ونکل علمهالی عالمه**۔

---

[1] فیض الباری (۴/۲)

﴿ماتحته هواء ومافوقه هواء وماء﴾ یہاں ما موصولہ ہے یا نافیہ؟ یہ اختلاف کا موضوع ہے، بعض حضرات نے اسے موصولہ کہا ہے جبکہ دوسرے علماء اسے نافیہ قرار دیتے ہیں علامہ سندھی، ملا علی قاری کی یہی رائے ہے، ہمارا خیال ہے کہ اگر عماء کو بالمد پڑھا جائے تو ما کا موصولہ ہونا اور بالقصر پڑھا جائے تو اس کا نافیہ ہونا زیادہ سمجھ میں آتا ہے کیوں کہ بادل کے وجود کو مان لینے کے بعد ہوا کو بھی تسلیم کر لینا ضروری ہے، تحت اور فوق کی ضمیریں سحاب کی طرف لوٹتی ہیں سیوطی نے، مصباح الزجاجة، میں ناصر الدین ابن المنیر کے حوالے سے یہی لکھا ہے، نیز ما کا معطوف علیہ هواء ہے جبکہ علامہ سندھی نے ماء کو تصحیف قرار دیا ہے ان کے نزدیک وہ ماء کی بگڑی ہوئی شکل ہے جو پہلے ماء کی تاکید ہے۔

امام نے روایت کو باب فیما انکرت الجهمیة میں درج کیا ہے، ترجمۃ الباب ثم خلق عرشه علی الماء ہے اس سے صفت تخلق ثابت ہوتی ہے اور جہمیہ دیگر صفات کے ساتھ تخلیق کے بھی منکر اور تحیز بالمکان کے قائل ہیں اس لئے حدیث سے انکی صراحتہ تردید ہوتی ہے، حدیث ترمذی (تفسیر رہود) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی طرح مصنف کی تصریح کے مطابق وہ سند بھی حسن ہے۔

(۱۸۳/۷) حَدَّثَنَا حُمَيْدُ بْنُ مَسْعَدَةَ ثَنَا خَالِدُ بْنُ الْحَارِثِ ثَنَا سَعِيدٌ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ مُحْرِزٍ الْمَازِنِيِّ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ مَعَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ وَهُوَ يَطُوْفُ بِالْبَيْتِ اِذْ عَرَضَ لَهُ رَجُلٌ فَقَالَ يَا ابْنَ عُمَرَ كَيْفَ سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَذْكُرُ فِي النَّجْوَى قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ يُدْنَى الْمُؤْمِنُ مِنْ رَّبِّهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتَّى يَضَعَ عَلَيْهِ كَنَفَهُ ثُمَّ يُقَرِّرُهُ بِذُنُوْبِهٖ فَيَقُوْلُ هَلْ تَعْرِفُ فَيَقُوْلُ يَارَبِّ اَعْرِفُ حَتَّى اِذَابَلَغَ مِنْهُ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَبْلُغَ قَالَ اِنِّي سَتَرْتُهَا عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا وَأَنَا أَغْفِرُ لَكَ الْيَوْمَ قَالَ ثُمَّ يُعْطٰى صَحِيْفَةَ حَسَنَاتِهٖ وَكِتَابَهُ بِيَمِيْنِهٖ قَالَ وَاَمَّا الْكَافِرُ أَوِ الْمُنَافِقُ فَيُنَادَى عَلٰى رُؤُسِ الْاَشْهَادِ قَالَ خَالِدٌ فِي الْاَشْهَادِ شَيْءٌ مِنْ انْقِطَاعٍ هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوا عَلٰى رَبِّهِمْ أَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظَّالِمِيْنَ .

صفوان بن محرز مازنی سے مروی ہے کہ ہم عبداللہ بن عمر کے ساتھ تھے جو بیت اللہ کا طواف کررہے تھے اسی دوران ان سے ایک شخص نے پوچھا اے ابن عمرتم نے رسول اللہ سے وہ کیا سنا ہے جس میں آپ ﷺ نے (بندے سے اللہ کی) سرگوشی کا تذکرہ کیا ہے انہوں نے کہا ہاں میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے دن مؤمن کو اس کے رب سے اتنا قریب کردیا جائے گا کہ باری تعالیٰ اسے اپنے پہلو سے ڈھانپ لیں گے پھر اس سے ایک ایک گناہ کا اقرار کرائیں گے اور پوچھیں گے کیا تمھیں اعتراف ہے وہ کہے گا مولیٰ مجھے اعتراف ہے یہاں تک کہ معاملہ اس حد تک پہونچے گا جہاں تک اللہ کو منظور ہوگا پھر باری تعالیٰ فرمائیں گے میں نے دنیا میں تیرے گناہوں کی پردہ پوشی کی ہے اور آج بھی تیری مغفرت کررہا ہوں، پھر اس کی نیکیوں کا صحیفہ اور نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیدیا جائیگا، فرمایا جہاں تک کافر ومنافق کا سوال ہے تو اسے بھرے مجمعے میں پکارا جائیگا۔

خالد بن حارث راوی کہتے ہیں کہ اشھاد کی سند میں یک گونہ انقطاع ہے، کہا گیا یہی وہ لوگ ہیں، جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا، تو سنو ظالموں پر اللہ کی لعنت ہوگی۔

﴿قال: بینمانحن مع عبد اللّٰہ بن عمروھویطوف بالبیت اذعرض لہٗ رجلٌ﴾ صحیح بخاری کتاب المظالم کی سند میں اس مفہوم کو صفوان بن مُحرز نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

﴿بینما انا امشی معَ ابن عمر اخذٌ بیدہ﴾ جو پہلے مفہوم کو مزید واضح کرتے ہیں ابن حجر کا کہنا ہے کہ سوال کرنے والا کون شخص تھا؟ میں ان کے نام سے واقف نہیں ممکن ہے کہ وہ سعید بن جبیر ہوں جیسا کہ طبرانی کی روایت میں ہے۔

﴿یذکر فی النجویٰ﴾ ابن حجر نے لکھا ہے، المرادبھاھناالمناجاۃ التی تقع من الرب سبحانہ تعالیٰ یوم القیامۃ من المؤمنین[1] جبکہ کرِمانی کا کہنا ہے کہ اس گفتگو پر نجوی کا اطلاق کفار کے مقابلے میں ہے جنہیں سرعام مخاطب کیا جائیگا، یُدنی المؤمنُ من ربّہ یوم القیامَۃ) صحیح مسلم اور بخاری کے ایک طریق میں بھی یہ مجہول ہی وارد ہوا ہے۔

---

1. فیض الباری (۲/۴)

بخاری میں یدنو احدکم من ربه کے الفاظ آئے ہیں، حتی یضع علیه کنفه کَنَفٌ ج اَکْنَاف، جانب سایہ پہلو اور بازو کو کہتے ہیں، باری تعالیٰ ان سے پاک اور منزہ ہیں اس لئے ان کی تاویل کی گئی ہے، جو امام نووی کے نزدیک ستره وعفوهٗ والمراد بالدنو ههنا دنو کرامة احسان لادنو مسافة واللّٰه تعالیٰ مزّه عن المسافة وقربها علامہ سندھی کے نزدیک ای ستره عن اهل الموقف حتی لا یطلع علی سره غیره سب کا خلاصہ یہی ہے کہ باری تعالیٰ کرامت واحسان کے ذریعہ بندۂ مومن کو قریب نصیب فرمائیں گے اور اس سے گناہوں کا اعتراف تمام اہل محشر سے چھپا کر فرمائیں گے، تاکہ مومن ذلت ورسوائی سے محفوظ رہے، حضرت کشمیریؒ کے نزدیک دُنو اور وضع کنف تجلیات الٰہی پر محمول ہے، اس صورت میں تاویل کی کوئی ضرورت نہیں چنانچہ لکھتے ہیں ان امثاله کلها محمولة عندی علی التّجلیات بدون تاویلٍ۔

﴿ثم یقررهُ بذنوبه فیقول هل تعرف فیقول یارب أعرِف﴾ صحیح مسلم کے الفاظ بھی یہی ہیں، جبکہ بخاری کے ایک طریق میں اتعرف ذنب کذا، اتعرف ذنب کذا فیقول عملت کذاو کذامرتین فیقول نعم ویقول عملت کذا و کذا فیقول نعم کے الفاظ مروی ہیں، تکرار کو ملا علی قاری نے یہاں تکثیر ذنوب کا اشارہ قرار دیا ہے یہ گناہ کس قسم کے ہیں، ابن حجر کا کہنا ہے، المراد بالذنوب فی حدیث ابن عمرمایکون بین المرأ وربّهٖ سبحانه وتعالیٰ دون مظالم العباد فمقتضی الحدیث انهاتحتاج اِلی المقاصصةِ یعنی وہ گناہ حقوق اللہ کے قبیل کے ہیں جن کا بدلہ دیا جانا ضروری ہے، حضرت گنگوہی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ یہ گناہ بندے سے غیر اختیاری طور پر صادر ہوئے، اور اس نے توبہ بھی نہ کی اس لئے اسے یاددہانی کرائی جائیگی اگر توبہ کر لیتا تو وہ نامہ اعمال سے ہی مٹادیئے جاتے، اور ان کی کوئی بازپرس نہ ہوتی، وهذه الذنوب هی التی اِرتکبها من غیر مبالاةٍ بها وشعور بصدورها، فَلَمْ یَتُبْ عنها، اذ لو تاب لکانت ممحوةً

گناہ گاروں کی قسمیں

حافظ ابن حجر نے مختلف احادیث کے پیش نظر گنہگار مسلمانوں کی اصولاً دو قسمیں کی ہیں[1]،

---

[1] صحیح مسلم ج ۲، ص ۳٦۰

من معصیته بینه وبین ربّه نافرمانی حقوق اللہ کی ہو[1]، من تکون معصتهٗ بینه وبین العبادؒ[1] اس کے گناہ حقوق العباد کی قبیل کے ہوں اب پہلی صورت کی بھی دو قسمیں ہیں، (الف) تکون معصیة مستورة فی الدنیا[2] یہ گناہ دنیا میں مخفی رہے، حافظ صراحت کرتے ہیں، کہ اسی قسم کے لوگوں کی آخرت میں بھی پردہ پوشی کی جائیگی، اور وہی حدیث باب کا مصداق ہیں، فهذا الذی یسترها اللہ علیه فی القیامة وهو بالمنطوق[3] (ب) تکون معصیة جاهرة[5] نافرمانی کھلم کھلا ہو، اس صورت میں پردہ پوشی نہیں بلکہ باز پرس ہوگی، اسی طرح دوسری صورت کی بھی دو قسم ہیں گنا (الف) ترجیح سیاٰتهم علی حساتهم، برائیاں نیکیوں سے زیادہ ہوں یہ لوگ گناہوں کی سزا بھگت کر شفاعت نبوی کی بنیاد پر نجات پائیں گے (ب) تتساوی سیاتهم وحسناتهم، دونوں برابر ہوں تو اس وقت تک جنت میں داخلہ نہ ہو سکے گا، جب تک ایک دوسرے کا بدلہ نہ دلوا دیا جائے۔

واما الکافر والمنافق فینادی علی رووس الاشهاد بخاری کتاب المظالم میں یہ الفاظ اس طرح بھی آئے ہیں، واما الکافرون والمنافقون الاشهاد هولاء الذین کذبوا علی ربهم لعنة الاالله علی الظالمین، اشہاد سے مراد یہاں ملائکہ انبیاً اور اہل ایمان ہیں، یعنی جب کفار و منافقین کو سر عام پکار کر ان کا کچا چھٹا کھولا جائے گا، تو حاضرین پکار اٹھیں گے کہ یہی وہ لوگ ہیں، جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا، ظالموں پر خدا کی لعنت ہو۔

خالد ابن حارث کہتے ہیں کہ اشہاد میں انقطاع ہے، مجددیؒ نے وضاحت کی ہے: انه لم یتصل سنده وبقیة الحدیث بلا انقطاع حدیث تو متصل ہے لیکن اشہاد لفظ کی سند منقطع ہے۔ حدیث بخاری (مظالم/۳)، مسلم (توبہ/۸) میں بھی آئی ہے ابن ماجہ کی سند صحیح ہے۔ امام ابن ماجہ نے یہ روایت باب فیماانکرت الجهمیة کے تحت نقل کی ہے، صفت کلام کا ثبوت ہی ترجمۃ الباب ہے، جہمیہ دیگر صفات کے ساتھ کلام کی صفت کے بھی منکر ہیں، اس لئے یہ ان پر حجت ہے۔

۱۔ سنن مصطفٰی ص ۱۱۸ ۲۔ بخاری: ج اص ۳۳۰ حاشیہ ۹
۳۔ فیض الباری ج ۴ ص ۳۹۱ ۴۔ لامع الدراری: ۲ ص ۳۸۱
۵۔ لامع الدراری: ۲ ص ۳۸۱۔

(۸/۱۸۴) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الْمَلِكِ مِنْ أَبِي الشَّوَارِبِ، ثَنَا أَبُوْ عَاصِمٍ الْعَبَّادَانِيُّ، ثَنَا الْفَضْلُ الرَّقَاشِيُّ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَرِ، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، بَينَا اَهْلُ الجَنَّةِ فِي نَعِيمِهِمْ اِذْسَطَعَ لَهُمْ نُورٌ فَرَفَعُوا رُؤسَهُمْ، فَاِذَ الرَّبُّ قَدْ اشرَفَ عَلَيْهِمْ مِنْ فَوقِهِمْ، فَقَالَ السَّلَامُ قَوْلًا مِن رَبٍّ رَحِيْمٍ، قَالَ فَيَنْظُرُ اِلَيْهِمْ وَيَنْظُرُوْنَ اِلَيهِ، فَلَايَلْتَفِتُوْنَ اِلٰى شيٍ مِنَ النَّعِيْمِ مَادَامُوا يَنْظُرُوْنَ اِلَيهِ حَتىٰ يَحْتَجِبَ عَنْهُمْ، وَيَبْقىٰ نُوْرُهٗ وَبَرَكَتُهٗ عَلَيْهِمْ فِي دِيَارِهِمْ .

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنتی نعمت وراحت میں مست ہونگے کہ اچانک ایک نور چمکے گا، وہ سر اٹھا کر دیکھیں گے اے اہل جنت! تم پر سلامتی ہو، آپ نے فرمایا کہ یہ اللہ کا وہی سلام ہوگا جسکی طرف سلام قولاً من رب رحیم میں اشارہ ہے فرمایا کہ باری تعالیٰ ان کی طرف دیکھیں گے اور جنتی دیدار الٰہی سے اس طرح لطف اندوز ہونگے کہ دیگر تمام نعمتوں کو بھول جائیں گے یہاں تک کہ باری تعالیٰ ان سے پردہ فرمالیں گے، اور جنتیوں کے پاس قیام گاہوں خدائی میں نور و برکت باقی رہ جائے گا۔

﴿فاذا الرب قد اشرف علیهم﴾ نعمتوں میں جنتیوں کے لئے سب سے عظیم نعمت دیدار الٰہی ہے، حدیث اسی کی منظرکشی کرتی ہے کہ جب جنت میں پہونچ کر یہ لوگ مسرور ومطمئن ہوجائیں گے، اور ان کی زندگی عیش وآرام میں گذرنے لگے گی، تو اچانک ایک نور چمکے گا وہ سر اٹھا کر دیکھیں گے تو وہاں باری تعالیٰ کو سایہ فگن پائیں گے، ان الفاظ سے جہت کا گمان ہو یا ہے، اس لئے حضرات محدثین نے اسکی تاویل کی ہے، سندھیؒ لکھتے ہیں یظهر علیهم حالٗ کونه عالیا علوا یلیق به تعالیٰ یعنی باری تعالیٰ جنتیوں پر اسطرح سایہ فگن ہونگے جوانکے شایان شان ہے جبکہ حضرت کشمیریؒ یہاں بھی فاذاالرب قداشرف علیهم من فوقهم، کو تجلیات پر محمول کریں گے، ملا علی قاریؒ نے بھی اسی سے ملتی جلتی بات کہی ہے، فرماتے ہیں ای تجلیٰ تجلی العظمة والكبرياء والبهاء والعلاء یعنی اس سے مراد عظمت ورفعت اور جمال وکبریائی کی تجلی ہے، اور یہ سب کے لیے عام ہوگی۔

(فینظر الیھم) باری تعالیٰ سب کو ہمہ وقت دیکھ رہا ہے پھر اس جملے کا کیا مطلب ہے، علامہ سندھیؒ نے اس کے دو معنیٰ لکھے ہیں (۱) یبدو لھم أنہ ناظر الیھم اسوقت جنتیوں کو بھی یہ بات دکھائی دیگی کہ باری تعالیٰ انکو دیکھ رہے ہیں، جب کہ دوسرے موقعوں پر ایسا نہیں ہوتا (۲) أو ینظر الیھم نظر رحمۃ فوق ما کانوفیھا، انہیں مزید نوازنے کے لئے ان پر رحمت وکرم کی نگاہ ڈالیں گے۔

﴿سلام قولا من رب رحیم﴾ کے محذوفات کو ملا علیؒ قاریؒ نے یوں اجاگر کیا ہے، ای لھم سلام عظیم یقال لھم قولاً کائنامن جھۃ رب رحیم[۲] اسکے بعد تجلیات پر پردہ ڈالدیا جائیگا، لیکن نور وبرکت کے اثرات جنتیوں کو بعد میں بھی محسوس ہونگے، جیسا کہ فرحت وغم گذرنے کے باوجود یادیں انسان کو متاثر کرتی ہے۔

ترجمۃ الباب رویت باری کا اثبات ہے، جہمیہ اس کے منکر ہیں، فضل رقاشیؒ محدثین کے نزدیک بالاتفاق ضعیف ہیں اور ابو عاصم عبّادانی کو عقیلی نے منکر الحدیث اور قدری قرار دیا ہے، اس لئے بوصیریؒ نے اسکو زوائد میں ھذا اسنادٌ ضعیفٌ اور ابن الجوزیؒ نے موضوع کہا ہے لیکن حافظ سیوطی نے اللآلی المصنوعۃ میں اس سے اختلاف کرتے ہوئے روایت کا ایک اور طریق بیان کیا ہے اسلئے یہ موضوع تو نہیں لیکن کمزور بہر صورت ہے۔

(۱۸۵/۹) حَدَّثَنَا عَلِیُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، ثَنَا وَکِیْعٌ، عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ خَیْثَمَۃَ عَنْ عدیِّ بْنِ حَاتِمٍ قالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَا مِنْکُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلّا سَیُکَلِّمُہٗ رَبُّہٗ، لَیْسَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَہٗ تَرْجَمَانٌ فَیَنْظُرُ مِنْ عَنْ أَیْمَنَ مِنْہٗ فَلَا یَرَی اِلّا شَیْأً قَدَّمَہٗ ثم یَنْظُرُ مِنْ عَنْ أَیْسَرَ مِنْہٗ، فَلَا یَرَی اِلَّا شَیْأً قَدَّمَہٗ ثُمَّ یَنْظُرُ أَمَامَہٗ فَتَسْتَقْبِلُہٗ النارُ فمن اِسْتَطَاعَ مِنْکُمْ ان یَتَّقِیَ النارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَۃٍ فَلْیَفْعَلْ۔

فرمایا، تم میں کوئی شخص ایسا نہیں جس سے باری تعالیٰ (قیامت میں) براہ راست گفتگو نہ کریں، حتی کہ دونوں کے درمیان کوئی بھی نہ ہوگا جب یہ شخص اپنی دائیں سمت نظر ڈالے گا تو صرف وہی عمل دیکھے گا جو اسنے آگے بھیجے تھے پھر وہ اپنی بائیں سمت نظر دوڑائے تو وہاں بھی صرف وہی چیز دکھائی دے گی جس کا وہ ارتکاب کر چکا تھا اب وہ اپنے سامنے دیکھے گا تو وہاں آگ اسے

بڑھتی نظر آئے گی اب تم میں جو شخص بھی آگ سے بچنے کی کوشش کرسکتا ہو چاہے وہ آدھی کھجور ہی کے ذریعہ ہو وہ یہ کر گزرے۔

﴿سیکلمه ربه﴾ دنیا میں باری تعالیٰ سے کوئی براہ راست گفتگو نہیں کرسکتا اور قرآن کی تصریح، **وماكان لبشرأن يكلمه الله اِلاوحيا أومن وراء حجاب أويرسل رسولافيوحي باِذنه مايشاء** کے مطابق گفتگو کی صرف تین صورتیں ہیں

(۱) الہام ووحی کے ذریعہ دل میں کچھ بات ڈال دینا۔ (۲) پردے کے پیچھے سے گفتگو کرنا کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور معراج میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ یہی صورت پیش آئی۔(۳) انبیاء پر وحی کا نزول جس کی تفصیل کے لئے ابن القیمؒ کی زاد المعاد یا مولانا محمد تقی عثمانی کی علوم القرآن کا مطالعہ کریں۔ یہ تو دنیا سے متعلق قانون تھا آخرت میں جب تمام پردے اٹھا دیئے جائیں گے اور غیبی حقائق نگاہوں کے سامنے ہونگے تو باری تعالیٰ اس دن ہر مسلمان سے بلا واسطہ گفتگو فرمائیں گے۔

﴿ترجمان﴾ امام نوویؒ نے تا کی بابت فتح وضمہ دونوں لغت لکھی ہیں، اور علامہ سندھیؒ کی وضاحت کے مطابق جیم کے بھی یہی دونوں اعراب آتے ہیں نوویؒ کے الفاظ میں اس کے معنیٰ **ألمعبرعن لسان بلسان** ہیں یعنی کوئی زبان کسی دوسرے کے خیالات کا اظہار کرے اور یہاں اسکی مراد سندھیؒ کے نزدیک **لاواسطة فى البين** ہے یعنی دونوں میں کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔

﴿اِلا شيئا قدمه﴾ ہمارے نزدیک بندۂ مؤمن کو دائیں طرف اس کے نیک اعمال اور بائیں سمت گناہ دکھائی دیں گے تاکہ وہ اپنی پوری زندگی کو ایک نظر میں دیکھ سکے۔

﴿فتستقبله النار﴾ اس کی شرح میں بخاری کے محشی نے ابن ہُبیرہ کا یہ قول نقل کیا ہے **والسبب مى ذلك أن النار تكون فى ممره فلايمكنه أن يحيدعنهااذلابدله من المرور على الصراط** اسکی وجہ یہ ہے کہ آگ اس کے راستے میں ہوگی جس سے بچنا ممکن نہیں کیونکہ پل صراط پر تو ہر ایک کو گذرنا ہوگا۔

﴿ولوبشق تمرة﴾ شق کے معنیٰ آدھے یا معمولی حصے کے ہیں، بخاری ومسلم کی دوسری

حدیث میں فمن لم یجد فبکلمة طیبة کی بھی وضاحت ہے یعنی دینے کے لئے کچھ بھی نہ ہوتو کلمہ خیر سے بھی وہ درجہ حاصل ہوسکتا ہے حضورؐ نے یہاں صدقہ کی ترغیب دی ہے جو یقیناً اکسیر کا درجہ رکھتا ہے جیسا کہ ترمذی کی روایت میں ہے اِن الصدقة لتطفی غضب الرب حدیث سے صفت کلام ثابت ہوتی ہے جسکو جہمیہ تسلیم نہیں کرتے اور خارق عادت امر ہونے کی بناء پر وہ اس مکالمہ کے منکر ہیں حدیث بخاری (رقاق/۴۹،توحید/۲۴) مسلم (زکوۃ/۱۱) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی صحیح ہے۔

(۱۸۶/۱۰) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ، ثَنَا أَبُوْ عَبْدِ الصَّمَدِ، عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ عَبْدِ الصَّمَدِ حَدَّثَنَا أَبُوْ عِمْرَانَ الجَوْنِيُّ عَنْ أَبِي بَكْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ قَيْسِ الاَشْعَرِيِّ عَنْ أَبِيهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ جَنَّتَانِ مِنْ فِضَّةٍ انيتهما وَمَافِيْهِمَا، وَجَنَّتَانِ مِنْ ذَهَبٍ، آنِيَتُهُمَا وما فيهما وَمَابَيْنَ الْقَومِ وَبَيْنَ اُن يَّنْظُرُوا اِلىٰ رَبِّهِمْ تَبارَكَ وَتَعَالىٰ اِلَّا رِداءُ الكِبْرِياء عَلىٰ وَجْهِهٖ فِي جَنَّةِ عَدْنٍ

فرمایا: دو جنتیں چاندی کی ہیں اور ان کی تمام چیزیں بھی چاندی کی ہیں، اور دو جنتیں سونے کی ہیں، اور ان کی تمام چیزیں بھی سونے کی ہیں تو جنتیوں اور باری تعالیٰ کے دیدار کے درمیان صرف جنت عدن میں چہرہ پر کبریائی کی چادر ہوگی۔

ملاعلی قاری کا کہنا ہے کہ جنتان مبتداء اور للمؤمن اس کی خبر محذوف ہے جب کہ ترمذی کے طریق میں ان فی الجنة جنتین واقع ہوا ہے، اس صورت میں محذوف نکالنے کی ضرورت نہیں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ انیتهما مبتدأ موخر اور من فضة خبر مقدم ہے جب کہ علامہ کرمانی نے انیتهما ومافیهما کو فضة کے فاعل ہونے کا احتمال ظاہر کیا ہے، دوسری ترکیب حافظ ابن حجر اور علامہ سندھی نے یہ کی ہے: جنتان کائنتان من فضة مبدل منہ ہے اور انیتهما وما فیها بدل اشتمال ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک دوسری احادیث کے پیش نظر پہلی ترکیب راجح ہے۔ فی جنة عدن امام نوویؒ لکھتے ہیں، ای الناظرون فی جنة عدن، فهی ظرف للناظر[1] امام قرطبیؒ اور ابن حجرؒ اسے محذوف سے متعلق کر کے القوم کا

[1] صحیح مسلم ۱/۱۰۰

حال قرار دیتے ہیں، تو ان کے نزدیک عبارت کائنین فی جنة عدن ہوگی۔

﴿علی وجهه﴾ کو طیبیؒ نے رداء الکبریاء کا حال قرار دیا ہے، یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے، کہ کیا رداء ذات باری کا احاطہ کئے ہوئے ہے؟ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جواب دیتے ہیں والجواب ان قوله فی جنة عدن لما کان ظرف الرداء لایلزم ذالك فالمعنی ان رداء الکبریاء علی وجهه وسبحانه علی ماهومنه فی جنت عدن[1] یعنی جب جنت عدن رداء کا ظرف قرار پایا تو اب یہ اشکال لازم نہیں آتا، بلکہ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے۔ کہ جنت عدن میں اس کے چہرے کی چادر اس کے شایان شان ہوگی۔

یہ جملہ فی الواقع متشابہات میں سے ہے اس لئے وجهه کی تاویل ذات باری سے اور رداء کی تاویل اس کی کسی صفت سے کی گئی ہے، جو مخلوق سے مشابہ نہیں، ابن حجر فرماتے ہیں کہ باری تعالیٰ جنتیوں پر کرم فرمائی کے لئے، اس چادر کو اٹھا کر اپنا دیدار کرائیں گے حضرت گنگوہی نے صراحت کی ہے کہ یہاں اصطلاحی جنت نہیں بلکہ اس کے دو درجے مراد ہیں، المراد بالجنتین درجتان منها[2] خود قرآن کریم میں اسے مطلق باغ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، ولمن خاف مقام ربه جنتان وغیرہ اسی کی مثال ہیں۔

مسند احمد ترمذی اور دارمی کی روایت میں حضرت ابو ہریرہ سے منقول ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے جنت کی بناوٹ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا لبنة من ذهب ولبنة من فضة، حدیث، بظاہر اس سے متعارض نظر آتی ہے، ابن حجر اور ملا علی قاریؒ تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حدیث سے محض جنت کی اشیاء کا سونے وچاندی کا ہونا ثابت ہوتا ہے جب کہ یہ روایت، اس کی دیواروں کی کیفیت بیان کرتی ہے، یہاں رؤیت باری اور جنت کی بناوٹ ترجمۃ الباب ہیں، کیونکہ جہمیہ جنت کے دائمی بھی ہونے کے منکر ہیں، حدیث بخاری (تفسیر رحمٰن، توحید/۲۴) ترمذی (الجنة /۳) میں بھی آئی ہے بخاری کا پہلا راوی الگ ہے جبکہ ترمذی کی سند بعینہ ابن ماجہ کی ہے امام نے اسے حدیث صحیح قرار دیا ہے۔

(۱۸۷/۱۱) حَدَّثَنَا عَبْدُ الْقُدُّوسِ بْنُ مُحَمَّدٍ حَدَّثَنَا حَجَّاجٌ، حَدَّثَنَا حَمَّادٌ،

[1] الکوکب الدری ۱۱۰/۲ [2] ایضاً

عَنْ ثَابِتِ الْبُنَانِيِّ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ ابِی لَیْلٰی، عَنْ صُهَیْبٍ، قَالَ تَلَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هٰذِهِ الْاٰیَةَ (لِلَّذِیْنَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَةٌ) وَقَالَ: إِذَا دَخَلَ أَهْلُ الْجَنَةِ الجنةَ وَأَهْلُ النَّارِ النَّارَ نَادَی مُنَادٍ: یَا أَهْلَ الْجَنَّةِ اِنَّ لَکُمْ عِنْدَاللّٰهِ مَوْعِدًا یُرِیْدُ أَنْ یُنجِزَکُمُوْهُ فَیَقُوْلُوْنَ: وَمَاهُوَ؟ أَلَمْ یُثَقِّلِ اللّٰهُ مَوَازِیْنَنَا وَیُبَیِّضْ وُجُوْهَنَا وَیُدْخِلنَا الْجَنَّةَ وَیُنجِنَا مِنَ النَّارِ؟ قَالَ فَیَکْشِفُ الْحِجَابَ فینظرونَ اِلَیْهِ فَوَاللّٰهِ مَاأَعْطَاهُمْ اللّٰهُ شَیْئاً أَحَبَّ اِلَیْهِمْ مِنَ النَّظَرِ یَعْنِیْ اِلَیْهِ، وَلَا أَقَرَّ لِأَعْیُنِهِمْ.

رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ جن نے لوگوں بھلائی کی ان کے لئے بھلائی وزیادتی ہے اور فرمایا کہ جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں پہنچ جائیں گے تو ایک منادی آواز لگائے گا کہ جنت والوں! ابھی اللہ کے ذمہ تمہارا ایک اور وعدہ ہے جسے وہ پورا کرنا چاہتے ہیں یہ لوگ کہیں گے وہ کیا ہے؟ کیا اللہ نے ہمارے نامہ اعمال بھاری نہ کردیا؟ کیا اس نے ہمارے چہرے کو روشن وتابناک نہ بنایا؟ کیا اس نے ہمیں جنت میں داخل کر کے جہنم سے نجات نہ دی، باری تعالیٰ پردے کو ہٹا دیں گے تو جنتی اسے دیکھیں گے، خدا کی قسم یہ دیدار عطا کردہ نعمتوں میں انہیں سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ آنکھوں کو ٹھنڈک عطا کرنے والا ہوگا۔

﴿للذین احسنوا﴾ ملاء علی قاری لکھتے ہیں ای العمل فی الدنیابان احادوا مقروناً بلاخلاص نہایت اخلاص واھتمام کے ساتھ کیا گیا نیک عمل اس کا مصداق ہے، الحسنی! ملاعلی قاری کا کہنا ہے ای المثوبة الحسنی وھی الجنة یعنی نیک بدلہ اوروہ جنت ہے وزیادۃٌ سے مراد ملاعلی قاری کے نزدیک رویت باری ہے اور تنکیر تعظیم کے لئے ہے یعنی زیادۃعظیمۃ ۔

علامہ طیبی کا کہنا ہے کہ باری تعالیٰ کی عنایات ونوازش کی بنیاد پر جنتی سوچیں گے اب اس سے بڑھ کر نعمت کونسی ہوگی سارے مراحل تو کامیابی سے گزر گئے اب ہمیں کیا چاہئے، علامہ سندھی نے لکھاہے کہ باری تعالیٰ ان کے دلوں میں حرص کو مٹا کر انہیں وہ سب کچھ عطا

کردیں گے جس سے زیادہ کی توقع نہیں جاسکتی، چنانچہ وہ نعمتوں سے فرحاں وشاداں رؤیت کا وعدہ بھول جائیں گے۔ انَّهُم يَنْسَون الوعدَ بالرُّويةِ وفيه اَن اللّٰهَ يُزِيلُ عن قلوبهم الحرص ويعطيهم مالايطمعون المزيدعليه ويرضيهم بفضله چنانچہ پھر پردہ اٹھایا جائے گا۔

﴿فيكشف الحجاب﴾ باری تعالیٰ اس سے منزہ ہیں کہ ان پر کوئی پردہ پڑا ہو چنانچہ ملاء علی قاری نے فيرفع الحجاب عن اعين الناظرين[1] اور علامہ سندھی نے ای الذی حجبهم ای ابصارهم کے ذریعہ وضاحت کی ہے کہ یہ پردہ اھل جنت کی نگاہوں سے ہٹے گا، انجارّ، پورا کرنا، تثقيل، بھاری کرنا، تبيض، سفید وروشن کرنا، تنجية، نجات دینا لم کی وجہ سے حرف علت گر گیا، قر (س ض) قرة آنکھ ٹھنڈی ہونا (افعل التفضيل) کا صیغہ ہے۔

رویت باری ترجمۃ الباب ہے حدیث باب صحیح مسلم (ایمان/۷۲) اور جامع ترمذی (الجنۃ/۱۶) میں بھی موجود ہے، اور ابن ماجہ کی سند بھی صحیح ہے۔

(۱۸۸/۱۲) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بنُ مُحمدٍ حَدَّثَنا اَبُومُعَاوِيَةَ، حَدَّثَنا الْاَعْمَشُ عَنْ تَمِيْمِ بْنِ سَلْمَةَ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيرِعَنْ عَائشَةَ قَالَتْ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَذِىْ وَسِعَ سَمْعُهُ الْاَصْوَاتَ لَقَدْجَاءَتِ الْمُجَادِلَةُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا فِيْ نَاحِيةِ البَيْتِ تَشْكُو زَوْجَهَا وَمَا اَسْمَعُ مَاتَقُوْلُ، فَاَنْزَلَ اللّٰهُ (قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا)

حضرت عائشہ فرماتی ہیں، تعریف اس خدا کی جس کی سماعت تمام آوازوں کا احاطہ کرلیتی ہے ایک جھگڑنے والی حضور کے پاس آئی، جب کہ میں گھر کے ایک گوشے میں بیٹھی تھی، وہ اپنے شوہر کی شکایت کررہی تھی، اور میں اسکی بات سن نہیں پائی تھی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی، اللہ نے اس عورت کی بات کو سن لیا، جو اپنے شوہر کے بارے میں تم سے جھگڑ رہی تھی۔

درمنثور، ابن کثیر، اور معالم التنزیل میں آیت کے نزول کا پس منظر یہ بیان کیا گیا ہے کہ

[1] مرقاة باب روية الله فصل اول .

حضرت اوس بن صامت نے ایک مرتبہ اپنی بیوی خولہ بنت ثعلبہ سے یہ کہا **انت علی کظهر أمی** زمانہ جاہلیت میں دائمی حرمت کے لئے یہ الفاظ بولے جاتے تھے، اور وہ طلاق مغلظہ سے بھی زیادہ سخت تھے، یہ صحابیہ گھبرا کر خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئی، اور وقوع طلاق سے متعلق مسئلہ پوچھا، اسکی بابت اس وقت کوئی تک صریح حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس لئے آپ نے فرمایا **ما اراك الاحرمت علیه** یہ سنکر وہ واویلا کرنے لگیں، کہ اس بڑھاپے میں کون میرا بوجھ اٹھائیگا، اور کسطرح میرے بچے پلیں گے، انہوں نے بے اختیار اللہ سے فریاد کی، **أللهم اِنی اشکوك الیك** ، ایک روایت میں ہے کہ آپ نے حضرت خویلہ سے کہا **ما امرت فی شانك بشی حتی الآن** ، حضرت مفتی شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ دونوں روایتیں صحیح ہوسکتی ہے ان میں کوئی تعارض نہیں، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئی، ظہار کے تفصیلی احکام فقہ وفتاویٰ کی کتاب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

﴿**الذی وسع سمعهٗ الاصوات**﴾ حافظ ابن حجر نے ابن بطلال کے حوالے سے وسع کے معنیٰ **ادرك** نقل کئے ہیں، علامہ سندھی لکھتے ہیں **ای احاط سمعه باالاصوات کلها لایفوته منهاشئی** ، بعض نسخوں میں اصوات کو مرفوع پڑھا گیا ہے، علامہ سندھی نے اسی لفظی ومعنوی اعتبار سے بعید قرار دیا ہے

﴿**لقد جاء ت المجاولة**﴾ سنن نسائی **فکان یخفیٰ علَیَّ کلامها** آیا ہے، حدیث سے صفت سماعت ثابت ہوتی ہے اور یہی ترجمہ الباب ہے۔ حدیث بخاری (توحید /۹) تعلیقاً، سنن نسائی (طلاق رظهار) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند حسن ہے۔

(۱۸۹/۱۳) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُبْنُ یَحْییٰ، حدثنا صَفْوَانُ بْنُ عِیْسیٰ، عن اِبن عَجْلَانَ عَنْ اَبِیْه، عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ کَتَبَ رَبُّکُم عَلیٰ نَفْسِهٖ بِیَدِهٖ قَبْلَ اَنْ یَخْلُقَ، رَحْمَتیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ.

مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے ہی تمہارے رب نے اپنے اوپر یہ لازم کرلیا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی۔

یہ رحمت باری تعالیٰ کی عظیم صفت ہے، اور دنیا کی تخلیق بھی دراصل اسی کا مظہر ہے، اسی

طرح فرشتوں کی تخلیق، انسانوں کو خلیفہ بنا کر سجی سجائی دنیا میں بھیجنا، انبیاء ورسل کی بعثت، مختلف زمانوں میں کلام الٰہی کا نزول، دائمی شریعت عطا کرنا ہونا پانی اور دوسری ضروریات زندگی کی فراہمی، عصیان ونافرمان کے باوجود قدم قدم پر درگزر ومسامحت نیز آخرت میں جنت عطا کرنا وغیرہ جیسی بے شمار نعمتیں اسی صفت ورحمت کا نتیجہ ہیں جس کو باری تعالیٰ نے تخلیق سے پہلے ہی لکھ دیا تھا۔

بخاری ومسلم میں لماخلق اللّٰہ الخلق کذب فی کتابه کا بھی اضافہ ہے، اور مسلم کے دوسرے طریق میں وهو موضوع عندهٗ کی بھی صراحت ہے اللہ کی رحمت وغضت کا کیا مطلب ہے؟ امام نووی نے لکھا ہے۔

قال العلماء غضبُ الله تعالیٰ ورضاهٗ یَرجِعَانِ الی مَعنیَ الاِرَادَةِ فارادتُه الاِثَابَةُ للمُطیعِ ومَنفعةُ العبدِ تُسمّٰی رضاً ورحمةً، وارادته عقاب العاصی وخُذ لَانِهٖ تُسمّٰی غضباً وارادتُه سبحانه وتعالیٰ صفةٌ له قدیمةٌ یریدبهاجمیعَ المُراداتِ ، والمرادُبالسَبَقِ والغَلَبةِ هُنا کثرةُ الرحمةِ وشمُولُها (صحیح ومسلم ج ۲ باب سعة رحمة اللّٰه الخ)

علما کا کہنا ہے کہ اللہ کی رضا اور اس کے غضب سے مراد ارادہ ہے مطیع وفرماں بردار بندے کو اجر ومنفعت کا ارادہ رحمت ورضاء کہلاتا ہے اور نافرمان کی رسوائی وسزا کا فیصلہ غضب کہلاتا ہے ارادہ اللہ کی قدیم صفت ہے جس کے ذریعہ وہ تمام چیزوں کا ارادہ کرتا ہے علماء نے وضاحت کی ہے کہ رحمت کی سبقت وغلبہ کے معنی یہاں کثرت اور رحمت کی تمام اصناف واقسام ہیں۔ ملا علی قاری نے اسی کو مزید وضاحت کے ساتھ لکھا ہے فرماتے ہیں۔

ومعنیَ الغلبةِ الرَّحمَةِ بالکثرةِ فی مُتَعلِّقِهَا علی الغَضَبِ والحاصلُ أن اِرادَةَ الخیرِ والنعمةِ والمثوبةِ منه سبحانه لعبادِهٖ اکثرُ من اِرادةِ الشرِّ و النِقمةِ والعُقوبَةِ لان الرحمةَ عامةٌ والغضبَ خاصٌ...... قیل رحمةُ الرحمان عامةٌ للمؤمنِ والکافرِبل لِجَمیعِ المَوجُودَاتِ (مرقات باب بدء الخلق، الفصل الاول)

غلبۂ رحمت کے معنی غضب کے بالمقابل رحمت کے متعلقات کی کثرت ہے یعنی باری

تعالیٰ شر، انتقام اور سزا سے زیادہ خیر ونعمت اور اجر کا ارادہ فرمائیں گے کیونکہ رحمت الٰہی مومن کافر بلکہ تمام موجودات کے لئے عام ہے۔

علامہ سندھی نے اس مقام پر یہ تنبیہ بھی کی ہے کہ سبقت وغلبت کے یہ معنی نہیں کے صفت رحمت تو کامل اور صفت غضب ناقص ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلی صفت کے آثار ونتائج دوسری سے زیادہ ہیں اور باری تعالیٰ جتنا سلوک رحمت کا کریں گے اتنا غضب کا نہیں ہوگا، يَدُلُّ على انه سَاقَ هذالكلامَ على أنه وعدَبانَه سَيُعامِل بالرَحمةِ مَالايُعامِلُ بالغَضَبِ ، لانه اِخبارٌعن صفةِ الرَّحمةِ والغضَبِ بان الاولى دونَ الثانيةِ ، لِانَّ صفاتِه كلَّها كاملةٌ عظيمةٌ ء ولان مَافعَلَ مِن آثارِ الاُولى فيمَاسبقَ اكثرُ مِمَافعَلَ مِن آثارِ الثَانيةِ حضرت گنگوہی کتب کا مطلب يُوجب منه منة وفضلاً كلها ہے[1] کتابت، تخلیق، رحمت اور غضب کی صفات ترجمۃ الباب ہیں، حدیث بخاری (دعوات/۱۰۹) مسلم اور ترمذی (بدء الخلق/۱) میں بھی موجود ہے۔

(۱۹۰/۱۴) حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بنُ الْمُنْذِرِ الحِزَامِيُّ وَيَحْيَ بْنُ حَبِيْبِ بْنِ عَرَبِيّ، قَالَا حَدَّثَنَا مُوسٰى بْنُ اِبْرَاهِيمَ بنِ كَثِيْرِ الاَنْصَارِيُّ الحَرامِيُّ، قَالَ سَمِعْتُ طَلْحَةَ بنَ خِرَاشٍ، قَالَ سَمِعْتُ جَابِرَ بنَ عَبْدِاللّٰهِ يَقُولُ لَمَّا قُتِلَ عَبْدُاللّٰهِ بنُ عَمْرِو بنِ حَرَامٍ يَوْمَ اُحُدٍ، لَقِيَنِى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ، فَقَالَ، يَا جَابِرُ أَلاَ اُخْبِرُكَ مَاقَالَ اللّٰهُ لِأَبِيْكَ؟ وَقَالَ يَحيٰى فِي حَدِيْثِهٖ فَقَالَ: يَاجَابِرُ! مَالِى أرَاكَ مُنْكَسِرًا قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اُسْتُشْهِدَ أَبِى وَتَرَكَ عِيَالًا وَدَيْنًا قَالَ: أفَلَا أُبَشِّرُكَ بِمَا لَقِي اللّٰهُ بِهٖ أبَاكَ؟ قَالَ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ مَاكَلَّمَ اللّٰهُ اَحَدًا قَطُّ اِلَّا مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ، وَكَلَّمَ أبَاكَ كِفَاحاً فَقَالَ: يَاعَبْدِى! تَمَنَّ عَلَيَّ اُعْطِكَ قَالَ: يَارَبِّ! تُحْيِيْنِى فَأُقْتَلَ فِيكَ ثَانِيَةً، فَقَالَ الرَبُّ سُبْحَانَهُ: اِنَّهُ سَبَقَ مِنِّى اَنَّهُمْ اِلَيها لَايَرْجِعُوْنَ، قَالَ: يَاربِّ! فَأبْلِغْ مِنْ وَرَائِي فَأنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ

---

[1] لامع الدراری: ۳/۴۳۶

قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ .

جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ جب غزوہ احد میں عبداللہ بن عمرو بن حرام شہید ہوئے تو رسول اللہ ﷺ سے میری ملاقات ہوئی آپ نے فرمایا اے جابر کیا میں تم کو وہ بات نہ بتاؤں جو اللہ نے تمہارے باپ سے کہی ہے، جب کہ یحییٰ راوی اپنی سند میں یہ الفاظ نقل کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: جابر کیا بات ہے مغموم اور شکست خوردہ نظر آتے ہو؟ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول میرے والد شہید ہو گئے اور انھوں نے آل اولاد اور قرض چھوڑا ہے، آپ نے فرمایا: کیا میں تم کو اس چیز کی خوشخبری نہ دوں جس کے ساتھ اللہ نے تمہارے والد سے ملاقات کی، انھوں نے کہا کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! فرمایا: اللہ نے بلا حجاب آج تک کسی سے گفتگو نہ کی تھی لیکن تمہارے والد کو براہِ راست شرف تکلم سے نوازا اور کہا اے میرے بندے! مجھ سے مانگ عطا کرونگا، انھوں نے درخواست کی اے خدا آپ مجھے زندہ فرمادیں تو میں دوبارہ آپ کی راہ میں شہید ہو جاؤں، باری تعالیٰ نے فرمایا یہ تو میری جانب سے طے کیا جا چکا ہے کہ لوگ یہاں آنے کے بعد پھر دنیا کی طرف نہیں لوٹ سکتے! انھوں نے کہا، مولیٰ جو لوگ ابھی وہیں موجود ہیں پھر انہیں کو مطلع فرمادیں رسول اللہ نے فرمایا کہ باری تعالیٰ نے اطلاع کے لئے یہ آیت نازل کی (جو لوگ اللہ کے راستے میں شہید ہوئے انہیں مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں، ان کے رب کی جانب سے انہیں رزق دیا جاتا ہے)۔

﴿مالی آراك منكسرًا﴾ ملا علی قاری نے اسکا ترجمہ منکسر البال والخاطر مغموم اور حزین سے کیا ہے، عیال گھر کے ان افراد کو کہا جاتا ہے جن کا نفقہ واجب ہوتا ہے۔

﴿افلا ابشرك بما لقى الله به اباك﴾ حضرت جابر ترکہ کی قلت اور قرض کے بوجھ سے پریشان تھے، ایسی صورت میں انکی نصرت واعانت کے بجائے ان کے والد کی اخروی مقبولیت وکامیابی کی خبر بظاہر بے جوڑ نظر آتی ہے پھر آپ نے اس موقع پر یہ بشارت کیوں سنائی؟ حضرت گنگوہیؒ جواب دیتے ہیں إنَّ البشارةَ تُزِيلُ تَرَحَ الهُمُومِ وَانعامُ اللّٰهِ تبارك وتعالٰى على اَبيه بعدَ مَوتِهٖ يُهَوِّنُ عَليهِ مَايلقاهُ لِاَجَلِه وَيتكَلَّفُ فِي اَداءِ دَينِهٖ خوش خبری غموں کے بوجھ کو ہلکا کر دیتی ہے اس لئے ان کے والد پر ہونے والے انعامات عنقریب

حضرت جابر کی پریشانیوں کو دور اوران کے قرض کی ادائیگی کو آسان کردیں گے تو اس لحاظ سے اس بشارت کا تعلق صرف اخروی نہیں بلکہ دنیوی معاملات سے بھی ہے۔

﴿ماکلم اللہ احدا قط الا من وراء حجاب﴾ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے، وما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیا او من وراء حجاب، اس قرآنی تصریح کے بعد مذکورہ جملہ پر اشکال پیدا ہوتا ہے دونوں میں تطبیق کس طرح ہو؟ ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ آیت کا تعلق دنیا سے ہے جبکہ یہ اخروی معاملہ ہے اس لئے کوئی اشکال نہیں مولانا عبدالغنی مجددی اس کی عارفانہ دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ روح وجسم مثالی یا جنتی بدن کلام ربانی کی تجلیات کا تحمل کر لیتے ہیں۔

عالم بالا میں جسم لطیف کی بدولت یہ مکالمہ ہر ایک کے حق میں ممکن ہے لیکن حدیث کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو بن حرام سے پہلے کسی شہید کا باری تعالیٰ سے ایسا مکالمہ نہیں ہوا سندھیؒ کے الفاظ یہ ہیں، لافی الدنیا ولافی عالم البرزخ ملا علی قاریؒ نے اس کی وجہ یہ بتلائی کہ وہ افضل من سَائر الشهداء الماضيةِ ہیں لیکن شہداء بدر کے فضائل کو دیکھتے ہوئے یہ بات محل نظر ہے حضرت مولانا محمد زکریاؒ نے مستدرک حاکم کے حوالے سے لکھا ہے کہ عبداللہ بن عمر غزوۂ احد میں شہید ہونے والے سب سے پہلے صحابی ہیں۔

﴿فکلمَهُ كِفَاحًا﴾ كَفَحَ (ف) كَفْحًا سے دوسرے مصدر ہے لقیته کفاحا عربوں میں معروف ہے یعنی رودررو ہونا آمنے سامنے ہونا ابن الاثیر نے نہایہ میں اور علامہ سندھیؒ نے سنن مصطفیٰ میں اس کی تشریح مَواجَهَة ليس بينهما حِجَابٌ ولا رسول سے کی ہے لیکن دیگر روایات کے پیش نظر حافظ سیوطیؒ نے اسے تمام شہداء احد سے متعلق قرار دیا ہے حضرت مولانا گنگوہیؒ کی بھی یہی رائے ہے فرماتے ہیں، وفعل هذا بجملة شهداء هذه الغزوة[1] الغرض یہ جملہ حضرت عبداللہ کی انتہائی مقبولیت اور مغفرت کی دلیل ہے۔

قرض کا مسئلہ

مسند احمد، سنن ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ کی روایت ہے کہ نفس المؤمن معلقة بدينه

---

[1] الکوکب الدری: ۲/۲۹۴، سورۃ شوریٰ/۵۱

حتی یقضٰی عنہٗ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرض چھوڑ جانے کی صورت میں بندہ مومن رحمت وراحت کے اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا جس کا وہ مستحق ہے حضرت عبداللہ مقروض ہیں پھر ان کے ساتھ یہ قربت کا معاملہ کیونکر ہوا حضرت مولانا مجددی نیا اس کے دو جواب دیئے ہیں۔ (۱) یہ وعید اس وقت ہے جبکہ میت نے قرض کی ادائیگی کا کوئی سامان نہ چھوڑا ہو عبداللہ بن حرام نے اس کے لئے ترکہ چھوڑا تھا اس لئے وہ وعید کا مصداق نہیں (۲) انکی روح کے محبوس و معلق نہ رہنے کی وجہ شہادت ہے جس کی بدولت حقوق العباد بھی معاف کر دیئے گئے، صحیح مسلم کی روایات میں ہمیں یغفر للشھید کل ذنبٍ الا الدین[۲] کا ضابطہ ملتا ہے اس لئے حضرت مولانا کا دوسرا جواب محل نظر ہے ہاں پہلا جواب بڑی حد تک صحیح ہے لیکن اس میں اتنا اضافہ اور کرنا ضروری ہے کہ میت نے قرض کی ادیگی میں کوئی کوتاہی وغفلت بھی نہ برتی ہو وہ خود ادا کرنا چاہتا تھا لیکن ناگہانی موت نے اس کا موقعہ نہیں دیا، حضرت عبداللہ کا یہی معاملہ ہے اور اللہ کی آئندہ ہونے والی ادائیگی کا بھی علم تھا اس لئے انہیں پیشگی اس قربت وانعام سے نوازا گیا جس کے مستحق وہ قرض کی ادائیگی کے بعد تھے۔

﴿تمن علٰی اعطك﴾ یہ تمنی سے امر کا صیغہ ہے اس لئے حرف علت کو گرا دیا گیا اسی طرح اعطك دراصل اعطیك تھا جواب امر ہونے کی بناء پر یاء ساقط ہوگئی، وعدے میں عموم نظر آتا ہے جو چاہو مانگ لو دیا جائیگا پھر جب انہوں نے دنیا میں دوبارہ واپسی کی درخواست کی تو اسے قبول نہیں کیا گیا اس پر وعدہ خلافی کا اطلاق ہوگا، علامہ سندھی لکھتے ہیں اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ معروف ومقرر اصول کے خلاف کوئی چیز طلب کرنا خود اس وعدے کے عموم سے خارج ہے کیونکہ ویمکن الجواب بان خلاف المیعاد المعھود مستثنٰی من العموم فان الغایة من جملة المخصصات کماذکرہ اھل الاصول.

﴿یارب تحیینی﴾ یہاں احیینی مناسب تھا اسے چھوڑ کر خبر یہ لانے کی کیا وجہ ہے؟ سندھی کہتے ہیں لاظھار کمال الرغبة انشائیہ چھوڑا خبر یہ لانا اپنی خواہش وآرزو کی شدت وکمال کو ظاہر کرتا ہے، ملا علی قاری نے بھی اسے دعا کے معنی میں قرار دیا ہے خبر بمعنٰی الدعاء[۳].

۱۔ الکوکب الدری: ۲۰۴/۳ ۲۔ صحیح مسلم: ج۲، باب من قبل فی سبیل اللہ کفرت خطایاہ الا الدین
۳۔ مرقات جامع المناقب: فصل دوم۔

﴿انه سبق منی انهم الیها لا یرجعون﴾ باری تعالیٰ کا ایک اٹل فیصلہ ہے کہ دنیا کی زندگی انسان کو صرف ایک بار ملتی ہے اس کے بعد وہ عالم برزخ میں منتقل ہو کر یہاں سے بالکل کٹ جاتا ہے اس لئے دنیا میں جسم تو کیا اس کی روح کے بھی دوبارہ آنے کا کوئی مکان نہیں ہاں بطور معجزہ تھوڑی دیر کے لئے کوئی زندہ ہو جائے تو کوئی حرج نہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات و معجزات اسی کی مثال ہیں۔

قرآن وسنت کی روشنی میں اربوں کھربوں انسانوں کے اندر چند مثالیں شاذ بلکہ اشذ کا درجہ رکھتی ہیں جو قواعد کی رو سے معدوم کے حکم ہیں اس لئے ہم کرامت کا نام لیکر جو ہر نامور دینی شخصیت کو زندہ کرنے پر تلے ہیں یہ چیز شریعت کے مسلم اصولوں سے متصادم ہے اور ہندوانہ عقیدے تناسخ کو بھی وہ ممکن بناتی ہے اس لئے کسی مسلمان کو ایسا باطل عقیدہ رکھنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

﴿فانزل الله تعالیٰ﴾ اس روایت سے آیت کا شان نزول حضرت عبداللہ بن عمر بن حرام کا واقعہ معلوم ہوتا ہے جبکہ سنن ابی داؤد اور صحیح مسلم باب فی بیان ان ارواح الشهداء فی الجنة کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ آیت کا شان نزول جملہ شہداء احد ہیں، اب دونوں میں تطبیق کس طرح ہو یہی کہا جائے کہ آیت دونوں ہی سے متعلق ہے حضرت عبداللہ مذکورہ بالا شہداء میں بھی شامل تھے اور ابن ماجہ کی روایت کے مطابق یہ عنایت ونوازش ان کی اضافی خصوصیت ہے، حیات اخروی تو مؤمن، کافر تمام انسانوں کو حاصل ہے پھر شہداء کی کیا خصوصیت ہوئی حضرات محدثین نے لکھا ہے کہ برزخ میں حیات کے مختلف درجے ہیں سب سے پہلا درجہ انبیاء کا ہے اور دوسرے نمبر پر شہداء ہیں جن کو دوسروں کے برخلاف جنت کا رزق مسلسل دیا جاتا ہے اور وہ سبز پرندوں کی شکل میں جنت میں اڑے پھرتے ہیں اس کے پھل کھاتے ہیں، نہروں کا پانی پیتے ہیں اور عرش میں لٹکی ہوئی سونے کی قندیلوں میں بسیرا کرتے ہیں دوسروں کو یہ نعمت حاصل نہیں۔ ترجمۃ الباب رویت باری اور صفت کلام ہے جہمیہ دونوں کے منکر ہیں۔

حدیث ترمذی (تفسیر آل عمران) میں بھی آئی ہے دونوں کی سند ایکساں ہے طلحہ بن خرش

کیونکہ کمزور ہیں اسلئے بوصیری نے زائد میں اسے هذا اسناد ضعیف قرار دیا ہے جبکہ امام ترمذی نے حسن غریب کہا ہے کیونکہ اس کو موسیٰ بن ابراہیم کے علاوہ کسی نے روایت نہیں کیا۔

(۱۹۱/۱۵) حَدَّثَنَا أَبُوْ بَكْرِ بْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ ثَنَا وَكِيْعٌ عَنْ سُفْيَانَ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ يَضْحَكُ اِلٰى رَجُلَيْنِ يَقْتُلُ أَحَدُهُمَا الآخَرَ كِلَاهُمَا دَخَلَ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُ هَذَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُسْتَشْهَدُ ثُمَّ يتوب اللّٰهُ عَلٰى قَاتِلِهِ فَيُسْلِمُ فَيُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُسْتَشْهَدُ .

فرمایا باری تعالیٰ ان دو آدمیوں پر ہنستے ہیں جن میں ایک دوسرے کو قتل کرتا ہے اور دونوں جنت میں جاتے ہیں ایک تو اللہ کے راستے میں جہاد کر کے شہید ہوتا ہے پھر باری تعالیٰ قاتل کو بھی اسلام کی توفیق دیتے ہیں وہ بھی جہاد کرتا ہے اور شہید ہو جاتا ہے۔

﴿ضحك﴾ جیسی تمام متشابہات کے سلسلے میں سلف کا موقف ظاہر پر ایمان رکھنا اور حقیقت کو اللہ کے سپرد کرنا ہے اس لئے وہ ان میں تاویل کے روادار ہیں جبکہ متاخرین نے افہام وتفہیم کے لئے تاویل کا راستہ اختیار کیا ہے، چنانچہ قاضی عیاض نے انما المراد به الرضاء بفعلهما والثواب علیه[1] سے اور ابن حجر وسندھی نے المراد بالضحك الاقبال بالرضاء[2] سے کی ہے، یعنی دونوں کی توفیق وقربانی سے اللہ راضی ہو گیا، امام بخاری نے اس کے معنی رحمت بتاتے ہیں جبکہ امام نووی نے ایک احتمال یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اس سے ان فرشتوں کی ہنسی مراد ہو جن کو اس کی روح قبض کرنے اور جنت میں داخل کرنے کی باری تعالیٰ نے ذمہ داری سونپی ہے کیونکہ مامور کا فعل آمر کی طرف منسوب ہو جاتا ہے جیسا کہ بادشاہ اگر کسی کو کسی کے قتل کا حکم دے تو یہی کیا جاتا ہے کہ، بادشاہ نے قتل کیا ویحتمل ان یکون المراد هنا ضحك ملائکة اللّٰه تعالٰی الذین یوجههم هم لقبض روحه وادخاله الجنة کما یقال قتل السلطان فلاناً اذا امربقتله[3] قاتل ومقتول سے متعلق حدیث

---

[1] صحیح مسلم ۲/۱۳۷ [2] فتح الباری ۶/۳۱، کتاب الجهاد باب الکافر یقتل المسلم ثم یسلم الخ
[3] صحیح مسلم ۲/۱۳۷

میں تین چیزیں ملتی ہیں (۱) دو مسلمان ناحق لڑے ہوں تو القاتل والمقتول کلاھما فی النار کا ضابطہ ہے (۲) قاتل اور مقتول میں ایک مسلمان دوسرا کافر ہے تو لایجتمع کافر وقاتله فی النار ابدًا کی رو سے مسلمان جنت میں اور کافر دوزخ میں جائیگا (۳) ان دونوں صورتوں کے برخلاف کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قاتل ومقتول دونوں جنت میں جائیں اسکی شکل حدیث باب کے مطابق یہ ھیکہ کافر نے مسلمان کو شہید کرنے کے بعد اسلام قبول کیا اور پھر وہ بھی کسی کے ہاتھوں شہید ہوگیا تو یہ دونوں باری تعالیٰ کو بڑے محبوب ہیں، ضحک کی صفت کا اثبات ترجمۃ الباب ہے حدیث بخاری، مسلم (امارہ/۳۴) نسائی (جھاد/اجتماع القاتل والمقتول) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی صحیح ہے۔

(۱۹۲/۱۶) حَدَّثَنَا حَرْمَلَةُ وَيُونُسُ بْنُ عَبْدِالْأَعْلٰى قَالَا حَدَّثَنَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ وَهَبٍ اَخبَرَنِي يُونُسُ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ حَدَّثَنِي سَعِيدُ بْنُ الْمُسَيبِ اَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ كَانَ يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقْبِضُ اللّٰهُ الْاَرْضَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَطْوِىُ السَّمَاءَ بِيَمِيْنِهٖ ثُمَّ يَقُوْلُ أَنَاالمَلِكُ أَيْنَ مُلُوْكُ الْاَرْضِ.

باری تعالیٰ قیامت کے دن زمین وآسمان کو لپیٹ کر اپنے داہنے ہاتھ میں لے لیں گے پھر فرمائیں گے، میں ہی بادشاہ ہوں کہاں ہیں دنیا کے بادشاہ؟

مسلم میں این الجبارون واین المتکبرون ہے دیگر چیزوں کی طرح اس دنیا کی بھی ایک عمر مقرر ہے پھر جب اس کے خاتمے کا وقت آئیگا تو سب سے پہلے صور پھونکا جائیگا پھر نظام کائنات درھم برھم ہونا شروع ہوجائیگا، آسمان جولق ودق دکھائی دیتا ہے کو باری تعالیٰ چشم زدن میں کاغذ کی طرح لپیٹ دینگے، یوم نطوی السماء کطی السجل للکتب، اسی طرح زمین جو بڑی وسیع وعریض نظر آتی ہے، سمٹ کر باری تعالیٰ کی ایک مٹھی میں سما جائیگی، والارض جمیعًا قبضتهٗ یوم القیامة والسموات مطویات بیمینه، حدیث پاک دراصل قرآن کی ان ہی دونوں آیتوں کی تفسیر ہے، جو گذشتہ روایت کی طرح متشابہات کی قبیل سے ہے، کیونکہ قبض، طی اور یمین کی حقیقت کا ادراک ناممکن ہے، قاضی عیاض نے شرح نووی میں یقبض اور یطوی کے معنی جمع کرنا بتائے ہیں ملاعلی قاری یوم تبدل الارض غیر الارض

کی روشنی میں زمین وآسمان کے بدل جانے کا رجحان ظاہر کرتے ہیں، علامہ سندھی لکھتے ہیں کہ اس سے باری تعالیٰ کی حد درجہ عظمت وقدرت کا اظہار ہوتا ہے اوران بڑے بڑے امور کی حقارت سامنے آتی ہے جن کے تصور سے ہی لوگوں کو پسینے چھوٹ جائیں **والمقصود بیان غاية عظمته تعالىٰ وحقارة الافعال التى تتحير فيها الاوهام** باری تعالیٰ کی شہنشاہیت کا اعلان ان لوگوں کے خلاف اتمام حجت ہوگا، جو شرک کرتے تھے آج وہ بے یارومددگار نظر آئیں گے باری تعالیٰ کی جانب قبض، طلی اور قول کی نسبت ترجمۃ الباب ہے۔

حدیث بخاری (تفسیر/زمر، رفاق/۴۴، توحید/۶) مسلم (صفۃ المنافقین/۱) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بعینہٖ مسلم کی سند ہے۔

(۱۹۳/۱۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بنُ يَحْيىٰ، ثنا مُحَمَّدُ بنُ الصَّبَّاحِ، حَدَّثَنَا الوَلِيْدُ بنُ أَبِيْ ثَوْرٍ الهدانِيُّ عَنْ سِمَاكٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بنِ عَمِيْرَةَ عَنِ الاَحْنَفِ بنِ قَيْسٍ عَنِ العَبَّاسِ بنِ عَبْدِ المُطَّلِبِ قالَ كنتُ بالبطحاءِ فِيْ عِصَابَةٍ وَفِيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فمَرَّتْ بِه سَحَابَةٌ فَنظر إِلَيْهَا فَقَالَ ماتُسَمُّوْنَ هٰذِهِ؟ قَالُوْا السَّحَابُ قَالَ وَالْمُزْنُ قالوا وَالْمُزْنُ قال "والعِنانُ" قال ابوبكرٍ قالوا وَالعِنَانُ قَال كم تَرَوْنَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ السَّمَاءِ قَالُوْ لانَدرِى، قال فانَّ بَيْنَكُمْ وبينها اِمَّا واحِدًا أواثنين أوْثلاثًا وَسَبْعِيْنَ سَنَةً وَالسَّمَاءُ فَوْقَهَا كذٰلِكَ حَتّٰى عَدَّ سَبْعَ سَمَاواتٍ ثُمَّ فَوْقَ السَّمَاءِ السابِعَةِ بَحْرٌ بَيْنَ أَعْلَاهُ وَاَسْفَلِهِ كَما بَيْنَ سَمَاءٍ الٰى سَمَاءٍ ثُمَّ فَوْقَ ذٰلِكَ كما ثمانِيَةُ أوعالٍ بَيْنَ اَظْلَافِهِنَّ وَرُكَبِهِنَّ كما بَيْنَ سَمَاءٍ الٰى سَمَاءٍ ثم عَلٰى ظُهُوْرِهِنَّ العَرْشُ بَيْن اَعْلَاهُ وَاَسْفَلِهِ كَمَا بَيْنَ سماءٍ اِلٰى سَمَاءٍ ثُمَّ اللّٰهُ فَوْقَ ذلك تبارك وتعالى.

عباس بن عبدالمطلب سے مروی ہے کہ میں ایک جماعت کے ساتھ بطحاء میں تھا رسول اللہ ﷺ بھی موجود تھے، آپ کے سامنے ایک بادل کا ٹکڑا گذرا اسے دیکھ کر فرمایا تم اسے کیا کہتے ہو حاضرین نے جواب دیا بادل فرمایا مزن بھی کہتے ہیں انہوں نے کہا ہاں مزن بھی کہتے

ہیں، فرمایا عنان بھی کہتے ہو، ابوبکر کی تصریح کے مطابق حاضرین نے کہا ہاں عنان بھی کہتے ہیں، پھر فرمایا، زمین و آسمان کے درمیان تم کتنی مدت سمجھتے ہو، انہوں نے جواب دیا ہمیں معلوم نہیں، ارشاد فرمایا، کہ تمہارے اور آسمان کے درمیان ۷۱/۷۲/۷۳ سال کا فاصلہ ہے پھر اس کے اوپر ایک آسمان ایسا ہی ہے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے سات آسمانوں کو شمار کرایا، پھر ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی تہہ وسطح کے درمیان ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک کا فاصلہ ہے پھر ان سب کے اوپر آٹھ پہاڑی بکریاں ہیں جن کی کھروں اور پیٹھوں کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک ہوتا ہے پھر ان کی پشت پر عرش الٰہی ہے، جس کے نچلے اوپر والے حصے کے درمیان ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک کا فاصلہ ہے پھر اس کے اوپر باری تعالیٰ جلوہ افروز ہیں۔

سحاب ، عنان اور مزن تینوں بادل کے نام ہیں مؤخر الذکر کے لئے سفید اور پانی سے بھرا ہونا بطحاء کے لغوی معنی ایسے کشادہ نالے کے ہیں جس میں ریت اور چھوٹی چھوٹی کنکریاں ہوں، یہ مکہ مکرمہ کی ایک مشہور جگہ ہے جو جنت المعلیٰ کے اوپر واقع ہے نیز مکہ پر بھی اس کا اطلاق کیا جاتا ہے **عصابہ** کے بارے میں طیبی محمد طاہر پٹنی اور ملا علی قاری کا کہنا ہے کہ وہ کفار مکہ کی جماعت تھی جب کہ حضرت گنگوہی ہی نے اسے صحابہ کی جماعت قرار دیا ہے پہلی رائے زیادہ قرین قیاس نظر آتی ہے۔

﴿اما واحدًا او اثنين او ثلثا﴾ طیبی کا خیال ہے کہ یہاں کسی مدت کی تحدید نہیں بلکہ تکثیر کی طرف اشارہ ہے کیونکہ دوسری روایات میں یہ مدت پانچ سو سال آئی ہے، المراد بالسبعين ههنا التكثير لا التحديد لما ورد ان بين السماء والارض وبين كل سماء مسيرة خمس مائة ملا علی قاری مولانا گنگوہی اور حضرت شیخ سہارنپوری کی بھی یہی رائے ہے علامہ سندھی ۷۱/۷۲/اور ۷۳ سال کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے لکھتے ہیں شاید یہ فرق چلنے والے کی چال کا ہے کیونکہ انسان کی رفتار کو گھوڑے کی رفتار پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، سیوطی اور ابن حجر نے بھی یہی لکھا ہے لیکن اس رائے کے ذریعہ اگر پانچ سو سال اور تہتر سال کے درمیان تطبیق پیدا کی جائے تو یہ زیادہ مناسب ہے اس صورت میں پانچ سو سال انسان کی

مدت ہوگی اور ۳۷ سال گھوڑے کی یہی راجح ہے۔ حضرت کشمیریؒ کا خیال ہے کہ یہاں راوی نے سیکڑوں کو چھوڑ کر صرف کسر کو ذکر کیا ہے۔ (العرف الشذی)

﴿ثم فوق ذالك ثمانية اوعال﴾ یہ وعل کی جمع ہے جس کے معنی پہاڑی بکرے کے ہیں اس کے تلوار کی طرح مڑے ہوئے دو سینگ ہوتے ہیں حضرت مولانا عبدالغنی مجددی فرماتے ہیں کہ یہاں قرآن کی آیت وحمل عرش ربك فوقهم يومئذ ثمانية کی طرف اشارہ ہے ملا علی قاریؒ، علامہ سندھی، اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری وغیرہ کے نزدیک اوعال کی صورت میں یہ فرشتوں کی جماعت ہے جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں۔

﴿بين اظلافهن وركبهن﴾ یہ ظِلف کی جمع ہے معنی مویشی کے کھر جب کہ رکب ٹانگوں سے اوپر کے حصے کو کہتے ہیں۔

﴿ثم الله فوق ذالك﴾ اس کی تشریح ملا علی قاری نے فوق العرش حكماً وعظمة واستيلاء[1] اور سندھی نے فوقيته على العرش بالعلو والعظمة والحكم لاالحلول والمكان سے کی ہے جس کا مشترک مفہوم یہ ہے کہ باری تعالیٰ کی یہ فوقیت کسی جہت اور مکان میں حلول نہیں بلکہ اس سے مراد علو، عظمت، اور حکم واستیلاء ہے جب کہ سلف اسے متشابہات میں شمار کر کے تاویل و تفصیل سے گریز کرتے ہیں ترجمۃ الباب آسمانوں، سمندر اور عرش کی تخلیق ہے جہمیہ اس صفت کے بھی منکر ہیں حدیث ابوداؤد (سنۃ/جہمیہ) ترمذی (تفسیر الحاقۃ) میں بھی آئی ہے ترمذی کی سند کو امام نے حسن غریب قرار دیا ہے جب کہ ابوداؤد و ابن ماجہ کی سند یکساں ہے دونوں میں ولید ابن ابی ثور موجود ہیں جن کو حافظ نے تقریب میں (۷۴۳۱) ضعیف لکھا ہے۔ اس لئے وہ حسن ہے۔

(۱۹۴/۱۸) حَدَّثَنَا يَعْقُوْبُ بْنُ حُمَيْدِ بنِ كَاسِبٍ ثَنَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ عَنْ عَمْرِو بْنِ دِينَارٍ عَنْ عِكْرِمَةَ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ ﷺ قَالَ اذَا قَضَى اللّٰهُ اَمْرًا فِى السَّمَاءِ ضَرَبَتِ الملٰئِكَةُ اَجنِحتَهَا خُضْعَانًا لِقَوْلِهٖ كَاَنَّهٗ سِلْسِلَةٌ عَلٰى صَفْوَانَ فَاِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوا مَاذَا قَالَ رَبُّكُم قَالُوْ الحَقَّ

[1] مرقات باب بدء الخلق فصل دوم [2] بذل المجہود کتاب السنہ باب فی الجہمیہ

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ قَالَ فَيَسْمَعُهَا مُسْتَرِقُوْا السَّمْعِ بَعْضُهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ فَيَسْمَعُ الْكَلِمَةَ فَيُلْقِيْهَا اِلٰى مَنْ تَحْتَهٗ فَرُبَّمَا اَدْرَكَهُ الشِّهَابُ قَبْلَ أَنْ يُلْقِيَهَا اِلَى الَّذِيْ تَحْتَهٗ فَيُلْقِيْهَا عَلٰى لِسَانِ الكَاهِنِ اَوِ السَّاحِرِ فَرُبَّمَا لَمْ يُدْرِكْ حَتّٰى يُلْقِيَهَا فَيَكْذِبُ مَعَهَا مِائَةَ كَذْبَةٍ فَتَصْدُقُ تِلْكَ الكَلِمَةُ الَّتِيْ سَمِعَتْ مِنَ السَّمَاءِ.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب باری تعالیٰ کوئی حکم صادر فرماتے ہیں تو فرشتے آسمان میں خوف واطاعت کی وجہ سے اس طرح پر مارتے ہیں گویا کہ چکنے پتھر پر لوہے کی زنجیریں گھسٹ رہی ہوں پھر جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوجاتی ہے تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا ان کا جواب ہوتا ہے کہ حق فرمایا وہ سب سے بلند وبالا اور بڑا ہے فرمایا پھر اس کو چھپ کر سننے والے سن لیتے ہیں جو اوپر نیچے ہوتے ہیں پھر وہ یہ بات سن کر اپنے نیچے والے کو بتاتا ہے تو بسا اوقات نیچے والے کو بتانے سے پہلے ہی وہ شہاب ثاقب کا شکار بن جاتا ہے اس طرح وہ اسے کاہن وساحر کی زبان پر جاری کر دیتا ہے کبھی اسے شہاب ثاقب نہیں پکڑ پاتا تو وہ نیچے القاء کر دیتا ہے پھر یہ اس میں سو جھوٹ ملاتا ہے اس طرح آسمان سے سنی گئی یہ بات سچ ہوجاتی ہے۔

﴿اذا اقضی اللّٰہ...... علی صفوان﴾ خضعان کو ابن حجر نے غفران کے وزن پر مصدر قرار دیا ہے، خطابی وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے جب کہ بعض حضرات اسے خاضع کی جمع بتلاتے ہیں، سندھی دونوں اقوال نقل کر کے لکھتے ہیں کہ جمع کی صورت میں تو یہ حال واقع ہے جب کہ مصدر کو مفعول مطلق قرار دینے کی گنجائش ہے یہ خوف کی ایک تعبیر ہے کیونکہ لان الطائر اذا استشعر خوفاً ارخیٰ جناحیه مرتعداً جب پرندہ خوف محسوس کرتا ہے تو مارے ڈر کے پروں کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے، اس آواز کو چکنے پتھر پر لوہے کی زنجیر بجنے سے تشبیہ دی گئی ہے جو مسلسل آواز پیدا کرتی ہے، مسلم کی حدیث میں ہے کہ جب باری تعالیٰ کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو پہلے حاملین عرش تسبیح پڑھتے ہیں پھر یک بعد دیگر تسبیح سماء دنیا تک پہنچتی ہے اور تمام فرشتے اسی میں مشغول ہوجاتے ہیں، کچھ دیر بعد حاملین عرش سے قریب والے پوچھتے ہیں

تمہارے رب نے کیا فرمایا، حاملین وہ حکم بتا دیتے ہیں اس طرح یہ بات بالترتیب نیچے والے فرشتوں تک پہنچ جاتی ہے......... صحیح مسلم کی اس حدیث کے پیش نظر سوال پیدا ہوتا ہے کہ قضاء الٰہی کے فوراً بعد فرشتوں پر گھبراہٹ کی یہ کیفیت طاری ہوتی ہے یا پہلے تسبیح وہ تسبیح پڑھتے ہیں حضرت گنگوہی فرماتے ہیں کہ پہلے پڑھتے ہیں بعد میں یہ کیفیت ہوتی ہے لیکن حضرت شیخ سہارنپوری نے الکوکب الدری کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ روایت کا سیاق یہ بتلا رہا ہے کہ سب سے مقدم گھبراہٹ کی کیفیت ہے جب وہ کچھ زائل ہوتی ہے تو فرشتے تسبیح پڑھنے لگتے ہیں اور اس کے بعد ہی ماذا قال ربکم کا سوال کرتے ہیں یہ قول ذوق کو زیادہ اپیل کر رہا ہے۔

﴿قالوا الحق وهو العلي الكبير﴾ حافظ سیوطی نے مصباح الزجاجہ میں لکھا ہے کہ قالوا کا فاعل جبرئیلؑ ومیکائیلؑ جیسے مقرب فرشتے ہیں سندھی کی بھی یہی رائے ہے۔

آیت کا یہی محمل ہے اس کے علاوہ بعض مفسرین نے جو کفار کا قول قرار دے کر اسے قیامت کے دن سے جوڑا ہے ابن حجر کے نزدیک وہ صحیح حدیث کے خلاف ہے۔

﴿الحق﴾ یا تو محذوف مصدر کی صفت ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور تقدیر عبارت قال الله تعالیٰ القولَ الحقَّ ہے یا مرفوع ہے اور تقدیر عبارت ای عبروا عن قول الله تعالیٰ وما قضاه وقدره بلفظ الحق یعنی انہوں نے اللہ کے قول اور قضاء وقدر کو حق سے تعبیر کیا، اس سے مراد کلمہ کن بھی ہوسکتا ہے جس کی رو سے دنیا میں کوئی خوشحال کوئی بدحال کوئی ذلیل اور کوئی محترم ہو جاتا ہے۔

﴿مسترقوا السمع﴾ استراق کے معنی چھپ کر سننے کے ہیں جس کا ترجمہ ابن حجر نے جن سے اور سندھی نے شیطان سے کیا ہے، یہاں دراصل قرآن کی ان آیات کی طرف اشارہ ہے۔ انا زينا السماء الدنيا بزينة الكواكب وحفظا من كل شيطان مارد لا يسمعون الى الملاءِ الاعلىٰ يقذفون من كل جانب دحوراً ولهم عذاب واصب الا من خطف الخطفة فاتبعه شهاب ثاقب.

شہاب ثاقب کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ اس کا جواب مختصر یہ ہے کہ وہ بڑے بڑے پتھروں کی مانند ہوتے ہیں اور پیشگی دفاع کے طور پر ان کو ہر وقت فضاء میں رکھا جاتا ہے جنوں اور

شیطانوں کو انہیں کے ذریعے دھتکارا جاتا ہے حکمت الٰہی کے تحت کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شہاب ثاقب کا شکار بننے سے پہلے وہ کچھ باتوں کو اچک کر نیچے القاء کر دیتے ہیں اور یہی کاہنوں اور جادوگروں کی کل معلومات ہیں جن میں وہ سو جھوٹ اور ملا کر لوگوں کو بیوقوف بناتے ہیں چنانچہ آسمان سے سنی ہوئی ان کی کوئی بات کبھی صحیح بھی ہو جاتی ہے لیکن اس میں ان کا کوئی کمال نہیں......... حدیث بخاری و ترمذی (تفسیر سبا) ابوداؤد مجملاً (الحروف والقرأت) میں بھی آئی ہے ابن ماجہ پہلے راوی کو حافظ نے تقریب (۷۸۱۵) میں صدوق رُبما وَهِم لکھا ہے بقیہ سند بخاری کی ہے۔

(۱۹/۱۹۵) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا اَبُوْمُعَاوِيَةَ عَنِ الْأَعْمَشِ عَنْ عَمْرِو بْنِ مُرَّةَ عَنْ أَبِيْ عَبِيْدَةَ عَنْ اَبِيْ مُوْسَى قَالَ قَامَ فِيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِخَمْسِ كَلِمَاتٍ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنَامُ وَلَايَنْبَغِيْ لَهُ أَنْ يَّنَامَ يَخْفِضُ الْقِسْطَ وَيَرْفَعُهُ وَ يُرْفَعُ اِلَيْهِ عَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ[1] قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ حِجَابُهُ النُّوْرُ لَوْ كَشَفَهُ لَا حْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهِ مَا انْتَهَى اِلَيْهِ بَصَرُهُ مِنْ خَلْقِهِ"

رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر ہمیں پانچ باتیں بتائیں اور فرمایا کہ باری تعالیٰ سوتے نہیں ہے اور نہ ہی سونا ان کی شان ہے وہ ترازو کو جھکاتے ہیں اور اوپر اٹھاتے ہیں دن کے اعمال رات کے اعمال سے پہلے ان کے پاس پہنچا دیئے جاتے ہیں اور رات کے اعمال دن کے اعمال سے پہلے پہنچا دیئے جاتے ہیں، ان کا پردہ نور ہے اگر وہ اسے ہٹا دیں تو ذات باری کے انوار و تجلیات تا حد نگاہ مخلوق کو جلا کر بھسم کر دیں گی۔

﴿قام فينا......... بخمس كلمات﴾ اس جملہ کی متعدد ترکیبیں کی گئیں ہیں لیکن ہمارے نزدیک راجح دو ترکیبیں ہیں پہلی ترکیب ملا علی قاری نے کی ہے کہ خمس، قام سے متعلق ہے اور فينا بیان ہے معنی ہوئے شمّر وتجلد له کسی کام کو مضبوطی سے انجام دینا قام بالأمر کی تعبیر آج کل بہت مستعمل ہے، جب کہ سندھیؒ کا خیال ہے کہ فينا کو بھی اگر قام سے متعلق کر دیا جائے تو یہ زیادہ صحیح بات ہوگی اب معنی ہوں گے قام فينا بيننا بتبليغ

خمس کلمات ۔یعنی ہمارے درمیان پانچ باتوں کی تبلیغ کے لئے آپ کھڑے ہوئے۔

﴿انّ اللّٰه لا ینامُ﴾ یہ قرآن کی آیت لا تاخذہ سنة ولا نوم کی وضاحت ہے نیند کی تعریف امام نوویؒ نے انغمار وغلبة علی العقل یسقط به الاحساس اور ملا علی قاریؒ اور سندھی نے استراحة القوی والحواس سے کی ہے یعنی راحت وسکون میں انسان اتنا مدہوش ہو جائے کہ اس کے ہوش وحواس تک قائم نہ رہیں امام نووی فرماتے ہیں واللّٰه تعالٰی منزہ من ذلك وهو مستحيل فی حقه. باری تعالٰی اس سے پاک ہیں، اور ان کے حق میں یہ محال ہے۔

﴿یخفض القسط ویرفعه﴾ قسط کی بابت امام نووی نے دو قول نقل کئے ہیں۔

(۱) ابن قُتَیبه نے لکھا ہے کہ قسط کے معنی میزان کے ہیں اور وجہ تسمیہ یہ ہے لأن القسط العدل وبالمیزان یقع العدل اب نووی کے الفاظ میں معنی یہ ہوئے ان اللّٰه تعالٰی یخفض المیزان ویرفعه بما یوزن من أعمال العباد المرتفعة الیه ویوزن من أرزاقهم النازلة الیهم فهذا تمثیل لما یقدر تنزیله فشُبه بوزن المیزان یعنی بندوں کے اوپر پہنچنے والے اعمال اور ان کے نیچے اترنے والے رزق کے وزن کی بناء پر باری تعالٰی ترازو کو جھکاتے ہیں اور اٹھاتے ہیں یہ دراصل اس کی قدرت اور بخشش کی تمثیل ہے جس کو ترازو کے وزن سے تشبیہ دی گئی ہے۔

(۲) وقیل المراد بالقسط الرزق الذی هوقسط کل مخلوق یَخفضه ویفتره ویرفعه فیوسعه قسط سے مراد رزق ہے ہر ایک کا الگ ترازو ہے۔
جب پلڑا جھکاتے ہیں تو روزی کم کر دیتے ہیں اور جب اس کو اٹھاتے ہیں تو فراخی عطا کرتے ہیں ملا علی قاریؒ کی وضاحت کے مطابق اس میں عزت، ذلت اور دوسرے امور بھی شامل ہیں باب کی ۲۳ ویں حدیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

﴿یرفع الیه الخ﴾ امام نوویؒ نے لکھا ہے فان الملائکة الحفظة یصعدون بأعمال اللیل بعد النقضائه فی أول النهار ویصعدون بأعمال النهار بعد

---

۱ مسلم ۹۹/۱ ۲ ۳ مسلم ۹۹/۱

انقضائه في اول الليل یعنی حفاظت پر مامور فرشتے رات کے اعمال کو ختم ہوتے ہی دن کے شروع میں پیش کر دیتے ہیں اور دن ختم ہوتے ہی اس کے اعمال کو رات کے بالکل ابتدائی حصے میں پہنچا دیتے ہیں علامہ سندھی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں **الدلالة علی مسارعة الکرام الکتبة الی رفع الأعمال وسرعة عروجهم الی مافوق السمٰوت** خدائی نظام نہایت مستحکم ہے اس لئے تمام اعمال فوراً اوپر پہنچتے ہیں اور ان میں ذرا بھی تاخیر نہیں ہوتی۔

﴿**حجابه النور**﴾ امام نووی نے لکھا ہے **حقیقة الحجاب انما تکون للأجسام المحدودة واللّٰه تعالیٰ منزه عن الجسم والحد** اس لئے اب حجاب کے معنی ان کے نزدیک **المانع من رؤيته**[1] ملا علی قاری کے نزدیک **منع الا ابصار من الاصابة بالروية**[2] اور سندھیؒ کے یہاں **المانع للخلق عن ابصاره في دار الفنا** ہوں گے یعنی عظمت و کبریائی کے انوار و جلال ہی رویت میں رکاوٹ ہیں۔

﴿**سُبحاتُ وجهه**﴾ **سُبْحَةٌ** کی جمع ہے لغوی معنی دعا تسبیح اور نفل نماز کے ہیں جب کہ اصطلاحی معنی امام نوویؒ نے یہ لکھے ہیں **نوره وجلاله وبهائه** ان پر تمام محدثین کا اتفاق ہے جب کہ **وجه** سے متعلق امام نوویؒ فرماتے ہیں **المراد بالوجه الذات** وجہ سے مراد ذات باری ہے۔

﴿**ما انتهى اليه بصره**﴾ امام نوویؒ نے **من خلقه** سے مراد تمام مخلوق کو لیا ہے **لأن بصره سبحانه وتعالیٰ محیط لجمیع الکائنات** پھر آگے لکھتے ہیں **لأحرق جلال ذاته جمیع مخلوقاته** باری تعالیٰ کی نگاہ پوری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اس لئے اس کا نور سب کو جلا ڈالے گا...... **خفض رَفع حجابٌ** اور **بَصَرٌ ترجمة الباب** ہیں جہمیہ کسی ایسی چیز کو باری تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کرتے جس کا انتساب بندوں کی طرف بھی درست ہو......... حدیث صحیح مسلم (ایمان/ ۷۱) میں بھی موجود ہے اور دونوں میں صرف پہلا راوی الگ ہے۔ اور وہ ثقہ ہے اس لئے ابن ماجہ کی سند بھی عمدہ ہے۔

(۲۰/۱۹۶) حَدَّثَنَا عَلِيُّ ابْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا وَکِيعٌ ثَنَا الْمَسْعُوْدِيُّ عَنْ عَمْرِو بْنِ

---

[1] شرح مسلم ۹۹/۱ [2] مرقاۃ باب القدر، فصل اول

مُرَّةَ عَنْ اَبِی عُبَیْدَةَ عَنْ اَبِی مُوْسَی قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنَامُ وَلَا يَنْبَغِیْ لَهُ أَنْ يَّنَامَ، يَخْفِضُ الْقِسْطَ وَيَرْفَعُهٗ حِجَابُهُ النُّوْرُ لَوْكَشَفَهَا لَاَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ كُلَّ شَيْءٍ أَدْرَكَهٗ بَصَرُهٗ" ثُمَّ قَرَأَ اَبُوْعُبَيْدَةَ (أَنْ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ)

پھر راوی ابوعبیدہ نے یہ آیت پڑھی ''پھر جب وہ آگ کے پاس پہنچے تو آواز دی گئی کہ آگ اور اس کے گردوپیش کی جگہ بابرکت ہے۔

مدین سے لوٹتے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو آگ دیکھی تھی شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ شاید یہ وہی چیز تھی جس کو حدیث میں حجابه النور کہا گیا ہے ابوعبیدہ نے بھی اسی تعلق کو ظاہر کرنے کے لئے حدیث کے بعد یہ آیت پڑھی ہے، مجددیؒ نے لکھا ہے غَرَضُ اَبِی عُبَيْدَةَ عَنْ قرأة هٰذِهِ الآية ان موسى عليه السلام مع عظمته وجلالته احتجب عن رويته تعالٰى بالنار ما راه سبحانه ان کا مقصود یہ بتلانا ہے کہ جلال عظمت کے باوجود موسیٰ علیہ السلام آگ کی بناء پر رویت سے محروم رہے اور انہوں نے اللہ کو نہیں دیکھا...... شرح وتخریج گذر چکی ہے ابن ماجہ کی سند درست ہے۔

(۲۱/۱۹۷) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ اَبِیْ شَيْبَةَ ثَنَا يَزِيْدُ بْنُ هَارُوْنَ أَنْبَأَنَا مُحَمَّدُ بْنُ اِسْحَاقَ عَنْ أَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ يَمِيْنُ اللّٰهِ مَلْأٰى لَايَغِيْضُهَا شَیْءٌ سَحَّاءُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَبِيَدِهِ الْأُخْرَى الْمِيْزَانُ يَرْفَعُ الْقِسْطَ وَيَخْفِضُهُ قَالَ أَرَأَيْتَ مَا أَنْفَقَ مُنْذُ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَاِنَّهٗ لَمْ يَنْقُصْ مِمَّا فِیْ يَدَيْهِ شَيْئًا .

اللہ کا داہنا ہاتھ بھرا ہوا ہے کوئی چیز اس میں کمی نہیں کرتی وہ دن رات نچھاور کرتا ہے اس کے دوسرے ہاتھ میں ترازو ہے پلڑے کو کبھی اٹھا دیتا ہے اور کبھی جھکا دیتا ہے، فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ اللہ نے زمین وآسمان کی پیدائش سے جو کچھ خرچ کیا ہے اس نے باری تعالیٰ کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔

﴿يمين الله﴾ ترمذی میں يمين الرحمان آیا ہے یہ فعلی کے وزن پر ملأن کی

تانیث ہے سلف کے نزدیک متشابہ ہونے کی بناء پر اس کی توجیہ مناسب نہیں جب کہ خلف قدرے تاویل وتفہیم کے قائل ہیں چنانچہ یمین کے معنی طیبی نے نعمة غزیرة[1] سندھیؒ نے أرید بالیمین النِعَم اور ملاعلی قاریؒ نے کنایة عن محل عطائه أی خزائنه بیان کیے ہیں یعنی نعمت وخزانے پر ہاتھ کا اطلاق کرنے کی وجہ اس کا تصرف ہے۔

اسی طرح ملأیٰ کے معنی سندھیؒ کے نزدیک کثیرة العطا اور ملاعلی قاری کے الفاظ میں کنایة عن کثرة تلك النعمة وعمومها[2] ہیں یعنی بے حد وحساب عطا فرمانے والا۔

﴿لایغیضها شئ﴾ غیضا ومَغاضًا، ثلاثی میں ضرب سے اور مزید فیہ میں افعال اور تفعیل سے آتا ہے معنی کم کرنا۔

﴿سَحَّاءُ﴾ نصر سے آتا ہے پانی کو بہت زیادہ مسلسل گرانا نووی فرماتے ہیں وزنه فعلاء صفة للید...... وعبر ﷺ عن توالی النعم بسَحّ الیمین لأنَّ الباذل مِنّا یفعل ذلك بیمینه[3] فعلاء کے وزن پر ہاتھ کی صفت ہے رسول اللہ ﷺ نے نعمتوں کے تسلسل کو دائیں ہاتھ کے تصرف وفیاضی سے تعبیر کیا ہے چونکہ ہم میں سے ہر ایک سخاوت دائیں ہاتھ ہی سے تو کرتا ہے۔

﴿أللیل والنهار﴾ امام نووی اور سندھی کی تصریح کے مطابق یہ دونوں ظرفیت کی بنا پر منصوب ہیں اور جملہ قرآنی آیت بل یداہ مَبْسوطتٰن کی تفسیر ہے جس کے معنی امام نووی نے ان اللّٰه تعالیٰ لا ینقصه الانفاق ولا یمسك خشیة الاملاق[4] اور سندھی نے والمراد به عدم الانقطاع لمادة عطائه لکھے ہیں یعنی اس کی نوازشیں ابر باراں کی طرح ہیں اس کے خزانوں میں کمی ہوتی ہے نہ ختم ہو جانے کا خوف اس کو خرچ سے روکتا ہے۔

﴿وبیده الأخریٰ المیزان﴾ امام نوویؒ فرماتے ہیں هذا یتضمن التحدید ویتقدس اللّٰه سبحانه عن التجسیم والحد انما خاطبهم رسول اللّٰه ﷺ بما یفهمونه[5] یمین وشمال جیسے الفاظ تحدید کو مستلزم ہیں جب کہ وہ جسم اور حد سے پاک ہے۔

﴿یرفع القسط ویخفضه﴾ شرح گذشتہ حدیث میں آچکی ہے، یہاں علامہ سندھی کا صرف یہ قول نقل کرنا ہے هو اشاره الی انزال العدل الی الارض مرّة و رفعه

[1] [2] [3] مرقاة المفاتیح [4] [5] مسلم ۱/۳۲۲

أخری کبھی دنیا میں انصاف اتارا جاتا ہے اور کبھی اس کو اٹھالیا جاتا ہے۔

﴿ما أنفق﴾ علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں أی قدر ما أنفق یعنی جس قدر اللہ نے روز اول سے خرچ کیا ہے اس سے خزانوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی......یمین ، سَحّ ، رفع، خفض اورانفاق حدیث مسلم (زکوٰۃ/۵) ترمذی (تفسیر/ مائدۃ) میں بھی آئی ہے سنن کا صرف پہلا راوی الگ ہے ابن ماجہ کی سند صحیح ہے۔

(۲۲/۱۹۸) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ وَمُحَمَّدُ بْنُ الصَّبَّاحِ قَالَا حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنِ اَبِيْ حَازِمٍ حَدَّثَنِي اَبِيْ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ مِقْسَمٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ يَقُوْلُ يَاخُذُ الْجَبَّارُ سَمٰوَاتِهِ وَأَرْضَهُ بِيَدِهِ وَقَبَضَ بِيَدِهِ فَجَعَلَ يَقْبِضُهَا وَيَبْسُطُهَا ثُمَّ يَقُوْلُ اَنَا الْجَبَّارُوْنَ اَيْنَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ قَالَ وَيَتَمَثَّلُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ يَمِيْنِهِ وَعَنْ يَسَارِهِ حَتّٰى نَظَرْتُ اِلَى الْمِنْبَرِ يَتَحَرَّكُ مِنْ اَسْفَلِ شَیْءٍ مِنْهُ حَتّٰى اِنِّیْ اَقُوْلُ اَسَاقِطٌ هُوَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟.

عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ میں نے منبر پر رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ باری تعالیٰ زمین وآسمانوں کو اپنے ہاتھو میں اٹھالیگا یہ کہہ کر آپ نے ہاتھ کو بند کیا اور پھر اس کو کھولنے اور بند کرنے لگے، پھر فرمائے گا میں طاقتور ہوں کہاں ہیں طاقت کا دعوی کرنے والے؟ کہاں ہیں تکبر کرنے والے؟ ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (استحضار وخشوع کی ایک خاص کیفیت کی وجہ سے) دائیں بائیں جھکنے لگے یہاں تک کہ میں نے منبر کو نیچے تک ہلتے ہوئے دیکھا اور مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر منبر گر نہ جائے۔

﴿یأخذ﴾ دوسرے طرق میں یطوی اور یقبض کے الفاظ ہیں جن کے معنی قاضی عیاض کے نزدیک جمع کرلینا ہے۔

﴿بیدہ﴾ صحیح مسلم کی روایت میں آسمانوں کی بابت یأخذ هن بیده الیمنی اور زمین کے لئے یطوی الارض بشماله کی تصریح ہے امام نوویؒ فرماتے ہیں وأما اطلاق الیدین للّٰه تعالیٰ فمتأول علی القدرة یدین کا اطلاق قدرت کے معنی میں ہے۔

﴿وقبض بیده فجعل یقبضها ویبسطها﴾ مسلم میں یقبض أصابعه ویبسطها آیا ہے جس کا فاعل امام نووی نے رسول اللہ ﷺ کو قرار دیا ہے مولانا عبد الغنیؒ مجددی کی بھی یہی رائے ہے علامہ سندھی نے لکھا ہے ألطاهر أن الضمیر للنبی صلی اللّٰہ علیه وسلم و کان یریهم بهذا کیفیة القبض بعد البسط فاعل کی ضمیر حضورؐ کی طرف راجع ہے اس طرح آپؐ صحابہ کو پکڑنے کی کیفیت سمجھا رہے تھے۔

﴿أنا الجبار﴾ اسمائے حسنی میں سے ہے معنی قابض قاہر طاقت وراور متسلط کے ہے۔ اس کی وضاحت ملا علی قاری نے ألظلمة والقهارونؒ سے کی ہے۔

﴿أین المتکبرون﴾ قاری نے لکھا ہے أی بمالهم وجاههم وخیلهم وحشمهمؒ جو لوگ مال و دولت منصب شہ زوروں اور اپنے ہمنواؤں پر اکڑتے تھے۔

﴿یتحرك﴾ امام نوویؒ نے لکھا ہے ان تحرکه بحرکة النبی ﷺ بهذه الاشارةؒ حضورؐ کے دائیں بائیں جھکنے اور اشارہ کرنے سے منبر میں حرکت ہوئی اور آپؐ کی یہ کیفیت قیامت کی ہیبت وشدت کی سبب تھی۔

﴿اساقط﴾ سندھیؒ فرماتے ہیں هو استفهام جریٰ بینه وبین نفسه یہ ان کے خوف واندیشے کی تعبیر ہے جو ایک خیال کی صورت میں ان کے دل میں پیدا ہوئی...... حدیث وما قدروا اللّٰہ حق قدره والأرض جمیعا الخ کی تفسیر ہے أخذ قبض یَدٌ اور قول کی نسبتؒ ہی ترجمۃ الباب ہے حدیث مسلم (صفۃ المنافقین/۱) میں آئی ہے ابن ماجہ کی سند صحیح ہے مسلم سے صرف پہلا راوی الگ ہے۔

(۱۹۹/۲۳) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ حَدَّثَنَا صَدَقَةُ بْنُ خَالِدٍ حَدَّثَنَا ابْنُ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ بُسْرَبْنَ عُبَیْدِ اللّٰهِ یَقُوْلُ سَمِعْتُ أَبَا اِدْرِیْسَ الْخَوْلَانِیَّ یَقُوْلُ حَدَّثَنِی النَّوَّاسُ بْنُ سَمْعَانَ الْکِلَابِیُّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ : مَا مِنْ قَلْبٍ اِلَّا بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ اِنْ شَاءَ اَقَامَهٗ وَاِنْ شَاءَ اَزَاغَهٗ" وَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: یَا مُثَبِّتَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ

---

۱ ۲ مسلم ۲/۳۷۱ ۳ مرقاۃ المفاتیح باب النفخ فی الصور فصل اول

قُلُوْبَنَا عَلٰی دِیْنِكَ "قَالَ: وَالمِیزانُ بِیدِ الرَّحْمٰنِ یَرْفَعُ أَقْوَامًا وَیَخْفِضُ آخَرِیْنَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ"

فرمایا: ہر قلب اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے وہ چاہے تو سیدھا اور چاہے تو اسے ٹیڑھا کردے رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اے دلوں کے جمانیوالے ہمارے قلوب کو اپنے دین پر جمادے فرمایا میزان اللہ کہ ہاتھ میں ہے اور وہ اسی کے ذریعے قیامت تک کچھ قوموں کو عروج دے گا اور کچھ کو پست کردے گا۔

ملا علی قاریؒ نے اصبعین کے سلسلے میں تین قول نقل کئے ہیں (۱) یہ دراصل دو صفتوں کا نام ہے صفت جلدل اور صفت اکرام، صفت جلال کے ذریعے دلوں پر فسق وفجور کا الہام کیا جاتا ہے جب کہ صفت اکرام سے تقوے کا الہام ہوتا ہے چنانچہ انسانی قلب کبھی تو صفت اکرام سے متاثر ہوکر فجور سے تقوے کا سفر کرتا ہے اور کبھی صفت جلال کے باعث تقوے سے ہٹ کر فجور کی جانب قائل ہوجاتا ہے هما صفة الجلال والاكرام فبصفة الجلال يلهمها فجورها وبصفة الاكرام يلهمها تقواها اى يقلبها تارة من فجورها الى تقواها وتارة من تقواها الى فجورها[۱]

اصابع سے رحمت وغضب کے آثار مراد ہیں یعنی باری تعالیٰ دلوں کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پلٹنے پر قادر ہیں ایمان سے کفر وکفر سے ایمان اطاعت سے نافرمانی اور نافرمانی سے اطاعت کی جانب مائل کردیتے ہیں معناه بين امرين من اثار رحمته وقهره اى قادر ان يقلبها من حال الى حال من الايمان والكفر والطاة العصيان[۲] قدرت وتصرف کی ایک مجازی تعبیر ہے یعنی وہ بندوں کے دلوں میں تصرف کرتا ہے اور اسکے لئے کوئی چیز مانع نہیں اطلاق الاصبع عليه تعالى مجاز[۳] قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ تمام قلبی امور ومعاملات کا شعبہ باری تعالیٰ نے اپنے پاس رکھا ہے اور کسی فرشتے کو یہ ذمہ داری نہیں سونپی اصابع کا مضاف رحمٰن لانے میں بھی یہی اشارہ ہے کہ قلوب کے معاملات کو اپنے پاس رکھنا باری تعالیٰ کی شفقت ورحمت کا نتیجہ ہے تاکہ کوئی فرشتہ ان کی قلبی

۱، ۲، ۳ مرقاۃ المفاتیح باب الایمان بالقدر فصل اول حدیث (۱۰)

واردات کو جانے نہ دلوں کے پوشیدہ خیالات کو لکھ سکے ایسی صورت میں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں تعلیم دی کہ ہم دلوں کی استقامت وتوفیق کی ہر وقت دعا کریں۔

﴿والمیزان الخ﴾ اس جملے پر بحث گذر چکی ہے حدیث باب میں مذکور اصابع ، اقامة، ازاغة، ید اور رفع و خفض ترجمۃ الباب ہیں ابن ماجہ کی سند کو حافظ بوصیری نے زوائد میں ھذا اسنادٌ صحیحٌ قرار دیا ہے۔

(۲۰۰/۲۴) حَدَّثَنَا اَبُوْكُرَيْبٍ مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ اِسْمَاعِيلَ عَنْ مُجَالِدٍ عَنْ أَبِي الْوَدَّاكِ عَنْ أَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ لَيَضْحَكُ اِلَى ثَلَاثَةٍ: لِلصَّفِّ فِي الصَّلَاةِ وَلِلرَّجُلِ يُصَلِّى فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ وَلِلرَّجُلِ يُقَاتِلُ ، أَرَاهُ قَالَ خَلْفَ الْكَتِيْبَةِ.

باری تعالیٰ تین آدمیوں سے خوش ہوتے ہیں نماز کی صف میں کھڑا ہونے والا وہ شخص جو رات کے آخری حصہ میں نماز پڑھے اور وہ جو قتال کرے مجھے ایسا یاد ہے کہ آپ نے فرمایا لشکر کے پیچھے قتال کرے۔

﴿لیضحك﴾ متشابہات میں سے ہے جس کی بابت سلف وخلف کے موقف کا فرق بیان کیا جا چکا ہے علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے تعدية الضحك بالى لتضمينه معنى الاقبال وذكر اللام فى التفصيل للتنبيه على أنه يضحك تشريفا لهم ضحک کو الیٰ کے ذریعہ متعدی کرنا عنایت وتوجہ کے معنی کو مستلزم ہے اور لام تینوں جگہ بطور تنبیہ یہ بتانے کے لئے لایا گیا ہے کہ باری تعالیٰ ان کے شرف کو بڑھانے کے لئے ہنستا ہے۔

﴿للصف فى الصلاة﴾ اس سے پہلے کائن محذوف مانا جائے گا اور یہ جماعت کی فضیلت بتانے کے لئے ہے۔

﴿وللرجل يصلى فى جوف الليل﴾ تہجد کے تمام فضائل اس کے ذیل میں آجاتے ہیں۔

﴿أراه﴾ تیسرا وہ شخص جو کفار سے جہاد کرتا ہے یہ رویت سے واحد متکلم مضارع مجہول کا صیغہ ہے اور ضمیر رجل کی طرف لوٹتی ہے اس صورت میں ہیں معنی گمان اور خیال کے ہوتے

ہیں ابوسعید فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آپ نے خَلْفَ الکتیبۃ بھی فرمایا۔

﴿خَلْفَ الکتیبۃ﴾ علامہ سندھیؒ نے اس کے معنی یہ لکھے ہیں أی خَلْفَ الجیش بمعنی أنه یقاتل بعد أن ظفروا یعنی لشکر کے پیچھے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مجاہدین کی فتح کے بعد بھی جنگ کرتا ہے حضرت مولانا عبدالغنی مجددی نے انجاح الحاجۃ میں ایک اور معنی کی طرف رہنمائی کی ہے فرماتے ہیں اذا فرهذه الکتیبة من القتال و خاف رجل واحد منهم عن التولی یوم الزحف فبرز نفسه للقتال وهذا أصعب الأمور یعنی جب لشکر شکست کھا کر بھاگ جائے تو یہ مرد مجاہد تولی یوم الزحف کی وعید کے پیش نظر اپنے فرار سے باز رکھے اور تنہا ہی میدان میں ڈٹ جائے فتح کے بعد لڑنا کوئی بہادری نہیں کمال تو اکھڑے ہوئے قدموں کو جمانا ہے اسی صورت میں یہ فضیلت حاصل ہوسکتی ہے۔۔۔۔۔ یضحك ترجمة الباب ہے جس کی نسبت جہمیہ باری تعالیٰ کی طرف درست نہیں سمجھتے ہیں۔

حافظ بوصیریؒ نے زوائد میں لکھا ہے هذا اسناد فیه مقال کیونکہ مجالد غیر معتبر راوی ہیں حافظ نے تقریب (۶۴۷۸) میں لکھا ہے لیس بالقوی وقد تغیر فی اخر عمرہ جبکہ عبداللہ بن اسماعیل کو تقریب (۳۲۱۲) میں مجھول کہا گیا ہے ابوحاتم اور ذہبی کی بھی یہی رائے ہے اس لئے سند ضعیف قرار پاتی ہے۔

(۲۰۱/۲۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ یَحْیٰی ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ رَجَاءٍ ثَنَا اِسْرَائِیْلُ عَنْ عُثْمَانَ یَعْنِی ابْنَ الْمُغِیْرَةِ الثَّقَفِیَّ عَنْ سَالِمِ بْنِ أَبِی الْجَعْدِ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَعْرِضُ نَفْسَهُ عَلَی النَّاسِ فِی الْمَوْسِمِ فَیَقُوْلُ: أَلَا رَجُلٌ یَحْمِلُنِیْ اِلَی قَوْمِهٖ فَاِنَّ قُرَیْشًا قَدْ مَنَعُوْنِیْ أَنْ أُبَلِّغَ کَلَامَ رَبِّیْ.

رسول اللہ ﷺ موسِمْ کے ایام میں خود کو لوگوں پر پیش کرتے تھے اور فرماتے کیا ایسا کوئی شخص ہے جو مجھ کو اپنی قوم کے پاس لیجائے کیونکہ قریش نے مجھے اس بات سے روک دیا ہے کہ میں اپنے رب کے کلام کی تبلیغ کرسکوں۔

﴿ألموسِمْ﴾ یہ وسم مادے سے ظرف کا صیغہ ہے ابوداؤد اور ترمذی میں ألموقف

آیا ہے جو بالکل ہم معنی لفظ ہے ابو طالب کے بعد مکہ کی سرزمین رسول اللہ ﷺ کے لئے مزید تنگ ہوگئی آپؐ نے قرب وجوار میں تبلیغ کرنا چاہی تو طائف کا دلدوز واقعہ پیش آیا بالآخر مطعم بن عدی کی پناہ میں آپؐ مکہ مکرمہ تشریف لائے اور ایام حج میں آنے والے قبائل کو اپنا مہمان بنانے کی ترغیب دی مَوسِمْ عزلی میں لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں جس کا استعمال عموماً حج کے ایام کے لئے اور کبھی عید کے لئے ہوتا ہے زمانہ جاہلیت میں بھی عربی قبائل مکہ آکر حج کیا کرتے تھے حضورؐ کی اس پیش کش کے سلسلے میں مؤرخ ابن اسحاق نے بنی کِندہ، بنی کعب، بنی حذیفہ اور بنی عامر وغیرہ کا نام لیا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی اس شَرَفْ کو نہ پاسکا یہاں تک کہ انصاریوں کا وفد آیا اور آپ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی اس باب کے تحت روایت لانے کا مقصد اللہ کی صفت کلام کو ثابت کرنا ہے جہمیہ اس کا انکار کرتے ہیں، حدیث ابوداؤد (سُنّة/قُران) ترمذی (قرآن: ۲۴) میں بھی آئی ہے اور امام نے اسے حسنٌ صحیحٌ غریبٌ قرار دیا ہے پہلے راوی کو چھوڑ کر تینوں کی سند یکساں ہے۔

(۲۶/۱۰۲) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ ثَنَا الْوَزِيْرُ بْنُ صَبِيحٍ ثَنَا يُوْنُسُ بْنُ حَلْبَسٍ عَنْ أُمِّ الدَّرْدَاءِ عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فِيْ قَوْلِهِ: كُلَّ يَوْمٍ هُوَفِي شَأنٍ قَالَ: مِنْ شَانِهِ أَنْ يَغْفِرَ ذَنْبا وَيُفَرِّجَ كَرْباً وَيَرْفَعَ قَوْمًا وَيَخْفِضَ اٰخَرِيْنَ.

کل یوم ھوفی شان کی بابت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی شان یہ ہے گناہ کو معاف کرتا ہے پریشانی کو دور کرتا ہے ایک قوم کو عروج دیتا ہے اور دوسری کو ذلیل کرتا ہے۔

آیت کا منشاء یہ ہے کہ ہر لحظہ اس کی الگ شان ہوتی ہے کسی کو زندہ کرتا ہے کسی کو موت دیتا ہے عزت ذلت کے فیصلے فرماتا ہے بیماروں کو شفاء اور اچھوں کو بیمار کرتا ہے غم زدوں کو ہنساتا ہے خوش وخرم کو رلاتا ہے کسی عطا کرتا ہے کسی کو محروم کردیتا ہے العرض فرد وقوم کی بابت ہر آن نئے فیصلے فرماتا ہے۔

﴿یفرج کربا﴾ جمع کروبٌ معنیٰ غم، فرج (ض) کے معنیٰ ثلاثی میں بھی کشادہ کرنے اور دور کرنے کے آتے ہیں لیکن علامہ سندھیؒ کے بقول یہاں معنیٰ کے اعتبار سے تشدید

مناسب ہے کیونکہ اس میں اہتمام اور مبالغہ پایا جاتا ہے جبکہ خفض (ض) خَفْضًا کے معنی زیر کرنا اور پست کرنے کے آتے ہے، یہاں رفع، خفض، اور تفریع ترجمۃ الباب میں بوصیری نے زوائد میں لکھا ہے ھذا اِسناد حسنٌ لتقاصر الوزیر عن درجۃ الحفظ والاِتقان ہشام بن عمار اور وزیر بن صبیح میں حفظ وضبط کی کمزوری ہے۔

باب من سن سنة حسنة او سئية

باب فیما أنکرت الجھمیۃ کے بعد امام نے یہ باب قائم کیا ہے دونوں میں کھلا ربط ہے وہ یہ کہ ماقبل میں گمراہیوں کا تذکرہ تھا اور اس میں گمراہوں کے اخروی حکم کا بیان ہے گویا وہ فردِ جرم تھی اور یہ فیصلہ خداوندی ہے نتیجہ یہ نکلا کہ جہم بن صفوان نے جتنی بدعتوں کو ایجاد کیا ان کا گناہ تو اسکو ہوگا ہی ساتھ میں ان سارے لوگوں کا وبال بھی اس پے پڑے گا، جنہوں نے بعد میں ان محدثات پر عمل کیا لیکن اس کی پیروی کرنے والوں کے عذاب میں کوئی تخفیف نہ ہوگی۔

بعض لوگوں نے یہاں بدعتِ حسنہ اور بدعت سیئہ پر استدلال کیا ہے جو بلاشبہ غلط ہے باب اجتناب البدع والجدل میں ہم نے اس موضوع پر مفصل روشنی ڈالی ہے مزید توجہ شرح کے ذیل میں آرہی ہے۔

(۲۰۳/۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ أَبِي الشَّوَارِبِ ثَنَا اَبُوْعَوَانَةَ ثَنَا عَبْدُ الْمَلِكِ بْنِ عُمَيْرٍ عَنِ الْمُنْذِرِ بْنِ جَرِيْرٍ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَعُمِلَ بِهَا كَانَ لَهُ أَجْرُهَا، وَمِثْلُ اَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا لَا يَنْقُصُ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئاً وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعُمِلَ بِهَا كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا لَا يَنْقُصُ مِنْ اَوْزَارِهِمْ شَيْئاً

یہ مضری قبیلہ کا واقعہ ہے جس کی تفصیل وپس منظر صحیح مسلم، سنن نسائی اور جامع ترمذی میں منقول ہے ہم ان طرق کی تمام کڑیوں کو جوڑ کر واقعہ کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔

جریر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ہم دوپہر چڑھے رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ بدویوں کی ایک جماعت آئی وہ سب ننگے پیر اور ننگے سر تھے اور ان کے گلوں میں تلواریں لٹکی ہوئی

تھیں اور جسم پر پھٹی پرانی اونی چادریں اور معمولی جبے تھے ان میں سے بیشتر بلکہ سب کا تعلق قبیلۂ مضر سے تھا رسول اللہ ﷺ نے جب ان کے فقر وفاقہ کی یہ حالت دیکھی تو تکلیف کی شدت سے چہرہ کا رنگ بدل گیا آپ گھر میں داخل ہوئے پھر تھوڑی دیر بعد باہر تشریف لا کر بلال کو اذان دینے کا حکم دیا پھر انہوں نے اقامت کہی اور آپ نے ظہر کی نماز پڑھائی اس کے بعد منبر پر فروکش ہو کر اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ آیت نازل کی ہے یا ایھا الناس! اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیراً ونساءًا واتقوا اللہ الذی تساءلون بہ والارحام ان اللہ کان علیکم رقیباً...... یا أیھا الذین آمنوا اتقوا اللہ ولتنظر نفس ماقدمت لغد...... پھر صحابہ کو صدقہ کرنے کی ترغیب دی کہ ہر شخص دینار، درہم، غلہ، کپڑا، کھجور گرچہ آدھی ہی کیوں نہ ہو صدقہ کرے تھوڑی دیر بعد لوگ اسی طرح بیٹھے رہے جس کی وجہ سے چہرۂ انور پر کچھ ناگواری کے اثرات ظاہر ہوئے تا آنکہ ایک انصاری چاندی کے سکوں کی تھیلی لے کر اس طرح حاضر ہوئے کہ وہ ان سے سنبھلتی نہ تھی یہاں تک کہ گر گئی پھر دوسرے صحابہ بھی پے در پے صدقہ لاتے رہے یہاں تک کہ غلوں اور کپڑوں کے وہاں ڈھیر لگ گئے اب میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مسرت سے سونے کی ٹکلی کی طرح چمکنے لگا آپ نے فرمایا

جس نے دین میں اچھے طریقہ کو رواج دیا تو اسے اس کا اجر ملے گا اور ان لوگوں کا بھی ثواب ملے گا جنہوں نے اس طریقہ پر عمل کیا لیکن اس سے عاملین کے ثواب میں کوئی کمی نہ واقع ہوگی اور جس نے غلط طریقہ کو رواج دیا تو اسے اس کا گناہ ہوگا اور ان لوگوں کا گناہ بھی اسی کے سر ہوگا جنہوں نے بعد میں اس پر عمل کیا لیکن اس کا ارتکاب کرنے والے کی سزا میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں فیہ الحث علی الابتداء بالخیرات وسن السنن الحسنات والتحذیر من اختراع الا باطیل والمستقبحات[1] حدیث میں نیکیوں کو شروع کرنے اور اعمال حسنہ کو فروغ دینے کی ترغیب ہے نیز برائیوں اور باطل افکار واعمال کو

---

[1] شرح مسلم

گھڑنے پر تنبیہ کی گئی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ قرآن وسنت کی رو سے جو چیزیں مطلوب ومحبوب ہیں ان میں اس طرح سبقت وابتداء کرنا کہ پھران پر عمل کی دوسروں کو بھی توفیق ہو پر یہ ثواب ہے جیسا کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ذریعہ ہندوستان میں جہاد وشہادت کا آغاز، حضرت نانوتویؒ کے انداز پر برصغیر میں مدارس کا قیام اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے درس قرآن کے بعد ہندوپاک میں جگہ جگہ قرآنی حلقوں کا سلسلہ اسی کی مثال ہیں اسی طرح معاشرہ میں اگر کچھ شرعی امور متروک ہوجائیں اور کوئی شخص انہیں انجام دے کر دوبارہ زندہ کردے تو اس کو بھی اتنا ہی ثواب ہوگا مثلاً نظریۂ خلافت کا احیاء، جمہوریت وسیکولرزم کی تردید، نکاح بیوگان کا اجراء، تعداد ازواج کی ترغیب اور میراث میں عورتوں کے حقوق کی ادائیگی...... حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کسی نئے فکر وعمل کو گھڑ کر دین میں شامل کردیا جائے کیونکہ کل بدعة ضلالة اور من احدث فی امرنا هذا مالیس منه فهو ردٌ کی رد سے یہ مطلقاً حرام ہے سنة حسنةً اور سنةً سئیةً کا فیصلہ شریعت کرچکی ہے اور ہم صرف منصوص امور کے پابند ہیں۔

یہ حسنہ کی مثالیں تھیں اب جہاں تک امور سیئه کا تعلق ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس نے کوئی ایسا گناہ کیا جس میں لوگ مبتلا نہ تھے لیکن اسے دیکھ کر پھر دوسروں کو بھی ہمت ہوئی اور اعتقاد وعمل کا یہ فساد دراز ہوتا چلا گیا تو اس میں ملوث ہونے والے ہر شخص کا گناہ اس شخص کو بھی پہنچے گا جس نے شیطانی کام کا آغاز کر کے لوگوں کو غلط راہ دکھائی جیسا کہ حدیث میں موجود ہے کہ روئے زمین پر قتل کرنے والے ہر شخص کا گناہ حضرت آدم کے لڑکے قابیل کو بھی پہنچتا ہے کیونکہ نوع انسانی کو خونریزی کی راہ اسی نے دکھائی تھی اسی پر معاشرہ کی ہر خرابی کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

حدیث صحیح مسلم (زکاۃ/ ۱۱، علم/ ۳) اور سنن نسائی (زکاۃ/ ٦٧) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند مسلم کی ہے بس فرق یہ ہے کہ امام مسلم نے اسے تین شیوخ سے روایت کیا ہے جب کہ ابن ماجہ نے حدیث ان میں سے ایک محمد بن عبدالملک سے لی ہے۔

(۲۰۴/۲) حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ بْنِ عَبْدِ الصَّمَدِ بْنِ عَبْدِ الْوَارِثِ حَدَّثَنِیْ أَبِیْ، عَنْ أَیُّوبَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِیْرِیْنَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَحَثَّ عَلَیْهِ فَقَالَ رَجُلٌ عِنْدِیْ کَذَا وَکَذَا، قَالَ فَمَا بَقِیَ

فِي الْمَجْلِسِ رَجُلٌ إِلَّا تَصَدَّقَ عَلَيْهِ بِمَا قَلَّ أَوْ كَثُرَ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مَنِ اسْتَنَّ خَيْراً فَاسْتُنَّ بِهِ كَانَ لَهُ أَجْرُهُ كَامِلًا وَمِنْ أُجُوْرِ مَنِ اسْتَنَّ بِهِ وَلَا يَنْقُصُ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئًا وَمَنِ اسْتَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَاسْتُنَّ بِهِ فَعَلَيْهِ وِزْرُهُ كَامِلًا، وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِيْ اسْتَنَّ بِهِ وَلَا يَنْقُصُ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْئًا.

ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا آپ نے اس کی مدد کے لئے لوگوں کو ابھارا ایک صاحب بولے میرے ذمے اتنا اتنا مال ہے حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ پھر مجلس میں کوئی شخص بھی ایسا نہ بچا جس نے کم یا زیادہ اس کو صدقہ نہ کیا ہو پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے خیر کی طرح ڈالی اور وہ فروغ پا گئی تو اس کو پورا بدلہ ملے گا اور ان لوگوں کے اجر میں بھی اس کا حصہ ہوگا جنہوں نے اس پر عمل کیا لیکن عاملین کے بدلے میں کوئی کمی نہ ہوگی اور جس نے کوئی بری طرح ڈالی، اور اس کا چلن بھی ہو گیا تو اس کی گردن پر اس کا پورا وبال ہوگا اور ان لوگوں کے گناہ میں بھی اس کا حصہ ہوگا جنہوں نے اس پر عمل کیا لیکن مجرموں کی سزا میں کوئی تخفیف نہ ہوگی۔

﴿عندی کذا و کذا﴾ یعنی اس شخص نے متعین طور پر اپنے صدقے کا اعلان کیا اور اس کی ادائیگی بعد میں کی ہوگی۔

﴿استنان﴾ کے معنی اولاً طریقہ جاری کرنا اور ثانیاً اس پر عمل کرنا ہے حدیث میں صراحت ہے کہ گمراہوں کے گناہ میں اس شخص کا بھی حصہ ہوگا جس نے گمراہی کا آغاز کر کے انہیں غلط راہ دکھائی تھی بظاہر یہ چیزیں قرآنی آیت و لا تزر وازرۃ وزر أخری سے متصادم نظر آتی ہے لیکن گہرائی سے دیکھا جائے تو دونوں میں گہری موافقت دکھائی پڑتی ہے وہ یہ کہ آیت عام ہے اور حدیث خاص یعنی بحیثیت مکلف ہر شخص اپنے کئے کا ذمہ دار ہے اور اس کے گناہوں میں کوئی دوسرا جوابدہ نہیں اسی لئے حدیث میں تصریح ہے کہ ان کے بوجھ اور گناہ میں کوئی تخفیف نہ ہوگی جب کہ ضلالت کا بانی دو بوجھ اٹھائے گا ایک گمراہی ایجاد کرنے کا دوسرا اس کے متعدی ہونے کا اور دونوں اپنے حصے کے مطابق سزا پائیں گے ناحق کسی کے گناہ دوسرے کی گردن میں نہیں ڈالے جائیں گے اس لئے حدیث وآیت میں کوئی اشکال نہیں، حدیث بظاہر پہلی روایت سے الگ نظر آتی ہے لیکن علامہ سندھی نے اسے حضرت جریر کی روایت کا

واقعہ قرار دیا ہے، سند کی بابت بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں اسنادہ صحیح کی وضاحت فرمائی ہے۔

(۲۰۵/۳) حَدَّثَنَا عِيسَى بْنُ حَمَّادِ الْمِصْرِيُّ، أَنْبَأَ نَا اللَّيْثُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ يَزِيْدَ بْنِ أَبِي حَبِيْبٍ عَنْ سَعْدِ بْنِ سِنَانٍ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ "أَيُّمَا دَاعٍ دَعَا إِلَى ضَلَالَةٍ فَاتُّبِعَ فَإِنَّ لَهُ مِثْلَ أَوْزَارِ مَنِ اتَّبَعَهُ وَلَا يَنْقُصُ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْئاً، وَأَيُّمَا دَاعٍ دَعَا إِلَى هُدًى فَاتُّبِعَ، فَإِنَّ لَهُ مِثْلَ أُجُوْرِ مَنِ اتَّبَعَهُ، وَلَا يَنْقُصُ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئًا"

بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے هذا اسناد ضعيف لضعف سعد بن سنان یہ ابوداؤد ترمذی اور ابن ماجہ کے راوی ہیں حافظ نے انہیں تقریب التہذیب (۲۲۳۸) میں صدوق له أفراد قرار دیا ہے یعنی سچے تو ہیں لیکن۔ سند ومتن میں بعض اوقات دوسرے رواۃ سے الگ منفرد نظر آتے ہیں۔

(۲۰۶/۴) حَدَّثَنَا أَبُوْ مَرْوَانَ، مُحَمَّدُ بْنُ عُثْمَانَ الْعُثْمَانِيُّ ثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ أَبِي حَازِمٍ عَنِ الْعَلَاءِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ دَعَا إِلَى هُدًى كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلُ أُجُوْرِ مَنِ اتَّبَعَهُ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئًا وَمَنْ دَعَا إِلَى ضَلَالَةٍ، فَعَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنِ اتَّبَعَهُ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ آثَامِهِمْ شَيْئًا.

﴿من دعا الی هدیً﴾ اس فضیلت کا مصداق ہر وہ شخص ہے جس نے دین کے صحیح تصور کو اجاگر کیا اور دعوت وتبلیغ کے ذریعہ اس نے انسانوں کو اللہ سے جوڑنے کی کوشش کی اسی طرح جہاد اور نظام شریعت کے قیام کی ترغیب بھی اس کے ذیل میں آتی ہے۔

﴿ومن دعا الی ضلالة﴾ اس وعید کا اطلاق ان تمام لوگوں پر ہوگا جنہوں نے انفرادی یا اجتماعی طور پر مسلمانوں میں گمراہی کی داغ بیل ڈالی، جس کے نتیجے میں بے شمار سادہ لوح اپنا دامن ایمان تار تار کر بیٹھے، بہاء اللہ ایرانی، غلام احمد قادیانی اور عبداللہ چکڑالوی وغیرہ اسی ضمن کے لوگ ہیں اسی طرح جن لوگوں نے خلافتِ عثمانیہ کے زوال کے بعد مسلمانوں کو

سیکولرزم اور جمہوریت سے جوڑا، دار الاسلام اور دار الحرب کا خاتمہ کیا اور جہاد وشہادت کے دروازے کو ہمیشہ کیلئے بند کرنے کی کوشش کی وہ بھی غالبًا اسی وعید کا مصداق ہیں...... حدیث مسلم (علم/۳) ترمذی (علم/ ۱۵) ابوداؤد (سنۃ/ ۷) میں بھی آئی ہے۔(اور ابن ماجہ کی سند)

(۵/ ۲۰۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحيٰى ثَنَا اَبُوْنُعَيْمٍ، ثَنَا اِسْرَائِيْلُ عَنِ الْحَكَمِ عَنْ اَبِيْ جُحَيْفَةَ، قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ "مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَعُمِلَ بِهَا بَعْدَهُ كَانَ لَه أَجْرُهُ وَمِثْلُ أُجُوْرِهِمْ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئًا وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعُمِلَ بِهَا بَعْدَهُ كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهُ وَمِثْلُ اَوْزَارِهِمْ مِنْ غَيرِ اَنْ يَنْقُصَ مِنْ اَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ

بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے **فی هذا الاسناد ضعيف لضعف اسرائيل** یعنی سند میں اسرائیل کوضعیف قرار دیا گیا ہے حافظ نے **تقريب التهذيب** میں اسرائیل نامی دوراویوں کا پتہ دیا ہے ایک تو اسرائیل بن موسیٰ ہیں جو بخاری نسائی ابوداؤد اور ترمذی کے روای ہیں حافظ نے انہیں **ثقة** قرار دیا ہے جب کہ دوسرے اسرائیل بن یونس ہیں اور غالبا یہی یہاں پر مراد بھی ہیں حافظ نے ان پر **ثقة تكلم فيه بلاحجة من السابعة** کی شہادت دی ہے اس لئے بوصیری کا فیصلہ محل نظر ہے اور متن کے ثبوت میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے۔

(۶/ ۲۰۸) حَدَّثَنَا أَبُوْبَكْرِ بْنِ أَبِيْ شَيْبَةَ ثَنَا أَبُوْ مُعَاوِيَةَ ، عَنْ لَيْثٍ ، عَنْ بَشِيْرِ بْنِ نَهِيْكٍ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ ، قَالَ: مَا مِنْ دَاعٍ يَدْعُوْ اِلَى شَيْءٍ اِلَّا وُقِفَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَازِمًا لِدَعْوَتِهِ مَادَعَا اِلَيْهِ وَاِنْ دَعَا رَجُلٌ رَجُلًا

فرمایا: کوئی داعی ایسا نہیں جس نے کسی چیز کی طرف بلایا ہو مگر یہ قیامت میں اسکو اسی دعوت وفکر کے ساتھ کھڑا کیا جائے گا جس کی طرف اس نے دعوت دی تھی چاہے ایک آدمی نے ایک ہی کو دعوت دی ہو۔

﴿وُقِفَ يوم القيامة﴾ سندھیؒ نے اس کی تشریح میں سورۂ صافات کی آیت **وقفوهم انهم مسئولون** کو پیش ہے یعنی کیا ان کو ٹھہراؤ ان سے باز پرس ہوگی۔

﴿لازما لدعوته﴾ سندھی نے یہاں دو احتمال ظاہر کئے ہیں مفعول مطلق کی صفت ہے

یعنی وقفا لازما مطلب ہوگا ای لأجل دعوته وقف کی ضمیر کا حال ہے اب معنی ان کے نزدیک ای حال کونه غیرمفارق عن دعوته بل معه دعوته کہ وہ اپنی دعوت سے الگ نہیں بلکہ اس کے ساتھ کھڑا ہوگا...... بوصیری نے زوائد میں لکھا ہے هذا اسناد ضعيف والليث هو ابن ابی سليم ضَعَّفَهُ الجمهور یعنی محدثین کے نزدیک یہ ضعیف ہیں حافظ نے تقریب (۵٦٨۵) میں لکھا ہے صدوق اختلط جدا ولم يتميز حديثه فترك سچے تو ہیں لیکن حافظہ اتنا گڑبڑ ہوگیا تھا کہ ان کی حدیث کی شناخت بھی مشکل ہوگئی اس لئے محدثین کے نزدیک وہ متروک ہیں۔

بَاب مَنْ أَحْيَا سُنَّةً قَدْ أُمِيتَتْ

گذشتہ باب میں پیش رفت کر کے کسی دینی کام کو فروغ دینے کا تذکرہ تھا اس باب میں اس طریقۂ نبوت کو زندہ کرنے کی فضیلت کا بیان ہے جو معاشرے سے بالکل مٹا دیا گیا ہے یہاں افعال کا باب لایا گیا ہے جس میں قصد، کوشش اور تعدی پائی جاتی ہے یعنی وہ سنت ازخود نہیں مٹی ہے بلکہ کچھ ناخداترسوں نے منصوبہ بند طریقے پر کوشش کر کے اسے دنیا سے مٹایا ہے یہ کون لوگ ہوسکتے ہیں؟ خارجی طور پر تو یہاں دین کے دشمن سمجھ میں آتے ہیں جب کہ داخلی طور پر سیکولر و بے دین مسلمان بھی یہ حرکت کر کے امت کو غلط سمت میں لے جانا چاہتے ہیں، آج ہم اس کا ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں۔ پھر سنت کا مفہوم مسواک وداڑھی تک محدود نہیں بلکہ وہ اس طریقۂ حیات کا نام ہے جو گود سے گور تک ہر شعبہ میں ہماری راہنمائی کرتا ہے وہ کبھی مستحب اور کبھی واجب وفرض بھی ہوتا ہے۔

(۲۰۹/ا) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ اَبِیْ شَيْبَةَ ثَنَا زَيْدُ بْنُ الْحُبَابِ ثَنَا كَثِيْرُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ عَوْفِ الْمُزَنِیُّ حَدَّثَنِیْ أَبِیْ عَنْ جَدِّیْ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ أَحْيَا سُنَّةً مِنْ سُنَّتِیْ فَعَمِلَ بِهَا النَّاسُ كَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا لَا يَنْقُصُ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئًا وَمَنِ ابْتَدَعَ بِدْعَةً فَعُمِلَ بِهَا كَانَ عَلَيْهِ أَوْزَارُ مَنْ عَمِلَ بِهَا لَا يَنْقُصُ مِنْ أَوْزَارِ مَنْ عَمِلَ بِهَا شَيْئًا۔

فرمایا: جس نے میرے کسی طریقہ کو زندہ کیا پھر لوگ اس پر عمل کرنے لگے تو اس کو عمل کرنے والوں کا سا اجر ملے گا اور ان کے اجر میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور جس نے کسی بدعت کو ایجاد کیا پھر وہ معمول بہا ہوگئی تو اس کے کاندھوں پر ان سب کا گناہ ہوگا جنہوں نے اس پر عمل کیا اور عاملین کے گناہ میں بھی کوئی تخفیف نہ ہوگی۔

﴿من أحيا سنة﴾ اس کے معنی امام سیوطی نے واحیاءھا: أن يعمل بها ويحرض الناس عليها ويحثهم علىٰ اقامتها بیان کئے ہیں سندھی سے بھی یہی منقول ہے یعنی سنت پر عمل دوسروں کو اس کی ترغیب اور اس کے قیام واستحکام پر ماحول کو تیار کرنا ملا علی قاری نے اس کی وضاحت ای من أظهرها واشاعها بالقول اوبالعمل سے کی ہے امام نے سنت کو ترجمۃ الباب میں قد اميتت سے مقید کر دیا ہے بعض احادیث میں اس کو زندہ کرنے پر سو شہیدوں تک کے ثواب کا وعدہ ہے جہاد وخلافت صحابہ کے طرز پر دعوت، نظام شریعت بیت المال اور حدود وغیرہ کا قیام ہی وہ سنن ہیں جن کو کبھی کا مٹایا جا چکا ہے اب انہیں زندہ کر کے ہی یہ فضیلت حاصل ہوسکتی ہے۔

﴿ومن ابتدع بدعة﴾ بدعت کا لفظ آتے ہی ہمارا ذہن بس تیجہ، چالیسواں، عرس میلاد اور قبر پرستی تک جاتا ہے حالانکہ یہ اعتقاد وعمل کی ہر گمراہی کو شامل ہے اور ہر وہ کوشش اس کا مصداق ہوگی جس کے ذریعہ امت کو صحیح تصورِ دین سے ہٹا کر جمہوریت، سیکولرزم اور دیگر باطل نظاموں سے جوڑا جائے ...... حدیث ترمذی (علم/١٦) میں بھی آئی ہے اور مصنف نے اس کو حسن قرار دیا جب کہ ابن ماجہ کی سند قدرے کمزور ہے کثیر بن عبداللہ راوی کو حافظ نے تقریب التہذیب (٥٦١٧) میں ضعيف افرط من نسبه الى الكذب کہا ہے یعنی ضعیف ہیں لیکن ان کو کذاب کہنا مناسب نہیں، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ کے علاوہ امام بخاری نے بھی جزء رفع الیدین میں ان سے روایت کی ہے۔

(٢١٠/٢) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَىٰ ، ثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ أَبِي أُوَيْسٍ ، حَدَّثَنِي كَثِيرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ اَبِيهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ

ل انجاح الحاجہ ٢ مرقاۃ المفاتیح ٢٢٥/١

مَنْ اَحْيَا سُنَّةً مِنْ سُنَّتِي قَدْ اُمِيتَتْ بَعْدِي فَاِنَّ لَهُ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلَ اَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنَ النَّاسِ لَا يَنْقُصُ مِنْ اُجُوْرِ النَّاسِ شَيْئًا وَمَنِ ابْتَدَعَ بِدْعَةً لَا يَرْضَاهَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ فَاِنَّ عَلَيْهِ مِثْلَ اِثْمِ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنَ النَّاسِ لَا يَنْقُصُ ، مِنْ آثَامِ النَّاسِ شَيْئًا .

جس نے میری سنت میں سے کسی ایسی سنت کو زندہ کیا جو میرے بعد مٹادی گئی تھی تو اس کو ایسا ہی ثواب ملے گا جیسا کہ اس پر عمل کرنے والے لوگوں کو ہوگا اور ان کے ثواب میں سے کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور جس نے ایسی بدعت کو گڑھا جس سے اللہ اور اس کے رسول راضی نہیں تو اس کو بدعت پر عمل کرنے والے لوگوں کا سا گناہ ہوگا لیکن عاملین کے گناہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ اسماعیل بن ابی اویس کو حافظ نے تقریب التہذیب (۴۶۰) میں صدوق اخطأ فی احادیث من حفظه من العاشرة قرار دیا ہے ناصر الدین البانی نے ضعیف لابن ماجہ/ ۱۵ میں سند کو ضعیف جداً لکھا ہے۔

بابٌ فی فَضْلِ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ

قرآن کریم کائنات کی سب سے زیادہ عظیم دولت ہے اس سے زیادہ باعظمت کوئی چیز دنیا میں موجود نہیں ہے اسی لئے قرآن کو سیکھنے اور سکھانے والے ہی سب سے افضل ہوں گے ابن ماجہ نے اسی حقیقت کو سمجھانے کے لئے یہ باب قائم کیا جس میں ایسی احادیث درج کی ہیں جو یہ بتلاتی ہیں کہ قرآنِ کریم کی تلاوت اس کا حفظ کرنا اور معانی کو سمجھ کر اس کے تقاضوں پر عمل کرنا اتنی بلند عبادت ہے کہ اس کی برکت سے نہ صرف مغفرت کا وعدہ ہے بلکہ ایسے بندوں کو اللہ تعالیٰ دنیا میں تو عزت ورفعت نصیب فرمائیں گے اور آخرت میں ان کو اپنا مقرب بنا کر اعزاز واقرباء کی بابت سفارش کرنے کا بھی حق دیں گے جو ظاہر ہے اخروی لحاظ سے سب سے بڑا اعزاز ہے پھر بعض احادیث میں تلاوت قرآن کریم کو سو رکعت نفل سے افضل بتلایا گیا جس سے اس کی اہمیت ووقعت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

(۲۱۱/۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ، ثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيْدِ الْقَطَّانُ، ثَنَا شُعْبَةُ

وَسُفْيَانُ، عَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ مَرْثَدٍ، عَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَيْدَةَ عَنْ أَبِي عَبْدِالرَّحْمٰنِ السُّلَمِيِّ، عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ، قَالَ شُعْبَةُ ...... : "خَيْرُكُمْ"...... وَقَالَ سُفْيَانُ: "أَفْضَلُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ"

فرمایا (شعبہ کی روایت کے مطابق) تم میں سب سے بہتر وہ ہے اور سفیان نے نقل کیا ہے کہ تم میں سب سے افضل وہ ہے جو قرآن کریم سیکھے اور اس کو سکھائے۔

علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے المراد من تعلم القران وعلّمه مع مراعاته عملاً والا فغير المراعي يعد جاهلاً، قرآن کو سیکھنے اور سکھانے والا اسی وقت سب سے افضل ہوسکتا ہے جب کہ وہ اس کے تقاضوں پر بھی پورا عمل کرتا ہو کیونکہ بے عمل کو تو جاہل شمار کیا گیا، ملا علی قاریؒ نے بھی لکن لابد من تعلم العلم والتعليم بالاخلاص[1] فرما کر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ فضیلت اسی وقت حاصل ہوگی جب کہ نیت رضائے الٰہی کی ہو اور منکرات ومعاصی سے بھی مکمل پرہیز ہو ورنہ یہ چیزیں اس فضیلت میں رکاوٹ بن جائیں گی۔

یہاں تعلیم وتعلّم سے محض پڑھنا اور پڑھانا مراد نہیں بلکہ ان کے معنی سیکھنے اور سکھانے کے ہیں الفاظ کو پڑھنا تعلیم کا ادنی درجہ ہے اور مفہوم ومعانی کو سمجھنا اس کا آخری مقام ہے یہ تعبیر بیک وقت دونوں کو شامل ہے اور اس کا صحیح مصداق وہی شخص ہوگا جو الفاظ کے ساتھ معانی کا بھی اہتمام کرے ملا علی قاریؒ نے لکھا ولايتمكن من هذا الاّ بالعلوم الشرعية مع زوائد المعارف القرآنية وفوائد المعارف الفرقانية ومثل هذاالشخص يعدّ كاملا لنفسه مكملا لغيره فهو أفضل المؤمنين مطلقاً[2] یعنی تمام مسلمانوں سے وہ افضل جب ہی ہوگا جب کہ اصول وفروع اور قرآنی علوم ومعارف سے بھی وہ کما حقہ آگاہ ہو چنانچہ حضرت گنگوہی فرماتے ہیں يدخل فيه الفقيه والمحدث وصدقه المفسر ظاهر ثم لذلك التعليم مراتب وبحسبه تتفاوت الخيرية[3] فقیہ اور محدث بھی اس فضیلت میں داخل ہیں اور مفسر تو اس کا مصداق ہے ہی پھر اس تعلیم کے درجے ہیں انہیں کے اعتبار سے فضیلت کی تعیین ہوگی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے تبلیغی نصاب فضائل

[1، 2] مرقاۃ المفاتیح ۲/۵۷۳ [3] الکوکب الدری ۲/۱۷۶

قرآن مجید میں حدیث کا یہی مفہوم نقل کیا ہے اس لئے آج جو لوگ حدیث کو صرف اصطلاحی قاریوں پر فٹ کر رہے ہیں محدثین کے فرمودات کی روشنی میں ان کا موقف درست نہیں اور خود صحابہ کی زندگی اس کی تردید کرتی ہے وہ پیدائشی عرب تھے مادری زبان بھی عربی تھی لیکن محض ایک سورت انہوں نے کئی کئی سالوں میں سیکھی ظاہر ہے ان کا یہ سیکھنا علوم ومعارف کے ساتھ تھا ورنہ الفاظ تو وہ چند دنوں میں یاد کر لیتے۔

حدیث باب صحیح بخاری (فضائل القرآن/۲۱) سنن ابی داؤد (صلوٰۃ/ثواب قراءۃ القرآن) اور جامع ترمذی (فضائل القرآن/۱۷) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی عمدہ ہے۔

(۲۱۲/۲) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، ثَنَا وَكِيعٌ، ثَنَا سُفْيَانُ، عَنْ عَلْقَمَةَ ابْنِ مَرْثَدٍ، عَنْ اَبِيْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ السُّلَمِيِّ، عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "اَفْضَلُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ"

شرح اور تخریج گذشتہ حدیث میں گذر چکی ہے سند ومتن دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

(۲۱۳/۳) حَدَّثَنَا أَزْهَرُ بْنُ مَرْوَانَ، ثَنَا الْحَارِثُ بْنُ نَبْهَانَ، ثَنَا عَاصِمُ بْنُ بَهْدَلَةَ، عَنْ مُصْعَبِ بْنِ سَعْدٍ، عَنْ اَبِيْهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "خِيَارُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ" قَالَ: وَأَخَذَ بِيَدِيْ فَأَقْعَدَنِيْ مَقْعَدِيْ هٰذَا، أُقْرِئُ.

﴿قال وأخذبيدى الخ﴾ حضرت مولانا عبدالغنی مجددی دہلوی نے میں لکھا ہے لعل هذا قول عاصم بن بهدلة لانه كان امام القراء فى زمنه وانتشر قراءته فى الآفاق شاید یہ قول عاصم بن بہدلہ راوی کا ہے کیونکہ وہ اپنے زمانے کے امام القراء تھے اور ان کی روایت قرات دنیا میں پھیل چکی تھی اب مجددیؒ اس قول کی وضاحت کرتے ہیں اى قال عاصم أخذ مصعب بن سعد بيدى فاقعدنى مقعدى هذا اى مجلس تعلم القرآن یعنی عاصم فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو سنانے کے بعد مصعب بن سعد نے میرا ہاتھ پکڑا اور تعلیم القرآن کے اس منصب پر بٹھلا دیا علامہ سندھی نے وضاحت کی ہے وعلّم القرآن فى زمان عثمان حتى بلغ الحجاج بن يوسف حضرت عثمانؓ کے زمانے سے

حجاج کے دور تک انہوں نے قرآن کریم پڑھایا۔

﴿اُقرِئُ﴾ متکلم کی ضمیر مفعول کا حال ہے یعنی مجھے پڑھانے کے لئے بٹھا دیا۔ سند کے ایک راوی حارث بن نبہان کو حافظ نے تقریب التہذیب (نمبر ۱۰۵۱) میں متروک من الثامنة قرار دیا ہے اس لئے بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے اسناده ضعيف لضعف الحارث بن نبهان.

(۲۱۴/۴) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ وَ مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنّٰى قَالَا يَحْيَى بْنُ سَعِيْدٍ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ اَبِىْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَثَلُ الْمُوْمِنِ الَّذِىْ يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ كَمَثَلِ الْاُتْرُجَّةِ طَعْمُهَا طَيِّبٌ وَرِيْحُهَا طَيِّبٌ وَمَثَلُ الْمُوْمِنِ الَّذِىْ لَا يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ كَمَثَلِ التَّمْرَةِ طَعْمُهَا وَرِيْحُهَا طَيِّبٌ وَلَا رِيْحَ لَهَا وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِىْ يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ كَمَثَلِ الرَّيْحَانَةِ رِيْحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا مُرٌّ وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِىْ لَا يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ كَمَثَلِ الْحَنْظَلَةِ طَعْمُهَا مُرٌّ وَلَا رِيْحَ لَهَا.

فرمایا: اس مومن کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے اترجے کی طرح ہے کہ مزہ بھی عمدہ اور خوشبو بھی شاندار، اور اس مومن کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا کھجور کی سی ہے کہ مزہ تو شیریں ہے لیکن خوشبو کچھ نہیں، اور اس منافق کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے پھول کی ہے جس کی خوشبو تو اچھی ہے لیکن مزہ کڑوا ہوتا ہے اور اس منافق کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا حنظل کی ہے جس کا مزہ بھی کڑوا ہے اور اس کی خوشبو بھی کچھ نہیں۔

﴿كمثل الأترجة﴾ مجددیؒ نے قاموس کے حوالے سے ترنج کی لغت بھی نقل کی ہے یہ کون سا پھل ہے ملا علی قاری نے لکھا ہے وهى احسن الثمار الشجرية وانفسها عند العرب لحسن منظرها صفراء فاقع لونها تسر الناظرين[1] یعنی درختوں پر آنے والے پھلوں میں یہ سب سے عمدہ اور عربوں کو سب سے زیادہ پسند ہے بڑا خوبصورت اور زرد ہوتا ہے اس کے رنگ کی شوخی دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے علامہ سندھی نے اس کی وضاحت

[1] مرقاۃ المفاتیح ۲/ ۵۷۷ کتاب فضائل القرآن، فصل اول

ان الفاظ میں کی ہے وھی من افضل الثمار لکبر جرمھا ومنظرھا وطیب طعمھا ولین ملمسھا ولونھا یسر الناظرین اس عبارت سے پھل کا بڑا ملائم اورلذیذ ہونا بھی معلوم ہوالیکن ابھی بھی اس کی تعیین نہیں ہوئی، حافظ ابن حجر اسی گرہ کو کھولتے ہوئے لکھتے ہیں تجمع طیبۃ الطعام والریح کا لتفاحۃ لأنہ یتداویٰ لقشرھا وھو مفرح بالخاصۃ ویستخرج من حبھا دھن لہ منافع[1] سیب کی طرح مہکتا ہوا خوبصورت اورلذیذ پھل ہے مفرح قلب ہے اس کے چھلکوں کی دواء بنائی جاتی ہے اوراس کے بیج سے ایسا تیل نکالا جاتا ہے جس کے بے شمار فوائد ہیں، ان فرمودات کی روشنی میں یہ ایسا پھل ہے جو رنگ، خوشبو کے ساتھ نہایت میٹھا اور ٹھنڈا بھی ہوتا ہے اسی لئے سخت صحرائی موسم کے باعث عربوں کو بہت پسند ہے اب قارئین غور کریں کہ اس کا ترجمہ لیمو یا چکوترے سے کرنا کس حد تک درست ہے جس کا مزہ کھٹا اور ترش ہوتا ہے لذت کا اس میں کوئی خاص سامان نہیں علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں وفیہ تشبیہ الایمان بالطعم الطیب لکونھا خیرا باطنیا لایظھر لکل أحد کہ یہاں ایمان کوتو عمدہ ذائقہ سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ وہ ایسا مخفی خزانہ ہے جو ہر ایک کو دکھائی نہیں دیتا، والقرآن بالریح الطیب ینتفع بسماعہ کل أحد ویظھر بمحاسنہ لکل سامع جب کہ قرآن کو نہایت عمدہ خوشبو سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ اسے سن کر ہر آدمی مستفید ہوسکتا ہے اوراس کا حسن وجمال ہر ایک کے سامنے ظاہر ہوجاتا ہے۔

﴿کمثل التمرۃ﴾ گویا قرآن کریم کی تلاوت ایمان کی خوشبو بھڑکا کر اسے چہار سو پھیلا دیتی ہے جس کی بدولت دوسروں کو بھی دین کی توفیق ملتی ہے لیکن تلاوت چھوڑنے کی صورت میں ایمان کھجور کی طرح بند ہوجاتا ہے اور دوسروں کو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا صرف اس کی مٹھاس صاحب ایمان ہی کے لئے مخصوص ہوکر رہ جاتی ہے۔

﴿کمثل الریحانۃ﴾ یعنی نازبو کا پھول جو نہایت عمدہ خوشبو کا ہوتا ہے مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے لکھا ہے لأن الفجور أفسد طعم الایمان یعنی فسق اورنفاق نے ایمان کے مزے کو فاسد کردیا اس لئے تلاوت کی خوشبو باقی رہی البتہ ایمان کی حلاوت نہ مل سکی، حدیث

---

[1] فتح الباری ۹/۵۴ کتاب فضائل القرآن باب فضل القرآن

کے اسلوب میں یہ اشارہ ہے کہ اگر وہ تلاوت جاری رکھے گا تو یہ خوشبو اس کے دل و دماغ میں سرایت کر کیا سے ایمان صحیح سے نواز دے گی جیسا کہ عہد رسالت میں منافقوں کے سچا پکا ایمان لانے کی مثالیں موجود ہیں۔

﴿کمثل الحنظلة﴾ معجم الوسیط میں لکھا ہے نبت مفترش ثمرته فی حجم البرتقالة ولونها فیها لب شدید المرارة، زمین میں پھیلنے والا پودا ہے جس کا پھل سائز ورنگ میں نارنگی جیسا ہوتا ہے اور اس کا گودا نہایت کڑوا ہوتا ہے یہ شخص کیونکہ ایمان و عمل دونوں سے محروم ہے اس لئے اسے کڑوا کہا گیا ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ یہاں قرآن سے استفادے کے درجات و شقاوت کو بیان کیا گیا ہے کہ ایک فائدہ اٹھاتا ہے، اور دوسرا گروہ محروم رہتا ہے...... حدیث صحیح بخاری (فضائل القرآن/ ۱۷، ۳۶ ،اطعمۃ/ ۳۱، توحید/ ۵۷) صحیح مسلم (فضائل القرآن/۴) ابوداؤد (ادب/ ۱۹) ترمذی (الامثال/۴) نسائی (ایمان/۳۲) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند عمدہ ہے۔

(۲۱۵/۵) حَدَّثَنَا بَكْرُ بْنُ خَلَفٍ اَبُوْبَشْرٍ ثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنِ مَهْدِيٍّ ثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنِ بُدَيْلٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ لِلّٰهِ أَهْلِيْنَ مِنَ النَّاسِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ هُمْ قَالَ هُمْ أَهْلُ الْقُرْآنِ أَهْلُ اللّٰهِ وَخَاصَّتُهُ .

فرمایا: کچھ لوگ اللہ کے چہیتے ہیں صحابہ عرض کیا اے اللہ کے رسول وہ کون ہیں فرمایا اہل قرآن اہل اللہ اور اس کے مخصوص لوگ ہیں۔

﴿ان الله أهلين من الناس﴾ اهل کی جمع مذکر سالم ہے معنی رشتے دار گھر والے اور مخصوص لوگ حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں میں کچھ لوگ اللہ سے اتنے ہی قریب ہے جیسے کہ کسی شخص کے گھر والے اس کے مقرب ہوتے ہیں اور وہ ان کا ہر طرح خیال رکھتا ہے۔

﴿هم أهل القران﴾ علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے ای حفظة القران يقرأونه اناء الليل وأطراف النهار والعاملون به ، یعنی اہل القرآن سے مراد وہ حفاظ ہیں جو دن رات قرآن کریم پڑھتے ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں ہمارے نزدیک حافظ کے ساتھ اس مفہوم

میں علماء بھی شامل ہیں جنہوں نے تفسیر اور علوم القرآن کو اپنی توجہات کا مرکز بنا کر پوری زندگی اس کے لئے وقف کردی ہے اہل القرآن کی اصطلاح کا اطلاق منکرین حدیث پر کبھی نہیں ہوسکتا جو لوگ حدیث ہی کو نہ مانتے ہوں اس سے استدلال کرتے ہوئے انہیں شرم نہیں آتی !!

﴿اهل الله و خاصتهٗ﴾ علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں بتقدیر أنهم اهل الله کہ یہاں پورا جملہ دراصل انهم اهل الله ہے اور اس کے معنی سندھی کے الفاظ میں اولیائه المختصون به اختصاص اَهل الانسان بهم کہ جس طرح گھر والے انسان کے مخصوص ہوتے ہیں اسی طرح قرآن میں منہمک لوگ مقرب اور اللہ والے ہیں.......... بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے هذا اسناد صحيح رجاله موثقون.

(۲۱۶/۶) حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ عُثْمَانَ بْنِ سَعِيْدِ بْنِ كَثِيْرِ بْنِ دِيْنَارٍ الْحِمْصِيُّ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ حَرْبٍ عَنْ اَبِيْ عُمَرَ عَنْ كَثِيْرِ بْنِ زَاذَانَ عَنْ عَاصِمِ بْنِ ضَمْرَةَ عَنْعَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ وَحَفِظَهٗ أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ وَشَفَّعَهٗ فِيْ عَشْرَةٍ مِنْ اَهْلِ بَيْتِهٖ كُلُّهُمْ قَدْ اسْتَوْجَبَ النَّارَ .

فرمایا: جس نے قرآن کو پڑھا اور اسے حفظ کرلیا اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کریں گے اور اس کے گھر والوں میں سے ان دس آدمیوں پر اس کو سفارش کا حق دیا جائے گا جن میں سے ہر ایک نے اپنے اوپر جہنم واجب کرلی تھی۔

﴿وحفظه﴾ جامع ترمذی میں فاستظهره فاحل حلاله وحرم حرامه منقول ہے استظهار کے معنی زبانی پڑھنے کے ہیں جو حفظ ہی کی ایک مترادف تعبیر ہے اور علم و عمل بھی اس کے دائرے میں آتے ہیں سندھیؒ نے لکھا ہے اى بمراعاة العمل به والقيام بموجبه یعنی عمل اور اس کے واجبات کی ادائیگی کی رعایت کے ساتھ حفظ و تلاوت ہونی چاہئے۔

﴿ادخله اللّٰہ الجنة﴾ سندھی فرماتے ہیں اى ابتداء والا فكل مومن يدخلها یہاں اوائل وہلہ میں جنت کا داخلہ مراد ہے ورنہ سزا بھگت کر تو ہر مسلمان جنت میں جائے گا۔

﴿وشفعه﴾ لغوی معنی سفارش قبول کرنے کے ہیں جس کی توجیہ ملا علی قاریؒ نے جعله

شفیعا اورعلامہ سندھیؒ نے قبل شفاعته سے کی ہے یعنی اس کوسفارشی بنا کراس کی شفاعت قبول کی جائیگی۔[1]

﴿قد استوجب النار﴾ سندھیؒ نے لکھا ہے ای بالذنوب لا بالکفر نعوذ باللّٰه منه یعنی جہنم کا وجوب گناہوں کی بناء پر ہوگا نعوذ باللّٰہ کفرکی وجہ سے نہیں حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں هذا الوجوه لیس بکفرهم او ترکهم والاّ لما شفع فیهم بل لغلبة سیئاتهم علی حسناتهم[2] وجوب نارکی وجہ کفریاترک دین نہیں کیوں کہ اس صورت میں اس کوسفارشی نہیں بنایا جاسکتا بلکہ اسکی وجہ سے گناہوں کا نیکیوں سے زیادہ ہوجاتا ہے...... حدیث ترمذی (فضائل القرآن/ ۱۵) میں بھی آئی ہے سند کی بابت مصنف نے هذا حدیث غریب لا نعرفه الاّ من هذا الوجه ولیس له اسناد صحیح وحفص بن سلیمان ابو عمر بزار کوفی یضعف فی الحدیث کا تبصرہ کیا ہے حافظ نے ابوعمر کوتقریب التہذیب (۱۴۰۵) میں متروك الحدیث مع امامته فی القراءة قرار دیا ہے اس لئے امام ترمذی کے اس فیصلے کا اطلاق ابن ماجہ کی سند پر بھی ہوگا کیونکہ یہ راوی یہاں بھی موجود ہے پھر کثیر ابن زاذان کوحافظ نے تقریب (۵۶۰۹) میں مجہول قرار دیا ہے اس لئے ناصر الدین البانی نے ضعیف لابن ماجہ/ ۱۵ میں اس سند کوضعیف جدا قرار دیا ہے۔

(۲۱۷/۷) حَدَّثَنا عَمْرُ و بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ الْأَوْدِیُّ ، ثَنَا أَبُوْ أُسَامَةَ ، عَنْ عَبْدِ الْحَمِیْدِ بْنِ جَعْفَر، عَنِ الْمُقْرِیِّ ، عَنْ عَطَاءٍ مَوْلَی أَبِیْ أَحْمَدَ، عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَعَلَّمُوْا الْقُرْآنَ وَاقْرَأُوْهُ وَارْقُدُوْا، فَاِنَّ مَثَلَ الْقُرْآنِ وَمَنْ تَعَلَّمَهُ فَقَامَ بِهِ كَمَثَلِ جِرَابٍ مَحْشُوٍّ مِسْكاً یَفُوْحُ رِیْحُهُ كُلَّ مَكَانٍ وَمَثَلُ مَنْ تَعَلَّمَهُ فَرَقَدَ وَهُوَ فِیْ جَوْفِهِ كَمَثَلِ جِرَابٍ أُوْكِیَ عَلَی مِسْكٍ

فرمایا: قرآن سیکھواس کو پڑھواورسو جاؤ کیونکہ قرآن کی مثال اوراس کوسیکھ کراس سے وابستہ ہونے والے کی مثال اس مشکیزے کی طرح ہے جومشک سے بھرا ہواوراس کی خوشبو چہار سو

---

[1] مرقاۃ المفاتیح [2] الکوکب الدری ۲/ ۱۷۵

مہک رہی ہو اور اس شخص کی مثال جس نے قرآن کو سیکھا پھر اس حال میں سو گیا کہ وہ اس کے سینے میں موجود تھا اس مشکیزے کی طرح ہے جس کا منہ مشک بھرنے کے بعد بند کر دیا گیا ہو۔

﴿تعلموا القرآن﴾ ملا علی قاریؒ نے ابو محمد جوینی کے حوالے سے لکھا ہے تعلموا القرآن ای تعلیمه فرض کفایة[1] کہ قرآن کا سیکھنا اور سکھانا فرض کفایہ ہے بدر الدین زرکشی فرماتے ہیں واذا لم یکن فی البلد او القریة من یتلوا لقران اثموا باسرهم[2] یعنی فرض کفایہ کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی شہر یا بستی میں کوئی بھی ایسا شخص نہ رہا جو قرآن کی تلاوت کر سکے تو وہ سب گنہگار ہوں گے اس لئے کچھ لوگوں کا ہر شہر میں موجود رہنا ضروری ہے دراصل تلاوت اسلامی معاشرے کا سب سے محبوب مشغلہ ہے اور علم و فضل کی فضا اسی سے پیدا ہوتی ہے۔

﴿واقرأوا﴾ علامہ سندھیؒ نے اس کے معنی داوموا علٰی قراءته مع العمل به لکھے ہیں یعنی عمل کے ساتھ ہمیشہ اس کی تلاوت کرتے رہو۔

﴿وارقدوا﴾ سندھیؒ نے لکھا ہے ذلك ذکرهٗ للتنبیه علٰی أن قاری القران لا یمنع عن النوم ولا یعاقب علیه اذا کان مع اداء حق القران وانما یعاقب علیه اذا لزم علیه عدم اداء حق القران ، یعنی راحت و آرام کا تذکرہ یہ بتانے کے لئے کیا گیا کہ قرآن کی تلاوت کرنے والے کو نیند سے منع نہیں کیا جاتا اور قرآن کا حق ادا کرنے کے بعد اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا مؤاخذہ تو جب ہوگا جب وہ قرآن کا حق ادا نہ کرے مختصر یہ کہ ذمہ داری نبھانے کے بعد راحت و آرام کوئی بری بات نہیں، یہی وجہ راجح ہے اور مجددیؒ نے واؤ کو اَو کے معنی میں لیے جو اس کا مفہوم من شاءَ قرأه فله الاجر ومن شاء رقد فعلیه الوزن بیان کیا ہے وہ مرجوح ہے۔

﴿فقام به﴾ علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں تشمر لأداء حقه قراء ة وعملاً یعنی تلاوت و عمل دونوں کی ادائیگی کے لئے کمر کس لے اور اس کو اپنا نصب العین بنا لے۔

﴿جراب محشو مسکاً﴾ جمع أجربة آتی ہے چمڑے کا برتن یعنی مشکیزہ محشو حشا (ن) حشواً سے مفعول کا صیغہ ہے معنی بھرنا، مسکاً اس کی تمیز ہونے کی بنا پر

[1،2] مرقاۃ المفاتیح ۲/۵۹۵ فضائل القرآن فصل دوم

منصوب ہے ملا علی قاری نے ابن الملک کے حوالے سے لکھا ہے صدر القاری کجراب والقرآن فیه کالمسك فانه اذا قراء وصلت برکته الی تالیه وسامعیه[1] قاری کے سینہ کو مشکیزہ سے اور قرآن کو مشک سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جب وہ تلاوت کرے گا تو اس کی برکتیں قاری اور سامع دونوں کو ملیں گی۔

﴿فرقد﴾ کی شرح سندھیؒ نے غفل ونام اور قاری نے نام عن القیام وغفل عن القراءة او کنایةٌ عن ترك العمل[2] سے کی ہے۔

﴿اُوکی علی مسك﴾ مجہول ہے معنی باندھنا علامہ سندھی فرماتے ہیں والمعنی: انه ملأه مسکا وربط فمه علی المسك مشکیزہ کو مشک سے بھر کر اس کا منہ باندھ دیا اور استفادہ اور افادہ دونوں کی راہیں مسدود ہو گئیں علوم نبوت کی تحصیل کے بعد کوئی دوسرا مشغلہ اختیار کرنے والا ہی حدیث کا مصداق ہے...... حدیث ترمذی (فضائل القرآن/۲) میں آئی ہے مصنف نے اس کو حسن قرار دیا ہے پہلے راوی کو چھوڑ کر ابن ماجہ کی سند بھی وہی ہے۔

(۲۱۸/۸) حَدَّثَنَا اَبُوْمَرْوَانَ مُحَمَّدُ بْنُ عُثْمَانَ الْعُثْمَانِيُّ ثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ سَعْدٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عَامِرِ بْنِ وَاثِلَةَ أَبِيْ الطُّفَيْلِ أَنَّ نَافِعَ بْنَ عَبْدِالْحَارِثِ لَقِيَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ بِعُسْفَانَ وَكَانَ عُمَرُ اسْتَعْمَلَهُ عَلَى مَكَّةَ، فَقَالَ عُمَرُ مَنِ اسْتَخْلَفْتَ عَلَى اَهْلِ الْوَادِيْ قَالَ اسْتَخْلَفْتُ عَلَيْهِمْ ابْنَ اَبْزَى قَالَ مَنْ اِبْنُ اَبْزَى قَالَ رَجُلٌ مِنْ مَوَالِيْنَا قَالَ عُمَرُ فَاسْتَخْلَفْتَ عَلَيْهِمْ مَوْلًى؟ قَالَ اِنَّهُ قَارِئٌ لِكِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى عَالِمٌ بِالْفَرَائِضِ قَاضٍ قَالَ عُمَرُ أَمَا اِنَّ نَبِيَّكُمْ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَاماً وَيَضَعُ بِهِ اٰخَرِيْنَ.

نافع بن عبد الحارث نے عسفان میں حضرت عمرؓ سے ملاقات کی انہوں نے ان کو مکہ کا عامل بنادیا تھا حضرت عمر نے پوچھا کہ وادی والوں پر تم اپنا جانشین کس کو بنا کر آئے ہو انہوں نے

---

[1] عسفان مکہ کے قریب ایک جگہ ہے۔ [2] اہل الوادی مکہ مراد ہے۔
[3] ابن اَبزیٰ صغار صحابہ میں ہیں قبیلہ خزاعہ کے غلام تھے عہد فاروقی میں جوان ہوئے اور حضرت علی نے انہیں خراسان کا حاکم بھی بنایا۔

کہا ابن ابزیٰ کو میں نے وہاں اپنا قائم مقام بنایا ہے، فرمایا ابن ابزیٰ کون ہے؟ انہوں نے عرض کیا ہمارے آزاد کردہ غلاموں میں کے ایک صاحب ہیں حضرت عمر نے کہا کہ تم نے اہل مکہ پر ایک غلام کو مقرر کر دیا؟ نافع بولے کہ وہ اللہ کی کتاب کے قاری، فرائض کے عالم اور قضاء کی صلاحیت رکھتے ہیں حضرت عمر نے کہا کہ سنو تمہارے نبی کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ کچھ لوگوں کو بلندی عطا فرمائے گا اور اسی کے باعث دوسروں کو ذلیل کر دے گا۔

﴿انه قارئ لكتاب الله﴾ قاریٔ احادیث کی ایک مخصوص اصطلاح ہے جس کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوگا جو تلاوت وقرأت کے ساتھ تفسیر اور قرآنی علوم سے بھی آشنا ہو۔

﴿عالم بالفرائض﴾ فریضہ کی جمع ہے وہ علم جس میں وارثوں کے سہاموں کی تعیین کی جاتی ہے۔

﴿قاض﴾ علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے ای بالحق یعنی وہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں ہمارے نزدیک اس تاویل کی ضرورت نہیں عہد فاروقی میں قضاء بالحق ایک عام چیز تھی کوئی نادر امتیازی وصف نہ تھا اس لئے اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ قرآنی علوم پر عبور اور فرائض وسنت سے کما حقہٗ واقفیت کی بناء پر ابن ابزیٰ قضاء کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہیں۔

﴿قال عمرؓ﴾ علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں تقریراً لاستحقاقه الا ستخلاف ابن ابزیٰ کی جانشینی کے استحقاق کو ثابت کرنے کے لئے حضرت عمر نے یہ حدیث سنائی۔

﴿بهذا الكتاب﴾ سندھیؒ کہتے ہیں أیٰ بقراته أیٰ بالعمل به یعنی رفعت وعزت قرآن کی تلاوت اور اس کی اطاعت پر موقوف ہے، تمہارا غلام بھی انہیں لوگوں میں سے ہے۔

﴿ويضع به اخرين﴾ وضع فلان کے معنی ذلیل ورسوی کرنے کے ہیں، سندھیؒ نے لکھا ہے أي بالاعراض عنه وترك العمد بمقتضاه کہ ذلت قرآن سے اعراض اور اس کے تقاضوں پر عمل نہ کرنے کی بنا پر ہوگی اس کی پیروی کرنے والے معزز ومحترم ہوں گے خواہ وہ غلام ہی کیوں نہ ہوں اور اس سے پہلوتہی کر کے اس پر عمل نہ کرنے والے پیچھے رہ جائیں گے خواہ ان کا تعلق عرب کے سب سے ممتاز قبیلے سے ہو تاریخ اس حدیث کی تصدیق کرتی ہے کہ غلاموں نے علم وفضل میں اتنی ترقی کی کہ وہ عربوں کے معلم بن گئے عبداللہ بن

مبارک، عکرمہ، ابن ابی رباح، سعید بن مسیّب، حسن بصری، اور امام مکحول، جیسے بیشمار حضرات اسی کی مثال ہیں جن میں ایک ایک زیارت کے لئے بسا اوقات پوری خلقت امنڈ پڑتی تھی اور خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہد میں تو مکہ مکرمہ، شام، مصر، یمن، خراسان، وغیرہ، میں دینی سیادت انہیں حضرات کے ہاتھ میں آ گئی تھی......... حدیث صحیح مسلم (فضائل القرآن/۱۳) میں بھی آئی ہے اور پہلے راوی کو چھوڑ کر سند دونوں کے یکساں ہیں ابو مروان نسائی اور ابن ماجہ کی راوی ہیں حافظ نے ان کی بابت تقریب (۶۱۲۸) میں **صدوق یخطأ** کا تبصرہ کیا ہے اب شاہد کی بنا پر ابن ماجہ کی سند بھی صحیح ہے۔

(۹/۲۱۹) حَدَّثَنَا الْعَبَّاسُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ الْوَاسِطِيُّ ، ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ غَالِبِ الْعَبَّادَانِيُّ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زِيَادِ الْبَحْرَانِيِّ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ زَيْدٍ، عَنْ سَعِيْدِ بنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ أَبِيْ ذَرٍّ، قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : "يَا أَبَا ذَرٍّ! لَأَنْ تَغْدُوَ فَتَعَلَّمَ آيَةً مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ، خَيْرٌ لَكَ مِنْ أَنْ تُصَلِّي مِائَةَ رَكْعَةٍ ، وَلَأَنْ تَغْدُوَ فَتَعَلَّمَ بَابًا مِنَ الْعِلْمِ عُمِلَ بِهِ اَوْلَمْ يُعْمَلْ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تُصَلِّي أَلْفَ رَكْعَةٍ"

مجھ سے فرمایا: اے ابوذر تم صبح کو نکل کر قرآن کی ایک آیت سیکھو یہ اس سے یقیناً بہتر ہے کہ تم سو رکعت نماز پڑھو اسی طرح صبح جا کر علم کا ایک حصہ حاصل کر لو خواہ اس پر عمل کیا جائے یا نہ کیا جائے یہ یقیناً اس سے بہتر ہے کہ تم ایک ہزار رکعت ادا کرو۔

﴿**لأن تغدو**﴾ قرآن کی آیت **وأن تصوموا خير لكم** کی طرح مصدر ہو کر متبداء ہے **فتعلم** کا **تغدو** پر عطف ہے اور **خیر** الخ خبر ہے۔

﴿**مائة ركعة**﴾ علامہ سندھی نے ای نافلة کی وضاحت کی ہے۔

﴿**عمل به اولم يعمل به**﴾ یہ الفاظ بادی النظر میں ایک کھٹک پیدا کرتے ہیں اور روایت کے کمزور ہونے کی ایک داخلی شہادت بھی ہے لیکن علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں ای **سواء كان علما متعلقاً بكيفية العمل كالفقه اولا، بأن يكون متعلقا بالاعتقاد مثلا وليس المراد أن يكون علما لا ينتفع به سواه** یہ علم فقہ کی طرح عمل کی کیفیت سے متعلق ہو یا عمل کے بجائے اس کا تعلق محض عقیدے سے ہو یہاں علم غیر نافع مراد نہیں ہے۔

علامہ سندھیؒ نے منذری کے حوالے سے سند کو حسن قرار دیا ہے لیکن یہ رائے محل نظر ہے عبادانی ایک راوی کو حافظ نے تقریب التہذیب (۳۵۲۷) میں مستور اور بحرانی کو (۳۴۲۸) مستور اور علی بن زید بن جدعان کو (۴۷۳۴) ضعیف قرار دیا ہے اس لئے بوصیری نے **هذا اسناد ضعيف لضعف علي بن زيد وعبدالله بن زياد** کا فیصلہ کیا ہے جب کہ ناصر الدین البانیؒ نے بھی ضعیف لابن ماجہ ۱/۱۶ میں اس کے ضعیف ہونے کا فیصلہ کیا ہے پھر داخلی شہادت بھی ضعف کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ قرآن کے علم پر تو سو رکعتوں سے زیادہ ثواب نہیں ہے جب کہ مجمل علم پر یہ اجر ایک ہزار رکعت سے اوپر پہنچتا ہے۔

بَابُ فَضْلِ الْعُلَمَاءِ والحَثِّ عَلَى طَلَبِ الْعِلْمِ

اس باب میں امام ابن ماجہ نے علماء کے فضائل بیان کئے ہیں یعنی اللہ کا ان کے ساتھ مخصوص فضل، رحمت وسکینہ کا نزول، فرشتوں کا ان کے پاس آکر اپنے پروں کو بچھا دینا، سمندر کی مچھلیاں کا دعا کرنا اور ان کے لئے جنت کا راستہ ہموار کر دینا اللہ کے وہ انعامات ہیں جن سے ہر شخص میں علم کی طلب اور اس کے حصول کا شوق پیدا ہوتا ہے امام نے اسی مقصد کے لئے یہ باب قائم کیا ہے۔

(۲۲۰/۱) **حَدَّثَنَا بَكْرُ بْنُ خَلَفٍ، اَبُوْبِشْرٍ، ثَنَا عَبْدُ الْأَعْلَى، عَنْ مَعْمَرٍ، عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: " مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ"**

اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے فقہ فی الدین سے نوازتا ہے۔

﴿**من يرد الله به خيراً**﴾ جملہ ہو کر شرط ہے ملا علی قاری اور سندھی کے نزدیک خیر کو نکرہ تعظیم کے لئے لایا گیا ہے یعنی خیر کثیر جو فقہ کے علاوہ دوسرے دینی شعبوں میں بھی پائی جاتی ہے۔

﴿**يفقهه في الدين**﴾ شرط کی جزاء ہے فقہ کے معنی سمجھداری بصیرت اور رسوخ کے ہیں چنانچہ حسن بصری نے فقیہ کی تعریف **الزاهد في الدنيا الراغب في الآخرة البصير**

لأمر دينه المداوم على عبادة ربه[۱] سے کی ہے اور یہی بات دوسرے الفاظ میں العلم الذی یورث الخشی فی القلب ویظهر أثره علی الجوارح ویترتب علیه الانظار علامہ سندھی نے کہی ہے یعنی فقہ اس چیز کا نام ہے جو دل میں اللہ کا ایسا خوف پیدا کردے کہ پورے بدن پر اس کے اثرات کھلی آنکھوں دکھائی دیں اور بندے کی تمام تر توجہ دنیا سے ہٹ کر عبادت وآخرت کی طرف ہو جائے۔

یہ فقہ کا عمومی مفہوم تھا ایک مفہوم اس کا اصطلاحی بھی ہے اور وہ ہے منصوص احکام کی درجہ بندی اور قرآن وسنت کی روشنی میں غیر منصوص کے حکم کو دریافت کرنا یہاں تفعیل کے مصدر میں دونوں مفہوم بیک وقت مراد ہیں چنانچہ ملا علی قاری نے اس کے معنی یجعله عالماً بتلائے ہیں امام نوویؒ نے لکھا ہے فيه فضيلة العلم والفقه فی الدين والحث عليه وسببه أنه قائد الى تقوى الله تعالىٰ[۲] حدیث میں علم وفقہ کی فضیلت اور ان کے حصول کی ترغیب ہے کیونکہ یہی چیز تقوے کی طرف رہنمائی کرتی ہے پھر طبیعت خود بخود لغزش سے دور اور صواب سے قریب تر ہو جاتی ہے اہل نظر کے نزدیک یہ مقام فقیہ النفس کا ہیں.......... حدیث صحیح بخاری (علم/۱۳، اعتصام/۱۱) صحیح مسلم) (زکوۃ/۲۳) اور ترمذی (علم/۱) میں بھی آئی ہے ابن ماجہ کی سند کی بابت بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے هذا اسناد ظاهره الصَّحَّةُ لكن اختلف فيه على الزهری لیکن متن کے ثبوت میں کوئی شبہ نہیں۔

(۲۲۱/۲) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ ثَنَا الْوَلِيْدُ بْنُ مُسْلِمٍ حَدَّثَنَا مَرْوَانُ بْنُ جَنَاحٍ، عَنْ يُوْنُسَ بْنِ مَيْسَرَةَ بْنِ حَلْبَسٍ، أَنَّهُ حَدَّثَهُ ، قَالَ: سَمِعْتُ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ يُحَدِّثُ، عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: "اَلْخَيْرُ عَادَةٌ، وَالشَّرُّ لَجَاجَةٌ، وَمَنْ يُرِدِ اللّٰهَ بِهِ خَيْرا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ"

عادت کے معنی فطرت کے ہیں اور لجاجت سخت جھگڑا کرنے کو کہتے ہیں علامہ سندھی نے لکھا ہے والمراد أن الخير موافق للعقل السليم یعنی حق اور نیکی عقل وفطرت کے مطابق ہے اس لئے اس پر فوراً شرح صدر ہو جاتا ہے جب کہ باطل اور ہر برائی سندھی کے

---

[۱] مرقاۃ المفاتیح ۱/۲۶۷ [۲] مسلم ۱/۳۳۳

الفاظ میں فلایدخل فی قلبه الاّ بلجاجة الشیطان والنفس الأثارة وہ شیطان ونفس کے زور ہی سے بندے کے دل میں داخل ہو جاتی ہے اور اسے تردد وانقباض میں مبتلا کر دیتی ہے مطلب یہ ہوا کہ عهد الست میں انسان کی فطرت میں ایمان وعبدیت کا جو بیج ڈالا گیا تھا جس کو قرآن فطرة الله التی فطر الناس علیها اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کل مولود یولد علی الفطرة سے تعبیر کیا ہے وہ اپنا اثر رکھتا ہے اور کفر وشرک کا دباؤ کم ہوتے ہی انسانی فطرت بول اٹھتی ہے اور بندہ ایمان کی طرف کھینچا چلا آتا ہے مختصر یہ کہ حق ونیکی فطری اور گناہ وباطل غیر فطری ہے بوصیری کے نزدیک حدیث کی سند تقریباً درست ہے۔

(۲۲۲/۳) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ، ثَنَا الْوَلِیْدُ بْنُ مُسْلِمٍ، ثَنَا رَوْحُ بْنُ جَنَاحٍ، اَبُوْسَعْدٍ عَنْ مُجَاهِدٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "فَقِیْهٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَی الشَّیْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ"

شیطان کے لئے ایک فقیہ ایک ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔

اس حدیث کے ذیل میں ملا علی قاری اور مولانا ادریس کاندھلویؒ نے امام طیبی کا یہ قول نقل کیا ہے إِنَّ الشیطانَ کُلما فَتَحَ باباً علی الناسِ مِنَ الاهوَاءِ زَیَّنَ الشَهَواتِ فی قُلوبِهِم یُبَیِّنُ الفقیهُ العارفُ مَکائدَهُ فَیَسُدُّ ذلك البابَ وَیجعلُه خَائباً خاسراً بِخِلافِ العَابدِ فانه رُبماَ یَشتَغِلُ فی العبادةِ وهو فی حَبائلِ الشیطَانِ وَلا یَدرِی.

شیطان جب بھی مسلمانوں میں خواہشات کا دروازہ کھول کر قلوب میں لذت وشہوت کی محبت پیدا کرنا چاہتا ہے تو علم وفضل کی بناء پر وہ فقیہ اس کے فریب کو آشکارا کر کے اس باب کو بند کر دیتا ہے نتیجہ وہ خائب وخاسر ہو کر رہ جاتا ہے اس کے برخلاف عابد عبادت میں اشتغال کے باوجود کبھی کبھی شیطان کے پھندوں میں جکڑا ہوتا ہے اور اسے اپنی گمراہی کا خود بھی احساس نہیں ہوتا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ اگر یہاں الفقیه الذی رزق الفهم فی الدین والتفطر لمدارکها مراد ہے تو وہ تمام مکر وفریب اور شیطانی وسوسوں کو اچھی طرح جانتا ہے اس لئے شکار نہیں ہو سکتا اور اگر یہاں فقیہ سے العالم بأحکام الدین وتفاصیلها مراد ہے تو وہ یحذر عن المواقع المحرمة فلا یستخفها ولا یستحلها فلا یقع فی

ورطة الكفر جب کہ عابد کو ان دونوں میں کوئی درجہ حاصل نہیں[1]۔ علامہ سندھیؒ لکھتے ہیں وذلك ان غاية همة العابد ان يخلص نفسه من مكائد الشيطان وقد لا يقدر عليه فيدركه الشيطان من حيث لا يدرى بخلاف الفقيه فقد يخلص الله تعالىٰ على يديه من مكائد الشيطان شیطان کا اصل ہتھیار وساوس اور قلبی تصرفات ہیں ان میں کون سا الہام ربانی ہے اور کون سا شیطانی یہ فرق کتاب وسنت میں راسخ ایک عالم ہی جانتا ہے جہلاء کو اس سے کوئی واقفیت نہیں اس لئے وہ بسا اوقات عبادت وریاضت کی کثرت کے باوجود شیطان کا لقمہ بن جاتے ہیں اور انہیں اس کا شعور بھی نہیں ہوتا خصوصاً مرجع بننے کے بعد عُبّاد وسالکین کو یہ صورت زیادہ پیش آتی ہے چنانچہ جس تحریک ومعاشرہ پر علماء کی گرفت ہوگی وہ تو اجتماعی گمراہی سے محفوظ رہے گا لیکن اگر اس کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں آجائے جو علم کے بجائے عبادت کی راہ سے اوپر آئے ہیں تو اس کی پٹڑی کا بدلنا یقینی ہے ماضی کی طرح دور حاضر میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔

حدیث کو امام ترمذی نے اپنی جامع میں (علم/ ۲۰) نقل کر کے لکھا ہے هذا حديث غريب ولا نعرفه الامن هذا الوجه من حديث الوليد بن مسلم جب کہ ابن ماجہ کی سند کو ناصر الدین البانی نے ضعیف ابن ماجہ/ ۱۶ میں موضوع قرار دیا ہے اسی طرح طبرانی نے سنده ضعيف وله شواهد اسانيد ها ضعيفة کہا ہے لیکن ملا علی قاری فرماتے ہیں لكن كثرة طرقه تخرجه عن الضعف خصوصاً طرق کی کثرت سے ضعف کا ازالہ ہوجاتا ہے اس لئے روایت ان کے نزدیک حسن قرار پائی۔

(۲۲۳/۴) حَدَّثَنَا نَصْرُ بْنُ عَلِيِّ الْجَهْضَمِيُّ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ دَاوُدَ عَنْ عَاصِمِ بْنِ رَجَاءِ بْنِ حَيَاةٍ عَنْ دَاوُدَ بْنِ جَمِيلٍ عَنْ كَثِيرِ بْنِ قَيْسٍ ، قَالَ ! كُنْتُ جَالِسًا عِنْدَ اَبِي الدَّرْدَاءِ فِيْ مَسْجِدِ دِمَشْقَ فَأَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ : يَا أَبَا الدَّرْدَاءِ ! اَتَيْتُكَ مِنَ الْمَدِيْنَهِ مَدِيْنَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لِحَدِيْثٍ بَلَغَنِي اَنَّكَ تُحَدِّثُ بِهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ فَمَا جَاءَ بِكَ تِجَارَةٌ؟ قَالَ لَا قَالَ وَلَا

[1] مرقاۃ المفاتیح ۱/ ۲۷۸

جَاءَ بِكَ غَيْرُهُ؟ قَالَ: لَا قَالَ: فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ طَرِيْقًا اِلَى الْجَنَّةِ اِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَتَضَعُ اَجْنِحَتَهَا رِضًا لِطَالِبِ الْعِلْمِ وَاِنَّ طَالِبَ الْعِلْمِ يَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ حَتَّى الْحِيْتَانِ فِي الْمَاءِ وَاِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ عَلَى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ اِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَاراً وَلَا دِرْهَمًا اِنَّمَا وَرَّثُوْا الْعِلْمَ فَمَنْ أَخَذَهُ اَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ.

کثیر بن قیس سے روایت ہے کہ میں ابودرداء کے پاس دمشق کی مسجد میں بیٹھا تھا ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہا اے ابودرداء میں تمہارے پاس مدینہ منورہ یعنی مدینۃ الرسول ﷺ سے آیا ہوں محض اس حدیث کے لئے جس کی بابت مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ اسے رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں انہوں نے فرمایا تجھے تجارت تو لے کر نہیں آئی ؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا اور کوئی غرض تو لے کر نہیں آئی اس نے کہا نہیں ابودرداء نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص علم کی تلاش میں کوئی راہ لے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرما دیتے ہیں فرشتے طالب علم کی خوشنودی کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں اور زمین و آسمان کی تمام مخلوق حتی کہ سمندر کی مچھلیاں تک اس کے لئے مغفرت کی دعا کرتی ہیں عالم کی فضیلت عابد پر ایسے ہی ہے جیسا کہ چاند کو ستاروں پر فوقیت حاصل ہے علماء انبیا کے وارث ہیں اور انبیاء دینار و درہم کا وارث نہیں بناتے وہ تو بس علم کا وارث بناتے ہیں تو جس نے اس کو حاصل کیا اس نے گویا بہت بڑی دولت حاصل کر لی۔

﴿فجاء رجل﴾ یہاں ملا علی قاری نے من طلبة العلم اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے لم أقف علی تسمیته کی صراحت کی یعنی نام معلوم نہیں۔

﴿لحدیث بلغنی انك تحدثه﴾ ملا علی قاری نے یہاں دو احتمال ظاہر کئے ہیں۔

(۱) یحتمل ان یکون سمعه احتمالاً یا تو اس نے روایت معنی سن رکھی تھی (۲) ویحتمل ان یکون سمع الحدیث لکن أراد ان یسمعه بلا واسطة لا فادة العلم

وزیادة یقین او لعلوا لاسنام فانه من الدین[1] یا حدیث تو اس نے سن رکھی تھی لیکن مزید یقین اور افادے کے لئے اسے براہ راست سننا چاہا، یا اس کا مقصد عالی سند تھی چونکہ وہ بھی دین میں مطلوب ہے۔

﴿فما جاء بك تجارة﴾ سنن ابی داؤد میں ماجئت لحاجة منقول ہے حضرت نے پہلے صحت نیت اور اس کے اخلاص کا امتحان لیا پھر مطمئن ہو کر حدیث بالا سنائی۔

﴿فانی سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم﴾ علامہ سندھی نے لکھا یحتمل أن هذا الحدیث هو الحدیث المطلوب للرجل اوغیره ذکره مبشراً له وترغیباً فی مثل مافعل یا تو یہ وہی حدیث ہے جس کے لئے اس شخص نے سفر کیا یا اس سے الگ کوئی دوسری حدیث ہے جسے حضرت نے اسے خوشخبری دینے کے لئے ذکر کیا تاکہ اس کے اس عمل یعنی سفر کی حوصلہ افزائی کی جاسکے ملا علی قاری فرماتے والاول اغرب والثانی أقرب پہلا احتمال بعید اور دوسرا راجح ہے یعنی الگ کوئی دوسری حدیث ہے علامہ طیبی حضرت گنگوہی، مولانا سہارنپوری اور مولانا ادریس کاندھلوی سے بھی یہی منقول ہے۔

﴿من سلك طریقاً یلتمس فیه علماً﴾ خط کشیدہ الفاظ ماقبل کا حال ہیں طیبی نے لکھا ہے کہ یہاں وطن کو چھوڑ کر ملک ملک گھومنا مراد ہے پھر ان کے تحت مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے من القرآن والسنة کی وضاحت کی ہے طیبی فرماتے ہیں وأی علم کان من علوم الدین قلیلا او کثیرا رفیعا اوغیر رفیع[2] دینی علوم میں کوئی سا علم ہو کہ ہو ابتدائی ہو یا نہائی سب پر یہی ثواب ہے اور یلتمس میں طالب کے اخلاص کی طرف اشارہ ہے۔

﴿سهل الله له طریقا الی الجنة﴾ ابوداؤد اور ترمذی کی روایت میں سلك الله به طریقا من طرق الجنة آیا ہے یہ ماقبل کی جزا ہے علامہ سندھی فرماتے ہیں هوا ماکنایة عن التوفیق للخیرات فی الدنیا اوعن ادخال الجنة بلا تعب فی الآخرة یا تو دنیا میں یہ نیکیوں کی توفیق کا ارشارہ ہے یا اس کا مطلب آخرت میں بغیر حساب کتاب جنت میں داخل کرنا ہے۔

[1] مرقاة المفاتیح ۲۷۹/۱ [2] بذل المجهود کتاب العلم

﴿وان الملائكة لتضع اجنحتها﴾ خطابی نے اس کے کئی مفہوم نقل کئے ہیں (۱) ان يكون وضعها الأجنحة بمعنى التواضع والخشوع تعظيما لحقه وتوقيراً لعلمه علم کی توقیراور طالب علم کی تعظیم کے لئے یہاں وضع سے مراد احترام اور خودسپردگی ہے قرآن میں واخفض لهما جناح الذل اسی کی مثال ہے یعنی فرشتے ان سے محبت وعقیدت رکھتے ہیں۔

(۲) وضع الجناح معناه عن الطيران للنزول عنده پروں کو بچھانے کا مطلب طالب علم کے پاس آسمان سے اڑکر آنا ہے جیسا کہ ذکر وتلاوت کرنے والوں کی بابت صحیح مسلم کی حدیث میں آتا ہے۔

نزلت عليهم السكينة وغشيتهم الرحمة وحفتهم الملئكة اس صورت میں مجاز کے بجائے حقیقی معنی مراد ہیں۔

(۳) بسط الجناح وفرشها لطالب العلم ليحمله عليها فيبلغه حيث يعمده ويقصدهٔ من البقاع فى طلبه ومعناه المعونة والتيسير والسعى له فى طلب العلم پروں کو پھیلانا اور طلبہ کیلئے بچھانا تا کہ غیر حسی طور پر اسے منزل مقصود تک پہنچائیں اس صورت میں معنی طالب علم کی نصرت اور طلب علم میں اس کی کوششوں کو کامیاب بنانا ہے۔

شارحین نے یہی توجیہات نقل کی ہیں اور ملا علی قاری نے ابن القیم اور طبرانی کے حوالے سے ایسے دو واقعے بھی نقل کئے ہیں جس میں وضع الجناح پر طنز کرنے والوں کے عبرتناک انجام کا تذکرہ ہے۔

﴿رضى لطالب العلم﴾ علامہ سندھیؒ نے یہاں مفعول لہ کے قول کو ترجیح دی ہے یعنی طالب علم کی خوشنودی کے لئے فرشتے ایسا کرتے ہیں۔

﴿يستغفر له من فى السماء والارض﴾ علامہ طیبی نے لکھا ہے هو مجاز من ارادة استقامة حال المستغفر له کہ مجازا یہاں استغفار کے معنی طالب علم کے حالات کی درستگی کے لئے دعاء کرنا ہے تا کہ اسے توفیق ملتی ہے رہے لیکن ملا علی قاری نے مجاز کے بجائے یہاں حقیقت کو اولیٰ قرار دیا ہے جس کا مطلب علامہ سندھی نے اذا لحقه ذنب لکھا ہے یعنی

اگر وہ کوئی گناہ کر لیتے ہیں تو پوری کائنات ان کے لئے استغفار کرتی ہے۔

﴿حتی الحیتان فی الماء﴾ مذکورہ عبارت بری مخلوق پر دلالت کرتی تھی اس لئے اس جملے کا اضافہ کیا گیا ہے اور دعاء کا دائرہ سمندر تک پہنچ گیا حیتان حوت کی جمع ہے جس کے معنی مچھلی کے ہیں لیکن یہاں اس سے تمام بحری مخلوق مراد ہیں۔

﴿وان فضل العالم علی العابد﴾ عالم سے مراد ملا علی قاری نے الغالب علیه العلم وهو الذی یقوم بنشر العلم بعد أداءه مع توجه الیه من الفرائض والسنن المؤکدة[1] لکھتے ہیں جس پر علم غالب ہو اور فرائض وسنن کی ادائیگی کے ساتھ وہ اس کی اشاعت بھی کرتا ہو۔

جب کہ عابد کی تعریف قاری نے یہ کی ہے الغالب علیه العبادة وهو الذی یصرف اوقاته بالنوافل مع کونه عالما بما تصح به العبادة جس پر عبادت کا غلبہ ہو اور اپنے اوقات کو نوافل میں صرف کرتا ہو نیز عبادت کی صحت کے بقدر اس کے پاس علم بھی ہو۔

﴿کفضل القمر علی سائر الکواکب﴾ سنن ابی داؤد میں لیلة البدر بھی منقول ہے علامہ سندھی نے لکھا ہے فان کمال العلم کمال یتعدی آثاره الی الغیر وکمال العباده کمال غیر متعد آثاره فتشابه الاول بنور القمر والثانی بنور سائر الکواکب یہاں عالم کو چاند سے اور عابد کو ستارے سے تشبیہ دی گئی کیونکہ عالم کا نور چاند کی طرح دوسروں کو بھی روشنی دیتا ہے جب کہ عابد کی عبادت سے دوسروں کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا۔

﴿ورثة الأنبیاء﴾ ابن الملک کے حوالے سے ملا علی قاری نے لکھا ہے لم یقل ورثة الرسل یشمل الکل علم وفضل کے لحاظ سے سارے علماء اعلی درجے کے نہیں ہوتے اس لئے سب کو شامل کرنے کے لئے انبیاء کا وارث کہا گیا ملا علی قاری توجیہ فرماتے ہیں فان البعض ورثة الرسل کاصحاب المذاهب والباقون ورثة الانبیاء علی اختلاف مراتبهم ائمہ اربعہ کی طرف بعض علماء تو رسولوں کے وارث ہیں جب کہ دوسرے اپنے مختلف مراتب کے لحاظ سے انبیاء کے وارث ہیں رسول صاحب شریعت وکتاب ہوتا ہے اور نبی کسی

---

[1] مرقاة المفاتیح ۱/۲۷۹، ۲۸۰

پہلے رسول کی شریعت کی طرف بلاتا ہے اس لئے معدودے چندتو شریعت کے ترجمان وراز داں ہوں گے جب کہ علماء کی اکثریت انبیاء کی طرح تجدید وعمل کی دعوت دے گی۔

﴿لم یورثوا دینارا و لا درهما﴾ معنی وارث بنانا۔

﴿انما ورثوا العلم﴾ ان کی دولت تو علم ہے جو وحی کے ذریعے انہیں عطا ہوئی ہے اسی کی نشر واشاعت کے لئے وہ دنیا میں مبعوث ہوئے ہیں اور مال سے ان کا تعلق بس بقدر ضرورت ہی ہوا کرتا ہے دینار و درہم تمام متاع دنیا کو شامل ہے۔

﴿بحظ وافر﴾ جس کے حصے میں علوم نبوت آ گئے اس نے تو گویا اپنا حصہ پورا وصول کرلیا اور اسے کائنات کی سب سے عظیم دولت مل گئی ملاعلی قاری نے لکھا ہے کہ جو عالم مال کا حریص ہے وہ انبیاء کا وارث نہیں...... حدیث ابوداؤد (علم/۱) میں بھی آئی ہے اور امام ترمذی نے بھی اسے جامع (علم/۲۰) میں نقل کر کے ابوداؤد وابن ماجہ کو سند کو اپنی سند سے عمدہ قرار دیا ہے حافظ ابن حجر نے عاصم بن رجاء کو صدوق یھم (۳۰۵۸) دواؤد بن جمیل کو ضعیف (۱۷۷۸) اور کثیر ابن قیس کو ضعیف (۵۶۲۴) قرار دیا ہے اسلئے سند کمزور ہے۔

(۲۲۴/۵) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ، ثَنَا حَفْصُ بْنُ سُلَيْمَانَ ثَنَا كَثِيْرُ بْنُ شِنْظِيْرٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيْرِيْنَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ وَوَاضِعُ الْعِلْمِ عِنْدَ غَيْرِ أَهْلِهِ كَمُقَلِّدِ الْخَنَازِيْرِ الْجَوْهَرَ، وَاللُّؤْلُؤَ وَالذَّهَبَ"

علم حاصل کرنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے اور نالائق کو علم دینے والا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص خنزیروں کو جواہرات موتیوں اور سونے کے ہار ڈالے۔

یہاں مطلق علم کی فرضیت مراد ہے یا اس کی کوئی محدود مقدار ہے شارحین حدیث نے دوسرے کو ترجیح دی ہے اور ملاعلی قاری نے مرقاۃ المفاتیح میں اور علامہ سندھیؒ نے سنن مصطفیٰ میں اس ضمن کے مندرجہ ذیل اقوال جمع کئے ہیں۔

(۱) هو علم الاخلاص: معرفة افات النفس وما يفسد الأعمال لأن الاخلاص ما مور به فصار علمه فرضا اخر یہاں علم اخلاص، نفسانی بیماریوں کی

معرفت اور اعمال صالحہ کوتلپٹ کر دینے والی چیزوں کی واقفیت مراد ہے کیونکہ اخلاص مطلوب ہے اس لئے وہ فرض ہو گیا۔

(۲) معرفة الخواطر وتفصيلها فريضة لأن الخواطر هي منشأ الفعل ولذلك يعلم الفرق بين لمة الشيطان ولمة الملك قلبی خیالات اور واردات کی معرفت اور ان کا تجزیہ مراد ہے کیونکہ خیالات ہی فعل کی بنیاد ہوتے ہیں تو اس طرح بندہ الہام ربانی اور القاء شیطانی کے فرق کو سمجھ سکے گا۔

(۳) هو طلب علم الحلال حيث كان اكل الحلال واجبا حلال کی واقفیت مراد ہے کیونکہ اکل حلال مومن پر فرض ہے۔

(۴) علم البيع والشراء والنكاح اذا أرا دالدخول في شئ منها خرید وفروخت اور نکاح وغیرہ جیسی جس چیز کو بھی انجام دے اس کا شرعی علم مراد ہے۔

(۵) هو علم الفرائض الخمس الذى بنى عليه الاسلام ارکانِ خمسہ (توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج) کا علم مراد ہے جو اسلام کی بنیادیں ہیں۔

(۶) هو طلب علم التوحيد بالنظر والاستدلال والنقل ، عقل ونقل اور استدلال کے ساتھ توحید کا علم مراد ہے۔

(۷) هو طلب علم الباطن وهو ما يزداد به العبد يقيناً وهو الذى يكتسب بصحبة الصالحين والزهاد المقربين سلوک وطریقت کا علم مراد ہے بندے کے یقین میں اس سے اضافہ ہوتا ہے اور وہ صلحاء اور زاہدوں کی صحبت میں ملتا ہے کیونکہ وہی علوم نبوت کے وارث ہیں۔

(۸) فاضل بیضاوی کا کہنا ہے کہ یہاں وہ علم مراد ہے جو فرض عین ہے اور جس کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔

(۹) علامہ بغوی نے علم کی دو قسمیں کی ہیں اصول اور فروع پہلے کے تحت توحید باری، تصدیق انبیاء اور ضروریات دین آتی ہیں جن کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے جب کہ فروع میں دینی احکام ومسائل داخل ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں (۱) فرضِ عین، طہارت، نجاست،

عبادات اور روزمرہ کی دینی ضروریات اسی کی ذیل میں آتی ہیں حدیث باب کا اشارہ بھی ان ہی کی طرف ہے (۲) فرض کفایہ، ایسے علم کو کہتے ہیں جس کے حصول سے انسان اجتہاد وافتاء کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے اور ایک آدمی کے حاصل کرنے سے وہ پورے شہر سے ساقط ہو جاتا ہے ہمارے نزدیک یہی قول راجح ہے اور ملا علی قاری نے بھی مفروض فرض عین کہہ کر اسی کو ترجیح دی ہے۔

﴿علیٰ کل مسلم﴾ علامہ سندھیؒ نے لکھا کہ أی مکلف لیخرج غیر مکلف من الصبی والمجنون وموضوعه الشخص فیشمل الذکر والأنثیٰ، یعنی مسلم سے مراد بالغ عاقل شخص ہے پاگل اور بچہ اس میں داخل نہیں، اور مسلم کا لفظ مرد عورت دونوں کو شامل ہے بعض لوگ یہاں ومسلمة کی زیادتی نقل کرتے ہیں جو ثابت نہیں ہے حافظ سخاوی نے المقاصدا لحسنة میں لکھا ہے کہ اس کا تذکرہ کسی بھی سند میں نہیں ملتا۔

﴿وواضع العلم الخ﴾ ملا علی قاری نے لکھا ہے بأن یحدثه من لا یفهمه اومن یرید منهم غرضاً دنیویا اومن لم یتعلمه للّٰہ[1] یعنی اس شخص کو حدیث سنائی جائے جو سمجھنے پر قادر نہیں یا تعلّم سے اس کا مقصد دنیا ہے یا وہ غیر اللہ کیلئے علم حاصل کر رہا ہے تو اس پر اس وعید کا اطلاق ہوگا ایسے لوگوں کا تذکرہ باب الانتفاع بالعلم کی حدیثوں میں آیا ہے تو جس طرح زر و جواہر سے لدنے کے باوجود خنزیر کی خست ودنائت میں کوئی کمی نہیں آتی اسی طرح نالائق و بے قدرے کو پڑھانا علم کی سخت توہین ہے یہاں لمحہ فکریہ ہے ان حضرات کے لئے جو ایسے نا اہلوں کو پڑھانے میں پوری زندگی صرف کر دیتے ہیں اسی طرح ان طلبہ کیلئے بھی بڑے ڈرنے کی بات ہے جو غفلت بے دینی اور ناقدری کی وجہ سے اس حدیث کا مصداق بن جاتے ہیں۔

سند کی تحقیق

سند کے راوی حفص بن سلیمان کو حافظ نے تقریب (۱۴۰۵) میں متروك الحدیث مع امامته فی القراءة اور کثیر بن شنظیر کو (۵۶۱۴) صدوق یخطی قرار دیا ہے اس لئے

---

[1] مرقاۃ المفاتیح ۱/۲۸۴

بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے اسنادہٗ ضعیف لضعف حفص بن سلیمان بیہقی نے بھی شعب الایمان میں ھذا حدیث متنه مشهور واسناده وقدروی من اوجه کلها ضعیف کی صراحت کی ہے لیکن جمال الدین مزی کا کہنا ہے روی من طرق تبلغ رتبة الحسن یہ طرق ۵۰ ہیں جنہیں انہوں نے ایک رسالہ میں جمع کیا ہے اس تفصیل کے پیش نظر امام نووی نے اسے سنداً ضعیف اور متناً صحیح قرار دیا ہے اور یہ واقعتاً بڑا محققانہ فیصلہ ہے۔

(۲۲۵/۶) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ اَبِیْ شَيْبَةَ وَعَلِیُّ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَا حَدَّثَنَا اَبُوْمُعَاوِيَةَ عَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ أَبِیْ صَالِحٍ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِماً سَتَرَهُ اللّٰهُ فِی الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَ مَنْ يَسَّرَ عَلٰی مُعْسِرٍ يَسَّرَاللّٰهُ عَلَيْهِ فِی الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللّٰهُ فِی عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِی عَوْنِ اَخِيْهِ وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقاً يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْماً سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ بِهٖ طَرِيْقاً اِلَی الْجَنَّةِ وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِی بَيْتٍ مِنْ بُيُوْتِ اللّٰهِ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَيَتَدَارَسُوْنَهٗ بَيْنَهُمْ اِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهٗ وَمَنْ أَبْطَأَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی مسلمان کی دنیا کی پریشانیوں میں سے کوئی پریشانی دور کردے تو باری تعالیٰ قیامت کی تکلیفوں میں سے اسے کسی تکلیف سے نجات دیں گے اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اسکی پردہ پوشی فرمائیں گے جو تنگ دست کو سہولت دے گا اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ فرمائیں گے اللہ تعالیٰ بندہ کی مدد فرماتے ہیں جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد کرے جس نے علم کی طلب میں سفر کیا مولا نے اس کے لئے جنت کی راہ ہموار کردی اللہ کے کسی گھر میں جیسے ہی کچھ لوگ قرآن کی تلاوت اور باہم علمی مذاکرہ کے لئے جمع ہوتے ہیں فرشتے فوراً انہیں گھیر لیتے ہیں ان پر سکینہ اترتا ہے، رحمت اپنے آغوش میں لے شخص کے لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے مقرب فرشتوں میں ان کا

تذکرہ کرتے ہیں جس شخص کے عمل نے اس کو پیچھے کردیا اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکتا۔

﴿من نَفَّسَ ...... یوم القیامة﴾ تنفیس معنی مہلت دینا عنه حزناً کسی سے غم دور کردینا کربة کے معنی رنج، مشقت، درد اور تکلیف کے ہیں ملا علی قاری نے لکھا ہے ای مؤمن ولو کان فاسقاً مراعاة لا یمانه[1] ہر ایمان والے کی تکلیف کو دور کرنے پر یہ ثواب ہے خواہ وہ فاسق ہی کیوں نہ ہو امام نوویؒ فرماتے ہے وفیه فضل قضاء حوائج المسلمین ونفعهم بما یتیسیر من علم اومال اومعاونته اواشارته بمصلحة اونصحته[2] حدیث میں مسلمانوں کی ضرورت کو پورا کرنے کی فضیلت ہے نیز انہیں اپنے تجربہ، دولت، اعانت خیر خواہی اور دوسرے کے فائدہ کی نشاندہی کرنے کی تعلیم ملتی ہے۔

﴿ومن ستر مسلما﴾ ملا علی قاری نے لکھا ہے ای فی قبیح یفعله فلا یفضحه او کساه ثوباً[3] کوئی گناہ کرتے دیکھے تو رسوا نہ کرے، یا ننگے کو کپڑا پہنا دے پہلا مفہوم مجاز اور دوسرا حقیقت ہے جس کو سندھیؒ نے ای بثوب اوبترك التعرض لکشف حاله بعد أن رءاه یرتکب ذنباً سے تعبیر کیا ہے جس میں اس کی غیبت سے اجتناب اور کمزوریوں کی تاویل وتوجیہ بھی شامل ہے۔

﴿ومن یَسَّرَ علی معسر﴾ علامہ سندھی فرماتے ہیں مدیون فقیر بالتجاوز عن الدین کلا او بعضاً اوبتا خیر المطالبة عن وقته یعنی تنگ دست قرض دار کا سب یا تھوڑا قرضہ معاف کردینا اس کی شکلیں ہیں۔

﴿فی عون اخیه﴾ سندھی نے لکھا ہے بأی وجه کان من جلب نفع اودفع ضر سَهّل له به یہ مدد کسی بھی طرح کی ہو خواہ اسے کوئی نفع پہنچایا جائے یا راحت رسانی کے لئے اس کی مشقت کو دور کردیا جائے۔

﴿ومن سلك طریقا یلتمس فیه علماً﴾ امام نووی فرماتے ہیں والمراد العلم الشرعی بشرط أن یقصد به وجه اللّٰه[4] یہ گرچہ ہر عبارت میں شرط ہے لیکن نووی کی

---

[1] مرقاة المفاتیح ۱/۲
[2] شرح مسلم ۲/۳۴۵
[3] مرقاة ۱/۲۷۰
[4] مسلم ۲/۳۴۵

تصریح کے مطابق یہاں علماء اس کا خصوصاً تذکرہ کرتے ہیں کیونکہ مسلمانوں اور خصوصاً نوعمر طلبہ میں اس کی بابت غفلت وتساہل پایا جاتا ہے اس جملہ کی تفسیر گذر چکی ہے۔

﴿فی بیت من بیوت اللّٰہ﴾ طیبی فرماتے ہیں شامل لجمیع ما یبنی للّٰہ تقربا الیہ من المساجد والمدارس والربط[1] اس میں اللہ کی عبادت کے لئے تعمیر ہونے والی سب چیزیں شامل ہیں یعنی مساجد، مدارس مجاہد کی قیام گاہیں۔

﴿یتلون کتاب اللّٰہ﴾ ملا علی قاری نے یہاں خشوع اور استغراق کی شرط لگائی ہے۔

﴿یتدارسونہ﴾ علامہ سندھی فرماتے ہیں شامل لجمیع ما یتعلق بالقرآن من التعلم والتعلیم والتفسیر والاکتشاف عن دقائق معانیہ قرآن کو سیکھنا، سکھانا مفہوم کو سمجھانا اور اس کی باریکیوں کا استنباط کرنا تدارس میں شامل ہے۔

﴿حفتھم الملائکۃ﴾ سندھی نے لکھا ہے ای طافوا بھم وداروا حولھم تعظیماً لصنیعھم اس عمل کی عظمت کے پیش نظر وہ ان کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں اور ان کے گرد طواف کرتے رہتے ہیں۔

﴿ونزلت علیھم السکینۃ﴾ سندھیؒ فرماتے ہیں ھی ما یحصل بہ صفاء القلب بنور القرآن وذھاب ظلمتہ النفسانیۃ سکینہ کے معنی قرآن کریم کی بدولت ہونے والی دل کی صفائی، نفس کا تزکیہ اور شیطانی تاریکیوں کا دور ہو جانا ہے۔

﴿وغشیتھم الرحمۃ﴾ سندھی نے لکھا ہے غطتھم وسترتھم یعنی رحمت خداوندی نازل ہو کر انہیں پورا ڈھانپ لیتی ہے۔

﴿فی من عندہ﴾ قاری لکھتے ہیں ای الملاء الاعلی والطبقۃ الاولٰی من الملائکۃ یہ تذکرہ فخر کے لئے ہوتا ہے[2]

﴿ومن أبطابہ عملہ﴾ امام نوویؒ فرماتے ہیں معناہ من کان عملہ ناقصا لم یلحقہ بمرتبۃ أصحاب الأعمال فینبغی أن لا یتکل علی شرف النسب وفضیلۃ الأباء ویقصر فی العمل[3] جس کا عمل ناقص ہوگا وہ کامل عمل والوں کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا

---

[1] سنن مصطفیٰ [2] مرقاۃ ۱/۲۷۱ [3] مسلم ۲/۳۳۵

اس لئے مناسب یہ ہے کہ بندہ عمل میں کوتاہی کر کے نسبی عزت اور خاندانی فضیلت پر تکیہ نہ کرے اللہ کا تقرب عمل صالح سے ملتا ہے نسب وخاندان سے نہیں ان اکرکم عند اللہ اتقاکم اسلامی کا اولین اصول ہے...... حدیث مسلم (دعاء/ ۱۱) ابوداؤد مختصر (علم/ ۱، ادب/ ۴۱) اور ترمذی (البر/ ۱۹، حدود/ ۳، قراۃ ۲) میں بھی آئی ہے اور ابن ماجہ کی سند بھی عمدہ ہے۔

(۲۲۶/۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيٰى ، ثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ ، أَنْبَانَا مَعْمَرٌ، عَنْ عَاصِمِ بْنِ اَبِى النَّجُوْدِ عَنْ زِرِّ بْنِ حُبَيْشٍ ، قَالَ: أَتَيْتُ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالِ الْمُرَادِيِّ فَقَالَ: مَا جَاءَ بِكَ؟ قُلْتُ اُنْبِطُ الْعِلْمَ قَالَ: فَاِنِّى سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "مَا مِنْ خَارِجٍ خَرَجَ مِنْ بَيْتِهِ فِى طَلَبِ الْعِلْمِ اِلَّا وَضَعَتْ لَهُ الْمَلَائِكَةُ أَجْنِحَتَهَا ، رِضًا بِمَا يَصْنَعُ"

زر بن حبیش فرماتے ہیں کہ میں صفوان بن عسال کے پاس آیا تو انہوں نے فرمایا کیوں آئے ہو؟ میں نے عرض کیا علم کی تحصیل کے لئے تو بولے میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ علم کی طلب میں جیسے ہی کوئی بندہ اپنے گھر سے نکلتا ہے تو فرشتے اس عمل سے خوش ہو کر فوراً اس کے لئے اپنے پر بچھا دیتے ہیں۔

انبط افعال سے نبط نبطا (ض ن) واحد متکلم کا صیغہ ہے الماء پانی ابلنا زمین یا چشمے سے پھوٹنا مجرد بھی گرچہ متعدی ہے لیکن باب افعال میں پہنچ کر اس کے معنی اہتمام اور کثرت کے ساتھ پانی نکالنا ہوئے اسی لئے ہم نے ترجمہ تحصیل سے کیا ہے علامہ سندھی فرماتے ہیں والمراد اطلب العلم واستخرجه من قلوب العلماء وأحصله فی قلبی یعنی میں بایں معنی علم حاصل کروں گا کہ علماء کے قلوب سے لے کر اسے اپنے دل میں رکھ لوں گا حدیث پر بحث گذر چکی ہے............ سند کے ایک راوی عاصم بن ابی النجود کی بابت حافظ نے تقریب (۳۰۵۴) میں لکھا ہے صدوق له أوهام حجة فی القراءة وحديثه فی الصحيحين مقرون سچے ہیں لیکن ان سے روایات میں غلطیاں ہوئی ہیں قرأت میں حجت ہیں اور شاہد کے طور ان کی احادیث صحیحین میں بھی موجود ہیں، عاصم تقریباً قابل اعتبار ہیں اس لئے سند میں خاص ضعف نہیں ہے۔

(۸/ ۲۲۷) حَدَّثَنَا اَبُوْبَکْرِ بْنُ اَبِیْ شَیْبَةَ ، ثَنَا حَاتِمُ بْنُ اِسْمَاعِیْلَ ، عَنْ حُمَیْدِ بْنِ صَخْرٍ، عَنِ الْمَقْبُرِیِّ، عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ،قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: "مَنْ جَاءَ مَسْجِدِیْ هٰذَا، لَمْ یَأْتِهِ اِلَّا لِخَیْرٍ یَتَعَلَّمُهُ اَوْیُعَلِّمُهُ ، فَهُوَ بِمَنْزِلَةِ الْمُجَاهِدِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، وَمَنْ جَاءَهُ لِغَیْرِ ذٰلِكَ فَهُوَ بِمَنْزِلَةِ الرَّجُلِ یَنْظُرُ اِلَی مَتَاعِ غَیْرِهٖ"

جو میری اس مسجد میں صرف خیر کیلئے آیا اس کو سیکھے یا سکھائے وہ مجاہد فی سبیل اللہ کے قائم مقام ہے اور جو کسی اور مقصد سے آیا تو وہ اس شخص کی مانند ہے جو دوسرے کی چیز پر نظر رکھتا ہے۔

حضرت مولانا عبدالغنی مجددی نے انجاح الحاجۃ میں لکھا ہے هذه الفضيلة مختصة بالمسجد النبوی علی الف الف تحية والمساجد الأخرى تبع لها فی تلك الفضائل فضیلت تو مسجد نبوی کی ہے لیکن دوسری مساجد تبعاً اس حکم میں داخل ہوں گی سندھی بھی یہی کہتے ہیں وحکم سائر المساجد کحکمه .

لم یاته الالخیر یہ جملہ حالیہ ہے اور نماز کے علاوہ یہاں طلب علم کے لئے آنے والے مراد ہیں۔

﴿یتعلمه أویعلمه﴾ جملہ معطوفہ بن کر خیر کی صفت ہے۔

﴿فهو بمنزلة المجاهد﴾ شرط کی جزاء ہے سندھی نے لکھا ہے وجه مشابهته طلب العلم بالمجاهد فی سبیل اللّٰه انه احیاء للدین واذلال للشیطان واتعاب للنفس وکسر ذری اللذة طلب علم کو جہاد سے تشبیہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم وتعلم دین کو زندہ کرتا ہے شیطان کو ذلیل کرتا ہے نفس کو توڑتا ہے اور عیش وعشرت کی بلندیوں کو ڈھا دیتا ہے یہی تمام اوصاف جہاد میں بھی ہیں اس لئے دونوں ایک درجے کے ہوگئے۔

﴿ومن جاء لغیر ذالك﴾ یعنی اس کی آمد کا مقصد تعلیم وتعلم ہے اور نہ ہی وہ نماز کے لئے آیا ہے۔

﴿فهو بمنزلة الرجل الخ﴾ سندھی لکھتے ہیں أی بمنزلة من دخل السوق لا یبیع ولا یشتری بل ینظر الی أمتعة الناس، ظاہر ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ یہ چیز

پہلے تو حرص اور بعد میں حسد پیدا کرے گی یتعلمه او یعلمه ترجمۃ الباب میں...... بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے اسنادهٗ حسن علی شرط مسلم .

(۹/ ۲۲۷) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ حَدَّثَنَا صَدَقَةُ بْنُ خَالِدٍ ثَنَا عُثْمَانُ بْنُ أَبِیْ عَاتِكَةَ عَنْ عَلِيِّ بْنِ يَزِيْدَ عَنِ الْقَاسِمِ عَنْ اَبِیْ أُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهُ ﷺ عَلَيْكُمْ بِهٰذَا الْعِلْمِ قَبْلَ أَنْ يُقْبَضَ وَقَبْضُهُ أَنْ يُرْفَعَ وَجَمَعَ بَيْنَ اِصْبَعَيْهِ الْوُسْطٰى وَالَّتِیْ تَلِی الْاِبْهَامَ هٰكَذَا ثُمَّ قَالَ الْعَالِمُ وَالْمُتَعَلِّمُ شَرِيْكَان فِی الْأَجْرِ وَلَا خَيْرَ فِیْ سَائِرِ النَّاسِ.

تم لوگ علم کولازم پکڑلو قبل اس کے کہ وہ سلب کرلیا جائے اور اس کا سلب کیا جانا اٹھانا ہے پھر آپ نے اپنی وسطی اور انگوٹھے سے ملی ہوئی دونوں انگلیوں کو ملا کر فرمایا کہ عالم اور طالب علم اجر وثواب میں اس طرح برابر کے شریک ہیں (جس طرح یہ دونوں انگلیاں) اور دوسرے لوگوں میں کوئی خیر نہیں ہے

﴿بهٰذا العلم﴾ سندھیؒ نے لکھا ہے الاشارة الی علم الدین الذی بعث صلوات اللّٰه وسلامه علیه ن لنشره یعنی وہ علوم نبوت مراد ہیں جن کی اشاعت کے لئے آپ دنیا میں تشریف لائے۔

﴿ان یرفع﴾ سندھی لکھتے ہیں ای من عندکم برفع من جاء به من الدنیا یعنی اس ہستی کو دنیا سے اٹھالیا جائے گا جو تمہارے پاس یہ علم لے کر آئی صحیح مسلم ۸۲/۱ میں فتقبض الأمانة من قلبه بھی آیا ہے۔علم کے خاتمہ کے لئے قبض ورفع دو مترادف تعبیریں ہیں، جو دوسری احادیث میں بھی مذکور ہیں جیسا کہ صحیحین کی حدیث ان اللّٰه لا یقبض العلم انتزاعاً ینتزعه من العباد ولکن یقبض العلم بقبض العلماء جب کہ رفع کی مثال صحیح مسلم کتاب العلم باب رفع العلم وقبضه میں ان من اشراط الساعة ان یرفع العلم ویظهر الجهل ہے نتیجہ یہ نکلا کہ علماء کو موت دے کر علم سلب کرلیا جائے گا اس لئے جلدل از جلد اسے ان سے لے کر اپنے سینوں میں محفوظ کرلیا جائے۔

﴿وجمع بین اصبعیه﴾ سندھیؒ نے لکھا ہے اشارة الی قرب او ان القبض لما

بینهما من الاتصال او جمع یشیربها الی کیفیة الرفع الی السماء یعنی تین صورتیں ہوئیں (۱) عالم اور طالب علم کے درجے کی قربت کی طرف اشارہ ہے کہ ان دونوں کا تقریبا ایک ہی مقام ہے (۲) رفع علم مجھ سے اتنا ہی قریب ہے جتنا یہ دونوں انگلیاں بعثت انا و الساعة کهاتین سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے (۳) انگلیاں اٹھا کر یہ بتلایا کہ علم آسمان کی طرف اٹھایا جائے گا ہمارے نزدیک یہاں پہلی توجیہ راجح اور دوسری دونوں بعید ہیں سیاق حدیث اسی کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں دونوں کے اجر وثواب، شرکت اور درجہ کی قربت بتلانا مقصود ہے۔

﴿ولا خیر فی سائر الناس﴾ یہاں خیر شر کی ضد نہیں بلکہ امتیاز اور افادہ کے معنی میں ہے..... سند کے ایک راوی علی بن زید بن جدعان کو حافظ نے تقریب (۴۷۳۴) میں ضعیف قرار دیا ہے بوصیری نے بھی زوائد ابن ماجہ میں هذااسناد علی بن زید بن جدعان والجمهور علی تضعیفه کی صراحت کی ہے اس لئے روایت درجہ صحت کو نہیں پہنچتی۔

(۱۰/۲۲۹) حَدَّثَنَا بِشْرُ بْنُ هِلَالٍ الصَّوَّافُ، ثَنَا دَاوُدُ بْنُ الزِّبْرِقَانِ عَنْ بَكْرِ بْنِ خُنَيْسٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ زِيَادٍ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ يَزِيْدَ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ مِنْ بَعْضِ حُجَرِهِ فَدَخَلَ الْمَسْجِدَ فَإِذَا هُوَ بِحَلْقَتَيْنِ اِحْدَاهُمَا يَقْرَأُوْنَ الْقُرْآنَ وَيَدْعُوْنَ اللّٰهَ وَالْاُخْرَى يَتَعَلَّمُوْنَ وَيُعَلِّمُوْنَ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ كُلٌّ عَلَى خَيْرٍ هٰؤُلَاءِ يَقْرَأُوْنَ الْقُرْآنَ وَيَدْعُوْنَ اللّٰهَ فَاِنْ شَاءَ اَعْطَاهُمْ وَاِنْ شَاءَ مَنَعَهُمْ وَهٰؤُلَاءِ يَتَعَلَّمُوْنَ وَيُعَلِّمُوْنَ وَاِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا فَجَلَسَ مَعَهُمْ.

ایک دن رسول اللہ ﷺ اپنے کسی حجرہ سے نکل کر مسجد میں تشریف لائے تو وہاں دو حلقے دیکھے ان میں سے ایک تلاوت قرآن اور دعاء میں مشغول تھا جب کہ دوسرے حلقہ والے علم سیکھ رہے تھے اور سکھا رہے تھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دونوں خیر پر ہیں یہ لوگ قرآن پڑھ رہے ہیں اور دعائیں مانگ رہے ہیں اللہ چاہے تو انہیں عطا کرے اور چاہے تو محروم کر دے جب کہ یہ حضرات تعلیم وتعلم میں مشغول ہیں میں معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں پھر آپ ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔

﴿بحلقتین﴾ سنن دارمی میں مَرَّ بمجلسین کی تعبیر ہے دونوں ایک ہی مفہوم پر

دلالت کرتی ہیں ملاعلی قاری نے ابن حجر ہیثمی کے قول ای حلقتین بو غیر معروف من الحدیث قرار دیا ہے ہمارے نزدیک یہ قاری کا تسامح اور ابن ماجہ کی روایت ہیثمی کی دلیل ہے۔

﴿کل علی خیر﴾ قاری لکھتے ہیں ای جالسین اوثابتین علی عمل خیر[۱] یعنی دونوں حلقے بھلائی و نیکی پر ہیں۔

﴿اعطاھم﴾ قاری فرماتے ہیں ای ما عندہ من الثواب[۲] یہاں دعاء کی قبولیت بھی مراد ہوسکتی ہے۔

﴿وان شاء منعھم﴾ یعنی سردست ان کی دعاء کو قبول نہ فرمائے بلکہ اسے آخرت کے لئے ذخیرہ بنادے اس کی دو صورتیں ہیں جو حدیث ۲۵۰ کے تحت من دعاء لایسمع کے ذیل میں آرہی ہیں۔

﴿وانما بعثت معلماً﴾ طیبی فرماتے ہیں اشعار بأنھم منه وھو منھم[۳] ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے اوجلس فیھم لا حتیاجھم الی التعلیم منه علیه الصلوٰة والسلام[۴] یعنی یہ بھی ممکن ہے آپ اس لئے وہاں بیٹھ گئے کیونکہ یہ لوگ علم سیکھنے میں آپ کے محتاج تھے.......... بوصیری نے زوائد میں لکھا ہے اسناد فیه داؤد وبکر وعبد الرحمن کلھم ضعفاء. حافظ نے تقریب میں (۱۷۸۵) پہلے کو متروك وکذبه الازدی دوسرکو (۷۳۹) صدوق له اغلاط افرط فیه ابن حبان اور تیسرے کو (۳۸۶۲) ضعیف فی حفظه قرار دیا ہے، اس لئے سند کافی کمزور ہے۔

باب من بلّغ علما

یہ باب امام ابن ماجہ نے علم کی نشرو اشاعت کرنے والوں کی فضیلت بیان کرنے کے لئے قائم کیا ہے اس کے تحت آنے والی تمام تر احادیث کا ایک ہی رنگ ہے اور وہ ہے حدیث وسنت کی تبلیغ، تکمیل دین کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہر امتی پر یہ ذمہ داری عائد کی کہ وہ نبوی تعلیمات کو بلا کم وکاست ہر اس شخص تک پہنچا دے جو ان سے واقف نہیں، ہوسکتا ہے کہ ان

[۱] [۲] [۳] [۴] مرقاة المفاتیح ۱؍۳۰۷

میں مبلغ سے زیادہ صلاحیت والے لوگ ہوں جو دین کے تصور کا ادراک کر کے اس کی صحیح ترجمانی کا فریضہ انجام دیں ایسے ذہین صاحب بصیرت اور سلامت طبع رکھنے والے لوگوں تک دین کو پہنچانے والوں کو رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ زندہ اور تابندہ رہنے کی دعا دی ہے۔

امت بحمد للہ اس فریضے میں کوتاہی نہیں کی اور ہر دور میں انہوں نے دعوت و تبلیغ کے لئے جینا اور مرنا سیکھا یاد رہے کہ تبلیغ غیروں کو دین کی دعوت دینے کا نام ہے مسلمانوں کی اصلاح کیلئے جو تحریک چلائی جائے گی وہ تذکیر ہے تبلیغ نہیں خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد شرعی نظام بالکل ہی منہدم ہو گیا اور دوسری خامیوں کی طرح اس شعبے کو بھی ہم نے نظر انداز اور معطل کر دیا ہے دعوت اصل تو جہاد کے ساتھ ہے لیکن مخصوص حالات میں وہ تنہا بھی دی جا سکتی ہے یہ خیال درست نہیں کہ مسلمانوں کی سو فیصد اصلاح کے بعد ہی دوسروں کو تبلیغ کی جا سکتی ہے اس طرح تو قیامت تک یہ فریضہ معطل ہو جائے گا کیونکہ فساق ہمیشہ ہی امت کا حصہ رہیں گے اس لئے علماء نے ایسی جماعت کا وجود ہر زمانہ میں فرض قرار دیا ہے جو یہ کار رسالت انجام دے اور اسکا تبلیغی طریقہ بھی صحابہ سے منقول ہو دوسری محرف کتابوں سے استفادہ، حق و باطل کو قریب کرنا اور باہمی مماثلت کے نقطوں کو تلاش کر کے کفار کے سامنے تواضع کا اظہار بزدلی ہے تبلیغ نہیں اہل حق کے یہ طریقے کبھی نہیں رہے وہ تو باطل پر چوٹ لگا کر حق کی صداقت کا اعلان کرتے ہیں۔

(۲۳۰/ا) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنُ نُمَيْرٍ وَعَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَا ثَنَا، مُحَمَّدُ بْنُ فُضَيْلٍ ثَنَا لَيْثُ بْنُ أَبِي سُلَيْمٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ عَبَّادٍ أَبِي هُبَيْرَةَ الْأَنْصَارِيُّ عَنْ أَبِيهِ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِي فَبَلَّغَهَا فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيهٍ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ، زَادَ فِيهِ عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَلَاثٌ لَا يُغِلُّ عَلَيْهِنَّ قَلْبُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ، إِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلّٰهِ وَالنُّصْحُ لِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَلُزُوْمُ جَمَاعَتِهِمْ

اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش و خرم رکھے جس نے میری حدیث سن کر اسے دوسروں تک پہنچایا کیونکہ بہت سے اہل علم غیر فقیہ ہوتے ہیں اور بہت سے فقیہ اسے افقہ تک پہنچا دیتے ہیں علی بن محمد نے اتنا اضافہ اور نقل کیا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن میں کسی مسلمان کا دل خیانت نہیں کرتا

اللہ کے لئے عمل کو خالص کرنا، مراء کی خیر خواہی اور مسلمانوں کی جماعت سے وابستگی۔

باب کی تمام روایات اس خطبے کی متفرق کڑیاں ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر دیا تھا مندرجہ بالا روایت اصولاً دو حصوں پر مشتمل ہے دونوں میں ربط بایں معنی ہے کہ دینی تبلیغ سے اتنی فقہی بصیرت ہر مسلمان میں ہونی چاہیئے کہ وہ کم از کم ان تین چیزوں کو انجام دے سکے پہلے سے متعلق گفتگو اگلی حدیث میں ہوگی یہاں ہم صرف دوسرے حصے پر کلام کریں گے۔

﴿ثلاث لا یغل علیهن﴾ افعال سے واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے معنی خیانت کرنا کوتاہی کرنا ملا علی قاری نے لکھا ہے والمعنی أن المومن لا یخون فی هذه الثلاثة الأشیاء ولا یدخله ضعف یزیله عن الحق حین یفعل شیئا من ذلک[1] یعنی ان تینوں چیزوں کی بابت مسلمان خیانت نہیں کرتا نہ اس کے دل میں ایسا کینہ ہوتا ہے جو ان میں سے کسی کی انجام دہی کے وقت اسے راست اور خدا ترسی سے ہٹا دے۔

﴿اخلاص العمل لله﴾ ملا علی قاری کے نزدیک یہ پورا جملہ ثلاث کا بدل ہے دونوں مل کر مبتداء محذوف کی خبر ہوں گے اخلاص کے معنی کسی عمل کو محض اللہ کی رضا و اخروی نجات و مغفرت کے لئے اس طرح انجام دینا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی دنیاوی مفاد نہ ہو یہ در اصل روح کی حیثیت رکھتا ہے جس طرح کوئی جسم بغیر روح کے حرکت نہیں کر سکتا، اسی طرح کوئی عمل بغیر اخلاص کے مقبول نہیں ہوتا حدیث میں ریا کو شرک اصغر کہا گیا ہے جس کی نحوست سے بڑے بڑے اعمال جنت کے بجائے دوزخ میں جانے کا سبب بن جاتے ہیں ریا کار عالم، سخی اور شہید کا عبرت ناک واقعہ اسی کی مثال ہے اس لئے دینی امور میں یہ چیز صد فیصد مطلوب ہے اور حدیث کا مطلب علامہ سندھی کے الفاظ میں یہ ہے جعل العمل خالصا لله لا لغیره[2] یعنی عمل کو خالص اللہ کے لئے کرے غیر اللہ کے نہیں۔

﴿والنصح لأئمة المسلمین﴾ دوسری چیز جس میں مومن کبھی خیانت نہیں کرتا امراء و خلفاء کے ساتھ خلوص و وفاداری ہے دین میں اصل اطاعت تو بس اللہ اور اس کے رسول ہی کی ہے لیکن ہر شخص نصوص تک رسائی نہیں رکھتا اس لئے ان لوگوں کی اطاعت بھی ضروری

---

[1] مرقاۃ المفاتیح ۱/۲۸۹ [2] مرقاۃ المفاتیح ۱/۲۸۹

قرار پائی جو کار نبوت کو انجام دیتے ہوں ان میں سب سے بلند مقام خلفاء وأمراء کا ہے اور یا
ایها الذین امنوا اطیعوا اللّٰه واطیعو ا الرسول واولی الأمر منکم میں راجح قول
کے مطابق اولی الامر سے خلفاء وامراء ہی مراد ہیں صحیحین کی حدیث من یطع الأمیر فقد
اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی اسی مفہوم کی وضاحت کرتی ہے یہ لوگ عقیدت
وخیر خواہی میں دوسروں سے مقدم ہیں جیسا کہ صحیح مسلم میں منقول تمیم داری کی حدیث بتلاتی ہے
قال الدین النصیحة قلنا لمن له قال للّٰه ولکتابه ولرسول ولأئمة المسلمین
وعامتهم پھر مسند احمد کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر کو نصیحت کرنے کا یہ
ادب بتلایا ہے من أراد ان ینصح لذی سلطان بأمر فلا یبذله علانیة ولکن یأخذ
بیده فیخلو به فان قبل منه فذاك والا کان قدادیٰ الذی علیه یعنی صاحب اقتدار کو
علانیہ کسی چیز کی نصیحت نہ کرے بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تنہائی میں لے جا کر یہ بات کہے اگر اس
نے قبول کرلیا تو مقصد حاصل ہے ورنہ وہ حق تو ادا ہو ہی گیا جو اس کے ذمے واجب تھا خلافتِ
عثمانیہ کے زوال تک ہمارے اسلاف اسی نبوی وصیت پر عمل پیرا رہے اور انہوں نے عام حالات
میں کبھی خروج نہیں کیا سیدنا حسین، ابن زبیر، اہل مکہ، اہل مدینہ اور خلافتِ عباسیہ میں جو خاندان
نبوت کے روشن چراغوں نے خروج کیا اس کی ٹھوس بنیاد موجود تھی جو اس زمرے میں نہیں آتی
چنانچہ امت نے بالاتفاق ان کے حق پر ہونے اور مخالفین کے باطل پر ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔

﴿ولزوم جماعتهم﴾ قرآن وسنت نے مسلمانوں کی شیزازہ بندی اور ہر امتی کے
لئے جماعت سے وابستگی کو لازم قرار دیا ہے واعتصمو بحبل اللّٰه جمیعا ولا تفرقوا ملا
علی قاری نے لکھا ہے ای موافقة المسلمین فی الاعتقاد والعمل الصالح من
صلوٰة الجمعة والجماعة وغیر ذلك[1] یعنی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عقائد اور صلوٰۃ
جمعہ وجماعت جیسی عبادات میں وہ مسلمانوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کرے، مولانا ادریس
کاندھلوی نے اس کی تشریح فما علیه اجماع المسلمین من الأفعال والا قوال
والاعتقاد[2] سے کی ہے یعنی مسلمانوں کے متفق علیہ عقائد وافعال سے وابستگی ہو اگر کوئی شخص

[1] مرقاۃ المفاتیح ۱/۲۸۹ [2] التعلیق الصبیح کتاب العلم فصل دوم

امت سے انحراف کرتا ہے تو صحیح مسلم کی حدیث کے مطابق **مات میتة جاهلیة** اس کی موت جاہلیت پر ہوگی و **من شذشذ فی النار** اور وہ جہنم کا ایندھن ہوگا۔ اسلام کی تاریخ اتحاد کی تاریخ ہے اور جو تھوڑے بہت اختلاف رونما ہوئے وہ اتنے سنگین نہیں جتنا کہ غیر محتاط مورخین ہمیں باور کراتے ہیں ہمارے پاس اتحاد کی بنیادیں موجود ہیں جب کہ دوسری قومیں انسے یکسر عاری ہیں اس لئے ہم آج نہیں تو کل ضرور متحد ہوں گے۔

حدیث کے ایک راوی لیث بن ابی سلیم کی بابت حافظ نے تقریب میں (۵۶۸۵) **صدوق اختلط جداً ولم یتمیز حدیثه** لکھا ہے بوصیری فرماتے ہیں: **هذا اسناد فیه لیث بن سلیم وقد ضعفه الجمهور وهو مدلس رواه بالعنعنة** اس لئے سند کمزور قرار پاتی ہے۔

(۲۳۱/۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ نُمَيْرٍ، ثَنَا أَبِيْ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِسْحَاقَ ، عَنْ عَبْدِ السَّلَامِ، عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ، عَنْ اَبِيْهِ، قَالَ: قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالْخَيْفِ مِنْ مِنًى فَقَالَ "نَضَرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَبَلَّغَهَا، فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فِقْهٍ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ"

گذشتہ حدیث کے تحت گذر چکا ہے محدثین نے یہاں پہلا سوال یہ اٹھایا ہے کہ روایت دعاء ہے یا خبر یعنی ایسے بندے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے باری تعالیٰ سے فرحت وتازگی کی درخواست کی ہے جب کہ خبر کی صورت میں معنی یہ ہوئے کہ اللہ نے آپ کی یہ دعاء قبول فرمالی اور ہر محدث اب قیامت تک فرحاں وشاداں رہے گا ملا علی قاری فرماتے ہیں **والاخبار أولى من الدعاء**[1] خبر دعاء سے زیادہ راجح ہے جب کہ **بذل المجهود** اور **التعليق الصبيح** میں اسے دعا قرار دیا گیا ہے حدیث میں دونوں کی گنجائش موجود ہے۔

﴿**بالخیف من منی**﴾ منی میں ایک مقام کا نام ہے جہاں پر آپ نے حجۃ الوداع میں خطبہ دیا، اب یہاں پر ایک مسجد بھی بنادی گئی ہے۔

﴿**نضر الله**﴾ محدثین نے تخفیف وتشدید دونوں نقل کی ہیں لیکن دوسری اس معنی کر

---

[1] مرقاۃ المفاتیح ۱/۲۸۸

راجح ہے کہ اس میں جوش اور مبالغہ پایا جاتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کا دعائیہ اسلوب اسی کا متقاضی ہے اصالۃً تو اس کے معنی نباتات کے استعارے میں تر و تازہ کرنا ہے لیکن انسان پر اس کا اطلاق کرنے کے بعد معنی میں وسعت پیدا ہوگئی اور اب نعمت و فرحت، آسائش و خوشحالی اور چہرے کی نورانی و تابانی بھی اس میں شامل ہے علامہ سندھی کے الفاظ میں مطلب یہ ہوا ای جَمَّلَهُ وَزَيَّنَهُ وأوصله الله الى نضرة الجنة یعنی اسے ظاہری و باطنی رونق و تابانی عطا فرمائیں گے اور بالآخر جنت کے سبزہ زاروں میں پہنچادیں گے ملا علی قاریؒ نے اس مفہوم کو ذرا اور پھیلایا ہے فرماتے ہیں خصه الله بالبهجة والسرور لما رزق بعلمه ومعرفته من القدر والمنزلة بين الناس في الدنيا ونعمه في الأخرة حتى يرىٰ عليه رونق الرخاء والنعمة[1] یعنی علم و معرفت کی بنا پر اللہ نے اس کو بایں معنی فرحت و سرور سے نوازا کہ دنیا میں بھی اس کا ایک مقام بن گیا اور آخرت میں بھی اس کے لئے نعمتیں مخصوص ہیں جن کے اثرات اس پر نظر آتے ہیں سفیان ابن عیینہ نے لکھا ہے مامن أحد يطلب الحديث الا وفي وجهه نضرة لهٰذا لحديث کہ اس کی رو سے حدیث کے ہر طالب علم کے چہرے پر رونق ہونی ضروری ہے۔

﴿فرب حامل فقه غير فقيه﴾ یعنی بسا اوقات علم کا حامل بذاتِ خود اس بات پر قادر نہیں ہوتا کہ اس سے اصول کا استخراج، مسائل کا استنباط اور کسی چیز پر استدلال کر سکے جب کہ دوسرا ان صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے اور قاری کے الفاظ میں ما لا يفهمه الحامل اس سے ان چیزوں کا استنباط کرتا ہے جن کو یہ مبلغ سمجھتا بھی نہیں تھا اس لئے نقل و تبلیغ کی ترغیب دی گئی ہے تاکہ ہر امتی کی صلاحیت حدیث میں لگ جائے مضبوط یادداشت کے لوگ اس کے الفاظ کو یاد کریں اور ذہین و نکتہ داں حضرات احادیث سے اپنے زمانہ کے مسائل کا استنباط کر سکیں جب کہ عدم تبلیغ کی صورت میں امت ان کے فوائد سے محروم رہ جائے گی۔

حدیث کی سند میں ایک راوی عبد السلام بن ابی الجموح ہیں جن کی بابت حافظ نے تقریب (۴۰۶۵) میں لکھا ہے ضعيف لايغتر بذكر ابن حبان له في الثقات فانه

---

[1] مرقاۃ المفاتیح ۱/۲۸۸

ذكره في الضعفاء یہ کمزور ہیں اور قاری کو اس بات سے دھوکہ نہ ہو کہ ابن حبان نے انہیں ثقات میں شمار کیا ہے انکا تذکرہ انہوں نے ضعفاء میں بھی کیا ہے اسلئے حدیث کی سند کمزور ہے۔

حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا خَالِيْ يَعْلَى ح وَحَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ ثَنَا سَعِيْدُ بْنُ يَحْيَى قَالَا ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ اِسْحَاقَ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنَحْوِهِ

ترجمہ وشرح گذر چکی ہے حدیث کی سند درست ہے۔

(۲۳۲/۳) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ، وَمُحَمَّدُ بْنُ وَلِيْدٍ، قَالَا: ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ ثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ سِمَاكٍ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بنِ عَبْدِ اللّٰهِ، عَنْ اَبِيْهِ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "نَضَّرَ اللّٰهُ اِمْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِيْثًا فَبَلَّغَهُ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَحْفَظُ مِنْ سَامِعٍ"

اللہ تعالیٰ اس بندے کو خوش وخرم رکھے جو ہم سے حدیث سن کر اس کی تبلیغ بھی کرتا: کیونکہ بہت سے لوگ سننے والے سے زیادہ حفظ وضبط رکھتے ہیں۔

﴿فرب مبلغ﴾ تفعیل سے مفعول کا صیغہ ہے وہ شخص جس کو سامع حدیث پہنچا رہا ہے۔

﴿أحفظ من سامع﴾ ترمذی میں احفظ کی جگہ اوعی کا لفظ ہے علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے انه افطن وافهم واكثر مراعاة لمعناه وعملا بمقتضاه وليس المراد الحفظ اللساني یہاں حفظ سے صرف زبانی یاد کرنا مراد نہیں بلکہ اس کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو نہایت ذہین وفہیم ہو اور حدیث کے معنی کی رعایت کر کے اس کے تقاضوں پر بھی عمل کرتا ہو حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں دفع بذلك ما اشتهر ان التلميذ يكون اقل علما من شيخه[1] اس جملے سے اس عوامی خیال کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ شاگرد ہمیشہ علم میں اپنے استاد سے کمتر ہوتا ہے نہیں، فرمان رسالت کے مطابق اس کی پرواز اساتذہ سے بھی کبھی اونچی ہوتی ہے اسی کی بناء پر صحابہ سے علوم نبوت کا ذخیرہ بعد والوں کو پہنچایا محدثین نے اسے محفوظ کیا اور فقہا نے استنباط واستخراج کا جو مظاہرہ کیا وہ اسی حدیث کی صداقت کا نمونہ ہے۔ حدیث امام

[1] لامع الداری ۱/۴۵

ترمذی نے اپنی جامع (علم/۷) میں نقل کر کے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے ابن ماجہ کی سند بھی صحیح ہے۔

(۲۳۳/۴) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ، ثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ الْقَطَّانُ، أَمْلَاهُ عَلَيْنَا، ثَنَا قُرَّةُ بْنُ خَالِدٍ، ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سِيرِينَ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِيْ بَكْرَةَ، عَنْ اَبِيهِ، وَعَنْ رَجُلٍ آخَرَ هُوَ اَفْضَلُ فِيْ نَفْسِيْ مِنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ أَبِيْ بَكْرَةَ، قَالَ: خَطَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ النَّحْرِ، فَقَالَ: لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ، فَإِنَّهُ رُبَّ مُبَلَّغٍ يُبَلِّغُهُ، اَوْعَى لَهُ مِنْ سَامِعٍ"

قربانی کے دن خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ حاضر کو چاہئے کہ وہ غائب تک پہنچادے کیونکہ بہت سے وہ لوگ جن کو یہ پیغام پہنچائے گا سامع یعنی حاضر سے کہیں زیادہ اس کو محفوظ رکھنے والے ہوں گے۔

﴿وعن رجل اخر﴾ سندھیؒ نے اس کے ذیل میں حمید بن عبداللہ خیری کا نام لیا ہے۔

﴿هذا افضل فی نفسی من عبدالرحمن﴾ مجددیؒ کے نزدیک یہ قرۃ بن خالد کا قول ہے یعنی وہ راوی ان کے نزدیک عبدالرحمٰن سے بھی زیادہ افضل ہے۔

﴿یوم النحر﴾ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو خطبہ دیا ہے حدیث باب اسی کا ایک ٹکڑا ہے اور اس باب کی پہلی حدیث کو چھوڑ کر دوسری احادیث بھی اسی خطبے کی متفرق کڑیاں ہیں۔

﴿لیبلغ الشاهد الغائب﴾ امر غائب سے واحد مذکر کا صیغہ ہے اور شاہد سے مراد ہر وہ صحابی ہے جنہوں نے میدانِ عرفات میں آپ کے پیغام کو سنا جب کہ غائب کا اطلاق ان لوگوں پر ہوگا جو یا تو اس وقت میدانِ عرفات میں حاضر نہ تھے یا پھر ان کی پیدائش عہدِ صحابہ کے بعد ہوئی یہ لیبلغ کا پہلا مفعول ہے جب کہ دسرا مفعول محذوف ہے علامہ سندھیؒ نے العلم الذی حضر سماعه سے اسی کی وضاحت کی ہے یعنی اس خطبے کی تمام ہدایات اور علوم نبوت، صحابۂ کرام وفات نبوی کے بعد جس طرح اپنے جزیرے سے نکل کر پوری دنیا میں پھیلے اور ہر طرف اسلام کا پیغام پہنچایا وہ اسی حکم کا نتیجہ تھا۔

﴿فانه رب مبلغ﴾ تبلیغ سے مفعول کا صیغہ ہے وہ شخص جس کو پیغام پہنچایا جائے۔
﴿یُبَلَّغُهٗ﴾ فعل مجہول ہے نائب فاعل ضمیر ہے جو مبلغ کی طرف لوٹتی ہے جب کہ "ہٗ" ضمیر کا مرجع علم ہے مطلب یہ ہوا کہ جس کو علم پہنچایا جائے گا۔
﴿أوعیٰ له من سامع﴾ وہ اس پہنچانے والے سے زیادہ لائق وفائق ہے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے ان اوعیٰ له معنیان أحفظ وأفهم ففی التبلیغ حصول الفائدتین معاً کما فی ترکه المضرتان معاً[1] اوعیٰ کے دو معنیٰ أحفظ اور افهم ہیں تو تبلیغ میں بھی دو فائدے ہوئے ایک اس علم کی حفاظت دوسرے اس کے معنیٰ کی حفاظت جب کہ تبلیغ نہ کرنے کی صورت میں دو نقصان ہوں گے ایک تو علم کے ضائع ہونے کا دوسرا غلط معنیٰ مراد لینے کا، اوعیٰ سامع سے کہیں زیادہ اچھی طرح یاد کر کے اس کے حقیقی معنیٰ کا حامل ہوگا علامہ سندھی اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں قد یفهم المبلغ مالا یفهمه الحامل من الأسرار والعلوم کہ کبھی اس شخص کی رسائی ان معارف وعلوم تک ہوتی ہے جن تک اس حامل کی نظر تک نہیں جاتی حدیث کی سند درست ہے۔

(۲۳۴/۵) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ اَبِیْ شَیْبَةَ ثَنَا اَبُوْاُسَامَةَ ح وَحَدَّثَنَا اِسْحَاقُ بْنُ مَنْصُوْرٍ أَنْبَأَنَا النَّضْرُ بْنُ شُمَیْلٍ، عَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِیْمٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ مُعَاوِیَةَ الْقُشَیْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَلَا لِیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ.

حدیث کی سند صحیح ہے شرح گذشتہ حدیث کے تحت گذر چکی۔

(۲۳۵/۶) حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ عَبْدَةَ أَنْبَأَنَا عَبْدُالْعَزِیْزِ بْنِ مُحَمَّدٍ الدَّرَاوَرْدِیُّ حَدَّثَنِیْ قُدَامَةُ بْنُ مُوْسیٰ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحُصَیْنِ التَّمِیْمِیِّ عَنْ اَبِیْ عَلْقَمَةَ مَوْلَی بْنِ عَبَّاسٍ عَنْ یَسَارٍ مَوْلَی ابْنِ عُمَرَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِیُبَلِّغْ شَاهِدُکُمْ غَائِبَکُمْ

حدیث کا مضمون امام ابوداؤد نے کتاب الصلوٰۃ باب من رخص فیهما اذا کانت الشمس مرتفعة میں یہ نقل کیا ہے کہ یسار کو ابن عمر و نے طلوع فجر کے بعد نماز پڑھتے

---

[1] لامع الدراری ۱/۴۵

ہوئے دیکھ لیا تو فرمایا یایسار: ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خرج علینا ونحن نصلی ھذہ الصلوٰۃ وقال لیبلغ شاھدکم غائبکم لا تصلو بعد الفجر الاسجدتین ابن ماجہ کی سند کے اور رواۃ تو درست ہیں جب کہ محمد بن الحصین کو حافظ تقریب (۵۸۲۳) میں مجھول لکھا ہے اس لئے روایت کمزور ہے۔

(۲۳۶/۷)حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ اِبْرَاهِیْمَ الدِّمَشْقِیُّ، ثَنَا مُبَشِّرُ بْنُ اِسْمَاعِیْلَ الْحَلَبِیُّ عَنْ مُعَانِ بْنِ رِفَاعَةَ عَنْ عَبْدِ الْوَهَّابِ بْنِ بُخْتٍ الْمَکِّیِّ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْداً سَمِعَ مَقَالَتِیْ فَوَعَاهَا ثُمَّ بَلَّغَهَا عَنِّیْ فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَیْرُ فَقِیْهٍ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰی مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ

﴿غیر فقیه﴾ یعنی جو فقیہ نہیں ہوتا وہ فقیہ کو پہونچا دیتا ہے اور جو فقیہ ہوتا ہے وہ افقہ تک پہنچا دیتا ہے، اس لیے یہ روایت ونقل کا اسے ثواب ملے گا۔

سند کے ایک راوی محمد بن ابراہیم دمشقی شامی ہیں جن کی بابت حافظ نے تقریب (۵۶۹۸) میں منکر الحدیث کا تبصرہ کیا ہے، بوصیری نے فرمایا ھذا اسناد فیہ محمد بن ابراھیم الشامی وھو متھم ونسبہ ابن حِبَّانَ بِالوضعِ ابن حبان نے ان کی طرف وضع کو منسوب کیا ہے اس لئے سند کمزور قرار پاتی ہے۔

باب من کان مفتاحاً للخیر

بعض لوگ فطرۃً صالح اور شریف ہوتے ہے ان کی سرشت میں خیر وسعادت کے عناصر قوی ہوتے ہیں پھر عمدہ تربیت اور موافق ماحول کی بدولت یہ رنگ پختہ تر ہو کر دائمی مزاج بن جاتا ہے جسکے نتیجہ میں ان سے خیر ہی کا صدور ہوتا ہے شر ان کے قریب تک نہیں پھٹکتا بلکہ ان کا طرز عمل اس کی راہوں کو مسدود کر دیتا ہے اسکے برخلاف کچھ لوگ عادۃً شری اور فسادی ہوتے ہیں شیطانی اثرات انکے دل کی گہرائیوں میں بیٹھ جاتے ہیں پھر غلط صحبت اور گندے ماحول کی بناء پر شرارت خبث کا رخ اختیار کر لیتی ہے نتیجتًا ان کی طبیعت شر اور فساد ہی کی طرف چلتی ہے

صلاح وتقوی کی جانب اس میں ادنی میلان بھی باقی نہیں رہ جاتا کل میسر لما خلق کے تحت یہ سب توفیق ربانی کے نتائج ہیں امام نے اسی حقیقت کو سمجھانے کیلئے یہ باب قائم کیا ہے۔

(۱/۲۳۷) حَدَّثَنَا الْحُسَيْنُ بْنُ الْحَسَنِ الْمَرْوَزِيُّ، أَنْبَانَا مُحَمَّدُ بْنُ أَبِي عَدِيٍّ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ اَبِي حُمَيْدٍ، ثَنَا حَفْصُ بْنُ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ اَنَسٍ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنَ النَّاسِ مَفَاتِيْحَ الْخَيْرِ عَلَى يَدَيْهِ وَوَيْلٌ لِمَنْ جَعَلَ اللّٰهُ مَفَاتِيْحَ الشَّرِّ عَلَى يَدَيْهِ.

فرمایا: بعض حضرات خیر کی کنجیاں اور شر کے تالے ہیں جب کہ کچھ لوگ شر کی کنجیاں اور خیر کے تالے ہیں تو خوش خبری ہے اس شخص کے لئے جس کے ہاتھوں میں اللہ نے خیر کی کنجیاں رکھدیں اور تباہی ہے اس شخص کے لئے جس کے ہاتھوں میں اللہ نے شر کی کنجیاں دیدیں۔

﴿مفاتیح للخیر مغالیق للشر﴾ مفتاح کی جمع ہے معنی کنجی اسی طرح دوسرے لفظ کا واحد مغلاق آتا ہے، یعنی وہ اوزار جس سے دروازہ بند کردیا جائے تالہ حضرت مجددیؒ نے لکھا ہے والمراد من مفاتیح الخیر الرجال الذین سببهم اللّٰه تعالیٰ لعباده بایصال الجنة من اهل المعرفة والعلم والجهاد ، والرئاسة فی ذلك الأمر للانبیاء علیهم السلام ثم للصحابة ثم لغیرهم من المجتهدین والعلماء والزهاد والعارفین مفاتیح خیر سے وہ اہل علم، صوفیاء اور مجاہدین مراد ہیں جن کو اللہ نے اپنے بندوں کو جنت تک پہنچانے کا ذریعہ بنایا ہے ان میں سب سے بلند مقام انبیاء علیہم السلام کا ہے ان کے بعد صحابہ وتابعین پھر ائمہ مجتہدین اور صوفیا ومجاہدین کا نمبر آتا ہے۔

﴿مغالیق للشر﴾ کے تحت مجددی فرماتے ہیں کما أن رئاسة الشر لابلیسؑ یعنی خیر میں جس طرح انبیاء سب سے اوپر ہیں شر میں اسی طرح شیطان قائدانہ حیثیت رکھتا ہے اور پھر نیچے اس میں بھی درجہ بندی ہوسکتی ہے۔

﴿فطوبیٰ﴾ طیب سے اطیب کا مؤنث ہے معنی رشک، سعادت، خیر، خوشخبری۔

﴿لمن جعل اللّٰه مفاتیح الخیر علیٰ یدیه﴾ سندھیؒ نے لکھا ہے ان اللّٰه تعالیٰ اجریٰ علیٰ ایدیهم فتح ابواب الخیر کالعلم والصلاح علیٰ الناس حتی کانه ملکهم

مفاتیح الخیر و وضعها فی ایدیهم یعنی ان ہی کے ذریعہ اللہ نے لوگوں پر علم تقویٰ جیسی خیر کے دروازے کھولے تو گویا خیر کی کنجیوں کا انہیں مالک بنا کر کنجیوں کو انکے ہاتھ میں رکھ دیا۔

﴿وویل لعبد الخ﴾ معنی ہلاکت، رسوائی، اوراخری عذاب کے ہیں گویا ان ہی کی وجہ سے دنیا میں شروفساد کے بہت سے سلسلے قائم ہوئے اور یہی انسانوں کی گمراہی کا ذریعہ بنے اس لئے انہیں آخرت میں عذاب ہوگا..... بوصیری نے زوائد میں لکھا ہے هذا اسناد ضعیف من اجل محمد بن ابی حمید فانه متروك حافظ نے تقریب (۵۸۳۶) ضعیف لکھا ہے۔

(۲/۲۳۸) حَدَّثَنَا هَارُوْنُ بْنُ سَعِيْدِ الْأَيْلِيُّ اَبُوْجَعْفَرٍ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ وَهَبٍ أَخْبَرَنِيْ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ اَبِيْ حَازِمٍ عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ هٰذَا الْخَيْرَ خَزَائِنُ لِتِلْكَ وَالْخَزَائِنِ مَفَاتِيْحُ لَهُ فَطُوْبٰى لِعَبْدٍ جَعَلَهُ اللّٰهُ مِفْتَاحاً لِلْخَيْرِ مِغْلَاقاً لِلشَّرِّ وَ وَيْلٌ لِعَبْدٍ جَعَلَهُ اللّٰهُ مِفْتَاحاً لِلشَّرِّ مِغْلَاقاً لِلْخَيْرِ.

یہ خیر دراصل خزانے ہیں اوران خزانوں کی کنجیاں ہیں تو خوش قسمت ہے وہ بندہ جس کو اللہ نے خیر کی کنجی اور شر کا تالا بنایا اور تباہی ہے اس شخص کیلئے جس کو اللہ نے شر کی کنجی اور خیر کا تالا بنایا۔

﴿ان هذا الخیر خزائن﴾ خیر نیکیوں کی تمام اقسام کو شامل ہے اور یہاں اس سے مراد وہ علوم نبوت ہیں جو رسول اللہ ﷺ پر وحی کی صورت میں نازل ہوئے یا آپ کے قلب اطہر سے پھوٹ کر نکلے واقعتاً ہمارے لئے یہ خزانے اور دفینے ہیں حضرت مجددی نے میں لکھا ہے ان أمور الدین من الوحدانیة والصلوٰة والزکوٰة وغیرها أسباب لخزائن الأخرة لأن الأعمال أسباب الجزاء فمن کان أعماله حسنة کان جزائه حسنا وبالعکس یعنی توحید نماز اور زکوٰۃ وغیرہ اخروی خزانوں کو حاصل کرنے کے ذرائع ہیں کیونکہ اعمال بدلے کا سبب ہیں اس لئے جس کے اعمال اچھے ہوں گے اس کو صلہ اچھا ملے گا اور جو بد عمل ہوگا وہ اس کی سزا پائے گا۔

﴿ولتلك الخزائن مفاتیح له﴾ خیر کے حصول کیلئے ان خزانوں کی کچھ چابیاں ہیں۔ اگلے حصے کی وضاحت گذر چکی ہے مزید سندھیؒ کا یہ قول نقل کرنا فائدے سے خالی نہیں

وذلك لأن الاول يشارك العاملين بالخير في الأجر پہلے شخص کو خوشخبری اس لئے ہے چونکہ وہ اجر میں نیکوکاروں کا شریک ہے والثاني يشارك العاملين بالشر في الوزر جب کہ دوسرے کی وعید کی وجہ غلط کاروں کے گناہ میں شرکت ہیںاب کی اس دوسری سند کی بابت بوصیری نے زوائد میں لکھا ہے وكذااسناده الثاني ضعيف لضعف عبد الرحمن حافظ نے بھی تقریب (۳۸۶۵) میں عبد الرحمن کو ضعیف قرار دیا ہے جب کہ شیخ البانی ضعيف لا بن ماجة ۱/ ۱۸ میں سند کو ضعيف جدا کہتے ہیں۔

باب ثواب معلم الناس الخير

علم وعلماء اور قرآن وتبلیغ کے فضائل کی اہمیت کو اجاگر کر کے امام ابن ماجہ نے معلم ومربی کے مرتبہ کی وضاحت بھی ضروری سمجھی چنانچہ باب من كان مفتاحا للخير اسی کی تمہید و تعظیم کے لئے قائم کیا گیا ہے جس سے اشارۃ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن وسنت کے تمام خزانوں کی کنجیاں دراصل وہ لوگ ہیں جوامت کی تعلیم وتربیت میں منہمک ہیں پھر باب ثواب معلم الناس الخير قائم کیا ہے اور اس کے تحت ایسی پانچ روایات درج کیں جو معلم کی غیر معمولی اہمیت کا پتہ دیتی ہیں واقعہ بھی یہی ہے کہ جو شخص ملت کے نونہالوں کی صحیح تعلیم وتربیت کر کے انہیں قرآن وسنت کا امین اور نبوت کا جانشین بنا دے دین کا اس سے بڑا کوئی خیرخواہ نہیں ہوسکتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی نیابت کا حق تو درحقیقت صرف اسی نے ادا کیا ہے انما بعثت معلما اسی واضح دلیل ہے اسی کی مجلس کے بارے میں تو ارشاد ہے نزلت عليهم السكينة وغشيتهم الرحمة وحفتهم الملائكة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نضر الله عبد اسمع مقالتي الخ کی دعا دی اور فرمایا کہ اس کے لئے زمین وآسمان کی تمام مخلوق حتی کہ سمندر کی مچھلیاں تک دعا کرتی ہیں واضح رہے ان بشارتوں کا مصداق صرف وہی معلم ومربی ہیں جو علم کے تقاضوں کو خود پورا کرنے کے ساتھ محض رضا الٰہی اور دین کی حفاظت کے لئے اس کی نشر واشاعت کرتے ہیں ورنہ جن حضرات نے اسے محض اپنی ملازمت کا ذریعہ سمجھا ہے ان کا ان بشارتوں سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ تو ان وعیدوں کا مصداق ہیں جو باب الانتفاع بالعلم

والعمل بہ کے تحت امام نے درج کیں ہیں۔

عالم ومعلم ہی اسلامی مزاج ومعاشرے کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اورانہیں کی بدولت دین خارجی اثرات اور تحریف سے پوری طرح محفوظ رہتا ہے یہ وہ حقیقت ہے جس کو ماضی کی طرف موجودہ باطل طاقتیں بھی اچھی طرح سمجھتی ہیں اسی لئے وہ عبادت گذاروں کے بجائے سب سے زیادہ علماء ہی کی دشمن ہیں کیونکہ یہی وہ طبقہ ہے جوان کی راہ کا پہاڑ بنا ہوا ہے اوراسے ہٹائے بغیر عوام کو گمراہ کرنا ممکن نہیں۔

(۲۳۹/۱) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ ثَنَا حَفْصُ بْنُ عُمَرَ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَطَاءٍ عَنْ اَبِيهِ عَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ "اِنَّهٗ لَيَسْتَغْفِرُ لِلْعَالِمِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ حَتَّى الْحِيْتَانُ فِي الْبَحْرِ"

حدیث میں زمین وآسمان کی مخلوق اور سمندر کی مچھلیوں کا تذکرہ ہے جب کہ ترمذی کی روایت میں **ان اللّٰہ وملئکتہ واھل السموات والارض حتی النملۃ فی حجرھا وحتی الحوت لیصلون علی معلم الناس الخیر** کی بھی وضاحت ہے صلوٰۃ واستغفار تقریباً مترادف لفظ ہیں طیبی کا کہنا ہے کہ یہ مجاز ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ باری تعالیٰ عالم ومعلّم کے احوال کو اخیر تک درست رکھتے ہیں ہومجاز **من ارادۃ استقامۃ حال مستغفرلھم** جب کہ ملاعلی قاری مجاز کے بجائے یہاں حقیقت کو راجح قرار دیتے ہیں کیونکہ دنیا کا نظام علم وعلماء ہی کے دم پر قائم ہے اورانہیں پرسب کی زندگی موقوف ہے یہ اس حدیث کا ٹکڑا ہے جو باب **فضل العلماء** کے تحت امام ابن ماجہ نے ابوالدرداء کے حوالے سے نقل کی ہے اور وہ ابوداؤد ومسند احمد بن حنبل میں بھی آئی ہے۔

(۲۴۰/۲) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عِيسَى الْمِصْرِيُّ ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ وَهْبٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ اَيُّوْبَ عَنْ سَهْلِ بْنِ مَعَاذِ بْنِ اَنَسٍ عَنْ اَبِيهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: "مَنْ عَلَّمَ عِلْمًا فَلَهٗ اَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهٖ لَا يَنْقُصُ مِنْ اَجْرِ الْعَامِلِ"

حدیث باب کی سند میں دو کمزوریاں پائی جاتی ہیں پہلی یہ کہ سہل بن معاذ کو ابن معین اور ابن حبان نے ضعیف قرار دیا ہے گرچہ عجلی کے ساتھ دوسرے موقع پرابن حبان ہی نے ان کی

توثیق بھی کی ہے دوسرا اعتراض حافظ بوصیری نے یہ کیا ہے **ويحيى بن ايوب لم يدرك سهل بن معاذ ففيه انقطاع** تو اس طرح یہ سند ضعیف اور منقطع قرار پائی لیکن متن حدیث کی نظیریں دوسری احادیث میں بھی موجود ہیں مثلاً صحیح مسلم کی حدیث **من سن في الاسلام سنة حسنة فعمل بها بعده كتب له مثل اجر من عمل به ولا ينقص من اجورهم شئ** اور مسلم ہی کی دوسری روایت میں **من دل على خير فله مثل اجر فاعله** اور اسی طرح صحیح کی تیسری روایت میں **من دعا الى هدى كان له من الاجر مثل اجور من تبعه لا ينقص ذلك من اجورهم شيئا** ان احادیث سے حدیث باب کے متن کی تصدیق ہوتی ہے اور اس کی صداقت میں پھر کوئی شبہ نہیں رہتا یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ عام طور پر ایک عالم کی شخصیت بہت سارے معلموں کی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے تو اس صورت میں ہر ہر معلم کو اتنا ہی ثواب ملے گا جس قدر ایک شخصیت کی تعمیر میں اس کا حصہ ہے اس طرح جہاں تک اس کے اثرات پہنچیں گے موثر کو ثواب ملتا رہے گا۔

(۲۴۱/۳) حَدَّثَنَا اِسْمَاعِيْلُ بْنُ اَبِيْ كَرِيْمَةَ الْحَرَانِيُّ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلْمَةَ عَنْ اَبِيْ عَبْدِ الرَّحِيْمِ حَدَّثَنِيْ زَيْدُ بْنُ اَبِيْ اُنَيْسَةَ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِيْ قَتَادَةَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "خَيْرُ مَا يُخَلِّفُ الرَّجُلُ مِنْ بَعْدِهِ ثَلَاثٌ وَلَدٌ صَالِحٌ يَدْعُوْ لَهُ وَصَدَقَةٌ تَجْرِيْ يَبْلُغُهُ اَجْرُهَا وَعِلْمٌ يُعْمَلُ بِهِ مِنْ بَعْدِهِ"

فرمایا: انسان دنیا میں جو کچھ چھوڑ کر جاتا ہے ان میں سب سے بہترین چیزیں ہیں نیک لڑکا جو اس کے لئے دعا کرتا ہو صدقۂ جاریہ جس کا ثواب اسے پہنچتا ہو اور ایسا علم کہ جس پر اس کی وفات کے بعد عمل کیا جائے۔

صحیح مسلم میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے **اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلثة من صدقة جارية اوعلم ينتفع به او ولد صالح يدعو له......** حدیث باب کا پہلا ٹکڑا **خير ما يخلف رجل من بعده** خبر مقدم ہے **ثلاث** مبدل منہ اور اگلا پورا جملہ بدل واقع ہے دونوں مل کر مبتدا موخر ہوئے..........انسان کے اعمال کا سلسلہ

صرف اس کی زندگی تک محدود ہے مرنے کے بعد کسی عمل کی اجازت نہیں ہوگی اور برزخی زندگی میں صرف وہی پونجی کام دے گی جو اس نے عبادت واطاعت کے ذریعے اکٹھی کی یا ثواب جاریہ کے کچھ کام کیئے حدیث کے مطابق وہ صرف تین چیزیں ہیں پہلی نیک اولاد ہے خواہ لڑکی ہو یا لڑکا یعنی اس نے اپنی اولاد کے تمام دینی حقوق ادا کر کے اس کی صحیح اسلامی بنیادوں پر تربیت کی ثواب اولاد کی نیکی کے اثرات میت کے سکون کا باعث ہوں گے اوران کی دعائیں مغفرت ورفع درجات باپ کے حق میں سب سے عظیم تحفہ ہوگی۔

﴿وصدقة تجری یبلغه اجرها﴾ صدقہ جاریہ میں مساجد ومدارس اور دینی تحریکات وغیرہ کا قیام ہے اسی طرح وہ تمام اوقاف بھی شامل ہیں جن سے دوسرے لوگ مستفید ہوں جب تک ان کا فیض جاری رہے گا بانی کو ثواب ملتا رہے گا۔

﴿وعلم ینتفع به من بعده﴾ حضرات محدثین کے نزدیک وہ درس وتدریس ''تہذیب وتزکیہ اور تصنیف وتالیف سب کو شامل ہے چنانچہ تمام دینی کتابوں شاگردوں اور مریدوں کے ذریعے جو بھی دین کی خدمت ہوگی اس کا ثواب مصنف ومدرس اور مربی کو ضرور ملے گا...... حدیث کی سند کی بابت حافظ بوصیری زوائد میں لکھتے ہیں ما یقتضی انه صحیح.

قال ابو الحسن وحدثنا ابو حاتم محمد بن یزید بن سنان الرهاوی حدثنا یزید بن سنان یعنی اباه حدثنی زید بن ابی انیسة عن فلیح بن سلیمان عن زید بن اسلم عن عبد الله بن ابی قتادة عن ابیه سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم فذکر نحوه.

محمد بن یزید کو حافظ نے تقریب (۶۳۹۹) میں لیس بالقوی اور یزید بن سنان کو (۷۷۲۷) ضعیف قرار دیا ہے، اس لئے سند کمزور ہے۔

(۲۴۲/۴) **حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ یَحْیَی حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ وَهْبِ بْنِ عَطِیَّةَ حَدَّثَنَا الْوَلِیْدُ بْنُ مُسْلِمٍ حَدَّثَنَا مَرْزُوْقُ بْنُ اَبِی الْهُذَیْلِ حَدَّثَنِی الزُّهْرِیُّ حَدَّثَنِی اَبُوْعَبْدِ اللّٰهِ الْاَغَرُّ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ مِمَّا یَلْحَقُ الْمُؤْمِنَ مِنْ عَمَلِهٖ وَحَسَنَاتِهٖ بَعْدَ مَوْتِهٖ عِلْمًا عَلَّمَهٗ وَنَشَرَهٗ وَوَلَدًا صَالِحًا**

تَرَكَهُ وَمُصْحَفًا وَرَّثَهُ اَوْمَسْجِدًا بَنَاهُ اَوْبَيْتًا لِإِبْنِ السَّبِيْلِ بَنَاهُ اَوْنَهْرًا أَجْرَاهُ اَوْصَدَقَةً اَخْرَجَهَا مِنْ مَالِهِ فِيْ صِحَّتِهِ وَحَيَاتِهِ يَلْحَقُهُ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهِ

مؤمن کے ثواب ونیکی میں انتقال کے بعد بھی کچھ چیزیں شامل ہوتی ہیں وہ علم جس کی نشرواشاعت کی ہو کوئی نیک اولاد چھوڑی ہو قرآن کریم کو وقف کیا ہو یا کوئی مسجد بنائی ہو یا کوئی مسافر خانہ تعمیر کیا ہو یا کوئی نہر کھدوائی ہو یا بحالت صحت کوئی مالی صدقہ کیا یہ چیزیں موت کے بعد بھی اس کے اجروثواب میں اضافہ کرتی رہیں گی

﴿فی صحته وحیاته﴾ علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے ای اخرجها فی زمان کمال حاله ووفور افتقاره الی ماله وتمکنه من الانتفاع به یعنی وہ بالکل چاق وچوبند ہو مال اس کی بنیادی ضرورت ہو اور اسے تصرف کی بھی پوری قدرت ہو ایسے وقت میں اگر وہ صدقہ کرتا ہے تو یہ خاص فکر آخرت کی دلیل ہے اور اس کو افضل ترین صدقہ قرار دیا گیا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے ای الصدقة اعظم اجرا فقال ان تصدق وانت صحیح وشحیح اس کے برخلاف آدمی اس وقت صدقہ کرے جب کہ بستر مرگ پر پہنچ کر زندگی کی ساری امیدیں دم توڑ چکی ہوں تو اس کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں ہوگی لیکن ثواب پھر بھی ملے گا ......علامہ سندھی نے ابن المنذر کے حوالے سے لکھا ہے اسناده حسن جب کہ بوصیری کا خیال ہے اسناده غریب.

(۲۴۳/۵) حَدَّثَنَا يَعْقُوْبُ بْنُ حُمَيْدِ بْنِ كَاسِبِ الْمَدَنِيُّ حَدَّثَنِيْ اِسْحَاقُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ طَلْحَةَ عَنِ الْحَسَنِ الْبَصْرِيِّ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَفْضَلُ الصَّدَقَةِ اَنْ يَتَعَلَّمَ الْمَرْءُ الْمُسْلِمُ عِلْمًا ثُمَّ يُعَلِّمَهُ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ.

افضل ترین صدقہ یہ ہے کہ کوئی مسلمان علم حاصل کر کے اسے اپنے مسلمان بھائی کو سکھائے۔بوصیری نے لکھا ہے هذا اسناد ضعیف لضعف اسحاق بن ابراهیم والحسن لم یسمع من ابی هریرة اسی لئے "ضعیف لابن ماجه" میں ناصرالدین البانی نے بھی اس سند کو ضعیف قرار دیا ہے۔

بابُ مَنْ كَرِهَ أَن يُوطأ عَقِبَاهُ

وطی (س) یطأ وطأ روندنا بعض نسخوں میں عقبیه آیا ہے اور علامہ سندھیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ محل نظر ہے کیونکہ اس صورت میں یُوْطَا کا فاعل محذوف ماننا پڑے گا جو کلام عرب میں بہت کم مستعمل ہے جب کہ یُوْطا عقباہ میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں اور یہی اکثر نسخوں میں منقول ہے۔

مسکنت نبوت کا لازمی جز ہے اور نبی عبدیت کے اعلی مقام پر ہوتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بھی ہمیں اسی تواضع کا پتہ دیتی ہے کہ آپ نے فخر دو عالم ہونے کے باوجود پوری زندگی معاشرہ کے ایک عام فرد کی طرح گذاری اور اپنے لئے کبھی کوئی امتیاز پسند نہیں کیا آپ کی معاشرت، اخلاق، نشست و برخاست، سلوک و معاملات، جہاد و فتوحات اور اقتدار وحکومت غرض زندگی کا ہر زاویہ فنائیت وتواضع ہی پر دلالت کرتا ہے اہل علم کی فضیلت بیان کرنے کے بعد امام ابن ماجہ نے یہ باب قائم کیا ہے ان کے پیش نظر کیا بات ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے لأن دأب المشائخ ان يتقدموا على التلامذة في المشي فنبه بهذا على أن تركه اولٰى کیونکہ مشائخ کا معمول ہے کہ وہ چلنے میں طلبہ سے آگے رہتے ہیں امام نے اس باب کے ذریعہ تنبیہ کی ہے اس طریقہ کو چھوڑنا ہی اولی ہے مقتدی شخصیات کو اس باب میں بھی نبی کا اسوہ اپنانا چاہئے۔

(۲۴۴/۱) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنِ شَيْبَةَ، ثَنَا سُوَيْدُ بْنُ عَمْرٍو، عَنْ حَمَّادِ بْنِ سَلْمَةَ عَنْ ثَابِتٍ، عَنْ شُعَيْبِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو، عَنْ اَبِيْهِ قَالَ مَارُوئِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَاكُلُ مُتَّكِئًا قَطُّ وَلَا يَطَأُ عَقِبَيْهِ رَجُلَان

رسول اللہ ﷺ کو کبھی ٹیک لگا کر کھاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا اور دو آدمی بھی آپ کے پیچھے نہیں چلتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے عقائد وعبادات کے ساتھ امت کو آداب معاشرت بھی سکھلائے ہیں کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا، بسم اللہ پڑھنا، دائیں ہاتھ سے کھانا اور آخر میں ہاتھ دھو کر اللہ کا

شکر ادا کرنا اسی ضمن کی تعلیمات ہیں

متکتاً یا کل کی ضمیر کا حال ہے جس کے معنی پیٹھ یا پہلو کا کسی چیز سے سہارا لگانا ہے بعض حضرات نے اسے طبی فوائد پر محمول کیا ہے لیکن علامہ کرمانی نے اس کی تردید کی ہے اور قاضی عیاض نے محققین سے اس کے معنی **التمکن لا کل فی الجلوس کا لمتربع المعتمد علی وطأ تحته لأن هذه الهیئة تستد عی کثرة الاکل** یعنی فرش پر چار زانوں بیٹھ کر کھانا اس صورت میں زیادہ کھایا جاتا ہے علامہ سندھیؒ ایسی تمام شکلوں کو جمع کرتے ہوئے لکھتے ہیں **الاتکاء: هو أن یتمکن فی الجلوس متربعاً اور یستوی قاعداً علی وطأ اویسندظهره الی شيء اویضع احد یدیه علی الأرض وکل ذلك خلاف الادب المطلوب حال الاکل وبعضه فعل المتکبرین وبعضه فعل المکثرین من الطعام** خلاصہ یہ نکلا کہ چہار زانو بیٹھنا، پشت ٹیکنا، ایک ہاتھ زمین پر رکھنا سب خلاف ادب وسنت ہیں جو متکبر اور پرخور لوگوں کا شیوہ ہے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے بذل المجہود (۳۵۱/۴) میں بھی تقریباً یہی بات کہی ہے۔

﴿**ولا یطأ عقبیه رجلان**﴾ علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے **انه من غایة التواضع لایتقدم اصحابه فی المشی بل اما ان یمشی خلفهم کما جاء ویسوق اصحابه اویمشی فیهم** یہ آپ کی حد درجہ تواضع تھی کہ راستہ میں صحابہ سے آگے نہیں بڑھتے تھے یا تو ان کے وسط میں چلتے یا انہیں آگے بڑھا کر پیچھے چلتے تھے یہی ترجمۃ الباب ہے علامہ سندھی فرماتے ہیں **وحاصل الحدیث انه لم یکن علی طریق الملوك والجبابرة فی الأکل والمشی ﷺ وبارك وکرّم** کہ آپ کھانے اور چلنے میں بادشاہوں اور مغروروں کے طریقہ پر نہ تھے بلکہ انتہائی متواضع تھے.......... حدیث ابوداؤد (اطعمہ/۳) میں بھی آئی ہے ابن ماجہ کی سند درست ہے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے بذل المجہود میں لکھا ہے کہ حدیث باب کی سند میں اگر **ابیه** سے مراد محمد ہیں تو یہ حدیث مرسل ہوگی کیونکہ وہ صحابی نہیں ہیں لیکن اگر یہ **ابیه** سے شعیب کے دادا مراد ہیں تو یہ مسند ہے شعیب کا دادا سے سماع ثابت ہے ......ان کا پورا نام یہ ہے شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو۔

قال ابوالحسن حدثنا حازم بن یحیٰی ، قال حدثنا ابراهیم بن الحجاج السامی قال حدثنا حماد بن سلمة (فذكرنحوه)

قال ابوالحسن ، حدثنا ابراهم بن نصر الهمدانی صاحب القفیز ثنا موسی بن اسماعیل قال حدثنا حماد بن سلمة (فذكر نحوه)

دونوں روایات میں فذكر نحوه کی جوزیادتی ہے وہ مصطفیٰ اعظمی کی تخریج سے نقل کی گئی ہے اصل نسخوں میں وہ موجود نہیں ہے لیکن اس کا حذف صحیح نہیں ہے۔

﴿ابو الحسن﴾ یہ امام کے شاگرد اور موجودہ نسخہ کے راوی ہیں، علو سند کی وجہ سے وہ ابن ماجہ کے واسطے کے بغیر اپنی بعض سندوں کو ذکر کرتے ہیں چنانچہ ان دونوں سندوں میں ان کے اور حماد بن سلمہ کے درمیان دو استاذ ہیں جب کہ ابن ماجہ کے واسطے سے رواۃ کی تعداد تین ہوجاتی ہے۔

(۲/۲۴۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوالْمُغِيْرَةِ قَالَ حَدَّثَنَا مُعَانُ بْنُ رِفَاعَةَ حَدَّثَنِي عَلِيُّ بْنُ يَزِيْدَ قَالَ سَمِعْتُ الْقَاسِمَ بْنَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ يُحَدِّثُ عَنْ اَبِیْ أُمَامَةَ ، قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ فِيْ يَوْمٍ شَدِيْدِ الْحَرِّ نَحْوَبَقِيْعِ الْغَرْقَدِ فَكَانَ النَّاسُ يَمْشُوْنَ خَلْفَهٗ فَلَمَّا سَمِعَ صَوْتَ النِّعَالِ وَقَرَ ذٰلِكَ فِيْ نَفْسِهٖ فَجَلَسَ حَتّٰى قَدَّمَهُمْ أَمَامَهٗ لِئَلَّا يَقَعَ فِيْ نَفْسِهٖ شَيْءٌ مِنَ الْكِبْرِ.

رسول اللہ ﷺ ایک دن شدید گرمی میں بقیع کی طرف آئے لوگ آپ کے پیچھے چل رہے تھے چنانچہ آپ نے جب جوتوں کی آواز سنی تو یہ بات آپ کو گراں گزری آپ وہیں بیٹھ گئے تا کہ صحابہ کو اپنے سامنے آگے بڑھادیں اور دل میں کبر کا شائبہ بھی نہ آئے۔

﴿وقر ذلك فی نفسه﴾ قرةً ووقاراً بوجھل ہونا، یہاں گراں گزرنا مراد ہے۔

﴿شیٔ من الكبر﴾ یہ راوی کا اپنا خیال ہے علامہ سندھی فرماتے ہیں فلا ينبغی له الاغتراء تکبر کی بات آپ کی شان کے مناسب نہیں بل ينبغی له زيادة الخوف والأخذ بالأحوط والتجنب عن الاسباب المؤدية الى الأفات النفسانية حددرجہ خوف واحتیاط اور نفسانی آفات تک پہنچانے والے اسباب سے پرہیز کی تعبیر آپ کے لئے

مناسب ہے مجددیؒ فرماتے ہیں فعل علیه السلام لتحذیرهم عن ذلك و الا فذاته ﷺ ارفع وابعد ان یقع فی نفسه شیءٌ من الکبر یعنی صحابہ کی تعلیم وتحذیر کے لیے حضور نے ایسا کیا ورنہ آپ کی بابت کبر کا تصور بھی بعید ہے، بوصیری نے زوائد میں لکھا ہے هذا اسناده ضعیف لضعف رواته قال ابن معین علی بن یزید، عن القاسم عن ابی امامة، هی ضعفاء کلها حافظ (۹۳۸۶) نے ابو المغیره کو مجهول ابن رفاعہ (۶۷۴۷) کو لین الحدیث کثیر الإرسال اور علی بن یزید (۴۸۱۵) کو مستور قرار دیا ہے۔

(۲۴۶/۳) حَدَّثَنَا عَلِیُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ، ثَنَا وَکِیعٌ ،عَنْ سُفْیَانَ ، عَنْ الْأَسْوَدِ بْنِ قَیْسٍ عَنْ نُبَیْحٍ الْعَنَزِیِّ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا مَشٰی مَشٰی أَصْحَابُهُ اَمَامَهُ وَتَرَکُوْا ظَهْرَهُ لِلْمَلَائِکَةِ.

نبی ﷺ جب چلتے تھے تو صحابہ آپ کے آگے چلتے تھے اور آپ کی پشت کو فرشتوں کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔

حدیث باب میں صحابہ کے معمول کا تذکرہ ہے جب کہ مسند احمد بن منیع میں مذکور ہے "مَشَوا خلفَ النبی ﷺ فقال اِمشوا اَمامی وخَلُّوا ظهری للملٰئکةِ" گویا آپ کا انہیں حکم تھا یعنی تواضعاً آپ انہیں اپنے آگے کر دیتے اور خود کچھ فاصلہ سے چلتے تھے علامہ سندھی نے لکھا ہے ای تعظیما للملائکة الماشین خلفه یعنی آپ کے پیچھے چلنے والے فرشتوں کی تعظیم میں صحابہ ایسا کرتے تھے بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے هذا اسناد صحیحٌ رجاله ثقاتٌ.

باب الوصاة لطلبة العلم

الوصاة وصیت کو کہتے ہیں جمع وصیٌ ، وصایة، اور وَصَایة آتی ہے امام ابن ماجہ کا مخاطب اس باب میں علماء ہیں وہ یہ تاکید کرنا چاہتے ہیں کہ جب لوگ ان سے علم سیکھنے آئیں تو ان کے ساتھ اعزاز واکرام کا معاملہ کیا جائے کیونکہ علم اللہ کی صفت ہے اور اسکا طلب گار ومتلاشی بھی اللہ کے یہاں بلند مقام کا حامل ہے قرآن نے عالم وجاہل کی حیثیت کو زندہ ومردہ

سے تعبیر کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اسے انبیاء کا وارث قرار دیا ہے نبی کی وارثت ظاہر ہے مال و دولت میں نہیں ہوتی بلکہ اس کا سلسلہ صرف علم وعمل میں چلتا ہے اس لئے علماء وطلباء در حقیقت نبی کے جانشین اور خلفاء ہیں فرشتے ان کے قدموں کے نیچے پر بچھاتے ہیں الملائکة تضع اجنحتها رضاً لطالب العلم زمین وآسمان بلکہ سمندر کی مچھلیاں تک ان کے لئے دعاء کرتی ہیں یستغفر له من فی السموت ومن فی الارض حتی الحیتان فی جوف الماء عابدوں کے مقابلے میں ان کی حیثیت ایسے ہے جیسا کہ ستاروں کے جھرمٹ میں چودھویں کا چاند، وہی دین کے حامل اور شریعت کے پاسبان ہیں ان ہی کے دم سے اسلام اپنی اصل شکل میں محفوظ ہے اس لئے روئے زمین کی اس افضل ترین مخلوق کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی رسول اللہ ﷺ نے پوری امت کو تاکید کی ہے فاذأتوا کم فاستوصوا بھم خیرا اور ان کے ساتھ حقارت وبدسلوکی دنیا وآخرت دونوں جہاں میں ذلت ورسوائی کا سبب ہے امام نے اسی حقیقت کو سمجھانے کے لئے یہ باب قائم کیا ہے۔

(۱/۲۴۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْحَارِثِ بْنِ رَاشِدِ الْمِصْرِيُّ ، حَدَّثَنَا الْحَكَمُ بْنُ عَبْدَةَ عَنْ أَبِي هَارُوْنَ الْعَبْدِيِّ، عَنْ اَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "سَيَأْتِيكُمْ اَقْوَامٌ يَطْلُبُوْنَ الْعِلْمَ ، فَاِذَا رَأَيْتُمُوْهُمْ فَقُوْلُوْا لَهُمْ : مَرْحَبًا مَرْحَبًا بِوَصِيَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَاَقْنُوْهُمْ" قُلْتُ لِلْحَكَمِ مَا "اَقْنُوْهُمْ؟" قَالَ: عَلِّمُوْهُمْ.

عنقریب لوگ تمہارے پاس علم حاصل کرنے کے لئے جوق در جوق آئیں گے جب تم انہیں دیکھو تو رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق انہیں مرحبا کہنا اور تعلیم دینا میں نے حکم سے پوچھا "اقنوھم" کا کیا مطلب ہے انہوں نے فرمایا علموھم یعنی ان کو تعلیم دینا۔

﴿سیأتیکم أقوام یطلبون العلم﴾ علامہ سندھی نے لکھا ہے الخطاب للصحابة ویلحق بھم العلماء یعنی اصلاً خطاب تو صحابہ کو ہے کیونکہ وہی علوم نبوت کے سب سے پہلے حامل اور امت کے سب سے پہلے معلم تھے علماء کیونکہ علم وفضل میں انہیں کے جانشین ہیں اسلئے اب قیامت تک اس حکم کا اطلاق انہیں پر ہوگا، وفات کے بعد یہ حدیث امر واقعہ بن کر ظاہر

ہوئی اور عالم اسلام کے تمام خاندان اور قبائل صحابہ کرامؓ سے استفادہ کرنے کیلئے مدینہ منورہ امنڈ پڑے جن کو صحابہ نے نہ صرف علوم سے روشناس کیا بلکہ بوقت ضرورت ان کی ہر طرح کفالت بھی کی بعد کی صدیوں میں بھی یہ سلسلہ قائم رہا اور علم وعمل کے سینکڑوں مرکز قائم ہوئے۔

﴿مرحبا مرحبا﴾ علامہ سندھیؒ نے تقدیر عبارت یہ لکھی ہے أتیت رحبا او رَحُبَت بلك دارٌ مرحبًا یعنی تم کشادگی میں آئے یا گھر تمہارے لئے کشادہ اور فرش راہ ہو گیا گویا یہ لفظ استقبال کے ساتھ عمدہ تعلیم وتربیت کی تاکید کو بھی مستلزم ہے۔

﴿بوصیة رسول الله ﷺ﴾ علامہ سندھی فرماتے ہیں والمراد بالوصیة من اوصی بهم رسول الله ﷺ یعنی اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی بابت آپ نے حسن سلوک کی وصیت کی۔

﴿ما أقنوهم﴾ یہ سوال محمد بن الحارث نے اپنے استاذ حکم بن عبدہ سے کیا تو انہوں نے مذکورہ وضاحت کی لیکن علامہ سندھی نے لکھا ہے اُمر من افناء یہ افناء کے باب سے امر کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں فتویٰ دینا پختہ بات بتلانا اور مستند تعلیم ان دونوں کو متضمن ہے، یا یہ قنیة سے ہے جس کے معنی کمائی کے ہیں، مجددی ت فرماتے ہیں واجعلوا لهم قنیة من العلم یستغنون بها اذا احتاجوا الیه تم انہیں علم کی پونجی دیدو، جب انہیں اس کی ضرورت ہوگی استفادہ کرلیں گے...... حدیث کو امام ترمذی نے (العلم/۴) میں نقل کر کے یحیٰی بن سعید کے حوالے سے لکھا ہے کان شعبة یضعف اباهارون العبدی یہ راوی ابن ماجہ کی سند میں بھی موجود ہے حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب (۴۰۸) میں لکھا ہے متروك ومنهم من كذبه شیعی علامہ سندھی فرماتے ہیں قلت ابوهارون العبدی ضعیف باتفاقهم اس لئے سند کمزور ہو جاتی ہے۔

(۲/۲۴۸) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَامِرِ بْنِ زُرَارَةَ ثَنَا الْمُعَلَّى بْنُ هِلَالٍ عَنْ اِسْمَاعِيْلَ قَالَ دَخَلْنَا عَلَى الْحَسَنِ نَعُوْدُهُ حَتّٰى مَلَأْنَا الْبَيْتَ فَقَبَضَ ثُمَّ قَالَ دَخَلْنَا عَلٰى اَبِىْ هُرَيْرَةَ نَعُوْدُهُ حَتّٰى مَلَأْنَا الْبَيْتَ فَقَبَضَ رِجْلَيْهِ ثُمَّ قَالَ دَخَلْنَا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ حَتّٰى مَلَأْنَا الْبَيْتَ وَهُوَ مُضْطَجِعٌ لِجَنْبِهٖ

فَلَمَّا رَءَ ا نَا قَبَضَ رِجْلَيْهِ ثُمَّ قَالَ: اِنَّهُ سَيَاتِيكُمْ اَقْوَامٌ مِنْ بَعْدِي يَطْلُبُوْنَ الْعِلْمَ فَرَحِّبُوْبِهِمْ وَ حَيُّوْهُمْ وَعَلِّمُوْا هُمْ قَالَ فَادْرَكْنَا وَاللّٰهِ اَقْوَاماً مَا رَحَّبُوْبنا وَلَا حَيَّوْنَا اِلَّا بَعْدَ اَنْ كُنَّا نذهَبُ اِلَيهِمْ فَيَجْفُوْنَا

اسماعیل کہتے ہیں ہم عبادرت کرنے کیلئے حضرت حسن کی خدمت میں حاضر ہوئے یہاں تک کہ ہم نے ان کے گھر کو بھر دیا وہ لیٹے ہوئے تھے انہوں نے اپنے پاؤں کو سمیٹ لیا پھر فرمایا کہ ہم بھی عیادت کرنے کیلئے حضرت ابوہریرۃؓ کی خدمت میں اسی طرح حاضر ہوئے تھے کہ ان کے گھر کو بھر دیا تھا وہ آرام فرمارہے تھے انہوں نے اپنے پاؤں کو سمیٹا اور فرمایا ہم بھی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اسی طرح حاضر ہوئے تھے کہ ہم نے گھر کو بھر دیا تھا آپ پہلو کے بل آرام فرماتھے جب ہم کو دیکھا تو آپنے پاؤں کو سکیڑ لیا پھر فرمایا یقیناً تمہارے پاس میرے بعد بہت جلد کچھ قومیں علم کی طلب میں آئیں گی تم انہیں مرحبا کہنا اور انہیں درازیٔ عمر کی دعادے کر علم سکھانا حضرت حسن نے کہا خدا کی قسم ہم نے ایسے لوگوں کو پایا جنہوں نے ہمارا خیر مقدم کیا نہ ہم کو دعاء دی اور نہ ہی وہ ہم کو تعلیم دینے کے لئے تیار ہوئے ہاں یہ ضرور ہوا کہ جب ہم ان کے پاس پہنچتے تھے تو یہ ہم سے اچھا سلوک نہیں کرتے تھے۔

﴿فقبض رجليه﴾ علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے اى توقيراً له اومن كثرة الزحام ہمارے نزدیک پہلی توجیہ راجح ہے اور بھیڑ اس کا عارضی سبب ہے شیخ مجددیؒ بھی تواضعاً للمسلمین کی صراحت کرتے ہیں...... یاد رہے کہ نعوده دونوں جگہ جملہ کی صورت میں ضمیر متکلم کا حال واقع ہے۔

﴿سيأتيكم أقوام من بعدى يطلبون العلم﴾ يطلبون العلم جملہ کی صورت میں اقوام کا حال ہے یعنی وفات نبوی کے بعد یہ لوگ کیونکہ علوم نبوت کے شوق میں تمہارے پاس آئیں گے اور اس کے علاوہ ان کی تم سے کوئی دنیاوی غرض نہ ہوگی اس لئے ان کو تعلیم و تربیت دینا تو ضروری ہوگا ہی ان کے اخلاص و محبت کی بناء پر تم انہیں خوش آمدید بھی کہنا کیونکہ وہ واقعۃً مہمانان رسول ہوں گے۔

﴿فرحبوا بهم﴾ علامہ سندھیؒ نے اسکے معنی قولوا لهم مرحباً لکھے ہیں مرحب

کے اصل معنی تو کشادگی اور فراخی کے ہیں اب مرحبابکم کا مطلب یہ ہوا کہ آپ فراخ جگہ میں تشریف لائے آپ کیلئے ہمارے دلوں میں کشادگی ہے گویا یہ اعزاز واکرام کی ایک پرزور تعبیر ہے۔ جبکہ مجددیؒ نے تقدیری عبارت ارحبو امرحبا یا لقیت مرحباً وسعۃ لکھی ہے۔

﴿وحیوّھم﴾ تحیة کے معنی زندہ رہنے کی دعا دینا ہے عربوں میں آج بھی سلام کے بعد حیاك اللّٰہ کہنے کا عمومی رواج ہے گویا خوش آمدید کہنے کے بعد دعاء دینا بھی طلبہ کا حق ہے۔

﴿وعلموھم﴾ پرزور استقبال اور دعا خیر کے بعد تعلیم کا حکم ہے کیونکہ انشراح صدر کے بعد یکسوئی ہو جاتی ہے معلوم ہوا کہ علمی استفادہ کیلئے استاذ وشاگرد کا مخلصانہ تعلق بھی ضروری ہے۔

﴿فادرکنا واللّٰہ اقواماً﴾ علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں اقوام من المشائخ لا التلامذة اقوام سے حضرت حسن کی مراد طلبہ نہیں مشائخ اور اساتذہ ہیں۔

﴿الا بعد ان کنا نذھب الیھم فیجفونا﴾ جفا جفاءً نصر کے باب سے آتا ہے معنی بداخلاق ہونا تندمزاج ہونا بے رخی برتنا تحقیر سے پیش آنا حضرت حسن بصری ۲۱/ ہجری دور فاروقی میں پیدا ہوئے ہیں اور خلافت راشدہ ہی میں وہ جوان ہو چکے تھے ایسے خیر القرون میں اساتذہ نے طلبہ سے یہ سلوک کیا سمجھ میں نہیں آتا جب کہ اس وقت علم کی مسندوں پر زیادہ تر صحابہ کرام ہی جلوہ افروز تھے؟ علامہ سندھی نے اس اشکال کی بابت فقیہ احمد بن ابی الخیر کا یہ قول نقل کیا ہے ان قول الحسن ھذا یحمل علی من ادرك من غیر الصحابة رضی اللّٰہ تعالٰی عنھم فان اکثر علمه انما اخذہ من غیرھم حضرت حسن کا یہ قول صحابہ کے علاوہ دوسرے حضرات کے بارے میں ہے کیونکہ ان کے علم کا زیادہ تر حصہ تابعین ہی سے ماخوذ ہے حضرت مجددی نے میں لکھا ہے الظاھر أنه من قول الحسن البصری کأنه یشکو عن شأن رجال نصبوا انفسھم لتعلیم العلم ثم تجبروا وتکبروا من تعلیم الفقراء والمساکین ولم یکن ھذا الابعد الصحابة رضوان اللّٰہ علیھم ہمارے خیال میں حضرت حسن کے ساتھ ایسا واقعہ ایک دو مرتبہ ہی پیش آیا ہے کیونکہ اکابر تابعین سے بھی ایسے سلوک کی توقع نہیں کی جاسکتی...... حدیث کے ایک راوی معلّٰی بن بلال بن سوید ہے جن کے بارے میں حافظ نے تقریب التہذیب (۶۸۰۷) میں لکھا ہے اتفق النقاد علی تکذیبه اس

لئے بوصیری اسناده ضعیف فیه المعلی بن هلال کذبه احمد و ابن معین وغیرهما و نسبه فیه المعلی بن حال کذبه احمد و ابن معین مغیرهما و نسبه الی وضع الحدیث غیر واحد و اسماعیل هو ابن مسلم اتفقوا علی ضعفه ہمارے نزدیک سند کا حکم اس سے کہیں زیادہ شدید ہے۔

(۲۴۹/۳) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، ثَنَا عَمْرُو بْنُ مُحَمَّدٍ الْعَنْقَزِيُّ، أَخْبَرَنَا سُفْيَانُ عَنْ أَبِي هَارُوْنَ الْعَبْدِيِّ قَالَ: كُنَّا اِذَا أَتَيْنَا اَبَا سَعِيْدِ الْخُدْرِيَّ قَالَ مَرْحَبًا بِوَصِيَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَنَا: اِنَّ النَّاسَ لَكُمْ تَبَعٌ وَاِنَّهُمْ سَيَأْتُوْنَكُمْ مِنْ أَقْطَارِ الْاَرْضِ يَتَفَقَّهُوْنَ فِي الدِّيْنِ فَاِذَا جَاءُوْكُمْ فَاسْتَوْصُوْا بِهِمْ خَيْرًا.

عبدی کہتے ہیں کہ ہم جب ابوسعید خدری کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو وہ فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی وصیت تمہیں مبارک ہو بے شک آپ نے ہم سے فرمایا تھا کہ لوگ تمہارے تابع ہیں وہ یقیناً تفقہ فی الدین کے لئے بہت جلد تمہارے پاس دنیا کے ملکوں سے آئیں گے تو جب وہ تمہارے پاس پہنچیں تو ان کی بابت تم اچھے سلوک کو یاد رکھنا۔

﴿ان الناس لکم تبع﴾ یہ تابع کی جمع ہے جب کہ دوسرا قول مصدر کا ہے کیونکہ بطور مبالغہ اس سے بھی صفت بناتے ہیں جیسے رجل عدل ملا علی قاریؒ یہاں ایک نکتے کا انکشاف کرتے ہیں اور وہ ہے وفیه مأخذ تسمیة التابعی تابعیا[1] یعنی تابعی کا لفظ یہیں سے ماخوذ ہے آگے فرماتے ہیں والخطاب لعلماء الصحابة یعنی الناس یتبعونکم فی افعالکم و اقوالکم لانکم اخذتم عنی مکارم الاخلاق فان الشریعة اقوالی و الطریقة افعالی و الحقیقة احوالی یہ اہل علم صحابہ سے خطاب ہے کہ لوگ تمہارے افعال و اقوال کی پیروی کریں گے کیونکہ یہ تعلیم تم نے مجھ سے حاصل کی ہے تو شریعت میرے اقوال کا نام ہے اور سنت میرے افعال کی کہتے ہیں اور میرے حالات ہی دین کی بنیاد و حقیقت ہیں۔

﴿فاستوصوا بهم خیرا﴾ علامہ طاہر پٹنی نے لکھا ہے فاطلبوا الوصیة و النصیحة لهم عن انفسکم بالتعلیم و الوعظ یعنی تم تعلیم و تربیت کے ذریعہ ان کی خیر خواہی کرنا[2]

---

[1] مرقاۃ المفاتیح [2] جامع ترمذی ۲-۹۳ حاشیہ ۲

علامہ سندھی نے لکھا ہے وفيه مبالغة حيث أمروا بأن يجر دوا عن انفسهم اخر ما يطلبون منهم التوصية في حق طلبة العلم یہاں اس بات پر زور ہے کہ حضرات معلمین وہ سارے علوم ان کے حوالے کردیں جن کے وہ خواہش مند ہوں طلبہ کے ساتھ یہی چیز خیر خواہی ہے..... حدیث امام ترمذی نے (العلم/۴) میں نقل کی ہے ابن ماجہ کی سند میں بھی ابوہارون عبدی موجود ہیں جن کی بابت حافظ تقریب (۴۸۴۰) میں لکھا ہے متروك ومنهم من كذبه شيعيٌّ اس لیے سند ضعیف قرار پاتی ہے۔

اَلاِنْتِفَاعُ بِالْعِلْمِ وَالْعَمَلِ بِهٖ

یہ باب علم سے مستفید ہونے اور اس کے تقاضوں پر عمل کرنے کے بیان میں ہے جس کے تحت امام ابن ماجہ نے گیارہ روایتیں درج کی ہیں سب کا مشترک پیغام وخلاصہ یہی ہے کہ علم کا حصول صرف اللہ کے لئے ہو کوئی دنیاوی غرض اس سے مقصود نہ ہو اسی صورت میں بشارتوں کا اطلاق ہوگا اور کسی کے پیش نظر حصول علم سے دنیاوی مفاد، جاہ ومنصب اور اعزاز وافتخار ہو تو یہ اس کے حق میں وبال بن جائے گا اور ایسے ریاء کاروں کا ٹھکانہ جہنم ہوگا کیونکہ اللہ کے نزدیک یہ بدترین لوگ ہیں۔

(۲۵۰/۱) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ، ثَنَا اَبُوْخَالِدِ الْأَحْمَرُ، عَنِ ابْنِ عَجْلَانَ، عَنْ سَعِيْدِ بْنِ أَبِيْ سَعِيْدٍ، عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ، قَالَ: كَانَ مِنْ دُعَاءِ النَّبِيِّ ﷺ "اَللّٰهُمَّ! اِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَايَنْفَعُ، وَمِنْ دُعَاءٍ لَايُسْمَعُ، وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ"

نبی ﷺ کی یہ دعا ہوا کرتی تھی، اے اللہ میں اس علم سے پناہ چاہتا ہوں جو مفید نہ ہو اس دعا سے جو قبول نہ ہو اس دل سے جس میں خشوع نہ ہو اس نفس سے جو کبھی سیراب نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ کی دعائیں گویا علم ومعرفت کا خزانہ ہیں بنیادی طور پر ان کی دو قسمیں ہیں طلب واستعاذہ، حدیث باب دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے۔

﴿من علم لا ينفع﴾ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے لکھا ہے اى لالى ولا

لغیری ولا فی الدنیا من العمل به ولا فی الآخرۃ من الثواب علیه[1] یعنی جو علم میرے لئے دوسروں کے لئے دنیا میں عمل کی توفیق اور آخرت میں ثواب کا باعث نہ بن سکے میں اس سے پناہ چاہتا ہوں حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ فرماتے ہیں من علم لا اعمل به ولا علم به الناس ولا یصل برکته الی قلبه ولا یبدل افعالی واقوالی واخلاقی المضرۃ الی المرضیة[2] یعنی اس علم سے پناہ چاہتا ہوں جس پر میں عمل کروں نہ دوسرے لوگ عمل کریں اور نہ اس کی برکتیں میرے قلب میں پیدا ہوں اور نہ ہی وہ مرے غلط افعال اقوال اور اخلاق کو بدل کر مہذب بنا سکے علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے فان من العلم ما لا ینفع صاحبه یصیر علیه حجة قیامت میں ایسا علم ہی انسان کے خلاف حجت بن جائے گا جیسا کہ جامع ترمذی کی روایت میں آتا ہے ما ذا عمل فی ماعلم.

﴿ومن دعاء لا یسمع﴾ دوسرے طرق میں لا یستجاب لها منقول ہے دعاء کی قبولیت کا باری تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے ادعونی استجب لکم اسی طرح ابوداؤد اور ترمذی کی روات ہے ان ربکم حی کریم یستحی من عبده اذا رفع یدیه أن یردهم صفراً مسند احمد کی روایت قبولیت کے تین درجوں کا پتہ دیتی ہے (۱) اما ان یعجل له دعوته یا تو باری تعالیٰ اسی وقت منہ مانگی مراد دے دیتے ہیں (۲) واما أن یدخرها له فی الآخرۃ یا اس کی دعاء کو آخرت کا ذخیرہ بنا دیا جاتا ہے (۳) واما ان یصرف عنه من السوء مثلها یا اس کے بدلے میں باری تعالیٰ کوئی تکلیف یا مصیبت کو دور کر دیتے ہیں دعاء کا رد ہونا کبھی تو حرام روزی کی وجہ سے ہوتا ہے کبھی اس کا سبب بے اعتنائی کے ساتھ مانگنا ہوتا اسی طرح وہ دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں جن کا نتیجہ گناہوں کا ارتکاب یا قطع رحمی ہو یہاں ان تمام موانع اور گناہوں سے بچنے کی تاکید ہے۔

﴿ومن قلب لا یخشع﴾ خشوع کے معنی خوف وانکساری کے ساتھ اللہ کی اطاعت کرنا ہے ایمان کے بعد ہر دل میں یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے اسی لئے قرآن نے اسے اہل ایمان کی صفت بتلایا ہے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے اس کے معنی ای من عند ذکر اللہ

---

[1] بذل المجہود ۲/۲۶۸ [2] التعلیق الصبیح کتاب الدعوات باب الاستعاذہ فصل اول

تعالیٰ[1] لکھے ہیں مولانا محمد ادریسؒ صاحب کاندھلوی نے اسے لا یخاف اللّٰہ سے تعبیر کیا ہے جو یقیناً ایمان کی ضد ہے۔یعنی اللہ کے ذکر کے وقت بھی خشوع وخوف پیدا نہ ہو۔سیوطی نے فرمایا وان القلب انما خلق لان یَخشع بها ربه و ینشرح لذلك الصدر ويقذف النور فيه فاذا لم يكن كذلك كان القلب قاسيا فيجب ان يُستعاذ منه. یعنی دلوں کو پیدا ہی اللہ سے ڈرنے کے لئے کیا گیا ہے تاکہ انشراح اور نور پیدا ہو، اگر یہ صورت نہیں ہوتی تو وہ دل سخت ہے جس سے پناہ مانگنی ضروری ہے۔

﴿ومن نفس لا تشبع﴾ اس کا مطلب علامہ سندھی نے ای حريصة على الدنيا لا تشبع منها لکھا ہے یعنی زہد وقناعت سے خالی ہوکر وہ آرزاؤں کا مسکن بن جائے ترجمة الباب پہلا جملہ ہے سند کے راوی ابوخالد احمر کو ابن حجر نے تقریب میں صدوق يخطئ ابن عجلان کو صدوق الا أنه اختلطف عليه أحاديث ابی هريرة اور سعید ابن سعید کو مجھول لکھا ہے اس لئے سند کمزور ہے مستقلاً حدیث نسائی (الاستعاذہ/٦۳) میں بھی آئی ہے لیکن پہلے راوی کو چھوڑ کر سند بعینہٖ یہی ہے۔

(۲۵۱/۲) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ حَدَّثَنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ نُمَيْرٍ عَنْ مُوْسٰى بْنِ عُبَيْدَةَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ ثَابِتٍ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اللّٰهُمَّ انْفَعْنِيْ بِمَاعَلَّمْتَنِيْ وَعَلِّمْنِيْ مَا يَنْفَعُنِيْ وَزِدْنِيْ عِلْمًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَال.

اے اللہ! آپ نے جو علم مجھے نصیب فرمایا اس کو میرے لئے نافع بنادے اور مجھے وہی علم عطا فرما جو میرے لئے نافع ہو مجھے مزید علم سے نوازیئے اور تعریف ہر حال میں اللہ ہی کی تعریف ہے۔

ترمذی میں واعوذ باللّٰه من حال اهل النار کا بھی اضافہ ہے یہ حدیث باب کی پہلی روایت ہی کے ایک ٹکڑے من علم لا ینفع کی شرح وتفسیر ہے جس میں عطا کردہ علم کو تو نافع بنانے اور آئندہ علم نافع کا سوال کیا گیا ہے جس میں اضافہ کا بندہ ہمہ وقت خواستگار ہے آخری جملہ یہ بتلاتا ہے کہ ہم اللہ کے ہر فیصلہ پر راضی ہیں اور اسی کی تعریف کرتے رہیں گے خواہ

[1] بذل المجھود ۲/۲٦۸ [2] صحیح مسلم ۲/۳۵۰

ہمیں علم زیادہ دیا جائے یا کم، حدیث ترمذی کتاب الدعوات (۱۱۹) میں بھی موجود ہے مصنف نے ہذا حدیث غریب من ہذا کہا ہے راوی کو چھوڑ کر دونوں کی سند یکساں ہے ابن ماجہ کی سند کو ناصر الدین البانی نے ضعیف لابن ماجہ/۲۰ میں صحیح قرار دیا ہے۔

(۲۵۲/۳) حَدَّثَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ حَدَّثَنَا يُوْنُسُ بْنُ مُحَمَّدٍ وَشُرَيْحُ بْنُ النُّعْمَانَ قَالَا: حَدَّثَنَا فُلَيْحُ بْنُ سُلَيْمَانَ عَنْ عَبْدِ للّٰهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ مَعْمَرٍ اَبِيْ طُوَالَةَ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا يُبْتَغٰى بِهِ وَجْهُ اللّٰهِ لَا يَتَعَلَّمُهُ اِلَّا لِيُصِيْبَ بِهِ عَرْضًا مِنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَعْنِيْ رِيْحَهَا قَالَ اَبُوْالْحَسَنِ أَنْبَأَنَا اَبُوْحَاتِمٍ حَدَّثَنَا سَعِيْدُ بْنُ مَنْصُوْرٍ حَدَّثَنَا فُلَيْحُ بْنُ سُلَيْمَانَ فَذَكَرَ نَحْوَهُ.

فرمایا: جس نے ایسا علم حاصل کیا جس سے اللہ کی خوشنودی ملتی ہے اور اس کا مقصد اس سے صرف دنیا کی منفعت ہے تو ایسا شخص قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔

حصول علم کا مقصد خدا شناسی اور راہ راست کی دریافت ہے اور دنیوی قدر و منزلت ضمنی چیزیں ہیں لیکن کوئی شخص اگر اصل مقصد کو پس پشت ڈال کر صرف دنیاوی اغراض کے لئے علم حاصل کرے تو یقیناً یہ علم کی توہین ہے اور ایسا شخص نبوی تصریح کے مطابق جہنم کا مستحق ہے قرآن وسنت کی اصطلاح میں کیونکہ علم علوم نبوت ہی کو کہا جاتا ہے اس لئے ملا علی قاری، علامہ سندھیؒ مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ اور دیگر شراح نے یہاں علم دین کی صراحت کی ہے۔

﴿لا يتعلمه﴾ ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ اس جملہ کی ترکیب میں تین احتمال ہیں (۱) تعلم کے فاعل کا حال ہے (۲) تعلم کا مفعول ہے (۳) علما کی دوسری صفت ہے[۱] اس جملہ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ جہنم کی وعید کا مصداق انسان اس وقت ہوگا جب کہ اس کا مقصد صرف اور صرف دنیوی غرض ہو، لیکن وہ رضاء الٰہی کے ساتھ اگر دنیا کی طرف مائل ہو تو وہ اس وعید سے خارج ہے جیسا کہ علامہ سندھی نے تصریح کی ہے **وفيه دلالة على أن الوعيد المذكور لمن لا يقصد بالعلم الا الدنيا واما من طلب بعلمه رضا المولى ،**

ومع ذلك له ميل ما الى الدنيا فخارج عن هذا الوعيد ......

﴿الا ليصب عرضا﴾ عرض سے مراد علامہ سندھی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے متاعا من الدينا لیا ہے، جب کہ ملا علی قاریؒ نے مالا او جاهًا کی وضاحت کی ہے۔

﴿لم يجدعرف الجنة﴾ عرف کو بو کہتے ہیں لیکن اس کا استعمال خوشبو کے لئے ہوتا ہے، تورپشتی نے اس تعبیر کو مبالغة فی تحريم الجنة قرار دیا ہے علامہ سندھیؒ لکھتے ہیں لان من لا يجد ريح الشيء لا يتناوله قطعا اسی طرح تمام شارحین حدیث یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ یہ شخص صرف اوائل وہلہ ہی میں جنت سے محروم رہے گا اور سزا بھگت کر دوسرے گنہگاروں کی طرح وہ بھی جنت میں داخل ہوگا...... حدیث سنن ابی داؤد (علم/۱۰ میں آئی ہے سند دونوں کی یکساں ہیں ابن نعمان کو حافظ نے ثقة يهم قليلا اور فليح ابن سليمان کو صدوق كثير الخطا قرار دیا ہے بقیہ رواۃ عمدہ ہیں

(۲۵۳/۴) حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ ثَنَا حَمَّادُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ثَنَا اَبُوْ كُرَيْبٍ الْاَزْدِيُّ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ اَوْ لِيُبَاهِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ اَوْلِيَصْرِفَ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْهِ هُوَ فِي النَّارِ .

جو علم کو بیوقوفوں سے جھگڑنے علماء پر فخر جتانے اور لوگوں کے چہروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے حاصل کرے وہ جہنم میں جائے گا

﴿ليمارى به السفهاء﴾ حضرات محدثین نے یماری کے معنی یجادل اور یقاوم بتلائے ہیں علامہ سندھی نے لکھا ہے ای يجادل به ضعاف العقول یعنی کم عقلوں پر اپنے علم کا رعب جھاڑے۔

﴿اوليباهى به العلماء﴾ دوسرے طریق میں یہاں یجاری کا لفاظ آیا ہے پہلے کے معنی فخر جتلانا اور دوسرے کا مطلب مقابلہ کرنا ہے گویا حصول علم کا مقصد ہی فخر و مقابلہ ہو۔

﴿اوليصرف وجوه الناس اليه﴾ ملا علی قاری نے لکھا ہے ای ليعظموه

او یعطوا المال له یعنی لوگوں کی تعظیم اور ہدایا کا خواہش مند ہو یا ان کے دوسرے قول کے مطابق یطلب العلم لمجرد الشهرة بین الناس اس کا مقصد صرف شہرت ہو علامہ سندھی نے اس مفہوم کو بڑی خوبصورت اور جامیعت کے ساتھ ادا کیا ہے فرماتے ہیں ینوی به تحصیل المال والجاه وصرف وجوه الناس العوام الیه وجعلهم کالخدم له اوجعلهم ناظرین اذا تکلم متعجبین من کلامه اذا تکلم معتمین حوله اذا اجلس دنیا پرستوں کی عموماً یہی آرزئیں ہوتیں ہیں کہ وہ دولت حاصل کر کے عوام کے منظور نظر بن جائیں وہ ان کی خدمت کریں ان کی بات اہتمام سے سنی جائے وہ جہاں بیٹھیں لوگ جمع ہو جائیں۔

﴿فهو فی النار﴾ علامہ سندھی فرماتے ہیں معناه أنه یستحقها بلا دوام کہ یہ ایمان کے باعث عارضی ہوگا ثم فضل الله واسع فان شاء عفا بلا دخول یعنی بغیر سزا کے بھی وہ معاف کرسکتا ہے۔

سند کے پہلے راوی ابوکرب ازدی کو ابن حجر نے تقریب (۸۳۲۶) میں مجھول، حماد ابن عبدالرحمٰن (۱۵۰۲) ضعیف اور ہشام بن عمار (۷۳۰۳) کو لیس بثقة قرار دیا ہے بوصیری نے زوائد بن ماجہ میں لکھا ہے اسناده ضعیف لضعف حماد وابی کرب.

(۲۵۴/۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ یَحْیٰی، ثَنَا ابِیْ مَرْیَمَ أَنْبَأَنَا یَحْیٰی بْنُ أَیُّوْبَ، عَنِ ابْنِ جُرَیْجٍ، عَنْ أَبِی الزُّبَیْرِ، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تَعَلَّمُوْا الْعِلْمَ لِتُبَاهُوْ بِهِ الْعُلَمَاءَ وَلَا لِتُمَارُوْا بِهِ السُّفَهَاءَ وَلَا تَخَیَّرُوْا بِهِ الْمَجَالِسَ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَالنَّارُ النَّارُ.

تم لوگ علم کو اس لئے نہ حاصل کرو کہ اس کے ذریعہ تم علماء پر رعب جماؤ اور نہ اس لئے کہ تم اس کے سہارے بیوقوفوں سے بحث کرو علم کے باعث اچھی نشست اس کی خواہش اور نہ کرو۔

دو حصے تو حدیث سابق ہی کی طرح ہیں جب کہ تیسرے کے معنی علامہ سندھیؒ نے یہ لکھے ہیں ای لا تختاروا به خیار المجلس وصدورها یعنی مجلسوں میں عمدہ واعلی نشست کی خواہش نہ کرو۔

﴿فالنار النار﴾ علامہ سندھیؒ نے تقدیر عبارت میں دو احتمال نقل کئے ہیں (۱) فله

النار اس صورت میں نار مرفوع ہوگی (۲) فیستحق النار یہاں مفعولیت کی بناء پر نار پر نصب پڑھا جائے گا تو بیک وقت دونوں ہی اعراب کا امکان ہے...... بوصیری نے زوائد میں لکھا ہے رجال اسناده ثقات.

(۲۵۵/۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الصَّبَّاحِ ، أَنْبَأَنَا الْوَلِيْدُ بْنُ مُسْلِمٍ ، عَنْ يَحْيَى بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ الْكِنْدِيِّ، عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِي بُرْدَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اِنَّ أُنَاسًا مِنْ اُمَّتِي سَيَتَفَقَّهُوْنَ فِي الدِّيْنِ ، وَيَقْرَأُوْنَ الْقُرْآنَ وَيَقُوْلُوْنَ ، نَاتِي الْأَمْرَاءَ فَنُصِيْبُ مِنْ دُنْيَاهُمْ وَنَعْتَزِلُهُمْ بِدِيْنِنَا وَلَا يَكُوْنُ ذٰلِكَ كَمَا لَا يُجْتَنٰى مِنَ الْقَتَادِ اِلَّا الشَّوْكُ كَذٰلِكَ لَا يُجْتَنٰى مِنْ قُرْبِهِمْ اِلَّا...... قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ الصَّبَّاحِ كَاَنَّهُ يَعْنِي الْخَطَايَا

میری امت میں کچھ لوگ تفقہ فی الدین کا اظہار کریں گے قرآن کو پڑھیں گے اور کہیں گے کہ ہم امراء کے پاس جا کر ان کی دنیا سے حصہ لیتے ہیں اور اپنے دین کو ان سے بچائے رکھتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوگا جس طرح کانٹے کے درخت سے صرف کانٹا ہی توڑا جاتا ہے اسی طرح ان کے قرب سے صرف لغزش و گناہ ہی حاصل ہوں گے۔

﴿سیتفقهون﴾ علامہ طیبی نے اس کے معنی سیدعون الفقہ[۱] بتلائے ہیں یعنی وہ تفقہ فی الدین کا دعویٰ کریں گے سندھی کی بھی یہی رائے ہے۔

﴿ویقرأون القرآن﴾ ملا علی قاری نے فرماتے ہیں ای بالقرءآت او بتفسیر الآیات[۲] اس سے مراد مختلف قرائتیں یا تفسیر و وضاحتیں ہیں۔

﴿ناتی الامراء﴾ عربی میں امراء دولت مند کو نہیں بلکہ مسلم حکمرانوں کو کہا جاتا ہے۔

﴿فنصیب من دنیاهم﴾ یعنی ہم صرف ان کی دنیا سے استفادہ کرتے ہیں۔

﴿ونعتزلهم بدیننا﴾ ملا علی قاری نے لکھا ہے ای نبعد عنهم بالاّ نشارکهم فی اثم یرکبونہ[۳] ان سے اپنا دین اس طرح بچائے رکھتے ہیں کہ ان کے کسی گناہ میں ہم شریک نہیں ہوتے۔

---

۱ ۲ ۳ مرقاة المفاتیح ۱/۳۱۰

﴿ولا یکون ذلك﴾ ملا علی قاری فرماتے ہیں ای لا یصح ولا یستقیم ماذکر من الجمع بین الضدین[1] یعنی دنیا کو وصول کرنا اور دین کو محفوظ رکھنا ایک دوسرے کی ضد ہے جن کا اجتماع آسان نہیں ہے اجتناء جنیاً سے افتعال کا مصدر ہے معنی پھل توڑنا جب کہ قتاد کی بابت علامہ سندھی نے لکھا ہے شجر ذو شوك لا یکون له ثمر سوی الشوك گویا یہ امراء گناہوں کا منبع بن چکے ہیں جن کی صحبت دین کو فاسد کر دیتی ہے الا کے بعد آپ نے کچھ ارشاد نہیں فرمایا کیونکہ محذوف مفہوم معروف ہے اور صحابہ نے اس کا پورا ادراک کر لیا محمد ابن الصباح راوی کہتے ہیں کہ "اِلَّا" کے بعد رسول اللہ ﷺ نے خطایا کا ارادہ کیا ہے یہ دراصل فتن اور آثار قیامت کی حدیث ہے جس کا مظاہرہ آج ہر سمت نظر آتا ہے کہ بعض علماء کافر حکمرانوں کے گھروں کا طواف کر کے اس وعید کا مصداق بنتے ہیں بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے هذا اسناد ضعیف وعبید اللّٰہ ابن ابی بردۃ لا یعرف ہمارے نزدیک یہ فیصلہ محل نظر ہے کیونکہ ابن ابی بردہ مجہول نہیں معروف ہیں اور حافظ نے تقریب (۴۳۴۲) میں انہیں مقبول من الرابعة قرار دیا ہے اسلئے حافظ عبد العظیم منذری نے کتاب الترغیب والترهیب میں اِنَّ جمیع رواته ثقات کا فیصلہ کیا ہے۔

(۲۵۶/۷) حَدَّثَنَا عَلِیُّ بْنُ مُحَمَّدٍ وَمُحَمَّدُ بْنُ اِسْمَاعِیْلَ قَالَا ثَنَا عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنِ مُحَمَّدٍ الْمُحَارَبِیُّ ثَنَا عَمَّارُ بْنُ سَیْفٍ عَنْ اَبِیْ مُعَاذِ الْبَصَرِیِّ ح وَحَدَّثَنَا عَلِیُّ بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا اِسْحَاقُ بْنُ مَنْصُوْرٍ عَنْ عَمَّارِ بْنِ سَیْفٍ عَنْ اَبِیْ مُعَاذٍ عَنِ ابْنِ سِیْرِیْنَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ جُبِّ الْحُزْنِ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا جُبُّ الْحُزْنِ قَالَ وَادٍ فِیْ جَهَنَّمَ یَتَعَوَّذُ مِنْهُ جَهَنَّمُ کُلَّ یَوْمٍ اَرْبَعَ مِاۃِ مَرَّۃٍ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَن یَّدْخُلُهُ قَالَ اُعِدَّ لِلْقُرَّاءِ الْمُرَائِیْنَ بِاَعْمَالِهِمْ وَاِنَّ مِنْ اَبْغَضِ الْقُرَّاءِ اِلَی اللّٰهِ الَّذِیْنَ یَزُوْرُوْنَ الْاَمَرَاءَ قَالَ الْمُحَارِبِیُّ الْجَوْرَۃَ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ غم کی گھاٹی سے پناہ مانگو صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے

[1] مرقاۃ المفاتیح ۱/۳۱۰

رسول غم کی گھاٹی کیا ہے؟ فرمایا جہنم کی ایسی وادی ہے جس سے خود جہنم بھی روزانہ چار سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے پوچھا گیا اے اللہ کے رسول اس میں کون داخل ہوگا فرمایا وہ ان قراء کے لئے تیار کی گئی جو اپنے اعمال میں ریا کاری کرتے ہیں یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین قراء وہ ہیں جو امراء کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ محاربی کہتے ہیں کہ یہاں ظالم امراء مراد ہیں۔

﴿جب الحزن﴾ جمع اجباب و جباب آتی ہے گہری گھاٹی اور کچے کنویں کو کہتے ہیں جب کہ حزن فرحت کی ضد ہے رنج وملال، علامہ سندھی نے طیبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب کی اضافت حزن کی طرف ایسے ہی ہے جیسا کہ دار السلام میں دار کی اضافت سلام کی طرف ہے ای فیھا السلام من الأفات گویا جہنم کی اس وادی میں رنج وغم کی بھرمار ہوگی۔

﴿یتعوذ منه جهنم﴾ علامہ سندھی فرماتے ہیں الظاهر انه علی حقیقته بظاہر یہ حقیقت پر محمول ہے والمراد سائر اودیة جهنم اور یہاں جہنم سے اس کی تمام وادیاں مراد ہیں جو دراصل شدتِ عذاب کی تعبیر ہے سندھی کا خیال ہے ینبغی ان یراد بجهنم ما اعد لتعذیب العصاة لا الکفرة والمنافقین یہاں جہنم سے وہ مقام مراد لیا جائے جس میں گناہگار مسلمانوں کو عذاب ہوگا وہ جہنم مراد نہیں جو کفار اور منافقین کے لئے مخصوص ہے شیخ الاسلام حضرت کشمیری نے بھی هذه درکة عصاة المومنین لا الکفار کہہ کر اسی کی تائید کی ہے

﴿اربع مائة مرة﴾ جامع ترمذی میں مأة مرة منقول ہے۔

﴿للقراء﴾ احادیث میں یہ لفظ علماء کیلئے استعمال ہوا ہے یعنی قرآن وسنت کے عالم۔

﴿المرائین﴾ رویۃ سے مفاعلت کے مصدر کا اسم فاعل کا صیغہ ہے معنی حقیقت کے خلاف ظاہر کرنا اعمال صالحہ دوسروں کو دکھا کر کرنا تاکہ بزرگی کی شہرت ہو۔

﴿یزورون الأمراء﴾ ایک راوی محاربی نے یہاں الجورة کی قید لگائی ہے جو جائر کی جمع ہے یعنی وہ ظالم بھی ہو ہر امیر سے ملاقات پر یہ وعید نہیں ہے...... حدیث کو (زہد/۳۵) میں نقل کر کے امام ترمذی نے غریب قرار دیا ہے ابن ماجہ کی سند کو البانی نے ضعیف لابن ماجہ/۲۰ میں ضعیف کہا ہے لیکن امام سیوطی کے نزدیک وہ حسن ہے اور یہی دل لگتی بات ہے۔

قَالَ اَبُوْ الحَسَنِ حَدَّثَنَا حَازِمُ بنُ یحییٰ ثنا ابوبَکرِ بنُ اَبِی شَیبةَ ومحمدُ بنُ

نُمیر قالا ثنا ابنُ نُمیرٍ عن مُعاویۃَ النَّصریِّ و کَان ثِقۃً ثم ذکرَ الحدیثَ نحوَہٗ باسنادِہٖ.

حدثنا ابراھیمُ بنُ نصرٍ ثنا ابوغسانٍ مالکُ بنُ اسماعیلَ ثنا عمّارُ بنُ سَیفٍ عَن ابی مُعاذٍ قال مالکُ بنُ اسماعیلَ قال عَمارٌ لا اُدری مُحمدٌ اَوانسَ بنَ سیرینَ

(۸/۲۵۷) حَدَّثَنَا عَلِیُّ بْنُ مُحَمَّدٍ وَالْحُسَیْنُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَا ثَنَا عَبْدُاللّٰہِ بْنُ نُمَیْرٍ عَنْ مُعَاوِیَۃَ النَّصْرِیْ عَنْ نَھْشَلٍ عَنِ الضَّحَّاکِ عَنِ الْاَسْوَدِ بْنِ یَزِیْدَ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَوْ أَنَّ اَھْلَ الْعِلْمِ صَانُوْا الْعِلْمَ وَوَضَعُوْہُ عِنْدَ اَھْلِہٖ لَسَادُوْا بِہٖ اَھْلَ زَمَانِھِمْ وَلٰکِنَّھُمْ بَذَلُوْہُ لِأَھْلِ الدُّنْیَا لِیَنَالُوْا بِہٖ مِنْ دُنْیَاھُمْ فَھَانُوْا عَلَیْھِمْ سَمِعْتُ نَبِیَّکُمْ ﷺ یَقُوْلُ مَنْ جَعَلَ الْھُمُوْمَ ھَماً وَاحِداً ھَمَّ اٰخِرَتِہٖ کَفَاہُ اللّٰہُ ھَمَّ دُنْیَاہُ وَمَنْ تَشَعَّبَتْ بِہِ الْھُمُوْمُ فِیْ اَحْوَالِ الدُّنْیَا لَمْ یُبَالِ اللّٰہُ فِیْ اَیِّ اَوْدِیَتِھَا ھَلَکَ .

حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ اگر علماء علم کی حفاظت کر کے اسے اہل اور لائق لوگوں کو دیتے تو یقیناً وہ اس کی بدولت اپنے زمانے والوں پر حکومت کرتے لیکن اس کو انہوں نے دنیاداروں کو تقسیم کیا تا کہ اس کے ذریعہ دنیاوی منفعت حاصل کریں نیتجتاً وہ ان کی نظروں میں گر گئے میں نے تمہارے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص تمام مقصدوں کا ایک مقصد آخرت کو بنالے گا تو باری تعالیٰ دنیوی مسائل میں بھی اس کی کفالت فرمائیں گے اور جس کے دنیا میں متعدد ارادے ہوئے اللہ کو اس کی کوئی فکر نہیں کہ وہ کس وادی میں دم توڑتا ہے۔

روایت کے اصولاً دو حصے ہیں موقوف اور مرفوع عبداللہ بن مسعود کے افادات پہلی قسم سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ حدیث نبوی دوسری کے ذیل میں آتی ہے۔

﴿صانوا العلم﴾ یعنی شخصیت کو مجروح کرنے والی چیزوں طمع، حسد، اور تکبر سے اگر وہ علم کو محفوظ رکھ کر اس کے تقاضوں یعنی زہد، ایثار، خوفِ الٰہی، فکرِ آخرت اور دعوت وتبلیغ پر عمل پیرا ہوتے۔ تو دنیا ان کے قدموں میں گر جاتی۔

﴿وضعوہ عند اھلہ﴾ ملا علی قاری نے لکھا ہے الذین یعرفون قدر العلم من

أهل الأخرة[۱] یعنی وہ خداترس لوگ جو علم کے مرتبہ سے آشنا ہیں علم کے صحیح وارث ہونے کے مستحق ہیں اور نالائقوں کو پڑھانے والا حدیث کے مطابق کمقلد الخنازیر الذهب واللؤلو ہے ابن مسعود کے زمانے میں ایسے دنیا دار علماء آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھے لیکن آج واقعی ان کی بڑی اکثریت ہے جنہوں نے دولت کی خاطر علم اور اپنے مرتبہ کو گرادیا۔

﴿لسادوابه﴾ ملا علی قاری فرماتے ہیں ای فاقوا بالسیا دة وفضيلة السعادة بسبب الصيانة والوضع عند اهل الكرامة دون اهل الاهانة[۲] تو یقیناً سیادت وسعادت، علم کی حفاظت اور نالائقوں کے بجائے اہل لوگوں میں اس کی اشاعت کی بنا پر ان کا مرتبہ بلند ہوتا۔

﴿فهانوا عليهم﴾ سندھی نے فرمایافانهم اهانوا رفيعاً فأهانهم الله جب انہوں نے ایک بلند چیز کو گرایا تو اللہ نے انہیں بھی ذلیل کردیا۔

﴿ولكنهم بذلوه لاهل الدنيا﴾ ملا علی قاری نے اس کا مطلب بأن خصوهم به او ترددوا اليهم به[۳] لکھا ہے یعنی انہوں نے علم صرف دنیا داروں ہی کو دیا، یا اسے لے کر ان کے گھروں کے طواف کئے۔

﴿نبيكم﴾ طیبی فرماتے ہیں هذا الخطاب توبيخ للمخاطبين حيث خالفوا أمر نبيهم[۴] یہ جملہ مخاطبین کیلئے تنبیہ ہے کیوں کہ انہوں نے اپنے نبی کے حکم کی مخالفت کی ہے۔

﴿من جعل الهموم هماً واحداً﴾ سندھی نے لکھا ہے من کا ن له هموم متعددة فتركها وجعل موضعها الهم الواحد کہ جس کے بہت سے مقاصد تھے جن کو چھوڑ کر صرف ایک آخرت کو مقصد بنالیا تو باری تعالیٰ اس کی برکت سے دنیاوی مقاصد میں بھی کامیابی عطا فرمائیں گے۔

﴿ومن تشعبت به الهموم﴾ علامہ سندھی نے لکھا ہے تفرقت الهموم اوفرقته الهموم یعنی ارادے مختلف ہوں یا ارادے خود اسی کو حیص و بیص میں مبتلا کردیں۔

﴿لم يبال الله﴾ اس کا مطلب ملا علی قاری نے لا ينظر اليه نظر رحمة[۵] اور

۱،۲ مرقاۃ المفاتیح ۱/۳۱۰ ۳،۴،۵ مرقاۃ المفاتیح ۱/۳۱۱

علامہ سندھی نے کنایۃ عن عدم الکفایۃ و العون لکھا ہے کہ باری تعالیٰ اس پر رحمت کی نظر نہیں ڈالیں گے اور یہ کفایت ونصرت نہ کرنے کا اشارہ ہے اللہ معاف فرمائے اس وقت ہم سب کا یہی حال ہے ترجمۃ الباب یہ ہے کہ علم کا فائدہ عمل کی توفیق اور فکر آخرت میں مضمر ہے اگر ان دونوں میں محرومی رہی تو پھر اس کے حصول کا کوئی نتیجہ نہیں...... سند کے ایک راوی نہشل بن سعید کو حافظ نے تقریب میں (۷۱۹۸) متروک و کذبه اسحاق بن راهویه قرار دیا ہے اس لئے بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے اسنادهٗ ضعیف فیه نهشل بن سعید ناصر الدین البانی نے "ضعیف لا بن ماجه" میں موقوف کو ضعیف اور مرفوع کو حسن قرار دیا ہے کیونکہ مستدرک میں اسی مضمون کی روایت موجود ہے حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے۔

قال ابو الحسن : حدثنا حازمُ بنُ یحییٰ ، ثنا ابوبکرِ بنُ أبی شَیبَةَ و محمدُ بنُ عبدِ اللّٰه بنِ نُمیرٍ، قالا: حدثنا ابنُ نُمیرٍ، عن مُعاوِیةَ النَّصرِیِّ و کان ثِقةً ثم ذکرَ الحدیثَ نحوَه باسنادِہٖ.

(۹/ ۲۵۷) حَدَّثَنَا زَیْدُ بْنُ أَخْزَمٍ، وَعَبَّادُ بْنُ وَلِیْدٍ، قَالَا ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبَّادٍ الْهُنَائِیُّ ثَنَا عَلِیُّ بْنُ الْمُبَارَكِ الْهُنَائِیُّ ، عَنْ اَیُّوْبَ السَّخْتِیَانِیِّ عَنْ خَالِدِ بْنِ دُرَیْكٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ، اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِغَیْرِ اللّٰهِ، اَوْ اَرَادَ بِهِ غَیْرَ اللّٰهِ، فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"

جس نے علم کو غیر اللہ کیلئے حاصل کیا یا اس سے غیر اللہ کی نیت کی تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

قرآن وسنت کی اصطلاح میں علم سے مراد دینی علم ہوا کرتا ہے چنانچہ حضرت گنگوہی نے اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے العلم الدینی اذ هو العلم حقیقة[1] یہاں علم سے دینی علم مراد ہے کیونکہ حقیقی علم وہی ہے۔

﴿لغیر اللّٰه﴾ اس کے حصول کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہونا چاہئے کیونکہ وہ اللہ کی صفت ہے اور ذات وصفات سے متعلق علوم کو مولا کی خوشنودی اور اپنی عاقبت سنوارنے ہی کیلئے حاصل کرنا چاہئے تاکہ خالق ومخلوق کے تعلق کو سمجھ کر ہم پھر عابد ومعبود کے رشتے کو استوار کریں۔

[1] الکوکب الدری ۱/ ۱۲۹

ظاہر ہے اتنی عظیم چیز کو دنیا کی ذلیل اغراض کا ذریعہ بنانا خود باری تعالیٰ کی توہین ہے اسی لئے جہنم کی وعید سنائی گئی ہے حدیث کے ذخیرے میں یہ شاید سب سے سخت وعید ہے جو اس کے علاوہ تفسیر بالرائے اور کذب علی النبی کی بابت بھی منقول ہے تو گویا غیر اللہ کیلئے علم حاصل کرنا بھی اسی نوعیت کا جرم ہے باری تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے ترجمۃ الباب یہ ہے کہ حصول علم کا فائدہ اس پر عمل اور اللہ کی خوشنودی کی طلب میں مضمر ہے...... حدیث ترمذی میں بھی آئی ہے اور پہلے راوی کو چھوڑ کر دونوں کی سند بھی یکساں ہے رواۃ تقریبا قابل اعتبار ہیں اس لئے ضعیف لابن ماجه /۲۲ میں ناصر الدین البانی کا اس سے ضعیف قرار دینا درست نہیں ہمارے نزدیک وہ حسن لذاته کے درجے کی حدیث ہے۔

(۲۵۹/۱۰) حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ عَاصِمِ الْعَبَّادَانِيُّ ثَنَا بَشِيْرُ بْنُ مَيْمُوْنَ قَالَ سَمِعْتُ اَشْعَثَ بْنَ سَوَّارٍ عَنِ ابْنِ سِيْرِيْنَ عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ لَا تَعَلَّمُوْا الْعِلْمَ لِتُبَاهُوْا بِهِ الْعُلَمَاءَ اَوْلِتُمَارُوْا بِهِ السُّفَهَاءَ اَوْلِتَصْرِفُوْا وُجُوهَ النَّاسِ اِلَيْكُمْ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَهُوَ فِي النَّارِ.

باب کی چوتھی اور پانچویں حدیث کے تحت شرح گذر چکی ہے سند کے ایک راوی بشیر بن میمون کو ابن معین نے اجمعوا علی طرح حدیثه امام بخاری نے منکر الحدیث بل متهم بالوضع[1] حافظ ابن حجر نے متروك متهم کہا ہے[2] اس لیے حافظ بوصیری نے هذا اسناد ضعیف کا فیصلہ کیا ہے ہمارے نزدیک یہ ضعف شدید تر ہے۔

(۲۶۰/۱۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ اِسْمَاعِيْلَ اَنْبَأَنَا وَهْبُ بْنُ اِسْمَاعِيْلَ الْاَسَدِيُّ ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ سَعِيْدِ الْمَقْبُرِيُّ عَنْ جَدِّهٖ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ لِيُبَاهِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ وَيُجَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ وَيَصْرِفُ بِهِ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْهِ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ جَهَنَّمَ.

ایک راوی عبداللہ بن سعید مقبری کے واضع حدیث اور متروک ہونے پر محدثین کا اتفاق ہے اس لئے بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے اسنادهٗ ضعیف لا تفاقهم علی عبدالله بن سعید بالوضع.

---

[1] ملاحظہ حاشیہ سندھی باب الانتفاع بالعلم والعمل به [2] تقریب التہذیب نمبر ۷۲۵

بَابُ مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ فَكَتَمَهُ

ادیان سابقہ کی تاریخ میں یہ پہلو بہت واضح اور نمایاں ہے کہ ان کی ہدایات وتعلیمات ایک مختصر مدت تک تو یقیناً عام رہیں اور ان سے مختلف طبقوں نے استفادہ کیا لیکن آگے چل کر ایک طاقت ور مذہبی طبقہ ظاہر ہوا جس نے دین کے تمام سرچشموں پر اپنی گرفت مضبوط کر کے اسے محض اک خاندانی جاگیر میں بدل دیا جس کے باعث عوام علوم نبوت سے بالکل محروم کر دیئے گئے اور ان کے کسی فرد نے اگر دین کو کبھی حاصل کرنے کی کوشش کی تو مذہبی قیادت نے اسے مجرم قرار دے کر سخت سزائیں دیں نتیجتاً دین پر دبیز پردے پڑ گئے۔

اسلام اللہ کا آخری دین ہے اور اس سے رہنمائی حاصل کرنا نوع انسانی کے ہر فرد کا حق ہے اس لئے ضروری تھا کہ اس کی اشاعت کا ایسا نظام قائم کیا جائے جس کے باعث بلاتفریق تمام انسانوں کی دین تک رسائی ہو اور کوئی طبقہ اس پر اپنی اجارہ داری قائم نہ کر سکے اس سلسلے میں سب سے پہلا انتظام تو یہ کیا گیا کہ اس کا حامل عربوں کو بنایا گیا جن کی فطرت بخل سے نا آشنا اور سخاوت کی خوگر تھی تاریخ اقوام پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ بخل جس قوم کی سرشت میں موجود ہوگا وہ مال و دولت ہی نہیں علوم وفنون کے سلسلے میں بھی بخیلی سے کام لے کر ہر قسم کی منفعت وعزت کو اپنے لئے محفوظ کرنا چاہتی ہے یہود ونصاریٰ اور ہندو اس کی زندہ مثال ہیں۔

دوسرا نظم یہ ہوا کہ دیگر مذاہب کی طرح اسلام میں کسی ایسے طبقے کی کوئی گنجائش نہیں جو محض نسل کی بنیاد پر قیادت کا دعوے دار ہو اور اسے شرعی قوانین کے رد و بدل کا بھی اختیار دیا گیا ہو یہاں سب ضابطے کے مکلّف اور قانون کے پابند ہیں کسی کو کوئی امتیاز ورعایت نہیں۔

تیسرے تبلیغ دین ضروری قرار دی گئی اور **الا فليبلغ الشاهد الغائب** کا اعلان کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان کی منصبی حیثیت کو واضح کیا تا کہ علوم نبوت کا یہ کارواں مسلسل رواں دواں رہے اور اس سے ہر شخص حصہ پا سکے۔

چوتھا نظم یہ ہوا کہ علم کا حصول بلاتفریق سب پر فرض کیا گیا **طلب العلم فريضة على كل مسلم** اور دوسری جانب ان طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ہر عالم ومبلغ کو یہ وصیت فرمائی سیاتیکم اقوام یطلبون العلم فاذا رئیتموھم فقولو لھم مرحبا مرحبا بوصیة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقنوہ اسی طرح تعلیم وتعلم کے اور بھی بے شمار فضائل حدیث میں موجود ہیں۔

اب سب سے آخری انتظام کتمان علم کے متعلق یہ وعید ہے جس میں صراحت کے ساتھ اسے ایک نا قابل برداشت جرم قرار دیا گیا ہے اور ایسا کرنے والے کو سخت عذاب کا مستحق بتایا ہے اس باب کو سب سے آخر میں قائم کر کے امام ابن ماجہ نے اشاعت دین کی بابت شریعت کے انہیں انتظامات کی طرف اشارہ کیا ہے چنانچہ واقعہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات و مآخذ ہر صدی میں عام رہیں اور آج بھی قرآن اور حدیث کی تمام کتابوں تک رسائی ہر مسلمان کا رات ودن کا مشغلہ ہے جب کہ دیگر مذاہب کی بنیادی تعلیمات و کتابیں صرف ان کے مخصوص لوگوں کے پاس ہی ہوتی ہیں عوام کو ان سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

(۲۶۱/۱) حَدَّثَنَا اَبُوبَکْرِ بْنُ أَبِیْ شَیْبَةَ حَدَّثَنَا أَسْوَدُ بْنُ عَامِرٍ حَدَّثَنا عُمَارَةُ بْنُ زَاذَانَ حَدَّثَنَا عَلِیُّ بْنُ الْحَکَمِ حَدَّثَنَا عَطَاءٌ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ ”مَا مِنْ رَجُلٍ یَحْفَظُ عِلْمًا فَیَکْتُمُهُ اِلَّا اُتِیَ بِهِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مُلْجَمًا بِلِجَامٍ مِنَ النَّارِ“

قال ابوالحسنِ أ ی القطانُ وحدثنا ابوحَاتِمٍ حدثنا ابوُالوَلیدِ حدثنا عُمارةُ بنُ زاذانَ (قال ابوالحسن ایضا حدثنا ابراھیمُ بنُ نُصَیرٍ حدثنا أبو نُعَیمٍ حدثنا عمارةَ بنُ زاذان) فذکر نحوہ.

جو شخص بھی حصول علم کے بعد اسے چھپائے گا وہ قیامت کے دن اس حال میں لایا جائیگا کہ اسے آگ کی لگام پہنائی گئی ہوگی۔

سند کے تمام رواۃ ثقہ ہیں صرف عمارہ بن زاذان حافظہ کے اعتبار سے کمزور ہیں ابن حجر نے تقریب ص: (۴۸۴۷) میں ان کو ”صدوق کثیر الخطاء“ قرار دیا ہے اس لئے دوسرے طرق کی موجودگی میں سند حسن قرار پاتی ہے کتمان علم پر گفتگو اگلی حدیث میں ہوگی۔

(۲۶۲/۲) حَدَّثَنَا أَبُوْ مَرْوَانَ الْعُثْمَانِیُّ مُحَمَّدُ بْنُ عُثْمانَ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِیْمُ بْنُ

سَعْدٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ عَبدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ هُرْمُزَ الْأَعْرَجِ أَنَّهُ سَمِعَ
اَباهُرَيرَةَ يَقُوْلُ وَاللّٰهِ! لَوْلَا ايَتَانِ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى مَا حَدَّثْتُ عَنْهُ
(يَعْنِيْ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) شَيْئًا أَبَدًا لَوْ لَا قَوْلُ اللّٰهِ (اِنَّ
الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتَابِ) الى اخر الآيتين.

ابن ماجہ کی حدیث مختصر ہے جب کہ امام بخاری نے **كتاب العلم كتاب الحرث والمزارعة** اور **كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة** میں اسی طرح امام مسلم نے باب فضائل ابی ہریرۃ میں یہ حدیث مفصل نقل کی ہے دونوں کے طرق ملا کر واقعہ اس طرح ہے

سعید ابن المسیب اور اعرج روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرۃ نے فرمایا کہ لوگ سوچتے ہیں ابو ہریرؓ بہت حدیثیں بیان کرتے ہیں حالانکہ انصار و مہاجرین ایسا نہیں کرتے قسم اللہ کی جو حساب لینے والا ہے میں تمہیں اس کی وجہ بتلاتا ہوں میرے انصاری بھائی تو کاشتکاری کرتے تھے اور مہاجرین کو تجارت کرنی پڑتی تھی جب کہ میں مسکین وفقیر آدمی تھا موٹا جھوٹا کھا کر بس رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پڑا رہتا نتیجہ میں ان موقعوں پر بھی موجود رہتا جب انصار ومہاجرین نہ ہوتے اور وہ چیزیں یاد رکھ لیتا جسے دوسرے بھول جاتے ایک دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں جو شخص بھی اپنا کپڑا پھیلا کر میری گفتگو سنے اور آخیر میں اسے اکھٹا کر کے اپنے سینے سے لگالے تو وہ میری کوئی حدیث نہیں بھول سکتا، اس وقت میرے پاس صرف ایک اونی چادر تھی میں نے اسے فورا بچھادیا آپ ﷺ جب گفتگو سے فارغ ہوئے تو میں نے چادر کو اکھٹا کر کے اپنے سینے سے لگالیا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اس دن سے آج تک میں کوئی بھی حدیث نہیں بھولا خدا کی قسم اگر قرآن کریم میں دو آیتیں نازل نہ ہوتیں تو میں تم سے کچھ بھی بیان نہ کرتا **ان الذين يكتمون ما انزل الله من الكتاب ......الرحيم** تک۔

حضرت ابو ہریرۃؓ غزوہ خیبر کے بعد ے ہجری میں ایمان لائے اور بمشکل تین سال انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں زندگی گذاری، اس تھوڑی مدت میں اتنی زیادہ احادیث بیان کرنا جتنی کہ سابقین اولین سے بھی مروی نہیں لوگوں کو اچنبھے میں ڈالتا تھا اسی شبہ کے ازالے

کے لئے آپ نے صراحت کی کہ میں دن رات خدمت نبوی میں حاضر رہتا اور تمام اعمال وفرمودات کو محفوظ رکھتا، اسی لئے بہت تھوڑے عرصے میں میرے پاس حدیثوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا، پھر نبوت کا آخری دور دراصل شریعت کے نزول کا دور ہے اور بیشتر احکام وقوانین اسی عہد میں نازل ہوئے ہیں، اسلئے پہلے کی بہ نسبت یہ دور زیادہ علوم سے بھرا ہوا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کثیر الروایہ صحابی ہیں ان کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار تک پہنچتی ہے پچھلی شریعتیں کتمان کے سبب مٹ گئیں اور قرآن نے بھی اس عمل کو مذموم وحرام قرار دیا اس لئے حضرت ابو ہریرہؓ نے دن رات اس ذخیرہ کی اشاعت کی اور جو کچھ انہیں دامن رسالت سے ملا تھا وہ سب بے کم وکاست انہوں نے امت تک پہنچا دیا۔ مجددی فرماتے ہیں کہ عالم وداعی کو بھی ریاکاری اور جاہ کے خوف سے علم کی اشاعت اور فریضۂ دعوت کو چھوڑنا نہیں چاہئے بلکہ وہ احتیاط کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہیں۔

بخاری ومسلم کی روایات میں ان الذین یکتمونَ ما انزلنا من البینات والھدی والی آیت الرحیم تک منقول ہے، جب کہ ابن ماجہ کی سند میں ان الذین یکتمون ما انزل اللّٰہ من الکتاب ویشترون بہ ثمنا قلیلا مروی ہے قرین قیاس یہ ہے کہ دونوں آیتیں ہی حضرت ابو ہریرہؓ کا مستدل ہیں، حافظ ابن حجر فتح الباری میں حدیث کا مطلب ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

ومعناہ لولا ان اللّٰہ ذم الکاتمین للعلم ماحدثت اصلا لکن لما کان الکتمان حراما وجب الاظھار فلھذا حدثت الکثرۃ لکثرۃ ما عندی[1] یعنی اگر علم چھپانے والوں کی باری تعالیٰ مذمت نہ فرماتے تو میں بالکل حدیث بیان نہ کرتا لیکن چھپانا جب حرام ہوگیا تو اب اظہار واجب ہے اس لئے میں بہت حدیث میں بیان کیں کیونکہ میرے پاس ان کا بہت ذخیرہ تھا۔

ابراہیم بن سعد سے آخیر تک پوری سند بخاری کتاب المزارعۃ باب فی الغرس کی ہے جب کہ ابومروان محمد بن عثمان صرف ابن ماجہ کے رواۃ ہیں ابوحاتم نے انہیں ثقۃ، صالح بن محمد

---

[1] فتح الباری کتاب العلم باب حفظ العلم

نے ثقة صدوق الا انه یروی عن ابیه المناکیر ابن حبان نے ثقة یخطئ ویخالف اور ابن حجر نے صدوق یخطئ قرار دیا ہے (تہذیب ۹/۳۳۶ تقریب (۶۱۲۸)) اس لئے سند حسن قرار پاتی ہے۔

(۳/۲۶۳) حَدَّثَنَا الْحُسَيْنُ بْنُ أَبِي السَّرِيِّ الْعَسْقَلَانِيُّ ثَنَا خَلَفُ بْنُ تَمِيمٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ السَّرِيِّ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا لَعَنَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَوَّلَهَا فَمَنْ كَتَمَ حَدِيْثًا فَقَدْ كَتَمَ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ ۔

جب اس امت کا آخری طبقہ پہلے طبقے پر لعنت کرے تو اس وقت جس نے ایک حدیث چھپائی اس نے گویا اللہ کی نازل کردہ تمام چیزوں کو چھپالیا۔

﴿اذا لعن آخر هذه الأمة اولها﴾ صحابہ کرام قرآن وسنت کے اولین مخاطب ہیں اس لئے علم وفضل، تقویٰ وطہارت اور عظمت واحترام میں بعد کا کوئی طبقہ ان کے مساوی نہیں ہوسکتا قرب قیامت میں کیونکہ ہر چیز الٹ جائے گی اس لئے کچھ گستاخ صحابہ پر دست درازی کی بھی حرکت کریں گے جس کا سبب یقیناً جہالت اور بے توفیقی ہوگی جیسا کہ علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے المراد اذا جهلوا بفضائل الصحابة وحرمة اللعن فسبوهم یعنی وہ فضائل صحابہ اور تحریم لعنت سے ناواقفیت کی بناء پر انہیں برا بھلا کہیں گے۔

﴿فمن کتم حدیثا﴾ علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں ای فی فضائل الصحابة وحرمة اللعن یہاں وہ حدیث مراد ہے جو صحابہ کی فضیلت اور ان پر لعنت کے حرام ہونے کو بتاتی ہو، جیسا کہ امام نسائی نے ناموافق حالات میں حضرت علیؓ کے فضائل بیان کرنے کی پاداش میں شہادت پائی اللہ رحم فرمائے اب تو اہل سنت والجماعت کہلانے والے لوگ بھی ناصبیوں اور شیعوں کی طرح صحابہ پر تنقید کر رہے ہیں، اہل حق کا عقیدہ الصحابة کلهم عدول ہے جس سے ادنی تجاوز ناصبیت اور شیعیت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے...... سند میں ایک راوی عبداللہ بن سری ہے جس کو حافظ نے تقریب میں (نمبر ۳۳۴۶) زاهد صدوق روی مناکیر کثیرة یتفرد بها من التاسعة ان کا محمد بن منکدر سے سماع ثابت نہیں اور درمیان

میں کئی واسطے ہیں اس لحاظ سے سند منقطع ہے جب کہ ابن ماجہ نے یہ حدیث جن صاحب سے لی ہے وہ حسین بن ابی السری ہیں حافظ نے تقریب میں (۱۳۴۲) انہیں ضعیف من الحادیة عشرة لکھا ہے اس لئے بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے فی اسناده حسین بن ابی السری کذاب وعبد الله بن السری ضعیف پھر مزی کی تصریح کے مطابق عبد اللہ کا ابن المنکدر سے سماع ثابت نہیں اس لیے شیخ البانی نے ضعیف لابن ماجہ/۲۲ میں اس کو ضعیف جدًا قرار دیا ہے۔

(۲۶۴/۳) حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ الْأَزْهَرِ، ثَنَا الْهَيْثَمُ بْنُ جَمِيلٍ حَدَّثَنِي عَمْرُو بْنُ سُلَيْمٍ، ثَنَا يُوسُفُ بْنُ اِبْرَاهِيمَ قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ فَكَتَمَهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ

جس شخص سے علم کی بابت کوئی سوال کیا گیا اور اس نے اسے چھپالیا (سائل کو صحیح جواب نہ دیا) تو قیامت کے دن اس کو آگ کی لگام دی جائے گی۔

﴿فکتمه﴾ کا سئل پر عطف ہے پورا جملہ شرط ہے جبکہ الجم الخ اس کی جزاء ہے۔

اللہ کی معرفت علم پر موقوف ہے اسی لئے باری تعالیٰ نے علماء سے علم کی اشاعت اور اس کو نہ چھپانے کا عہد لیا ہے واذ اخذ الله ميثاق الذين اوتو الكتاب لتبيننه للناس ولا تكتمونه حدیث باب اسی آیت کی تفسیر ہے جس میں نقض عہد کی سزا میں آگ کی لگام پہنانے کا ذکر ہے...... علم کے مختلف درجات ہیں یہاں کونسا مراد ہے خطابی نے لکھا ہے هٰذا فی العلم الذی یلزمه تعلیمه اياه ويتعين عليه فرضه[1] یہ وعید اس علم کے بارے میں ہے جس کا سکھانا اس کو ضروری ہے اور جو اس پر فرض ہے ملا علی قاری نے بھی هو علم يحتاج اليه السائل فی امر دینه[2] کہہ کر یہی وضاحت کی ہے جب کہ علامہ سندھیؒ نے اذا كان السائل اهلاً لذلك العلم اور حضرت گنگوہیؒ نے ولم يكن فی اظهاره مفسدة.

کی قید لگائی ہے خلاصہ یہ نکلا کہ یہ وعید اس علم کے بارے میں ہے جس کی سائل کو عملی

---

[1] بذل المجہود ۴/ کتاب العلم [2] مرقاۃ کتاب العلم فصل دوم

زندگی میں ضرورت ہو وہ اس کا اہل ہو اور اس کے اظہار میں کوئی فتنہ بھی نہ ہو جیسا کہ میراث وغیرہ کے مسائل یا حلال وحرام کی وضاحت اور کسی نومسلم کا دینی ضروریات کی بابت سوال کرنا کبھی یہ سوال زبان قال کے بجائے زبان حال سے بھی ہوسکتا ہے اور فرد کے بجائے یہ صورت حال پورے معاشرے کو بھی پیش آسکتی ہے اس وقت باطل افکار کی تردید اور دین کے صحیح تصور کو پیش کرنا ہر عالم پر فرض ہوگا......امام ترمذی نے (علم/۳) میں حدیث کو نقل کر کے اسے حسن قرار دیا ہے ابن ماجہ کی سند میں یوسف بن ابراہیم کو حافظ نے تقریب (نمبر ۷۸۵۵) میں ضعیف من الخامسة قرار دیا ہے لیکن علامہ سندھیؒ نے لکھا ہے فالمتن ثابت والكلام في خصوص الأسانيد.

(۲۶۵/۵) حَدَّثَنَا اِسْمَاعِيْلُ بْنُ حِبَّانَ بْنِ وَاقِدِ الثَّقَفِيُّ اَبُوْ اِسْحَاقَ الْوَاسِطِيُّ ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَاصِمٍ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ دَابٍ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. مَنْ كَتَمَ عِلْماً مِمَّا يَنْفَعُ اللّٰهُ بِهٖ فِيْ اَمْرِ النَّاسِ فِي الدِّيْنِ أَلْجَمَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ

جس نے اس علم کو چھپالیا جس سے اللہ دینی امور میں لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے تو قیامت کے دن باری تعالیٰ اسے آگ کی لگام پہنائیں گے۔

قرآنِ کریم نے کتمانِ علم کے سلسلے میں ان الذين يكتمون ما انزلنا من البينات والهدىٰ کی صراحت کی ہے آیت کے آخری الفاظ البينات والهدىٰ بعینہ وہی چیز ہیں جن کو حدیث باب میں فی امر الناس امر الدين کہا گیا ہے یعنی وہ علوم ومسائل جن کی اشاعت ضروری ہے اور روزمرہ عوام کو ان سے سابقہ پڑتا ہے یہ وعید انہی سے متعلق ہے رہے باریک دقیق مسائل تو ان سے اس مضمون کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ اہلیت نہ ہونے کے باعث وہ ان سے تشویش بلکہ فتنے میں مبتلا ہوجائیں گے، شیخ مجددی فرماتے ہیں ان هذا الوعيد مختص بكتمان علم الدين لا الصّنائع الدنيوية یہ وعید علم دین سے متعلق ہے اس کا دنیاوی صنعت وحرفت سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ ان کا چھپانا جائز ہے،..........سند کے ایک

راوی محمد بن داب کی بابت ابن حجر نے تقریب (۵۸۶۶) میں لکھا ہے کذبہ ابوزرعة اس لئے ناصر الدین البانی نے ضعیف لابن ماجہ/۲۲ میں اس سے ضعیف جدًا قرار دیا ہے۔

(۲۶۶/۶) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ حَفْصِ بْنِ هِشَامِ بْنِ زَيْدِ بْنِ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ ثَنَا اَبُوْاِبْرَاهِيْمَ ، ثَنَا اِسْمَاعِيْلُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ الْكَرَابِيْسِيُّ عَنِ ابْنِ عَوْنٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيْرِيْنَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ يَعْلَمُهُ فَكَتَمَهُ اُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنَ النَّارِ .

جس نے کوئی علمی بات پوچھی گئی جس کو وہ جانتا تھا پھر بھی چھپالیا تو اسے قیامت کے دن آگ کی لگام پہنچائی جائے گی۔

حدیث ابوداؤد (علم/۸) میں بھی آئی ہے ابن ماجہ کی سند میں اور رواہ تو تقریباً درست ہیں بس اسماعیل بن ابراہیم قدرے کمزور ہیں حافظ نے تقریب میں (نمبر۴۲۰) انہیں لین الحدیث قرار دیا ہے اس لئے سند میں قدرے ضعف آجاتا ہے۔

تقریظ

حضرت مولانا ریاست علی صاحب مدظلہ

استاذ حدیث دار العلوم دیوبند

الحمدللّٰہ و کفٰی و سلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی ، أما بعد!

عزیز محترم مولانا اسعد قاسم سنبھلی زید مجدہم نے طلب علم ہی کے زمانہ میں مصباح الزجاجہ کے نام سے مقدمۂ سنن ابن ماجہ کی مشکل احادیث کی شرح مرتب کی تھی جو طلبہ کے درمیان بہت مقبول ہوئی، پھر انہوں نے مقدمہ ابن ماجہ کی مکمل شرح کا ارادہ کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے عزم کے مطابق کام پورا کرادیا، اور اب ان کی یہ علمی کاوش ''ضیاء السنن'' کے نام سے طبع ہورہی ہے، اللہ مزید خدمات کی توفیق عطا کرے، آمین۔ سنن ابن ماجہ، حسن ترتیب اور فنی خصوصیات کی وجہ سے نہایت اہم کتاب ہے، اور انہی خصوصیات کی بنا پر محدثین نے اس کے بارے میں قیمتی تاثرات ظاہر کئے ہیں، جیسا کہ ابن ماجہ کے شیخ ابوزرعہ رازی نے کتاب دیکھ کر فرمایا تھا:

''کہ یہ کتاب اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچے گی تو اس کے سامنے فن حدیث کی بیشتر مصنفات معطل ہوجائیں گی''

انہی خصوصیات میں اُن کی کتاب کا مقدمہ بھی ہے جس میں ابن ماجہ نے صراطِ مستقیم کی وضاحت و تعیین، نیز فرقِ باطلہ کی تردید کے لئے ابواب قائم فرمائے ہیں، راقم الحروف کو دار العلوم دیوبند میں جب دورۂ حدیث کے کسی سبق کے دئے جانے کا وقت آیا تو حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ نے ابن ماجہ کی تدریس کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ مقدمہ میں ابن ماجہ نے محدثین کے انداز میں اہل حق یعنی اہل سنت والجماعت کی شاندار ترجمانی کی ہے، اور باطل کی ملمع سازی کے اس زمانہ میں اگر اربابِ تدریس صحیح نظریات کی ترجمانی اور غلط نظریات کی تردید میں ابن ماجہ کی سعی مشکور کو ملحوظ رکھیں تو اس سے بڑا فائدہ ہوگا۔

یاد آتا ہے کہ کسی موقع پر راقم نے حضرت مولانا نعمانی صاحب کا یہ تاثر، مولانا اسعد قاسم سنبھلی سلمہٗ سے ذکر کیا تو انہیں بڑی مسرت ہوئی تھی اور ان کی کتاب کے بعض مقامات پر نظر ڈال کر اندازہ ہوا کہ انہوں نے مقدمہ ابن ماجہ کی تشریحات میں اس کی رعایت کی ہے، اور اس کے علاوہ انہوں نے اپنی کتاب میں ان تمام باتوں کا لحاظ کیا ہے جو کسی اچھی اور کامیاب شرح کے لئے ضروری ہیں۔

میں بارگاہِ خداوندی میں دست بدعا ہوں کہ خدا ان کی اس علمی کاوش کو علمی حلقوں میں قبول عام اور اپنی بارگاہ میں حسن قبول کی دولت سے نوازے اور زیادہ سے زیادہ خدمات کی توفیق ارزانی کرے، آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

(حضرت مولانا) ریاست علی غفرلہٗ

خادم تدریس دار العلوم دیوبند ۱۸؍شوال ۱۴۲۶ھ

تقریظ

حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف غزنوی

محدث جامعة العلوم الإسلاميه، بنوری ٹاؤن، کراچی

الحمدلله وحده، والصلاة والسلام على من نبيّ بعده، وبعد:

حضرت مولانا مفتی اسعد قاسم سنبھلی فاضل دارالعلوم دیوبند مدظلہم کی تألیف ''ضیاء السنن شرح ابن ماجہ'' کا مسوّدہ بعض چیدہ مقامات سے دیکھنے کا موقع ملا، ماشاء اللہ موصوف نے اچھی محنت کی ہے، عبارت کا حل، مشکل الفاظ کی صرفی نحوی اورلغوی تحقیق، بامحاورہ واضح ترجمہ اور سند کے اعتبار سے حدیث کا مقام معتبر حوالوں کے ساتھ متعین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، دورِ حاضر کے طلبہ کی استعداد و مزاج کو سامنے رکھ کر غیرضروری طویل مباحث سے اجتناب کرتے ہوئے مولانا نے ضروری تشریح پر اکتفا کیا ہے جو ان کی مزاج شناسی کی دلیل، خداداد صلاحیت کا ثبوت اور وقت کا تقاضا ہے۔

اللہ تعالیٰ مولانا کی اس محنت کو شرفِ قبولیت نصیب فرمائے، اور آخرت میں ان کے مغفرت اور مرفع درجات کا ذریعہ بنائے۔ (آمین)

عبدالرؤف غزنوی عفا اللہ عنہ

سابق استاذ دارالعلوم دیوبند

حال استاذ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی، پاکستان

۱۳/۴/۱۴۲۷ھ

دارالکتاب کی کچھ اہم شروحات کا تعارف

افادات: حضرت مولانا اکرام علی صاحب مدظلہ
شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل

اُردو میں اب تک مسلم شریف کی کوئی قابل ذکر شرح نہیں ہے، جب کہ حدیث کے طلباء اس کی بے حد ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ خاص طور پر کتاب الایمان کے ابواب زیادہ تشریح وتوضیح کے محتاج ہیں۔ مقدمۂ مسلم اگرچہ زیادہ مشکل سمجھا جاتا ہے مگر اس کی متعدد شروحات موجود ہیں، اس لئے بہتر سمجھا گیا کہ اولاً کتاب الایمان کی شرح شائع کی جائے، چنانچہ اس کی جلد اوّل جو کتاب الایمان کے مباحث پر مشتمل ہے شائع ہو چکی ہے۔ قیمت مجلد =/300

البحر الرائق
شرح عربی
کنز الدقائق

تالیف: العلامة الشیخ زین الدین ابن نجیم مصری حنفیؒ

فقہ حنفی کی مشہور ومعروف کتاب ''کنز الدقائق'' کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، اپنے مسائل کے تنوع اور فروع کی کثرت، اور پیچیدہ طرز نگارش کے باعث طلباء میں یہ کتاب ایک چیستاں بنی ہوئی ہے، ہر دور میں اس کی حواشی اور شروحات لکھی گئیں، عربی زبان میں اسکی سب سے مفصل اور جامع شرح ''البحر الرائق'' ہے۔

قیمت =/3500

DARUL KITAB

DEOBAND, DIST. SAHARANPUR, U.P. (INDIA) PIN-247554

Mobile: 9412557658, 9997520332 Phone: 01336-222558

Email : nadimulwajidi@gmail.com